ترجمان السنة

عربی اردو

1

دورِ حاضر کی ضرورتوں کے مطابق اہم تشریحات
اور قدیم و جدید مباحث کے ہمراہ مستند کتابوں سے
احادیثِ نبویہ کا جامع انتخاب

تالیف
زبدۃ المحدثین حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ
استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

ادارہ اسلامیات
۱۹۰ انار کلی لاہور
۷۲۴۳۹۹۱ — ۷۳۲۴۴۱۲ — ۷۳۵۳۲۵۵
فیکس: ۷۲۲۳۷۸۵ ـ ۰۴۲ ـ ۰۹۲

ترجمان السنّة

مصوّر

عربی - اردو

جلد اوّل

دورِ حاضر کی ضرورتوں کے مطابق جدید عنوانات اور قدیم مباحث کے ہمراہ
احادیثِ طیبہ کا جامع و مستند عظیم الشان مجموعہ

تالیف
زبدۃ المحدثین حضرت مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی مہاجر مدنی قدس سرہٗ
استاذ الحدیث دار العلوم دیوبند و رفیق ندوۃ المصنفین دہلی

اِدارہ اسلامیات
پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور
فون ۷۲۳۴۲۱۲، فیکس ۷۳۲۴۷۸۵-۴۲-۹۲

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۳۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ
چوک اردو بازار، کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱

اِنتساب

شیخ الاسلام حضرت علّامہ سیّد محمد انور شاہ قدّس سرّہٗ کی عشقِ نبوی اور خدمتِ حدیث میں ڈوبی ہوئی رُوح کے نام جن کے فیضِ صحبت سے رفقائے ندوۃ المصنفین اس خدمت گرامی کے لائق ہوئے۔

ندوۃ المصنفین

فہرست مضامین ترجمان السنۃ جلد اوّل

اسلام میں تنقید و تبصرہ

ائمہ اربعہ اور بعض اُن مشہور محدثین کے تذکرے جن کی تصنیفات اس مجموعہ کی زمین اور ماخذ ہیں

کتاب التوحید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

احادیثِ نبویہ پہلی صدی کے آخر سے لیکر تیسری صدی تک مختلف مقاصد کے پیشِ نظر مختلف حیثیتوں اور ترتیبوں کے ساتھ باضابطہ جمع ہوتی رہیں اور محدثین کی مساعیِ جلیلہ وجمیلہ اس سلسلہ میں بلاشبہ اس حد تک پہنچ چکی ہیں کہ فنونِ حدیث کے لحاظ سے اب کسی نئی تالیف وترتیب کا تخیل بھی دماغ میں لانا دشوار ہوگیا ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہر زمانہ کے نئے نئے تقاضے اور نئی نئی ضرورتیں ہوتی ہیں اس لئے اس جمود کی اور جمود پر اصرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اب کسی تالیف وتصنیف کی جانب جدید اسلوب کے ساتھ قدم اٹھانا بھی جرم سمجھا جائے، اس اقدام کا مطلب کبھی بھی یہ نہیں ہوسکتا کہ ہمیں اس باب میں سلف کی بے مثال خدمات کا اعتراف کرنے میں تامل ہے یا ان کے کارناموں کو بے وزن کرنا چاہتے ہیں، بلکہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ارشاداتِ نبویہ کا بیشمار ذخیرہ جو مختلف ممالک، اور مختلف بلاد کے لاکھوں انسانوں کے سینوں میں بکھرا پڑا ہوا تھا اس کو ایک جگہ بشکلِ سفینہ قلمبند کردینا پھر اس میں ہر ہر حدیث کی ایک ایک سند اور تمام مختلف اسنادوں کو یکجا کرنا اس پر بعض حضرات کا تو روایت باللفظ اور روایت بالمعنی کی باریکیوں کو بھی نظر انداز نہ کرنا پھر ان میں صحت وسقم، وقف وارسال، انقطاع وارسال، شذوذ ونکارت اور مجروح وعلل جیسے دقیق مباحث پر تنبیہ کرتے چلے جانا اور ان سے عہدہ برا ہونا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کا اعتراف نہ کرنا علمی دنیا میں بہت بڑی ناسپاسی وحق ناشناسی ہے۔ الحمد للہ کہ ان کی خدمات کا یہ تمام ذخیرہ آج ہمارے سامنے جوامع وسنن، مسانید ومعاجم مستدرکات، اجزاء واطراف اور علل وغیرہ کی شکل میں موجود ہے حتی کہ اب دین کے اصول وفروع کے کسی باب میں امت کے لئے نیا میٹریل تلاش کرنا ممکن نہیں رہا ہے، کوئی قلم اگر کچھ لکھے گا، کوئی زبان اگر کوئی کلمہ کہے گی وہ سب ان ہی کی خوشہ چینی کہلائے گی۔ گویا اب ہر تالیف میں اصل سرمایہ اُن کا رہے گا اور صرف نقش ونگار اور تصویر وتشکیل کی خدمت ہماری۔

بدقسمتی سے مسلمانوں کا ایک طبقہ جو فقہاء و محدثین کے ساتھ مرتبط تھا اپنے ضیقِ ماحول قصورِ فہم اور کوتاہیٔ نظر کی وجہ سے ان تصانیف میں وہی کچھ دیکھتا رہا جو اُس کے آئینۂ قلب میں نظر آرہا تھا۔ اس لئے جب مطولات کا باب شروع ہوتا اس میں بھی خصوصیت سے وہ حصہ جو مختلف فیہ مسائل سے متعلق ہے تو اس طبقے کے علوم و معارف اور تدقیق و تحقیق کے سمندر میں تلاطم برپا ہو جاتا، تقریروں میں طول، طبیعت میں روانی اور مزاج میں جولانی پیدا ہو جاتی لیکن جب ان ہی کتب میں اجتماعیات و اخلاقیات سیاستِ مدنیہ اور تدبیرِ منزل وغیرہ کے باب آتے تو اس بحرِ متلاطم میں یک قلم جمود طاری ہو جاتا، لبوں پر مہرِ سکوت لگ جاتی، زبان پر خاموشی کے قفل چڑھ جاتے اور طبیعت کا وہ تمام جوش و خروش ایسا ٹھنڈا پڑ جاتا گویا اس میں حرارت کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔

اندریں حالات اس غلط فہمی کا پیدا ہو جانا ناگزیر تھا کہ محدثین کی یہ گراں مایہ خدمات یا تو کتبِ صوفیاء کی طرح صرف ایک "نظامِ خانقاہی" کا مجموعہ ہیں۔ یا یہ کتب کلام کی طرح علماء کلام کی موشگافیوں کا ایک دفترِ پراگندہ اس اندازِ بحث و نظر کے خلاف اگر کبھی کسی نے کوئی قدم اٹھایا بھی تو اس کو بے دینی و زیغ، عدمِ تقلید، مخالفتِ سلف اور اس طرح کی عجیب و غریب تہمتوں سے متہم کر دیا گیا۔ ادھر مسلمانوں کا دوسرا طبقہ جو مذہب کو روزِ ازل ہی سے سامانِ دردسری یا زیادہ سے زیادہ ایک آئینِ تہذیب خیال کئے ہوئے تھا اس کو خود تو مطالعہ کی توفیق نہ ہوئی، ہماری اس غلط روش سے وہ ایک اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا یعنی یہ کہ ان کتابوں میں عبادات و رسوم یا چند مسائل کلامیہ و فقہیہ کے علاوہ اجتماعیات و معاشیات کا کوئی باب بھی نہیں ہے اور ہے تو بہت سطحی بلکہ غیر ضروری اور ان چند در چند وجوہ کی بناء پر وہ اپنی معاشیات و اقتصادیات کے لئے کوئی دوسری راہ تلاش کرنے پر مجبور ہو گیا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں جماعتیں افراط و تفریط کے راستوں پر جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمیعِ احادیث کی جو خدمت محدثین کر گذرے ہیں اس کی اہمیت کو کسی وقت اور کسی حیثیت سے بھی کم کرنا یا صرف اُن گنے چنے ابواب کی وجہ سے جنہیں ان کتب میں کسی وقتی ضرورت سے اہمیت دے دی گئی تھی، تمام ابواب و تراجم اور مباحث و بیانات کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا یا ان میں موجودہ جدید اصطلاحی الفاظ نہ دیکھ کر اصل حقائق سے بھی ان کو خالی سمجھ لینا یا موضوعِ فن سے لاعلمی کی بناء پر خود اس فن کے اہم ابواب کو غیر اہم سمجھ کر معترض ہونا علمی دنیا میں ناقابلِ معافی جرائم ہیں۔

دوسری طرف ہمیں اس کا بھی اعتراف کرنا چاہئے کہ ان کتب میں جو ابواب و تراجم ایک خاص فضا اور خاص ماحول میں اہم سمجھ لئے گئے تھے آج بھی ان کو اسی نظر سے دیکھے چلے جانا، وہی جمیعت کی تردید

معتزلہ وخوارج کے ساتھ وہی جھگڑے، صفات کے عین وغیر ہونے کے متعلق وہی فلسفیانہ کاوشیں، پھر قرآن کریم کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کی وہی قدیم بحثیں زیر تحقیق لائے چلے جانا اور ایک ایسی زمین پر مالکیت وشافعیت کے لئے صف آرائی کرنا جہاں نہ کوئی شافعی ہے نہ مالکی، علم وفکر کے ان مظاہروں کو ہرگز اقتضاء علم نہیں کہا جاسکتا نہ تو اس کا نام احساسِ ضرورت ہے اور نہ اس کو صحیح معنی میں اتباعِ سلف کا نام دیا جاسکتا ہے، اتباعِ سلف یہ ہے کہ جس طرح امام بخاریؒ نے اپنے وقت کے فتنوں کے مقابلہ کے لئے کتاب الرد علی الجہمیۃ، حجیت اخبار آحاد، صفاتِ باری اور شئونِ باری پر مناسب مناسب عنوانات قائم کئے تھے۔ ان کے قدم بقدم چل کر ہم بھی وقتی مسائل کے لئے مناسب عنوانات قائم کریں۔ ہمیں اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ نہیں ہے کہ اگر امام بخاریؒ اس زمانے میں موجود ہوتے تو اپنی مجتہدانہ شان، دقت رسی، دقیقہ سنجی، اور امت کی ضرورتوں کے متعلق صحیح نبض شناسی اور دردمندی کی وجہ سے اپنے بابوں، ترجموں اور عنوانوں کا رُخ جہمیت واعتزال کی تردید کے بجائے یقیناً ان ہی مسائل کی طرف پھیر دیتے جو ہمارے وقت کے الجھے ہوئے مسائل کہلاتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج بھی بخاری میں اجتماعیات واقتصادیات اور دیگر ضروری مسائل کی جانب ایسی اہم تلمیحات موجود ہیں کہ اگر کوئی ذی علم ان سے استفادہ کرنا چاہے تو بہت کچھ استفادہ کرسکتا ہے اور انھیں جدید اخذ واستنباط کی بنیاد قرار دے سکتا ہے۔ آخر حضرت شاہ ولی اللہ محدثینِ ہند میں ایک محدث ہی تو تھے، جنھوں نے اسی قسم کے ضروریات کا احساس کرکے عام ومتعارف مباحث کے علاوہ اجتماعیات واقتصادیات کے غیر متعارف اور صد درجہ مفید مباحث اپنی تصانیف میں پھیلا دیئے۔ آج حجۃ اللہ کو اٹھا کر دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حنفی ہونے کے باوجود اُن کی نگاہ میں مسائل فروعی کو کیا اہمیت حاصل ہے۔

بہرحال سلف کی خدمات کے پورے اعتراف کے ساتھ اگر صورت حال کو اس نظر سے دیکھا جائے تو خدمتِ حدیث کا یہ گوشہ مجموعی طور پر خالی نظر آتا ہے اور بلاشبہ وقت کی شدید ترین ضروریات میں یہ اہم ترین ضرورت باقی ہے کہ اس وقت احادیثِ نبویہ پر اس نقطۂ نظر سے دوبارہ نظر ڈالی جائے کہ بین الاقوامی اور اجتماعی مسائل میں دینِ کامل کی ہدایات کیا ہیں اور فرموداتِ نبوی میں وقت کے نئے نئے تقاضوں اور الجھنوں کا کیا حل پیش کیا گیا ہے۔ کسی زمانہ میں عدم اہمیت کی وجہ سے اگر ترتیب وتدوین احادیث کا یہ طریقہ بروئے کار نہیں لایا گیا تو اس دور کی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے چھپے اور دبے ہوئے عنوانات اُبھارے جائیں، ان کو اسلوبِ جدید کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ اور ایک ایسا جامع اور مرتب متن حدیث سامنے آجائے جو حسب ذیل خصوصیات پر مشتمل ہو۔

متنِ حدیث

اب تک عام طور پر احادیث کا جو ذخیرہ عوام کے سامنے آیا ہے وہ بیشتر صحاح ستہ کی حدیثیں ہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث موجود ہیں جو مسندوں، معجموں اور دوسری غیر متداول، ضخیم کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ضرورت ان کو اس طرح جمع کرنے کی ہے کہ وہ بلوغ المرام یا آثار السنن کی طرح صرف شوافع اور احناف کی حدیثوں کا مجموعہ بن کر نہ رہ جائیں بلکہ صحیح معنی میں احادیثِ نبویہ کا مجموعہ کہلائیں، ان میں ہر صحیح یا حسن حدیث لے لی جائے، خواہ وہ فقہی مسلک کے لحاظ سے کسی مسلک یا کسی فرقہ سے متعلق ہو۔ گویا اصل مقصد جمع و ترتیبِ احادیث ہو اور فقہی مسلک کی خدمت درجۂ ثانوی پر ہو۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ امت کے ہاتھوں میں احادیثِ صحیحہ کا بڑے سے بڑا مجموعہ پہنچ جائے گا اور وہ اس قابل ہو جائے گی کہ اپنی جدید ضروریات کے لئے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکے اور فروعی مسائل میں دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اپنی اپنی رائے کے متعلق زیادہ روشنی میں فیصلہ کرنے کا موقعہ مل سکے گا۔

عنوانات

یہی خدمت سب سے اہم خدمت ہے اس کام کے لئے ایک طرف زیادہ سے زیادہ احادیث زیرِ نظر رہنے کی ضرورت ہے، دوسری طرف وقتی مسائل کا پورا استحضار پھر اُن میں اہم اور غیر اہم کا صحیح انتخاب اور بہت سے حقائق کی تفہیم کے لئے موجودہ اصطلاحات سے واقفیت۔ اس کے لئے ضرورت نہیں ہے کہ ہم قدیم طرز کی پیروی کریں اور اپنی جانب سے کوئی نیا باب یا نیا عنوان قائم کرنا ایک بدعت تصور کرلیں۔ ہمارے لئے اس باب میں امام بخاریؒ کا اسوۂ حسنہ کافی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ احادیثِ نبویہ کے خفی اشارات و تلمیحات کو ابھار ابھار کر بشکل عنوانات روشن کرنے کے وہی موسس ہیں جو شخص آئندہ کسی نہج پر بھی اس سلسلہ میں کوئی قدم اٹھائے گا اس کے لئے لازم ہوگا کہ وہ کتاب بخاری کو اپنے لئے مشعلِ راہ تصور کرے اور جس طرح اپنے دور کے مسائل پر انھوں نے مفید سے مفید تراجم قائم کئے ہیں اسی طرح وہ اپنے زمانہ کے مسائل پر نئے نئے عنوانات قائم کرتا چلا جائے۔

ترجمہ

عام مسلمانوں اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کی ضرورت کے لئے حدیثوں کا اردو ترجمہ بھی ضروری تھا جو نہ تو اتنا با محاورہ اور تشریحی ہو کہ مستقل تصنیف بن جائے اور نہ ایسا تحت اللفظ کہ مطلب خبر نہ رہے۔ موجودہ ماحول میں اس طرح کے ترجمہ کی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔

تشریحی نوٹ

احادیث کی تشریح اور عنوانات کی پوری تفصیل کے علاوہ دیگر امور متعلقہ کے بسط و شرح کے لئے ایسے تشریحی نوٹوں کی بھی ضرورت تھی جو نہ تو جدت میں اتنے ڈوبے ہوئے ہوں کہ اسلامی تعلیمات کے اصل مرکز ہی سے ہٹ جائیں اور نہ ان پر قدامت پرستی کا ایسا گہرا رنگ ہو کہ جدید

ارباب نظران کو دیکھنا ہی گوارا نہ کریں بلکہ قدیم معلومات جدید قالب میں زیادہ سے زیادہ احتیاط کے ساتھ پیش کر دی جائیں۔ ہر بات نکھری ہوئی اور صاف صاف بلا خوف لومۃ لائم کہدی جائے لیکن مجادلہ و مناقشہ کا رنگ نہ آنے پائے، کسی کی ایذا دہی یا دل آزاری یا افحام واسکات ہرگز مقصود نہ ہو بلکہ صرف احقاق حق، اور اصلاح خلق مطمح نظر ہو۔ خلاصہ یہ کہ یہ مجموعہ، الفاظ حدیث میں تو موبمو سلف کے نقش قدم پر ہو لیکن اپنی ترتیب اور عنوانات میں تمام تر آزاد رہے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر ایسا کوئی مجموعہ مکمل طور پر تیار ہو گیا تو وقت کی بہت بڑی اور اہم ضرورت پوری ہو جائے گی۔ ندوۃ المصنفین کسی وقت بھی اس ضرورت کے احساس اور اس کی طرف عملی اقدام سے غافل نہیں رہا یہاں تک کہ جب حالات نے کسی درجہ میں بھی مہلت دی تو بہت سی مشکلوں اور دشواریوں کے باوجود قدم اٹھانے میں پس و پیش نہیں کیا گیا۔ اور جو کام بڑی بڑی اسلامی سلطنتوں کے کرنے کا تھا اُسے اس ادارے نے اپنے ذمۂ ہمت پر لے لیا، اس عظیم الشان خدمت کے لئے جتنا علمی سرمایہ، جتنی قوتِ احساس، قوتِ فکر، قوتِ عمل، درکار ہے ظاہر ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک ہی تصنیف ہے مگر درحقیقت یہ مستقل چار تصنیفیں ہیں جن میں ہر تصنیف اپنی حیثیت میں بڑی جدوجہد اور سخت کاوش کی محتاج ہے جدید عنوانات کا انتخاب، ان کے مناسب احادیث کا انتخاب پھر ان کا ترجمہ، اس پر تشریحی نوٹوں کا مرحلہ کھیل تماشہ نہیں ہے اگر کسی کے لئے قدرت یہ تمام سامان مہیا کر دے تو پھر وسعتِ وقت، طمانیتِ قلب اور سکونِ دماغ کا سوال سامنے رہتا ہے۔ لیکن جب اس خدمت کی تفویض کا وقت آیا تو کاتبِ ازل نے میرا نام سامنے کر دیا۔ کسی رسمی معذرت کے بغیر مجھے اس کا برملا اعتراف ہے کہ اس خدمت کیلئے جتنے ساز و سامان کی ضرورت ہے اس میں ایک سامان بھی پورے طور پر میرے ساتھ نہیں ہے۔ تاہم خدمتِ حدیث کے لئے جینا اور اُسی میں مرجانا چونکہ میری ایک دلی تمنا ہے اس لئے اسی بے سرو سامانی کے عالم میں اس کٹھن منزل کے سفر کا ارادہ کر لیا گیا ہے۔

سفر شروع کرنے کے لئے کچھ زادِ راہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ میں نے اپنے مفوضہ کام کی ابتدا مصر کی جدید تصنیف "التاج" سے کی کہ یہ کتاب حکومتِ مصر کی جانب سے ان ہی احساسات کے پیشِ نظر تصنیف کی گئی تھی۔ لیکن جب اس کتاب کو لیکر چند قدم اٹھا چکا تو معلوم ہوا کہ جس منزل پر مجھے پہنچنا ہے اس کے لئے یہ روشنی قطعاً ناکافی ہے۔ اس میں احادیث کا ذخیرہ توقع سے بہت کم ملا عنوانات قطعاً ناکافی نظر آئے اور جو ملے بھی ان میں سوائے تقدیم و تاخیر کے کوئی جدت نہ دیکھی اور اس لئے اس کتاب پر میری ایک سال کی کرائی محنت بے سود ہو گئی۔ اسی غور و فکر میں مسند امام احمد کی جدید

تبویب نظر سے گذری۔ یہ جدید خدمت دیکھکر میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ اب اس کتاب کی مدد سے اپنے سفر کو کسی حد تک کامیاب دیکھ سکوں گا۔ مسند احمد محتاج تعارف نہیں ہے اس میں سات سو صحابہ[۱] کی تقریباً تیس، چالیس ہزار حدیثیں موجود ہیں اگر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو بجا ہے۔ یہ کتاب ابوابِ فقہیہ کے ترتیب کی بجائے صحابہ کی ترتیب پر تالیف کی گئی ہے اس لئے اس سے استفادہ بہت مشکل تھا۔ تبویبِ مسند نے اس مشکل کو حل کر دیا ہے اس پر محشی کی محنت نے تنقید کی جانفشانی سے بھی سبکدوش کر دیا۔ اسی کے ساتھ مستدرک حاکم علامہ ذہبی کی نقد کردہ موجود ہے اور مجمع الزوائد بھی طبع ہو کر آ گئی ہے۔ جدید انتخاب کے لئے یہ ذخیرہ کفایت کرتا ہے۔ کنز العمال کی آٹھ جلدوں میں اگرچہ ۴۶۱۸۱ چھیالیس ہزار ایک سو اکیاسی احادیث کا ذخیرہ موجود ہے مگر اس میں صحت و ضعف کا معیار قائم رکھنا مشکل ہے۔ شیخ علی متقی ہندی نے مکرر احادیث حذف کر کے ایک جدید ترتیب سے اس کو مرتب کر دیا ہے اور اس کا نام منتخب کنز العمال رکھا ہے اس میں حدیثوں کی تعداد تیس ہزار دو باقی رہ گئی ہے اس تصنیف میں یہ کتاب بھی زیرِ نظر رہی ہے۔

معیارِ صحت

جمع حدیث کے لئے معیارِ صحت قائم کرنا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہم نے اپنے مقصد کے پیش نظر نہ تو اس میں اتنی شدت اختیار کی ہے کہ اس معیار پر احادیث کا ذخیرہ تلاش کرنا ہی مشکل ہو جائے اور نہ اتنی وسعت کہ احادیثِ موضوعہ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ احادیث صحاح کے علاوہ جن حدیثوں پر کسی معتمد حافظ حدیث نے صحیح یا حسن ہونے کا حکم لگا دیا ہے اگر اس کا مضمون آیات قرآنیہ اور مشہور صحیح احادیث کے خلاف نہیں ہے تو ہم نے اس کو صحیح یا حسن میں شمار کر لیا ہے[۲]۔ خواہ محدثانہ نقد

---

[۱] شیخ تاج الدین سبکی طبقات کبریٰ میں امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ اس کتاب کو میں نے ساڑھے سات لاکھ احادیث سے بھی زیادہ کے مجموعہ میں سے منتخب کر کے جمع کیا ہے تاکہ جب کسی حدیث کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو تو وہ اس کتاب کی طرف رجوع کر لیں اگر اس میں مل جائے تو خیر ورنہ اس کو قابلِ احتجاج تصور نہ کریں۔

[۲] حافظ ابن قیم امام احمد کے فتاوے کے اصول کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"چوتھا ضابطہ یہ ہے کہ مرسل احادیث کو لے لیا جائے بلکہ اگر اس باب میں کوئی حدیث معارض نہ ہو تو ضعیف حدیث پر بھی عمل کر لیا جائے حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ یہاں ضعیف سے مراد وہ حدیث ہے جو ثقہ راویوں کی مخالف یا ایسے اشخاص کی بیان کردہ نہ ہو جس پر کوئی ایسی تہمت ہو جس کے بعد ان کی احادیث پر عمل کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ امام احمد نے جس ضعیف حدیث کو قیاس پر مقدم رکھا ہے اس سے اسی قسم کی ضعیف حدیث مراد ہے اور اس بات پر اجمالاً دیگر ائمہ کا بھی اتفاق ہے۔ (اعلام الموقعین ص ۲۵)

ان وجوہ کی بناء پر ہم نے صرف تائیدی طور پر ضعیف احادیث کا ذکر کرنا نامناسب نہیں سمجھا۔ اس مسئلہ کے متعلق حجیتِ حدیث کے عنوان میں مزید تفصیل دیکھئے۔

اس میں باقی ہو۔ اہل علم جانتے ہیں کہ علمی نقد سے صحیحین کی احادیث بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکیں پھر یہ ایک ایسا موضوع ہے جس میں کوئی نیا قدم اٹھانا اب مشکل ہے کسی حدیث کے متعلق اگر محدثین کی مختلف آراء دیکھنا ہوں تو اس کے لئے مستقل تصانیف موجود ہیں۔ ہم نے ان اصطلاحی مباحث کو چھیڑنا غیر مفید اور اپنے مخاطبین کی فہم سے بلند سمجھا ہے تاہم بضرورت کہیں کہیں مختصر اشارات کر دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد تائیدی طور پر بعض ابواب میں ضعیف احادیث بھی ذکر کر دی گئی ہیں بشرطیکہ موضوع اور محض بے اصل نہ ہوں یہ وسعت صرف اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ جب ایک مضمون صحیح احادیث سے ثابت ہو چکا ہے تو اب اگر اسی مضمون کی دوسری حدیثوں سے کچھ توضیح ہو سکتی ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام احمدؒ جیسا مسلم محدث ہو کر حدیث کے نام پر ایک مسند جمع کرتا ہے پھر اس میں اتنی وسعت سے کام لے لیتا ہے کہ اس کی بعض احادیث کے متعلق وضع تک کا شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ گو حافظ ابن حجرؒ نے اس کو تسلیم نہیں کیا تاہم اس سے ان کی وسعت نظر کا ثبوت ضرور ملتا ہے امام موصوف کے اس طریق کار سے معلوم ہوا کہ جو شخص جمع احادیث کا ارادہ کرے اس کے لئے کسی حد تک وسعت اختیار کرنے کی گنجائش ہے۔ ہم نے کسی باب میں مسائل کی بنا اس قسم کی احادیث پر نہیں رکھی ہمیشہ صحیح احادیث کے ساتھ ساتھ صرف تائیدی طور پر ان کو پیش کیا ہے وہ بھی ایسے ابواب میں جہاں تساہل اختیار کرنا محدثین کے نزدیک عیب شمار نہیں ہوتا۔ احکام اور دوسرے حلال و حرام کے موقعوں پر نظر اس سے بلند رکھی گئی ہے۔ جن حضرات نے مراسیل کا انکار کیا ان کے دلائل خواہ کچھ بھی ہوں مگر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ احادیث نبویہ کے ایک بہت بڑے ذخیرہ سے ان کو دست بردار ہو جانا پڑا جس میں علوم امت کے لئے کتنی قیمتی بہا ہدایات موجود ہیں۔ اگر ہمارے وجدان میں وہ موضوع اور بے اصل نہیں تو محض منکرین حدیث سے ڈر کر ان کو ذکر نہ کرنا علمی جبن ہے۔ خود امام بخاریؒ کو دیکھیے ایک طرف ان کی کتاب بخاری موجود ہے اگرچہ اس کا موضوع صرف صحیح احادیث ہیں مگر ان کو بھی ترجمۃ الباب میں اپنی رائے کی تائید یا اظہار کے لئے آثار و تعلیقات ضعیفہ لانا ناگزیر ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ ادب المفردؒ اور ان کی دوسری تصانیف میں یہ معیاری رنگ باقی نہیں رہا۔

خلاصہ یہ کہ ہماری تصنیف کا موضوع صحیحین پر استدراک یا اس معیار کی کوئی کتاب جمع کرنا نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس قسم کی احادیث سے آج تک امت اصولی طور پر استفادہ کرتی چلی آئی ہے۔ اسی قسم کی احادیث سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے۔ اگر ہمارے خیال میں یہ اصول غلط نہیں تو اس جماعت کے اعتراضات سے ہمیں کیا خوف ہو سکتا ہے جس کے اعتراض سے صحیحین بھی مستثنیٰ نہیں رہ سکیں۔

ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ محض اپنے معیارِ عقل سے صحیح سے صحیح احادیث کو رد کرکے امت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہدایات سے محروم کردیا جائے بلکہ یہ ہے کہ جن احادیث پر اب تک عام امت کی نظر نہیں پہنچی اگر وہ موضوع اور بے اصل نہیں ہیں تو اُن سے استفادہ کا پورا موقعہ بہم پہنچایا جائے۔ منکرینِ حدیث کو اگر یہاں کوئی اختلاف ہے تو وہ اصولی ہے ان کے نزدیک احادیثِ صحیحین بھی دین میں حجیت کے قابل نہیں ہمیں اُن حضرات کے نقشِ قدم پر چلنا ہے جن کے ہاتھوں میں امت کی باگ ڈور سمجھی گئی۔ ہے جن کو اپنے رسول کی ایک ایک ہدایت دنیا و مافیہا سے بیش بہا نظر آتی تھی اگر ان حضرات۔ کے نزدیک کسی مسئلہ کی بنا ضعیف حدیث پر قائم کی جاسکتی ہے تو ہمارے یہاں صرف تائیدی طور پر کسی ضعیف حدیث کا ذکر کرنا جرم کیوں ہو۔

ترتیب احادیث و عنوانات

اصحابِ سنن نے عام طور پر اپنی کتب کی ابتدا طہارت سے، طہارت کے بعد عبادات پھر معاملات سے کی ہے۔ صحیحین میں یہ جدت ہے کہ ان کی ابتدا ایمان سے کی گئی ہے پھر امام بخاریؒ نے ایک نیا قدم یہ اٹھایا کہ ایمان پر وحی کو مقدم کردیا۔ علمی اعتبار سے یہ پرواز قابلِ داد ہے لیکن میں تقاضاء وقت و مصلحت کے لحاظ سے کسی اور نئے قدم اٹھانے کا متلاشی تھا کہ میں نے الفتح الربانی (تبویب مسند) کی ابتدا "معرفتِ ربوبیۃ" سے دیکھی، اپنے مذاقِ طبیعت اور احساسِ ضرورت کی بنا پر یہ ابتدا بہت پسند آئی اس لئے اس تالیف کی ابتدا بھی اسی عنوان سے کی گئی پھر خدا تعالیٰ کی عظمت اور دیگر صفات کے ساتھ بالخصوص صفتِ رحمت کا ذکر کرکے آخر میں اسماء باری تعالیٰ پر اس باب کو ختم کردیا۔ اور باب کے خاتمہ پر احادیث اور تشریحی نوٹوں کی روشنی میں خدا کی ہستی کے متعلق جو تاثرات پیدا ہوسکتے تھے ان کو بشکلِ مقالہ منضبط کردیا۔ یہ باب اس سے کہیں زیادہ پھیل سکتا تھا اور کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں پہلے گاہی سردست اس کو جدید خدمت کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ دوسرے نمبر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی سامنے آتی ہے اس لئے ان پر بھی بہت سے مفید عنوانات قائم کئے گئے ہیں جن میں ختمِ نبوت کو خصوصیت سے روشن کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت استاد مرحوم کی یادداشت اور مطبوعہ رسالہ خاتم النبیین سے کافی مدد لی گئی ہے اور پہلے باب کی طرح یہاں بھی جو تاثرات ان احادیث سے پیدا ہوسکتے تھے ان کو مقالہ کی صورت میں آخر میں درج کردیا گیا ہے امید ہے کہ موجودہ مباحث کے پیشِ نظر یہ مقالہ بڑی حد تک بصیرت افروز ثابت ہوگا اس کے بعد نبوت کے ابواب سامنے آتے ہیں اُن پر بھی اپنے علمی مبلغ پرواز کے بقدر ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے مفید عنوانات قائم کرکے باب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارک پر ختم کیا گیا ہے۔ ان احادیث کو دیکھکر رسول کا جو نقشہ

دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے اس کو یہاں بھی بشکلِ مقالہ سپردِ قلم کیا گیا ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کے تصور کی اس تکمیل سے فارغ ہو کر ابواب ایمان شروع کئے گئے ہیں۔ اور اس موضوع پر دو مقالے لکھے گئے ہیں ایک قدرے طویل اور ایک بہت مختصر ان مقالوں میں مسائلِ کلامیہ کو اسلامی اور تبلیغی رنگ میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے اہم کتاب حافظ ابن تیمیہؒ کی "کتاب الایمان" ہے۔ ان دو مقالوں کے لئے دیگر کتب کے علاوہ اس کتاب کا تقریباً پانچ مرتبہ مطالعہ کیا گیا ہے اور حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ ان مباحث کو سادہ سے سادہ رنگ میں پیش کیا جائے۔ امید ہے کہ خدا اور رسول کے اس طرح تصور کے بعد کتاب الایمان کی احادیث کا لطف آپ پہلے زیادہ اٹھا سکیں گے اور آپ کو اس کا پورا یقین ہو سکے گا کہ خدا اور رسول پر صحیح معنیٰ میں ایمان لانا صرف مذہبِ اسلام نے سکھایا ہے۔ دوسرے مُندرِس یا مُنحرف مذاہب صرف ایمان کا لفظ جانتے ہیں اس کی حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں۔ یہی باب اسلام کی اساس ہے اس لئے اس میں مؤلف نے خود بھی کافی محنت اٹھائی ہے اور قارئین سے بھی یہی درخواست ہے کہ اگر انھیں اپنے مذہب سے کوئی دلچسپی ہے تو اس باب کو وہ بار بار پڑھیں انشاء اللہ یہ تکرار بے فائدہ نہیں رہے گا۔

تشریحی نوٹ جس مقصد کے پیشِ نظر یہ کتاب تالیف کی گئی ہے وہ تبلیغِ دین اور اصلاحِ خلق ہے محض ایک فنی اور علمی خدمت نہیں ہے اس لئے نوٹوں میں بھی زیادہ تر ان ہی مقاصد کی رعایت کی گئی ہے اصطلاحی مباحث، علمی مناقشات، اور مُندرِس مذاہب کے تذکروں سے ممکن احتراز کیا گیا ہے اور اگر کہیں اس کی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو اُن کو زیادہ سے زیادہ اختصار اور سادگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کتاب الایمان کے معرکۃ الآراء مباحث بہت کچھ جدوجہد کے بعد بھی اتنے سادہ اور مختصر نہیں رہ سکے، ان کو پوری کاوش و تحقیق کے بعد بشکل مقالہ مستقل طور پر علیحدہ کر دیا گیا ہے، خاص احادیثِ ایمان کی تشریح کی سطح ان مباحث سے بلند رکھی گئی ہے۔ بہت سے مقامات پر اجمال بھی کفایت کر سکتا تھا مگر اُسی اپنے ایک مقصد کے پیشِ نظر بلا ارادہ کچھ پھیلاؤ اور تفصیل ہو گئی ہے۔ فروعی مسائل میں پورے اعتدال اور انصاف کے ساتھ حنفی مذہب کی تائید ضرور کی گئی ہے مگر دیگر مذاہب کے بالمقابل اکھاڑا قائم نہیں کیا گیا۔

ہمارے پیشِ نظر ہر جگہ دفع اعتراض ہے نہ کہ دوسروں کو موردِ الزام بنانا۔ اس کے باوجود جن فروعی مسائل پر دوسری کتابوں میں آپ کی نظر سے اوراق گذریں گے یہاں چند سطور ہی ملیں گی اور جن اصولی مسائل پر دوسری جگہ سطور ہوں گی یہاں اجزاء و اوراق کے انبار نظر آئیں گے۔

مقدمہ

کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں پہلی بحث افتراقِ امت کی حدیث پر کی گئی ہے
یہ حدیث علمی لحاظ سے بھی ہر زمانہ میں زیرِ بحث رہی ہے اور اس زمانہ میں بھی زیرِ بحث ہے
اس کے علاوہ چونکہ فِرقِ اسلامیہ کے افتراق کا مرکزی نقطہ ہی قرآن و حدیث ہیں اس لئے یہ ضروری
معلوم ہوا کہ کتاب کے شروع میں اُن اسباب و علل پر بھی بحث کردی جائے جو اس افتراق کا سبب
بن جاتے ہیں تاکہ کتاب کا مطالعہ کرنے والے اس روشنی میں ما انا علیہ واصحابی کا منہاجِ قویم صاف
طور پر دیکھ لیں اور سُبلِ منحرفہ سے اجتناب اختیار کرسکیں۔ اس بحث میں ضمنی طور پر بہت سے علمی
مسائل کا حل کیا گیا ہے جو اپنی جگہ الجھے ہوئے سمجھے گئے ہیں اگر ان مباحث کو نظرانداز کردیا جاتا تو صرف
مسئلہ افتراقِ امت کے لحاظ سے کیا جاسکتا تھا لیکن اُن مقاصد و فوائد کے پیشِ نظر جن کی بنا پر کہ اس
بحث کو مقدمہ میں درج کیا گیا ہے حذف کرنا تو درکنار قصداً زیرِ بحث لانا ضروری تھا اس کے بعد
حُجیّتِ حدیث کی بحث بھی ہمارے وقت کی اہم بحث ہے اس پر بھی جتنا کچھ لکھدیا گیا ہے وہ منکرینِ
حدیث کے لئے خواہ ناکافی رہے، اگر نفسِ مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہوگا۔

فہرست ماخذ کتاب

یہ فہرست کتاب ختم ہوجانے کے بعد زیادہ مکمل اور صحیح طور پر مرتب ہوسکے گی۔ ابھی
نہیں کہا جاسکتا کہ آئندہ تالیف میں ہمیں کن کن کتابوں کی اور ضرورت ہو ہاں یقینی
امر ہے کہ یہ فہرست سَو کتابوں سے زیادہ پر مشتمل ہوگی، صرف اس پہلے جزء میں بھی کافی مراجعت کی گئی ہے
جن کے حوالہ جات موقعہ بموقعہ درج کردیے گئے ہیں۔

اس ضمن میں حضرت استاد مرحوم کے علوم و معارف کا وہ ذخیرہ بھی جو اس کتاب کے موضوع کے
مناسب ہے پیش کیا جائے گا اگرچہ حق یہ ہے کہ جس اندازِ فکر سے یہ کتاب لکھی جارہی ہے وہ تمام تر
حضرت استاد مرحوم ہی کا پیدا کردہ ہے لیکن وہ لوگ بہت ہی کم ہیں جو اس دعوے میں میرے ہم آہنگ
ہوسکتے ہیں۔ سلسلۂ تلامذہ کا بڑا طبقہ وہی ہے جو سال دو سال شریکِ درس رہا اور سند لیکر رخصت ہوگیا
جو شخص استادِ مرحوم کے جلوت و خلوت کا شریک رہا ہو وہی جان سکتا ہے کہ یہ محدث جو امت میں
صرف امام بخاریؒ کی طرح فنِ حدیث میں اپنی شہرت رکھتا تھا وہ امت کی اصلاح کے لیے کتنی دلسوزی
اور اس کی دردمندی کے لئے کتنا مضطرب تھا۔

ایک ضروری تنبیہ

ماخذِ حدیث میں ہر جگہ اصول کی مراجعت نہیں کی گئی بلکہ کتبِ حدیث کے اعتماد پر
نقل در نقل پر کفایت کرلی گئی ہے۔ ہرچند کہ یہ ایک عیب ہی مگر جو عیب کہ تصانیف کا
جزءِ لاینفک بن چکا ہے وہ غلط العام فصیح کے قاعدہ کے موافق عیب نہیں رہا۔ یہ تنبیہ اس لئے ضروری تھی

کہ بعض مقامات پر جب اصول کی مراجعت کی گئی تو اصل و نقل میں کچھ معمولی سا فرق نظر آیا مثلاً مشکوٰۃ شریف یا "اتاج" میں صحیحین کی ایک روایت دیکھی جب اس کا اصل متن سے مقابلہ کیا تو ایک دو لفظوں کا فرق ملا۔ اس بحث و تحقیق میں پڑنا اس لئے اہم نہ سمجھا گیا کہ اول تو ایک حدیث صحیح بخاری میں ہی کئی کئی جگہ مذکور ہوتی ہے پھر اصحابِ نسخ کے لحاظ سے خود بخاری میں بھی الفاظ کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ فن حدیث کے لحاظ سے اگرچہ اس کو بہت اہمیت ہے مگر ہمارے موضوع کے لحاظ سے شاید اس کا فائدہ اتنا نہ ہو پھر اس کے لئے جتنی مدت درکار ہے وہ اہلِ علم ہی جان سکتے ہیں۔ ایک علمی تحقیق کے پیچھے ارشاد و تبلیغ کے اہم مقصد کو تاخیر میں ڈال دینا مناسب نہ تھا۔ ادھر اِن کتب پر اعتماد کر لینا کچھ ناموزوں بھی نہیں۔ آخر صاحبِ مشکوٰۃ کو مصابیح جیسی کتاب کے لفظی اختلافات پر کہیں کہیں تنبیہ کرنا پڑی ہے اس کے باوجود اصل کتاب کا وزن کچھ کم نہیں ہوا بلکہ اس کو معمولی اختلاف سمجھ کر مختلف محامل پر محمول کر لیا گیا ہے۔

معذرت تمام خامیوں کے باوجود وقت کی تنگی قدم قدم پر میرے خیالات کو حسب دلخواہ عملی جامہ پہنانے میں مانع رہی۔ ایک طرف میری ایک سالہ خدمت رائیگاں جا چکی تھی دوسری طرف ندوۃ المصنفین اسی سال اس کتاب کے پیش کرنے کا اعلان کر چکا تھا اس لئے کام کی رفتار تیز رکھنی پڑی، دن بھر میں جتنا مسودہ تیار ہو جاتا کاتب کے حوالہ کر دیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں عنوانات و احادیث کی تلاش کے ساتھ تمام گذشتہ عنوانات کا استحضار رہنا مشکل تھا۔ اس لئے عنوانات میں جتنا حسن ترتیب قائم رہنا چاہئے تھا قائم نہیں رہ سکا۔ بسا اوقات کسی مضمون کے متعلق کوئی مفید حدیث خیال میں آئی لیکن اس کا اصل موقعہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اس لئے دوسرے باب میں کسی دوسرے عنوان کے تحت میں اس کو درج کرنا پڑا مثلاً جس حدیث پر الاستشفاع بالرسول کا باب قائم کیا گیا ہے اس کا اصل محل عظمتِ باری کا باب تھا لیکن اس وقت اس حدیث کی طرف ذہن منتقل نہیں ہو سکا بدرجہ مجبوری اس کو رسالت کے باب میں ایک دوسرے عنوان سے درج کیا گیا اسی طرح ہر ہر قدم پر مختلف تصنیفی مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا ہے جن کی وجہ سے ندوۃ المصنفین کے قائم کئے ہوئے تخیل کا صحیح خاکہ پیش نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اس عجلت میں اس خدمت کا جو نقشِ اول آپ کے سامنے آرہا ہے وہ کتاب کے افادے اور مولف کی کاوش کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

آخر میں بادب گذارش ہے کہ جو دماغ فلسفہ و سائنس کے دقیق سے دقیق مسائل حل کرنے سے نہیں گھبراتے وہ احادیثِ نبویہ کے اس ذخیرہ کو دیکھ کر پہلے سے پہلے ہی گھبرا نہ جائیں بلکہ اس کو دیکھیں اور پھر دیکھیں اس پر بھی اگر کچھ مشکل باقی رہ جائے تو اس میں کوتاہیِ مولف کے ساتھ اس فن کی اجنبیت اور اپنے مذاقِ طبیعت کے اختلاف کا دخل بھی تصور فرمائیں اگر ابتداً کچھ تلخی برداشت کر لی گئی اور آزردہ ہو کر

کتاب کو چھوڑا نہیں گیا تو انشاءاللہ تعالیٰ اتنی مناسبت پیدا ہو جائے گی کہ پھر بہ تکلف چھوڑنا بھی چاہیں تو چھوڑ نہ سکیں گے۔

ارباب علم سے استدعا ہے کہ وہ اپنی منصفانہ علمی تنقید سے مطلع فرمائیں تاکہ طبع ثانی میں اس کا لحاظ رکھا جائے۔ اللهم تقبل منا انك أنت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم

آمین

محمد بدر عالم عفا اللہ عنہ

حدیث افتراقِ امّت

اور

اس کی اسناد پر ایک نظر

امام ترمذیؒ نے حدیث افتراقِ امت روایت کرنے والوں میں چار صحابہؓ کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرؓ کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے اور حضرت سعدؓ اور عوف بن مالکؓ کا صرف حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے پھر اول الذکر صحابی کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا ہے اور ثانی الذکر کی حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

ابوہریرہؓ کی حدیث

عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال تفرقت الیهود علی احدی وسبعین او ثنتین وسبعین فرقة والنصاری مثل ذلك وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقة (ترمذی)

ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں منقسم ہوئے اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائیگی[1]

حافظ سخاوی نے بھی مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر کوئی اختلاف رائے ظاہر نہیں کیا۔ امام شاطبیؒ نے کتاب الاعتصام میں ابوہریرہؓ کی روایت پر کئی جگہ صحت کا حکم لگایا ہے۔[2]

حدیث افتراق کے پندرہ راویوں کے نام

شارح سفر السعادۃ نے امام ترمذی کے پیش کردہ ناموں پر گیارہ صحابہ کا اور اضافہ کیا ہے۔ انسؓ، جابرؓ، ابوامامہؓ، ابن مسعودؓ، علیؓ، عمرو بن عوفؓ، عویمر ابوالدرداءؓ، ابومعاویہؓ، ابن عمرؓ[3]

---

[1] حاکم کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی ہے وہ ضعیف ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸)

[2] دیکھو ج ۲ ص ۱۹۲ و ۱۴۰ و ۲۰۹ - اور الموافقات ج ۴ ص ۱۰۷۔ حاکم نے حدیث مذکور کو دو جگہ روایت کیا ہے۔ (مستدرک ج ۱ ص ۶ و ۱۲۸) ذہبی فرماتے ہیں علی شرط مسلم یعنی یہ حدیث مسلم کی شرط پر ہے۔

[3] مشکوٰۃ شریف میں بحوالہ مسند احمد و ابوداؤد صحابی کا نام معاویہ ذکر کیا ہے۔ اگر کتب حدیث میں کہیں ابومعاویہ کی روایت مل جائے تو خیر ورنہ بظاہر یہاں راوی معاویہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ کنز العمال میں بھی راوی کا نام معاویہ ہے بحوالہ مسند احمد و طبرانی، مستدرک (ج ۱ ص ۵۴) مستدرک میں بھی معاویہ ہے۔ (دیکھو ج ۱ ص ۱۲۸)۔

واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔ اس طرح اس حدیث کے رُواۃ کی تعداد ۱۵ تک پہنچ جاتی ہے جن میں ابوہریرہؓ کی روایت کے متعلق جہاں تک ہمیں معلوم ہے کسی نے کوئی قابلِ ذکر ردو قدح نہیں کی۔ بعض دوسرے صحابہ کی روایات میں البتہ کچھ کلام کیا گیا ہے جو مختصراً درج ذیل ہے۔

حضرت انسؓ کی روایت شیخ جلال الدین سیوطی حضرت انسؓ کی روایت عقیلی اور دارقطنی کے حوالہ سے پیش کر کے تحریر فرماتے ہیں والحدیث المعروف "واحدۃ فی الجنۃ وھی الجماعۃ (یعنی معروف حدیث کے الفاظ یہ ہیں "ایک فرقہ جنت میں جائے گا اور وہ مسلمانوں کی جماعت ہوگی) پھر بطریق ابن عدی نقل کر کے کہتے ہیں والمحفوظ فی المتن (یعنی اس متن کے جو الفاظ محفوظ ہیں یہ ہیں) "تفترق امتی عن ثلاث وسبعین فرقۃ کلھا فی النار الا واحدۃ" [۱]

اہلِ علم جانتے ہیں کہ معروف و محفوظ مُنکر و شاذ کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور شاذ و مُنکر میں صرف راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کا فرق ہے گویا پہلے الفاظ کے خلاف روایت کرنے والے راوی ثقہ نہیں ہیں اور دوسرے متن کے خلاف راوی اگرچہ ثقہ ہیں مگر ان کے الفاظ میں شذوذ ہے۔ بہر حال معروف و محفوظ لکھ کر حافظ سیوطیؒ نے حضرت انسؓ کی روایت کے متعلق اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔

حافظ نور الدین ہیثمی نے اس مقام پر قدرے بسوط کلام کیا ہے اور اس حدیث کے طُرق سنن مشہورہ کے علاوہ مسند ابو یعلیٰ، مسند بزار اور طبرانی سے پیش فرما کر ہر صحابی کی روایت پر تنقید کی ہے۔ چنانچہ حضرت انسؓ کی روایت کو بطریق مسند ابو یعلیٰ ایک طویل سیاق کے ساتھ نقل فرما کر لکھتے ہیں۔

ویزید الرقاشی ضعفہ الجمہور وفیہ توثیق لین وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح [۲]	اس میں ایک راوی یزید رقاشی ہیں جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے اور ہلکے درجہ پر اس کی توثیق بھی کی گئی ہے بقیہ تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔

ایک جگہ اسی حدیث کا دوسرا طریقہ پیش کر کے اس پر حسب ذیل کلام کرتے ہیں۔

رواہ ابو یعلیٰ وفیہ ابو معشر نجیح وفیہ ضعف [۳]	اس حدیث کو ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی ابو معشر نجیح ہے اس میں قدرے ضعف ہے۔

حضرت ابو امامہؓ کی روایت حضرت ابو امامہؓ کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں۔

رواہ ابن ماجہ والترمذی باختصار ورواہ الطبرانی ورجالہ ثقات [۴]	اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے مختصراً روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے اور اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

ساتویں جلد میں اتنی تفصیل اور مذکور ہے۔

---

[۱] اللآلی ص ۲۲۸، ۲۲۹ [۲] مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۲۶۔ [۳] ایضاً ج ۷، ص ۲۵۸۔ [۴] ایضاً ج ۶ ص ۲۳۴۔

رواہ الطبرانی فی الاوسط والکبیر بنحوہ وفیہ ابوغالب[۱] وثقہ یحیی بن معین وغیرہ وبقیۃ رجال الاوسط ثقات وکذلک احدی اسناد الکبیر[۲]

اس حدیث کو طبرانی نے معجم اوسط میں روایت کیا ہے اور معجم کبیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ کے ساتھ روایت کیا ہے اس میں ایک راوی ابوغالب ہے۔ یحیی بن معین وغیرہ نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے بقیہ معجم اوسط کے سب راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر کی ایک اسناد کا حال ہے۔

حضرت سعد بن وقاصؓ کی روایت حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت مسند بزار سے نقل کر کے لکھتے ہیں۔

رواہ البزار وفیہ موسی بن عبیدۃ الربذی وھو ضعیف[۳]

مسند بزار میں اس کو روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی موسی بن عبیدۃ ربذی ضعیف ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت پھر اسی جلد میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے متعلق حسب ذیل ارشاد ہے۔

رواہ ابو یعلی وفیہ لیث بن ابی سلیم وھو مدلس وبقیۃ رجالہ الثقات[۴]

اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اس میں ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہے[۵] جو مدلس ہے۔ بقیہ راوی ثقہ ہیں۔

حضرت ابو الدرداء و واثلہ کی روایت پھر حضرت ابو الدرداء، ابو امامہ، واثلہ اور انس کی روایات کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

رواہ الطبرانی وفیہ کثیر بن مروان وھو ضعیف جداً[۶]

اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی کثیر بن مروان ہے اور وہ بہت ضعیف ہے۔

حضرت عمرو بن عوف کی روایت اس کے بعد حضرت عمرو بن عوف کی روایت بحوالہ طبرانی نقل کر کے اپنی رائے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

رواہ الطبرانی وفیہ کثیر بن عبد اللہ وھو ضعیف وقد حسن الترمذی لہ حدیثا وبقیۃ رجالہ ثقات۔[۷]

اس میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے ترمذی نے اس کی ایک حدیث کی تحسین بھی کی ہے بقیہ تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہیں۔

---

۱ ابوغالب کے نام میں اختلاف ہے، کوئی حزور کوئی سعید بن حزور اور کوئی نافع کہتا ہے۔ تہذیب التہذیب کی بارہویں جلد میں حافظ ابن حجرؒ نے ان کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ بعض کتب میں ابوغالب کی بجائے ابن ابی غالب لکھا گیا ہے ہمارے نزدیک اس حدیث کے راوی ابوغالب ہی ہیں اسی طرح کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۳۳ میں حزور کی بجائے ترور رار کے ساتھ لکھا ہے وہ بھی کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ ۲ و ۳ و ۴ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۵۹ -

۵ یہ راوی مختلف فیہ ہے بایں ہمہ اس کو ثقہ بھی کہا گیا ہے۔

۶ مجمع الزوائد ج ۷ ص ۲۵۹۔ ۷ ایضاً ج ۷ ص ۲۶۰ و مستدرک ج ۱ ص ۱۳۹۔

بلاشبہ کثیر بن عبداللہ کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے اور اسی وجہ سے امام ترمذیؒ کی تحسین کو بھی قابلِ اعتراض سمجھا گیا ہے مگر اہلِ علم و تجربہ جانتے ہیں کہ ترمذی اگر ضعیف راویوں کی روایات کی تحسین کرتے ہیں تو بیشتر ایسی جگہ کرتے ہیں جہاں تعامل یا خارجی دلائل سے روایت کی قوت ثابت ہو جاتی ہو صرف اس ضعیف طریقہ ہی پر ان کی نظر نہیں ہوتی۔ بنابریں اگر ابوہریرہؓ کی روایت کی صحت کے بعد اس طریقہ کی بھی تحسین کر دی جائے تو گنجائش نکل سکتی ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ کی روایت | باب افتراقِ امت کے خاتمہ پر حافظ نورالدین نے حضرت ابنِ مسعودؓ کی حدیث تحریر فرما کر لکھا ہے۔

رواہ الطبرانی باسنادین ورجال احدھما رجال الصحیح غیر بکیر بن معروف وثقہ احمد وغیرہ وفیہ ضعف۔

اس حدیث کو طبرانی نے دو سندوں سے روایت کیا ہے جس میں ایک سند کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی ہیں سوائے بکیر بن معروف کے کہ وہ صحیح کا راوی نہیں ہے مگر امام احمد وغیرہ نے اس کی توثیق کی ہے اور اس میں کچھ ضعف ہے۔

حضرت عوف بن مالکؓ کی روایت | عوف بن مالکؓ کی روایت مستدرک حاکم میں موجود ہے اور اس کے متعلق حاکم کے الفاظ یہ ہیں۔

ھذا حدیث صحیح علی شرط الشیخین[1] یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

حاکم کی تصحیح کو عام طور علماء بنظرِ اعتبار نہیں دیکھتے مگر یہاں حافظ ذہبی نے بھی سکوت کیا ہے اور ان کے خلاف کوئی نکتہ چینی نہیں کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہبی کو بھی ان سے اتفاق ہے ورنہ وہ حسبِ عادت یہاں بھی اپنا اختلافِ رائے ظاہر کرتے۔

حضرت علیؓ کی حدیث | علامہ شاطبیؒ نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ "اضمن عھدۃ صحتہ[2]" میں اسکی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا" مگر کوئی خاص جرح بھی نہیں فرمائی۔

حدیث معاویہؓ | اور ابوہریرہؓ کی حدیث نقل کر کے حاکم فرماتے ہیں۔

ھذہ اسانید تقام بھا الحجۃ فی تصحیح ھذا الحدیث[3] یہ اسانید ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے اتنی بات کو ذہبیؒ نے بھی تسلیم کیا ہے۔

پندرہ صحابہ میں سے تیرہ صحابہ کی احادیث پر علماء کے یہ خیالات ہیں ان میں ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرو، انس، ابوامامہ، عمرو بن عوف، معاویہ، ابن عمر، عوف بن مالک کی روایات صحیح یا حسن کے درجہ پر آ سکتی

---

[1] مستدرک ج ۴ ص ۴۳۰ [2] الاعتصام ج ۲ ص ۲۱۱ [3] مستدرک ج ۱ ص ۱۲۸۔

ہیں۔ بقیہ روایات کی اسانید اگرچہ ضعیف ہوں مگر تعدد طُرق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھی قطعاً نظر انداز کرنے کے لائق نہیں۔ اب اس مجموعۂ روایات کو سامنے رکھکر انصاف کیجئے کہ جو حدیث اتنے صحابہ سے مختلف صحیح اور حسن طریقوں سے مروی ہو کیا محض چند شبہات کی وجہ سے اس سے صرف نظر کر لینا درست ہوگا۔

کسی حدیث پر اجمالی حکم اس کے مجموعۂ طرق پر حکم نہیں ہے

مذکورہ بالا بیان سے مختصراً یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک ایک حدیث کتنے کتنے صحابہ سے روایت کی گئی ہے۔ پھر ایک ایک صحابی کی حدیث کے کتنے کتنے طریقے ہیں۔ اس لئے کسی حدیث کے متعلق ضعف یا صحت کا حکم دیکھکر پہلے یہ تحقیق کر لینا چاہئے کہ یہ حکم اس کے تمام طریقوں پر حاوی ہے یا کسی خاص صحابی کی حدیث یا اس کے کسی خاص طریقے سے متعلق ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک ایک حدیث کے تمام طریقے ہر محدث کے پیش نظر ہوں۔

امام ترمذی جیسا جلیل القدر امام حدیث یہاں صرف چار صحابہ کا پتہ دیتا ہے حالانکہ ان کے علاوہ گیارہ صحابہ اور بھی ہیں جو اس کو روایت کرنے والے ہیں۔ پس اگر کوئی محدث کسی حدیث پر کوئی اجمالی حکم لگاتا ہے تو یہ صرف اس کے علمی استحضار کے لحاظ سے ہے۔ اب اگر خارجی ذرائع اور تحقیقات سے کسی خاص طریقہ کا ضعف و صحت ثابت ہو جائے تو یہ اس کے مبہم حکم کے ہرگز معارض نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ اس کے علم میں یہ طرق نہ ہوں ہاں اگر ان طُرق کے علم کے بعد بھی اس کی رائے وہی رہتی ہے تو اب اس کو مخالف یا موافق کہنا درست ہوگا اس کے بعد اختلاف رائے کا مرحلہ پھر زیر بحث رہے گا۔ راویوں اور روایات کے سلسلہ میں تضعیف و توثیق کا معاملہ اہل علم کے نزدیک دن رات کی بات ہے۔ ایک ناواقف ایک محدث کی رائے نقل کر کے اسے سارے طریقوں پر حاوی بنا دیتا ہے اور اس ایک رائے کو سارے محدثین کی رائے سمجھ بیٹھتا ہے اور واقفِ حال کو تحقیق کے بعد غور کرنا پڑتا ہے کہ دلائل کا پلّہ کس طرف بھاری ہے۔ یہی حدیث جس کے متعلق آپ نے یہ تفصیل پڑھی۔ اب آیئے اس کے مخالف آرار کا حال دیکھئے علامہ مجدالدین فیروز آبادی سفر السعادۃ کے خاتمہ پر اس حدیث کے متعلق لکھتے ہیں۔

لم یثبت فیہ شیٔ — اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوئی۔

احادیث پر تنقید کی تین تعبیرات اور ان کا فرق

ان الفاظ کو دیکھکر بعض لوگ تو یہاں تک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ مصنف کے نزدیک یہ حدیث گویا موضوع ہے۔ کاش ان حضرات نے اگر اس کتاب کی ذرا ورق گردانی کی ہوتی تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ مصنف نے احادیث پر حکم لگانے کے لئے مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں کہیں "باطل موضوع" اور کہیں "لم یصح فیہ حدیث" اور کہیں "لم یثبت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ان تینوں الفاظ میں بڑا فرق ہے پہلی تعبیر کا مطلب یہ ہے کہ اس مضمون کو حدیث رسول کہنا ہی

غلط ہے اور دوسرا لفظ صرف صحت کی نفی کرتا ہے خواہ کسی درجے میں حدیث ثابت ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قنوت، جہر بسم اللہ اور وضوء بالنبیذ کی احادیث پر بھی مصنف نے یہی حکم لگایا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ سب حدیثیں بے اصل ہیں۔ اسی طرح "لم یثبت" کا لفظ ضعیف طرق کی نفی نہیں کرتا۔ اگر ان تعبیرات کے فروق کی رعایت کی جائے تو پھر بہت سے مواضع پر مصنف کے کلام سے اعتراض اٹھ جائے گا[1]

[1] مولانا عبدالحی صاحب نے رسالہ الرفع والتکمیل میں ان فروق کی پوری تشریح فرمادی ہے ملاحظہ ہو۔

کثیرا ما یقولون لا یصح او لا یثبت ھذا الحدیث و یظن منہ من لا علم لہ انہ موضوع او ضعیف وھو مبنی علی جھلہ بمصطلحاتھم وعدم وقوفہ علی مصرحاتھم۔ فقد قال علی القاری فی تذکرۃ الموضوعات لا یلزم من عدم الثبوت وجود الوضع انتھی۔ وقال الحافظ ابن حجر فی تخریج احادیث الاذکار المسمی بنتائج الافکار ثبت عن احمد بن حنبل انہ قال لا اعلم فی التسمیۃ فی الوضوء حدیثا ثابتا قلت لا یلزم من نفی العلم ثبوت العدم وعلی التنزل لا یلزم من نفی الثبوت ثبوت الضعف لاحتمال ان یراد بالثبوت الصحۃ فلا ینتفی الحسن وعلی التنزل لا یلزم من نفی الثبوت عن کل فرد نفیہ عن المجموع۔ وقال نور الدین السمھودی قلت لا یلزم من قول احمد فی حدیث التوسعۃ علی العیال یوم عاشوراء لا یصح ان یکون باطلا فقد یکون غیر صحیح وھو صالح للاحتجاج بہ اذ الحسن رتبۃ بین الصحیح والضعیف۔ اھ۔ وقال الزرکشی فی نکتہ علی ابن الصلاح۔ بین قولنا موضوع وبین قولنا لا یصح بون کثیر فان الاول اثبات الکذب و الاختلاق والثانی اخبار عن عدم الثبوت ولا یلزم منہ اثبات العدم وھذا یجئ فی کل حدیث قال فیہ ابن الجوزی لا یصح ونحوہ اھ۔ وقال علی القاری مع ان قول السخاوی لا یصح لا ینافی الضعف والحسن اھ۔ قال الزرقانی ونقل القسطلانی عن ابن رجب ان ابن حبان صححہ

بسا اوقات محدثین لا یصح یا لا یثبت کا لفظ فرماتے ہیں۔ ناواقف اس کا مطلب یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک موضوع یا ضعیف ہے یہ خیال ان کی اصطلاح سے جہالت اور ان کی تصریحات سے ناواقفی کا نتیجہ ہے۔ ملا علی قاری تذکرۃ الموضوعات میں فرماتے ہیں کہ عدم ثبوت کہنے سے اس کا موضوع ہو جانا ضروری نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نتائج الافکار میں فرماتے ہیں کہ امام احمد فرماتے تھے کہ میرے نزدیک وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کے متعلق کوئی حدیث ثابت نہیں، میں کہتا ہوں کہ پہلے تو کسی شخص کے نہ جاننے سے اس چیز کا فی الواقع نہ ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر نفی ثبوت سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے تو ہر ہر فرد کے نفی ثبوت سے مجموعہ کا ثبوت نہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے۔ نور الدین سمہوری فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کے عاشوراء کی حدیث کے متعلق (لا یصح) فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ باطل ہو، ہو سکتا ہے کہ صحیح تو نہ ہو مگر قابلِ استدلال ہو کیونکہ صحیح اور ضعیف کے درمیان ایک مرتبہ حسن کا بھی ہے۔ زرکشی نکت ابن صلاح میں فرماتے ہیں کہ ہمارے (لا یصح) اور (موضوع) کہنے میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ موضوع کہنے کا مطلب یہ ہے کہ راوی کا جھوٹ اور وضع ثابت ہو گیا ہے اور لا یصح میں صرف عدم ثبوت کی خبر ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس کا عدم ثابت مان لیا جائے یہی بات ان تمام حدیثوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے جن کے بارے میں ابن جوزی نے لا یصح یا اسی طرح کا کوئی اور حکم لگا دیا ہے۔ اھ۔ زرقانی کہتے ہیں کہ قسطلانی نے حافظ ابن رجب سے یہ نقل کیا ہے کہ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

علاوہ ازیں شارح سفر السعادۃ لکھتے ہیں کہ علامہ مجد الدین کا یہ حکم صرف ان الفاظ پر ہے جو یہاں انھوں نے نقل کئے ہیں یعنی ۷۲ فرقوں میں امت کا افتراق۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ لفظ تمام طریقوں کے خلاف ہے۔ حافظ سیوطیؒ نے حضرت انسؓ کی روایت کے صرف ایک طریقہ میں یہ لفظ پیش کیا ہے بقیہ سب طرق و روایات میں ۷۳ کا لفظ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ سفر السعادۃ کے بعض نسخوں میں دو کی بجائے تین کا لفظ بھی موجود ہے اس کے متعلق شارح فرماتے ہیں "اگر ایں چنیں است محل سخن است" اگر ۷۳ کی روایت کے متعلق بھی مصنف کی یہی رائے ہے تو اس میں کلام ہے۔

ابن حزم بھی زیر عنوان "الکلام فیمن یکفر ومن لا یکفر" اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ھذان حدیثان لا یصحان اصلاً عن طریق الاسناد[1] یہ دونوں حدیثیں اسنادی لحاظ سے بالکل صحیح نہیں۔

یہاں بھی صحت کی نفی ہے اب ان دونوں حضرات کا یہ مجمل حکم دیکھئے اور اس کے مقابلہ میں وہ ساری تفصیلات سامنے رکھئے جہاں ایک ایک روایت کی پوری چھان بین کی گئی ہے۔

ابن حزم کی رائے فیصلہ کن نہیں ہے

ہمیں معلوم نہیں ہے کہ ان حفاظِ حدیث کے سامنے وہ سب طرق موجود بھی ہیں یا نہیں اور اگر موجود بھی ہیں تو کیا اصولِ حدیث کا یہ کوئی ضابطہ ہے کہ جس طرف ابنِ حزم ہو جائیں بس راہ صواب اسی میں منحصر ہو جائے گی اگر ایک طرف حافظ ابن جوزی کا تشدد امت میں ضرب المثل ہے تو اس کے ساتھ ہی ابن حزم کی زبان کا سیفِ حجاج[2] ہونا بھی مشہور ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) فیہ رد علی قول ابن دحیہ لم یصح فی لیلۃ نصف شعبان شئی الا ان یرید نفی الصحۃ الاصطلاحیۃ فان حدیث معاذ ھذا حسن لا صحیح اھ

ابنِ حبان نے شب نصف شعبان کی فضیلت کی حدیث کو صحیح کہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متعلق ابنِ دحیہ کا لم یصح کہنا غلط ہے مگر یہ کہ اس کے کلام میں اصطلاحی صحت کی نفی مراد لی جائے کیونکہ معاذ کی یہ حدیث اصطلاحی طور پر یقیناً صحیح نہیں ہے گو حسن ہو۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [1] کتاب الفصل ج ۳ ص ۱۳۸۔

[2] اس کی وجہ حافظ ابن حزم نے اپنی تصنیف مداواۃ النفوس میں خود تحریر فرمائی ہے۔

ولقد اصابتنی علۃ شدیدۃ ولدت علی ربوا فی الطحال شدیدا فولد ذلک علی ومن الضجر وضیق الخلق وقلۃ الصبر والنزق امرا حاسبت نفسی فیہ فانکرت تبدل خلقی واشتد عجبی من مفارقتی لطبعی۔

(توجیہ النظر ص ۱۳ تحت استدراک فی الفائدۃ السابعۃ)

میں ایک شدید بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے میری تلی بہت بڑھ گئی تھی اس لئے میرے مزاج میں تنگی، تیزی و بداخلاقی جلد بازی پیدا ہو گئی ہے جب میں اپنی پہلی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے کہ میرے عادات و اخلاق کس قدر تبدیل ہو گئے ہیں اور میں اپنی اصلی طبیعت سے کتنا دور ہو گیا ہوں۔

بہرحال حدیث کا معاملہ ماد شا کے تابع نہیں ہے۔ حدیث کے اسانید اب بھی موجود ہیں۔ ان مبہم اور مجمل کلمات کو چھوڑ کر اس کے رجال پر تفصیلاً نظر کر لینا چاہئے اس کے بعد بھی اگر رجحان ابن حزم اور علامہ مجدالدین کے ساتھ رہتا ہے تو امر دیگر ہے۔ پھر یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ حافظ ابن حزم اپنی وسعتِ نظر کے باوجود خود امام ترمذی اور ان کی کتاب الجامع ہی ناواقف ہیں اس لئے ان کا لا یصح کہنا اور بھی بے اثر ہو جاتا ہے۔[1]

حدیث کی صحت پر معنوی قرائن

حنیفیۃ اور یہودیۃ ونصرانیۃ کا تقابل

قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی دنیا میں دینِ حنیف کے حریف صرف دو مذہب ہیں یہودیۃ اور نصرانیۃ عہدِ نبوۃ میں بھی حریفانہ جنگ ان ہی دو کے درمیان نظر آتی ہے اور احادیث صحیح بھی ان ہی دو کے درمیان مستقبل میں کشمکش کا پتہ دیتی ہیں۔ آیات ذیل کو بغور پڑھئے اور اس جذبہ کا اندازہ کر لیجئے۔

قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ۔ — کہتے ہیں کہ یہودی بن جاؤ یا نصرانی بن جاؤ تو راہ یاب ہوگے آپ اُن سے کہدیجئے بلکہ میں حضرت ابراہیمؑ کی ملت کا متبع ہوں جو ایک طرف ہو جانے والا تھا۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۔ — حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ ایک طرف ہو کر خدا کے فرمانبردار ہی تھے۔

غیر المغضوب علیہم میں اتباع یہود ونصاریٰ کی طرف ایک لطیف اشارہ

غالباً اسی لئے قرآن کریم نے صراطِ مستقیم کی تفسیر کرتے ہوئے اثباتی پہلو میں منعم علیہم کا اور سلبی پہلو میں مغضوب علیہم اور ضالین ہی کا ذکر کیا ہے اور اس اہتمام سے کیا ہے گویا جب تک یہ سلبی پہلو ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک صرف صراط الذین انعمت علیھم اس کے پورے مفہوم کو ادا ہی نہیں کرتا پھر اس دعاء کے پنجوقتہ تعلیم کرنے

---

[1] حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ابن حزم اپنی جلالتِ قدر کے باوجود امام ترمذی جیسے شخص سے بالکل ناآشنا ہیں حتی کہ جب ان کے سامنے امام ترمذیؒ کا تذکرہ ہوا تو تعجب سے فرمایا "ومن محمد بن عیسی بن سورۃ ؟" یہ محمد بن عیسیٰ کون شخص ہیں۔ (دیکھو الباعث الحثیث الی معرفت علوم الحدیث)

حافظ ابن حجرؒ امام ترمذی کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ واما ابو محمد بن حزم فانہ نادی علی نفسہ بعدم الاطلاع فقال فی کتاب الفرائض من الایصال محمد بن عیسی بن سورۃ مجھول۔ ابن حزم کو اس بات کا خود اقرار ہے کہ وہ محمد بن عیسیٰ (ترمذی) سے واقف نہیں ہیں چنانچہ ان کو مجہول لکھتے ہیں۔ (تہذیب التہذیب)

حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں۔ ترمذی کے بارے میں ابن حزم کا قول کہ وہ مجہول شخص ہیں کچھ قابلِ التفات نہیں ہے کیونکہ ان کو نہ امام ترمذی کی کتاب جامع سے واقفیت ہے اور نہ ان کی کتاب العلل کا علم ہے۔ (میزان الاعتدال)

میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ملتِ حنفیہ پر سب سے زیادہ خطرہ ہے تو شاید ان مغضوب علیہم اور ضالین کی اتباع کا ہے جس کا دوسرا نام یہودیۃ ونصرانیۃ ہے۔

مشرکین و یہود کے تعلقات

کتبِ سیرت کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیۃ ونصرانیۃ بھی گو آسمانی دین تھے مگر مشرکین کے ساتھ ان کے برادرانہ تعلقات قائم تھے جونہی اسلام نے دنیا میں قدم رکھا سب سے پہلے مشرکین کے ساتھ اس کے مدِمقابل یہی یہودی و نصرانی تھے حالانکہ دینِ سماوی میں اشتراک کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو دینِ حنیفی کے ساتھ پوری ہمدردی ہوتی اور بجائے مشرکین کے ان کا رُخ اسلام کی طرف ہوجاتا لیکن جیسے جیسے اسلام ترقی کرتا رہا اسی قدر یہودیۃ ونصرانیۃ بڑھ بڑھ کر اسی کے مقابلہ پر آتی رہی یہاں تک کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو مشرکینِ عرب نے اسلام کے سامنے سپر ڈالدی اور ان کی طرف سے شریعتِ مطہرہ کو اتنا اطمینان میسر ہوا کہ صاف لفظوں میں یہ اعلان کردیا گیا۔

ان الشیطان قد أیس ان یعبدہ المصلون فی جزیرۃ العرب۔ (مشکوٰۃ شریف)

شیطان اب اس بات سے ناامید ہو چکا ہے کہ نمازی مسلمان پھر کبھی جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے۔

پیغمبرِ اسلام کا یہود و نصاریٰ کی طرف سے خطرہ کا آخری الارم

لیکن یہودیۃ ونصرانیۃ کا عَلَمِ جنگ اسلام کے بالمقابل برابر لہراتا رہا اور کسی وقت بھی اسلام کو ان کی دسیسہ کاریوں سے اطمینان میسر نہ ہوا حتیٰ کہ صاحبِ شریعت کے آخری لمحاتِ حیات کی وصیتوں میں ایک اہم بالشان وصیت یہ تھی۔

اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب

یہود و نصاریٰ کو جزیرۂ عرب کے چپے چپے سے باہر نکالدو

اسی حریفانہ کشمکش کا نتیجہ تھا کہ جب حنیفیۃ کا زمین پر اقتدار ہوا تو یہودیۃ ونصرانیۃ مغلوب ہوگئیں اور جب کبھی یہودیۃ ونصرانیۃ کا غلبہ ہوا تو حنیفیۃ کو مغلوب ہوجانا پڑا۔

یہود و نصاریٰ سے جزیہ قبول کرنے کی وجہ

اس سلسلہ میں واضح رہنا چاہیے کہ یہودیۃ ونصرانیۃ کے مسخ ہوجانے کے باوجود اسلام نے محض دینِ سماوی ہونے کے باعث ان کی بڑی رعایت رکھی ہے۔

موافقت اہلِ کتاب کی عام سنت فتحِ مکہ تک تھی

چنانچہ اسلام فتحِ مکہ سے قبل تک جن امور میں جدید ہدایات نازل نہ ہوتیں بہ نسبت کفار کے ان کی موافقت کو ترجیح دیتا رہا لیکن جب اس سلوک کے بعد بھی ان کا دل نہ پسیجا تو یہ ثابت ہوگیا کہ اب ان کے سینہ پُرکینہ سے اسلام کی عداوت نکلنے والی نہیں ہے اس لئے مخالفت کا حکم دیدیا گیا اور آئندہ ان تمام مواقع پر جہاں جہاں سے حنیفیۃ کو یہودیۃ ونصرانیۃ سے خطرہ ہوسکتا تھا امت کو خبردار کردیا گیا۔

مشترکہ حدود کی نگرانی میں اسلام کی خیر مضمر ہے

روزہ، نماز، شکل و شباہت، دعاء و سلام میں غرض جہاں بھی

اسلامی حدود اُن کے حدود سے ملتے نظر آتے تھے ملتِ حنیفیہ کے حلقہ بگوشوں کو تنبیہ کردی گئی کہ اپنے حدود کی نگرانی رکھیں۔ اس کے باوجود صاحبِ نبوۃ کی دوربین نظروں نے تاڑ لیا تھا کہ اس حریف کا ایک دن پھر غلبہ ہوگا اور پھر پیروانِ ملتِ حنیفی یہودیت و نصرانیت کے پیچھے چل پڑیں گے۔ اسی عہد نامسعود کا نقشہ صحیح بخاری کی اس حدیث میں کھینچا گیا ہے۔

اس امت میں یہود و نصاریٰ کی اتباع کی پیشگوئی

قال لتتبعن سنن الذین من قبلکم شبراً بشبر و ذراعاً بذراع حتی لو دخلوا فی جحر ضب لاتبعتموہ قلنا یا رسول اللہ الیھود والنصاریٰ قال فمن۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ضرور گذشتہ لوگوں کے قدم بقدم چل کر رہوگے حتیٰ کہ اگر ان میں کوئی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوا ہوگا تو تم بھی ضرور داخل ہوگے ہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں آپ نے فرمایا کہ پھر اور کون۔

دوسرے الفاظ میں اس مجنونانہ اتباع کی غایت یہاں تک بیان کی گئی ہے کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا ہوگا تو تم میں بھی ایسے افراد ہونگے جو یہ روسیاہی کرکے رہیں گے۔

بعض نومسلموں کو مشرکین کی نقالی کی تمنا اور آپ کی سرزنش

جب تک اسلام کا ضعیف دور رہا بعض نومسلموں کے قلوب میں ہر معمولی اور غیر معمولی امور میں یہی جذبۂ اتباع اُبھرتا رہا۔

"ابوواقد لیثی فرماتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ خیبر کی سمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ روانہ ہوئے اُس وقت ہم نومسلم تھے وہاں مشرکین نے ایک درخت اپنے ہتھیار لٹکانے کے لئے مقرر کر رکھا تھا ہم نے اُسے دیکھکر کہا یا رسول اللہ ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی درخت ہتھیار لٹکانے کے لئے مقرر کردیجئے آپ نے تعجباً تکبیر کہی اور فرمایا یہ تو وہی بات ہوئی جیسا بنی اسرائیل نے (سمندر عبور کرنے کے بعد کچھ بت پرستوں کو پوجا کرتے دیکھکر کہدیا تھا [illegible] جیسا خدا ان کا ہے ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی خدا بنا دیجئے۔ تم ضرور یہود و نصاریٰ کی نقالی کرکے رہوگے۔"

لیکن جتنی اسلام کو قوت حاصل ہوتی گئی اس کے یہ جذبات فنا ہوتے رہے حتیٰ کہ کچھ دن بعد ہی اب ان کا نقشہ یہ تھا کہ:

"حضرت مقداد بن الاسود جنگ بدر کی تیاری کے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں کہتے ہیں یا رسول اللہ ہم وہ نہیں ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ کہدیں اے موسیٰ جا تو اور تیرا رب لڑ آ۔ ہم تو آپ کے دائیں بائیں آگے اور پیچھے رہ کر آپ کے ساتھ جنگ کریں گے۔" (بخاری شریف)

اب ان دونوں جذبات کا موازنہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہی بات یعنی حرصِ اتباع جو دورِ ضعف

ہیں غیر اختیاری طور پر منہ سے نکل رہی تھی اب انتہائی قابلِ نفرت و عار بن رہی ہے مگر دونوں جگہ نقطۂ تجاذب وہی بنی اسرائیل ہیں۔ اسلامی دورِ انحطاط میں وہی اتباعِ بنی اسرائیل کا جذبہ پھر لوٹ آئے گا۔ اور بنی اسرائیل کی جو مشابہت پہلے انتہائی قابلِ نفرت و حقارت معلوم ہوتی تھی پھر لائقِ رغبت بن جائے گی۔ امتِ محمدیہ کے اسی رجعتِ قہقریہ کو صحیح بخاری کی حدیثِ بالا میں بیان کیا گیا ہے یعنی وہی بات جو آپ کے زمانہ میں قابلِ تعجب تھی آئندہ دور میں ناگزیر طور پر ہونے والی بات ہوگی۔ حتی کہ اگر یہود و نصاریٰ میں کسی نے ماں سے زنا کیا ہوگا تو اس بے حیائی میں بھی یہ امت ان کی اتباع کر کے رہے گی۔

امتِ محمدیہ شغفِ اتباع ہی کی بدولت صفتِ افتراق میں بھی اتباع کرے گی

اس شغفِ اتباع سے یہ مترشح ہو رہا ہے کہ یہ امت جب ہر معقول اور نامعقول بات میں ان کے نقشِ قدم پر چلے گی تو یقیناً ضلالت اور گمراہی کی وہ سب راہیں جو یہود و نصاریٰ نے اختیار کی تھیں یہ بھی اختیار کرے گی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جتنے گمراہ فرقے ان میں نمودار ہوئے تھے اس میں بھی نمودار ہوں گے لیکن افسوس یہ ہے کہ بلند تر جب گرتا ہے تو یہاں بھی فروتر رہتا ہے اس لئے امتِ محمدیہ جب دورِ عروج و کمال میں بلند تر تھی تو اپنے دورِ انحطاط میں اسے فروتر ہی رہنا چاہئے اور اسی لئے وصفِ افتراق میں یہود و نصاریٰ سے آگے آگے نظر آنا چاہئے۔ آخر جو مسندِ اعلیٰ علیین پر جلوہ نما تھا جب ایمان اور عملِ صالح سے محروم ہوا تو اس کا ٹھکانا اسفل السافلین ہی ٹھہرا۔

شدتِ اتباع اور حدیثِ افتراق کا تناسب

غالباً اسی گہری مناسبت کی وجہ سے صحیح بخاری کی اس حدیث کو جامع ترمذی میں حدیثِ افتراق کے لئے بطور مقدمہ ذکر کیا گیا ہے یا بالفاظِ دیگر اس شدید افتراق کو اس مبالغہ آمیز اتباع کا ثمرہ اور نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو باتیں بنی اسرائیل میں ہوئیں وہ ٹھیک ٹھیک سب میری امت میں ہوں گی حتی کہ اگر ان میں سے کسی نے بے محابا اپنی ماں سے زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی کوئی ایسا بدبخت ہوگا جو اس بیحیائی کا ارتکاب کریگا اور بنی اسرائیل بہتّر فرقوں میں بٹے تھے (آخر حدیث تک)

اس سیاق کو پڑھئے اور بغور پڑھئے اور اس عمیق ربط تک پہنچ جائیے جو اس شدید اتباع اور شدید اختلاف کے مابین مستور ہے اگر آپ اس ربط کو پالیں تو یقیناً اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ حدیثِ افتراق درحقیقت صحیح بخاری کی حدیثِ اتباع کا ایک تتمہ تھا جو وہاں رہ گیا تھا وہ یہاں ذکر کر دیا گیا ہے بہرحال اگر ہمارے پاس صرف صحیح بخاری ہی کی یہی ایک حدیث ہوتی تو افتراقِ امت کی اجمالی داستان پڑھنے کے لئے کافی تھی۔ آئندہ اوراق میں اس کے متعلق آیاتِ قرآنیہ کے کچھ اور اشارات بھی آپ کے ملاحظہ سے گذریں گے لیکن اس سے قبل ہم مفہومِ اختلاف کو ذرا واضح کر دینا چاہتے ہیں۔

لفظِ اختلاف کی توضیح

ہر یکساں حالت کے بعد جب اس کے خلاف کوئی دوسری حالت رونما ہوتی ہے تو اس کا نام ہم اختلاف رکھتے ہیں اس لحاظ سے اگر اس عالم پر عرش سے لیکر فرش تک نظر ڈالیں تو سارا عالم اسی اختلاف کی آماجگاہ نظر آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر اس عالم کی کوئی زیادہ سے زیادہ صحیح تعریف ہو سکتی ہے تو بس یہی ایک لفظ اختلاف ہے

اختلافِ زمان لیل و نہار، شہور و سنین، پھر اس میں فصلوں اور موسموں کا ایک اختلاف ہے جسے اختلافِ زمان کہنا مناسب ہے اس اختلاف کو آیتِ ذیل میں ذکر کیا گیا ہے۔

ولہ اختلاف اللیل والنھار — شب و روز کا یہ اختلاف اللہ تعالیٰ ہی کا تصرف ہے۔

اختلاف السنہ والوان اس سے آگے بڑھئے تو حیوانات و نباتات و جمادات کا اختلاف پھر ان میں اجناس اور اجناس میں انواع اور انواع میں اصناف اور اصناف میں افراد کا اختلاف ہے پھر ان افراد میں طبیعتوں، مزاجوں، رنگوں اور زبانوں کا اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے

اختلاف السنتکم والوانکم — تمہاری زبان اور رنگوں کا اختلاف

آفاق و انفس کا یہ اختلاف دیکھکر صاف طور پر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ افتراق و اختلاف اس جہان کی فطرت ہے اور اسی پر اس کی آبادی کا مدار ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن — اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف کر

اختلاف ضلالت و ہدایت لیکن اس وقت یہ اختلافات زیرِ بحث نہیں ہیں بلکہ اس سے بالاتر ضلالت و ہدایت کا ایک اختلاف ہے وہی ہمارا مرکزِ بحث ہے۔ اس لحاظ سے اگر مجموعۂ عالم پر ایک اجمالی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ امم سابقہ ایک طرف ہیں اور امتِ محمدیہ دوسری طرف اسی کو حسبِ ذیل آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ ° تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے۔

فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۔ ° تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے مومنین کو ان باتوں میں ہدایت نصیب فرمائی جن میں کہ پیشتر امتوں نے ناحق اختلاف پھیلایا تھا۔

امتحانی سوالات میں امتِ محمدیہ کی کامرانی کے مقامات مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت میں اختلاف ہوا کہ وہ یہودی تھے یا نصرانی خدائے قدوس نے امتِ محمدیہ کو ہدایت نصیب فرمائی کہ یہ دونوں خیال غلط ہیں وہ دراصل حنیف تھے۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں اختلاف ہوا، یہود نے ان کا انکار کیا اور نصاریٰ نے

خدا ٹھیرایا۔ یہاں امتِ محمدیہ کو ہدایت نصیب ہوئی اور جادۂ مستقیم ان ہی کے لئے مقدر رہا۔

قبلہ کے بارے میں بھی ایک رائے یہی ہے کہ وہ امتوں کے انتخاب پر رکھا گیا تھا مگر انھوں نے یہاں بھی صحیح انتخاب نہ کیا اور جو اصل قبلہ تھا اس کی ہدایت اسی امت کو نصیب ہوئی۔

جمعہ کا دن بھی اسی اختلاف کی ایک کڑی ہے پہلی امتوں نے یوم التعطیل میں غلطی کی، کسی نے یوم السبت اور کسی نے یوم الاحد مقرر کیا۔ امتِ محمدیہ کو یہاں بھی راہِ ہدایت نصیب ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ اسی اختلاف کی طرف آیۂ ذیل میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (ہود)

اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا لیکن وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے بجز اُن کے جن پر آپ کا پروردگار رحم فرمائے اور اسی اختلاف کے لئے انھیں پیدا کیا ہے۔

اختلافِ امم عطاء اور مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہاں مختلفین سے یہودیۃ و نصرانیۃ مجوسیۃ و حنیفیۃ کا اختلاف مراد ہے اور الا من رحم ربک سے مراد حنفاء ہیں۔ شاید اس لئے بھی اس امت کو امت مرحومہ کا خطاب دیا گیا۔

اختلافِ امتِ محمدیہ لیکن اس اختلاف کے علاوہ ایک اور اختلاف ہے جو خود اس امت میں مقدر ہے وہ جماعتِ اہلِ حق اور باطل فرقوں کا اختلاف ہے اس بنا پر فرقِ باطلہ مختلفین کا مصداق رہیں گے اور اہلِ حق الا من رحم ربک کا۔

اختلاف اہلِ حق اس سے بھی آگے خود جماعت اہلِ حق کا اختلاف ہے جس پر ہم آئندہ بحث کریں گے

اختلاف کا تکوینی راز پہلے آیت کی مراد سنئے۔ اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ نقاشِ عالم کو اپنی صفتِ جلال و جمال کی جلوہ نمائی منظور تھی اس لئے اس نے انسانوں کو ایسے ہی قویٰ فکریہ و عملیہ سے مرکب فرمایا ہے کہ وہ ہمیشہ اسبابِ سعادت و شقاوت میں اختلاف کرتے ہی نظر آئیں گے اور اسی باہمی کشمکش میں خدائی قہر و مہر کا سامان مہیا ہوتا رہے گا۔ اگر اس دنیا میں یہ اختلاف رونما نہ ہوتا تو یہ محشرستانِ عالم خموشاں بن جاتا اور یہاں کے بسنے والے یا صرف خدائی مہر کے مظہر ہوتے یا صرف قہر کے لیکن عالم تقدیر کو ایک ناتمام کمال کا مظاہرہ ناپسند تھا اس لئے اس نے اختلاف اس کی بنیاد میں ڈالدیا اور اب ضروری ہوگیا کہ دنیا جس قدر پھیلتی جائے اختلاف کا دامن بھی اسی قدر وسیع ہوتا چلا جائے حتی کہ یہود اگر ۷۱ فرقوں میں بٹے ہوں تو نصاریٰ بہتّر فرقوں میں بٹیں اور امتِ محمدیہ جو آخری اور سب سے بڑی امت ہے وہ تہتّر فرقوں میں منقسم ہو جائے۔ سورۂ ہود کی اس آیت میں مختلفین کو "الا من رحم ربک" کے مقابلہ میں ذکر کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ تکوین نے تکوینی طور پر تمام انسانوں کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے (۱) اہلِ اختلاف (۲) مرحومین۔

اختلاف کرنا رحمت سے محرومی کی علامت ہے

اس تقابل سے مفہوم ہوتا ہے کہ جو اہلِ اختلاف ہیں وہ رحمت کے تحت نہیں ہیں اور جو رحمت کے نیچے آچکے ہیں وہ قرآن کی نظر میں اہلِ اختلاف کی فہرست میں داخل نہیں اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ نجات صرف اس جماعت کے لئے ہے جو "الا من رحم ربک" کی مصداق ہے اور بقیہ اہلِ اختلاف کے لئے نجات نہیں۔ سورۂ انعام میں اس اختلاف کی مزید تشریح ملتی ہے۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِىْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا	میرا سیدھا راستہ یہ ہے اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر مت چلو
تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (انعام)	کہ وہ تم کو خدا کے راستہ سے جدا کرکے تتر بتر کردیں گے۔

راہِ حق ایک ہے اور ناحق بہت

آیتِ بالا میں صراطِ مستقیم کے لئے لفظ مفرد اور بقیہ اہلِ اختلاف کے لئے "السُّبُل" لفظِ جمع اختیار کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ راہِ مستقیم ایک ہی ہے اور ضلالت و گمراہی کے راستے بہت ہیں۔

صراطِ مستقیم اور سُبُلِ متفرقہ کا نقشہ

مسندِ احمد اور نسائی وغیرہ میں ہے کہ اس معنوی افتراق و تشتت کو محسوس طور پر سمجھانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے سامنے ایک سیدھا خط کھینچا پھر اس کے دائیں بائیں اور بہت سے خطوط کھینچے اور فرمایا دیکھو یہ سیدھا خط تو صراطِ مستقیم ہے اور اس کے دائیں بائیں جو خطوط ہیں وہ سُبُل اور ناپسندیدہ راہیں ہیں جن کی طرف شیاطین دعوت دیتے ہیں اس کے بعد آیت مذکورہ تلاوت فرمائی۔

قرآنِ کریم میں حدیثِ افتراق کی طرف اشارہ ہے

اب اگر سورۂ ہود اور سورۂ انعام کی ان ہر دو آیات کے نتائج کو ملاؤ تو حدیثِ افتراقِ امت کا پورا پورا مفہوم سامنے آجاتا ہے صرف فِرَقِ باطلہ کی تحدید اور عدم تحدید کا فرق باقی رہتا ہے اور اگر دونوں آیتوں کے نتائج کا تجزیہ کرو تو حسب ذیل ہوگا۔

آیتِ انعام۔ (۱) صراطِ مستقیم صرف ایک ہے۔ (۲) سُبُلِ متفرقہ بہت ہیں۔

سورۂ ہود۔ (۳) نجات صرف ایک جماعت کے لئے ہے۔ (۴) اہلِ اختلاف کے لئے نجات نہیں۔

یہی چاروں امور حدیثِ افتراق کا مفہوم ہیں اور بس۔ ضلالت و ہدایت کے اس اختلاف کو سورۂ بقرہ میں بھی حسب ذیل پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ	سب لوگ ایک ہی دین پر تھے (پھر انھوں نے
النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ	دین میں اختلاف ڈالا) تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری
مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ	سنانے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان کے
بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ۔	ساتھ سچی کتاب اتاری تاکہ جن باتوں میں انھوں نے
(بقرہ)	اختلاف ڈالا تھا فیصلہ کرے

رسول دنیا میں ناروا اختلافات کو مٹانے کے لئے آتے ہیں۔ یعنی خدائے قدوس نے تو رسولوں کو اس لئے بھیجا تھا کہ ناروا اختلاف ختم کر دیا جاتا اور یک جہتی کے ساتھ اس قانون پر عمل کیا جاتا جو "الکتاب" کے نام سے اتارا گیا تھا مگر افسوس کہ عاقبت نا اندیشوں نے اس سامانِ اتحاد کو بھی سامانِ اختلاف بنا لیا اور اس طرح بعثتِ انبیاء اور تنزیلِ صحف کا جو اصل منشاء تھا اسی کو برباد کر ڈالا۔ اس کے مخفی راز کو سورۂ ہود کی آیت "ولذلك خلقهم" میں سمجھایا گیا تھا جس کی طرف ہم مضمون کے شروع میں اشارہ کر چکے ہیں۔

قرآن کریم سے لفظ اختلاف کی توضیح اب اِس اختلاف کی حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے آیاتِ ذیل پر غور کیجئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (انعام)	جنہوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سی پارٹیاں بن گئے آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں۔
مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ (الروم)	اور ان لوگوں میں مت ہو جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور پارٹیاں بن گئے ہر پارٹی اپنے خیال میں مست ہے۔
اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ۔ (انعام)	خدائے تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ اگر چاہے تو تمہاری پارٹیاں بنادے اور تم کو آپس میں بھڑا دے۔

عذابِ افتراق عذابِ استیصال کا بدل ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ آپ کی امت پہلی امتوں کی طرح ہلاک نہ ہو، وہ دعا مستجاب ہوئی اور عذابِ استیصال ہمیشہ کے لئے اٹھالیا گیا مگر آپس کے افتراق وتشتت کا مقدر عذاب پھر بھی باقی رہا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پارٹیوں سے اہلِ اہواء کا اختلاف مراد ہے اور آپس میں بھڑانے کا مصداق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو کافر کہکر جنگ شروع کر دے جیسا کہ خوارج نے حضرت علیؓ کے ساتھ کیا تھا (الاعتصام ج ا ص ۳۹)

افتراقِ مذموم کی حدود ان ہر سہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں جو افتراق مذموم ہے وہ یہ ہے کہ ملت کی ہیئتِ اجتماعیہ پارہ پارہ ہو جائے، محبت ومودت، تعاون وتناصر، ہمدردی وسازگاری کے سارے رشتے ٹوٹ جائیں اور جماعتی شیرازہ اوراقِ پریشان کی طرح منتشر ہو جائے۔

دین میں پارٹی بندی برداشت نہیں یہ اختلاف، یہ پارٹی بندی دین میں ایک لمحہ کے لئے قابلِ برداشت نہیں۔ اسی لئے فرمایا "لَسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ" ایسی مفسد جماعت سے آپ کا کوئی علاقہ نہیں ہو سکتا گویا یہ مکمل بائیکاٹ کا اعلان ہے۔

اب سوال صرف یہ رہتا ہے کہ وہ کونسا اختلاف ہے جو بم کی طرح پھٹ کر ملت کی وحدت کو

پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ دورِ صحابہ میں بھی مذہبی اختلافات نظر آتے ہیں اور خلافتِ راشدہ ہی کے زمانہ میں فرقہ بندیوں کے نشانات کا پتہ چلتا ہے۔ پھر کیا یہ مقدس قرن بھی اس اختلاف کا مصداق ٹھیرایا جا سکتا ہے اس شبہ کا جواب ہمیں خود قرآنِ کریم سے ہی دینا ہے لیکن بطورِ مقدمہ پہلے یہ سُن لیجئے کہ اختلاف ائتلاف کی ضد ہے جس کے معنی باہمی الفت و محبت کے ہیں اگر ائتلاف کے ساتھ اختلاف ہو تو درحقیقت یہ اختلاف ہی نہیں

اختلافِ دین وملت

حقیقی اختلاف دلوں کا اختلاف ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ (۱) دین و ملت کا اختلاف ظاہر ہے کہ قدرت نے بنی نوعِ انسان کے لئے ایک ہی دین اتارا تھا۔ نوعِ انسانی پر واجب تھا کہ وہ یک جہتی کے ساتھ یک زباں ہو کر مضبوطی سے اس کو اختیار کرتی لیکن وہ باز نہ آئی اور طرح طرح کی بہانہ بازیوں اور حیلہ سازیوں سے اس کے قبول کرنے میں پس و پیش شروع کیا۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہمیشہ وحدت کی دعوت پر پارٹیاں اور اجتماع کی آواز پر افتراق و تشتت پیدا ہوتا رہا۔ ان پارٹیوں میں ہمیشہ آتشِ بغض و عناد بھڑکتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک ملک، ایک شہر، ایک خطہ اور ایک قبیلہ و خاندان کے ہو کر ایسے جدا ہوئے کہ کسی وصف میں گویا ایک دوسرے کے شریک ہی نہ تھے۔ یہاں تک کہ معاشرت و تمدن کا کوئی گوشہ نہ رہا جس میں یکجہتی کی کوئی جھلک نظر آتی۔ شکل و شباہت بدلی، نشست و برخاست کے طریقے بدلے طعام و لباس کے طریقے جدا جدا ہو گئے۔ جب ایک جماعت دوسرے کے ساتھ یہ اختلاف پیدا کر لیتی ہے تو اصطلاح میں ایسی دو مختلف پارٹیوں میں ایک کو مسلم اور دوسرے کو کافر کا لقب دیا جاتا ہے اور اب یہ اختلاف فطرۃ انسانی کے لئے ایسا تباہ کن اختلاف ہو جاتا ہے کہ اگر قدرت اپنے غیبی ہاتھ سے اس بھڑکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا نہ کرتی رہے تو عالم فنا ہو جائے۔ عجیب بات ہے کہ اس عالم اختلاف کی بقا کا سبب بھی یہی اختلاف ہے اور اس کے فنا کا سبب بھی یہی، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے ۔۔۔ اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

اس کا نام اختلافِ ملت اور اختلافِ دین ہے۔

ایک ملت میں اصول و کلیات کا اختلاف

(۲) دوسرا اختلاف یہ ہے کہ ایک ملت ایک دین سے وابستہ ہو کر پھر اس میں اندرونی اختلاف پیدا ہو جائے اب اگر یہ اختلاف صرف جزئیات کی حد تک ہے تب بھی یہ کوئی قابلِ ذکر اختلاف نہیں نہ اس اختلاف سے قلوب میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تنافر پیدا ہوتا ہے نہ الفت و محبت کے رشتوں پر اثر پڑتا ہے۔ ہاں اگر یہ جزئی اختلافات بھی اس کثرت سے پیدا ہو جائیں کہ اصول و کلیات کی جگہ لے لیں تو ظاہر ہے اس کا حکم دوسرا ہوگا۔

اختلافِ اصول موجب افتراق ہے

اور اگر دین میں اشتراک کے بعد اس کے بعض اصول و کلیات میں اختلاف

ہو جائے تو یہ اختلاف البتہ اختلافِ ملت و دین کی طرح افتراقِ قلوب کا موجب بن جاتا ہے۔ دیکھو معتزلہ خوارج، مرجیہ، اہلِ سنت، سب ایک ہی ملت اور ایک ہی دین سے وابستہ ہیں مگر بعض اصول و کلیات میں اختلاف کی وجہ سے اس طرح گروہ اندر گروہ ہو گئے ہیں کہ جو عداوت و بغض اختلافِ ملت کا ثمرہ تھا وہی ان اختلافات کا نتیجہ بن گیا ہے۔

فروعی اختلاف اختلاف نہیں

اب ہم قرآن سے ہی بتلانا چاہتے ہیں کہ اس کی نظر میں اصول و کلیات کے اتحاد کے بعد فروع کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں۔

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (الشوریٰ)

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین میں ان ہی باتوں کی راہ ڈالی ہے جن کا حضرت نوح ؑ کو حکم دیا تھا اور جو حکم کہ ہم نے آپ پر بھیجا اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ ؑ کو حکم دیا تھا یعنی یہ کہ دین کو قائم رکھو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو۔

ادیانِ سماویہ میں اختلاف نہیں

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور تک شریعتوں اور مناہج کا کھلا ہوا اختلاف رہا۔ مگر پھر بھی قرآنِ کریم نے اس کو ایک ہی دین قرار دیا ہے اور شرائع کے باہمی فروعی اختلاف کو وحدتِ دین کے خلاف نہیں سمجھا، اگر فروعی اختلاف بھی افتراق و اختلاف کی حد میں آسکتے تو اس افتراق کے ہوتے ہوئے پھر "وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ" (دین میں افتراق مت پھیلاؤ) کا خطاب کیونکر درست ہوتا۔ پس جس طرح شرائع سماویہ اور صحفِ انبیاء علیہم السلام فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی دین کہلائے، ایک کا مصدق دوسرے کا مصدق رہا، ان کے ماننے والے سب ایک ہی رشتۂ اتحاد و اخوۃ میں منسلک رہے۔ تحزب و تعصب اور بغض و عناد کی کوئی شان ان میں پیدا نہیں ہوئی اور اسی لئے وہ "کانوا شیعا" کی حد میں نہیں آئے۔ اسی طرح ایک دینِ حنیف کے اندر فروعی اختلافات اس کی شانِ اجتماع و وحدت میں خلل انداز نہیں ہوتے۔

اجتہاد بھی دین کا ایک اصول ہے

اجتہاد کے موقع میں اجتہاد کرنا بھی دین کی ایک سمجھائی ہوئی بات ہے اور اسی کا قائم کردہ اصول ہے اُسے دین میں اختلاف کیونکر کہا جا سکتا ہے اختلاف یہ ہے کہ اس کے کسی مقرر کردہ اصول یا کسی تصریح کردہ جزئی کا خلاف کیا جائے لیکن جہاں اس نے سکوت کیا ہے اور یہ سکوت قصداً کیا گیا ہے وہاں ہر مجتہد کو اس کی اجازت دیدی ہے کہ وہ پوری جد و جہد اور ملکۂ استنباط و اجتہاد کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ مآخذِ دین سے اس کا حکم معلوم کرے۔

صحابہ کرام کا اختلاف

اب آیئے[۱] صحابہؓ کے اختلافات کو دیکھیں۔ حدوث و قدم عالم، صفات کے عین و غیر

[۱] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۸

اور جبر و قدر کے باریک و دقیق مسائل میں قدم رکھنا تو اُن کا اصول ہی نہ تھا اس لئے ان چیزوں میں اختلاف کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا وہاں سوال تھا تو صرف امتثال و اطاعت، فرمانبرداری اور وفاشعاری کے طریقوں میں تھا اس بنا پر اگر اختلاف تھا تو یہی کہ فلاں چیز سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں۔ تیمم وضو کا قائم مقام کب ہو سکتا ہے کوئی آمین زور سے کہنا پسند کرتا تھا کوئی آہستہ سے۔ کوئی رکوع کو جاتے اور آتے ہاتھ اٹھا لیتا تھا۔ پھر یہ اختلافی رنگ بھی اس قدر پھیکا تھا کہ ان اختلافات کے ساتھ ساتھ وہ ایک ہی مسجد میں نمازیں ادا کر لیتے بلکہ خوشی خوشی ایک دوسرے کے پیچھے اقتدا بھی کر لیا کرتے تھے خصومت و جدل تو درکنار موافقت و مخالفت کے تصور سے بھی ان کے دماغ خالی تھے اسی لئے اخوتِ اسلامی، نصح و خیر خواہی، محبت و مودت کی اتنی بھی مثال تاریخ کبھی کسی دوسری جماعت میں نہیں دکھا سکتی۔

اندریں حالات ان فروعی اور جزوی اختلافات کو ان کے یہاں کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا سکتی۔ ہاں خلافت کے دورِ ثالث و رابع میں جو کچھ ہنگامہ آرائیاں ہوئیں ان میں تعصب و تحزب کا وجود ناقابلِ انکار حقیقت ہے مگر الفاظِ قرآنی پر غور کیا جائے تو اس کا جواب بھی ان ہی آیات میں موجود ہے۔ سورۂ انعام اور سورۂ روم کی مذکورہ بالا آیات کو ایک بار پھر پڑھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن یہاں جس فرقہ بندی کی ممانعت کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ ایک دین میں اختلاف برپا کر کے اس کو مختلف دینوں کی طرح بنا دیا جائے یہ اختلاف اس کے اصول و کلیات میں اختلاف ہی کے بعد ہو سکتا ہے۔ آیتِ ذیل کو بغور ملاحظہ کیجئے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا جنھوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور بہت سی پارٹیاں بن گئے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہاں ان پارٹیوں کا ذکر ہے جن کی گروہ بندی کی بنیاد عقائد و اعمال کا اختلاف ہو، اسی اختلاف کو اختلاف فی الدین کہا جا سکتا ہے۔

صحابہ کا اختلاف آپس کا اختلاف تھا نہ کہ دین کا

اب اس معیار کے مطابق ان پارٹیوں کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عقائد و اعمال کا اُن کے درمیان کوئی ذکر ہی نہ تھا وہ ایک ہی عقیدے، یکساں عمل اور ایک ہی دین کے حامل تھے اور اسی ایک متفقہ دین کی خاطر ہی ایک دوسرے سے برسرِ پیکار تھے۔ ان میں اگر اختلاف تھا تو یہ تھا کہ اس متفقہ دین کا اس وقت علمبردار کون ہے پس جس فرقہ بندی کی ممانعت آیات مذکورہ بالا میں کی گئی ہے ان حضرات کا اختلاف اس سے بہت دور تھا۔

یہاں ان شکوک و شبہات کی جوابدہی مقصود نہیں ہے جو مدت دراز کے یکطرفہ تصور کے بعد دماغوں میں راسخ ہو چکے ہیں بلکہ صرف اس علمی حقیقت کو واشگاف کرنا ہے کہ کیا صحابہ کے دور کا اختلاف ہمارے زیرِ بحث اختلاف کا مصداق بن سکتا ہے؟ ہمارے نزدیک صحابۂ کرام کے مشاجرات ہرگز اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ

کی حد میں نہیں آتے۔ ہاں اگر الفاظِ قرآنیہ کو خواہ مخواہ کے لئے وسعت دیکر ان مشاجرات کو داخل کرنا ہی منظور ہو تو امر دیگر ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ صحابہ کرام میں اگرا جتہادی و فروعی اختلافات تھے تو اس بنیاد پر ان میں کوئی گروہ بندی نہیں تھی۔ اور جب پارٹیاں نہیں تو ان کی بنیاد عقائد و اعمال یعنی تفرق فی الدین نہ تھی۔ آگے چل کر ہم اس کو اور واضح کریں گے کہ قرآن و حدیث میں سیاسی گروہ بندیاں زیرِ بحث نہیں۔

اب آپ کو اختیار ہے کہ اس اختلاف کو اختلاف ہی نہ کہئے یا اختلافِ مذموم سے جدا کر لیجئے۔ مجاہد پہلے مشرب کے معلوم ہوتے ہیں وہ "الا من رحم ربك" کی تفسیر میں فرماتے ہیں فان اهل الحق ليس فيهم اختلاف[1] "اہلِ حق میں کوئی اختلاف نہیں اور حسن کا دوسرا مشرب معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں فان اهل رحمة الله لا يختلفون اختلافا يضرهم[2] یعنی اہلِ رحمت ایسا اختلاف نہیں کرتے جو ان کو مضرت رساں ہو کیونکہ یہ اختلاف ان ہی مسائل میں ہے جہاں کوئی نص نہیں ہے۔

دین میں اختلاف کے رفع کا اصول — ان مسائل میں شریعت نے خود اپنی جانب سے اختلافات دور کرنے کا حسب ذیل ضابطہ مقرر کر دیا ہے۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔	پھر اگر تم کسی چیز میں اختلاف کرو تو اُسے خدا اور اس کے رسول کو سپرد کر دو۔

یہ زریں قانون اسی لئے مقرر کیا گیا ہے کہ دینی اختلاف اختلاف نہ رہے بلکہ ردّ الی اللہ والرسول کی وجہ سے حکمِ منصوص ہی کا رنگ اختیار کر لے۔ اور اس طرح اس اختلاف میں پھر ایک شانِ وحدت پیدا ہو جائے

آیۃ فان تنازعتم کی نادر تفسیر — امام ابو اسحٰق شاطبیؒ نے موافقات میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ جس طرح اصولِ شریعت میں کوئی اختلاف نہیں ہے اسی طرح اس کے فروع میں بھی کوئی اختلاف نہیں اور اس سلسلہ میں آیۃ "فان تنازعتم" کی تقریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رفع تنازع و اختلاف ہی کے لئے تو ردّ الی اللہ والرسول کا حکم ہوا ہے اب اگر کتاب و سنۃ میں بھی اصول و فروع میں اختلاف تسلیم کر لیا جائے تو اس ردّ کا فائدہ کیا ہوگا۔ اختلاف پھر اپنی جگہ بحال رہے گا۔ ایک اختلاف دوسرے اختلافی آئین سے ختم نہیں ہو سکتا بلکہ اس آئین سے ختم ہو سکتا ہے جس میں خود کوئی اختلاف نہ ہو سکے

محقق دمیاطی محشی موافقات کو اس دعویٰ میں کچھ تردد ہے ہمارے نزدیک امام شاطبیؒ کا دعویٰ بالکل درست ہے اور اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اصولِ شریعت میں کوئی اختلاف نہیں — اس کا حاصل یہ ہے کہ مقصدِ شریعت نہ اصول میں مختلف ہے نہ فروع میں

---

[1] الاعتصام ج ۱ ص ۲۹۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۴۵ [3] ج ۴ ص ۱۱۹ و اعلام الموقعین ج ۱ ص ۴۱۔

بلکہ اتحادِ اصول کے بعد فروع میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ فروع اصول کے ہمیشہ تابع رہتے ہیں۔ اس لئے جب اصول میں اختلاف نہیں تو فروع میں کیسے ممکن ہے۔ لیکن آیت میں اس امر کا دعویٰ نہیں ہے کہ ردّ الی اللہ والرسول کے بعد ہر شخص کو وہ حکم قصدِ شارع کے مطابق حاصل بھی ہو جائے گا ظاہر ہے کہ بعض مرتبہ ایک جزئی میں اصولِ متفرقہ صادق آنے کی صلاحیت ہوتی ہے ہر مجتہد اپنے اپنے خیال کے موافق اُسے ایک اصل کے ماتحت داخل کرتا ہے اور اس اصل کے مطابق اس کا حکم اخذ کر لیتا ہے اس لئے اجتہاد و آراء کے اس تجاذب کی وجہ سے فروع میں اختلاف رونما ہو جاتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ مختلف حکم خود شریعت کے بیان کردہ نہیں ہیں۔ اس نے ایک ہی قانون بنایا ہے اور اس کے مطابق اس کا ایک ہی حکم ہونا چاہئے حتی کہ اگر عہدِ نبوت ہوتا اور آپ سے براہِ راست اس جزئی کے متعلق سوال کیا جاتا تو اس کا ایک ہی جواب ملتا لیکن بعد میں جب راہِ صواب کا انتخاب صرف افہام پر موقوف رہ گیا تو اب اختلافِ افہام و عقول کی وجہ سے مجتہد فیہ جزئیات میں اختلاف ضروری ہو گیا یہ دوسری بات ہے کہ شریعتِ حنیفیہ نے قانونِ یسر کے موافق یہاں خطاء و صواب دونوں صورتوں میں اجر کا وعدہ کر لیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درحقیقت اس کے آئین میں اس جزئی کے لئے دو حکم ایک دوسرے سے علیحدہ اور مختلف موجود تھے۔

مفہومِ اختلاف کی اس توضیح کے بعد مناسب ہے کہ اب اس کے اسباب پر بحث کی جائے۔

اسباب اختلاف و تفرق

یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہاں ہمارا مطلب اختلاف سے بعض اصول و کلیات کا اختلاف ہے اس لئے اسی کے اسباب پر ہمیں غور کرنا ہے۔ جہاں تک استقراء اور تلاش سے دریافت ہو سکتا ہے اس کے تین اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ (۱) ناقص اور سطحی علم۔ (۲) اتباعِ ہویٰ و خواہشِ نفس (۳) اتباعِ رسوم و عادات۔

ان اسباب پر غور کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس دور پر غور کرنا ضروری ہے جس میں مذہب کی سطح پر اختلاف کا کوئی چھوٹا سا بلبلہ بھی تیرتا نظر نہیں آتا پھر وہ کیا اسباب و دواعی ہوئے کہ یہ سمندر دفعۃً متحرک ہوا اور ایسا متحرک ہوا کہ اس کی امواج معمورۂ عالم کو محیط ہو گئیں۔

دورِ اول کا طریقِ تحصیلِ علم

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کی قوم جس کو قرآن کریم نے اُمّی ہونے کا لقب دیا ہے اور جس کو خود بھی اپنے اُمّی ہونے پر فخر تھا تحصیلِ علم کے لئے جس پہلی درسگاہ میں داخل ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ مبارک تھی یہاں نہ کسی رسمی درسگاہ کا سند یافتہ معلم ان کا مربی تھا نہ کوئی مرتب کتاب ان کے سامنے تھی صرف ان ہی میں کا ایک اُمّی انسان ان کے پیشِ نظر تھا جسے وہ خدا کا رسول تسلیم کر چکے تھے اور بس۔

دو دوروں میں اختلاف نہ ہونے کے اسباب

اسی بنا پر اس کی نشست و برخاست، نطق و سکوت، طعام و لباس، آمد و رفت غرضکہ جملہ عادات و عبادات کی جو وضع دیکھ لیتے اس کو اپنا دستور العمل بنا لیتے جو کہہ دیتا اُسے خدا کا حکم تصور کرتے اور جو کر لیتا اسے رضاءِ الٰہی کا یقینی ذریعہ سمجھتے خلاصہ یہ کہ آپ کے کلماتِ طیبات کا سننا اور یاد کرنا یہی ان کا سبق تھا، اپنے عمل کو آپ کے عمل کے مطابق بنانے میں لگا رہنا یہی ان کا عمل تھا اس لئے ان کی سادہ فطرت اور سادہ دماغ میں جو پہلا نقش قائم ہوا وہ حق ہی حق اور صواب ہی صواب تھا۔ پھر مزید برآں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرِ صحبت سے ان علوم نے ان میں ایسا رسوخ اور ایسی نورانیت پیدا کر دی تھی کہ وہ خود ایک معیارِ حق و باطل بن گئے تھے۔ اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت ان کے سامنے اترتی رہی اور وہ اس کی صحیح سے صحیح تفسیر آپ کے طرزِ عمل میں پڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ تمام کا تمام دین انھوں نے نہایت سہولت اور صحت کے ساتھ اس طرح سیکھ لیا جس طرح ایک بچہ بلا کسی تکلف و تکلیف اپنے والدین کے پورے پورے رنگ ڈھنگ اور طور طریق سیکھ لیتا ہے۔ ایسے ماحول میں اختلاف و افتراق کا کیا گذر ہو سکتا تھا۔

قرآن کریم کی اس عملی اور زندہ تصویر کے روپوش ہو جانے کے بعد گو تحصیلِ دین میں اب وہ سہولت تو باقی نہیں رہی تھی مگر چونکہ اصل کی عکسی تصاویر بکثرت چلتی پھرتی موجود تھیں اس لئے قرآن پڑھنے والے اگر کہیں اٹکتے تو ان عکسی تفسیروں سے ان کا حل کر لیتے لیکن جب یہ عکسی تصاویر و تفاسیر گم ہوتی گئیں اور ادھر اسلام عرب سے نکل کر مختلف سمتوں میں پھیل گیا تو وہ طریقِ تعلیم و تعلم بھی بدل گیا۔

دوسرے دور کا طریقہ، ذہنی انتشار اور ماحول کا اختلاف فہم مراد میں مخل ہوتا ہے

علومِ رسمیہ اور اہلِ عجم سے کثرتِ اختلاط کی وجہ سے ذہن منتشر ہو گئے اندازِ فکر بدل گیا قرآن کریم کے صرف الفاظ سامنے رہ گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات و تفصیلات کا جو ذخیرہ پہنچا وہ بھی بشکلِ الفاظ پہنچا اس لئے چون و چرا اور لا و نعم کا دروازہ کھل گیا عقلاء نے اپنی عقل کے بھروسہ پر اور بے علموں نے اہلِ علم ہونے کی غلط فہمی میں دین کو تختۂ مشق بنا لیا اور رفتہ رفتہ وہ اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے جن کی بنیاد عقائد تھی اور جن کو دین کا اختلاف کہا جا سکتا تھا۔

پارٹیوں کا ظہور

اور اب وہ وقت قریب تر ہو گیا کہ آیت " او یلبسکم شیعا " کی تاویل دنیا میں بہت جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے یعنی۔ اچانک خلافتِ راشدہ کے دورِ رابع میں ایک طوفانِ بدتمیزی اٹھا۔ ایک جماعت قرآن ہاتھ میں لئے ہوئے ہے تہجد کے نشانات اس کی پیشانیوں پر ہیں اور وہ خلیفۂ وقت پر چڑھائی کے لئے اس لئے جمع ہوئی ہے کہ اس کے نزدیک وہ کافر ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کون ہے جسے یہ بدبخت دائرۂ اسلام سے خارج کر رہے ہیں؟ وہ کہ جس کی شمشیر اور جس کی تقریر نے نہ معلوم کتنے کفار کو مسلمان

بنایا تھا جس کی نسبت ارشادِ نبوی تھا انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ۔ علیؓ تمہیں میرے ساتھ وہ نسبت ہے جو حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی اور وہ جس کو امت باب العلم کہتی ہے۔ حیرت ہے کہ جس کو کل دورِ کفر میں پہلا مسلمان کہا جاتا تھا آج اسلام کے زمانہ میں خود اسی کے دورِ خلافت میں اُسے اول کافر کہا جا رہا ہے یہ فتنہ خوارج کا فتنہ تھا جس کی تفصیل کتبِ تاریخ میں مذکور ہے۔ [1]

---

[1] حافظ ابن عبدالبرؒ نے اس کی مختصر سرگذشت اس طرح لکھی ہے کہ جب خوارج حضرت علیؓ پر چڑھائی کر کے آئے تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے امیرالمومنین دیکھئے یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلہ میں آمادۂ پیکار کھڑے ہیں آپ نے جواب دیا کہ پہلے انہیں جنگ شروع کر لینے دو۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں ایک دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجئے میں ان لوگوں سے گفتگو کر لوں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھیڑ لگ رہی ہے شب بیداری کی وجہ سے ان کے چہرے سیاہی مائل ہیں، سجدوں کے نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیکیں پڑ گئی ہیں دُھلی ہوئی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کو دیکھا تو بولے ابن عباسؓ کیسے آئے؟ اور یہ حلہ کیسا پہن رکھا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں میں نے جواب دیا کہ تمہیں اس حلہ پر کیا اعتراض ہے میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے یمنی کپڑے دیکھے ہیں، اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔ آپ کہہ دیجئے کہ یہ زینت اور اچھی اچھی غذائیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہیں کس نے حرام کیں۔

پھر انہوں نے دریافت کیا کہو کیوں آئے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور ایک ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہوں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہو، میری آمد کا مقصد یہ ہے کہ ان کی باتیں تم تک اور تمہاری باتیں ان تک پہنچا دوں۔ انہوں نے آپس میں کہا ان سے بات مت کرو کیونکہ یہ قریشی ہیں اور ان کے حق میں قرآن کہتا ہے بل ھم قوم خصمون بلکہ یہ لوگ جھگڑالو ہیں۔ بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے اس کے بعد ان میں کے دو تین شخص سامنے آئے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت علیؓ پر تمہیں کیا اعتراض ہے۔ انہوں نے کہا تین اعتراض ہیں۔ میں نے کہا بتاؤ انہوں نے کہا پہلی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں کو حَکَم بنایا حالانکہ قرآن کریم میں یہ ہے ان الحکم الا للہ۔ فیصلہ صرف خدا کا ہے۔ میں نے کہا چلو ایک بات ہوئی، اور بولو۔ کہنے لگے حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ سے جنگ کی پھر نہ کسی کو قید کیا اور نہ مالِ غنیمت لوٹا۔ اب اگر ان کی جماعت مسلمان تھی تو ان سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح ان کے ساتھ جنگ درست تھی قید کرنا بھی درست تھا۔ میں نے کہا اچھا اور کچھ؟ بولے تیسری بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا اس لئے اگر وہ مومنین کے امیر نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہوئے۔

میں نے کہا اگر میں ان سب باتوں کا تمہیں خود قرآن وسنت سے ہی جواب دیدوں تو کیا واپس چلے جاؤ گے انہوں نے کہا کیوں نہیں۔ اس پر میں نے کہا اچھا تو سنو!

پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن ہی میں دوسروں کو حَکَم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے چنانچہ حالتِ احرام میں کوئی شخص شکار کرے تو اللہ تعالیٰ نے اس پر جزا مقرر کی ہے اور اس کا فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے جو وہ کہدیں گے وہی قابل تسلیم ہو جائے گا۔ اسی طرح خلع میں طرفین کے دو شخص بلا کر فیصلہ ان کی رائے پر رکھدیا ہے اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابلِ تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں قابلِ تسلیم نہیں ہو گا اب بتاؤ تمہارا یہ اعتراض جاتا رہا یا نہیں۔ کہنے لگے جی ہاں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ان کے اقوال وعقائد دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درک مقاصد، فہم معانی، استنباط و استنتاج کا ان میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا انہیں شوق ضرور تھا مگر اس کے معانی کی انہیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن ان کی زبانوں پر تھا مگر ان کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے، ان کی اسی علمی بے مائگی کی طرف حدیث کے الفاظ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یقرؤن القرآن لایجاوز حناجرھم یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف ان کی زبانوں پر ہوگا اُن کے قلوب میں علم و فہم کا کوئی ذرہ تک نہ ہوگا۔

دوسری علامت ان کے علم نما جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ یقتلون اھل الاسلام ویدعون اھل الاوثان بت پرستوں کو چھوڑ کر اہلِ اسلام کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور نفس میں تقشف پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ جب ان سے مناظرہ کے لئے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ انھوں نے فرمایا ہے وہ یہ تھا میں ایسی جماعت کے پاس سے آرہا ہوں جس میں یہ قرآن اترا ہے اور جو براہِ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے۔

قرآن خواں اور قرآن داں کا فرق

اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں۔ اگر انصاف کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کے صحیح مراد وہ لوگ زیادہ جانتے تھے جن میں سب سے پہلے قرآن اترا، اور جنھوں نے براہِ راست صاحبِ کتاب سے اس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اس پر عمل کا طریقہ دیکھا، یا تم جو ان میں سے کسی ایک بات میں بھی ان کے شریک وسہیم نہیں، نہ تم قرآن کے نزول کے ماحول سے واقف ہو اور نہ اس کی مراد دریافت کرنے کا کوئی صحیح معیار تمہارے سامنے ہے صرف ایک سطحی علم، ایک جامد رائے اور ایک جہل آلود مزاج ہے۔ اس پر یہ دعویٰ ہے کہ مخلص بھی تم ہی ہو۔ قرآن کو بھی تم ہی سمجھتے ہو اور تم ہی اس پر عمل کرتے ہو۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بتاؤ حضرت عائشہؓ تمہاری ماں تھیں یا نہیں اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے قیدیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں اگر اس کا اقرار کرتے ہو تو بھی کافر ہو۔ کہو اس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے؟ انھوں نے کہا نہیں میں نے کہا کہ اب تیسری بات کا جواب سنو۔ صلح حدیبیہ میں ابوسفیان وسہیل کے اصرار پر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا پھر اگر حضرت علیؓ نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا۔

سوال وجواب کے بعد ان میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہوگئے اور جو رہ گئے وہ قتل کر دیے گئے۔

(جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۰۴)

اسبابِ اختلاف حضرت ابن عباسؓ کی نظر میں

اسی لئے جب ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے دریافت فرمایا کہ اس امت کا جب نبی ایک، قبلہ ایک، کتاب ایک ہے تو پھر اس میں اختلاف کیونکر پیدا ہوگا تو حضرت ابن عباسؓ نے یہی جواب دیا تھا کہ اے امیر المومنین قرآن ہمارے سامنے اترا ہے۔ ہم تو اس کے موارِد نزول کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن آئندہ ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر انھیں صحیح طور پر اس کے موارد و مصادر کا علم نہ ہوگا پھر اس میں اپنی طرف سے رائے زنی شروع کریں گے اور اٹکل کے تیر چلائیں گے۔ اس لئے ان میں اختلاف ہوجائے گا اور جب اختلاف ہوگا تو لڑائیاں ہوں گی۔ شروع میں تو حضرت عمرؓ نے اس خیال سے اتفاق رائے نہ کیا لیکن غور کرنے کے بعد انھیں بھی ابن عباسؓ سے اتفاقِ رائے کرنا پڑا۔[1]

حضرت ابنِ عباسؓ کے اس صوابدید کی اس سے زیادہ شہادت اور کیا ہوسکتی ہے کہ اسلام میں ایک خوفناک گروہ بندی کی جب بنیاد پڑتی ہے تو وہ اسی ناواقفی وجہل کی بدولت نظر آتی ہے۔ چنانچہ خوارج کا نقطۂ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں انھیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انھیں کافر قرار دیتے پھر اس جاہلانہ بنیاد پر اُن سے آمادۂ جنگ ہوجاتے تھے۔

سلف کی یہ دقتِ نظر قابلِ داد ہے جنھیں ہر دینی معاملے میں سب سے پہلے یہی تلاش رہا کرتی تھی کہ اس میں صحابۂ کرام کا طریقہ کیا تھا اور جب ان کی کوئی ایک رائے معلوم ہوجاتی تو اسی کو اپنے لئے اسوہ بنا لیتے اور اختلاف دیکھتے تو ان ہی آرا میں سے کسی کا اتباع کرلیتے اور ان سے باہر قدم نکالنا ضلالت وگمراہی تصور کرتے۔[2]

---

[1] الاعتصام ص ۱۵۷

[2] حافظ ابنِ عبد البر امام اوزاعی سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے شاگرد بقیہ بن الولید سے فرمایا

یا بقیة العلم ما جاء عن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم وما لم یجئ فلیس بعلم۔[1]

اے بقیہ بس علم تو وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو اُن سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔

قال الشعبی ما حدثوک عن اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فخذ بہ وما قالوا فیہ برأیہم فبل علیہ۔[2]

عامر شعبیؒ کہتے ہیں لوگ جو باتیں تمہارے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی جانب سے نقل کریں تو انھیں اختیار کرلو اور جو اپنی رائے سے کہیں انھیں نفرت کے ساتھ چھوڑ دو۔

حضرت ابنِ مسعودؓ فرماتے ہیں۔

لا یزال الناس بخیر ما اتاهم العلم من قبل اکابرهم فاذا اتاهم من قبل اصاغرهم هلکوا۔[3]

جب تک لوگوں کے سامنے بڑے بڑے علماء کا علم رہے گا وہ دین میں ترقی یافتہ رہیں گے اور جب ناواقفوں کا علم شروع ہوگا تو برباد ہوجائیں گے۔

ابنِ مبارکؒ فرماتے ہیں اصاغر سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین میں اپنی رائے لڑائیں۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں میرے نزدیک اس کی مراد یہ ہے کہ جو لوگ صحابہ کے بعد ہیں ان کا علم حاصل کیا جائے اور صحابہ کے علم کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دی جائے۔[4]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹ [2] ایضاً ج ۲ ص ۳۲ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۹۔ [4] ایضاً ج ۱ ص ۱۵۸۔

کلام فہمی کے لئے محاورات کے سوا مصنف کی مزاجی خصوصیات کا علم بھی ضروری ہے

اگر ملکی عادات، رسم ورواج، زبانی محاورات، مصنف کی خصوصیات کا علم کسی عام کلام کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے تو بلاشبہ کلام اللہ کے مراد متعین کرنے کے لئے بھی اس کا علم ضروری ہے کہ عرب کا ماحول، عرب کی زبان پھر سب سے پہلے کتاب اللہ کا طرزِ خطابت کیا تھا؟ ظاہر ہے کہ ان اوصاف میں جس قدر عہدِ نبوت کے قریب ہوتے جاؤ گے اتنا ہی کمال نظر آتا جائے گا اور جتنا اس عہد سے نیچے اترتے آؤ گے اتنا ہی نقصان نظر آتا جائے گا۔

علم کا طول وعرض اور ہے اور اس کا عمق اور

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ صحابہ کے علوم میں وہ طول وعرض نہیں ملتا جو متاخرین کے یہاں موجود ہے مگر صحیح علم طول وعرض کا نام نہیں بلکہ اس کے رسوخ اور عمق کا نام ہے۔ اکتسابی اور رسمی فنون چونکہ محض انسانی دماغ کی پیداوار ہیں اس لئے ظنی ہیں اور ظنیات میں چونکہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لئے تحصیلِ یقین کی سعی میں دلائل اور تحقیقات کا طول وعرض خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحی کا علم قطعی ہے وہ جتنا نظر آتا ہے سب مغز ہی مغز ہوتا ہے اس لئے اس میں طول وعرض نہیں ہوتا ہاں اس کی گہرائی بے اندازہ ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص زمین پر کروِیّت یا اس کی حرکت بزورِ دلائل ثابت کرنا چاہے تو اس کیلئے بہت بڑے علم، بہت کافی تجربے اور ایک طویل عمر کی حاجت ہوگی لیکن وہ شخص جو ان دونوں چیزوں کو اپنی

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن امام ربیعہ پر سخت گریہ طاری ہوا اُن سے دریافت کیا گیا خیر تو ہے کیا کوئی مصیبت درپیش ہے فرمایا نہیں لیکن یہ دیکھ رہا ہوں کہ دین کی باتیں بے علموں سے دریافت کی جاتی ہیں اور یہی گمراہی کا پیش خیمہ ہے [1]

ان آثار اور اس طرح کے بہت سے آثار سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلف کے یہاں صحابہ کے علم کا کتنا وزن تھا ان کے یہاں اس علم کی اتنی قدر وقیمت کیوں تھی؟ اس کا راز یہ ہے کہ جس طرح سنت مقاصدِ قرآنیہ کے لئے کاشف ہے اسی طرح صحابہ کے کلمات مقاصدِ سنت کی شرح کرنے والے ہیں کیونکہ یہ کلمات اگر حضورؐ سے سُنے ہوئے ہیں تو ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نقل سے افضل کوئی نقل نہیں ہو سکتی اور اگر وہ ان کی اپنی رائے ہے تو دین میں ان کی رائے سے بہتر کس کی رائے ہو سکتی ہے۔

محمد بن سیرینؒ سے حج کے ایک مسئلہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ کرہہا عمر و عثمان فان یکن علماً فہما اعلم منی وان یکن رأیاً فرأیہما افضل یعنی عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ اسے مکروہ سمجھتے تھے، اب اگر یہ علم تھا تو وہ مجھ سے زیادہ عالم تھے اور اگر ان کی رائے تھی تو ان کی رائے میری رائے سے افضل ہے۔

یہ محمد بن سیرینؒ کا قول ہے جو مشہور ترین تابعی ہیں اور تابعین میں بڑا مرتبہ رکھتے ہیں وہ علم ابھی تو کہہ رہے ہیں۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو اور اس کے سوا جو علم ہے اس کا نام رائے رکھتے ہیں پھر صحابہ کی رائے کا وہ مرتبہ سمجھتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں اپنی رائے قابلِ ذکر نہیں سمجھتے۔

---

[1] الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۹ [2] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۳۱

آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کو ان میں سے کسی بات کی بھی ضرورت نہیں، سب سے بڑی دلیل، سب سے بڑا تجربہ اس کا اپنا مشاہدہ ہے اس لئے جو یقین اس کو حاصل ہے وہ پہلے شخص کو عشر عشیر بھی نصیب نہیں ہو سکتا چنانچہ قرآنِ کریم میں فرمایا۔ افتمارونہ علیٰ مایریٰ۔ کیا تم اس رسول سے اس کی آنکھوں دیکھی باتوں میں جھگڑتے ہو بہرحال جب دین کے علم اور دین کے مسائل پر بحث ہوگی تو سب سے پہلے یہ پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ اس باب میں صحابہ اور سلف کی رائے کیا تھی[1] اور ان کی رائے کے بالمقابل دوسری سب رائیں اسی طرح ٹھکرا دینے کے قابل ہوں گی جس طرح ہائی کورٹ کے نظائر کے مقابلہ میں دوسری عدالتوں کے فیصلے ٹھکرا دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں۔ وہ دین کا ہائی کورٹ تھے اور ان سے زیادہ صحیح مراد حاصل کرنا عقلاً تو ممکن ہے مگر واقعات کے دائرہ میں ممکن نہیں اس کے سوا جو علم بھی ہے گو اس میں طول و عرض نظر آئے اور اس میں عمق کا بھی گمان ہوتا ہو لیکن وہ سب سطحی علوم ہیں اور ان کا اتباع یقیناً دینی افتراق کا باعث ہو کر رہے گا۔[2]

اسی کی طرف حدیثِ ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

---

[1] حضرت حسنؒ صحابہ کے حال کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں، یہ جماعت پوری امت میں سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرے علم کی مالک اور سب سے زیادہ بے تکلف جماعت تھی۔ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کی رفاقت کے لئے اسے پسند کیا تھا وہ آپ کے اخلاق اور آپ کے طریقوں سے مشابہت پیدا کرنے کی سعی میں لگی رہا کرتی تھی اس کو دھن تھی تو اسی کی تلاش تھی تو اسی کی۔ اس کعبہ کے پروردگار کی قسم ہے کہ وہ جماعت صراطِ مستقیم پر گامزن تھی۔ (الموافقات ج ۴ ص ۷۸)

حضرت ابن مسعودؓ کی تعبیر اس سے بھی زیادہ صاف، شاندار اور مکمل ہے۔

من کان منکم متاسیا فلیتاس باصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم فانھم کانوا ابر ھذہ الامۃ قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا واقومھا ھدیا واحسنھا حالا قوما اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ واقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوا فی آثارھم فانھم کانوا علی الھدی المستقیم۔ (۲)	تم میں جس کو اقتدا کرنا ہو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی اقتدا کرے کیونکہ وہ نیک دلی میں سب سے زیادہ علم میں سب سے گہرے نہایت بے تکلف مضبوط کیرکٹر اور بہت اچھے حالات کے لوگ تھے اور اسی لئے خدا تعالیٰ نے اس بہترین جماعت کو اپنے بہترین رسول کی صحبت اور دین کی حفاظت کے لئے انتخاب کیا تھا اس لئے تم بھی ان کی بزرگی پہچانو اور ان کے ہی نقشِ قدم پر چلو کیونکہ وہ سیدھے اور صاف راستہ پر تھے

صحابہ کی صفات اور ان کے علمی پایہ کے متعلق الفاظ کا یہ توافق بتاتا ہے کہ ان میں یہ اوصاف اس قدر عیاں تھے کہ جو شخص بھی انہیں دیکھتا تھا وہ ان اوصاف کو سب سے پہلے ان میں دیکھ لیتا تھا اور اس لئے خود ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتا اور دوسروں کو اس وصیت کے پہنچانے کے لئے مجبور تھا جو ان کے زمانہ میں ان مقدس ہستیوں کا بچشم خود مشاہدہ کرنے والے تھے یا اس سے قریب تر زمانہ میں تھے۔ ان کی رائے تو یہ ہے اور جو ان دو صفتوں سے محروم ہیں اگر وہ کوئی اور رائے رکھتے ہیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں۔ [2] دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۶۶ و ج ۴ ص ۱۱۲ و ۱۳۶

لا یقبض اللہ العلم انتزاعا ینتزعہ	اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے ایک دم نہیں نکالے گا
من الناس ولکن یقبض العلم	بلکہ علماء کو ایک ایک کرکے اٹھالے گا، یہاں تک کہ جب
بقبض العلماء حتی اذا لم یبق عالم	کوئی صحیح عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے
اتخذ الناس رؤسا جھالا فافتوا بغیر	وہ فتوے دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں
علم فضلوا واضلوا۔	کو بھی گمراہ کریں گے۔

عالم رئیس فتنہ نہیں ہوتا جاہل پر عالم کا گمان کر لیا جاتا ہے

بعض علماء نے اس حدیث سے خوب استنباط فرمایا ہے کہ علماء کبھی رئیسِ ضلالت نہیں ہوتے مبدأ ضلالت ہمیشہ جاہل ہوتا ہے پھر اس کے اتباع میں گمراہی پھیلتی ہے مگر فتن جب ٹوٹتے ہیں تو ایک تاریکی نے کر نہیں ٹوٹتے اپنے گرد و پیش میں اتنی تاریکیاں لے کر آتے ہیں کہ اس وقت عالم اور غیر عالم کی شناخت ہی ممکن نہیں رہتی۔ غیر عالم بانیٔ ضلالت ہوتا ہے اور یہ ٹیکہ علماء کے نام پر مفت لگ جاتا ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک امین انسان کبھی خیانت نہیں کرتا لیکن غلطی سے کبھی امین کے دھوکہ میں امانت خائن کے ہاتھوں میں جا پڑتی ہے۔ وہ خیانت کرتا ہے پھر مشہور یہ ہوتا ہے کہ فلاں امین نے خیانت کی ہے اسی طرح ایک عالم متقی، راسخ العلم، کبھی منشاء ضلالت نہیں ہوتا۔ یوں ذلت ولغزش انسانی فطرت ہے وہ اس وقت زیر بحث نہیں۔ فرقہ بندی اور فرقہ پرستی کا جذبہ ہمیشہ بے علموں میں ابھرتا ہے مگر بدنامی علم کے نام پر باقی رہ جاتی ہے۔ آج بھی اگر ہندوستان کی فرقہ بندیوں پر نظر ڈالو گے تو ان کے مختلف عناصر میں ایک بڑا عنصر یہی بے علمی ہے یا وہ فرزانگی جس کی بلند پروازیوں کے لئے حدود اور غیر حدود کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔

سطحی اور عمیق علم کا فرق

بحث تشنہ رہ جائے گی اگر اس مرحلے پر سطحی علم اور عمیق علم کی مناسب وضاحت نہ کی جائے صاحبِ موافقات نے اپنی کتاب کے شروع میں تیرہ مقدمات تحریر فرمائے ہیں جن میں ہر مقدمہ اپنی جگہ مہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ ہمارے مضمون کے لحاظ سے اور بھی زیادہ اہم ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ہمیشہ محقق اور راسخ العلم شخص سے حاصل کیا جانا چاہئے کیونکہ مشہور ہے کہ ازنا قصے کامل نزاید۔ اس کی علامت تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ راسخ العلم کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی اور ان کی تربیت میں رہ کر حاصل کیا ہو تاکہ ان کے فیض صحبت سے اس کا رسوخ بھی حاصل ہو جائے صحبت اور ملازمت شیخ کو رسوخ علم میں بڑا دخل ہے۔ صحابہ کا علم اسی طریق پر تھا، یہی وجہ ہے کہ ان میں ایک "قُلْ هُوَ اللهُ" پڑھنے والا اصحابی جس خوبی اور پختگی سے توحید اسلام سمجھا ہوا تھا آج تیس پاروں کا حافظ بھی اس کا عشر عشیر سمجھا ہوا نہیں۔

صرف مطالعہ کا علم اغلاط سے پاک نہیں ہوتا

بات یہ ہے کہ الفاظ میں اشتراک وترادف، حقیقت ومجاز اور عموم وخصوص کے احتمالات پھیلتے چلے جاتے ہیں اس لئے محض لفظوں کی لوٹ پلٹ سے یقین تک رسائی نہیں ہوتی، محقق معلم ایک نکھری نکھرائی مراد متعلم کو بتا دیتا ہے پھر یہ کچھ قدرتی انتظام بھی ہے کہ جب ایک جماعت تشنہ لب، دستِ حاجت دراز کئے ہوئے تحصیلِ علم کے لئے آتی ہے تو اس اجتماع میں کچھ عجیب برکت پیدا ہوجاتی ہے یعنی معلم میں قوتِ افادہ اور متعلم میں وہبی طور پر قوتِ استفادہ کچھ اس طرح رونما ہوجاتی ہے کہ علوم جس انداز سے یہاں کھلتے ہیں صرف اپنے مطالعہ سے نہیں کھلتے۔ آخر یہ کیا بات تھی کہ صحابۂ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن کے بعد ہی اپنے قلوب میں ایک تغیر محسوس کیا تھا حضرت حنظلہ جب اپنے گھر آتے تو ان کے قلب میں بردِ یقین کی جو کیفیت آپ کی صحبت میں ہوتی بدل جاتی۔ یہ انشراح ویقین سب اسی ملازمتِ نبی کا کرشمہ ہی تو تھا۔

زیر تربیت علم کی تاثیرات

اس تربیت اور صحبت کی تاثیر بعض مستعدین پر تو عجب حیرت انگیز طریقے سے ہوئی ان کی قوت استفادہ اتنی ترقی کرگئی کہ بعض مرتبہ نزولِ وحی سے پہلے ہی وہ بجلی کی طرح دور سے اس کو لپک لیا کرتے۔ کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوتا کہ وحیِ الٰہی کا فیصلہ کل کیا ہوگا۔ مگر نورِ نبوت کا یہ تربیت یافتہ، انوارِ صحبت سے لبریز، مجلس میں بول اٹھتا اور جو وہ بول اٹھتا تمام وحی اسی کے موافق نازل ہوجاتی، صلاحیتِ صواب رسی کی یہی وہ آخری منزل تھی جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہوگیا ہوتا تو یہ خلعت اس کو پہنا دیا جاتا۔ یہ وہی ہے جس کو دنیا عمر فاروقؓ کے نام سے پکارتی ہے۔ صحاح کی روایات میں تو موافقاتِ عمرؓ کی تعداد تین ہی بتائی گئی ہے مگر موافقاتِ عمرؓ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ بہرحال اگر عمرؓ اس ماحول کے سوا قرآن کریم کا مطالعہ کہیں اور رہ کر کرتے تو کیا یہ صواب رسی، یہ توقد، یہ ذکاء ان کو میسر آتا۔

صلح حدیبیہ میں صحابہ کے اضطراب اور پھر سکون میں ایک تعلیمی سبق

دیکھئے صلح حدیبیہ کا واقعہ ان کے اور دیگر صحابہ کے لئے کتنا مشکل سبق تھا فاتحانہ جرأت رکھتے ہوئے مفتوحانہ شرائط کو معقول سمجھنا اور ان کو قبول کرلینا کتنی کٹھن منزل تھی۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ وحیِ الٰہی نازل ہوئی اور اس نے اس واقعہ کا نام فتح رکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر فاروقؓ کو جو اس معاملہ میں سب سے زیادہ الجھن میں پڑے ہوئے تھے بلایا اور وحیِ الٰہی کو پڑھ کر سنا دیا آپ کا پڑھ کر سنانا تھا کہ یا ابھی ابھی وہ بے چینی وہ اضطراب تھا کہ طبیعت سنبھالے نہ سنبھلتی تھی یا اب صلح حدیبیہ کا فتح ہونا ان کی رگ وپے میں اتنا سما چکا تھا کہ تمام اضطراب وبے چینی کی بجائے سکون ہی سکون واطمینان ہی اطمینان تھا۔

حادثۂ وفات پر صحابۂ کرام کا دوسرا اضطراب وسکون

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات نے جو

ہیجان ان کے سینہ میں برپا کر دیا تھا وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ کی موت کے نام لینے والے کا جواب شمشیر سے دینا چاہتے تھے مگر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا آیت وما محمد الا رسول الخ کا پڑھنا تھا کہ یہ اور ان کے ساتھ بہت سے مدہوش صحابہ ہوش میں تھے۔ صحبت میں رہ کر جو علوم حاصل کئے جاتے ہیں اُن میں اول تو شبہات پیدا نہیں ہوتے اور جو پیدا ہوتے ہیں وہ اسی طرح ظاہری و باطنی اثرات سے کافور ہوتے رہتے ہیں حتیٰ کہ

علم پڑھنا چاہئے گننا چاہئے جب ایک متعلم اس طرح علم پڑھتا اور گن لیتا ہے تو اس کا قلیل علم بھی قلیل نہیں ہوتا اب اس کا نام علم نہیں رہتا بلکہ قرآنی الفاظ میں شاید حکمت ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جس حکمت کو حضرت لقمان کا بڑا علم بتلا دیا گیا ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا لُقْمَانَ الْحِكْمَةَ ہم نے لقمان کو حکمت مرحمت فرمائی تھی۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

حکمت کا مفہوم گو عام مفسرین نے حکمت کی تفسیر سنت کی ہے مگر یہاں اور بھی بہت اقوال موجود ہیں، تعلیم کتاب کے ساتھ جب حکمت کی تعلیم نہیں رہتی تو گویا اصل دوا کا بدرقہ نہیں رہتا اس لئے اس کی تاثیر میں بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ معلم محقق کتاب کے ساتھ حکمت کی بھی تعلیم دیتا ہے جو کتاب کے علاوہ دوسری چیز ہوتی ہے۔ یہ حکمت کتاب کی شکل میں کوئی دوسری کتاب نہیں ہوتی بلکہ اس کتاب کو صحبت نبی میں پڑھنے کے وہ اثرات ہوتے ہیں جو مستعد شخص کی ذہنیت میں ایسی صلاحیت پیدا کر دیتے ہیں کہ صحیح فہم و فراست اُس کے لئے ملکۂ نفس بن جاتی ہے اس کے خیالات و عقائد خود پاکیزہ اور دوسروں کو بھی پاکیزہ بنا دیتے ہیں۔ غلطیات کو اس کا ذوق قبول نہیں کرتا اور صحیح حقیقت قبول کرنے میں اُسے کچھ تردد نہیں رہتا۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں:۔

الحکمۃ والعلم نور یھدی بہ اللہ من یشاء — حکمت اور علم ایک نور ہے خدا تعالیٰ جسے چاہتا ہے دیدیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کسب کا ثمرہ ہی نہیں بلکہ وہبی نعمت ہے کسی نصیب والے کو مل جاتی ہے، کتاب اللہ کے ساتھ جب یہ حکمت نہیں ہوتی تو خام طبائع اسے فلسفہ بنا لیتی ہیں غالباً اقبال مرحوم نے اسی کے لئے یہ شعر کہا ہے

فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی — رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی

امام مالکؒ جب مسائل اجتہادیہ اپنے طلبہ کے سامنے بیان فرماتے تو طلبہ ان سے لکھنے کی اجازت طلب کرتے آپ منع فرما دیتے اور کہتے کہ یہ مسائل اگر دنیا میں پھیل گئے پھر کل ان کے متعلق میری رائے بدل گئی تو اس کی تلافی مشکل ہو جائے گی اس لئے لکھو مت، انھوں نے عرض کیا پھر کیا کریں تو فرمایا

تحفظون وتفھمون حتی تستنیر قلوبکم ثم لا تحتاجون الی الکتابۃ — بس زبانی یاد رکھو اور انہیں خوب سمجھ لو یہاں تک کہ جب تمہارے قلوب روشن اور منور ہو جائیں گے تو اس کے بعد لکھنے کی خود بخود ضرورت نہ رہیگی۔

دوسری جگہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔

لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکنہ نور یجعلہ اللہ فی القلوب

علم کثرتِ روایات کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ دلوں میں ڈال دیتا ہے۔

پھر اس کی علامت بیان فرماتے ہیں۔

ولکن علیہ علامۃ ظاہرۃ وھو التجافی عن دار الغرور والانابۃ الی دار الخلود

اس کی ایک کھلی علامت دنیا سے نفرت اور آخرت کی طرف توجہ ہے۔

علم ایک نور کا نام ہے

امام مالکؒ جیسا شخص یہ بتا رہا ہے کہ علم کثرتِ روایت اور طول و عرض کا نام نہیں بلکہ وہ ایک نور ہے جس کے بعد دماغ رٹنے کا محتاج نہیں رہتا اس کی روشنی میں حقائق اشیاء اسی طرح نظر آنے لگتی ہیں جیسا کہ آفتاب کی روشنی میں سیاہ و سفید۔

علم کے متعلق اشراقیین کی رائے

اشراقیین کا بڑا طبقہ علم کی حقیقت بھی اشراقی نوری قرار دیتا ہے۔ علم درحقیقت اسی نور کا نام ہے جب تک یہ نور پیدا نہیں ہوتا اس وقت تک مسائل غامضہ تو درکنار بدیہیات بھی اپنی پوری حقیقت کے ساتھ منکشف نہیں ہوتے وہ قرآنی سورتیں کی سورتیں پڑھ جاتا ہے۔ حدیثوں کے انبار کے انبار رٹ لیتا ہے لیکن اس کے قلب میں جو درحقیقت علم کی تخت گاہ ہے علم و فہم کا کوئی حصہ نہیں پہنچتا اسی لئے خوارج کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ یقرؤن القراٰن لایجاوز حناجرھم علم کی حقیقت سے ناآشنا تو آیات و احادیث کا یہ طول و عرض الفاظ کا یہ طمطراق دیکھ دیکھ کر مرعوب ہوتا رہتا ہے مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ علم خوشنما الفاظ کا صرف ایک انبار ہے جس کی حقیقت قاعدۂ بغدادی کے صرف انتیس حروف ہیں اور بس۔ اس کے برخلاف جو علوم تاثیرِ صحبت سے راسخ ہو کر نور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں وہ کتنے ہی مختصر ہوں ان کا جامہ کتنا ہی کہنہ اور دریدہ ہو مگر قدر شناس خوب جان لیتا ہے کہ یہ گدڑیوں میں لعل ہے۔

نورِ علم بلا عقیدت و اتباع منتقل نہیں ہوتا

یہ علم صرف مشائخِ کرام اور علماءِ کبار کی زیرِ تربیت ہی حاصل ہوتا ہے اور اس لئے جب تک متعلم ان کے ساتھ عقیدت و محبت کا تعلق نہ رکھے ان کے رنگ میں رنگین نہ ہو اس وقت تک علم کا یہ نور بھی اس کے سینہ میں منتقل نہیں ہوتا۔ وہ حرف شناس ہو کر حاضر ہوتا ہے اور فقرہ باز بن کر واپس چلا جاتا ہے اب جتنا چاہے اس پر ناز کرے۔

غالباً اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سلفی علم سے ہمارا کیا مطلب تھا اور صحابہ کے علم کو ہم نے صرف حسنِ اعتقاد سے نہیں بلکہ حقیقت کی بناء پر عمیق کہا تھا۔ اب یہ علم اگر کسی سینہ میں سرایت کر جائے تو کیا آپ کے نزدیک اس پر مقاصدِ شریعت مخفی رہ سکتے ہیں۔ اگر علم کے مختلف حاملین ایک ہی منبع سے فیض یاب ہوں جہاں کوئی

اختلاف نہیں تو کیا ان میں اختلاف پیدا ہونے کا کوئی احتمال ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد راسخ العلم کی دوسری علامت یہ تحریر فرمائی ہے کہ اس کا علم و عمل، حال و قال ایک دوسرے سے مطابق ہو۔

علم صحیح عمل کی دعوت دیتا ہے

مذکورہ بالا تفصیل کے بعد یہ نتیجہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے کہ صحیح عالم بے عمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ صحیح علم بلا عمل قائم رہ سکتا ہے۔ علم صحیح کا تسلط اور اس کی باطنی تسخیر اپنے حامل کو اس کے لئے جھکا دیتی ہے کہ وہ اس کے مقتضاء پر عمل کرے۔ کچھ دن عالم اور علم میں یہ کشمکش رہتی ہے پھر بالآخر یا عالم کو اقتضاء علم کے تابع ہو جانا پڑتا ہے ورنہ علم خود اس سے کنارہ کش ہو کر اپنی گدی ویران چھوڑ جاتا ہے۔

علماء سوء کی علامت

فاضل مولف نے آٹھویں مقدمہ کے آخر میں ایسے علماء کا نام علماء سوء رکھا ہے اور اس کی شہادت میں اکابر صحابہ و علماء کے آثار ذیل نقل کئے ہیں۔

"حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اے گروہ علماء اپنے علم پر عمل بھی کیا کرو کیونکہ عالم وہ ہے جو پہلے علم حاصل کرے پھر اس پر عمل بھی کرے اس کا علم و عمل یکساں نظر آئے۔ آئندہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہوں گے جو علم حاصل کریں گے مگر وہ انکے گلے کے نیچے نہ اترے گا۔ ان کا باطن ان کے ظاہر کے مخالف اور ان کا علم ان کے عمل کے برخلاف ہوگا۔ حلقے بنا بنا کر بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں گے یہاں تک اپنے شاگرد پر کوئی تو اس لئے ناراض ہوگا کہ وہ اسے چھوڑ کر دوسرے کے حلقۂ درس میں کیوں بیٹھ گیا یہی لوگ ہیں جن کے اعمال قبول نہ ہوں گے۔"

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ عالم تو وہ ہے جو اپنے علم کے موافق عمل بھی کرے لیکن جس کا علم و عمل مخالف ہو وہ کیا عالم ہے۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علماء وہ لوگ ہیں کہ جب علم حاصل کر لیتے ہیں تو اس پر عمل کرتے ہیں اور جب عمل کرتے ہیں تو اسی میں مشغول ہو جاتے ہیں اور جب مشغول ہو جاتے ہیں تو عوام میں نظر نہیں آتے جب نظر نہیں آتے تو ان کی تلاش پڑتی ہے جب تلاش ہوتی ہے تو مخلوق سے بھاگتے ہیں۔

حضرت حسنؓ سے روایت ہے جو شخص لوگوں سے علم میں برتر ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ عمل میں بھی ان سے برتر ہو۔

سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ علم جب آتا ہے تو عمل کو پکارتا ہے اگر وہ بھی آ گیا تو ٹھہر جاتا ہے ورنہ رخصت ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا آثار میں علم و عمل کا وہ ربط جو ان حضرات کی دور بیں نظروں میں تجربہ کے بعد ثابت ہوا ہی ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد صاحب موافقات لکھتے ہیں کہ علم میں لگے رہنے سے ایک نہ ایک دن عمل کے لئے مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔

حسنؒ فرماتے ہیں شروع میں ہم نے دنیا کے لئے علم حاصل کیا آخر کار ہمیں علم نے آخرت کی طرف کھینچ ہی لیا۔
معمرؒ کہتے ہیں یہ بات مشہور تھی کہ اگر کوئی علم دنیا کی نیت سے حاصل کرے گا تو آخر علم اسے کشاں کشاں خدا کی طرف لے ہی آئے گا۔
حبیب بن ابی ثابتؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے علم حاصل کرنا شروع کیا تو اس وقت ہماری کوئی اچھی نیت نہ تھی لیکن جب علم آیا تو خود بخود اچھی نیت پیدا ہو گئی۔

اختلاف کا دوسرا سبب ابتلاء ہوتی ہے

قدرت نے انسان میں فہم و فراست اور عقل و ذکاوت کی وہ طاقت ودیعت رکھی ہے کہ جب وہ اس کا پورا پورا ادراک کر لیتا ہے تو بر و بحر کی ساری طاقتیں اس کو اپنی ہی محکوم نظر آتی ہیں، وہ سمندروں کے طوفانوں، دریا کی موجوں اور بڑے بڑے حوادثِ ارضی کو نظر میں نہیں لاتا وہ سورج کی شعاعوں اور بادلوں کے پانی سے بڑی بے نیازی کے ساتھ فائدہ اٹھاتا ہے اور اگر اس کے نظامِ عمل میں یہ عظیم الشان مخلوق کبھی اس کے ارادہ کے موافق کام نہیں کرتی تو اپنا ایک الگ سورج اور جدا بادل بنا کر نہایت حاکمانہ انداز میں ان کا بائیکاٹ کر دیتا ہے۔

انسان کبھی اپنی حکومت دیکھتا ہے اور سب کچھ پر حکومت کا یقین کر لیتا ہے

اپنی حاکمیت کی بے پناہ وسعت دیکھ کر اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ بس وہی ایک حاکم علی الاطلاق ہے اور سب کچھ اسی کے زیرِ حکومت ہے۔ اسی زعمِ حاکمیت میں کبھی کبھی جب وہ آسمان کی طرف نظر اٹھاتا ہے تو اس کی نظر ایک ایسے عالم پر پڑتی ہے جہاں اس کی حاکمیت کا وہ اثر ظاہر نہیں ہوتا جو اس کرۂ ارضی پر نظر آتا تھا یہ ہمہ وقت اس کے قدموں کے نیچے پامال ہو رہا ہے اور وہ اس کی قیدِ حکومت سے تمام تر آزاد ہے۔ نظامِ شمسی و قمری اس کی دسترس سے بالکل باہر ہیں، سیارات کی گردش اور بے شمار ثوابت کی معین نشست پھر ان میں صغیر و کبیر، قرب و بعد کا تناسب، یہ ابھی تک اس کے لئے موجبِ حیرت بن رہا ہے، اور لوں سعی کے بعد اگر اس نے اذنِ پرواز حاصل کئے بھی تو وہ بھی چند میل کے فاصلہ پر جا کر شکستہ ہو گئے۔ تاہم کبھی وہ ہواؤں پر اڑا اور کبھی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھا اور اپنی عقل و فراست کی جتنی بھی طاقت تھی وہ سب خرچ کر ڈالی مگر ابھی تک اس کو یہ باور نہیں ہو سکا کہ عالمِ علوی پر بھی اس کو وہی تصرف و قبضہ حاصل ہو گیا ہے جو عالمِ سفلی پر تھا قدرت اس کو اتنا زبردست حاکم بنا کر پھر کبھی کبھی اس لئے شکست دیتی رہتی ہے کہ اس کے دل میں کبھی اس سے برتر حکومت کا تصور بھی آجائے اسی قدرت و عجز کے درمیان اس کا امتحان لیا جا رہا ہے۔

معجزہ

انبیاء علیہم السلام آتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ وہ اسی بادشاہت کے پیغمبر ہیں جس سے وہ ہمیشہ شکست کھاتا رہا ہے اور اس دعویٰ کے ثبوت میں دنیوی طاقتوں کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ اپنی ساری طاقتوں کو بروئے کار

لے آئیں اور ان کا مقابلہ کرلیں اور اگر اس پر بھی مقابلہ نہ کر سکیں تو اس کا یقین کرلیں کہ وہ ضرور کسی ایسی حکومت کی طرف سے آئے ہیں جو ان ساری حکومتوں سے قوی تر اور بالاتر ہے اسی کا نام معجزہ ہے اس کے بعد وہ ان کے سامنے ایک دستور العمل رکھتے ہیں اور بے چون وچرا اس پر عمل کرنے کی عام دعوت دیتے ہیں۔

انسان کا قدرت کے ساتھ ایک فریب

یہ شکست خوردہ انسان گو اس قاہرانہ طاقت کے بالمقابل کبھی کبھی سرنگوں ہو جانے پر مجبور تو ہو جاتا ہے مگر اندر ہی اندر کوشش کیا کرتا ہے کہ اس حاکم قانون کو بھی اپنی ہی قیدِ حاکیت میں لے آئے باغی تو یہاں صاف انکار کر دیتا ہے اس سے ہمیں سروکار ہی نہیں۔ ایک فرمانبردار بھی اس موقع پر حقِ حاکیت ادا کرتا نظر نہیں آتا اور ایک صحیح بات کی آڑ لے کر اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے اور بجا کرتا ہے کہ اس آئین کو معقول تر آئین ثابت کرے مگر یہاں فریب یہ ہے کہ اس معقولیت کا معیار اپنی عقلِ نارسا کو بنا لیتا ہے اور اس لئے اس خیر خواہی میں وہ شریعتِ سماویہ کی گردن توڑتا موڑتا رہتا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ہر اختلاف میں اسی قانون کو حکم اور فیصل بناؤ اور عمل یہ ہے کہ اس قانون کو اپنی عقل کے مطابق کرنے کی سعی ہو رہی ہے اسی کا نام اتباعِ ہویٰ ہے۔

اتباعِ ہدیٰ اور اتباعِ ہویٰ متضاد سمتیں ہیں

قرآن کریم اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو تبع ہویٰ ہے وہ سماوی ہدیٰ کا تبع نہیں ہو سکتا اور جو آسمانی ہدایت کا تبع ہے وہ ہویٰ کے پیچھے نہیں جا سکتا۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا — پھر ہم نے آپ کو دین کے راستہ پر رکھا ہے (یعنی ہدیٰ) تو
وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (جاثیہ) — آپ اسی پر چلئے اور بے علموں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلئے۔

یعنی اتباعِ ہدیٰ کو اتباعِ ہویٰ کا ترک لازم ہے۔ ہدیٰ اور ہویٰ اپنی اپنی جگہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں، قدرت نے دونوں انسان کے سامنے رکھ دیئے ہیں وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ اور ان دونوں راستوں میں ایک راستہ پر چلنے کا حکم اور دوسرے سے احتراز کا حکم دیدیا ہے۔

ہدیٰ اور ہویٰ کے دوراہے پر انسان کا امتحان

اسی دوراہے پر کھڑا کر کے انسان کا امتحان لیا گیا ہے۔ راہِ ہدیٰ پکارتی ہے کہ راہ یہ ہے اس پر چلو مگر ہویٰ مچلنے لگتی ہے اور سو طرح کی رکاوٹیں سامنے لے آتی ہے۔ ہدیٰ ایک آسمانی آئین ہے اس کے اتباع میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور ہویٰ اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکیت کا مزا آتا ہے اس لئے یہاں ایک نیک بخت انسان بڑی حماقت یہ کرتا ہے کہ ھدیٰ اور ہویٰ کے درمیان اتفاق وسازگاری کی سعی کرنے لگتا ہے تاکہ ع

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

مگر یہ سعی لاحاصل ہے قرآن نے پہلے اعلان کر دیا ہے کہ یہ دو راہیں علیحدہ علیحدہ ہیں ایک کا سرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے اور دوسری کا سرا شیطان کے ہاتھ میں ہے ایک کا منتہیٰ جنت ہے اور دوسری کا دوزخ۔

اتباعِ ہویٰ میں سکون کا راز

یاد رکھنا چاہیئے کہ خواہشات و ہوا کا محرک چونکہ خود نفسِ انسانی ہے اس لئے وہ جسمِ انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہوتی ہیں ان کا خلاف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ جسم کو جان کا۔ ان میں اسی طرح فطری جاذبیت ہوتی ہے جیسا کہ لوہے اور مقناطیس میں اور جب کبھی ان پر قرآن و سنت کا ملمع چڑھ جاتا ہے تو اب وہی ہویٰ ٹھیک ھدیٰ کی صورت نظر آنے لگتی ہے اور ہدیٰ اور ہویٰ کے اس توافق کے بعد جو اطمینان و انشراحِ قلب میسر آتا ہے وہ گنگا و جمنا کے سنگم کا سا لطف سامنے کر دیتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اپنے اندر اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ پھر تلاشِ حق کا لفظ سننا بھی اُسے گوارا نہیں ہوتا۔ اسی لئے سورہ الجاثیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطریقِ امتنان ارشاد فرمایا گیا تھا کہ دیکھئے اتباعِ ہویٰ کی اس گرم بازاری کے زمانہ میں ہم نے آپ کو ہدیٰ پر قائم رکھا ہے یہ کتنا بڑا احسان ہے، تو اب آپ ان بے علموں کی ہویٰ کا ساتھ نہ دیں۔ ہویٰ کے ان غیر معمولی اثرات اور برقی تاثیر و تعدیہ کا حال حدیثِ افتراق کے آخری جملوں میں بدیں الفاظ ذکر کیا گیا ہے۔

وانہ سیخرج فی امتی اقوام تتجاری بھم	آئندہ میری امت میں کچھ لوگ آئیں گے جن میں یہ اہواء و خواہشات
تلک الاھواء کما یتجاری الکلب بصاحبہ	اس طرح رچی ہوئی ہوں گی جیسا کہ ہڑک کتے کاٹے کے جسم میں
لا یبقی منہ عرق ولا مفصل الا دخلہ (ابوداؤد)	کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ اس کا ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری گھسی ہوئی ہو

تشبیہاتِ انبیاء علیہم السلام اور استعاراتِ شعراء میں فرق

یہ انبیاء علیہم السلام کے تشبیہات ہیں، شاعروں اور افسانہ نگاروں کے استعارات نہیں اس لئے یہاں صرف رنگینی اور لطف اندوزی مقصود نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی صحیح سے صحیح ترجمانی مد نظر ہوتی ہے۔ کتے کاٹے کی بیماری پر غور کیجئے تو اس میں آپ کو دو باتیں نظر آئیں گی۔ ایک یہ کہ چونکہ یہ بیماری ایک ایک جوڑ میں سرایت کر جاتی ہے اس لئے لاعلاج ہوتی ہے۔ دوم یہ کہ جس طرح یہ بیماری دراصل دیوانے کتے میں موجود ہوتی ہے لیکن جب وہ کسی کو کاٹ لیتا ہے تو اس کو بھی اس بری طرح لگ جاتی ہے کہ پھر یہ شخص بھی کتے کی طرح خوفناک اور قابلِ احتراز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر یہ کسی تیسرے انسان کو کاٹ لے تو اس پر بھی وہی اثر ظاہر ہو جاتا ہے جو دیوانے کتے کے کاٹنے سے ہوتا۔

اصحابِ ہویٰ کو توفیقِ توبہ میسر آنا مشکل ہے

ان خصوصیات کے بعد اب اگر آپ اہلِ ہویٰ کے حالات کا موازنہ کریں تو اس تشبیہ میں آپ کو نبوت کا ایک اعجاز نظر آئے گا۔ ہویٰ کا حال بھی یہی ہے کہ جب وہ انسان کی رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر وہی انسان کو بشکل "ہدیٰ" نظر آنے لگتی ہے اس لئے یہاں توبہ کی

امید نہیں رہتی، توبہ کی توفیق اس وقت ہو سکتی ہے جبکہ قلب کا کوئی گوشہ ہویٰ سے خالی ہو مگر جب رگ رگ میں ہویٰ سرایت کر جائے تو اب توبہ کی توفیق کہاں سے آئے اسی لئے سورۂ جاثیہ میں فرمایا ہے۔

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰھَہٗ ھَوٰہُ وَاَضَلَّہٗ	بھلا دیکھئے تو جس نے اپنی خواہشات کو اپنا خدا اور حاکم ٹھیرا لیا
اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰی سَمْعِہٖ وَقَلْبِہٖ	اور علم رکھنے کے باوجود خدا نے اس کو راہ سے بھٹکا دیا اور
وَجَعَلَ عَلٰی بَصَرِہٖ غِشٰوَۃً فَمَنْ یَّھْدِیْہِ	اور اس کے کان اور دل پر مہر لگادی اور آنکھوں پر پردہ ڈالدیا
مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ (الجاثیہ)	تو اب اس کو خدا کے بعد کون ہدایت دیسکتا ہے کیا تم اس پر غور نہیں کرتے

علم کی گمراہی جہل کی گمراہی سے بدتر ہے

آیتِ بالا میں چند مہم فوائد بتلائے گئے ہیں پہلا یہ کہ جس طرح بے علمی گمراہی کا سبب بنتی ہے اسی طرح کبھی علم بھی گمراہی کا سبب ہو جاتا ہے مگر جو گمراہی علم کی راہ سے آتی ہے اس کا نتیجہ بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے یہ گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں بلکہ روشنی کی گمراہی ہے جہل کی نہیں، علم کی گمراہی ہوتی ہے اس لئے یہاں اسباب ہدایت سب معطل ہو جاتے ہیں، نہ کان کچھ سنتے ہیں اور نہ آنکھیں غور و فکر کرنے کے لئے تیار ہوتی ہیں اور قلب میں تو حکومتِ ہویٰ کی وجہ سے حق بینی اور حق فہمی کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی اس لئے یہاں ہدایت و توبہ کی کوئی توقع نہیں رہتی۔ اگر خدا ہی اسباب ظاہر یہ سے بالاطریقہ پر ہدایت نصیب فرمائے تو یہ دوسری بات ہے اسی کو دوسری آیت میں بلفظ طبع ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ	یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور وہ
وَاتَّبَعُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ (محمد)	اپنے خواہشات کے پیچھے چل پڑے۔

سورۂ جاثیہ میں جس بد نصیبی کو لفظِ ختم سے تعبیر فرمایا تھا یہاں لفظ طبع سے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ دونوں لفظوں کا حاصل وہی محرومی اور شقاوت ہے۔

ہویٰ پرست کو خدا پرستی کا مغالطہ

دوسری بات یہ کہ ہویٰ پرست کو اتباعِ ہویٰ میں وہ مزا آتا ہے جو خدا پرست کو عبادت میں کیونکہ جب اس نے اپنی ہواہی کو اپنا خدا بنا لیا ہے تو پھر اسی کی فرمانبرداری اس کو خدا کی فرمانبرداری نظر آنی چاہئے اس لئے جتنا ایک خدا پرست ہدیٰ کے اتباع کی سعی کرتا ہے اس سے زیادہ ایک ہویٰ پرست اپنی ہویٰ کے اتباع کے پیچھے رہتا ہے اور حیرت ہے کہ راستہ کے اس اختلاف کے باوجود دونوں کے خیال میں مقصد پھر ایک ہی ہوتا ہے یعنی خدائے قدوس کی فرمانبرداری اس التباس کے بعد متبع ہویٰ سے توبہ کی توقع ایسی ہے جیسی کہ ایک متبع ھدیٰ سے کفر کی توقع۔ نہ وہ اپنے اسلام کو چھوڑ سکتا ہے نہ یہ اپنی ہویٰ کو اس کا نتیجہ پھر وہی توبہ سے محرومی نکلتا ہے۔

اتباع ہویٰ کو گمراہی لازم ہے

تیسری بات یہ کہ اتباعِ ہویٰ اور ضلالت لازم و ملازم ہیں اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ

اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ دو متضاد نقطے ہیں۔ اس کا حاصل یہی تھا کہ اتباعِ ہویٰ کا نتیجہ ضلالت و گمراہی ہے
اسی کو آیت ذیل میں بیان فرمایا گیا ہے۔

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ	اے داؤد ہم نے آپ کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تو مخلوق میں
فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ	سچائی کا فیصلہ کیجئے اور خواہش و ہویٰ کی اتباع نہ کریئے۔
الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللہِ (ص)	کہ یہ آپ کو خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔

خلافتِ حق اتباعِ ہویٰ کے منافی ہے

اس آیت میں بھی اسی مضمون کو بتلایا جا رہا ہے کہ آپ خلیفہ ہیں آپ کے لئے ضروری ہے کہ خدا کی زمین پر خدا ہی کے احکام نافذ کریں یہی خدائی خلافت کا حق ہے۔ لیکن اگر آپ نے ہویٰ اور اپنی خواہش کی پیروی کی تو پھر خدا کی راہ آپ کو نظر نہیں آسکتی اور کیسے نظر آسکتی ہے جبکہ اس کی خاصیت اسبابِ ہدیٰ کا تعطل ہو۔

دوم اس آیت سے جہاں ہویٰ اور ضلالت کا ربط معلوم ہوتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اتباعِ ہویٰ شانِ خلافت کے بھی منافی ہے۔ خدا کا خلیفہ دنیا میں اس لئے آتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اسی کے راستہ پر لگائے نہ اس لئے کہ خود ہی گم کردہ راہ بن جائے

اتباعِ ہویٰ شریعت اور سیاست دونوں کے لئے مضر ہے

تیسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہویٰ جس طرح مسائلِ شریعت کی فہم میں مخل ہوتی ہے اسی طرح حکومت عدل و انصاف، معاملہ فہمی کے لئے بھی سدِ راہ ہے چونکہ خلیفہ کا تعلق دونوں شعبوں سے ہوتا ہے اس لئے اس مرکزی نقطہ پر متنبہ رہنے کی اس کو پوری ہدایت کی گئی ہے۔ اس کی مزید تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَھْوَآءَھُمْ لَفَسَدَتِ	اگر حق ان کے خواہشات کی پیروی کرتا تو آسمان و زمین
السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ	فاسد ہو جاتے۔

معلوم ہوا کہ اتباعِ ہویٰ جس طرح نظامِ مذہب میں مخل ہے اسی طرح نظامِ عالم کو بھی درہم برہم کرنے والا ہے۔ اسی لئے صاحبِ موافقات نے تو اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے کہ شریعت داعیۂ ہویٰ کو ختم کرنے کے لئے ہی آئی ہے۔

مذمتِ ہویٰ میں سلف کے اقوال

مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں ہم سلف کے چند آثار بھی نقل کر دیں کہ ہمارے نزدیک علم یہی ہے سفیان ثوریؒ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی خوش اعتقادی میں بولا "انا علی ھواک" میں تو آپ کی ہویٰ (خواہش) کا متبع ہوں۔ اس پر ابن عباسؓ نے جواب دیا "الھوی کلہ ضلالۃ" ہویٰ (خواہشات) سب گمراہی ہے پھر بطریق تادیب و سرزنش فرمایا ای شیء انا

علی ھواك" انا علی ھواك" کیا چیز ہے یعنی کچھ نہیں۔ ابن وہب حضرت طاؤس سے نقل کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے جہاں ہویٰ کا ذکر کیا ہے وہاں اس کی مذمت ہی فرمائی ہے۔[1] اب آیات ذیل کو بغور پڑھئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جہاں ہویٰ کا ذکر آیا ہے مذمت ہی کے سلسلہ میں آیا ہے۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَھْوَی الْاَنْفُسُ — صرف اٹکلوں اور اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں

آیت بالا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اتباع ہویٰ اور اتباع ظن و تخمین یہ ایک ہی نوع کی باتیں ہیں واقعات اور حقائق سے دونوں دور دور رہتے ہیں۔

اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ کَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ۔ (محمد) — بھلا وہ شخص جو اپنے پروردگار کی طرف کے کھلے ہوئے راستہ پر ہو ان کے برابر ہو سکتا ہے جن کی نظروں میں اپنے اعمال بد مزین ہوں اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے ہوں۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی (والنازعات) — جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو یقیناً اس کی جگہ جنت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ احتراز ہویٰ مورث خوف ہے اور اتباع ہویٰ موجب بے خوفی۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ (النجم) — وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا بلکہ وہ صرف خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔

یہاں آپ کا نطق دو ہی صورتوں میں منحصر کر دیا گیا ہے ہویٰ اور وحی تیسرا اور کوئی احتمال نہیں۔ اسی لئے جب ہویٰ آپ کے کلام سے منفی ہے تو صرف اس کا وحی ہونا متعین ہے۔ معلوم ہوا کہ ہویٰ اور وحی دو متضاد چیزیں ہیں۔ اگر ان چند آیات پر ہی غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہویٰ صرف ظنون یعنی اٹکل اور تخمین کا نام ہے کوئی سماوی روشنی اس کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اپنے اعمال کے بدتری کو اچھی صورت میں سمجھنا اور سمجھانا اور خدا سے بے خوفی اس کا واحد منشا ہوتا ہے۔ وحی سماوی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ضلالت و گمراہی اس کو لازم ہے غرض نظام معیشت اور نظام مذہب دونوں کے لئے تباہ کن ہے اور شخصی مضرت کے لحاظ سے اس کا اثر انسان کے لئے اس کے اسباب ہدایت کا کلی تعطل ہے اسی لئے اس پر ایک طرح توبہ کا دروازہ بھی بند ہو جاتا ہے اور اس کے شفایاب ہونے کی اسی طرح توقع نہیں رہتی جس طرح کتے کے کاٹے شخص کی۔

ہویٰ متعدی مرض ہے [تشبیہ کا دوسرا جزء تعدیہ ہے آپ کے نزدیک تو یہ صرف مجاز و استعارہ ہوگا مگر آئیے سلف کو دیکھئے کہ انھوں نے کیا سمجھا تھا۔

---

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۱۵۲ و ۱۵۵۔

عن ابن مسعود قال من احب ان یکرم دینہ فلیعتزل مخالطۃ الشیطان ومجالسۃ اصحاب الاھواء فان مجالستھم الصق من الجرب۔	حضرت ابنِ مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص تم میں اپنے دین کی قدر کرنا چاہے اسے شیطانی افعال اور اصحابِ اہواء سے علیحدہ رہنا چاہئے کیونکہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی بیماری خارش سے زیادہ اڑ کر لگتی ہے۔

ایوب فرماتے ہیں کہ ایک دن ایک شخص ابنِ سیرینؒ کے پاس گیا اور بولا اے ابوبکر (ان کی کنیت ہے) میں آپ کے سامنے قرآن کی صرف ایک آیت تلاوت کرنا چاہتا ہوں اسے پڑھ کر بس فوراً چلا جاؤں گا۔ ابن سیرینؒ نے دونوں کانوں میں انگلیاں دے لیں اور فرمایا اگر تو مسلمان ہے تو میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں، ابھی میرے گھر سے چلا جا اس نے کہا اے ابوبکر میں آیت پڑھنے کے سوا اور کوئی تقریر نہیں کروں گا۔ انھوں نے فرمایا جا بس تو چلا ہی جا۔ جب وہ چلا گیا تو فرمایا خدا کی قسم اگر مجھے یقین ہوتا کہ میرا دل ایسا ہی مطمئن رہے گا جیسا کہ اب ہے تو میں اسے آیت پڑھنے کی اجازت دیدیتا لیکن مجھے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں وہ آیت پڑھ کر میرے دل میں کوئی ایسا شبہ پیدا نہ کردے جسے میں بعد میں نکالنا چاہوں اور نہ نکال سکوں[1]۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ صاحب بدعت سے بات چیت مت کرو اور نہ اس سے جھگڑا کرو، وہ تمہارے دل میں فتنہ کا بیج ڈال دے گا۔[2]

ان آثار سے معلوم ہوگیا کہ صاحب شریعت کی وہ تشبیہ کتنی پُر مغز اور حقیقت سے کتنی قریب تر تھی۔

ہوٰی کی جاذبیت اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ہوٰی معنوی طور پر اپنے اندر کچھ ایسی جاذبیت رکھتی ہے کہ اس کے آثار بعض مرتبہ غیر اختیاری ہو جاتے ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ یہ چیز ناحق ہے مگر پھر اس کے باطل اثرات گھن کی طرح اندر ہی اندر اس کے ایمان کو کھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ جبر و قدر اور مشاجرات صحابہ کے مسائل۔ ایک اچھا خاصا ایماندار شخص بھی جب اس وادی میں قدم رکھتا ہے تو کچھ دور چل کر شبہات اور وساوس کی جھاڑیوں میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور ہزار کوشش کے باوجود اس کا ایمان زخمی ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اسی لئے صاحبِ شریعت نے اس پُرخار وادی میں قدم رکھنے کی ممانعت کردی ہے مگر مصیبت تو یہ ہے کہ جتنا اُدھر سے ممانعت کی تاکید ہوئی، اتنا ہی یہاں اس کی سیر و سیاحت کا شوق بڑھا۔ حضرت ابنِ مسعودؓ کے الفاظ میں یہ دلیری اور ایمان کی پختگی کی بات نہیں بلکہ اپنے دین کے اکرام نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر ہوٰی میں اتنی جاذبیت نہ ہوتی تو اس میں فرقہ بندی کی یہ طاقت بھی نہ ہوتی۔

قرآن و سنت عقل کے لئے روشنی ہیں نہ کہ عقل قرآن و سنت کے لئے ایک جماعت نے جب اپنی اہواء و خواہشات کی روشنی میں۔ قرآن و سنت کا مطالعہ شروع کیا تو معیارِ صحت انھیں اپنی عقل ہی نظر آئی۔ پھر جو آیت اور

---

[1] الاعتصام ج ۲ ص ۲۴۱۔ [2] ایضاً

حدیث اس معیار کے موافق اتری اس کو تسلیم کرلیا ورنہ تاویل یا انکار کا راستہ اختیار کیا اور اس معصیت کا عذرِ گناہ بدتر از گناہ یہ تراشا کہ صاحب شریعت کا کلام عقل کے مخالف ہو ہی نہیں سکتا یہ بالکل درست تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اس عقل کا بھی کوئی معیار ہونا چاہئے۔ خلافِ عقل کہنے کا بھی کوئی ضابطہ ہونا چاہئے ان مراحل پر بحث کئے بغیر فلاسفہ دور نے جو طے کردیا بس وہ تو وحی منزل من السماء بن گیا اور جو وحیِ حقیقی نے ہدایت کی اُسے اساطیر اولین کہکر محتاجِ نقد بھی نہ سمجھا گیا۔ چنانچہ حشرِ اجسام، صراط، میزانِ اعمال، جسمانی عذاب و ثواب رؤیتِ باری تعالیٰ، جنت و جہنم، اس قسم کے اور جتنے امور پروازِ عقل سے بالاتر تھے، سب کا گو صاف انکار تو نہیں کیا گیا مگر اس طرح تسلیم کیا جس کو درحقیقت ایک تسلیم نما انکار ہی کہنا چاہئے۔ بلاشبہ اگر مذکورہ بالا مسائل کو صرف عقل کے ذریعے طے کیا جائے تو یہ مشکل ہے، نورِ وحی کے بغیر نہ وہ دریافت ہوئے اور نہ صفتِ ایمان کے بغیر وہ حدِ یقین میں آسکتے ہیں۔

آخر کار اس غلط بنیاد کی وجہ سے دین میں عقائد و اصول کا دوسرا اختلاف پڑ گیا اور جس طرح کہ پہلے اختلاف کی بنیاد جہل پر قائم ہوئی تھی، اس اختلاف کا قلعہ عقل پر تعمیر ہوگیا اسی کی طرف حدیث افتراقِ امت کے بعض طرق میں یہ الفاظ اشارہ کرتے ہیں۔

الذین یقیسون الامور برأیھم فیحلون الحرام ویحرمون الحلال۔

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو دین کے مسائل میں صرف قیاس آرائیاں کرتے ہیں اور حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنادیتے ہیں۔

ابنِ عبدالبرؒ کہتے ہیں کہ ابنِ معین نے اس زیادتی کو بے اصل قرار دیا ہے مگر صاحب الاعتصام بعض علماء سے نقل فرماتے ہیں کہ انھوں نے ابنِ معین کا یہ حکم تسلیم نہیں کیا اور کہا ہے کہ یہ ٹکڑا اور ثقہ راویوں سے بھی منقول ہے لہذا اس کی اسناد بے غبار ہے۔ ہاں اگر ان کے علم میں اس کے سوا کوئی اور خفی علت ہے تو دوسری بات ہے۔

مذموم قیاس آرائی کیا ہے؟

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ الفاظ مذکورہ بالا میں اس قیاس آرائی ہی کی مذمت ہو رہی ہے جو دین کی حقیقت بدل ڈالے اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنادے۔ غیر منصوص جزئیات کے احکام اصولِ شریعت کے مطابق حاصل کرنا پھر ان کے اسباب و حِکَم پر بحث کرنا مذموم قیاس آرائی میں داخل نہیں بلکہ اہلِ علم کے لئے ضروری ہے اس لئے یہ سمجھنا نافہمی ہے کہ ہم نے دین کو بلا وجہ ایک معمہ بنانے کی دعوت دی ہے یا غور و فکر کی راہ معطل کرنے کی سعی کی ہے۔ اس تقریر سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ قرآن جگہ جگہ تدبر و تفکر کی دعوت دیتا ہے طرح طرح سے واقعاتِ ماضیہ بیان کرکے ان سے عبرت پذیری کی ترغیب دیتا ہے آیات آفاقی و انفسی کا بغور مطالعہ کرنا شیوۂ مومنین قرار دیتا ہے اور حلال و حرام کے معاملہ میں بھی اس حد تک غور و فکر کی ممانعت نہیں کرتا، جہاں تک اس کے احکام کی تبدیلی و ترمیم نہ ہو، ہاں اس کی اجازت نہیں دیتا کہ اگر آپ

کی عقلِ نارسا اس کے منصوص احکام کی حقیقت دریافت کرنے سے عاجز ہے تو ان کو توڑ موڑ کر اپنی عقل کے سانچے میں ڈھال لیں، یہی اتباعِ ہویٰ ہے۔ اتباعِ ہدیٰ یہ ہے کہ شریعت کو حاکم اور عقل کو محکوم شریعت کو متبوع اور اس کو تابع بنایا جائے۔ اور اتباعِ ہویٰ یہ ہے کہ عقل کو حاکم اور شریعت کو اس کا محکوم بنا دیا جائے قرآن و سنت کی روشنی میں عقل سے کام لینا حکمت ہے اور عقل کے حدود میں قرآن و سنت کو محدود کر دینا اتباعِ ہویٰ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے غور و تفکر پر کوئی چوکی پہرہ قائم نہیں کرتا مقصد صرف یہ ہے کہ عقل کو عقل کی حد پر رکھئے اور اس کو دیو بے زنجیر کی طرح آزاد نہ بنایئے ؎

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

اختلاف و افتراق کا تیسرا سبب اتباعِ عادات ہے

قومی، ملکی یا خاندانی عادات اور رسم و رواج کچھ اتنی بری چیزیں بھی نہیں کہ ان کی اصولاً مذمت ہی کی جائے بلکہ اگر غور کیجئے تو یہ انسانی اصلاحِ معیشت کا ایک فطری دستور العمل بھی ہیں بہت سی وہ اصلاحات جو انسان آئینی طور پر قبول کرنا پسند نہیں کرتا اپنی خاندانی، یا ملکی عادات کی وجہ سے خوشی خوشی قبول کر لیتا ہے اسی لئے شریعتِ حنیفیہ نے اس کا بڑا لحاظ کیا ہے۔ بلکہ قانونِ تیسیر کا یہی ایک بڑا اصول ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسانوں میں کوئی فاسد عنصر ظلم و تعدی اور محض اپنے جہل و بے علمی کی وجہ سے کوئی بات کر گذرتا ہے۔ اس کے دستِ نگر تو اس کے خوف کے سبب سے چون و چرا نہیں کر سکتے۔ اہلِ علم اپنی بے دست و پائی کی وجہ سے اغماض کر لیتے ہیں لیکن جب اسی حال پر کچھ زمانہ گذر جاتا ہے اور کوئی سماوی یا ارضی طاقت اس میں انقلاب پیدا نہیں کرتی تو پھر یہی عام عادت بن جاتی ہے اور شدہ شدہ اہلِ مذہب اس کو اپنے مذہب کا جزء قرار دیدیتے ہیں۔ بعض مزارات پر بھنگ نوشی اور سجادہ نشینی کے لئے عزوبت کی زندگی گویا شرطِ سجادگی تھی۔ آخر ایک دور آیا اور آنکھ کھلی تو اس کے خلاف آواز بلند کی گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی کورٹ تک مقدمہ پہنچا۔ جب مدعین سے اس کا ثبوت طلب کیا گیا تو ان کے پاس بجز اس کے کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ اس درگاہ کی قدیم رسم ہے۔

اسی طرح فاسد عادات کچھ زمانہ کے بعد مذہبیت کا رنگ پیدا کر لیتی ہیں اور دین میں محض اس رسمِ بد کی وجہ سے فرقہ بندی کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ شبِ برات کی آتش بازی اور عرسوں میں شراب و قمار بازی مذہب کی تعلیم نہیں لیکن یہی عادات ہیں جن کو مذہبی رنگ دیدیا گیا ہے یہ عادات بعض جہلاء میں تو اتنی راسخ ہو چکی ہیں کہ ان کے خلاف آواز اٹھانا گویا علمِ جہاد بلند کرنا ہے اسی کا نام اندھی تقلید ہے۔

اندھی تقلید کیا ہے؟ قرآنِ کریم نے جہاں کہیں مذمت کی ہے اسی قسم کی تقلید کی ہے۔ جب کبھی قرآن نے کفار کی بے تکی اور نامعقول باتوں پر دلائل کا مطالبہ کیا ہے تو ان کے پاس ایک ہی جواب تھا۔

وَقَالُوْا اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّۃٍ وَّاِنَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ۔ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادوں کی روش ہی دیکھی ہے اس لئے ہم ان ہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔

اس پر قرآنِ کریم نے جو اعتراض کیا وہ یہ نہیں تھا کہ آبار و اجداد کی تقلید کرنا غلط ہے بلکہ یہ تھا کہ

اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ۔ یعنی اگر تمہارے باپ دادوں میں عقل و ہدایت کا کوئی شمہ بھی نہ ہو پھر بھی تم ان ہی کی تقلید کئے چلے جاؤ گے۔

دوسری جگہ ذرا اس سے نرم لہجہ میں ارشاد ہے۔

قُلْ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْہِ اٰبَآءَکُمْ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ (زخرف) آپ کہدیجئے کہ اگرچہ میں تمہارے سامنے وہ راہ پیش کروں جو اس سے کہیں زیادہ بہتر ہو جس پر تم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے انھوں نے جواب دیا کہ جو طریق تم دیکر بھیجے گئے ہو ہم تو اس کو مان نہیں سکتے۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان کے آبار و اجداد میں عقل کی روشنی یا نورِ ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں کورانہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے عقلی کی تقلید کی جائے خواہ پھر اس کے ساتھ ہزار دلائل بھی کیوں نہ ہوں اس کے بالمقابل روشن خیالی یہ ہے کہ ہدایت اور عقل کی بات کی پیروی کی جائے خواہ وہ کتنی ہی خاموش اور کتنی ہی سکوت کے ساتھ ہو۔ ہمارے موجودہ دور میں اندھی تقلید اور جمود کا مفہوم ہی غلط سمجھا گیا ہے۔ عالمِ غیب کی بلند سے بلند حقائق الٰہیات کے عمیق سے عمیق معارف اور اس کے علاوہ انبیار علیہم السلام کی ان تمام باتوں کو اُن کے اعتماد پر مان لینا جن کو ان کی بچی نظروں نے خود دیکھا یا فہمِ سلیم نے خوب سمجھا ہے کورانہ تقلید کہلاتا ہے اور یورپ کے فلاسفروں کی ناتمام اور ادھوری تحقیقات کو پورے یقین کے ساتھ مان لینا روشن خیالی کے نام سے موسوم ہے۔ اگر زیادہ غور سے دیکھا جائے تو اختلاف دلائل و بے دلیل ہونے کا نہیں بلکہ اعتماد و بے اعتمادی کا ہے۔ عصرِ حاضر کے موجدین پر چونکہ پورا اعتماد حاصل ہے، اس لئے ان کی باتیں دلیل یا بے دلیل ماننا سب روشن خیالی میں شمار ہے اور انبیار علیہم السلام پر چونکہ دلی گہرائی میں وہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لئے یہاں تصدیق کے لئے ان کے فرمان سے بھی بڑھ کر کسی اور دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے اور ان کی باتیں بے دلیل ماننا اندھی تقلید نظر آتی ہے۔ حالانکہ قرآن یہ کہتا ہے کہ انبیار علیہم السلام کے سب علوم نہایت کھلے اور اتنے صاف ہوتے ہیں کہ ان کے لئے کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

(۱) اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ کَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَھْوَآءَھُمْ (محمد) بھلا جو شخص اپنے پروردگار کے واضح راستہ پر چلتا ہو اس کے برابر ہو سکتا ہے جن کو اپنا برا کام بھلا نظر آتا ہے اور اپنی خواہشات پر چلتے ہیں۔

(۲) اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (زمر)	بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کے لئے کھول دیا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے روشنی میں ہے۔
(۳) اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى۔ (الرعد)	بھلا جو شخص یہ یقین کرتا ہے کہ جو تیرے پروردگار کی طرف سے تجھ پر اترا وہ حق ہے اس کے برابر ہو سکتا ہے جو نابینا ہے۔

ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس راستہ کی دعوت دیتے ہیں وہ خود ایک کشادہ اور کھلا ہوا راستہ ہوتا ہے، ان کی مقابل جماعتوں پر اس کی یہ کشادگی اس لئے پوشیدہ رہتی ہے کہ ان کے سامنے ان کے اعمال بدمزین ہوتے ہیں، ان کے اہواء و خواہشات خود ان کی آنکھوں کا حجاب ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ نورِ بصیرت اُن سے اس طرح سلب ہو جاتا ہے کہ پھر وہ ایک نپٹ اندھے کی طرح ہو جاتے ہیں اب انصاف کرو کہ اندھی تقلید کس کی ہے اُن انبیاء علیہم السلام کی جن کو خود شرح صدر حاصل ہے، ان کے علوم سراپا نور ہی نور ان کا راستہ صاف ستھرا اور کھلا ہوا راستہ ہے یا اُن کی جو خود نابینا ہیں، جن کی آنکھوں پر اہواء و خواہشات کے تو بر تو حجابات پڑے ہوئے ہیں اور اس لئے انھیں اپنی بدعملی ہی بھلی نظر آتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح سطحی علم اور اتباعِ ہوا فرقہ بندی کا سبب ہو جاتے ہیں اسی طرح اتباعِ عادات و رسوم بھی اس کا سبب بن جاتی ہے، یہ تینوں اسباب ایک جگہ جمع بھی ہو سکتے ہیں اور جدا بھی ہو سکتے ہیں اور وقت کی مساعدت اور ماحول کی مناسبت پر ان جماعتوں کے گھٹنے بڑھنے، پیدا ہونے اور فنا ہونے کا مدار رہتا ہے، امید نہیں ہے کہ مذہبی افتراق و تشتت کے لئے ان امور کے اسباب ہونے میں دو رائیں ہوں مگر جو بات ہر دور میں عقدۂ لاینحل بن کر رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی فرقہ کے علم کو سطحی کہدینا یا اس کو متبع ہویٰ قرار دینا یا کسی رسم کو رسمِ جاہلیت ٹھیرا دینا آسان بات نہیں، ہر فرقہ اپنے علم کو عمیق اور اپنے طریق کو اتباعِ سنت اور اپنے رسم و رواج کو طریقِ سلف کہتا ہے، اس گتھی کو سلجھانے سے عقل کے ناخن عاجز ہیں، ایک فرقہ کا فیصلہ دوسرے کے حق میں معتبر نہیں ہو سکتا اور اس مرحلہ پر پہنچکر خدا کی اس تقدیر پر راضی ہونا پڑتا ہے جس کی طرف اس نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے ولذالک خلقھم۔ ہم نے اس تماشا گاہِ اختلاف کو اختلاف ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسی ہنگامۂ اختلاف میں انبیاء علیہم السلام وحدت و اتحاد کی دعوت دیتے چلے آئے ہیں اور ہمیشہ ان کی اس آواز پر اختلاف و تشتت بڑھتا رہا ہے اسی کشاکش میں دنیا کی حیات کا راز مضمر ہے۔ اگر خیر و شر ایک حرف ہو جائے تو شاید کارخانۂ عالم درہم و برہم ہو جائے۔

فرقوں کی یہ کثرت پھر امتِ محمدیہ کی عقلاء کے لئے عجب گردابِ حیرت بن رہی ہے۔ ایک مفکر یہ سوچ رہا ہے کہ افتراق و تشتت کی اتنی کثرت میں آخر راز کیا ہے۔ پھر امتِ محمدیہ کے ۷۲ فرقوں کو دوزخی کہدینا اور

صرف ایک فرقہ کو جنتی کہنا اس کے لئے اور بھی مشکل کا ساماں بنا ہوا ہے اِدھر ایک مورخ صفحات عالم کی ورق گردانی کرکر کے تھکا جاتا ہے مگر اس کا بیان حدیث کے عدد سے نگر نہیں کھاتا۔ بہت حساب لگاتا ہے مگر کبھی یہ عدد گھٹ جاتا ہے کبھی بڑھ جاتا ہے، ان الجھنوں سے گھبرا کر جب وہ نظر اوپر اٹھاتا ہے تو اس کو ایک راہ یہی آسان نظر آتی ہے کہ وہ اس حدیث ہی سے دستبردار ہو جائے۔ جس غریب کو یہ پہلا موقع پیش آیا ہو اس کا گھبرا جانا کچھ موجبِ تعجب بھی نہیں۔

احادیث میں مفہوم عدد کی بحث

لیکن ایک محدث جب ان مشکلات پر گذرتا ہے تو دنیا کی حیرت اس کے لئے خود وجہِ حیرت بن جاتی ہے وہ اعداد و شمار کی بحث کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اعداد و شمار صرف وقتی استحضار اور متکلم کے ذہنی اعتبار کی ایک بات ہوتی ہے کبھی وہ ابہام و اجمال کا ارادہ کرتا ہے تو عدد میں بھی پوری تفصیل اختیار نہیں کرتا اور کبھی تفصیل پر اترتا ہے تو عدد کی بھی تفصیل کر ڈالتا ہے طبیعت کے انشراح اور وقت و ماحول کی وسعت کے لحاظ سے دونوں صورتیں اختیار کر لینا معقول بات ہے افراد کو انواع اور انواع کو اجناس کے تحت میں داخل کرتے چلے جائیے تو عدد گھٹتا چلا جائے گا اور اس کے برعکس اجناس و انواع کی تحلیل کرتے جائیے تو وہی عدد بڑھتا چلا جائے گا۔ ان دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں سمجھا جا سکتا

اعداد و شمار میں مورخ کا اختلافِ نظر

اسی طرح اگر کوئی مورخ فرقہائے عالم کے متعلق کوئی عدد لکھتا ہے تو یہ اس کی طبیعت پر منحصر ہے کہ وہ کس فرقہ کو کتنی تاریخی اہمیت دینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض معمولی فرقے اس کے نزدیک تاریخی لحاظ سے قلمبند کرنے کے قابل ہوں اور بعض بڑے فرقے یہ اہمیت نہ رکھتے ہوں۔ ہر مورخ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقرر کردہ معیار کے لحاظ سے جو عدد چاہے ذکر کرے۔ یہاں تطبیق و اختلاف کا کوئی سوال پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس مورخ کے معیار اور اس کی اہمیت و غیر اہمیت کا اندازہ نہ لگا لیا جائے، پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اس کے اس معیار سے اتفاق لائے بھی کر لے ہر شخص کا ذوق اور اس کا نقطۂ نظر علیحدہ ہو سکتا ہے اس لئے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ کوئی دوسرا معیار مقرر کر لے ان معمولی مقامات پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے[1]۔

---

[1] یہاں ہم آپ کے سامنے اسی نوع کی چند احادیث پیش کرتے ہیں تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ احادیث میں یہ دن رات کی باتیں ہیں۔ عدد کی وضع و صحت کا فیصلہ ان پر نہیں ہو سکتا۔

اختلافِ عدد کی چند مثالیں

(۱) احادیث شعب الایمان میں ایمان کے شعبوں کا عدد کہیں ۷۰ سے اوپر اور کہیں ۶۰ سے اوپر بتلایا گیا ہے۔ کیا ۶۰ کو پھیلا کر ۷۰ یا ۷۰ کو سمیٹ کر ۶۰ کہنا کوئی بہت ہی بعید از حقیقت بات ہے۔

(۲) بعض احادیث میں رؤیا صالحہ کو نبوت کا چھیالیسواں جزء اور کہیں اس کے خلاف بتلایا گیا ہے احادیث میں یہاں سخت اختلاف ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

پس جب تک کہ اس عدد وشمار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر معلوم نہ ہو جائے مستقیم الاسناد احادیث کو ضعیف یا موضوع قرار دیدینا بڑی جسارت اور انتہائی دلیری ہوگی۔ حدیث افتراقِ امت بھی اسی سلسلہ کی ایک حدیث ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں بھی کسی خاص معیارِ ضلالت وفتنہ کے اعتبار سے یہ خاص عدد بتلایا گیا ہو۔

پھر امت کے ۷۳ فرقوں کا مسئلہ کوئی عقیدہ کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ سلسلۂ فتن وانقلابات کی ایک پیشگوئی ہے اور اس باب کی عام احادیث کی طرح اس کے بھی بہت سے پہلو مبہم ہیں انھیں اپنے حال پر مبہم رہنے دو اس ابہام کی وجہ سے حدیث کو موضوع یا ضعیف کہنا بے معنیٰ ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) (۳) احادیث تقسیم رویا میں کہیں ثلاثی تقسیم مذکور ہے اور کہیں ثنائی۔

(۴) خصائصِ نبوت کے سلسلہ میں کہیں ۵ خصائص مذکور ہیں اور کہیں زیادہ۔

(۵) امت کے شہدار کے عدد میں بھی بڑا اختلاف ہے۔

(۶) کنتم خیر امۃ کی تفسیر میں صاحب مشکوٰۃ نے جامع ترمذی کی ایک حسن روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ تم ۷۰ امتوں میں وہ آخری سترویں امت ہو جو خدا کو سب امتوں میں پیاری امت ہے۔ کیا نہیں ہوسکتا کہ اس امت کا سترویں امت ہونا تفاوتِ درجات اور مراتبِ خیریت کے لحاظ سے ہو۔

(۷) جامع ترمذی میں ہے کہ اہلِ جنت کی ایک سو بیس صفیں ہیں۔ اسی امتِ محمدیہ کی اور بقیہ دوسری امتوں کی۔

(۸) صحیح احادیث میں دجالوں کا عدد کہیں تیس اور کہیں ۷۰ تک بھی موجود ہے وغیرہ وغیرہ

اختلافِ عدد کے مختلف جوابات اس قسم کی احادیث میں علمار کے مختلف نظریات ہیں کوئی محض اپنی ذہانت سے نکتہ طرازیاں کرکے ان مختلف عددوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کوئی یہ عذر کرتا ہے کہ ایک وقت آپ کو اس عدد کا علم دیا گیا تھا اس کے بعد اس سے زیادہ کا علم دیدیا گیا۔ محدث مزاج اگر قرائن دیکھ لیتا ہے تو کبھی کبھی اضطراب کی بھی تعبیر دیتا ہے۔ محاوراتِ کلام سے ذوق رکھنے والا اس عدد کو صرف تکثیر کے لئے سمجھتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ جواب ان اعداد میں تو درست ہے جہاں محاورۂ عرب میں وہ عدد تکثیر کے لئے مشہور ہو جیسا ۷۰ کا عدد۔ آیت ذیل میں بھی تکثیر کے معنیٰ مراد ہیں

إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ — اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی استغفار کریں تو بھی ہرگز ہم ان کی مغفرت نہیں کریں گے۔

اب احادیثِ بالا پر غور کیجئے کیا اگر شعب الایمان شمار کے بعد حدیث کے مذکورہ بالا عدد سے کم وبیش ثابت ہوں تو صحیح بخاری کی اس حدیث کو ضعیف یا موضوع کہدیا جائے گا، یا اگر دجالوں کا عدد تاریخی لحاظ سے احادیث کے عدد کے موافق ثابت نہ ہو تو اس سارے ذخیرۂ احادیث کو ناقابلِ اعتبار ٹھیرا دیا جائے گا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ جن دجالوں کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے ان کے عدد وشمار میں کسی خاص صفت کی رعایت کی گئی ہو۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں صرف ان دجالوں کا عدد بیان فرمایا ہے جن کو قوت وشوکت حاصل ہوگی ورنہ دعویٰ نبوت میں بسا اوقات سوداویت اور جنون کی وجہ سے بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے مدعیانِ نبوت بے شمار گذرے ہیں ان سے حدیث میں کوئی بحث نہیں صحیح بخاری کتاب الفتن میں ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ مجھے امراء جور کے نام (ظالم بادشاہوں کے نام) بتلائے گئے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو ان کا نام ونسب تک بتلا سکتا ہوں۔

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

پیشگوئی کی احادیث میں ابہام ناگزیر ہے

فنِ حدیث پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ دورِ فتن اور مستقبل کے واقعات کی احادیث میں اکثر ایک نوع کا ابہام ہوتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جزئیات کی جب تعیین کی جاتی ہے تو علی العموم وہ الفاظ کلیات کا جامہ پہن لیتے ہیں اور اس لئے جب انسان اس کو اپنے محل پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جتنی صفائی سے اس کا دل چسپاں کرنا چاہتا ہے چسپاں نہیں کر سکتا مثلاً تھوڑی دیر کے لئے آپ فرض کر لیجئے کہ زید کی شکل و صورت آپ قیدِ الفاظ میں لانا چاہیں تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رنگ یہ ہے، نقشہ یہ ہے اور بہت سے بہت اس کا طول و عرض بتا سکتے ہیں۔ مگر کیا یہ سب الفاظ اتنی تعیین پیدا کر سکتے ہیں کہ پھر دوسری صورت پر اس کا صادق کرنا ممکن ہی نہ ہو، بلکہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی یہ قیود خود زید ہی کی صورت کی تشخیص میں اور صعوبت پیدا کر دیں۔ جب ایک نادیدہ شخص کی تعیین صرف الفاظ سے پوری نہیں ہو سکتی تو مستقبل کے حوادث کی تعیین باوجود اُن کے تنوع اور تشابہ کے کیونکر ہو سکتی ہے۔

شریعت کا ایک اہم نصب العین

اتنی تشریح شریعت کے اصل نصب العین کے بھی خلاف ہے وہ اپنے مخاطب دماغوں کو ایسی تربیت دینا چاہتی ہے کہ جو علومِ غیبیہ وہ بیان کرے وہ بلا تردد صرف اس کے اعتماد و وثوق پر قابلِ یقین ہو جائیں اور اس تسلیم و رضا کی انھیں ایسی عملی مشق حاصل ہو جائے کہ پھر جہاں ان کے سامنے تفصیل کر دی جائے وہاں تفصیل ہی مناسب معلوم ہو، اور جہاں اجمال رکھا جائے وہاں اجمال ہی پسندیدہ نظر آنے لگے۔ آیئے آثارِ ذیل میں اس تربیت کے آثار ملاحظہ فرمایئے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ)

اس حدیث سے گمان ہو سکتا ہے کہ شاید تمام امراءِ جور کے نام ان کو بتلائے گئے تھے لیکن حضرت حذیفہؓ سے مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ان قائدینِ فتن کے نام بتلائے ہیں جن کے ساتھ تین سو یا اس سے زیادہ کی جماعت ہوگی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں معدود شمار بیان کرتے وقت فرد کوئی معیار ہوتا ہے جسن اتفاق سے وہ معیار یہاں ہمارے سامنے آگیا ہے ورنہ حضرت حذیفہؓ کے متعلق ہم یہی سمجھتے تھے کہ ان کو ہر ہر قائدِ فتنہ کا نام بتلا دیا گیا تھا۔ احادیثِ فتن میں اس عام ابہام و انتشار کے علاوہ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی روایات احادیثِ حلال و حرام کی طرح عام صحابہ سے دستیاب نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علم کا مخاطب ہر ذی فہم اور غیر ذی فہم بنایا نہیں جا سکتا اس لئے اور ابہام و اجمال پیدا ہو جاتا ہے مگر یہ ابہام اس لئے مضر نہیں ہوتا کہ فتنے جب سامنے آتے ہیں تو اہلِ بصیرت پر اُن کا فتنہ ہونا مخفی نہیں رہتا۔ اس تشخیص و تعیین کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی ہے کہ یہ فتنہ کون سا فتنہ ہے۔ اسی طرح حدیث زیرِ بحث میں امت کے افتراق کی پیش گوئی کی گئی ہے اس کا مقصد اس افتراق سے آگاہ کرنا اور ان گمراہیوں کے دور میں اس کی تاکید کرنا ہے کہ دامنِ سنت اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اسی لئے صحابۂ کرام نے اس حدیث کو سن کر یہ سوال نہیں کیا کہ وہ فرقے کون سے ہیں ان کی علامات کیا ہیں بلکہ یہ پوچھا ہے کہ وہ ایک فرقۂ ناجیہ کونسا فرقہ ہے کیونکہ عملی لحاظ سے یہی مفید ہے کہ اس کے فرقہ کی تعیین ہو جائے جب یہ ایک ہی فرقہ ہے تو اس کے سوا جتنے فرقے ہیں وہ بلا بحث کئے خود بخود باطل فرقے ہوں گے۔ اس لئے صحابہ کے نزدیک اس بحث میں پڑنا ہی ایک ماغی تعرض کے سوا اور کچھ نہ تھا

خرج عمر علی الناس فقال	حضرت عمرؓ باہر تشریف لائے اور فرمایا میں تمہیں اس کی اجازت نہیں
اخرج علیکم ان تسئلونا	دیتا کہ جو واقعہ اب تک پیش نہیں آیا تم اس کے متعلق مجھ سے فرضی
عالم یکن فان لنا فیما کان	سوالات کرو کیونکہ جو واقعات اب تک پیش آچکے ہیں ہمیں ان کے
شغلا۔ ؎۱	غور وخوض میں ہی کافی مصروفیت رہتی ہے۔
وکان زید بن ثابت اذا سئل	حضرت زید بن ثابتؓ سے جب فرضی سوالات کئے جاتے تو آپ
عن شئ یقول کان ھذا فان	دریافت کرتے کیا یہ واقعہ پیش آچکا ہے۔ اگر کہا جاتا نہیں تو فرماتے
قالوا لا قال دعوہ حتی یکون ؎۲	جب تک پیش نہ آجائے اُسے رہنے دو۔

حضرت ابن عمرؓ سے استلام حجر اسود کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے، اس پر سائل نے یہ فرضی سوالات شروع کر دیئے اگر بھیڑ ہو جائے اگر میں نہ کر سکوں تو جواب یہ دیا ہے۔

اجعل ارأیت بالیمن۔ ؎۳	اپنے ان فرضی سوالات کو یمن میں ڈال۔

یعنی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے اس کی اقتدار کی پوری کوشش کر اور خواہ مخواہ جان چرانے کے لئے فرضی سوالات مت کر۔ انسان بسا اوقات اس لئے سوالات کرتا ہے کہ وہ اس ذریعہ سے مخاطب پر جواب کا دروازہ تنگ کرکے اس کی زبان سے اپنے لئے جواز کی رخصت حاصل کرلے۔

مسروق فرماتے ہیں کہ میں نے ابی بن کعب سے کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے پوچھا کیا یہ واقعہ پیش آچکا ہے میں نے عرض کیا، نہیں تو فرمایا۔

اجمنا یعنی ارحنا حتی یکون فاذا	ابھی تو ہمیں آرام سے رہنے دو جب پیش آجائے گا تو ہم تمہاری خاطر
کان اجتھدنا لک رأینا	اس پر غور کرلیں گے اور یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی حل بھی اس وقت
؎۴	ہماری سمجھ میں آجائے گا۔

صرف دماغی تفریحات عملی جدوجہد میں مخل ہوتی ہیں

ان کے علاوہ حضرت عمار، حضرت معاذ بن جبل اور دیگر تابعین وعلماء سے بھی بکثرت ایسے آثار مروی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ محض دماغی تفریحات میں پڑے رہنا انسان کی عملی جدوجہد کے لئے مضرت رساں ہے۔ آج بھی جس قدر بے عمل افراد یا جماعتیں نظر آئیں گی، ان پر غور کروگے تو ان کا مشغلہ بھی دماغی عیاشی نظر آئے گا اور بس۔ صحابہ وتابعین اور تبع تابعین کے دور میں اس نظریہ کے متعلق کیا کیا فرق ہوتا گیا اس پر بحث کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

؎۱ و؎۲ و؎۳ و؎۴ جامع العلوم والحکم ج ۲ ص ۲۵۔

اخبارِ غائبہ میں مذاق سلف

ان آثار سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ پیش گوئیوں کے سلسلہ میں مذاقِ سلف کیا ہونا چاہئے، کیا انھوں نے کھلے طور پر ایک بات کی ہندی کی چندی کرنے کی جرأت کی ہوگی۔ اگر جواب نفی میں ہے تو پھر خود ہی انصاف کیجئے کہ اگر کچھ وجوہات کی بنا پر ان احادیث کے بعض پہلو اسی زمانہ میں مبہم رہ گئے تو بعد میں اب کون ہے جو ان کو صاف کر سکتا ہے اور اگر نہیں کر سکتا تو کیا اس لئے ان احادیث کی صحت پر کوئی اثر پڑنا چاہئے۔

فرقہائے مختلفہ کی تعیین

جہاں تک ہمارا علم ہے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان فرقوں کی نام لے کر کسی حدیث میں تعیین نہیں کی گئی، ہاں کچھ ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں جن سے ان فرقوں کی تعیین میں مدد لی جا سکتی ہے، نام لے کر مدح وذم کرنا ہماری شریعت کا دستور بھی نہیں ہے۔ فارس اور اہلِ مدینہ کے فضائل میں متعدد احادیث ملتی ہیں مگر کوئی حدیث ایسی ثابت نہیں ہوئی جس میں نام لے کر ان کا مصداق بتایا گیا ہو، علماء نے صرف اپنی جانب سے قیاس آرائیاں کی ہیں۔ پس جب مقامِ مدح پر نام لینا احادیث کی سنت نہیں تو مذمت کے ذیل میں کسی کا نام لینا کب اس کے بلند اخلاق کا اقتضاء ہو سکتا ہے۔ بلکہ شریعتِ محمدیہ کا یہ ایک عام قانون ہے کہ اگر سہو و نسیان کی بنا پر کسی شخص سے کوئی معصیت سرزد ہو جائے تو تا امکان اس کی پردہ پوشی ہی کرنی چاہئے، حدود کے باب میں شہادت کے اندر جس قدر شدت اختیار کی گئی ہے وہ بھی صرف ستر اور پردہ پوشی کی حکمت پر مبنی ہے[1] یعنی شریعت یہ نہیں چاہتی کہ پورے ثبوت کے بغیر فواحش اور حیاسوز جرائم کی اشاعت یا کسی مسلمان کی پردہ دری کی جائے

مغیرہ بن شعبہ پر تہمت کی تشفی بخش تحقیق

مغیرہ بن شعبہ کے متعلق تہمتِ زنا پر حضرت عمرؓ کی دعا کا جو واقعہ مشہور ہے اس کا منشا بھی یہی تھا۔ نکتہ چینوں نے اُسے دوسرا رنگ دیا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عیوب کی فہرست میں شمار کیا ہے مگر دور بینوں نے اسی کو بڑی حکمت پر مبنی سمجھا ہے، یہ فہم اور درد اسی کو میسر آسکتا ہے جس کو مقاصدِ شریعت کا پورا ادراک ہو وہی اس کی رعایت کر سکتا ہے کہ اگر اسلام کے دور اول میں کسی مقتدر شخصیت کے متعلق کوئی غلط الزام حدِ ثبوت کو پہنچ جائے تو آئندہ نسلوں کے لئے وہ کتنا مضرت رساں ہو سکتا ہے۔

واقعہ کی حقیقت یہاں کل اتنی تھی کہ انھوں نے خفیہ طور پر نکاح کر لیا تھا وہی بُرے عنوان سے مشہور

---

[1] انما امر الله بالعدد فی شهود الزنا لانه امور فیه بالستر ولهذا اغلظ فیه النصاب۔ — اللہ تعالیٰ نے زنا کے گواہوں میں عدد اس لئے شرط قرار دیا ہے کہ ان معاملات میں (جب تک ثبوت نہ ہو) اصل ستر ہے اسی لئے نصاب شہادت میں نسبۃً زیادہ سختی اختیار کی گئی ہے۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۸۱)

ہوگیا چونکہ اس وقت اس قسم کے نکاح کی حضرت عمرؓ نے ممانعت فرمادی تھی، اس لئے انھیں یہ عذر کرنے کا موقعہ بھی نہ مل سکا کہ میں نے خفیہ نکاح کرلیا ہے چنانچہ جب عدم ثبوت کی وجہ سے مقدمہ خارج ہوگیا اور ان سے حقیقت حال دریافت کی گئی تو انھوں نے صاف طور پر اپنے نکاح کا حال بیان کردیا۔[1]

علماء جرح و تعدیل نے تمام تر احتیاط کے باوجود اپنی ان نکتہ چینیوں پر جو تنقیدِ حدیث کے سلسلہ میں انھوں نے راویوں کے متعلق کی ہیں بہت تاسف کا اظہار کیا ہے اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ شانِ ستاری ہرگز اس کے درپے نہیں ہے کہ وہ امت کے مجرمین کی برسرِ بازار رسوائی کا کوئی آئینی دستور تیار کرے۔[2]

یہ بنی اسرائیل جیسے باغیوں ہی کے لئے موزوں تھا کہ جب شب میں وہ کوئی گناہ کرتے تو اس کی صبح کو اپنے دروازوں پر لکھا ہوا دیکھ لیتے، یا مالِ حرام سے صدقہ دیتے تو آسمان سے آگ اترتی اور اُس کو جلائے بغیر واپس ہو جاتی اور یہ اُن کی رسوائی کا عام اعلان ہوتا۔ امتِ محمدیہ کے لئے اب یہ سب آئینِ پردہ داری منسوخ ہوچکے ہیں

---

[1] حضرت عمرؓ نے یہ ممانعت اس لئے فرمائی تھی کہ عام طور پر نکاح بہر دو وجہ سے کیا جاتا ہے یا تو اس میں شرعی مصالح کی پوری رعایت نہیں کی جاتی اس لئے اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کھلے طور پر یہ نکاح کرلیا گیا تو شاید کسی کو اس پر اعتراض ہوگا، یا اس دعویٰ کو نواحش کے لئے آڑ بنالیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو ان دونوں باتوں کا سدِباب منظور تھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے بھی اسی قسم کے مصالح کے پیشِ نظر انعقادِ نکاح کے لئے نصابِ شہادت شرط قرار دیا ہے۔ حالانکہ کسی اور عقد میں انعقاد کے لئے نصابِ شہادت شرط نہیں ہے

روی ابن النحوی فی البدر المنیر ان المغیرة ادعی فی تلک المرأة التی رموہ بها انها الزوجة قال وکان یری نکاح السر وروی انہ کان یتبسم عند شهادتهم فقیل لہ فی ذالک فقال انی اعجب مما ارید ان افعلہ بعد شهادتهم فقیل وما تفعلہ قال اقیم البینة علی انها زوجتی ذکرہ فی البدر المنیر۔ (الروض الباسم ج ۱ ص ۱۴۷)

ابن النحوی بدرِ منیر میں روایت کرتے ہیں کہ جس عورت کے معاملہ میں حضرت مغیرہ کو تہمت لگائی گئی تھی اُن کے نزدیک وہ ان کی بیوی تھی کیونکہ خفیہ طور پر نکاح کرلینا اُن کے نزدیک جائز تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب گواہ ان کے خلاف گواہی دے رہے تھے تو یہ کھڑے مسکرا رہے تھے جب اُن سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے کہ ان کی گواہی کے بعد جو میں کرنا چاہتا ہوں اسی کی وجہ سے مجھے ہنسی آرہی ہے۔ دریافت کیا گیا آپ کیا کہیں گے فرمایا میں اس کا ثبوت پیش کروں گا کہ یہ میری بیوی ہے۔ اس واقعہ کو بدرِ منیر میں ذکر کیا ہے۔

[2] ابن ابی حاتم کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دن ان کے سامنے کتاب الجرح والتعدیل پڑھی جارہی تھی۔ محمد بن مہرویہ رازی نے کہیں ان سے یحیٰی بن معین کا یہ مقولہ نقل کیا "ہم ان لوگوں پر بھی طعن کرگذرتے ہیں جو ہم سے دو دو سال پیشتر اپنے خیمے جنت میں لگا چکے ہیں"

یہ سُن کر ابن ابی حاتم رونے لگے اور جسم پر ایسا رعشہ طاری ہوا کہ کتاب ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس حکایت کو پھر دوبارہ انھوں نے سُنا اور خوب روئے۔

امت محمدیہ کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت

علماء نے اس امت کے آخری امت ہونے کی ایک لطیف حکمت یہی تحریر کی ہے کہ اب خدا تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس امت کی داستانِ عمل بھی پہلی امتوں کی طرح کسی اور امت کے سامنے پڑھی جائے۔

جماعتِ منافقین کی ریشہ دوانیوں سے کتبِ سیرت و تاریخ بھری پڑی ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ شریعت کا سلوک یہی تھا کہ ان میں سے جس نے نمائشی طور پر بھی اسلام کا نقاب ڈال لیا اس کو رسوا نہیں کیا گیا یعنی جو مومن کا بھیس بنا کر آگیا اسے آنے دیا گیا اور جس نے زبانی اسلام کی شہادت دیدی اس کی شہادت قبول کر لی گئی۔
ماسوا اس کے افتراق و تشتت، تعصب و نخوت کے دور میں جماعتوں کو نام لے کر گمراہ اور دوزخی ٹھیرانا بھڑکتے ہوئے فتنوں کو اور بھڑکانا ہے۔

امام غزالیؒ کی ایک مفید نصیحت

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ عہدِ ماضی میں عوام کی گمراہی کا باعث بعض مرتبہ خود اہلِ حق کا تعصب بن گیا ہے، انھوں نے حق کی حمایت میں ناحق جماعت کو بنظرِ حقارت و نفرت دیکھا جاہلوں نے صرف ان کی ضد میں اپنے جہل و عناد میں اور تشدد اختیار کر لیا۔ شدہ شدہ یہ وقتی ضد دائمی عقائد بن گئے حتی کہ کلام اللہ کے حدوث و قدم کے مباحث میں یہاں تک مبالغہ آمیزیاں ہوئیں کہ جو آواز ان کے حلقوم سے نکلتی ہے اس کو بھی قدیم کہدیا گیا۔ کاش اگر یہ مقابلے اور مناظرے نہ ہوتے تو یہ بے معنی کلمات جو بعد میں عقائد بن گئے شاید کسی مجنوں کی زبان سے بھی نہ نکلتے۔

اس عام سنت کے سوا اگر کہیں کسی جماعت یا فرد کا نام لیا گیا ہے تو کسی خاص ہی مصلحت کے لئے جس پر علماء نے اپنی جگہ کافی بحث کر دی ہے اس لئے ان فرقوں کی تعیین پر بحث کرنا قطعاً غیر ضروری ہے تاہم جب اذہان اس طرف متوجہ ہو گئے اور بحث شروع کر دی گئی تو مجبوراً ہمیں بھی کچھ لکھدینا مناسب ہے۔

اس موضوع پر علماءِ کلام اور علماءِ اصول دونوں نے اپنی اپنی جگہ گفتگو کی ہے۔ ہمارے نزدیک علامہ طرطوشیؒ کا کلام سب میں منتخب ہے اور اسی کو علامہ شاطبی نے بھی اختیار فرمایا ہے اس لئے ہم اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

یہ پہلے ثابت کیا جا چکا ہے کہ حدیث میں زیرِ بحث صرف وہ اختلافات ہیں جو تفرق فی الدین کی حد میں آسکتے ہیں۔ یہ وہ افتراق ہے جو صراطِ مستقیم سے وابستہ رہ کر انحراف کے نتائج میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام قرآنی لفظوں میں "السبل" رکھا گیا ہے اس کا حاصل اصل دین سے منسوب رہ کر اس کے بعض اصول و کلیات کے ساتھ اختلاف کرنا ہے اس لئے یہاں اختلاف و افتراق سے امتِ اجابت ہی کا اختلاف و افتراق مراد ہوگا۔ امتِ دعوت کا اختلاف جس میں کفار بھی داخل ہو جائیں مراد نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر یہ انحراف اپنی حد سے تجاوز

کر جائے تو اس کی انتہا کفر پر بھی ہو سکتی ہے۔

حدیث کے لفظ اُمتی تو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس اختلاف کا یہاں ذکر کیا گیا ہے وہ لفظِ امت کے تحت میں رہ کر ہی ہونا چاہئے۔ یہاں امت سے امتِ دعوت مراد لے لینا بہت بعید ہے کیونکہ اس امت کے اختلاف کو بنی اسرائیل کے اختلاف کے ساتھ تشبیہ دی جا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ ان کا اختلاف یہودیت و نصرانیت کے وسیع مفہوم میں داخل رہ کر ہی تھا اسی طرح اس امت کا اختلاف بھی امتِ اجابت میں رہ کر ہونا چاہئے۔ کفر اپنے تمام انواع و اقسام کیساتھ شریعت کی نظر میں ایک ہی ملت قرار دیا گیا ہے۔ اس کے تشتت و افتراق کی بحث شریعت میں غیر مفید بحث ہے۔ اگر تاریخی اعتبار سے نظر ڈالی جائے تو بھی یہی نظر آتا ہے کہ اسلام میں جو مختلف فرقہ بندیاں ہوئیں ہمیشہ وہ اسلام ہی کے نام پر ہوئیں۔ خوارج کی جنگ کی تمام بنیاد ہی یہ تھی کہ وہ اپنا قدم اسلام اور صراطِ مستقیم پر سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ کو دائرۂ اسلام سے باہر قرار دیتے تھے، معتزلہ، مرجیہ اور دیگر فرقِ باطلہ سب اپنی اپنی جگہ یہی دعویٰ رکھتے تھے کہ سیدھی راہ ان ہی کی راہ ہے دوسری جماعتیں منحرف اور حق سے ہٹی ہوئی جماعتیں ہیں ان وجوہ کی بنا پر ظنِ غالب یہ ہے کہ ان فرقوں کا ظہور صرف اسلام کے اندر مقدر ہے کفر کی جماعتیں اس میں شامل نہیں ہیں۔

فرقۂ باطلہ کی پہلی علامت بغض و نفاق ہے

ان فرقہائے باطلہ کی تعیین کا راستہ اب یہی ہو سکتا ہے کہ ان کی علامات پر اصولی طور پر بحث کی جائے۔ کتاب و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انحراف، زیغ اور افتراق کی بڑی علامت خود آپس کا اختلاف ہے۔ پس اگر کوئی مسئلہ اسلام میں زیرِ بحث آتا ہے اور اس کی وجہ سے افتراق و تشتت نہیں پھیلتا، بغض و عداوت کی ہوا نہیں چلتی، امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہوتا، آپس کی محبت و مودت ختم نہیں ہوتی تو اس کو اختلافِ مذموم نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اگر اس کا نتیجہ تحزب و تعصب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوتی ہے تو اسے انحراف کا اثر سمجھنا چاہئے۔ آیۃ ولا یزالون مختلفین کی تفسیر کے ذیل میں مجاہد فرماتے ہیں کہ مختلفین اہلِ باطل ہیں اور مرحومین کے متعلق لکھتے ہیں۔

اهل الحق ليس فيهم اختلاف　　　اہلِ حق میں اختلاف نہیں ہوتا۔

مطرف بن شخیر کہتے ہیں کہ اگر کہیں اہلِ اہوا میں بھی محبت و اتحاد ہوا کرتا تو یہ دھوکا لگتا کہ شاید یہی لوگ اہلِ حق ہوں لیکن جب اس نعمت سے وہ محروم ہیں تو اب ہر ذی عقل یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اہلِ حق نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کی شانِ اختلاف و افتراق نہیں۔

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ مختلفین اہلِ اہوا اور الا من رحم ربک اہلِ سنت والجماعت ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ رحمت اختلاف نہیں کرتے۔ [۱]

---

[۱] کتاب الاعتصام ج ۱ ص ۳۹ و ۴۰۔

یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ اُس وقت تک اہل حق کے قلوب میں فروعی اختلافات رکھنے کے باوجود کوئی بغض عناد نہ تھا گو آج یہ سمجھنا اور سمجھانا دونوں مشکل ہیں کہ فروعی اختلاف کے باوجود محبت کیسے قائم رہ سکتی ہے اگر غور کرو گے تو موجودہ افتراق کی بنار فروعی اختلافات نہیں ہیں بلکہ قلبی سرد مہری ہے۔ ہاں بہانہ بنانے کو یہ بوجہ مذہب کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے تاہم اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اگر رفع یدین اور آمین کے جھگڑے تحزب و تعصب اختلاف و افتراق کی صورت پیدا کر لیں تو ہرگز اس اختلاف کو بھی اہل حق کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا۔

حافظ ابن قیمؒ قیاس کی مذمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ قیاسات ہی کی بدولت امت کے کلمہ میں تفرق پھیلی اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ قیاسات خدا کی مرضی کے برخلاف ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا۔	اگر یہ قرآن اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف نظر آتا۔

حضرت ابن عباسؓ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تبیض وجوہ کا مصداق اہل سنت اور اہل ائتلاف ہیں اور تسود وجوہ کا مصداق اہل فرقت و اختلاف ہیں۔

اختلاف نہ کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آپس میں اختلاف برپا نہ کرو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پڑ جائے گا۔ اسی لئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی آیت کے مفہوم میں صحابہؓ کا اختلاف دیکھتے تو آپ کو سخت ناگوار ہوتا اور آپ کو اتنا غصہ آتا کہ آپ کا روئے انور انار کے دانہ کی طرح سرخ ہو جاتا اور فرماتے "کیا اس بات کا تم کو حکم دیا گیا تھا" بعثت رسول کا اصل مقصد ہی رفع اختلاف ہے اس لئے جو اختلاف کرتا ہے درحقیقت وہ اس اہم مقصد پر ہی ضرب لگاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا "اگر تم اختلاف کرو گے تو تمہارے بعد والے اور زیادہ اختلاف کریں گے"۔

ایک دن حضرت عمرؓ کو خبر پہنچی کہ ابی بن کعبؓ اور ابن مسعودؓ اس مسئلہ میں اختلاف کر رہے ہیں کہ نماز ایک کپڑے میں ادا کرنا سنت ہے یا دو کپڑوں میں، تو انہوں نے ممبر پر خطبہ دیا اور فرمایا "جب تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہو کر ایسے ایسے مسائل میں اختلاف کرو گے تو پھر تمہارے بعد مسلمان کس کے قول کو اختیار کریں گے مگر آج کے بعد میں نے سنا کہ دو شخصوں میں اختلاف ہو رہا ہے تو جو مجھے کرنا ہے کر گزروں گا"۔

حضرت علیؓ نے اپنے قاضیوں کو لکھ بھیجا "جیسے تم پہلے فیصلہ کیا کرتے تھے اب بھی اسی کے موافق کرتے رہو مجھے اختلاف پسند نہیں، میری تمنا ہے کہ جس طرح میرے پیشرو دنیا سے گذر گئے اسی طرح کسی اختلاف کے بغیر میں بھی گذر جاؤں"۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "پہلی امتیں اسی عادت کی بدولت ہلاک ہوئیں کہ وہ اپنے انبیاء علیہم السلام کے سامنے اختلاف کیا کرتی تھیں"۔ اور دوسری حدیث میں فرمایا کہ "اپنی کتاب کے بعض حصہ کو

بعض کے ساتھ متعارض سمجھ کر ٹکرایا کرتی تھیں. قرآن اس لئے نہیں آیا کہ تم اس میں اختلاف پیدا کر کے ایک آیت کو دوسری آیت سے ٹکراؤ بلکہ اس کا ایک حصہ دوسرے کی تصدیق کرتا ہوا اترا ہے۔ ؎۱

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام اسی عداوت وبغض کی رو میں بہے چلے جارہے تھے خدا تعالیٰ کا ان پر بڑا انعام ہوا کہ اس نے ان کی بہتی کشتی اختلافات کی دہارے نکال کر محبت ومودت کے کنارے لگادی۔

وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ	اور ذرا اُس زمانہ کو بھی یاد کرو جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پھر
بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ	اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈالدی اب جو صبح ہوئی ہے تو تم
إِخْوَانًا۔	اس کی مہربانی سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بنے ہوئے تھے۔

پس قلوب میں انس ومحبت، الفت واخوت یہ خدا کی بڑی نعمت ہے اس لئے یہ حصہ اسی کا ہوسکتا ہے، جو اِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ کی فہرست میں داخل ہوچکا ہے اس کے بالمقابل اختلاف وافتراق اس نعمت سے محروم ہونے کی نشانی ہے۔

امام بخاریؒ نے کتاب الاعتصام میں ایک باب قائم کر کے لاتزال طائفۃ کی حدیث نقل کی یعنی میری امت میں ایک جماعت ہمیشہ حق پر رہے گی۔ اس کے بعد دوسرا باب قائم کیا اور یہ آیت تحریر فرمائی "او یلبسکم شیعًا" خدا تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ تمہاری پارٹیاں بنادے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ان دونوں بابوں کے درمیان مناسبت یہ ہے کہ پہلی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اس امت میں آئندہ اختلاف ہوگا حتی کہ حق پر قائم رہنے والا صرف ایک طائفہ رہ جائے گا اس لئے آئندہ باب میں اس اختلاف کی وجہ بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انواعِ عذاب میں اختیار دیا گیا تو آپ نے عذاب کی تمام قسموں میں سے عذابِ افتراق کو پسند فرمالیا تھا کہ اس میں پہلی امتوں کی طرح آپ کی امت کا استیصال تو نہ تھا۔ پس معلوم ہوا

؎۱ دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۲۵ وجامع بیان العلم ج ۲ ص ۸۳ و ۸۴۔

حضرت عمرؓ کے اس خطبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سیاسی نظر کیسی دور بیں تھی وہ اجتہاد کو نہیں روکتے اختلاف کو روکتے ہیں، مناظرے کو روکتے ہیں اور ایسی بحث کو روکتے ہیں جو برسرِ دست گو اختلاف نہ کہلائے مگر آئندہ کہیں امت کے لئے اختلاف کا تخم نہ ڈالدے۔ اسی طرح قرآن میں بحث وتمحیص کی ممانعت نہیں۔ ممانعت اس بحث کی ہے جس کا حاصل قرآن کی آیات میں اختلاف وتعارض ثابت کرنا ہو کوشش یہ کرنا چاہئے کہ جہاں اختلاف ہو اس کو تاامکان رفع کیا جائے۔ جہاں تعارض نظر آئے اُسے دُور کیا جائے نہ یہ کہ جہاں اختلاف کا کوئی شائبہ نہ ہو وہاں دماغ سوزی کر کے اختلاف پیدا کیا جائے۔ اہلِ حق اور اہلِ اختلاف کے مزاج کا اگر اندازہ کروگے تو دونوں کی بحثوں میں مابہ الامتیاز یہی ہوگا، ان کا مقصد بحث کر کے اختلاف مٹانا ہے اِن کا مدعا بحث کر کے اختلاف پیدا کرنا ہے۔ واللہ المستعان۔

کہ اختلاف و تشتت یہ ایک عذاب ہے اور اہلِ باطل کی نشانی ہے۔ [1]

دوسری علامت اتباعِ متشابہات ہے

مسئلہ کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے پہلے محکم و متشابہ کی حقیقت ذہن نشین کرنا ضروری ہے قرآن کریم کہتا ہے:۔

هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ — خدا ہی نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں آیاتِ محکمات ہیں

مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ — جو کتاب کا بڑا حصہ ہے اور دوسری آیات متشابہات ہیں۔

عربی میں لفظِ اُم کے معنی اصل اور بڑے کے آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کو ام القریٰ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ زمین کا مرکزی نقطہ اور اس کی اصل یہی ہے، یہیں سے زمین اطراف وجوانب میں پھیلائی گئی ہے۔ سورۂ فاتحہ کو بھی ام الکتاب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اصولِ کتاب پر حاوی ہے۔ ام الطریق بڑے راستہ کو کہا جاتا ہے وہ بھی چھوٹے راستوں کے پھٹنے کی اصل ہوتا ہے۔ دراصل ام میں اصل ہونے کے ساتھ اس کے مرجع اور مرکز ہونے کا مفہوم بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ ماں کو عربی میں اسی لئے ام کہتے ہیں کہ وہ اولاد کی اصل اور ان کا مرجع ہوتی ہے یعنی وہ اسی کے ارد گرد رہتے ہیں، ضرورت کے وقت اسی کی طرف لوٹ کر آتے ہیں۔ جنگ کے بڑے جھنڈے کو بھی اُم اسی لئے کہا جاتا ہے کہ لشکر کر وفر کے وقت اسی جگہ لوٹ کر آتا ہے۔ [2]

اس لحاظ سے محکمات کے ام الکتاب ہونے کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ قرآن کا بڑا حصہ اور اصل ہیں یہ اپنی جگہ قائم رہیں گے اور قرآن کا دوسرا حصہ جو نہ اس کی اصل ہے اور نہ اتنا بڑا ہے وہ انھیں محکمات کے ارد گرد گھومتا رہے گا جب ان میں کوئی الجھاؤ پیش آئے گا تو ان ہی محکمات کی طرف لوٹ کر حل کر لیا جائے گا اور ام کی طرح ان کو مستقل حیثیت حاصل نہ ہوگی۔ جب آپ محکم و متشابہ کا فرق سمجھ چکے تو اب سنئے کہ محکمات و متشابہات کی اس تقسیم ہی نے یہاں خدا کی قہر و مہر کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ مومن، راسخ فی العلم کے لئے راستہ یہ ہے کہ وہ محکمات پر عمل کرتا رہے اور متشابہات پر ایمان لاتا رہے۔ اس کے برعکس کج فطرت، بد و تیرہ ضمیر کر لیتا ہے کہ قرآن کا جو کھلا ہوا حصہ ہے اسے تو متشابہات کی طرح عملاً چھوڑ دیتا ہے اور جو متشابہات ہے اس کو محکمات کی طرح زیر بحث لے آتا ہے متشابہات خود تو اپنی مراد میں واضح نہیں ہوتے اور یہ شخص ام کتاب کی طرف رجوع نہیں کرتا اس لئے

---

[1] اگر آپ اختلاف کے صحیح معنی سمجھ گئے ہیں تو یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تو برعکس اہلِ حق میں اختلاف اور اہلِ باطل میں اتفاق نظر آتا ہے۔

[2] اس لحاظ سے سورۂ فاتحہ کو ام الکتاب کہنے کی ایک لطیف حکمت یہ بھی ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں اپنی جگہ رہتی ہے۔ بقیہ قرآن اس سے آ آ کر ملتا رہتا ہے۔ اب یہ بات بھی حل ہوگئی کہ ہر رکعت میں خاص سورۂ فاتحہ ہی کیوں واجب کی گئی ہے۔ بقیہ سورتوں میں کوئی اور سورت واجب کیوں نہیں کی گئی، اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن میں جو سورت اُم کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہی سورۂ فاتحہ ہے اس لئے اسی کا حق ہے کہ یہ سورت بہ حیثیت ام اپنی جگہ رہے اور بقیہ قرآن اس سے آ آ کر ملتا ہے۔

(از افادات حضرت استاذ قدس سرہٗ)

جس قدر اس کی مراد حاصل کرنے میں دوڑتا جاتا ہے اسی قدر منزلِ مقصود سے بعید تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ کہیں پہنچکر اس کی پیاس بجھے مگر اس کی تشنگی اور بڑھتی رہتی ہے اور اسی جدوجہد میں اس کی عمر تمام ہوجاتی ہے نہ اُسے ساحلِ مراد ہی ہاتھ آتا ہے نہ اس بدنصیب کا سفر ہی تمام ہوتا ہے۔

خدائے قدوس نے حل و حرمت اور عمل کے جتنے آئین بنائے ہیں اس میں کوئی ابہام نہیں رکھا اور جہاں ابہام رکھا ہے اس پر عمل کی دعوت نہیں دی بلکہ صرف ایمان لانے کا امر کیا ہے۔ اب اگر کوئی بدنصیب صحیح راہ نہیں چلتا اور خود بھٹکتا پھرتا ہے تو یہ قصور اس کا ہے یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا کا راز اسی میں مضمر ہے۔ اسی جگہ مخلص و غیر مخلص، سعید و شقی کا فرق واضح ہوتا ہے۔ شانِ تفویض و تسلیم، تمرد و سرکشی کا یہی نقطۂ امتحان ہے، فرقہائے باطلہ کے پھوٹنے کا یہی سرچشمہ ہے اس لئے اس پر دوبارہ پھر تفصیلی نظر ڈالئے۔

محکم و متشابہ کی تحقیق محکم کے دو معنی ہیں ایک عام اور ایک خاص۔ خاص اصطلاح میں محکم منسوخ کے بالمقابل مستعمل ہوتا ہے۔ اس بنا پر قرآن کی جو آیات منسوخ نہیں وہ سب محکمات کہلائیں گی اور جو منسوخ ہیں ان کو متشابہات کہا جائے گا۔ محکم کے عام معنی یہ ہیں کہ جو آیات اپنی مراد میں واضح اور کھلی ہوئی ہیں وہ محکمات ہیں۔ اس اصطلاح کے موافق متشابہات وہ آیات ہوں گی جو اپنی مراد میں واضح نہ ہوں خواہ بحث و تمحیص کے بعد حل ہوسکیں یا نہ ہوسکیں اس بنا پر متشابہات کی دو قسمیں ہوجائیں گی (۱) حقیقی (۲) اضافی۔ متشابہ حقیقی وہ ہوگا جس کی مراد نہ خود شریعت نے بتلائی ہو نہ اس کے حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہو۔ یعنی تحقیقات کے تمام دروازے بند نظر آئیں اور جو دروازہ کھلا ہوا ہو وہ صرف ایک ایمان کا دروازہ ہو۔ قرآن کریم میں ایسے متشابہ کا وجود بہت ہی نادر ہے اور اس کا مقصد بجز ایمان لانے کے اور کچھ نہیں ہے۔ آیت بالا میں متشابہات سے یہی معنی مراد ہیں۔[۱]

متشابہ اضافی قرآن کریم کا وہ حصہ ہے جس کی تفصیل خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان کردی ہے۔ مثلاً کسی عام کی تخصیص یا کسی مطلق کی تقیید لیکن بے علمی یا کج فطرتی یا اتباع ہویٰ اس تحقیق کی فرصت نہیں دیتی کہ کلام کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے۔ عام و خاص، مطلق و مقید کے ارتباط کا لحاظ کیا جائے بلکہ صرف یکطرفہ نظر کرکے قرآن کے خلاف ایک معنی پیدا کرلیتی ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ ایک شخص نے جابر جعفی سے دریافت کیا کہ ذیل کی آیت کا کیا مطلب ہے۔

فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْۤ اَبِيْۤ اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ۔

اس نے جواب دیا اس آیت کا مصداق ہنوز ظاہر نہیں ہوا۔ سفیان نے فرمایا جھوٹ بولتا ہے۔ حمیدی کہتے ہیں ہم نے سفیان سے دریافت کیا اس شخص کا مطلب کیا تھا فرمایا روافض کا عقیدہ ہے کہ حضرت علیؓ بادلوں

---

[۱] یہ معنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہیں۔ (تفسیر المنار ج ۳ ص ۱۶۴)

میں چھپے بیٹھے ہیں، جب کبھی ان کو حکم ہوگا تو اپنی اولاد کے ساتھ آسمانوں میں ظاہر ہوں گے، یہ رافضی اُس پر اس آیت کو چسپاں کرنا چاہتا ہے۔

اب غور کیجئے کہ آیت کا تمام سیاق و سباق صاف صاف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بارے میں ہے۔ یہاں اس مہمل سراپا کذب عقیدہ کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ مگر اس شخص نے جب آیت کو اپنے مذہب پر ڈھالنا چاہا تو اس کو اول و آخر سے علیحدہ کر کے صرف درمیان کا حصہ پڑھا۔ اسی طرح خوارج صرف ان الحکم الا للہ رٹا کئے اور یہ نہ دیکھا کہ خود قرآن ہی میں دوسری جگہ انسانوں کی تحکیم موجود ہے۔ جبریہ کا حال بھی یہی ہے وہ بھی صرف

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ　　　اللہ نے تمہیں اور تمہارے عمل کو پیدا کیا

کو لئے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جب ہمارے عمل بھی اسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو اب ہمارا اختیار کیا رہا۔ لیکن اُسی قرآن میں جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (یہ بدلہ ہے اُن کاموں کا جو انھوں نے خود کئے ہیں) بھی موجود ہے۔ جس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بندہ کے افعال اس کے کسب و اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

غرض باطل فرقوں کا یہی دستور ہے کہ پہلے وہ ایک خیال نکالیتے ہیں پھر اس پر قرآن سے استدلال قائم کرنے کے لئے کسی آیت کی آڑ تلاش کر لیتے ہیں اور ہوٰی پرستی کا رنگ چڑھا کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتے کہ اسی قرآن میں دوسری جگہ اس کی تشریح ان کے مدعا کے خلاف موجود ہوتی ہے پس متشابہ اضافی بعض کے لحاظ سے تو متشابہ ہوتا ہے اور بعض کے لئے محکم ہوتا ہے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ جب خود شریعت نے مبہم کو مفصل، عام کو خاص، مطلق کو مقید کر دیا ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی تشابہ نہیں رہتا اور اسلئے علماء کو اس پر بحث کا حق حاصل ہوتا ہے اور اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی توضیح میں ایک قاصر الفہم کے لئے دوسری آیت کی طرف رجوع کرنے کا محتاج ہوتا ہے، جس کی اہلیت اس شخص میں موجود نہیں ہوتی تو اس کے لئے یہی کہا جائے گا کہ جس طرح متشابہاتِ حقیقیہ کی تفتیش علماء کے لئے ممنوع تھی اسی طرح ان آیات محکمات پر بحث کرنا اس کے لئے ممنوع ہے۔ اب متشابہ حقیقی اور متشابہ اضافی میں فرق یہ رہے گا کہ متشابہ حقیقی پر بحث و تفتیش کرنا مطلقاً زیغ کی علامت تھی، متشابہ اضافی پر بحث کرنا صرف نااہل اور بے علموں کے لئے زیغ کی علامت ہوگی۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ تشابہ کبھی فی نفسہ ہوتا ہے کبھی اپنے قصورِ علمی کی وجہ سے نظر آنے لگتا ہے، حکم دونوں جگہ ایک ہے۔ متشابہ حقیقی سب کے لئے متشابہ ہے اس لئے کسی کو بحث کرنے کی اجازت نہیں اور متشابہ اضافی جس کے حق میں متشابہ ہے خاص اس کے لئے اس پر بحث کی اجازت نہیں لیکن جب اہل زیغ اپنی بے علمی کا ادراک نہیں

[1] دیکھو الموافقات ج ۳ ص ۸۹ - ۹۳۔

کرتے یا ادراک کے باوجود محض جسارت اور اتباعِ ہویٰ کی وجہ سے اس وادی میں قدم رکھدیتے ہیں تو پھر اسی جگہ کی وہ شاخیں پھوٹنے لگتی ہیں جن کو قرآنِ کریم میں "السبل" کہا گیا ہے اور اختلافِ مذموم کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ [۱]

تیسری علامت اتباعِ ہویٰ ہے۔ گذشتہ مباحث میں اس پر آیات واحادیث کی روشنی میں کافی بحث گذر چکی ہے۔ ان ہر سہ علامات میں فرق یہ ہے کہ پہلی علامت یعنی اختلاف وتشتت کی شناخت ہر شخص کرسکتا ہے دوسری علامت کی شناخت صرف علماء راسخین کا حصہ ہے کیونکہ وہ محکمات ومتشابہات کے فرق پر موقوف ہے اور اس کا علم علماء ہی کو ہو سکتا ہے۔ تیسری علامت خود انسان ہی کے فیصلہ کی بات ہے وہ خود ہی اس کا فیصلہ کرسکتا ہے کہ اس کے باطن میں اتباعِ ھُدیٰ کا جذبہ ہے یا اتباعِ ہویٰ کا۔

اب اگر آپ کو فرقہائے باطلہ کی شناخت کرنی ہے تو ان علامات سے کر لیجئے مگر ان علامات کے بعد بھی دائرۂ بحث ختم نہیں ہوگا اس لئے اس بحث کو تمام کرنے کا وہی ایک راستہ ہے جو یہاں صحابۂ کرام نے اختیار فرمایا تھا یعنی ان ۷۲ فرقوں کی تعیین یا ان کی علامات پر سوال وجواب کی بجائے یہ تحقیق کر لی جائے کہ فرقۂ ناجیہ کونسا فرقہ ہے یہ مفید بھی ہے اور مختصر بھی۔

فرقۂ ناجیہ کی تعیین اور بقیہ فرقوں کے ابہام کی حکمت صحابۂ کرامؓ نے اس راستہ کو اس لئے چھوڑ دیا تھا کہ وہ یہ جانتے تھے کہ راہِ مستقیم بغیر صاحبِ وحی کے بتائے ہوئے قطعی طور پر دریافت ہی نہیں ہو سکتی۔ اگر صرف ہماری عقل اس کے لئے کافی ہو سکتی تو انبیاء علیہم السلام کی حاجت ہی کیا رہتی اس لئے اس کی تعیین تو خود رسول ہی کی زبان سے ہو جانا چاہئے یہ امت کے اجتہاد پر سپرد کرنے کا مسئلہ نہیں ہے ہاں شاہراہِ نجات متعین ہو جانے کے بعد سُبُلِ منحرفہ کی تعیین امت کے سپرد کی جاسکتی ہے گویا عمل کے لئے میدان صاف کر دیا گیا ہے اور صرف نظری مرحلہ میں امت کے فہم واجتہاد کا امتحان لیا گیا ہے۔

شریعتِ محمدیہ صفتِ اعتدال میں اتنی اتم واکمل ہے کہ دوسرے ملل مستقیمہ میں گویا "الصراط المستقیم" اس کا

---

[۱] تفسیر المنار میں محکم ومتشابہ کی بحث بہت مکمل موجود ہے۔ فاضل مصنف نے صرف اس مسئلہ پر ۲۲ صفحہ پر بحث کی ہے اگر اس کے دوسرے اطراف وجوانب کا بھی لحاظ کیا جائے تو پورے ۶۲ صفحات پر یہ مباحث پھیلے ہوئے ہیں۔ اور محکم ومتشابہ کی تفسیر میں دس اقوال پیش کرنے کے بعد یہ اختیار کیا ہے کہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جس کی مراد بالکل غیر معلوم ہو بلکہ اس کو غیر معقول قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس شے کا ہم ادراک نہیں کرسکتے وہ متشابہات کے معانی نہیں بلکہ ان کی پوری پوری کیفیات ہیں مثلاً صفاتِ الٰہیہ کی کیفیت، جنت ودوزخ اور دوسرے عالمِ غیب کی تفصیلی کیفیت، استواء علی العرش اور قیامِ قیامت کی کیفیت اور اس قسم کے دوسرے امور ان کے نزدیک قرآنِ کریم میں صرف متشابہ اضافی ہے، متشابہ حقیقی کا کوئی وجود نہیں جو لوگ متشابہات پر دورِ حاضر کے اعتراضات کا جواب دینا چاہیں ان کے لئے اس کا مطالعہ کرنا ضروری ہے ان کے کلام کا اصل ماخذ حافظ ابن تیمیہؒ کی سورۂ اخلاص کی تفسیر ہے۔ محمد بن ابراہیم وزیرؒ نے بھی اس جگہ مفید کلام کیا ہے۔ (دیکھو الروض الباسم ج ۲ ص ۵۲۔)

ایک لقب بن گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ جتنا توازن، جتنا اعتدال، جتنا اقتصاد اور میانہ روی اس شریعت میں ملحوظ ہے اتنی دوسری شرائع میں نہیں۔ شریعت موسویہ و عیسویہ کے افراط و تفریط کا حال معلوم ہے، گو وہ اپنے زمانہ کا توازن درست رکھنے کے لئے کتنی ہی معتدل ہوں مگر اس شریعت کے اعتدال کے بالمقابل رکھی نہیں جا سکتیں آخر وہ اصر اور اغلال (شدید احکام) کیا چیزیں تھیں جنہیں شریعتِ مصطفویہ نے میزانِ شریعت سے نکال کر اعتدال کی صورت پیدا کی ہے۔ اسی وصف ممتاز کے لحاظ سے اس امت کو امتِ وسط کہا گیا ہے اس لئے یہاں ادنیٰ ادنیٰ انحراف بھی نمایاں ہو جاتا ہے اور وہ صراطِ مستقیم سے ہٹے ہوئے سبل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ۔

سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ "قصد السبیل" یعنی میانہ راستہ طریقِ سنت ہے اور "منہا جائر" ملل و سبل متفرقہ ہیں۔ مجاہد نے اس کو اور زیادہ صاف الفاظ میں بیان کیا ہے وہ "قصد السبیل" کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

المقتصد بين الغلو والتقصير وذلك	یعنی میانہ روی یہ ہے کہ نہ اس میں غلو اور مبالغہ ہو اور نہ کوتاہی
يفيد ان الجائر هو الغالي او المقصر و	رہے اس کے بالمقابل جائر کا مفہوم یہی ہوگا کہ اس میں یا تو
كلاهما من اوصاف البدع۔ [1]	غلو نظر آئے یا کوتاہی، یہ دونوں طل منحرفہ کے اوصاف ہیں۔

ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ اقتصاد اور اعتدال کتنی کٹھن منزل ہے اگر پلہ ذرا جھکتا ہے تو غلو ہو جاتا ہے اگر ذرا اٹھتا ہے تو تقصیر کا الزام عائد ہوتا ہے اس لئے اعتدال کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہر وقت شریعت پر ترازو کی طرح ٹکٹکی بندھی رہے کہ کہیں ڈگمگاتی تو نہیں ہر بوالہوس کے یہ نصیب کہاں ؎

ایں شربت عاشقیست خسرو | بے خونِ جگر چشید نتواں

کلہم فی النار الا واحدۃ

یہاں ایک شبہ یہ بھی پیش آرہا ہے کہ اس امت کی اکثریت اگر جہنم میں ہو تو یہ امت مرحومہ کیسے ہو سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک اصولاً یہ سوال ہی غلط ہے یہ فیصلہ ابھی قبل از وقت ہے۔ درمیانی مراحل سے گذر کر جب یہ امت جنت میں داخل ہو جائے اس وقت یہ توازن قائم کرنا چاہئے کہ دوسری امتوں کے مقابلہ میں یہ امت زیادہ ہے یا کم، اس وقت یہ صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ درحقیقت یہ امت امتِ مرحومہ ہے یا نہیں [2]

نیز یہ بھی تو سوچئے کہ اس امت کی ضرب المثل وحدت، اس کی خداترسی، راستبازی، باہمی ہمدردی وسلوک یہ اس کے دورِ عروج کی باتیں ہیں اس کے برعکس اس کا افتراق و تشتت، اس کا تفرق و کجروی یہ اس کے دورِ نزول کی داستان ہے۔ کسی قوم کے دورِ عروج کی تاریخ اس کے دورِ زوال میں پڑھنے کی سعی کرنا بڑا ظلم ہے

---

[1] الاعتصام ج ا ص ۲۷۔ [2] ترمذی میں روایت ہے کہ اہلِ جنت کی کل صفیں ایک سو بیس ہوں گی جس میں اسّی اس امت کی اور بقیہ چالیس سب امتوں کی۔

جن احادیث میں اس امت کی خیریت و برتری موجود ہے اُن ہی میں اس کے دورِ انحطاط کا یا افتراق مذکور ہے پھر اس میں تردد و شبہ کی کیا بات ہے۔

کلہم فی النار کی تحقیق

یہاں ایک بڑے عالم محقق نے یہ جواب دیا ہے کہ "کلہم فی النار" دراصل ایک محاورہ ہے جو کسی چیز کے غلط اور ناقابلِ قبول ہونے کے موقعہ پر بولا جاتا ہے جیسا کہ اردو میں کہدیتے ہیں کہ "اسی چولھے میں ڈالو" یہاں درحقیقت دوزخی ہونا مراد ہی نہیں مگر ہمیں اس جواب میں تردد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حدیث کے دوسرے الفاظ میں "واحدۃ فی الجنۃ" "صرف ایک فرقہ جنت میں ہوگا" موجود ہے۔ لفظ نار اور جنت کا تقابل یہاں اس محاورہ کی گنجائش نہیں دیتا۔

ہمارے نزدیک حدیث کی راجح مراد وہ ہے جو حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے بیان فرمائی ہے اور جس کو شاہ عبدالعزیزؒ نے جزوی اصلاح کے ساتھ اپنے فتاوی میں نقل فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس ایک فرقہ سے مراد وہ فرقہ ہے جو بلا کسی ادنیٰ عذاب کے جنت میں جائے گا اور یہ وہ ہوگا جس میں اعتقادی اور عملی کسی پہلو سے بھی بدعت نے راہ نہ پائی ہوگی۔ اگر بنا بر بشریت کوئی عملی کمزوری اُن سے سرزد بھی ہوگئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی رحمت یا اُسے معاف کردے گی ورنہ قبر اور محشر کے شدائد میں کہیں اس کا حساب مجری کرلے گی۔ اس کے بالمقابل جو باطل فرقے ہیں ان کو اپنے افتراق و تشتت کی سزا بھگتنا پڑے گی اس کے بعد وہ بھی جنت میں چلے جائیں گے۔ آخر کار اس امت کا ہر ہر فرقہ کچھ عذاب پاکر یا بلا عذاب جنت میں داخل ہوجائے گا۔ یہی مطلب ہو سکتا ہے ابن عمرؓ کی اس حدیث کا۔

ما من امۃ الا و بعضہا فی النار و بعضہا فی الجنۃ الا امتی فانہا کلہا فی الجنۃ

ہر ایک امت کے کچھ لوگ جنت میں اور کچھ دوزخ میں جائیں گے مگر ایک میری امت ہے جو پوری کی پوری جنت میں جائے گی۔

یہ حدیث معجم اوسط اور معجم صغیر میں طبرانی نے روایت کی ہے۔ صاحب جمع الفوائد فرماتے ہیں کہ اس کی سند ضعیف ہے تاہم اس کی مراد وہ ہے جو ہم نے ابھی آپ کے سامنے ذکر کی ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس امت کے لئے مدارِ نجات صرف کلمۂ توحید ہے اور معصیت موجب عذاب نہیں۔ یہ اہلِ سنت والجماعت کا مذہب نہیں ہے مرجیہ کا مذہب ہے۔ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ نے اپنی امت کے بعض افراد کو بچشم خود دوزخ میں دیکھا پھر یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ یہ تمام امت بلا عذاب جنت میں داخل ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ظاہر یہی ہے کہ اس فرقہ سے وہی فرقہ مراد ہے جس نے سنت پر ٹھیک ٹھیک عمل کیا ہے بدعت سے وہ ہمیشہ دور اور نفور رہا ہے، اس کے اعتقاد و عمل کے دونوں بازو درست ہیں، یہی فرقہ سیدھا جنت میں داخل ہوگا اور لفظ "ما انا علیہ و اصحابی" بھی زیادہ اسی پر چسپاں ہوتا ہے۔

فرقۂ ناجیہ کی تحقیق

ما انا علیہ واصحابی ـــــ الجماعۃ ـــــ السواد الاعظم

درحقیقت یہی وہ مسطر ہے جس کو سرورِ کونین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے تیار کیا تھا کہ صفحاتِ عالم پر آئندہ عقائد و اعمال کی جب کوئی سطر کھینچی جائے تو وہ اسی مسطر سے برابر کرلی جائے مضمون بالا مطالعہ کرنے کے بعد اب یہ فیصلہ کرنا آپ کو آسان ہوگا کہ وہ جماعت کونسی ہے جس کو معیارِ حق و باطل قرار دیا گیا ہے مختصر یہ کہ یہ وہ راسخ العلم جماعت ہے جو نہ تو الفاظ کی جکڑ بندیوں میں اتنی مقید ہے کہ عقل کو بالائے طاق رکھدے نہ عقل کے گھوڑے پر ایسی سوار ہے کہ آنکھ بند کرکے علمِ سلف کو پامال کرتی چلی جائے بلکہ علمِ صحیح اور فہمِ صحیح کی دو ردشنیوں میں اسی طریق کا پورا احترام رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا طریق تھا۔ اس راہِ مستقیم پر نہ تو اختلاف کی کھائیاں ہیں اور نہ بغض و عناد کی پہاڑیاں بلکہ یہ وہ راہ ہے جس کے دن رات دونوں برابر ہیں لیلہا ونہارہا سواء۔

اختلاف کی تشریحات پڑھنے کے بعد اب یہ یقین کرلینا آپ کو آسان ہوگا کہ صحابہ کی جماعت میں کوئی اختلاف نہیں تھا وہ صرف فروعی مسائل میں جہاں ضروری سمجھتے اجتہاد کرلیتے تھے ان کے دَور میں عمل ہی کا چرچا تھا اس لئے ایک مکمل دین کے جو طے شدہ مسائل تھے وہی مشغلہ ان کے لئے کافی تھا فرضی مسائلِ ذات و صفات کے مباحث سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا اگر دین کے عملی حصہ کو صرف عمل کے لئے دیکھا جائے تو وہ آج بھی اتنا ہی مختصر اور صاف نظر آئے گا مگر افسوس تو یہ ہے کہ دورِ فتن نے بدنصیبی سے ہمارے حصہ میں عمل کی بجائے اختلاف کا مشغلہ لگا دیا ہے۔

اختلاف امتی رحمۃ کی تشریح یہ ایک ضعیف الاسناد[1] حدیث ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے اس کی شرح میں علماء کے مختلف خیال ہیں قاسم بن محمد فرماتے ہیں۔

"کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے عملی اختلاف میں ہمارا یہ بڑا فائدہ رکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ان میں کسی کے مطابق بھی عمل کرلے" اس کے لئے اتنی گنجائش نکل آئی ہے۔"

ابن وہب اس کی مزید تشریح نقل فرماتے ہیں:۔

"قاسم بن محمد کہتے ہیں کہ مجھے خلیفۂ عدل عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول بہت پسند ہے کہ مجھکو یہ تمنا نہیں ہوتی کہ

---

[1] صاحب مقاصد حسنہ فرماتے ہیں کہ حدیث "اختلاف امتی رحمۃ" کو بیہقی نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں مرفوعاً روایت کیا۔ طبرانی اور دیلمی اور ضحاک نے اس کو منقطع طور پر روایت کیا ہے۔ عراقی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف مرسل ہے۔ خطابی کے کلام سے مستفاد ہوتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں۔ بیضاوی کے حاشیہ میں ہے کہ اس حدیث کو سبکی وغیرہ نے ذکر کیا ہے مگر محدثین کے طبقہ میں یہ حدیث معروف نہیں (الموضوعات ص ۹۱) ان چند نقول سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث کا سندی پایہ کمزور ہے تاہم بے اصل بھی نہیں۔

صحابہ میں اختلاف نہ ہوتا اگر کہیں مسائلِ دینیہ میں ایک ہی قول ہوتا تو بعض صورتوں میں لوگوں کے لئے وہ عملی تنگی کا باعث ہو جاتا لیکن اب ان کے اختلاف سے دین میں عمل کی مختلف راہیں نکل آئیں چونکہ وہ ہمارے مقتدیٰ ہیں اس لئے اب اگر ان میں کسی کا قول اختیار کر لیا جائے تو وہ بھی دین کی ایک سنت پر عمل سمجھا جائیگا۔[1]

اس کا بظاہر حاصل یہ ہے کہ صحابۂ کرام چونکہ زیر سایہ نبوت تربیت یافتہ تھے. شریعت کے اغراض و مقاصد کو پوری طرح سمجھنے اور رعایت کرنے والے تھے اس لئے ان کے اختلاف کی وجہ سے ایک عمل کی جو مختلف صورتیں پیدا ہوئیں وہ سب دین ہی کی راہیں کہلائیں گی اور سب مقبول ہوں گی اگر ان کے اختلاف کی بدولت ہمارے سامنے یہ مختلف صورتیں نہ آتیں اور ایک عمل کی ایک ہی صورت ہوتی تو بعض حالات میں اسی ایک صورت پر عمل کرنا دشواریوں کا موجب بن سکتا تھا۔ اس بنا پر ان کے اختلاف کے رحمت ہونے کا مطلب دین میں عملی وسعت ہوگا۔ امام شاطبیؒ کو یہاں ایک اور دشواری پیش آگئی ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی کج فہم اس کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ ہر شخص کو اس بات کا حق ہے کہ حسب خواہش وہ جب چاہے جس صحابی کا قول چاہے اختیار کر سکتا ہے یہ بالکل غلط ہے اس لئے فرماتے ہیں۔

"یہ بات طے شدہ ہے کہ شریعت کے ہر ہر مسئلہ میں جزئی جزئی مصلحت کے علاوہ ایک کلی مصلحت بھی ہے. جزئی مصلحت تو خاص اس مسئلہ کی دلیل اور حکمت سے ظاہر ہوتی ہے لیکن کلی مصلحت یہ ہے کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے اعتقادی، قولی، عملی، ہر پہلو میں آئین شریعت کا مقید رہے اور ایک سانڈ کی طرح آزاد نہ رہ سکے اس کی ہر ہر نقل و حرکت شریعت کے اشاروں پر ہو۔"[2]

اس کے بعد پھر قاضی اسمٰعیلؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے اختلاف سے جو وسعت ہم کو حاصل ہوئی ہے وہ دین میں اجتہاد کرنے کی وسعت ہے کیونکہ ان کا اختلاف اس کی دلیل ہے کہ غیر منصوص مسائل میں انہوں نے اجتہاد کیا ہے اور اس اجتہاد ہی کی وجہ سے ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اختلافات کے رحمت ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صحابہ کے مختلف افعال میں ہر شخص کو بے دلیل اپنی مرضی کے مطابق انتخاب کا حق حاصل ہو گیا ہے۔"[3]

"ابن عبد البر نے قاضی اسمٰعیلؒ کی رائے پسند کی ہے اور اپنی کتاب جامع بیان العلم میں اس پر مفصل کلام کیا ہے۔"[4]

قاضی اسمٰعیلؒ کا مطلب یہ ہے کہ گوناگوں واقعات اور مختلف حوادث کے لئے ہمیشہ نص صریح کا ملنا تو دشوار ہے اس لئے امت کے لئے دینی مسائل میں اجتہاد کرنا ایک ناگزیر مسئلہ تھا جس کے لئے متاخرین امت کو ابتدائی قدم اٹھانا بہت مشکل ہو جاتا، جب صحابۂ کرام میں اختلافات ہوئے اور معلوم ہوا کہ یہ اختلافات

[1] الاعتصام ج ۲ ص ۱۲۶ [2] الموافقات ج ۴ ص ۱۳۱۔ [3] ایضاً ج ۴ ص ۱۲۲۔ [4] ج ۲ ص ۸۰ تا ۹۲۔

ان کے اجتہاد کی وجہ سے پیدا ہوئے تو اب امت کے لئے بھی اجتہاد کا جواز نکل آیا یہی وہ رحمت ہے جس کی طرف اختلاف امتی رحمۃ میں اشارہ کیا گیا ہے اگر ان میں یہ اختلافات نہ ہوتے تو یہ ثابت ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم سے پیشرو امت نے دین کے باب میں اجتہاد کیا ہے یا نہیں، ان حالات میں ہمارے لئے از سرِ نو اجتہاد کا دروازہ کھولنا بہت مشکل تھا، ادھر اجتہاد کرنا مشکل، اُدھر ہر جزئی مسئلہ میں نصِ صریح ملنا ناممکن۔ پھر دین کی مشکلات حل ہوتیں تو کیونکر ہوتیں۔ صحابہ کرام کے اختلاف نے ہماری یہ مشکل حل کر دی اور اب عملی طور پر ہمارے لئے اجتہاد کا اسوۂ حسنہ ثابت ہو گیا۔ اختلاف کے رحمت ہونے کا یہ مطلب غلط ہے کہ ہر شخص کو اپنے اہوار کے موافق صحابہ کے اقوال میں انتخاب کر لینے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب تو بالفاظِ دیگر یہ ہے کہ شریعت کی کسی پر کوئی گرفت ہی نہیں کیونکہ بعض مرتبہ مسائلِ فروعیہ میں اختلاف نفی و اثبات کا اختلاف ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ انسان کا کوئی عمل نفی و اثبات کے دائرہ سے عقلاً باہر نہیں رہ سکتا بس اس تقدیر پر اگر ہر شخص کو صحابہ کے افعال میں انتخاب کا حق حاصل ہو جائے تو اس کا جو عمل بھی ہوگا وہ یقیناً شریعت کے دائرہ میں کہلائے گا اور شریعت کا وجود و عدم برابر ہو جائے گا اور آپ معلوم کر چکے ہیں کہ یہ سرے سے شریعت کے مقاصدِ کلیہ کے بالکل برخلاف ہے وہ انسان کو اتنا آزاد چھوڑنا پسند نہیں کرتی۔

تلاش کر کر کے صرف شرعی رخصتوں پر عمل کرنا فسق ہے

حافظ ابنِ حزمؒ اس پر تو اجماع نقل کرتے ہیں کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔ [۱]

بہرحال صحابہ کرام کے اختلافات دیکھ کر اختلافِ امت کے رحمت ہونے کا مطلب خواہ صرف جوازِ اجتہاد کی حد تک ہو یا امت کے سامنے ایک عمل کی مختلف صورتوں کی وسعت بھی اس کے مفہوم میں داخل ہو۔ دونوں صورتوں میں صحابہ کرام کے اختلاف کی نوعیت، دوسری جماعتوں کے اختلاف کی نوعیت سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہ بحث اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ ہر شخص کو مختلف اقوال میں حسب دلخواہ انتخاب کا حق حاصل نہیں، اس کے ضوابط و قواعد مستقل ہیں، ہماری غرض یہاں صرف یہ بتلانا ہے کہ صحابہ کرام میں اصولاً تو کوئی اختلاف ہی نہ تھا ہاں فروعی اختلاف تھا مگر وہ ہمارے لئے باعثِ رحمت ہوا نہ کہ باعثِ تفرق و زحمت۔

مجتہدینِ امت کا اختلاف

مجتہدین کے دور تک عمل کی گاڑی اسی طرح مشترکہ طور پر کھنچتی رہی۔ شدہ شدہ بے علمی کا دور آیا۔ ادھر تکوینی طور پر کچھ اہلِ علم کسی خطہ یا جماعت میں روشناس ہو گئے۔ بے علم جماعتوں نے ان سے مسائل پوچھنا شروع کئے پھر معاصر علما نے ان کا علم، خلوص و دیانت آزما کر ان کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ اس طرح ایک زمانۂ دراز تک اہلِ علم اور غیر اہلِ علم کی متفقہ آواز نے ان کو دنیا میں ایک غیر معمولی حیثیت دیدی، ان کے

---

[۱] الموافقات ج ۴ ص ۱۴۴۔

فروع واصول مکمل طور پر قلمبند کئے گئے اور بحث وتمحیص کے تسلسل سے دیگر مجتہدین کے بالمقابل ان میں ایک خاص امتیاز پیدا ہو گیا اور اپنے اپنے دائرۂ تلمذ کے مطابق ان کا مذہب اس مجموعی صورت میں پھیلتا رہا۔

تدوینِ دین میں فطری ارتقاء

فطری ارتقاء، احساسِ ضرورت اور جذباتِ خدمت کی بنا پر جس طرح قرآن صحف سے مصحف مصحف سے مصاحف اور مصاحف سے اعراب وسور ورکوعات کے مدارجِ ارتقائی طے کرتا چلا آیا اور بلاشبہ ان ارتقائی منازل کے بعد یہ قرآن وہی قرآن تھا جو دَورِ اول میں موجود تھا۔

سنت میں ارتقاء

اسی طرح سنت کے بھی ارتقائی دور ہیں، گو قرآن وسنت کے مراتب کے لحاظ سے عملِ انسانی کو یہاں کچھ زیادہ آزادی حاصل ہوئی اس لئے وہ دورِ صحابہ سے گذر کر دَورِ مجتہدین میں اور منضبط ہوئے پھر اس انضباط میں کچھ اور ترقیات ہوئیں اور ایک زمانہ تک حدیث وفقہ ایک ہی جگہ مدون چلتے رہے۔ اسی احساسِ ضرورت نے پھر مجبور کیا کہ دونوں فن علیحدہ علیحدہ کر دیئے جائیں۔ شروع میں صرف یہ قدم بھی نیا اور قابلِ اعتراض معلوم ہوا آخرکار اس کے فوائد دیکھکر تمام دنیا نے اس کو مانا اور تمام علماء کی یہی متفقہ پالیسی بن گئی۔

فقہی ارتقاء

اس فطری ارتقاء اور تکوینی اسباب کے ماتحت لاکھوں اہلِ علم اور کروڑوں انسانوں میں یہ دین بحیثیتِ مجموعی سفر کر رہا ہے اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کا نام شافعیت وحنفیت رکھکر دنگل قائم کر دو، یا اسے اختلافِ دَور کے لحاظ سے قدرت کی ایک اعانت تصور کر لو، جس نے تمہاری سہولت کے لئے، تمہاری ضرورت کے بقدر مرتب شدہ دین تمہارے گھروں تک پہنچا دیا ہے۔

حنفیت وشافعیت کے اختلاف کی حقیقت

حنفیت وشافعیت کا اختلاف بھی دین میں کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے، نہ یہ اختلافِ اہوا پر مبنی ہے نہ اتباعِ متشابہات کا نتیجہ ہے، نہ علمِ سلف سے بے خبری اُس کی بنیاد ہے بلکہ "اختلاف امتی رحمۃ" کا وہ حصہ ہے جو ہر زمانہ میں بقدرِ ضرورت امتِ مرحومہ میں تقسیم ہوتا رہا ہے۔ اگر نااہلوں اور بے علموں نے اُس کو پارٹی بندی کا ذریعہ بنا لیا ہے تو یہ قصور اُن کا ہے۔

ما انا علیہ واصحابی کی تحقیق

اس کے بعد ہمیں عنوانِ بالا پر غور کرنا ہے۔ بظاہر یہاں آپ کا جواب سوال کے پورا پورا مطابق نظر نہیں آتا۔ صحابہ کا سوال فرقۂ ناجیہ کے متعلق تھا آپ کا صاف جواب "انا واصحابی" ہونا چاہئے تھا یعنی وہ جماعت میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔ بلاشبہ اُس وقت فرقۂ ناجیہ کا مصداق یہی جماعت تھی اور اگر اس سے بڑھ کر کوئی آئین کلی بتانا مقصود تھا۔ تو وہ کتاب وسنت ہے بلکہ "ما انا علیہ واصحابی" کا حاصل بھی یہی ہے پھر آپ کے اصحاب کا طریقہ آپ کے طریق کے سوا کوئی اور طریق نہیں تھا اس کے مستقل طور پر بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہونی چاہئے۔

ان سوالات کے حل کی طرف جب انسان توجہ کرتا ہے تو اس کو صاحبِ نبوت کے ایک ایک لفظ کا کمال

کھلتا چلا جاتا ہے، بیشک تبادر یہی تھا کہ جواب "انا واصحابی" ہوتا مگر یہاں سائل کا مقصود اس کے زمانہ کی جماعتِ حق کی تعیین نہ تھی وہ دورِ فتن میں حق جماعت کی تعیین کا طالب تھا اگر اُسے آپ صرف کتاب وسنت ہی کا معیار بتاتے تو یہ جواب اُس دور کے مناسب حال نہ ہوتا جس میں ہر باطل سے باطل فرقہ کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہی کتاب و سنت کا حامل ہے اس لئے یہاں آپ نے وہ فیصلہ کن آئین بتانا چاہا ہے جو اس زمانہ کے بھی مناسب حال ہو، وہ صرف کتاب وسنت نہیں بلکہ اُس کی وہ عملی تصویر ہے جو آپ نے اپنے صحابہ کے سامنے بطریق اسوہ پیش فرمائی تھی۔ صحابۂ کرام نے اُس کے ایک ایک خط وخال کو دیکھا اور مو بمو اس کی نقل کی۔ اب اِدھر یہ اسوہ حسنہ اُدھر اس کا وہ مکمل نقشہ تھا۔ پوچھنے والوں کے لئے اس سے زیادہ صاف بات اور کیا ہوسکتی تھی کہ جو صراطِ مستقیم کو دریافت کرنے آتا، اُسے آنکھوں سے دکھا دیا جاتا اور زبان سے سمجھا دیا جاتا کہ وہ صراطِ مستقیم یہ ہے اس لئے یہاں افراد و اشخاص کی بحث چھوڑ کر اُن اوصاف کو بتا دیا گیا ہے جو فرقۂ ناجیہ کی تعیین میں ہمیشہ کے لئے کارآمد ہوں۔

الفاظ میں احتمالات باقی رہتے ہیں اس لئے فیصلہ کن صرف ان کی عملی صورت ہے

اس جواب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دورِ فتن میں کچھ ایسا تعصب نمودار ہو جاتا ہے کہ اُس زمانہ کی کٹ حجتی ختم کرنے کے لئے صرف الفاظ کافی نہیں ہوتے، یہاں حقیقت و مجاز، عموم وخصوص کے احتمالات پیدا کردینے کا سہارا باقی رہتا ہے اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دوٹوک عمل ہی وہ کھلی ہوئی شریعت ہے جس میں یہ احتمالات نہیں چلتے۔ اسی لئے دورِ فتن کا بنیادی مسئلہ اسی تفصیلی شریعت کا انکار ہوا کرتا ہے۔ قرآن کریم سے زیادہ لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں اور حدیث سے زیادہ فقہ کا۔

صحابۂ کرام پر آپ کا مکمل اعتماد

رہا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی سنت کو یہاں مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے تو اس کی وجہ بظاہر اس کامل اعتماد کا اظہار کرنا ہے جو آپ کو اپنے صحابہ کی فہم پر حاصل تھا۔ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ بعض مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں کسی مافوق العادت امر کا تذکرہ ہوتا جیسے حیوانات کا تکلم، تو آپ نے ابوبکرؓ وعمرؓ کی غیر حاضری میں یہ کلمات فرمادیئے ہیں "امنت انا وابوبکر وعمر" میں اور ابوبکرؓ وعمرؓ بھی اس پر ایمان لائے۔ ان کی عدم موجودگی میں ان کی طرف سے ان کے ایمان کی شہادت دینا یہ اُن پر کمالِ وثوق کی طرف ہی اشارہ تھا۔

صحابہ کے بعض افعال کی صورت گو عہدِ نبوت میں نہ ملے مگر وہ مقاصدِ شریعت کے ماتحت ہوتے ہیں

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کے بعض اعمال کی صورت گو دورِ سنت میں ہمیں نظر نہ آئے مگر مقاصدِ شریعت کے لحاظ سے اس کا عین شریعت کے مطابق ہونا ضروری ہے لیکن دورِ فتن میں صحابہ کے متعلق یہ حسن ظن قائم رہنا مشکل ہے اس لئے اس بحث کو ختم کرنے کے لئے ان کے طریق کو ایک مستقل حیثیت دیدی گئی ہے۔ مثال کے طور پر تراویح کا مسئلہ ہے، کون نہیں جانتا کہ تراویح کی یہ اجتماعی صورت جو آج ہمارے دور میں رائج ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نہ تھی۔

حضرت عمرؓ نے اس اجتماعی صورت کو شروع کیا۔ اس وقت طبائع میں کتنی سلامتی، کتنا اتحاد، کتنی یکسوئی، کتنا انقیاد تھا کہ سب نے اس کا اتباع کیا اور کوئی اختلافی ہنگامہ برپا نہ ہوا۔ بات یہ تھی کہ یہ درست تھا کہ تراویح کا یہ دور آپ کے زمانہ میں نہ تھا مگر صحابہ کرام کو معلوم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس التزامِ جماعت کے ساتھ تراویح نہ پڑھنے سے جو بات مانع آئی تھی وہ فرضیت تھی کہ ماہ رمضان کا مبارک مہینہ، نزولِ وحی کا دور موجود، اس میں صحابہ کرام کا پرخلوص اجتماع اگر اسی طرح مسلسل ہوتا رہا تو اس کا بہت امکان تھا کہ یہ اجتماعی ہیئت جواب تک اختیاری تھی آئندہ لازم قرار نہ دیدی جائے اور جب ان بادہ نوشوں کا دَور ختم ہو تو آئندہ جام و سبو کی یہ گردش کہیں بار نہ ہو جائے اس لئے حضرت عمر فاروقؓ کو جب دیگر مہماتِ اسلام سے فرصت ملی تو فوراً تراویح کے باجماعت ادا کرنے کی ترغیب دی کہ اب وحی بند ہو چکی تھی اور وجوب کا کوئی احتمال باقی نہ رہا تھا اسکی ایک مثال نہیں بہت سی مثالیں ہیں کہ صحابہ کے دور کا کوئی عمل گو صرف اپنی صورت کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں نظر نہ آئے لیکن حقیقت کے لحاظ سے آپ کے منشاء کے اتنا مطابق ہوتا ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تشریف فرما ہوتے تو یہی فرماتے۔ یہ ہمارا حسنِ ظن نہیں بلکہ عہد مبارک ہیں۔

قرآن کا حضرت عمرؓ کی رائے کی تصویب کرنا ان کے دینی مزاج شناسی کی دلیل تھی

خود وحی الٰہی کا حضرت عمرؓ کی بار بار تصویب کرنا اس بات کی کھلی ضمانت تھی کہ آئندہ بھی ان کی اصابتِ رائے امت کو تسلیم ہونا چاہئے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو موجودہ بے احتیاطیوں کو دیکھکر عورتوں کا مسجدوں میں آنا بند کردیتے، اس اختلافِ صورت اور اتحادِ مقصد کے پیش نظر مناسب ہوا کہ "ما انا علیہ" کے ساتھ ساتھ "واصحابی" کا لفظ اور اضافہ کردیا جائے۔

منصب تشریع اور منصبِ اجتہاد کی تقسیم

خالق نے اپنے رسول کو منصبِ تشریع سے نوازا تھا۔ اس کے رسول نے اپنے صحابہ کو منصبِ اجتہاد سے نواز دیا اور اس طرح جو نعمت رسول کے حصہ میں آئی تھی امت کا بھی اس میں ایک حصہ لگ گیا۔

السواد الاعظم الجماعۃ کا مصداق

ان الفاظ کی تفسیر میں صاحبِ اعتصام نے متعدد اقوال نقل فرمائے ہیں، ہمارے خیال میں حدیث کے گذشتہ الفاظ ہی اس کی تشریح کے لئے کافی ہیں یعنی جماعت اور سوادِ اعظم سے وہی جماعت اور وہی سوادِ اعظم مراد ہے جو ما انا علیہ واصحابی (یعنی کتاب وسنت کی متبع) ہے۔ اگر ان ہر سہ الفاظ کا خلاصہ نکالو تو یہ ہوگا کہ اہلِ حق ہونے کی علامت یہ ہے کہ وہ جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ہو اور نہ صرف یہی بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے طریق کا بھی احترام کرنے والی ہو اگر کوئی جماعت صرف آپ کے طریقہ کا احترام کرتی ہے لیکن صحابہ کے طریق کا احترام نہیں کرتی تو وہ ان الفاظ کے حدود سے باہر ہے دورِ قرن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور آپ کے اصحاب کے مابین تفریق کا عقیدہ بھی ظاہر ہو چکا ہے۔

خدائے قدوس اپنے اور اپنے رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا اور رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے مابین تفریق کا روادار نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے اور رسول کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا، اسی طرح رسول اپنے اور اپنے صحابہ کے درمیان تفریق کی اجازت نہیں دیتا در حقیقت یہ انتہائی نادانی اور کجروی ہے کہ جو جماعت امت اور اس کے رسول کے درمیان واسطہ ہے، اس کے اقوال و افعال کو ہم تک پہنچانے والی ہے، اسی پر اعتماد نہ کیا جائے۔ اگر خدا کا رسول خود اپنی حیات میں ان پر اعتماد کر چکا ہے۔ بادشاہوں سے اور قبائل کفار سے گفت و شنید اُن ہی کی معرفت کی ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ امت اُن پر اعتماد نہ کرے۔ ایک عالمگیر دین جس جماعت سے نکلتا ہے اگر وہی جماعت ناقابل اعتماد ہے تو پھر آئندہ دور میں اُس دین کا خدا حافظ۔

اسوۂ صحابہ کی اہمیت

اسی اہمیت کے پیش نظر الفاظ بالا میں صحابۂ کرام کی سنت کو ایک مستقل حیثیت دیدی گئی ہے ورنہ جس طرح رسول کا طریقہ خدا تعالیٰ کے طریقہ سے' جدا نہیں، ٹھیک اسی طرح صحابہ کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے علیحدہ نہیں۔ اس لئے فرقۂ ناجیہ کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ ان دونوں طریق کی جو بہ حقیقت ایک ہی ہیں اپنے اپنے مرتبہ میں بزرگی و احترام کی قائل ہو بلکہ اس پر گامزن بھی ہو۔ خوارج نے صرف سنتِ رسول کو لیا اور صحابہ کی ایک جماعت کو کافر ٹھیرایا، یہی ان کے ناحق ہونے کی پہلی علامت تھی اور اسی کی طرف حضرت ابن عباسؓ نے بھی اپنے کلام میں اشارہ فرمایا تھا۔

حواریین اور صحابۂ کرام کا مقابلہ

عیسائیوں کو جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شخصیت سے مقابلہ کرنے میں ناکامی رہی۔ اسی طرح حواریین اور آپ کے صحابۂ کرام کے مقابلہ میں بھی ناکامی رہی ہے بلکہ ان کو حسرت ہے کہ اگر کہیں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حواری بھی آپ کے صحابہ کی طرح جانباز اور اتنے ہی فدا کار ہوتے تو اس طرح مسیحی دین صدیوں گمنامی کے عالم میں پڑا نہ رہتا۔

ہجرت کے چھٹے سال صلح حدیبیہ کے موقعہ پر جب عروہ قریش کی جانب سے شرائط صلح پر گفتگو کے لئے آتا ہے تو جن الفاظ میں صحابہ کی وفاداری کا نقشہ اس نے خود قریش کے سامنے کھینچا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک کافر کے قلب پر اس کا کتنا گہرا اثر پڑا تھا وہ کہتا ہے۔

"کہ میں نے قیصر و کسریٰ و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں لیکن جو والہانہ عقیدت کا منظر یہاں دیکھا، کہیں نہیں دیکھا۔ جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بات کرتے ہیں تو گردنیں جھک جاتی ہیں اور محفل پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ نظر بھر کر کوئی شخص ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔ آپ کے وضو کا پانی اور آپ کا بلغم زمین پر گرنے نہیں پاتا کہ وہ اُسے ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں اور اپنے چہرہ اور ہاتھوں پر مل لیتے ہیں۔"

اسی لئے اس قوم کے احساسِ خودداری و وفاشعاری کی داستانیں پڑھنے والے مسلم و کافر اس پر متفق ہیں کہ اس سے زیادہ اطاعت و فرمانبرداری کا ثبوت دنیا کی کسی قوم نے پیش نہیں کیا۔

صحابیت کا احترام نجات کی علامت ہے

الغرض چونکہ ایک صحابیت کے احترام ہی کا مخالف ہونا مقدر تھا اس لئے فرقۂ ناجیہ کی ایک بڑی علامت صحابیت کا وقار و احترام بھی قرار دیدیا گیا ہے جو اُس کا احترام نہیں کرتا وہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا احترام نہیں کرتا۔ [۱]

شانِ اجتماع حق کی علامت ہے

دوسری علامت جماعت کے لفظ سے یہ مفہوم ہوتی ہے کہ ان میں شانِ جمعیت و وحدت نمایاں ہونا چاہیے۔ افتراق و تشتت بغض و عناد اُن سے دور دور رہنا چاہیے اور سوادِ اعظم کے لفظ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ افراد ایسے موقر ہونا چاہئیں کہ ان کا وجود ایک جماعت کی شکل میں بھاری باشوکت اور بارعب نظر آئے۔ چنانچہ عبداللہ بن مبارک سے جب دریافت کیا کہ وہ جماعت کون ہے تو جواب میں ابوبکرؓ و عمرؓ سے شروع کرکے محمد بن ثابت اور حسین بن واقد کے دور تک پہنچ گئے جب ان سے کہا گیا کہ ان حضرات کی تو وفات ہوگئی تو فرمایا کہ پھر ابوحمزۃ السکریؒ [۲]

افراد کی اکثریت معیارِ صداقت نہیں

یہ ایک بہت ہی عامیانہ خیال ہے کہ سوادِ اعظم سے صرف افراد کی اکثریت مراد ہے غور کرنا چاہئے کہ دورِ فتن میں اہلِ حق کی اکثریت کب ہو سکتی ہے۔ پھر اس اکثریت کو ہر حق و باطل کے فیصلہ کا شرعی معیار قرار دیدینا اور بھی نافہمی ہے اگر آج ایک طرف بے دینی، دہریت، مذہبی حریت، فواحش و منکرات کی اکثریت موجود ہے تو کیا اس کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے آپ کو سوادِ اعظم کا معزز لقب دے کر فرقۂ ناجیہ کا مصداق ٹھیرالے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اختلاف کی بحث میں بتایا جاچکا ہے کہ اختلاف سے عقائد کا اصولی اختلاف مراد ہے اسی طرح "ماانا علیہ واصحابی" میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کے عقائد کے اصول ہی مراد ہیں، ہر بحث و جدل کے موقعہ پر اس حدیث کو پڑھنا درحقیقت حدیث کی توہین کرنا ہے۔ حدیث لا تجتمع امتی علی ضلالۃ اگر بلحاظ سند درست ہو تو اس کی مراد بھی یہی ہے کہ امت پر کوئی دور ایسا نہیں آئے گا کہ اس میں حق پر کوئی باقی نہ رہے اور سب گمراہی پر متفق ہو جائیں بلکہ ایک جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی۔ یہاں بھی اکثریت کا فیصلہ مذکور نہیں ہے۔ دنیا میں اکثریت ہمیشہ حق کے خلاف ہوتی ہے مگر اس کی حقانیت کی یہ دلیل ہے کہ غلبہ آخرکار اسی کو حاصل ہوتا ہے۔

اسی مضمون کو صحیح بخاری میں بالفاظ دیگر یوں ارشاد فرمایا ہے۔ لن تزال ھذہ الامۃ قائمۃ علی الحق لا یضرھم من خالفھم حتی یاتی امر اللہ۔

---

[۱] دیکھو مقدمۂ اصابۃ فصل ثالث [۲] ان کا اسم مبارک محمد بن میمون مروزی ہے [۳] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۲۲۶۔

حدیث لن تزال الخ کا مصداق

روایتِ بالا میں "ھذہ الامۃ" کا لفظ ہے مگر عمرو بن ہانی کی روایت میں "طائفۃ من امتی" اور یزید بن اصم کی روایت میں "عصابۃ من امتی" کا لفظ ہے جس کا یہ منشاء ہے کہ یہ اوصاف جمہور امت کے نہیں بلکہ اس امت میں صرف ایک طائفہ وجماعت کے اوصاف ہیں۔ بلکہ ابن حزم تو یہ کہتا ہے کہ طائفہ لغتِ عرب میں بعض شئے کو کہتے ہیں اس لئے طائفہ کا اطلاق ایک شخص پر بھی آسکتا ہے۔ والطائفۃ فی لغت العرب یقع علی الواحد فصاعدًا۔[1]

امام بخاری جزم کے ساتھ فرماتے ہیں کہ وہ طائفہ اہلِ علم کا طائفہ ہے اور امام احمد فرماتے ہیں کہ وہ اہلِ حدیث ہیں۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ امام احمد کی مراد اہلِ سنت ہیں ان تینوں الفاظ کا خلاصہ ایک ہی ہے۔ اہلِ حدیث اور اہلِ علم اور اہلِ سنت ایک ہی معنی کی مختلف تعبیریں ہیں بعض نافہم اس کو بھی اختلاف سمجھ لیتے ہیں۔ صاحب موافقات نے جلد رابع میں اس پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

اقوالِ مفسرین اور الفاظ شارحین حدیث میں اکثر اختلاف عبارت ہوتا ہے اسے اختلافِ حقیقت نہ بنانا چاہیئے۔

ماکان ظاھرہ الخلاف ولیس فی الحقیقۃ کذلک واکثر ما یقع ذلک فی تفسیر الکتاب والسنۃ فتجد للمفسرین ینقلون عن السلف فی معانی الفاظ الکتاب اقوالا مختلفۃ فی الظاھر فاذا اعتبرتھا وجدتھا تتلاقی۔[2]	یعنی جہاں ظاہر میں اختلاف نظر آئے اور در حقیقت اس میں کوئی اختلاف نہ ہو یہ صورت زیادہ تر کتاب و سنت کی تشریحات میں نظر آتی ہے تم دیکھو گے کہ مفسرین قرآن کریم کے الفاظ کی شرح میں مختلف تعبیرات نقل کرتے ہیں لیکن جب ان کو بغور ملاحظہ کرو گے تو ان سب کا نقطۂ نظر ایک ہی بات ہوگی صرف الفاظ مختلف ہوں گے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس کو مفصل لکھا ہے۔ دیکھو توجیہ النظر۔

بہر حال یہ ایک طویل بحث ہے ہم نے یہاں ضمنی فائدہ کے طور پر صرف تنبیہ کر دی ہے کہ اگر اس کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو دین میں اختلافات کا بہت بڑا باب جو ہماری نافہمی سے اختلاف کی صورت میں نظر آرہا ہے بند ہو جاتا ہے۔ ما انا علیہ واصحابی۔ الجماعۃ۔ السواد الأعظم۔ اسی سلسلہ کی ایک مثال ہے۔ یہاں بھی سوادِ اعظم اور جماعۃ سے وہی طائفہ مراد ہے جس کو مذکورہ بالا روایت میں ذکر کیا گیا ہے اُس طائفہ کے اوصاف پر غور کرنے سے اس کے سوادِ اعظم فرمانے کی وجہ بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ حدیث بالا یہ کہتی ہے کہ مختلف رکاوٹوں اور ناسازگاری احوال کے باوجود وہ جماعت خدا کے دین پر قائم رہے گی اور بلحاظ اپنے عزم واستقلال دوسروں پر اتنی بھاری ہوگی کہ مخالفین کی مخالفت ان کو اپنے جادۂ مستقیم سے ہٹا نہ سکے گی گویا اگر ایک طرف

[1] الاحکام فی اصول الاحکام ج ۱ ص ۱۰۹ [2] ج ۴ ص ۲۱۴

تکوینی طور پر فرقۂ منحرفہ کی یہ کثرت رہے گی تو دوسری طرف ایک طائفہ ایسا بھی ضرور باقی رہے گا جو اقلیت میں ہو کر بھی اپنی شانِ جمعیت اور عزم و استقلال کی وجہ سے کبھی اکثریت سے مرعوب نہ ہوگا۔ ؎

نبوت ختم ہو چکی اس لئے امت کو عام گمراہی سے محفوظ رہنا چاہئے

جس امت میں نبوت ختم ہو چکی ہے اُس امت میں نبوت کی خدمات انجام دینے کے لئے ایک طائفہ مقدر ہونا چاہئے جو ان فرائض کو انجام دیتا رہے اور جس طرح کہ نبی وقت تن تنہا ہونے کے بعد بھی کفر کا مقابلہ کیا کرتا ہے اب اس جماعت کو باطل کا مقابلہ کرنا چاہئے اور جس طرح کہ تمام روئے زمین کی مخالفت اُسے اپنی جگہ سے ایک انچ جنبش نہیں دے سکتی اسی طرح زائغین اس طائفہ کے قدم بھی دینِ متین سے متزلزل نہیں کر سکتے۔

طائفہ میں امتی کا وجود جماعتی شکل پر ہونا ضروری نہیں ہے

حافظ ابنِ حجرؒ تصریح فرماتے ہیں کہ اس طائفہ کا ایک جگہ ہونا کوئی ضروری امر نہیں ہے بلکہ جو افراد بھی اپنی اپنی جگہ منتشر طور پر احیاء سنت میں مشغول ہوں وہ شرعی نظر میں سب ایک جماعت اور اسی طائفہ کے افراد کہلائیں گے۔ لہٰذا یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ اجتماعی شکل میں کسی گوشہ یا کسی خاص خطہ میں یکجا موجود ہوں۔

مجددین کی اجمالی تشریح

جیساکہ ہر صدی پر مجددین کی آمد کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ مجدد کا فردِ واحد ہونا ضروری ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ دین کی مختلف ضروریات کی تجدید شخصِ واحد کی بجائے ایک طائفہ سے حاصل ہو جائے اور بہ حیثیتِ مجموعی یہی طائفہ مجدد دین کہلائے۔ (دیکھو فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۲)

یہ ناواقفی بھی ایک مصیبت عظمیٰ ہے کہ عوام اور بعض خواص خود اپنی جانب سے کسی حدیث کی کوئی شرح سمجھ لیتے ہیں اور جب اس کے خلاف کوئی حقیقت سامنے آتی ہے تو اُس سے کان کھڑے کرنے لگتے ہیں حالانکہ وہ بات اپنی جگہ بالکل صاف ہوتی ہے۔

امت کا پہلا مجدد

بعض اشخاص پر مجدد کے لقب کی شہرت نے یہ تخیل پیدا کر دیا ہے کہ مجدد گویا بزرگی کا کوئی منصب ہے حالانکہ امت نے سب سے پہلے یہ لقب خلیفۂ عدل عمر بن عبدالعزیزؒ کے لئے استعمال کیا تھا پھر اس کے بعد امام شافعیؒ کے متعلق کہا گیا ہے اسی طرح آئندہ بھی تخمینی طور پر یہ لقب جاری رہا ہے۔ بہر حال مجددین کے لئے نہ دعویٰ کرنا ضروری نہ اس کا ایک فرد میں انحصار ضروری ہے بلکہ آخری دین کی یہ مختلف اصلاحی صورتیں ہیں جو تکوینی طور پر کبھی اجتماعی اور کبھی انفرادی صورت میں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ مجددین - طائفۃ من امتی۔ ما انا علیہ واصحابی۔ ہے۔ السواد الاعظم سب اسی کے شعبے ہیں۔ بات ایک ہے لفظ مختلف۔

اصلاحِ دین کا تکوینی نظام

صحیح بخاری میں اس روایت کے ایک لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جماعت کا وجود تکوینی ارادہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اختلاف کے نئے سے نئے شاخسانے دنیا میں رونما ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی نئی سے نئی تدبیری قدرت پیدا کرتی رہے گی اسی خیر و شر کے ہنگامہ کا نام عالم اختلاف ہے جسے دنیا کہتے ہیں۔

من یرد اللہ بہ خیرًا یفقہ فی الدین	جس کے متعلق خدا خیر کا ارادہ کرتا ہے اُسے دین میں سمجھ
ولن یزال امر ھذہ الامۃ مستقیما	دیدیتا ہے اور اس امت کا دین ہمیشہ مستقیم رہے گا
حتی تقوم الساعۃ الخ	یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

دین پر استقامت کے لئے دین کی سمجھ ضروری ہے

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ تفقہ فی الدین ارادۂ الٰہیہ کے ماتحت نصیب ہوتا ہے۔ کسب کا ثمرہ نہیں اسی طرح دین کی استقامت کی راہیں بھی تکوینی ہیں۔ بیشک جس دین میں ختم نبوت مقدر ہو چکا ہے اس میں بقاء استقامت کی بشارت اور اس کے تکوینی انتظامات کی خبر بھی ضروری امر تھا۔

کرمانی شارح بخاری فرماتے ہیں کہ الفاظِ بالا سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ استقامت میں تفقہ فی الدین داخل ہے اور اسی ارتباط کی وجہ سے حدیث میں دونوں باتیں ایک سیاق میں ذکر کی گئی ہیں۔

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۵۰)

اب سوچو کہ فرقۂ ناجیہ کی اس سے زیادہ صاف تشریح اور کیا ہو سکتی تھی اور اسی لئے جب تک عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ باقی رہا یہ اختلافات بھی رونما نہ ہوئے لیکن جونہی آپ کا عہدِ باسعادت اور صحابہ کا دورِ مسعود ختم ہوا تو "ما انا علیہ واصحابی" کی وہی کھلی ہوئی بات ایک معمہ بن کر رہ گئی حتی کہ جس قدر اس زمانہ کو بُعد ہوتا گیا اختلافات کی خلیج اسی قدر زیادہ وسیع ہوتی گئی۔ لہٰذا ہر باطل سے باطل اور منحرف سے منحرف بھی دعوٰی کر رہا ہے کہ "ما انا علیہ واصحابی" کا مصداق وہ ہے لیکن اب یہاں نہ صحابہ ہیں نہ ان کے دور کے دیکھنے والے کہ اس نزاع کا فیصلہ ہو جاتا۔ ایک جماعت خدا کی صفات کی ہی سرے سے منکر ہے اور خالص توحید اسی کا نام رکھتی ہے معتزلہ مدعی ہیں کہ اہلِ توحید و عدل وہی لوگ ہیں مشبہ چیخ رہے ہیں کہ صفات پر صحیح ایمان صرف ان کو حاصل ہے اور ہر ایک کے پاس دلائل میں وہی قرآن و سنت ہے غرض ہر ایک کا گمان یہی ہے کہ فرقۂ ناجیہ اسی میں منحصر ہے۔ بہرحال صحیح صورتِ عمل مخفی ہونے کے بعد اب یہ شرح الفاظ بھی صرف ایک رسّی کشی کا میدان بنے ہوئے ہیں اسی کو سورۂ روم میں ارشاد فرمایا تھا۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ — ہر پارٹی اپنے اپنے خیال میں مست ہے۔

منحرف جماعتیں دعوی حقانیت میں دلیر ہوتی ہیں

گویا منحرف جماعتوں کا یہ بھی ایک خاصہ بن کر رہ جاتا ہے کہ غور و تفکر کی بجائے انہیں صرف اپنی حقانیت کا زعمِ باطل ہو جاتا ہے۔ عالمِ اختلاف کی یہ ہنگامہ آرائی دیکھکر تقدیر ہنستی ہے اور کہتی ہے۔

وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَٰلِكَ خَلَقَهُمْ — یعنی یہ اختلاف اسی طرح باقی رہے گا اور سارا عالم کو اسی اختلاف کے لئے بنایا بھی ہے۔

حدیث قرطاس میں ایک انوکھی تنبیہ

اسی لئے شاید وفات کے وقت کوئی ایسی بات آپ لکھتے لکھتے رہ گئے تھے اگر کہیں وہ لکھدی جاتی تو امت میں اختلاف کا خطرہ مستقل مٹ جاتا۔

ھلم اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ[1] — لاؤ تمہارے لئے ایک ایسی بات لکھدوں کہ اس کے بعد پھر کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے۔

اگر کہیں یہ کتاب قیدِ کتابت میں آجاتی تو ممکن تھا کہ امت کی امت لا یزالون مختلفین سے نکل کر سب الا من رحم ربک کے نیچے داخل ہو جاتی مگر آخر کار تقدیر غالب آئی اور ایسے حالات رونما ہو گئے کہ یہ تحریر وجود میں نہ آسکی

تقدیر ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی تمناؤں کا ساتھ نہیں دیتی

ایک مرتبہ آپ نے ارادہ کر لیا تھا کہ شبِ قدر کا صاف صاف علم بتا دیا جائے، مگر مسجدِ نبوی میں کچھ شور بپا ہو گیا آخر وہ علم بھی اُسی طرح مستور رہ گیا یہاں بھی کچھ قصد مبارک تھا کہ لاؤ کوئی ایسی بات بتلا دی جائے کہ آئندہ تفرقہ کا اندیشہ ہی نہ رہے مگر یہاں بھی کچھ شور ہو گیا آخر کار

[1] کتاب الاعتصام ج ۲ ص ۱۴۸۔

وہ نوشتہ جوں کا توں رہ گیا۔ عالمِ تقدیر و تکوین کا یہ تماشا بھی قابلِ دید ہے کہ اگر عالمِ تدبیر نے کبھی وحدت و اجتماع کے لئے زور لگایا بھی تو اُسی وقت پردۂ غیب کے کسی اندرونی ہاتھ نے اس کا سارا کھیل بگیڑا کر دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر قلم بھی خاموش ہو جاتا ہے۔ قلم اینجا رسید سر بشکست

تقدیر اسباب کے پردہ میں نمایاں ہوتی ہے

خیر و شر دو متضاد قوتیں ہیں جب ایک ابھرے گی تو دوسری مغلوب ہو جائے گی۔ قدرت خود انھیں زیر و زبر کیا کرتی ہے۔ بندۂ اسباب یہاں شکست و فتح کی دھن میں لگا رہتا ہے وہاں یہ منظور ہی نہیں کہ میدان کسی فریق کے بھی یک طرفہ ہاتھ آجائے اس لئے شکست و فتح کا ڈول باری باری کھنچتا ہی رہتا ہے اور یہ بازی اس وقت تک برابر کھیلی جائے گی جب تک کہ عالمِ اختلاف کو آباد رکھنا ہے ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض۔

گویا نظامِ قدرت کی طرح یہ بھی اس کا ایک نظام ہے کہ وہ صوامع و بیع و مساجد کے اختلاف کو بساطِ عالم پر سجائے رکھے اور اگر کوئی طاقت اس کے برخلاف ابھرے تو اس کے مقابلہ کے لئے خود سامنے آکر ان کو ایسے حدود پر روک دے جس کے بعد کسی کے مٹ جانے کا خطرہ پیدا ہونے لگے۔ اس اختلاف کی آبادی کے لئے دنیا مشغولِ جنگ رہتی ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ جنگ اسبابِ موت ہے۔ قدرت کہتی ہے کہ اسبابِ بقا ہی ہے۔ اگر قدرت کا ہاتھ نہ ہوتا تو اب تک ایک پارٹی نے غلبہ پا کر دوسری کو فنا کر دیا ہوتا اور چونکہ عالمِ اختلاف کی فطرت کے خلاف اس کو جینے کا حق نہیں ہے اس لئے اُسے بھی فنا ہونا پڑتا۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ عالمِ تشریع و عالمِ تقدیر کے مابین ہمیشہ مطابقت ضروری نہیں ہے۔ حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے برادرانِ یوسف کو چشم زخم نہ لگنے کی تدابیر کئے جائیں گے مگر تقدیر نے جس کے مقدر میں جیل خانہ لکھ دیا ہے وہ جیل جا کر رہے گا۔

حدیث کی صاف صاف تشریح کے بعد اختلاف عالمِ تکوین کے ماتحت ہے

الحاصل اگر "ما انا علیہ واصحابی" کے صاف صاف بات ہونے کا آپ یہ مطلب سمجھتے تھے کہ اس فیصلہ کے بعد اختلاف کا تخم ہی دنیا سے مٹ جائے گا تو آپ نے غلط سمجھا تھا اور اگر شریعت کے سر یہ الزام رکھنا چاہتے ہیں کہ اس نے فرقۂ ناجیہ کی کوئی صحیح تفسیر نہیں کی تو یہ اس سے زیادہ غلط سمجھے ہیں۔ عالمِ تشریع بصائر یعنی کھلی کھلی باتیں آپ کے سامنے بیان کرتا رہیگا مگر عالمِ تکوین شبہات کے گرد اڑا اڑا کر اس کو تاریک و مکدر بناتا رہے گا۔ اب سلسلۂ اسباب میں راہِ حق تلاش کرنے کی تگ و دو جاری رکھئے اگر آپ کا نام "الا من رحم ربک" میں درج ہو چکا ہے تو جو راہ سب سے زیادہ صاف آپ کو نظر آئے گی وہ یہی "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ ہوگی اور اگر خدانخواستہ اس فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے تو یک تنکہ بھی آپ کو پہاڑ معلوم ہوگا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى السَّمَآءِ۔

سو جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اس کے سینہ کو بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم تدبیر کو چھوڑ کر آپ کو تقدیر کے حوالے کرنا چاہتے ہیں بلکہ اختلاف کا مفہوم، اس کے اسباب فرقہائے منحرفہ کی شناخت، پر تامقدور بحث کر کے آخر میں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ یہاں اختلاف کے ان اسباب ظاہر کے ساتھ خاص طور پر اس کا ایک تکوینی سبب بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے ولذالک خلقھم سے اشارہ فرمایا ہے اور اسی لئے اس افتراق کو دیکھ کر یہ سمجھنا غلط ہے کہ یہ حدیث کے قصورِ بیان کا ثمرہ ہے۔ بیان تو اتنا واضح ہے جتنا کہ ہو سکتا ہے مگر چونکہ خطاب تکلیف علیحدہ ہے اور خطاب تقدیر علیحدہ اس لئے کبھی کبھی ایک صاف بات بھی چیستان بن کر رہ جاتی ہے اگر آج بھی کوئی شخص "ما انا علیہ واصحابی" کی راہ معلوم کرنا چاہے تو اس کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ پس اشکال یہ نہیں ہے کہ فرقۂ ناجیہ مبہم ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے دریافت کے جو اسباب ہیں خواہش نفس اس طرف آنے ہی نہیں دیتی۔ بقول اکبر مرحوم

اللہ کی راہیں سب ہیں کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جو بحث یہاں کی گئی ہے وہ حدیث کے مذاق کے موافق کی گئی ہے، ایک مورخ کو حق ہے کہ وہ تاریخ کے مطابق اسباب اختلاف بتائے۔ اصحاب تاریخ کا خیال ہے کہ ابتداء میں سیاست و مذہب مدغم تھے، اس لئے سیاسی تحریکات سب مذہبی رنگ میں ہی نمایاں ہوتی تھیں اس وقت ان دونوں عناصر کی تحلیل بہت ہی مشکل تھی۔ پھر جب قومیت نے مذہبی جذبات کی روح حاصل کر لی تو اس وقت سے سیاست کو مذہب کا جامہ پہننے کی ضرورت نہ رہی اس لئے مورخین نے مذہبی اختلافات کو سیاسی اختلافات کی بنیاد قرار دیا ہے مگر بنظر غور اگر آپ اس بنیاد کی بھی کوئی بنیاد تلاش کریں گے تو وہ اسباب پائیں گے جن کا مذکورہ بالا سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔

حجیتِ حدیث

انکارِ حدیث کے فتنہ کا آغاز

اسلام میں تقریباً پہلی صدی تک صحیح احادیث کو بلا تفصیل متفقہ طور پر حجت سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ معتزلہ ظاہر ہوئے، ان کے دماغوں پر عقل کا غلبہ تھا انھوں نے حشر و نشر، رویۃ باری تعالیٰ، صراط و میزان، جنت و جہنم اور اس قسم کی اور احادیث کو قابلِ تسلیم نہ سمجھا اور اپنے اس مزاجی فساد کی وجہ سے اخبارِ متواترہ کے سوا بقیہ احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور بہت سی قرآنی آیات میں جو اپنے مذاق کے خلاف دیکھیں تاویلیں کر ڈالیں۔[1] حافظ ابنِ حزم فرماتے ہیں کہ

"اہلِ سنت، خوارج، شیعہ، قدریہ تمام فرقے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن احادیث کو جو ثقہ راویوں سے منقول ہوں برابر قابلِ حجت سمجھتے رہے یہاں تک کہ پہلی صدی کے بعد متکلمین معتزلہ آئے اور انھوں نے اس اجماع کے خلاف کیا۔"[2]

سب سے پہلے امام شافعیؒ نے رسالہ میں اور کتاب الام کی ساتویں جلد میں اس خیال کی تردید کی۔ امام احمدؒ نے بھی اطاعتِ رسول کے اثبات میں مستقل ایک جزء تصنیف کیا اور احادیث و قرآن سے مخالفین کی تردید کی جس کا ایک حصہ حافظ ابنِ قیمؒ نے اعلام الموقعین میں نقل کیا ہے۔ اس کے بعد امام غزالیؒ، ابنِ حزم اور حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے المستصفیٰ۔ الاحکام۔ اور الروض الباسم میں اس کے خلاف مقالات لکھے حتیٰ کہ پھر اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کا یہ ایک مستقل موضوع ہی بن گیا۔ متاخرین میں حافظ سیوطیؒ نے بھی ایک مستقل جزء اس پر تالیف کیا۔

معتزلہ کا یہ فتنہ ایک علمی فتنہ تھا اس لئے انکارِ حدیث میں اُنھیں بہت کچھ پس و پیش کرنا پڑا یہاں تک میں ایک جماعت نے یہ تصریح کی کہ خبرِ واحد اگر عزیز ہو جائے (یعنی اس کے راوی اول سے آخر تک ہر طبقہ میں دو دو رہیں) تو چونکہ وہ مفیدِ یقین ہو جاتی ہے اس لئے حجت ہو جائے گی۔ حافظ ابنِ حجرؒ نے ابو علی جبائی معتزلی سے نقل فرمایا کہ حدیث کی صحت کے لئے اس کا عزیز ہونا شرط ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکارِ حدیث سے ان کا

---

[1] علامہ جزائری لکھتے ہیں کہ اگرچہ لوگوں میں یہ بہت مشہور ہے کہ معتزلہ کا مذہب علم فلسفہ میں توغل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے مگر یہ خیال بے اصل ہے کیونکہ ان کا مذہب صحابہ کے آخری دور میں ظاہر ہو چکا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک فلسفہ کی کسی کتاب کا بھی ترجمہ ہونے نہ پایا تھا (توجیہ ص ۷۷) ہمارے نزدیک اگر یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے جب بھی فلسفی اثرات کے لئے کتابی توغل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ان کے عقائد، طرزِ استدلال، انداز شبہات سب اس کی کھلی ہوئی شہادتیں ہیں کہ خارجی یا داخلی کسی نہ کسی طور پر ان کے دماغوں پر فلسفہ کا تسلط ضرور ہو چکا تھا اگر مطالعۂ کتب کے ذریعہ نہ ہو تو نہ سہی۔ [2] الاحکام ج ۱ ص ۱۱۴۔ [3] ج ۲ ص ۲۱۷۔

مقصد دین سے سبکدوشی حاصل کرنا نہ تھا بلکہ وہ ایک اصولی غلطی تھی جو اُن کے دماغوں میں ایک غلط بنیاد پر قائم ہو گئی تھی لیکن ہمارے دور کا فتنہ علم و فہم پر مبنی نہیں بلکہ جہل و عناد پر مبنی ہے اس کا مقصد مذہب کی گرفت ڈھیلی کرنا اور اس کو ایسی صورت میں پیش کرنا ہے جو ہر سانچے میں ڈھلنے کے قابل ہو جائے اس لئے اب انکارِ حدیث کے لئے کسی بڑی دلیل کی ضرورت بھی نہیں رہی بلکہ صرف چند احادیث میں معمولی شبہات پیدا کر کے بقیہ تمام احادیث کو بے دلیل رد کر دیا گیا۔[1]

قرآن نے تو شریعتِ موسویہ کے صرف چند شدید احکام ہی کو اصر و اغلال سے تعبیر فرمایا تھا مگر یہاں بعض منکرینِ حدیث نے آپ کی تمام احادیث کو اصر و اغلال کہہ ڈالا۔ العیاذ باللہ۔ اس گروہ کا عقیدہ ہے کہ اطاعت صرف خدا کی کتاب کی واجب ہے۔ رسول کی اطاعت منصبِ رسالت کے لحاظ سے کوئی ضروری امر نہیں اس کا فریضہ صرف تبلیغِ قرآن سے ادا ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔ گویا اس کے کسی قول و فعل کو تشریعی کوئی حیثیت حاصل نہیں ہوتی اگر اس کی اطاعت لازم ہوتی ہے تو ایسی ہی جیسے اپنے زمانہ کے ہر امیر و حاکم کی لازم ہوا کرتی ہے۔ اس عقیدہ کا مبنی درحقیقت مقامِ نبوت اور حقوقِ نبوت سے تمام تر جہالت اور ناواقفیت ہے یہ عقیدہ ایسا ہی بدیہی البطلان ہے جیسا یہ کہنا ایمان لانا صرف خدا پر ضروری ہے۔ رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں اگر اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کی کوئی تاویل کی جا سکتی ہے تو آمنوا باللہ ورسولہ کی تاویل کیوں نہیں کی جا سکتی۔

اس لئے اس خیال کی اصلاح کر کے انکارِ حدیث کی ایک تیسری صورت پیدا کی گئی اور وہ یہ کہ دین میں کتاب اللہ کے سوا اسوۂ رسول کا اتباع اور لازم ہے۔ اسوۂ رسول۔ رسول کا وہ عمل ہے جو اس نے امت کو کتاب اللہ کے مطابق کر کے دکھلایا ہے اس کے علاوہ دوسرے امور میں اس کی حیثیت پھر وہی امیر کی حیثیت رہ جاتی ہے جس کی اطاعت صرف اس کے زمانۂ حیات سے وابستہ ہوتی ہے اس خیال کے حامل مولوی اسلم صاحب جیراجپوری اور اُن کی جماعت ہے۔ ان کے نزدیک بھی حدیث کو کوئی تشریعی حیثیت حاصل نہیں بہت سے بہت صرف تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے نزدیک مولوی اسلم صاحب بھی مقامِ نبوت سے قطعاً بے خبر ہیں اور اسی لئے خدا کے مقدس رسولوں کو دوسرے امراء کی طرح ایک امیر تصور کرتے ہیں۔ گو اسوۂ رسول کو تسلیم کر کے انہوں نے پہلی جماعت سے

---

[1] ان عمر بن الخطاب کان یقول اصحاب الرأی اعداء السنن أعیتهم الاحادیث ان یحفظوها وتفلتت منهم ان یعوها واستحیوا حین سئلوا ان یقولوا لا نعلم فعارضوا السنن برأیهم فایاکم وایاهم (اعلام ج ۱ ص ۴۵)

حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ قیاسین عقل حدیث کے دشمن ہوا کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف سائلین کے جواب میں انکار کرتے تو انہیں شرم دامنگیر ہوتی ہے حدیثیں یاد کرنے کی توفیق ہوتی نہیں تو اپنی رائے سے جواب دیتے ہیں اور احادیث کا عقل سے مقابلہ شروع کر دیتے ہیں تم ایسے لوگوں سے بچے رہنا۔

ایک قدم ضرور آگے بڑھایا ہے مگر صرف اتنی بات تسلیم کر لینے سے حقِ رسالت ادا نہیں ہوتا۔

ہم نے ہر فریق کے دلائل کو بنظرِ انصاف دیکھا ہے مگر جہاں تک دعوے کے مثبت پہلو میں کسی فریق کے پاس ہمیں کوئی وزنی دلیل نظر نہیں آئی۔ البتہ منفی پہلو میں صرف چند شکوک شبہات ہیں جنہیں ہر فریق نے دلائل کا رنگ دے کر پھیلا دیا ہے۔ زیادہ تر افسوسناک یہ ہے کہ یہ شبہات اہلِ سنت کی کتابوں سے ہی ماخوذ ہیں اور اُن ہی کتابوں میں ان کے جوابات بھی مذکور ہیں مگر منکرینِ حدیث نے نہ اس کی طرف کوئی اشارہ کیا ہے اور نہ اُن جوابات کو نقل کر کے کوئی تردید کی ہے۔ مولانا اسلم صاحب اور ان کے دوسرے ہم خیال صاحبان کا یہ طریقہ ایک علمی سرقہ کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک منکرینِ حدیث کے تمام طویل و عریض بیانات میں صرف دو باتیں قابلِ توجہ ہیں اور وہی ہر پھر کر ان کے تمام بیانات کا خلاصہ بھی ہیں۔

(۱) قرآن کریم ایک جامع کتاب ہے اس لئے دینی ہدایات کے لئے خود کافی ہے حدیث کا محتاج نہیں۔

(۲) قطعی دین کی بنیاد ظنیات پر قائم نہیں کی جا سکتی اور احادیث کا تمام ذخیرہ ظنی ہے۔

مولانا اسلم صاحب نے بھی احادیث نبویہ کے ظنی اور غیر معتبر ہونے پر علم حدیث کے عنوان سے ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ ہمارے نزدیک احادیث کی ظنیت و قطعیت پر مولانا کی یہ بحث ان کے نقطۂ نظر سے بھی غلط ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ میں ڈالنے والی بات ہے کیونکہ مولانا موصوف کے نزدیک احادیث مروجہ کا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلا ہی نہیں آپ نے صرف قرآن کی تبلیغ کی ہے اور اسی پر عمل کر کے امت کو دکھلایا ہے دین کے بس یہی دو رکن ہیں اور یہ دونوں تواتر سے ثابت ہیں۔ اس کے سوا دین کے معاملہ میں آپ نے کبھی کوئی ارشاد نہیں فرمایا۔ اگرچہ یہ خیال بہت ہی تعجب خیز ہے کہ جب حضرتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے دین کے متعلق قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور ہدایت صادر ہی نہیں ہوئی تھی تو پھر حدیث کی یہ دنیا کی دنیا کہاں سے پیدا ہو گئی۔ امت کے سب سے برگزیدہ، اہلِ علم و فضل، صاحب تقویٰ و دیانت، صاحبان نے احادیث کا یہ سارا قلعہ صرف ہوا پر کیسے تعمیر کر دیا اور محض ایک غلط فہمی بلکہ بے علمی کی بنیاد پر صدیوں تک احادیث اور اسماء الرجال کے حفظ میں کیوں مفت سر مارا گیا اس لئے منکرینِ حدیث کو دو باتوں میں سے ایک بات صاف طور پر کہہ دینا چاہیے یا تو صاف اقرار کرنا چاہیے کہ احادیثِ نبویہ نہ تو تشریعی حیثیت رکھتی ہیں نہ تاریخی بلکہ اُن تمام جھوٹوں میں سے وہ بدتر جھوٹ ہیں جو دنیا کے پردہ پر کبھی نہیں بولے گئے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ	اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ افترا باندھے یا یہ کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے حالانکہ اس پر کوئی وحی نہیں بھیجی گئی۔

دوسری صورت میں اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ارشاد فرمایا تھا اور امت نے اُسے ضائع کر دیا تو اس کا اقرار کرنا چاہئے کہ دین محمدی کا بھی ایک حصہ یہودیت و نصرانیت کی طرح ضائع ہو گیا اور اب اس میں سے صرف قرآن کریم باقی رہ گیا ہے۔ یہ کہنا کہ احادیث چونکہ بعد کے دور میں مدون ہوئیں ہیں اس لئے حد یقین کو نہیں پہنچیں اور اس لئے قابلِ حجت نہیں ہو سکتیں۔ اس کا اقرار کر لینا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احادیث ارشاد تو فرمائی تھیں مگر وہ چند در چند وجوہ سے قابلِ اعتبار نہیں رہیں۔ یہ مولانا کے مسلک کے خلاف ہے۔ ان کے نزدیک احادیث مروجہ، سب اباطیل و مزخرفات کا مجموعہ ہے جسے محدثین ائمہ اربعہ، اور دیگر حفاظ نے محض حسنِ ظن سے یا عمداً جھوٹ بول کر خود ترتیب دے لیا ہے۔ العیاذ باللہ

قرآن کریم کی جامعیت تمام امت کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن کریم ایک جامع اور کامل کتاب ہے قائلینِ حدیث بھی منکرینِ حدیث سے بڑھ کر اس کا اعتراف کرتے ہیں لیکن نقطۂ بحث یہ ہے کہ قرآن کی جامعیت کیا احادیث کے ثبوت اور حجیت کے خلاف ہے؟ یا صحیح معنی میں اس کی جامعیت احادیثِ نبویہ پر نظر کرنے کے بعد ہی روشن ہوتی ہے؟

قرآن کریم کی جامعیت کا یہ مفہوم تو غالباً کسی کے نزدیک بھی نہ ہوگا کہ وہ تعلیم و توضیح کا محتاج نہیں، اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال کسی عموم میں کوئی تقیید کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں، ارکان و شرائط اسباب و موانع کی تمام تفصیلات اس میں مذکور ہیں ہر باب کے غیر متناہی جزئیات کا اس نے احاطہ کر لیا ہے۔ فرائض و واجبات، مستحبات و سنن کی تمام حدود اُس نے قائم کر دی ہیں حتیٰ کہ بحث و نظر کے لئے اب اس نے کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا۔ سوچو اور انصاف کرو کہ کیا کسی کتاب کے کامل ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے یا عقلاً ایسا ہونا ممکن بھی ہے اگر جواب نفی میں ہے تو خاص کتاب اللہ کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال کسی عموم میں کوئی تقیید اور کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں رہا حتیٰ کہ وہ اپنے معنی و مراد حاصل کرنے میں رسول کے بیان کا بھی محتاج نہیں۔ اگر درحقیقت قرآن کی جامعیت اور اس کی وضاحت اسی درجہ ہوتی تو رسول کی بعثت بے فائدہ رہتی۔ قرآن کریم براہِ راست اتار دیا جاتا اور دنیا خود اس سے استفادہ کر لیتی۔ لیکن قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت کے لئے رسول کی بعثت کے بغیر کوئی چارہ نہیں، رسول کے واسطہ کے بغیر کتاب اللہ سمجھی نہیں جا سکتی۔ خدا کا فرشتہ اس کی کتاب کی پہلے رسول کو تعلیم دیتا ہے پھر رسول اس پر مامور ہوتا ہے کہ وہ خدا کی اور مخلوق کو اس کی تعلیم دے۔ علّمه شديد القوىٰ ذو مرة۔ حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا بڑا مقصد قرآن کریم کی تلاوت و تعلیم ہی فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ	بیشک بڑا احسان کیا اللہ نے ایمان والوں پر جبکہ بھیجا ان میں پیغمبر انہیں
رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ	میں سے جو پڑھتا ہے اُن پر اللہ کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے
يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔	اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور عقل کی باتیں۔

بعثت رسول کے تین اہم مقاصد

یہاں رسول کی بعثت کے تین اہم مقاصد بتلائے گئے ہیں (۱) تلاوتِ کتاب۔ (۲) تزکیہ۔ (۳) تعلیم۔ تلاوتِ کتاب بظاہر تو سب سے ہلکا اور ادنیٰ مقصد نظر آتا ہے بالخصوص عرب اہلِ زبان کے لئے مگر اس کی اہمیت کا اندازہ صرف آپ کی اُس دعا سے کیا جا سکتا ہے جو آپ نے تلاوت کی توسیع کے متعلق فرمائی تھی آپ نے فرمایا اے اللہ میری امت اُمّی ہے اگر ان پر قرآن کی تلاوت صرف ایک نہج پر لازم کی گئی تو ابتدائی حالات میں یہ ان کے لئے بڑی دشواری کا موجب ہو جائے گا۔ اس لئے کچھ اور توسیع نازل فرما یہ درخواست آپ نے اس وقت تک برابر جاری رکھی جب تک کہ سات حروف تک تلاوت کرنے کی اجازت حاصل نہ کر لی اگر کہیں رسول نے قرآن کی خود تلاوت کر کے نہ بتایا ہوتا تو معلوم نہیں کہ عرب اور بالخصوص عجم کے تلاوت میں کتنے نقائص باقی رہ جاتے آج امت نے اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن کریم کی صحیح طور پر تلاوت کرنے کے لئے مستقل ایک فن مدون کر دیا ہے۔ منکرینِ حدیث کو شاید یہ بھی قرآن کی جامعیت اور اس کے تیسیر کے خلاف معلوم ہوتا ہو گا۔

تعلیم و تزکیہ

یہ بات درست ہے کہ قرآن کریم کے اولین مخاطب عرب تھے جو خود اہلِ زبان تھے مگر کسی کتاب کی مراد سمجھنے کے لئے صرف زبان دانی کافی نہیں ہوتی۔ بسا اوقات مصنف کی مراد محاورات کے توسعات، اشتراک و ترادف اور مجاز و کنایات کے پردوں میں پوشیدہ رہ جاتی ہے بلکہ جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی شرح و بسط کی محتاج سمجھی جاتی ہے۔ دیوانِ غالب اردو ہی کا ایک دیوان ہے اس کی ادبیت بھی ضرب المثل ہے اس کا مولف بھی شعراء کی سب سے پہلی صف میں شمار ہوتا ہے لیکن جب غالب دنیا سے رخصت ہو گئے اور ان کے کلام کی مراد براہِ راست معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہا تو اب ان کا دیوان لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے تختۂ مشق بن گیا صوفی مزاج نے جہاں چاہا اُن کے کلام میں تصوف بھر دیا۔ رند مشرب نے شراب کا لفظ دیکھکر مستی و کیف کے سارے نقشے کھینچ دیئے۔ فلسفی نے اپنی تمام موشگافیاں ختم کر ڈالیں لیکن غالب کی صحیح مراد کے موافق شاید کوئی شرح بھی نہ لکھی گئی اُن سے اگر پوچھا جائے تو وہ ان کے متعلق شاید یہی جواب دیں ؎

ہر کس از ظن خود شد یارِ من وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

جب ایک انسان کی تالیف کا حال یہ ہے تو اب انصاف کیجئے کہ اگر قرآن بھی اسی طرح لوگوں کی طبع آزمائی کا میدان بنا دیا جاتا تو اس کا حشر کیا ہوتا۔ عرب اس وقت اگر زبان دانی کے اعلیٰ سے اعلیٰ دورِ عروج سے گذر رہا تھا تو قرآن بھی اعجاز کے بلند سے بلند مراتب طے کر کے آیا تھا۔ یہ اعجاز صرف اس کے الفاظ تک محدود نہ تھا اس کے معانی میں بھی موجود تھا وہ ان کے پاس ہدایت کے ایسے علوم لے کر آیا تھا جو نسلِ انسانی کو آخری معراج تک پہنچانے کے ضامن تھے۔ تاریخی واقعات اور علمی نزاعات میں اس کی حیثیت حکم کی حیثیت تھی وہ مبدأ و

معاد، الٰہیات و مجردات، اسرار غیب اور روحانی حقائق کا معلم، معاشرت و معاشیات کا مقنن بن کر نازل ہوا تھا اور مخاطبین اپنی طویل گمراہی، بے علمی اور طبعی ضد کی وجہ سے ایسی تاریکی میں گر چکے تھے کہ ان میں ان علوم کے از خود سمجھنے سمجھانے کا کوئی سلیقہ ہی باقی نہ رہا تھا جو لوگ ایک اللہ کے لفظ کے سوا رحمٰن کے نام سے بھی نا آشنا ہوں اُن سے از خود قرآن فہمی کی توقع رکھنا کتنا بعید ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ — جب ان سے کہا گیا رحمٰن کو سجدہ کرو،

قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ۔ — بولے رحمٰن کیا ہوتا ہے؟

اس ماحول میں اگر قرآن صرف ان کی زبان دانی اور ان کی فہم پر چھوڑ دیا جاتا اور رسول کی ذات درمیان سے علیحدہ کر لی جاتی تو کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وہ ..... اللہ تعالیٰ کی صحیح مراد کو پہنچ جاتے۔ دیوانِ غالب کی شرحیں اگر مختلف ہو گئیں ایک ایک شعر کے کئی کئی معنی بیان کئے گئے تو یہاں غالب کو اور داد ملی لیکن اگر یہی حال قرآن کا ہو جاتا تو سوچو کیا راہِ ہدایت صحیح طور پر کسی کے ہاتھ آجاتی۔ بات یہ ہے کہ غالب کا دیوان شعر کا ایک دیوان ہے، شعر خود نازک خیالیوں اور مبالغہ آمیزیوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے اس لئے یہاں جو شارح جتنا دور اور جتنا گہرا گیا اتنا ہی کامیاب سمجھا گیا۔ یہاں بحث صرف یہ ہے کہ جو معنی غالب کے الفاظ میں پہنائے گئے ہیں الفاظ میں ان کی قریب یا بعید صلاحیت موجود بھی ہے یا نہیں۔ غالب کی مراد سے یہاں نہ کوئی بحث ہے نہ ہو سکتی ہے۔ کتاب اللہ میں صرف الفاظ کی صلاحیت پر بحث نہیں ہوتی وہ شاعری نہیں حقیقت اور ٹھیک حقیقت کا پتہ دینے آئی ہے جو کتاب ہر معاملہ کی حقیقت کا فیصلہ کرنے آئی ہے اگر وہ بھی رائے زنی اور محض دماغی مشاقی کا میدان بنادی جائے تو یہاں بھی دیوانِ غالب کی طرح حقیقت کا سراغ لگنا نا ممکن ہو جائے اور جب دورِ صحابہ میں قرآن کا نقشِ اول ہی اس ابہام و اجمال میں قائم ہو تو آئندہ نسلوں میں قرآن کے ابہام کا حال کیا ہو یقیناً دینِ الٰہی جیسا پہلے مجہول تھا کتاب اللہ کے نزول کے بعد اس سے زیادہ مجہول ہو جائے اور کوئی شخص بھی یہ نہ بتلا سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی ذات و صفات کے متعلق کیا عقائد لے کر تشریف لائے تھے اور آپ نے عبادات و معاشرت، تمدن و معیشت کے کیا اصول مقرر فرمائے تھے اور اس طرح یہ کامل دین ناقص در ناقص بن کر رہ جائے۔ اس لئے یہاں رائے زنی کو سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا اور صاف طور پر یہ اعلان کر دیا گیا کہ اگر کسی نے قرآن میں صرف اپنی رائے سے کام لیا اور فرض کر لو کہ حسب الاتفاق اس کی صحیح مراد حاصل بھی کر لی تو بھی اس کا یہ اقدام نہایت غلط ہے۔

خطا اگر راست آید تا ہم خطا است

جب محض زبان دانی عام کتابوں کے سمجھنے کے لئے بھی کافی نہیں اور رائے زنی کی اس میں ممانعت کر دی گئی

تو اب اس کے سوا اور کیا صورت تھی کہ خدا کا رسول خود آ کر اس کی تعلیم دے پہلے خود پڑھے پھر انھیں پڑھ کر سنائے جب وہ الفاظ کی تصحیح سے فارغ ہو لیں تو اس کے بعد خدا تعالیٰ کی مراد بتلائے اور ساتھ ہی ساتھ اس پر عمل کرنے کی ایسی اسپرٹ پیدا کر دے کہ ان کے جوارح جنبشِ عمل کے لئے بے چین ہو جائیں اور اس طرح بہت جلد انھیں اسلام کے پاکیزہ عقائد اور خالص اعمال سے مزین کر کے کفر کی ظلمتوں سے باہر نکال دے۔

اگر اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے رسول کے ذریعہ جلد جلد انھیں تعلیم و تزکیہ کے مراحل طے نہ کراتا تو یقیناً وہ مدت العمر اس کی مراد حاصل نہ کر سکتے۔ کتاب اللہ جو خالص عمل کرنے کے لئے نازل ہوئی تھی وہ صرف دماغی کد و کاوش کا مشغلہ بن کر رہ جاتی اور خدا کی مخلوق اُن تمام ترقیات و مدارج سے محروم رہ جاتی جو اعمالِ صالحہ کے صلہ میں ان کے لئے موعود تھیں اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بڑا احسان کیا کہ اپنی راہ کی تلاش ان کے ذمہ نہیں ڈالی بلکہ ان میں اپنا ایک رسول بھیجا اور اپنی کتاب نازل فرمائی پھر اس کتاب کی مراد سمجھنے کا بار بھی اُن کے اُمّی دماغوں پر نہیں ڈالا بلکہ عالم کا سب سے بڑا معلم اس کی تعلیم دینے کیلئے بھیجا اُس نے پڑھایا، سمجھایا اور اگر انھیں کوئی شبہ پڑا تو نہایت سہولت سے اسے حل بھی کر دیا اور اس طرح اُن کی ہدایت کا راستہ بہت مختصر کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اپنی جد و جہد سے اس پر عمل کرنے کے لئے انھیں مضطر بھی کر دیا اور بہت جلد ان کی زندگی میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ وہ اپنی آبائی وراثت یعنی جنت سے محروم ہو جانے کے بعد پھر اس کے مستحق و مالک بن گئے۔

آیاتِ قرآنیہ میں صحابہ کے چند شبہات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات

یہاں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کی چند مثالیں پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جن سے یہ اندازہ کیا جا سکے گا کہ صحابہ کرام کو بھی قرآن فہمی میں شبہات پیش آجاتے تھے اگر کہیں وہ دور نہ کئے جاتے تو نہ معلوم کب تک وہ .... اسی عالم تردد میں پڑے رہتے۔

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ۔ (جو لوگ ایمان لائے پھر انھوں نے اپنے ایمانوں میں کوئی ظلم شامل نہیں کیا یہی لوگ ہیں جن کو امن ملے گا اور یہی ہدایت یافتہ ہیں) تو صحابۂ کرامؓ گھبرا اٹھے اور دربارِ رسالت میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ ہم میں ایسا شخص کون ہے جس نے ایمان لانے کے بعد کوئی ظلم اور معصیت نہ کی ہو؟ پس اس آیت کے بموجب تو ہم میں کوئی بھی امن اور ہدایت کا مستحق نہیں رہتا آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے ہر معصیت مراد نہیں ہے بلکہ خاص شرک مراد ہے۔ جیسا کہ دوسری آیت میں شرک کو ظلم ہی سے تعبیر فرمایا گیا ہے اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (شرک بہت بڑا ظلم ہے) یہ جواب سُن کر صحابہ کے دل مطمئن ہو گئے اور ان کا تردّد جاتا رہا۔

(۲) ایک مرتبہ آپ نے فرمایا قیامت کے دن جس کا بھی حساب لیا گیا سمجھ لو کہ بس وہ ہلاک ہوا۔ اس پر ایک بی بی نے عرض کیا یا رسول اللہ قرآن تو یہ کہتا ہے وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ کِتَابَہٗ ... فَسَوْفَ یُحَاسَبُ حِسَابًا یَّسِیْرًا۔ (جس شخص کا اعمالنامہ دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اس کا حساب نہایت نرمی سے ہوگا۔) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہلاک نہ ہوں گے۔ آپ نے فرمایا حسابِ یسیر کے معنیٰ عرض کے ہیں۔ یعنی اعمالنامہ ان کے سامنے رکھ کر ان کو صرف جتلا دیا جائے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا ہے مگر اس پر باز پرس نہ ہوگی۔ اس کے سوا اگر کسی سے یہ سوال کر لیا گیا کہ یہ کام کیوں کیا تھا تو بیشک اس کی خیر نہیں۔ (صحیح بخاری) یہ سن کر ان کا شبہ رفع ہوگیا۔

(۳) جب روزہ کے احکام میں یہ آیت نازل ہوئی۔ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ۔ (کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ سیاہ و سفید دھاگہ میں تمہیں فرق معلوم ہونے لگے) تو عدی بن حاتمؓ نے دو دھاگے ایک سفید اور دوسرا سیاہ لے کر اپنے تکیہ میں رکھ لئے اور شب میں ان دھاگوں کو دیکھتے رہے جب دونوں کا رنگ نظر آنے لگا تو انھوں نے کھانا پینا بند کر دیا۔ آپ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا اے عدی تمہارا تکیہ بڑا لمبا چوڑا معلوم ہوتا ہے جس میں رات اور دن دونوں سما جاتے ہیں یہاں سفید اور سیاہ دھاگے مراد نہیں، شب کی تاریکی اور دن کی سفیدی مراد ہے۔ اس کے بعد مزید توضیح کے لئے آیت میں مِنَ الْفَجْرِ کا ٹکڑا اور نازل ہوگیا تاکہ پھر اس غلط فہمی کا اعادہ نہ ہو۔

(۴) بعض صحابہ کو آیت مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ (جو شخص کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا) میں یہ شبہ ہوا کہ ہر انسان سے کوئی نہ کوئی قصور تو ہوتا ہی ہے لہذا اس آیت کے موافق ہر شخص کے لئے عذاب میں گرفتار ہونا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں بدلہ سے جہنم کا عذاب سمجھنا صحیح نہیں بلکہ ہر وہ تکلیف جو انسان کو دنیا میں پہنچتی ہے وہ بھی اس کی فروگذاشت کا بدلہ بن جاتی ہے۔

ہر چند کہ منکرینِ حدیث کے سامنے احادیث سے کوئی بات ثابت کرنا بے سود ہے مگر یہاں ہماری غرض ان احکام کا اثبات نہیں بلکہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتلانا منظور ہے کہ صحابہ کرام کو بھی اہلِ زبان ہونے کے باوجود... قرآنِ کریم میں کچھ شبہات پیش آئے ہیں جنھیں اگر وہ براہِ راست صاحبِ رسالت سے حل نہ کرتے تو نہ معلوم ان آیات کی مرادیں سمجھنے میں کتنی الجھنیں پیش آتیں۔ کیا کوئی شخص صرف زبانِ عربی کی مدد سے یہ متعین کر سکتا ہے کہ سوال اول میں ظلم سے شرک مراد ہے یا سوال نمبر ۲ میں حسابِ یسیر کے معنیٰ اعمالنامہ سامنے رکھ دینے کے ہیں یا سوال نمبر ۴ میں جزا سے دنیوی تکالیف مراد ہیں۔ پہلی آیت عقائد اور دوسری معاد اور تیسری عبادات سے متعلق ہے۔ یہ تینوں باب صرف ایک غلطی کی وجہ سے خدا جانے کتنی تاریکی میں پڑے رہتے۔

مزید براں قرآن فہمی کے بھی اتنے مراتب ہیں کہ بعض مرتبہ چھوٹوں کا ذہن ایسی بات کی طرف منتقل ہو جاتا تھا کہ بڑوں کا ذہن اس طرف نہ جاتا تھا مثلاً سورۂ اذا جاء نصر اللہ میں ابن عباسؓ کا یہ سمجھنا کہ اس میں آپ کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے یا ایک عورت کا حضرت عمرؓ کے زیادہ مہر مقرر کرنے کی ممانعت کو تسلیم نہ کرنا اور کہنا کہ وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَارًا۔ سے معلوم ہوا کہ اگر مہر زیادہ بھی مقرر کر دیا جائے تو جائز ہے۔ جس قرآن میں نافہمی سے یہ شبہات اور فہم کے یہ مراتب ہوں وہ رسول کے بیان کے بغیر کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ اگر قرآن کی مراد صرف عقول کے حوالہ کر دی جاتی اور رسول آکر خود اس کو بیان نہ کرتا تو نہ معلوم شریعت کا حال کیا بن جاتا۔

سوال نمبر ۳ سے یہ اندازہ بھی ہو سکتا ہے کہ شبہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ منشا رشبہ خود کتاب اللہ میں بھی موجود ہو بلکہ بعض مرتبہ انسانی دماغ کسی مغالطہ میں پھنس کر از خود کوئی شبہ پیدا کر لیتا ہے پھر اگر یہ شبہ بالکل بے بنیاد ہو تو قابل رعایت نہیں ہوتا لیکن کسی حد تک معقول ہو تو اس کا جواب بھی دے دیا جاتا ہے شبہ کے ان مراتب کی تشخیص حکم کی مرضی پر موقوف ہے اسی لئے قرآن کریم نے بہت سے شبہات کا جواب دیدیا ہے اور بہت سے شبہات کو ناقابل جواب سمجھ کر جواب کی طرف توجہ نہیں کی۔

قرآن کریم کے مضامین کے متعلق بعض تشریحی سوالات

یہ تو اُن مشکلات کی چند مثالیں تھیں جو صحابۂ کرام کو قرآن کی نفس مراد سمجھنے میں پیش آئیں۔ اب اُن مشکلات کی چند مثالیں دیکھئے جو صحابہ نے قرآن کی بعض تفصیلات کے متعلق آپ سے دریافت کیں۔

(۱) قرآن کریم کہتا ہے کہ قیامت میں باری تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ صحابہ اہل زبان تھے رؤیت کا مفہوم ان کو معلوم تھا اس لئے رؤیت کے مفہوم میں اُنھیں کوئی مغالطہ نہیں ہوا انھوں نے اس کی پوری حقیقت سمجھ لی اور معتزلہ کی طرح اُس کی کوئی تاویل بھی نہیں کی لیکن جو کچھ دشواری انھیں پیش آئی وہ صرف اس کی تفصیل سمجھنے میں تھی کیونکہ دنیا میں معمولی اجتماع کے وقت کسی ایک شخص کو باطمینان دیکھنا ممکن نہیں ہوتا، پھر قیامت میں جہاں اولین و آخرین کا بہت بڑا اجتماع ہوگا ایک خدا کی رؤیت کیسے ہوگی۔ بظاہر بہت سی گردنیں پھلانگنی پڑیں گی، بہت سے کاندھے چھل جائیں گے اور پھر بھی شاید سب اہل محشر برابر کی رؤیۃ سے فیض یاب نہ ہو سکیں۔ یہ تخیلات نہ رؤیۃ کے ثبوت کے متعلق ہیں نہ اس کی مراد میں بلکہ پورے وثوق کے بعد ان تفصیلات کے معلوم کرنے میں ہیں جن کے لئے کہ ایک مشتاق متلاشی رہا کرتا ہے۔ آپ نے نہایت سادگی سے فرمادیا کہ مخلوقات کے دائرہ ہی میں آؤ، دیکھو آفتاب اور چاند تمہارے سامنے ہیں، اس کا نور گرم ہے اُس کا سرد، اِس کی تمام تر تمازت اور اُس کی انتہائی ملاحت کے باوصف جس طرح بلا مزاحمت تم اُن دونوں کو دیکھا کرتے ہو اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ اپنے رب کو محشر میں دیکھو گے جب مخلوقات کے

دائرہ میں تمہاری آنکھوں کے سامنے ایک مثال نہیں بلکہ دو مثالیں ایسی موجود ہیں جہاں تمام عالم کو بیک وقت دیدار میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تو خالق کے دائرہ میں بھی جو اس سے کہیں اعلیٰ وارفع ذات ہے کوئی دشواری نہ ہوگی۔ آپ کی اس مثال کے بعد آیت وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ۔ اس دن بہت (لوگوں کے) منہ ترو تازہ ٹکٹکی لگائے اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

(۳) ایک مرتبہ تقدیر کے مسئلہ میں صحابۂ کرام کو یہ شبہ ہوا کہ جب ہمارے اعمال پہلے سے طے شدہ لکھے پڑے جا چکے ہیں تو اب آئندہ عمل کی جدوجہد کرنا بیکار ہے، ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ کیوں نہ رہیں، آپ نے فرمایا اگر تم سعید لکھے جا چکے ہو تو تم سے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اعمالِ صالحہ نہ کرو اور اگر خدانہ کردہ تقدیر دوسری طرف جا چکی ہے تو اعمالِ صالحہ کی ہزار کوشش کرو مگر تم کر ہی نہیں سکتے۔ تم سمجھتے ہو کہ عمل کی جدوجہد کرنا تقدیر سے باہر بات ہے ایسا نہیں بلکہ تقدیر کا وسیع احاطہ جہاں جزا و سزا کو محیط ہے ایسا ہی عملِ خیر اور عملِ شر کو بھی محیط ہو چکا ہے لہذا عمل کئے جاؤ تم سے وہی عمل صادر ہوں گے جو تمہاری تقدیر کے موافق ہیں[1]۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى۔ یعنی نیکی کی توفیق اور بدی سے احتراز سب اللہ تعالیٰ ہی کے تیسیر سے میسر آتا ہے۔

(۴) يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ۔ (اس دن جبکہ زمین اپنی حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان دستِ ایزدی میں لپٹے ہوئے ہوں گے) صحابہ نے دریافت کیا یا رسولؐ جب ایک طرف زمین اپنی موجودہ حالت سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی لپیٹ دیئے جائیں گے، تو اس وقت خدا کی یہ ساری مخلوق کہاں ہوگی فرمایا پل صراط پر۔

(۵) سورۂ والنجم میں جب اللہ تعالیٰ کے دیدار کا ذکر آیا تو صحابہ نے ازراہِ اشتیاق پوچھا یا رسول اللہ آپ نے اپنے رب کو دیکھا، کیسا تھا؟ فرمایا ایک نور تھا۔ عالمِ قدس کی تعبیر دنیا میں نور کے لفظ سے زیادہ واضح کسی اور لفظ سے ہو ہی نہیں سکتی، اس پر نور کا اطلاق ایسا ہی ہے جیسا وادیِ ایمن کے نورِ نار کا اطلاق۔ وہ بھی دراصل ایک نور ہی تھا مگر اس وقت بشکلِ نار نظر آرہا تھا۔

(۶) صحابۂ کرامؓ نے جب یہ بار بار سنا کہ مرنے کے بعد پھر ایک مرتبہ زندہ ہونا ہے تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مٹی ہو کر ریزہ ریزہ ہو کر پھر نئے سرے سے زندگی کیوں کر ہوگی؟ فرمایا کبھی بارش سے قبل

---

[1] یہ جواب سن کر سراقہ بن جعشم فرماتے ہیں کہ میں آج سے عمل میں جتنی کوشش ہوسکتی ہے کروں گا۔ حیرت ہے کہ تقدیر کا مسئلہ سن کر صحابہ نے کیا کہا تھا اور آج دنیا کیا کہتی ہے۔ حضرت عمرؓ سے بھی اسی کے قریب الفاظ منقول ہیں۔

تم نے زمین کی حالت دیکھی ہے کیسی خشک کیسی بے آب وگیاہ نظر آتی ہے پھر بارش کے بعد کتنی سبز کتنی تروتازہ ہوجاتی ہے وہ تنکے جو اسی زمین پر مردہ لیٹے ہوئے تھے ایک چھینٹا پڑنے کے بعد ہی کیسے اکڑتے ہوئے کھڑے ہوجاتے ہیں کَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ۔ اسی طرح مرنے کے بعد تم بھی پھر جی اٹھوگے۔

(۷) قرآن کریم کی بے شمار آیتوں میں وحی کا لفظ آیا ہے، عرب وحی کے لفظ اور اس کی عام شرح سے تو واقف تھے لیکن وحی رسالت اور وحی نبوت کی تفصیل نہ جانتے تھے اس لئے آپ سے دریافت کیا گیا، یارسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ نے اس کی اجمالاً تین صورتیں بتلائیں جو صحیح بخاری کے پہلے ہی صفحہ میں مذکور ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص کو اس سے بھی بڑھ کر عین حالتِ وحی میں آپ کو دیکھنے کا شوق دامنگیر ہوا، اس نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا انھوں نے موقع پاکر فرمایا آ دیکھ لے۔ وہ آیا اور اس نے عین وحی کی حالت میں آپ کو دیکھا اور اس طرح نزولِ وحی کی شدت جو کبھی پہلے سنا ہی کرتا تھا اب اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرگیا۔

(۸) يَاۤ اُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۔ اس پر بعض اہلِ کتاب نے صحابہ سے سوال کیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں یہ ہارون علیہ السلام کی بہن کہاں سے آگئیں حضرت ہارون اور موسٰی علیہما السلام کا زمانہ تو ایک ہی زمانہ ہے اور حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی علیہما السلام کے درمیان بہت بڑی مدت ہے۔ صحابہؓ سے اس کا جواب نہ آیا، آپ سے دریافت کیا آپ نے فرمایا، یہ بھی کوئی اعتراض ہی ہر قوم اپنے نبیوں کے ناموں پر تبرکاً نام رکھتی چلی آئی ہے، یہاں وہ ہارون نبی مراد نہیں بلکہ ان کے ہمنام اور شخص مراد ہے۔

(۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے دریافت کیا آیتِ قرآنیہ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ میں یہ سبا کسی عورت کا نام ہے یا ملک کا۔ آخر تمام صحابہ جغرافیہ داں تو نہ تھے اُمّی لوگ تھے، ان کے دماغوں میں یہ سوالات آجانا کچھ بعید نہ تھا آپ نے فرمایا نہ کسی عورت کا نام ہے نہ ملک کا بلکہ ایک شخص کا نام تھا جس کی طرف عرب کے دس قبائل منسوب ہیں۔

(۱۰) وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَاۤ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔

اس پر بعضوں نے دریافت کیا شاید یہ اُن لوگوں کا حال ہے جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں اس لئے انھیں عذاب کا ڈر ہوگا۔ آپ نے فرمایا بلکہ یہ وہ نیک لوگ ہیں جو اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں کہ ان کے یہ اعمال کہیں قیامت کے دن قبول نہ ہوں۔

(۱۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یہ تعویذ، گنڈے اور مختلف قسم کی دوائیں،

کیا تقدیر الٰہی پلٹ دے سکتی ہیں فرمایا نہیں بلکہ یہ بھی تقدیر کے احاطہ میں داخل ہیں۔ جو دوا اثر کرتی ہے اس کے متعلق تقدیری احاطہ میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ یہ شخص فلاں دوا کرے گا اور اچھا ہو جائے گا۔ اِس مختصر جواب سے یہ شبہ بھی رفع ہو جاتا ہے کہ کونین خود جراثیم ملیریا کے لئے مہلک ہے اس لئے اس کے استعمال سے بخار چلا جانا ضروری امر ہے۔ ہر جگہ تقدیر کا مسئلہ اڑا دینا جہالت کی بات ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا فرمانا درست ہے مگر اس مہلک جراثیم کا استعمال کرنا نہ کرنا یہ بھی تقدیر میں پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہ اس مرتبہ مثلاً وہ جراثیم ہلاک نہ ہوں گے اس لئے بعض مرتبہ بیسیوں گرین کونین استعمال کر لینے کے بعد بھی یہ جراثیم فنا نہیں ہوتے اسباب اور تقدیر میں مزاحمت نہیں اسباب کسی حد تک مؤثر ہیں مگر دائرۂ تقدیر سے باہر نہیں۔

فروعی مسائل کے متعلق چند سوالات اس کے بعد ہم یہاں چند مثالیں ایسی بھی پیش کرنا چاہتے ہیں جو صحابہ کے بعض فروعی سوالات سے متعلق ہیں۔

(۱) ایک مرتبہ صحابہ کا ایک دستہ جس کا گذران بیشتر سمندر کے شکار پر تھا آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ ہم لوگ اکثر سمندر میں سفر کرتے ہیں اور صرف پینے کے لئے تھوڑا سا پانی ہمارے ساتھ ہوتا ہے اگر اُس سے وضو کرلیں تو پیاسے رہیں، کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر سکتے ہیں، آپ نے فرمایا کیوں نہیں، اس کا پانی اور مردار دونوں پاک ہیں۔ سوال کی وجہ یہ تھی کہ قرآن کریم میں جس پانی کی صفت طہور بتلائی گئی تھی وہ بارش کا پانی تھا وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا۔ (اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا ہے) کنویں کا پانی بھی دراصل یہی پانی ہوتا ہے جو جذب ہو کر زمین کی تہ میں محفوظ رہتا ہے۔ سمندر کا پانی دوسرے قسم کا پانی تھا اس کا ذائقہ جدا اُس کا رنگ جدا، پھر اس میں بہت سے جانور بھی مرتے کھپتے رہتے ہیں۔ اس لئے ابتدائی حالات میں یہ سوال بیجا نہ تھا آپ کے جواب سے وہ مطمئن ہو گئے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک کنواں بیر بضاعۃ کے نام سے مشہور تھا اس کے ذریعہ سے چند کھیتوں کی آب پاشی بھی کی جاتی تھی چونکہ جنگل میں واقع تھا اس لئے جنگل کے کنوؤں کی طرح وہ بھی محفوظ نہ رہتا تھا ہر چند کہ آب پاشی کی وجہ سے اس کا پانی اکثر نکلتا رہتا تھا تاہم نفیس المزاج صحابہ کو یہ سوال کرنا پڑا کہ وہ ایک ایسا کنواں ہے جس میں طرح طرح کی نجاستوں کا جا پڑنا بہت ہی قرین قیاس ہے کیا اس کا پانی وضو کے قابل ہے آپ نے فرمایا (شبہ مت کرو) جب تک نجاست کا اثر پانی میں نظر نہ آئے، (غیر محفوظ) پانی ناپاک نہیں ہوتا۔ قدرت نے جب پانی کو پاک پیدا کیا ہے تو جب تک کوئی دلیل ظاہر موجود نہ ہو اس کے ناپاک کہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر محض شبہات کی بنا پر پانی ناپاک کہہ دیا جائے تو عرب جیسی سرزمین پر یہ حکم بڑی تنگی کا موجب بن جائے۔

(۳) حضرت ام سلمہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ میں اپنے بال سخت گوندھتی ہوں کیا جنابت سے غسل میں مجھے اپنے بال ہر بار کھولنا چاہیئے؟ آپ نے فرمایا نہیں جڑوں میں پانی پہنچا لینا کافی ہے۔

(۴) ایک عورت اپنا دامن ذرا لمبا رکھتی تھیں مسجد کا راستہ ناصاف تھا۔ جب مسجد جاتیں تو دامن زمین پر گھسٹتا اس لئے اُن کو وہم ہوا کہ شاید ناپاک ہو جاتا ہوگا۔ آپ سے عرضِ حال کیا۔ آپ نے فرمایا پاک کپڑا زمین پر گھسٹنے سے ناپاک نہیں ہوتا جب تک اس میں ناپاکی کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔

(۵) ایک مرتبہ گھی میں چوہیا گر گئی اور مر گئی، اس گھی کے متعلق آپ سے دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا اگر گھی جما ہوا ہے تو چوہیا پھینک دو اور اس کے ارد گرد کا گھی بھی پھینک دو بقیہ گھی استعمال کرلو، اور اگر گھی پگھلا ہوا ہے تو اب کھانے کے قابل نہیں رہا۔

(۶) آپ سے مردار کی کھال کے متعلق پوچھا گیا کیا اُسے استعمال کر سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں دباغت اسے پاک کر دیتی ہے۔

(۷) آپ نے تین تین بار وضو کر کے فرمایا وضو اس طرح کرنا چاہیئے اس سے زیادہ پانی بہانا پانی ضائع کرنا ہے۔

(۸) ایک بادیہ نشین شخص نے دریافت کیا ہم چار چار مہینے ریگستان میں رہتے ہیں پانی نہیں ملتا غسل کے موقعہ پر ہم کیا کریں آپ نے فرمایا تیمم کر لیا کرو تمہارے لئے یہی پاکی ہے۔

(۹) ایک شخص آپ کی خدمت میں نماز کے اوقات دریافت کرنے کے لئے آیا آپ نے فرمایا دو دن ہمارے ساتھ نماز پڑھو، پہلے دن تمام نمازیں اول وقت ادا کیں دوسرے دن آخر وقت پھر فرمایا نماز کے اوقات دیکھ لئے یہ ہیں۔

(۱۰) ایک سائل نے پوچھا یا رسول اللہؐ دن رات میں وہ گھڑی کونسی ہے جس میں پروردگار اپنے بندوں کے سب سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے آپ نے فرمایا آخر شب۔

ہم نے مثال کے طور پر یہاں صرف دس دس سوال وجواب ذکر کئے ہیں حافظ ابن قیمؒ نے پورے ایک سو دس صفحات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے سوال وجواب تحریر فرمائے ہیں[۱]۔ ان سینکڑوں سوال وجواب کے مرتب اور پُر مغز سلسلہ کو جو اسانید ثابتہ کے ساتھ روایت ہوتا چلا آیا ہے یکلخت موضوع کہدینا منکرین حدیث کے لئے تو بہت آسان ہے لیکن جنھوں نے ابھی تک انکارِ حدیث کا فیصلہ نہیں کیا ہے اُن کو کم ازکم اس پر تو غور کرنا چاہیئے کہ اگر بالفرض صحابۂ کرام کے دماغوں میں اس قسم کے سوالات پیدا ہوئے ہوں، یا آج جب عمل

[۱] دیکھو اعلام الموقعین ج ۴ از ص ۲۳۰ تا ۳۴۱۔

کے لئے قدم اٹھایا جائے اور یہ سوالات پیدا ہونے لگیں تو کیا ان کے جوابات صرف قرآن اور عقل کی مدد سے دیئے جاسکتے ہیں بالخصوص اُس امی قوم سے جس کو ابھی تک استنباط کے طریقوں اور مسائل کے استخراج سے کوئی واسطہ نہ پڑا ہو، اور اگر بالفرض دیئے جاسکتے ہیں تو کیا وہ اتنے ہی مختصر اور حقیقت سے لبریز اور اتنے ہی تشفی بخش ہوں گے جو یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص سوال و جواب کے اس تمام سلسلہ پر انصاف کے ساتھ نظر ڈالتا رہے تو اس کو بہت جلد یقین آجائے گا کہ یہ جوابات حدیث کی مدد کے بغیر ہرگز براہِ راست قرآن سے اخذ نہیں کئے جاسکتے اور اس لئے قدرِ مشترک طور پر وہ مجبور ہوگا کہ ان کی اصلیت اور واقعیت تسلیم کرلے۔ وہ ہرگز یہ ہمت نہیں کرسکتا کہ اس تمام قیمتی اور علمی ذخیرہ کو محض چند شبہات کی بنا پر موضوع کہہ ڈالے۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی اُس کو پورا پورا احساس ہوگا کہ کتاب اللہ کی جامعیت اور اس کی صحیح مراد سمجھنے کے لئے یقیناً ایک ایسے معلم کی بھی ضرورت ہے جو اپنی عقل سے نہیں بلکہ خدا سے علم پاکر حسب ضرورت اس کی تفصیل کرتا رہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ اگر کوئی معلم نہ ہو تو اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے معلم کے ساتھ کتاب نہ ہو۔ اس لئے کتاب اللہ کا رشتہ رسول سے ہرگز قطع نہیں کیا جاسکتا۔ اُس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جو رشتہ کہ خدا اور رسول کے مابین ہے وہی کتاب اللہ اور حدیث رسول کے درمیان سمجھنا چاہیئے۔

اسوۂ رسول اور کتاب اللہ

یہ امر بھی ملحوظ رہنا چاہیئے کہ کتاب اللہ صرف ایک علمی کتاب نہیں جس کا مقصد صرف علمی طور پر حل کرلینا ہو اور بس بلکہ یہ افراد و اقوام کا وہ دستور العمل بھی ہے جسے زندگی کے ایک ایک شعبہ میں نافذ کرنا ہے اس لئے رسول کی تعلیم کے بعد بھی ایک اہم ضرورت باقی رہتی ہے اور وہ اس کا نقشۂ عمل ہے۔ دنیوی علوم میں بھی بہت سے علم ایسے ہیں جو عملی مشاقی کے بغیر اولاً تو سمجھ ہی میں نہیں آتے اور اگر سمجھ میں بھی آجائیں تو اس وقت تک صحیح طور پر کئے نہیں جاسکتے جب تک کہ اس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو، جیسے ڈاکٹری کا علم یا سائنس کے دوسرے تجربات کے ان کا علمی طور پر سمجھنا بھی پہلے ان کے عمل کو دیکھنے پھر خود عملی طور پر ان کو کرلینے پر موقوف ہے صرف ان کا پڑھ لینا ان کی پوری حقیقت سمجھنے کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ جب ان معمولی علوم کا حال یہ ہے تو پھر ربانی علوم کی دقتیں اور معاملات و عبادات کی نزاکتیں اپنے انواع و اقسام کے اختلاف کے ساتھ کسی ربانی معلم کی تعلیم اور اس کے کسی صحیح نقشے کے دیکھے ہوئے بغیر کیسے سمجھی جاسکتی ہیں۔

اس لئے ضروری ہوا کہ کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اس کا صحیح صحیح نقشۂ عمل بھی بھیجا جائے تاکہ تعلیم رسول کے بعد اُس میں جو عملی الجھنیں باقی رہ جائیں وہ اس مکمل نقشہ کو دیکھ دیکھ کر حل کرلی جائیں، مشیتِ ایزدی نے یہاں معلّم کتاب کے ساتھ اس کا نقشۂ عمل علیحدہ نہیں بھیجا بلکہ جو معلّم تھا خود اسی کو مجسم نقشۂ عمل بنا دیا تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ہر قوم کے لئے ایک پیشوا نمونہ ہوتے ہیں تمہارے لئے بہتر نمونہ خدا کا رسول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول صرف تبلیغ وحی کے لئے نہیں آتے بلکہ عملی طور پر کتاب اللہ کا نمونہ بھی ہوتے ہیں اس لئے ہر عمل میں ان کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔

اسوۂ رسول کی جامعیت

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم تمام کتبِ سماویہ میں سب سے زیادہ جامع کتاب ہے اس لئے اس کا نقشۂ عمل بھی تمام نقشوں میں جامع تر ہونا چاہئے یعنی اگر کتاب اللہ میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ کے احکام مذکور ہیں تو اس کی زندگی میں بھی ان عبادات کا مکمل نقشہ ملنا چاہئے اور اگر اس میں امارت و امامت، غزوات و جہاد، نظم و نسق اور فصلِ خصومات کے ہدایات بھی موجود ہیں تو ان کا نقشہ بھی اس کی زندگی میں نظر آنا چاہئے۔ اگر اس کی حیات میں قرآن کا ایک ہی پہلو ہو، فصلِ خصومات اور دیگر انتظامی امور کا نمونہ نہ ہو تو اس نمونہ کو مکمل نمونہ اور اس نقشہ کو قرآن کریم کا مکمل نقشہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس نمونہ کو جامع اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ قرآن کے ہر چھوٹے بڑے عمل کی تصویر اس کی ساعاتِ زندگی میں نظر آجائے صرف عبادات و معاملات کی نہیں بلکہ اُن فطری حالات کی بھی جہاں شریعت نے کچھ نہ کچھ دخل دیدیا ہے[1] یعنی بول و براز، طعام و شراب،

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض منافقوں نے طعن کے لہجہ میں صحابہ سے کہا اچھا صاحب تمہارا رسول تو پاخانہ پھرنے اور پیشاب کرنے کا طریقہ بھی بتلاتا ہے گویا ان نافہموں کے نزدیک انسانی زندگی کے یہ شعبے کسی سماوی ہدایت کے محتاج ہی نہیں تھے حالانکہ سوچنے کی بات تو یہ تھی کہ جو گوشے زیادہ کمزور ہوتے ہیں وہی زیادہ قابلِ اصلاح بھی سمجھے جاتے ہیں۔ نافہم انسان صرف ایک گوشہ کی تکمیل کو تکمیل سمجھ لیتا ہے اور ذی فہم جانتا ہے کہ بعض مرتبہ مکان کے غیر اہم گوشوں کی طرف غفلت کرنے سے تمام مکان ہی غیر محفوظ ہو جاتا ہے اگر بول و براز کی نزاکتیں معلوم نہ ہوں تو طہارت کیسے حاصل ہو اور جب طہارت حاصل نہ ہو تو نماز کیا ہو اور جب نماز ہی نہ ہو تو دین کیا رہ جائے۔ تعجب ہے کہ کل جاہلیت کے دور میں جو اعتراض منافقین کی زبانوں سے نکل رہے تھے وہی اعتراضات آج خود مسلمانوں کی زبانوں سے نکل رہے ہیں وہ اُن احادیث پر جو انسانی مستور زندگی سے متعلق ہیں وہی اعتراضات کرتے ہیں جو منافقین قضاءِ حاجت انسانی کی احادیث پر کرتے تھے۔ حالانکہ ان کو اس پر بھی غور کرنا ضروری تھا کہ کیا ان شعبوں پر خود قرآن کریم نے بھی روشنی ڈالی ہے یا نہیں اگر قرآن کریم نے بھی اُن کے متعلق کچھ ہدایات نازل فرمائی ہیں تو کیا وہ اس کا بھی تمسخر اڑائیں گے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا ضروری تھا کہ نزولِ قرآن کے وقت عالمِ انسانی میں ان گوشوں کے متعلق بھی کچھ کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں یا نہیں اگر درحقیقت یہاں بھی افراط و تفریط کا بدتر حال موجود تھا تو کیا ان کی اصلاح فرمانا رسول کا فرضِ منصبی نہ تھا اور کیا ان کے لئے اسوۂ حسنہ میں کوئی صحیح نمونہ نظر نہ آنا چاہئے۔ اس لئے اگر ان گوشوں کی قرآنی ہدایات کا اسوۂ حسنہ بھی آپ کی زندگی میں موجود ہے تو ہونا چاہئے یہاں معترضین کو ان احادیث کا ہونا ناگوار ہے اور طالبِ حق کو اسوۂ حسنہ کی تکمیل کے پیشِ نظر ان کا نہ ہونا موجبِ ملال ہے۔

رفتار و گفتار، خندہ و گریہ، نوم و بیداری، حتیٰ کہ انسانی زندگی کے نازک سے نازک حالات کی بھی، اگر قرآن کی جامعیت کے لئے ان معمولی گوشوں پر بھی علمی حیثیت سے روشنی ڈالنا ضروری تھا تو اس کے نقشۂ عمل کی تکمیل کے لئے ان کی عملی نزاکتوں کا ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ پس اگر قرآن نے ازدواجی زندگی کی تشریحات کرنا انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھا ہے تو ان نزاکتوں کی باریکیاں بھی اس نقشہ میں صفائی سے نظر آنا چاہئیں چہ جائیکہ باہمی معاملات کے فیصلے امت کے جہات اور جنگ و صلح کی تدابیر جیسے مسائل۔ مولانا اسلم صاحب کی یہ بڑی کوتاہ نظری ہے کہ انھوں نے ان جیسے اہم امور کو اسوۂ رسول سے خارج کر دیا ہے۔ اگر قرآن کریم نے ان معاملات کے متعلق بھی کچھ اصولی ہدایات فرمائی ہیں تو پھر ان کا نمونہ اگر یہاں اسوۂ رسول میں نظر نہیں آتا تو اور کہاں نظر آسکتا ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو صرف کسی خاص شعبۂ زندگی کا نمونہ نہیں بنایا تھا بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا وہ سب یہاں دکھلا دیا گیا تھا۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے فرمایا کہ یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا۔ خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو۔ گویا اسوۂ رسول کی جامعیت بھی کتاب اللہ کے ہم رنگ تھی۔ اسی لئے آپ کی ذات کو بلا کسی تفصیل کے تمام عالم کے لئے اسوہ بنا دیا گیا تھا، ایک طرف خدا کی یہ جامع کتاب موجود تھی۔ دوسری طرف یہ جامع اسوہ موجود تھا خلاصہ یہ کہ ایک قرآن بشکل مصحف تھا اور دوسرا بشکل اسوۂ رسول، فرق یہ تھا کہ وہ خاموش تھا یہ ناطق، یہاں تیسری چیز احادیث رسول تھیں یہ بھی قرآن ہی کی ایک شکل تھی مگر وہ مجمل تھا یہ مفصل، یہ تینوں قرآن کو بلحاظ اجمال و تفصیل جدا جدا تھے مگر بلحاظ اصل حقیقت یہ ایک ہی قرآن تھا۔ [۱]

[۱] مولانا اسلم صاحب اسوۂ رسول کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر اس کو متواتر فرماتے ہیں۔ ہمیں علمی لحاظ سے مولانا سے یہ سخت شکوہ ہے کہ وہ حدیث کے لئے پورے پورے ثبوت بھی ناکافی سمجھتے اور انھیں شک کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن جب خود کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو اس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں سمجھتے، اگر اسوۂ رسول کے تواتر سے ان کی غرض یہ ہے کہ آپ نے نماز پڑھی تھی اور بس، تو اس کے لئے صرف قرآن ہی کا تواتر کافی ہے لیکن اگر اس سے آگے بھی تفصیل مراد ہے تو اُن کو یہ صاف کرنا ضروری تھا کہ کن کن ارکان میں ان کو تواتر مسلم ہے اور کن میں نہیں۔ اسی طرح قرآن کے تمام عبادات کی ادائیگی کا نقشہ اسوں نے کیا تیار کیا ہے، آپ کے اسوۂ حسنہ میں آپ کی امامت آپ کا نظم و نسق امت، اور فصل قضایا بھی شامل ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو صرف بہ حیثیت رسالت یا یہاں کوئی تقسیم ہے اگر ہے تو وہ تقسیم بھی تواتر سے ثابت ہے یا نہیں۔ بہرحال جتنی بات قرآن سے ثابت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول تمہارے لئے مطلقاً بلا کسی تخصیص کے اسوہ اور نمونہ بنایا گیا ہے اور بلا کسی تقسیم کے وہ تمہارا رسول ہے پس جب رسول کی ذات بلا کسی تفصیل کے اسوہ ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ جو کچھ بھی عملی پہلو میں اس نے کر کے دکھلایا ہے وہ سب مولانا کے نزدیک بھی قرآنی امر کے ماتحت (باقی برصفحۂ آئندہ)

اسوۂ رسول اور عرب

جہاں ایک طرف کتاب اللہ کی عملی تشریح کے لئے ایک نمونہ کی ضرورت تھی اسی کے ساتھ عرب کی دماغی حالات کی وجہ سے بھی اسوۂ رسول کی بڑی ضرورت تھی، وہ امّی قوم تھی، تمدن اور تعلم کے طریقوں سے بہت دور تھی، اُن کی تفہیم وتربیت کے لئے وہی طریقہ مناسب تھا جو فطری کہا جا سکتا ہے. فطری تعلیم یہی ہے کہ خود عمل کرکے دکھلا دیا جائے، بچہ جب پیدا ہوتا ہے نہ وہ کچھ کہنا جانتا ہے نہ کرنا مگر جتنا وہ ترقی کرتا جاتا ہے اتنا ہی اپنے گھر کی زبان، اس کا طور وطریق سب سیکھتا چلا جاتا ہے. حتیٰ کہ ایک انگریز کا بچہ کسی تعلیم کے بغیر ایسی فصیح انگریزی بولنے لگتا ہے جو ایک ہندوستانی کالج میں تعلیم پانے کے بعد بھی نہیں بول سکتا اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ فطری طریقہ پر تعلیم حاصل کرتا ہے وہ اپنے والدین کو بولتا دیکھکر بولتا ہے اور جس طرح کسی عمل میں مصروف دیکھتا ہے اسی کی نقالی میں خود بھی مصروف ہو جاتا ہے اس لئے اُسے اپنی زبان اور اپنے طور وطریق میں کسی خارجی تعلیم کی ضرورت نہیں پڑتی. اسی طرح صحابہ کرام نے بھی اس مکمل دین کا بڑا حصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے سیکھا ہے صرف اعمال نہیں بلکہ اقوال بھی اور صرف اقوال ہی نہیں بلکہ ایک ایک عقیدہ بھی۔ اسی

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) واجب التسلیم ہونا چاہئے اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری کی پوری زندگی آپ کا تمام کا تمام اسوۂ حسنہ حرف بحرف بطریق تواتر منقول ہے یا اس کا ایک حصہ متواتر ہے اور بڑا حصہ غیر متواتر پہلی صورت تو تواتر کے خلاف ہے دنیا میں کوئی شخص بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ آپ کے عبادات ومعاملات کا ہر ہر پہلو تواتر سے ثابت ہے لامحالہ یہی کہنا پڑے گا کہ اس کا ایک حصہ متواتر اور دوسرا غیر متواتر ہے بلکہ بڑا حصہ غیر متواتر ہے مثلاً یہ متواتر ہے کہ آپ نے ظہر کی نماز پڑھی یہ بھی متواتر ہے کہ چار پڑھیں، رکوع سجدہ کئے، رکوع پہلے کیا پھر سجدہ، نماز کے آخر میں بیٹھے اور سلام بھی پھیرا. شروع نماز میں ہاتھ اٹھائے اس کے بعد ایک آدھی بات کا اور اضافہ کر لیجئے لیکن صرف ان متواتر امور سے بھی نماز کی پوری صیانۃ مکمل نہیں ہوتی۔ پھر دین کے اُس حصہ کے متعلق مولانا کا فیصلہ کیا ہوگا جو صحابہ کے سامنے اسوۂ رسول میں نظر آنے کی وجہ سے قابل قبول تھا اور اب تواتر کے ساتھ منقول نہ ہونے کی وجہ سے قابل تسلیم نہیں رہا. ان جزئیات کے لئے اب تجویز کیا ہے۔

یہ بھی غور طلب ہے کہ نماز میں سہو بھی پیش آسکتے ہیں اس کی تلافی کی صورت اب کیا ہونا چاہئے. قرآن کریم ضرور قیام کی حالت میں پڑھا جاتا تھا لیکن اگر بھول کر رکوع یا سجدہ میں پڑھ لیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے. بہرحال یہاں عملی طور پر بہت سے عمل کے گوشے ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جس کا حکم ہمیں متواتر طور پر اسوۂ حسنہ میں ملتا. صرف اپنی عقل کے زور سے ان کے جوابات سمجھ میں نہیں آسکتے. اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ جو کچھ اپنی سمجھ میں آجائے اسی کو قرآنی حکم قرار دیدیا جائے. دوسرا راستہ یہ ہے کہ اُن کے جوابات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور اسوۂ حسنہ میں تلاش کئے جائیں اور جو جو حدِ یقین کو پہنچ جائیں ان کو بلا پس وپیش مان لیا جائے. یہ راستہ تو مولانا اسلم صاحب اختیار کر نہیں سکتے. ہر بات کی تفصیل قرآن سے ثابت نہیں ہوتی تو اب طفل تسلی کی صورت یہی تحریر فرماتے ہیں کہ صرف اسوۂ رسول متواتر ہے اور وہ عملی تفصیلات کے لئے کافی ہے مگر کیا اس اجمالی حکم سے وہ دین کا تفصیلی نقشہ تیار کر سکتے ہیں اور کیا اس تواتر کی قید کے بعد قرآن کی طرح اسوۂ رسول کی جامعیت کا ثبوت دے سکتے ہیں. حدیث کا انکار کرنا تو آسان ہے مگر اس کا انکار کرکے جو مشکلات سامنے آتی ہیں اس کا حل آسان نہیں

عملی تربیت و تعلیم کے اثرات تھے کہ تمام دین ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا جیسا طبعی اخلاق انسان میں غیر شعوری طور پر سرایت کئے ہوئے ہیں۔ اگر یہ وسیع دین صرف زبانی طور پر آج کل کی طرح اسکولوں میں پڑھایا جاتا تو عمریں صرف ہو جاتیں اور اس کا ایک حصہ بھی حاصل نہ ہو پاتا۔ امی اور آزاد دماغ لفظوں کے رٹنے میں اور غیر مانوس طریقوں کے نقشہ بنانے اور جاننے میں اتنا بار محسوس کرتے کہ جس کو زیادہ مدت نبھانا بھی مشکل ہو جاتا اس لئے اُن کی دماغی ساخت کے مطابق ہی اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا جس نے اپنے کمالات سے اپنی ذات میں ایسی جاذبیت حاصل کر لی کہ ہر شخص کا منظورِ نظر بن گیا۔ اس کے طور و طریق عادات و عبادات دلوں میں اس طرح گھر کر گئے کہ اس نمونہ کے سوا سب نمونے دل سے محو ہو گئے اس لئے دین کے عملی حصے کے سمجھنے میں کم سے کم الجھنیں پیش آئیں اور اگر پیش آئیں تو ذرا سے اشارہ سے دور ہو گئیں۔ آج وہی اسوۂ حسنہ ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں رہا جس کے ساتھ کل تک ہم قرآن کو ملا ملا کر پڑھا کرتے تھے اس لئے قرآن فہمی میں بھی اختلاف آراء پیدا ہو گیا۔ اگر احادیث کی یہ تفصیلات بھی ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو خدا ہی جانے عقولِ انسانیہ کتاب اللہ کا نقشہ صرف اپنے ذہن سے کیا بنا ڈالتیں۔ اس لئے جہاں ایک طرف کتاب اللہ کی تعلیم کے لئے رسول بھیجا گیا تھا اسی کے ساتھ اس کا نقشہ بھی خود اپنی جانب سے مکمل کر کے بھیج دیا گیا تا کہ انسان حتی الوسع خدا کی عبادت کا نقشہ اپنے دماغ سے نہ تراشے اور اپنی ہر چھوٹی سے چھوٹی حرکت و سکون میں اُسی نقشہ الٰہی کا مو بمو اتباع کرتا رہے اور اس مختصر راہ پر چل کر خدائے تعالیٰ کی محبوبیت کے مقام تک بہت جلد پہنچ جائے۔ جس امت کے لئے جد و جہد کی مدت قلیل رکھی گئی ہو اور تقدیر یہ ہو کہ اس کو تمام امتوں پر فائق رکھا جائے اس کے لئے صورت یہی تھی کہ تھوڑے عرصہ میں اس کو بڑی مسافت طے کرا دی جائے اگر کتاب اللہ کی فہم اس کے رموز کی تفصیلات اس کا عملی نقشہ تمام امت ہی کے عقول کے سپرد کر دیا جاتا تو ایک شخص بھی اپنی تمام عمر صرف کرنے کے بعد یہاں کامیاب نہ ہو سکتا۔

جمیع العلم فی القرآن لکن   تقاصر عنہ افہام الرجال

قرآن کریم کی جامعیت کا اصل مفہوم

مذکورہ بالا تفصیلات سے یہ واضح ہو گیا کہ قرآن کریم کی جامعیت احادیث کے تسلیم کرنے سے مانع نہیں بلکہ اس کی جامعیت ہی اس کی متقاضی ہے کہ اس کے اصول کی تشریح اس کے دفعات کی تفصیل اور اس کے اشارات کی تفہیم کی جائے کیونکہ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مفہوم ہی یہ ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام بشکلِ کلیات بیان کر دیئے گئے ہوں۔ امام شاطبی فرماتے ہیں۔

القرآن علی اختصارہ جامع ولا یکون جامعاً الا والمجموع فیہ امور کلیات[1]۔	قرآن کریم مختصر ہونے کے باوصف پھر جامع کتاب ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس میں کلیات مذکور ہوں۔

[1] الموافقات ج ۳ ص ۳۶۷۔

قال محمد وبلغني ان جوامع الكلم ان الله يجمع الامور الكثيرة التي كانت تكتب في الكتب قبله في الامر الواحد والامرين او نحو ذلك[1]

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ جوامع الکلم کی تفسیر مجھے یہ معلوم ہوئی ہے کہ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے پہلی کتابوں میں بہت (سی پھیلاؤ کے ساتھ) بیان فرمائی تھیں وہ ایک دو جملوں ہی میں جمع کر دے،

جوامع الکلم کی تفسیر حافظ ابن قیم جوامع الکلم کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وجوامع الكلم هي الالفاظ الكلية العامة المتناولة لافرادها فانضاف ذلك الى بيانه الذي هو اعلى رتب البيان لم يعدل عن الكلمة الجامعة التي في غاية البيان لما دلت عليه الى لفظ اطول منها واقل بيانا معها ان الكلمة الجامعة تزيل الوهم وترفع الشك وتبين المراد[2]

جوامع الکلم وہ کلی اور عام الفاظ ہیں جو اپنے تمام افراد کو شامل ہوں اور اپنے اختصار کے باوجود پھر اتنے حاوی ہوں کہ جب اُن کی زیادہ سے زیادہ تفصیل کی جائے تو یہ تمام تفصیل اُن سے باہر نظر نہ آئے پھر اتنے واضح اور عام فہم بھی ہوں کہ اس کی مراد سمجھنے میں کوئی دشواری بھی نہ ہو اور کوئی شک و وہم بھی پیش نہ آئے۔

حافظ ابن قیمؒ کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام کی جامعیت اس وقت کمال سمجھی جاتی ہے جبکہ اس میں حسب ذیل اوصاف بھی موجود ہوں۔ (۱) وہ اپنے ماتحت انواع و افراد کو اتنا حاوی ہو کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو اس کا کوئی فرد اس سے باہر باقی نہ رہے۔ اسی کے ساتھ وہ ان افراد کے حکم پر بھی دلالت کرے جو اس کے الفاظ کی قید سے خارج ہو گئے ہیں۔ گویا کلام کی جامعیت اس وقت کمال سمجھی جائے گی جبکہ اس کے الفاظ کی بندش ایسی ہو کہ اس میں موافق اور مخالف دونوں پہلوؤں کے حکم پر دلالت ہو جیسا کہ حافظ ابن قیمؒ نے اسی کتاب میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔

الكلمة الجامعة وهي قاعدة عامة وقضية كلية تجمع انواعا وافرادا وتدل دلالتين دلالة طرد ودلالة عكس۔[3]

وہ ایک ایسا عام قاعدہ اور کلی جملہ ہوتا ہے جو بہت سی انواع و افراد کو شامل ہو اور اپنے افراد کے لئے موافق اور دوسرے افراد کے لئے اُس کے مخالف احکام پر دلالت بھی کرے۔

جیسے "کل مسکر حرام" یہ حدیث جوامع الکلم میں شمار ہے اس میں دونوں دلالتیں موجود ہیں یعنی جتنی نشہ آور چیزیں ہیں خواہ وہ کتنی ہی مختلف انواع و اصناف کی ہوں سب اس ایک حدیث کے ماتحت حرام ہیں اور اسی کلام کی دوسری دلالت یہ ہے کہ جو چیزیں نشہ آور نہیں وہ اسی حدیث کی رو سے سب جائز ہیں۔ پس یہ ایک ہی حدیث ایک پہلو سے مسکرات کا حکم اور دوسرے پہلو سے غیر مسکرات کا حکم بتلانے کے لئے کافی ہے۔

(۲) جوامع الکلم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی ایسی تنگی بھی نہ ہو کہ مراد کے خلاف کچھ اور

[1] بخاری باب المفاتیح فی الید ص ۳۸۔ [2] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۲۶۔ [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۴۹۔

وہم پیدا ہونے لگے۔ وہ کلام خواہ کتنا ہی جامع کیوں نہ ہو مستحسن نہیں سمجھا جا سکتا جس میں خود متکلم کی مراد کے خلاف اوہام پیدا ہو جائیں۔

(۳) تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ الفاظ اتنے مبہم بھی نہ ہوں کہ جو مراد ان کی بتلائی جائے وہ اُن سے ظاہر نہ ہو جامعیت کا کمال یہ ہے کہ پورے اختصار کے باوجود پھر اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو ہر تفصیل پر وہ ایسا ہی صادق نظر آئیں گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے۔ ان اوصاف ثلاثہ کے لحاظ کرنے کے بعد جب آپ کسی اونچے سے اونچے مصنف کا کلام ملاحظہ فرمائیں گے تو ہر مصنف کے کلام میں دو خامیوں میں سے ایک خامی ضرور دیکھیں گے۔ اگر وہ شانِ جامعیت میں ممتاز ہوگا تو اس میں اغلاق و ابہام کا عیب ضرور نظر آئے گا اور اگر واضح اور صاف ہوگا تو اس میں شانِ جامعیت مفقود ہوگی، ان دو متضاد صفتوں کا اجتماع یا آپ آیاتِ قرآنیہ میں دیکھیں گے یا بعض احادیثِ نبویہ میں یہ شانِ جامعیت بھی درحقیقت اعجاز کا ایک شعبہ ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو انبیاء و رسل کی صف میں اپنی ایک خصوصیت شمار کیا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ جس رسول کو تمام عالمِ انسانی کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا گیا تھا اُس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ اس کے کلام میں بھی اس کی بعثت کی وسعت کے بقدر جامعیت اور وسعت مرحمت کی جاتی تاکہ ہر زمانہ میں ہر قسم کے انسان اپنی ہر قسم کی ضرورت اُن جامع اور مختصر الفاظ سے حل کر سکتے۔ اس جامعیت کے بھی مراتب ہیں ہر رسول کے کلام میں اپنے دائرہ بعثت کی وسعت کے بقدر ایک قسم کی جامعیت ہونا ضروری ہے اس لئے جس رسول کی بعثت سب سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اس کے کلام کی جامعیت بھی سب سے زیادہ ہونا چاہئے۔ مختصر الفاظ میں جوامع الکلم ٹھیک کوزے میں دریا کی مثال ہوتے ہیں اسی کا دوسرا نام سہل ممتنع بھی ہے۔

حافظ ابن قیم کی اس تقریر سے اب آپ قرآن کی جامعیت کا مفہوم بھی سمجھ لے سکتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ قرآن کی جامعیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بعد اب تفصیل و تشریح میں جانے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی یا وہ اتنا واضح ہے کہ اس کے لئے کسی معلم و مفسر کی حاجت نہیں ہوتی بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خدا شناسی اور آدابِ عبدیت کے تمام اصولوں پر حاوی ہے جیسا کہ جہاں بانی کے ایک ایک نکتہ ایک ایک شوشہ کے لئے مکمل آئین ہے ایک چوبِ خشک اس پر عمل کر کے عارف کامل ہو سکتا ہے اور ایک فقیر بے نوا اس کے اتباع کی بدولت تاجِ شاہانہ پہن سکتا ہے۔ پھر شاہی اور گدائی کے یہ عمیق اور دقیق اصول اس نے ایسے جامع اور سادے الفاظ میں قائم کیے ہیں کہ دنیا کے مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات میں سے کبھی کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آسکتی جس کے متعلق قرآن کریم کے ان الفاظ میں پوری روشنی نہ ملے۔ پھر اتنی جامعیت کے ساتھ اس کی سطح ایسی صاف نظر

آتی ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے علم کا شخص بھی اُن کی گہرائی سمجھنے کا گھمنڈ کر لیتا ہے، اُس کی اسی شان سہل ممتنع کی وجہ سے ایک جاہل اور ایک عالم ایک فقیر اور ایک بادشاہ اُس سے برابر کا فائدہ حاصل کر لیتے ہیں۔ قلیل العلم شخص خوش ہو جاتا ہے کہ اس نے اس کی تہ کو پالیا اور نہیں جانتا کہ یہ قرآن کی شان جامعیت کا کرشمہ تھا، یہاں ہر شخص اپنی اپنی پیاس اور اپنے اپنے ظرف کے بقدر سیراب ہو جاتا ہے لیکن اس بحر ناپیدا کنار میں پانی کتنا ہے اس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ آخر یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ یہ کلام کس کا ہے اگر کسی بڑے شاعر یا کسی بڑے عالم کے کلام میں اس کی سطح کے علاوہ اس کا کچھ عمق بھی ہوتا ہے تو یہاں خالق کے کلام میں اس کی تلاش کیوں نہیں ہوتی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لکل آیۃ ظہر و بطن ہر آیت کی ایک مراد اس کے ظاہر سے ہاتھ لگ جاتی ہے دوسری مراد اس کے عمق اور گہرائی میں جانے سے نصیب ہوتی ہے۔ اگر کوئی بدنصیب یہاں صرف اس کے ایک ہی حصہ پر قناعت کر کے بیٹھ رہے تو یہ اس کا نصیب۔ اُس کو یہ سوچنا چاہئے کہ جس کلام کا متکلم ایسی ذات پاک ہو جس کے علم کی کوئی نہایت نہیں، تمام عالم کے علوم اس کے بحر علم کا ایک قطرہ بھی نہ ہوں اس کے کلام میں کتنی گہرائی اور کتنی بلندی ہو سکتی ہے۔ کیا ہر شخص اُن ساری گہرائیوں اور تمام بلندیوں کو حاصل کر لینے کا دعوی کر سکتا ہے یا اسی کرنا چاہئے۔ پھر جتنا حصہ اس کو حاصل ہو گیا ہے کیا اس کے متعلق اُسے وثوق کے ساتھ یہ گمان کر لینا چاہئے کہ اس نے متکلم کی پوری پوری مراد کو پالیا ہے۔ حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں۔

ان دلالۃ النصوص نوعان حقیقیۃ و اضافیۃ فالحقیقیۃ تابعۃ لقصد المتکلم و ارادتہ وھذہ الدلالۃ لا تختلف والاضافیۃ تابعۃ لفہم السامع وادراکہ وجودۃ فکرہ وقریحتہ وصفاء ذھنہ و معرفتہ بالالفاظ ومراتبھا وھذہ الدلالۃ تختلف اختلافا متباینا بحسب تباین السامعین فی ذلک[1]

نصوص کی دلالت دو قسم کی ہے حقیقی، اضافی حقیقی دلالت تو متکلم کے قصد اور اس کے ارادہ کے تابع ہوتی ہے۔ اس دلالت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا اضافی دلالت فہم سامع اس کی جودت فکر، صفائی ذہن، الفاظ اور اس کے مراتب کے شناسائی پر موقوف ہے اس دلالت کے اتنے ہی مختلف مراتب ہیں جتنا کہ ان اوصاف میں سامعین کے مراتب مختلف ہیں۔

پس جو دلالت کہ حقیقی ہے وہ تو یہاں متکلم کے ارادہ کے تابع ہے اس کو یقینی طور پر اس وقت تک کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے جب تک کہ خود متکلم ہی اس کو نہ بتلائے، رہ گئی دوسری قسم تو اس کے اتنے لاتعد و لاتحصی مراتب ہیں کہ کوئی شخص یہاں یہ دعوی کر ہی نہیں سکتا کہ کلام کی جو مراد اس نے سمجھ لی ہے اس کے بعد اب اس میں آئندہ کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، اگر یہ ابہام نصوص کتاب میں بھی باقی رہے تو جزم کے ساتھ کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے کہ کتاب اللہ پر اس نے عمل کر لیا ہے اس لئے یہاں مراد متکلم بتلانے کے لئے خود متکلم کی جانب سے ایک معلم مقرر کر دیا گیا ہے اُس نے

---

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۰۵

اس کی جامعیت کے پیشِ نظر وہ حدود بیان کردی ہیں جہاں تک اُن کا احاطہ پھیلتا ہے اب آپ آیت فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ پر غور کیجئے، پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہاں حائضہ عورت سے اعتزال کے کتنے مراتب ہوسکتے ہیں۔ اگر آپ صرف اپنی عقل سے انھیں متعین کرنا چاہیں تو کیا متعین کرسکتے ہیں ہاں احادیثِ رسول کی روشنی میں آپ اُن پر آسانی بحث کرسکتے ہیں اور بسہولت وہ حدود بتلاسکتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کی شانِ جامعیت احادیثِ نبویہ کی تشریحات سے ہرگز بے نیاز نہیں کرتی، بلکہ ان کے بغیر پورا نقشہ ہی ذہن میں نہیں آسکتا۔ جب ایک انسان حلال و حرام کے تفصیلی ابواب، اصولِ عقائد کی وضاحت، تمدن اور معیشت کے مفصل طریقے احادیث میں پھیلے ہوئے دیکھ لیتا ہے اور اس ضمن میں ایسی ایسی تفصیلات پر مطلع ہوتا جاتا ہے جدھر اس کا ذہن بھی نہ جاسکتا تھا۔ پھر ان تمام تفصیلات کو جب کسی ایک آیت کے تحت میں درج پالیتا ہے تو قرآن کی جامعیت پر جو وثوق اس کو اس تفصیلی سیر کے بعد حاصل ہوتا ہے وہ اس کے بغیر ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا پس احادیثِ نبویہ قرآن کی جامعیت کا بہت بڑا ثبوت ہیں نہ کہ اس کے مخالف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک قرآن کی جامعیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک گنوار شخص زنا کا ایک مقدمہ لیکر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے لڑکے نے زنا کرلیا ہے میں نے اس کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ اسے رجم کرنا چاہئے، میں نے اس کے عوض میں سو بکریاں اور ایک باندی ادا کردی ہے پھر کچھ لوگوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اس کے لئے سو کوڑے اور سال بھر جلاوطنی کی سزا ہے آپ نے یہ سن کر فرمایا "لاقضين بينكما بكتاب الله" (میں کتاب اللہ کے مطابق تمہارا فیصلہ کروں گا) تیری باندی اور بکریاں تو واپس ہیں اور لڑکے پر سو کوڑے اور سال بھر کے لئے جلاوطنی کی سزا، اور انیس تم اُس عورت کے پاس جاؤ جس سے یہ زنا کا دعوی کرتا ہے اگر وہ اقرار کرلے تو اُسے رجم کردو، انیس گئے اُس نے اقرار کرلیا اور رجم کردی گئی۔ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کا حکم کتاب اللہ کے موافق فیصلہ قرار دیا ہے حالانکہ کتاب اللہ میں رجم اور جلاوطنی کہیں مذکور نہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک بھی کتاب اللہ کی جامعیت کا مفہوم کتنا وسیع تھا۔

صحابہؓ کے دور میں قرآن کی جامعیت

یہ بات سمجھنے کے لئے کہ صحابہ کے زمانہ میں بھی قرآن کی جامعیت ہمیشہ بلحاظِ اصول ہی سمجھی گئی ہے ذیل کے چند واقعات کو پیشِ نظر رکھنا چاہئے۔

(۱) قبیلۂ بنی اسد کی ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا میں نے سُنا ہے آپ اُن عورتوں پر لعنت کرتے ہیں جو جسم گودنے کا پیشہ کرتی ہیں یا خود گدواتی ہیں۔ انھوں نے فرمایا جی ہاں، جس پر خدا نے لعنت کی ہو اور جو خود قرآن میں بھی مذکور ہو میں اُس پر لعنت کیوں نہ کروں، اس نے عرض کیا قرآن تو میں بھی پڑھتی

ہوں مگر میں نے تو قرآن میں یہ کہیں نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا اگر تو قرآن سمجھ کر پڑھتی تو یقیناً اس میں دیکھ لیتی کیا قرآن میں یہ نہیں ہے۔

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ — رسول جو تمہیں دے اُسے قبول کرو اور جس بات سے روکے اُس سے رک جاؤ۔ [1]

اس اجمالی حکم کے ماتحت یہ سب جزئیات درج ہیں، اس نے ایک اجمالی قانون بتلا دیا ہے۔ ان تمام

---

[1] مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کو یہاں عجیب شبہ گذرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "ما اتاکم" کی آیت مال غنیمت کی تقسیم کے بارے میں ہے حدیث سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے یہاں "آتا" کے لفظ کو جو "نہی" کے بالمقابل واقع ہے لوگوں نے غلط فہمی سے امر یا قال کے معنی میں سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ لفظ قرآن میں سینکڑوں جگہ آیا ہے اور کہیں ان معنوں میں مستعمل نہیں ہوا بلکہ ہر جگہ اس کے معنی دینے ہی کے ہیں لہذا ایسا استدلال بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ حدیثیں اقوال ہیں ان کے لئے دینے کا لفظ نہیں کہا جا سکتا، رسول اللہ نے جو چیز دی ہے وہ قرآن ہے۔ انتہی۔

مولانا کو چونکہ قرآن کی جامعیت کا علم ہی نہیں اس لئے یہاں بھی انھوں نے آیت بالا کو صرف مال غنیمت سے خاص کر ڈالا ہے۔ قائلین حدیث کے نزدیک آیت بالا اپنی شان جامعیت کی وجہ سے صرف مال کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اُن ساری ہدایات کو بھی شامل ہے جو آپ نے اپنی امت کو دی ہیں، یہ تحقیق بھی عجیب ہے کہ حدیث کے متعلق تو دینے کا لفظ مستعمل نہیں ہو سکتا مگر قرآن کے متعلق ہو سکتا ہے اس پر یہ کہنا کہ "حدیثیں چونکہ اقوال ہیں اس لئے ان کے لئے دینے کا لفظ نہیں کہا جا سکتا" اور بھی مضحکہ خیز ہے کیا قرآن اقوال ہی کا مجموعہ نہیں پھر اگر اقوال کے اس مجموعہ کو دیا جا سکتا ہے تو حدیث کے دوسرے مجموعہ کو کیوں نہیں دیا جا سکتا ہمارے نزدیک دونوں وحی ہیں صرف متلو اور غیر متلو ہونے کا فرق ہے۔ یہاں آیت بالا کے سمجھنے میں ہمیں تو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی البتہ مولانا کو یہ غلط فہمی ضرور ہوئی کہ انھوں نے قرآن کریم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ایسا ہی ایک جلد بند ھا بندھایا تصور کر لیا ہے جو شاید تورات کی طرح دیدیا گیا تھا اگر ایسا نہیں ہے بلکہ اس کی متفرق آیتیں نازل ہوتی تھیں اور انھیں آپ صحابہ کے سامنے پڑھ کر ہی سناتے تھے۔ اس کے باوجود لفظ آتا اس پر بولا جا سکتا تھا تو اگر دوسرے وقت آپ اُسی زبان اُسی دہنِ مبارک سے کچھ احادیث ارشاد فرما دیتے ہوں اس پر بھی لفظ آتا کیوں نہیں بولا جا سکتا۔ مولانا کی قرآن دانی کی یہ انتہا ہے کہ انھیں سینکڑوں جگہ میں ایسی کوئی آیت نظر نہیں آئی جہاں یہ لفظ ایسے معنی میں مستعمل ہو جو حدیث پر بھی بولے جا سکیں قرآن کریم میں ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ (اللہ تعالیٰ درجہ بلند کرتا ہے مومنین کے اور اُن کے جن کو علم دیا گیا ہے) اگر علم کے لئے یہ لفظ مستعمل ہو سکتا ہے تو کیا حدیث ایک علم ہی نہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ۔ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ۔ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا۔ وَاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ۔ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ۔ ان آیات میں "آتا" کا لفظ کتاب کے لئے، علم کے لئے، حکمت کے لئے، حکم اور نبوت کے لئے فضائل و کمالات کے لئے اور آخری آیت میں "فصل الخطاب" یعنی اقوال کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے اس لئے مولانا کا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔ یہ چند سطور ہی مولانا کے دعویٰ کی تردید کے لئے کافی ہیں اس لئے اس مختصر حاشیہ پر ہی کفایت کی جاتی ہے۔

فروعات کو اس کے نیچے سمجھو۔ آپ نے دیکھا کہ حدیث کے تسلیم کر لینے سے قرآن کی جامعیت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اگر ہم اس سے قطع نظر کر لیں تو کیا اُس کی یہ جامعیت ثابت ہو سکتی تھی۔

(۲) حضرت عبد الرحمٰن بن یزید نے ایک مُحرم شخص کو سلے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو اس کو منع فرمایا۔ اُس نے کہا قرآن میں کہاں ہے دکھلایئے، انھوں نے یہی آیت تلاوت فرمادی، "ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا" رسول جو دیدے وہ لے لو اور جس بات سے روکدے رک جاؤ۔ [۱]

(۳) حکم بن ابان نے عکرمہ سے امِ ولد کا حکم دریافت کیا انھوں نے فرمایا وہ آزاد ہے، میں نے پوچھا کس دلیل سے؟ کہا قرآن سے، میں نے کہا کس آیت سے؟ کہا اَطِیْعُوا اللہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولو الامر کی) حضرت عمرؓ امِ ولد کو آزاد فرماتے تھے چونکہ وہ بھی اولو الامراء، حاکم تھے اور حاکم کی اطاعت کرنا قرآنی حکم ہے اس لئے ان کا منع کرنا بھی قرآنی حکم ہے۔

ان آثار سے ثابت ہے کہ صحابہ کے نزدیک قرآن کی جامعیت اصول ہی کے اعتبار سے تھی اسی لئے جب کسی تفصیلی حدیث کے متعلق ان سے سوال ہوتا تو وہ قرآن کی کسی اجمالی آیت پر حوالہ کر دیتے اور اس تفصیل کو اس اجمال کے تحت میں قرار دیتے۔

ائمہ کے نزدیک قرآن کی جامعیت

ائمہ کے طبقہ میں امام بخاریؒ نے اپنی تصنیف الجامع الصحیح المسند میں جہاں احادیثِ صحیحہ کو جمع کیا ہے اس کے ساتھ اور بھی بہت فوائد اور نوادر کی طرف اشارات فرمائے ہیں انھوں نے فقہ کا بیشمار ذخیرہ تراجم میں پھیلایا ہے پھر اس کے مناسب آثارِ صحابہ اور احادیثِ مرفوعہ پیش کی ہیں تاکہ حدیث اور فقہ کا ربط ظاہر ہو جائے پھر ہر باب میں اُن احکام کے مناسب قرآنی آیات تلاوت کی ہیں تاکہ فقہ کے تمام ابواب قرآن کریم میں اجمالاً نظر آجائیں اور ان کے مناسب احادیث دیکھکر قرآن کی جامعیت کا پورا مشاہدہ ہو جائے، اسی کے ساتھ حدیث اور قرآن کا ربط بھی معلوم ہو جائے اور اس طرح ایک ہی تصنیف منکرینِ فقہ اور منکرینِ حدیث دونوں کا جواب بن جائے۔ فقہ کو برا بھلا کہنے والے احادیث سے مسائل کے استنباط کا طریقہ سیکھ لیں، اور حدیث کو قرآن کے خلاف کہنے والے قرآن میں احادیث کے مآخذ معلوم کر لیں۔ حافظ ابن حزمؒ ظاہری ہو کر لکھتے ہیں۔

کل ابواب الفقہ لیس منھا باب	فقہ کے تمام ابواب میں کوئی باب بھی ایسا نہیں جس کی اصل
الاولہ اصل فی القراٰن نعلمہ	قرآن وسنت میں موجود نہ ہو، خدا کا شکر ہے کہ ہم اُس

---

[۱] حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عبد الرحمٰن بن یزید کے ان دونوں بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت "ما اٰتاکم" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بھی شامل ہے اس کا تعلق صرف مال دینے اور اس کے قبول کرنے سے نہیں ہے جیسا کہ مولوی اسلم صاحب سمجھے ہیں بلکہ مال اور ہدایت دونوں کو شامل ہے۔

والحمد للہ حاشا القراض فما وجدنا | اصل کو خود بھی جانتے ہیں ہاں ایک قراض کا باب ایسا ہے
لہٗ اصلاً فیہما البتۃ (الموافقات ج ۳ ص ۲۱) | جس کی اصل ہیں کتاب وسنت دونوں میں نہیں ملی ۔

ظاہری فرقہ حالانکہ قیاس کا منکر ہے مگر وہ بھی اس کا اقرار کرتا ہے کہ تمام ابواب فقہیہ کے اصول قرآن میں مذکور ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ کے طبقہ میں بھی قرآن کی جامعیت اصول ہی کے لحاظ سے مسلم تھی ۔

امام شاطبیؒ فرماتے ہیں ۔

تعریف القرآن بالاحکام الشرعیۃ	قرآن کریم نے احکام شرعیہ اکثر کلی طور پر بتلائے ہیں اور
اکثرہ کلی لاجزئی وحیث جاء جزئیاً	جہاں جزئی طور پر کوئی حکم بتلایا بھی ہے وہ کسی حکم کلی
فاخذہ علی الکلیۃ ۔ [۱]	کے ماتحت ہے ۔
القرآن فیہ بیان کل شیء	قرآن کریم میں ہر چیز کا بیان ہے ۔ اس کا جاننے والا اجمالاً
فالعالم بہ علی التحقیق عالم بجملۃ الشریعۃ	تمام شریعت کا جاننے والا ہے اس طرح پر کہ اس کا کوئی
ولا یعوزہ منہا شیٔ [۲]	حکم اس سے باقی نہیں چھوٹتا ۔

پھر جلد رابع میں لکھتے ہیں ۔

لیس فی السنۃ الا ولہ اصل فی القرآن ۔	حدیث میں کوئی حکم ایسا نہیں جس کی اصل قرآن میں نہ ہو ۔

ان نقول سے ظاہر ہے کہ قائلین حدیث بھی جامعیتِ قرآن کے معترف ہیں مگر ان کے نزدیک اس کی جامعیت صرف بلحاظِ اصول ہے ۔ قرآن کی اسی شانِ جامعیت پر نظر رکھتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا حَسْبُنا کتاب اللہ ۔ اگر اس کا مطلب وہ ہوتا جو منکرینِ حدیث سمجھے ہیں تو وہ احادیث جمع کرنے کے لئے مجلسِ مشاورت طلب نہ کرتے جس کی تفصیل آئندہ آرہی ہے ، اپنے وعظوں میں یہ اعلان نہ کرتے رُدُّوا الجہالات الی السنۃ [۴] اور یہ ارشاد بھی نہ فرماتے تعلموا الفرائض والسنۃ کما تعلمون القرآن [۵] ۔ اپنے دین کے فرائض اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اسی طرح ذوق وشوق سے سیکھو جیسا قرآن سیکھتے ہو ۔ جو لوگ کسی کلام کی مراد اپنے زاویۂ نظر سے سمجھنے کے عادی ہو جاتے ہیں انھیں بلاوجہ ہر جگہ تعارض نظر آتا ہے ۔ منکرینِ حدیث کو حضرت عمرؓ کی تمام احادیث میں سے صرف یہی ایک حدیث صحیح نظر آئی ہے اور اس ایک حدیث کی بنا پر وہ ان کی اس قسم کی تمام احادیث پر موضوع ہونے کا حکم لگا دیتے ہیں ۔ حالانکہ اگر بے دلیل موضوع کہنا بھی کوئی صحیح طریقہ کہا جا سکتا ہے تو ان احادیث کے مقابلہ میں ایک "حسبنا کتاب اللہ" کی حدیث کو موضوع کیوں نہ کہا جائے ۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی

---

[۱] حافظ ابن تیمیہؒ اور امام شاطبیؒ نے اس کی اصل بھی ثابت کی ہے دیکھو اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۱۱ ۔ اور الموافقات ج ۳ ص ۲۱ ۔ [۲] الموافقات ج ۳ ص ۳۶۶ ۔ [۳] ایضاً ج ۳ ص ۳۶۹ ۔
[۴] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۸۷ ۔ [۵] ایضاً ج ۲ ص ۱۲۳ ۔

تعارض نہیں ہے تعارض صرف اس لئے پیدا ہو گیا ہے کہ ان کے کلام کی مراد ہی غلط سمجھی گئی ہے صحیح مراد وہ ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

قرآن کی تفسیر و بیان صرف رسول کا منصب ہوتا ہے

وَاَنْزَلْنَا اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ۔ ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے اُسے خوب واضح کر دیں۔

آیت بالا میں لفظ "للناس" سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اگرچہ خود بیان سہی لیکن ہر شخص اس بیان کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس قصور کی وجہ سے اس بیان کو اور واضح کرنے کے لئے رسول بھیجا جاتا ہے پس یہ احتیاج قرآن کے قصور بیان کی وجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کے قصورِ فہم کی وجہ سے ہے۔ یہ ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ جو کلام جس قدر بلند پایہ ہوتا ہے اسی قدر شرح کا زیادہ محتاج ہوتا ہے دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا کی کتاب کی مراد بیان کرنا صرف رسول کا منصب ہے بلکہ اس کی بعثت کی یہ ایک بڑی غایت و غرض ہے۔

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک شخص سے فرمایا تو احمق ہے کیا قرآن میں کہیں ظہر کی چار رکعتیں اور ان میں جہر نہ ہونا مذکور ہے اس کے بعد فرمایا۔

ان کتاب اللہ أبھم ھذا وان السنۃ تفسر ذلك۔ [1] کتاب اللہ نے اس کو مبہم رکھا پھر سنتِ رسول نے اس کی تفسیر کر دی۔

مطرف بن شخیر سے ایک شخص نے کہا آپ ہمارے سامنے قرآن کے سوا کچھ اور مت بیان کیجئے انھوں نے فرمایا۔

واللہ ما نرید بالقرآن بدلا ولکن نرید من ھو اعلم بالقرآن۔ [2] خدا کی قسم ہم قرآن کی بجائے ہم بھی کوئی اور کتاب نہیں چاہتے لیکن ہم اس سے کیسے قطع نظر کر سکتے ہیں جو قرآن کا سب سے زیادہ جاننے والا تھا

قرآن و حدیث کا ربط

عمران بن حصین کے بیان سے قرآن و حدیث کا ربط بھی معلوم ہو گیا کاش اگر منکرینِ حدیث اس ربط کو پا لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن کو تسلیم کر کے حدیث کا انکار ممکن نہیں اور حدیث کا انکار کر کے قرآن کو ماننے کی کوئی صورت نہیں یہاں ان دونوں میں متن و شرح کی نسبت ہے پھر یہ متن شرح میں اور شرح متن میں اس طرح درج ہے کہ ایک کا اقرار و انکار دوسرے کا اقرار و انکار بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قرآن کی طرح اُس کا بیان بھی خدا ہی کی طرف سے ہے گویا ماتن ہی خود شارح بنا ہوا ہے اس لئے ایسی شرح کو متن سے جدا نہیں کیا جا سکتا نہ ایسے بیان کو اصل کتاب سے علیحدہ سمجھا جا سکتا ہے۔

فرض و واجب کے مراتب کا اختلاف

اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ قرآن و حدیث کا مرتبہ ایک ہی رہتا مگر یہاں نوعیتِ ثبوت کے فرق سے حکم میں تفاوت پیدا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن کے ثبوت کی جو نوعیت ہے وہ حدیث کے

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱۔ [2] الموافقات ج ۴ ص ۲۶۔

ثبوت کی نہیں اس لئے حدیث کا رتبہ قرآن سے کمتر سمجھا گیا ہے، امام شاطبی نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے۔

رتبۃ السنۃ التاخر عن الکتاب فی الاعتبار[۱]   سنت کا مرتبہ قرآنِ کریم کے بعد میں ہے۔

اس کے ذیل میں وہ ایک بڑی حقیقت پر تنبیہ فرما گئے ہیں اور وہ یہ کہ جب حکم شریعت یکساں ہے تو پھر احکامِ فقہ میں فرض اور واجب کا اختلاف کیسے پیدا ہوگیا۔ سنت، استحباب، اباحت وغیرہ کے مراتب تو اور ائمہ کے فقہ میں بھی موجود ہیں لیکن واجب کی اصطلاح صرف فقہ حنفی میں ملتی ہے اسی لئے کتبِ اصول میں مرتبۂ واجب کے اثبات میں بڑی بحث کی گئی ہے۔ امام شاطبی اس عنوان کے ذیل میں اس کے متعلق بھی ایک مفید بات تحریر فرما گئے ہیں۔

وما فرق بہ الحنفیۃ بین الفرض والواجب راجع الی تقدم اعتبار الکتاب علی السنۃ وان اعتبار الکتاب اقوی من اعتبار السنۃ۔ وقد لا یخالف غیرہم فی معنی تلک التفرقۃ والمقطوع بہ فی المسئلۃ ان السنۃ لیست کالکتاب فی مراتب الاعتبار[۲]

حنفیہ نے واجب اور فرض کا جو فرق کیا ہے وہ اسی بات پر مبنی ہے کہ قرآن کو حدیث پر ترجیح ہے اور اس بات پر کہ قرآن کریم کا اعتبار سنت سے قوی تر ہے اتنی بات میں دوسروں کو بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اجمالی طور پر یہ بات یقینی ہے کہ مراتبِ اعتبار میں حدیث قرآن کے برابر نہیں ہوسکتی۔

امام شاطبیؒ کے اس بیان سے واضح ہوگیا کہ جب دلیل میں کسی وجہ سے ظنیت پیدا ہوجاتی ہے تو حنفیہ اس فرق کو ظاہر کرنے کے لئے اُسے قطعی کے برابر نہیں کرتے۔ ارکان و فرائض شئی کی ماہیت ہوتے ہیں پس جو ماہیت قطعی ہو اس کے اجزا ظنی کیسے ہوسکتے ہیں مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یہ سب آیات قرآنیہ سے ثابت ہیں۔ لہٰذا جو ان عبادات کے اجزاء اور ارکان ہوں وہ بھی اسی درجہ قطعی دلیل سے ثابت ہونے چاہئیں جیسے قیام، سجدہ، رکوع قراءت یہ تمام ارکان قرآن سے ثابت ہیں اس کے برخلاف تعدیلِ ارکان، قعدہ اولیٰ اور خاص سلام کا لفظ قرآن سے ثابت نہیں بلکہ اُن احادیث سے ثابت ہیں جو ثبوت میں قرآن سے کمتر ہیں اس لئے حنفیہ نے ان دونوں قسموں کے حکم میں فرق کرنے کے لئے ایک قسم کو فرض اور دوسری کو واجب کہدیا ہے۔ دلائل کے قوت و ضعف کے اعتبار سے احکام میں مراتب کا تفاوت قرار دینا بالکل معقول بات ہے۔ حنفیہ کے کتبِ اصول میں اس فرق کی پوری توضیح و تقریر کی گئی ہے ہمارے نزدیک فرض اور واجب کا فرق صرف اس حقیقت پر مبنی نہیں اگرچہ یہ بات اپنی جگہ قابلِ تسلیم ہے کہ قرآن کا مرتبہ حدیث سے مقدم ہے لیکن صرف اتنی بات سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو قرآن سے ثابت ہو اُس کو فرض اور جو حدیث سے ثابت ہو اُس کو واجب کہدیا جائے بلکہ بہت سے مستحبات قرآن سے اور بہت سے فرائض احادیث سے ثابت ہوسکتے ہیں۔ البتہ نوعیتِ ثبوت کے لحاظ سے جو فرق رہے گا وہ یہ ہوگا کہ

---

[۱] الموافقات ج ۴ ص ۷۔ [۲] ایضاً ج ۴ ص ۸۔

وہ مستحبات بلحاظ ثبوت قطعی ہوں گے اور یہ فرائض ظنی. قوت وضعف کے تفاوت سے خود فرض میں بھی مراتب قائم کئے جا سکتے ہیں ایک فرض کو قطعی دوسرے کو ظنی کہا جا سکتا ہے یہ کہنا کہ فرض ظنی بعینہ واجب ہے، زیر تامل ہے یہاں شیخ ابن ہمام نے جو بحث فاتحہ خلف الامام کے ضمن میں فرمائی ہے قابل مراجعت ہے۔

فرض وواجب کے مراتب میں بحر العلوم کی تحقیق

ہمارے نزدیک مسئلہ کی پوری حقیقت وہ ہے جو بحر العلوم نے رسائل الارکان میں تحریر فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ماہیت کے اجزا اہمیت اور غیر اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے ایک درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزا کہلاتے ہیں مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے یہ تمام اجزا ایک حیثیت نہیں رکھتے اسی طرح زید میں ہاتھ، پیر، سر، دل، دماغ وغیرہ سب اس کے اجزا شمار ہوتے ہیں۔ مگر ان اجزا میں پھر اتنا بڑا تفاوت نظر آتا ہے کہ بعض کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے اور بعض کے کٹنے سے اس کے نمو میں نقصان پیدا ہو جاتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح زید کے اگر ہاتھ پیر قطع کر دیے جائیں تو پھر بھی اس کو زید ہی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی گردن کاٹ دی جائے تو پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ اس کا ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس کو اب زید کہنا صرف اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ پہلے اس ڈھانچے پر زید کا لفظ اطلاق کیا جاتا تھا پس جس طرح خارج میں کسی ماہیت کے اجزا میں حکم کا اتنا تفاوت موجود ہے اسی طرح فقہاء نے شرعی ماہیات کے اجزا میں بھی یہی فرق سمجھا ہے۔ نماز کے بعض اجزا وہ ہیں جن کے نقصان سے نماز کی زینت میں فرق آتا ہے اور بعض سے اس کی حقیقت میں نقصان پیدا ہوتا ہے اور بعض سے نماز کا اسم اطلاق کرنا ہی درست نہیں رہتا۔ پہلی قسم مستحبات، دوسری واجبات اور تیسری فرائض و ارکان کہلاتی ہے رہا یہ کہ ان مراتب کا اندازہ کیسے ہو تو یہ اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور عمل سے ہوتا ہے۔ بعض اجزاء کے ترک سے آپ نے اس عمل کو ناقص قابل اعادہ قرار دیا اور بعض کے ترک سے گو ناقص کہا مگر اس کا اعادہ لازم نہیں کیا۔ اور بعض کی وجہ سے اس عمل کا ہونا نہ ہونا برابر سمجھا جب آپ کے فرمان میں یہ تفاوت موجود ہے ادھر قرآن اقیموا الصلوۃ کہہ کر نماز کا تقاضہ کر رہا ہے تو لامحالہ فقہاء کو یہ غور کرنا پڑا کہ نماز میں وہ اجزاء کون سے ہیں جن کے ادا کر لینے سے خدا کا مطالبہ پورا پورا ادا ہو جاتا ہے اور وہ کون سے ہیں جن کے ترک سے ناقص ادا ہوتا ہے اور وہ کون سے جن سے نماز کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے اصل حقیقت فوت نہیں ہوتی. فقہاء نے صرف ہماری سہولت کے لئے ان اجزاء کے علیحدہ علیحدہ نام تجویز کر دیے ہیں تاکہ تعلیم و تعلم میں آسانی ہو جائے۔ اگر منکرین حدیث کو ان ناموں سے چڑ ہو تو وہ ان ناموں کو استعمال نہ کریں مگر کیا اس حقیقت سے بھی انکار کیا جا سکتا ہے کہ نماز کے اجزا سب برابر کے اجزا نہیں۔ پس فرض وواجب کا فرق صرف دلیل کے قطعی یا ظنی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ در اصل خود ان اجزاء کی

حقیقت کی وجہ سے ہے جو جز، واجب ہے وہ درحقیقت اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ فرض، اسی طرح جو مستحب ہے وہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ واجب، اس لئے صیغۂ امر ایک ہی رہتا ہے مگر مطالبہ کی اہمیت میں خود اس جز کے اہم اور غیر اہم ہونے کے لحاظ سے فرق پڑ جاتا ہے۔ [1]

خلاصہ یہ کہ جب اجزاء کی یہ فطری تقسیم تمام کائنات میں موجود ہے تو پھر یہی تقسیم اگر ماہیات شرعیہ میں بھی موجود ہو تو اُس میں کیا تردد ہے۔ آج بھی اردو میں ہم امر و نہی کے صیغے استعمال کرتے ہیں مگر کیا ہر امر کا اقتضاء برابر سمجھا جاتا ہے یا آج بھی بعض حکم معمولی بعض اس سے زیادہ تاکیدی ہو سکتے ہیں۔ پس جس طرح مراتب کا یہ تفاوت ہمارے حکم میں موجود ہے اسی طرح خدائی احکام کو سمجھنا چاہیے۔ اقیموا الصلوٰۃ (نماز قائم کرو) میں بھی ایک حکم ہے۔ اور واذا حللتم فاصطادوا (جب حج کا احرام کھولدو تو شکار کرو) میں بھی ایک حکم ہے مگر نماز کو فرض کہا جاتا ہے اور شکار کرنا کوئی شخص فرض نہیں کہتا حالانکہ صیغۂ امر ایک ہی ہے مگر فرض و مباح کے مراتب اسی ایک امر کے تحت میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان امور کے لحاظ کے بعد رسول کے بیان اور احادیث کی اہمیت اور پیدا ہو جاتی ہے منکرینِ حدیث کو یا تو قرآنی امر و نہی سب یکساں مرتبہ میں لحاظ رکھنے ہوں گے یا پھر محض اپنی عقل سے ان میں مراتب کا تفاوت پیدا کرنا پڑے گا۔

مولانا اسلم صاحب جس کو اسوۂ رسول کہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک حدیث ہی کا ایک بڑا شعبہ ہے جیسا کہ آئندہ واضح کیا جائے گا۔ بہرحال اگر قرآن اپنی جامعیت کے ساتھ اسوۂ رسول کا محتاج ٹھیر سکتا ہے تو اُسے حدیث کا محتاج ٹھہرانے میں بھی کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے، یہ احتیاج صرف ایسی ہی احتیاج ہے جیسی متن کو شرح کی احتیاج ہوتی ہے۔ اس احتیاج سے شرح کی کوئی فضیلت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہاں شرح اور متن کی احتیاج ثابت کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اصل فضیلت متن ہی کو ہے اگر متن نہ ہوتا تو شرح کس پر لکھی جاتی لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اگر یہ شرح نہ ہوتی تو ہر شخص اس متن کو اس سہولت کے ساتھ کس طرح سمجھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسا تعزیراتِ ہند کی دفعات اور قوانین کی دوسری کتابیں۔ گورنمنٹ کی جانب سے یہ قوانین مجمل الفاظ میں مدون ہو کر شائع ہو گئے ہیں، عدالتیں اس کی مختلف مختلف مرادیں بیان کرتی رہتی ہیں مگر اس کی صحیح مراد وہی سمجھی جاتی ہے جو ہائی کورٹ بیان کرتا ہے اسی لئے اس کے نظائر ہر جگہ ناطق سمجھے جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن بھی ایک قانون کی کتاب ہے اس کی مراد متعین کرنے کے لئے صرف رسول کا بیان معتبر ہے۔ اگر قرآن رسول کی اس ذمہ داری کی تصریح نہ بھی کرتا جب بھی ہمارا فرض ہوتا کہ ہم اُس بیان کو تلاش کریں جو رسول نے خواہ غیر ذمہ دارانہ طور پر قرآن کی تشریح میں پیش کیا ہے۔ چہ جائیکہ جب وہ اُس کا ذمہ دار بھی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لئے رسول نے صرف قرآن کے الفاظ کو دہرایا نہ ہوگا نہ دہرانے کو کوئی شخص بیان کہہ سکتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نے صرف الفاظ کے ترجمہ پر

[1] اس تحقیق سے اس شخص کا بھی جواب ہو جاتا ہے جس نے ایک مناظرہ میں امام شافعیؒ سے کہا تھا کہ جب قرآن میں امر و نہی ایک میں تو پھر آپ

کفایت بھی نہ کی ہو گی کیونکہ اہلِ زبان کے لئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی، یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر آج قرآن کی مراد سمجھنے میں کچھ مشکلات حائل ہو سکتی ہیں تو یقیناً اس وقت بھی حائل ہوئی ہوں گی ہاں قلت وکثرت کا فرق ہو سکتا ہے اور شبہات کی نوعیت کا فرق بھی ممکن ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ تمام قرآن میں کبھی کسی کو شبہ ہی پیش نہ آیا ہو۔ حافظ ابن قیمؒ وفد بنی المنتفق کی آمد کے واقعات کے سلسلہ میں ان کا ایک سوال تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب ہمیں درندے کھاپی کر برابر کر دیں گے اور ہوائیں فضاء عالم میں منتشر کر کے نیست و نابود کر دیں گی تو پھر ہمارا دوبارہ جینا کیوں کر ہو گا؟"

اِس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ جن کا یہ خیال ہے کہ آپ کے دور میں چپ چاپ عمل کر لینے کے سوا کبھی عقلی شبہات کے متعلق کوئی حرف بھی منہ سے نہیں نکالا گیا یہ سراسر غلط ہے اور اسی طرح یہ بھی ایک خیالِ خام ہے کہ معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ دین کے علمی حصہ کو اُن سے کچھ زیادہ سمجھنے والے تھے پھر لکھتے ہیں۔

وفيه دليل على انهم كانوا يوردون على رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يشكل عليهم من الاسئلة والشبهات فيجيبهم عنها بما يثلج صدورهم وقد اورد عليه صلى الله عليه وسلم الاسئلة اعداؤه واصحابه اعداؤه للتعنت والمغالبة واصحابه للفهم و البيان وزيادة الايمان وهو يجيب كلا عن سؤاله الا ما لا جواب عنه كسوال عن وقت الساعة۔[1]

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کو جو شبہات پیش آتے وہ برابر انھیں آپ کے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ بھی دل ٹھنڈا کر دینے والے جوابات انھیں مرحمت فرمایا کرتے یہاں دوست ودشمن کا فرق نہ تھا سب ہی سوال کرتے اور سب ہی کو جواب دیا جاتا فرق صرف یہ تھا کہ دشمن جھگڑا کرتے اور اپنے غالب آنے کی فکر میں رہتے اور آپ کے صحابہ دین کی باتیں سمجھنے اور زیادہ سے زیادہ ان پر یقین حاصل کرنے کی فکر میں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی زبان سے كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى (تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے) کا سوال نکل سکتا ہے اور کسی کی زبان سے یہ بھی ادا ہو سکتا ہے۔ اَنّٰى يُحْيِ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا (بھلا اس بستی کی اس طرح بربادی کے بعد اب اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ کہاں زندہ کرے گا) تو غریب صحابہ کرام کے سوالات پر کیا اتہام ہے۔ پس یہ کس قدر ضروری ہے کہ ہم اُن تمام شبہات کو پیش نظر رکھیں اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ ان کلمات کو تلاش کریں جو رسول نے ان شبہات کے جواب میں یا خود قرآن کی مراد بتلانے میں ذمہ دارانہ طور پر ادا فرمائے تھے[2]۔ جتنا ہم اس اہمیت پر غور کرتے جاتے ہیں اسی قدر حدیث کی ضرورت ہمیں اور عیاں ہوتی جاتی ہے

[1] زاد المعاد۔ ج ۳ ص ۷۵۔

[2] مولانا اسلم صاحب رسول کے بیان کی اس اہمیت کو کم کرنے کے لئے تحریر فرماتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن نور مبین اور مفصل کتاب ہے جس کو اس کے اولین مخاطب یعنی صحابہ کرام بے تکلف سمجھتے تھے ۔۔۔۔ کل زمانۂ نبوت میں قرآنی تعلیمات کے متعلق صحابہ نے جس قدر باتیں پوچھیں وہ امام رازیؒ کے بیان کے مطابق ۱۴، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں صرف ۱۲ ہیں، ان سب کے جوابات قرآن ہی میں نازل کئے گئے ہیں۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

اسی اہمیت اور ضرورت کو مطرف بن شخیر نے بتلایا تھا "ولکن نرید من ھو اعلم بالقرآن" (یعنی ہمیں قرآن کے ساتھ اُس کی تلاش بھی ضروری ہے جو قرآن کا سب سے زیادہ سمجھنے والا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔

امام اوزاعیؒ کے قول کی تشریح

حدیث کی اسی صفت بیان و توضیح کے پیشِ نظر امام اوزاعیؒ سے منقول ہے۔

الکتاب احوج الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۱)	کتاب اللہ سنت کی طرف زیادہ محتاج ہے بہ نسبت سنت کے کتاب اللہ کی طرف

امام اوزاعیؒ نے یہ مقولہ اپنی جانب سے نہیں کہا بلکہ مکحول سے نقل فرمایا ہے حافظ ابو عمر اس کی مراد یہ بیان فرماتے ہیں۔

یرید انھا تقضی علیہ و تبین المراد منہ	امام اوزاعیؒ کا مطلب یہ ہے کہ سنت قرآن کی مراد بیان کر دیتی ہے

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) نیز مختصر جامع بیان العلم کے آخری صفحہ میں ایک ایک کر کے گنا دیئے ہیں۔" (علم حدیث ص ۲۷) پھر صفحہ ۳۹ میں تحریر فرماتے ہیں "یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس قرآن کا مخاطب قرار دیا ہے وہ انسانی عقل ہے جس میں اس نے فکر و نظر کی قوت ودیعت فرمائی ہے اس کی ہدایت کے لئے جس قدر روشنی کی ضرورت ہے اس کتاب میں رکھدی ہے جو ہر زمان و مکان میں اُس کی رہنمائی کے لئے کافی ہے"۔ ان دونوں عبارتوں کے ملانے سے یہ صاف سمجھ میں آسکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے صرف عقل کافی ہے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقلِ انسانی میں بھی بڑا تفاوت ہے پھر عرب کے سوا عجم کو زبانِ عربی کے سمجھنے کا سلیقہ بھی درکار ہے پھر زبان دانی کے بعد قرآن پر اتنا عبور بھی ضروری ہے کہ ہم معنیٰ آیات سب بیک وقت دماغ میں مستحضر ہوں تاکہ کتاب اللہ کی مراد کتاب اللہ سے حل ہو سکے۔ پھر بہت سی آیات قصہ طلب ہیں، بہت سی مجمل نظر آتی ہیں۔ ان سب مراحل سے گذرنے کے لئے کتنا وقت درکار ہے، کیا اس مدت میں دین معطل رکھا جائے یا صرف منکرینِ حدیث کا بیان معتبر سمجھا جائے۔ ان تمام مشکلات کو طے شدہ سمجھکر مولانا ایک دوسری طرف متوجہ ہو گئے ہیں وہ یہ کہ قرآن میں ہی یہ موجود ہے کہ ہم نے تمہیں اس لئے بھیجا ہے کہ تم ہماری کتاب کو واضح کر کے ان پڑھ لوگوں کو سمجھا دو، ان کی ناقص عقلوں پر براہ راست سمجھنے کا بوجھ ڈالنا ان کو بڑی تنگی میں ڈالدینا ہے۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور عقل کے علاوہ رسول کے بیان کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے جواب میں فرماتے ہیں: "لاریب آپ کی تعلیم و تبیین دینی ہے۔ لیکن وہ وہی عملی تشریح یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا"۔

معلوم نہیں کہ مولانا کو رسول کے قول سے کیا ضد ہے کہ دین کے باب میں رسول کے منہ سے ایک لفظ کا صدور بھی وہ تسلیم نہیں کرتے اور عمل کے درجہ میں تمام تفصیلات کو ماننے کے لئے تیار ہیں۔ یہ بحث نہیں ہے کہ اسوۂ رسول متواتر ہے یا غیر متواتر۔ چلئے آپ حدیث کو غیر متواتر ہونے کی وجہ سے تسلیم نہ کیجئے مگر اتنا تو تسلیم کر لیجئے کہ دین کے باب میں آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی وحی الٰہی سے نہ سہی اپنی عقل سے ہی کچھ نہ کچھ سمجھا ہو گا آخر وہ کیا تھا پھر اگر قرآن و عقل کی دو روشنیاں بھی آپ کے لئے کافی نہیں اور ان کے بعد اسوۂ رسول کا ہونا بھی ضروری ہے تو اتنی توسیع کے بعد آپ رسول کے قول پر کہاں سے کنٹرول کر سکتے ہیں۔ رسول کے بیان کو صرف عمل کے دائرہ میں محدود کر دینا آخر کس دلیل سے ہے۔

مولانا کو چونکہ احادیث سے دلچسپی نہیں ہے اس لئے انھوں نے یہاں ۱۲، اور ۱۴، کا اختلاف کر یونہی چھوڑ جانا اپنے لئے اور مفید سمجھا ہے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ یہاں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ کل سوالات ۱۴ ہیں۔ جس میں سے روح اور ذو القرنین کا سوال صحابہ کی طرف سے نہ تھا اس لئے مجموعی تعداد ۱۴ ہے اور صحابہ کے سوالات کی بارہ، اس کے بعد سنئے کہ آپ نے شاید اس پر بھی غور نہیں کیا کہ ابن عباسؓ خود خورد سال تھے یہ تمام صحابہ کے سوالات کے اعداد و شمار کیسے بیان کر سکتے ہیں۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

حافظ ابو عمرؒ نے امام اوزاعیؒ کے الفاظ کی جو مراد اپنی جانب سے بیان کی ہے وہ خود امام اوزاعیؒ نے حسان بن عطیہ سے بھی نقل فرمائی ہے۔

کان الوحی ینزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ویحضرہ جبرئیل بالسنۃ التی تفسر ذلک۔ — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آیا کرتی تھی اور جبرئیل آپ کے پاس وہ سنت لیکر آیا کرتے تھے جو اس کی تفسیر کر دیتی تھی۔

امام شاطبیؒ امام اوزاعیؒ کے الفاظ کی اور شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لان الکتاب یکون محتملا لامرین فاکثر فتاتی السنۃ بتعیین احدھما فیرجع الی السنۃ ویترک مقتضی الکتاب۔ (الموافقات ج ۴ ص ۸ و ۱۰) — قرآن کی عبارت میں کبھی دو باتوں کا کبھی اس سے بھی زیادہ کا احتمال ہوتا ہے اور یہ متعین نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مراد کیا ہے۔ حدیث ان میں سے ایک احتمال متعین کر دیتی ہے اور وہی قرآن کی مراد سمجھی جاتی ہے۔ پھر قرآن کریم کے دوسرے احتمالات پر عمل نہیں کیا جاتا۔

اس کی اور شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ فمعنی کون السنۃ قاضیۃ علی الکتاب انھا مبینۃ لہ فلا یوقف

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) ہزاروں صحابہ اُن سے پہلے گذر چکے ہوں گے اور بہت سے صحابہ سے ان کی ملاقات بھی ہوئی ہو گی پھر اس قسم کی احادیث کو بلا قید پورے عموم کے ساتھ سمجھ لینا کتنا عقل کے موافق ہو سکتا ہے لیکن چونکہ اس اجمالی اور مبہم حکم سے حدیث کے انکار میں مدد مل سکتی تھی اس لئے یہاں مولانا کو پورا شرح صدر حاصل ہو گیا۔ اگر یہی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جائے تو تواتر سے اس طرف مولانا کا تردد دور ہی نہیں ہوتا اور اس میں بھی یہ تردد پڑ جاتا ہے کہ تواتر کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ یہ بحاب وہ مراد سنئے جو محدثین نے بیان فرمائی ہے۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں۔

قلت المراد ابن عباس بقولہ ما سألوہ الا عن ثلاث عشرۃ مسئلۃ المسائل التی حکاھا اللہ فی القرآن عنھم والا فالمسائل التی سألوہ عنھا وبین لھم احکامھا بالسنۃ لاتکاد تحصی۔ (اعلام الموقعین ج۲ ص۳۱) — یعنی ابن عباسؓ نے یہاں کل ان شبہات کی تعداد بیان فرمائی ہے جن کے جوابات قرآن کریم میں مذکور ہیں۔ یقیناً ابن عباسؓ سے پہلے اور ان کی لاعلمی میں بھی بہت سے سوال ہوئے مگر تعریف کے محل پر اُن ہی سوالات کا تذکرہ کرنا مناسب ہے جن کی اہمیت کو خود قرآن نے محسوس کیا اور ان کا جواب خود دیا۔

اگر مولانا حدیث کی روشنی میں قرآن پڑھتے تو اُن کو معلوم ہو جاتا کہ قلتِ سوال کی وجہ خود قرآن کی ممانعت ہے لاتسألوا عن اشیاء ان تبد لکم تسوءکم۔ رسول سے بہت باتیں دریافت مت کیا کرو اگر تمہیں تمام باتوں کا جواب دیدیا جائے تو بعض مرتبہ تمہیں پسند نہ ہوگا اور قرآنی بیان کے بعد ان کا تسلیم کرنا ضروری ہو گا۔ اس آیت سے تو اُلٹا یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس وقت سوالات کی کثرت اتنی ہو گئی تھی کہ قرآن کو روکنا پڑا۔ پس جو عدد قرآن میں مذکور ہے اُسے صحابہ کے سوالات کا تمام عدد سمجھ لینا محض غلط ہے۔ مولانا کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اگر اھلۃ۔ الساعۃ۔ الجبال کا سوال کرنا قرآنی تعلیمات میں شامل ہو سکتا ہے تو کیا اس جیسے اور سوالات قرآنی تعلیمات میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ پھر کیا ماذا ینفقون اور خمر اور میسر کا بیان اسوۂ رسول میں نہ تھا۔ اعتراض کا نقد اور جواب کا ادھار اچھا نہیں۔ صحابہ کے سوالات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوابات کا نمونہ دیکھنا ہو تو اعلام الموقعین ملاحظہ کیجئے۔ از جلد ۲ ص ۲۳۰ تا ۳۱۳۔

علی اجمالہ واحتمالہ وقد بینت المقصود منہ لا انھا مقدمۃ علیہ کون السنۃ قاضیۃ علی الکتاب کا مطلب یہ ہے کہ جب سنت کتاب اللہ کی مراد بیان کردے تو اب کتاب اللہ کے اجمال یا لفظی احتمالات پر عمل نہ کیا جائے گا پھر اس کی مزید توضیح کے لئے ایک مثال دیتے ہیں۔

مثلاً قرآن کریم نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹ دینا مقرر فرمائی ہے مگر یہ بیان نہیں فرمایا کہ کتنے مال چرانے کی یہ سزا ہے۔ اسی طرح یہ بھی تفصیل نہیں کی کہ کتنا ہاتھ کاٹا جائے۔ ان احتمالات کو سنت نے صاف کرکے بتلادیا کہ جس مال کی چوری سے ہاتھ کاٹا جاسکتا ہو وہ مثلاً کم ازکم دس درہم کی مقدار ہونا چاہئے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال محفوظ ہو تاکہ چوری کا لفظ اس پر صادق آسکے اس کے بعد جب ہاتھ کاٹا جائے تو پہونچے پر سے کاٹنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ احکام حدیث سے ثابت کئے گئے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ یہ احکام خود قرآن سے ثابت شدہ ہیں، مگر حدیث نے صرف یہ بتلادیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہاں مراد یہ تھی جیسا کسی آیت کا مطلب اگر ہم امام مالک رح سے دریافت کرلیں اور ان کے بیان کے موافق اس پر عمل کرلیں تو یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہم نے امام مالک کے قول پر عمل کیا ہے بلکہ ہر شخص یہی کہتا ہے کہ ہم نے قرآن پر عمل کیا ہے۔ پس جس طرح یہاں اصل حجت قرآن کریم ہی سمجھا جاتا ہے اور امام مالک کو صرف مفسر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن و حدیث کا معاملہ ہے[1]۔ یہاں بھی حدیث کی تفصیل کو مستقل کہنا غلط ہے بلکہ حدیث صرف یہ بیان کردیتی ہے کہ یہاں قرآن کریم کی مراد یہ ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

فکان السنۃ بمنزلۃ التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب (ج ۵ ص ۱۰)

گویا سنت، کتاب اللہ کے احکام کے لئے بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے۔

حدیث کی یہی حیثیت امام اوزاعی نے حسان بن عطیہ سے نقل فرمائی ہے اور یہی حیثیت عمران بن حصین صحابی کے الفاظ میں آپ کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں۔ پس سلف اور خلف کے ان متفقہ الفاظ سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث میں متن و شرح کا ربط ہے، ان میں ایک دوسرے کا مخالف نہیں بلکہ مبین اور شارح ہے۔ کتاب اللہ بمنزلہ متن ہے اور حدیث اس کے لئے بمنزلہ شرح۔ اسی کی طرف آیت مذکورہ میں تنبیہ کی گئی ہے۔

---

[1] امام اوزاعی کے قول کی شرح آپ نے خود اور دوسرے علماء کی زبان سے سن لی۔ کیا آپ کے نزدیک وہ درحقیقت حدیث کو قرآن پر فوقیت دیتے ہیں مگر مولانا اسلم صاحب نے جن کتابوں سے یہ مقولہ نقل فرمایا ہے ان ہی میں اس کا یہ مطلب بھی مذکور تھا۔ مگر پھر یہ لکھدیا ہے "آخر کار حدیث کا غلبہ یہاں تک پہنچ گیا کہ قرآن کریم سے بھی اس کی اہمیت بڑھادی گئی"۔ (ص ۱۰)

اس کے جواب میں ہم ادب ہی عرض کرسکتے ہیں کہ جیسا آپ نے عقل اور اسوۂ رسول کی اہمیت بڑھادی ایسا ہی ہم نے رسول کے ایک بیان کی اور اہمیت بڑھادی۔ اگر وہ اہمیت قرآن کے مخالف نہیں تو یہ بھی نہیں۔

انا انزلنا الیک الکتاب لتبین للناس ما نزل الیھم۔ رسول کی جس خدمت و فرض کو یہاں بیان کیا گیا ہے
اسی کا دوسرا نام حدیث ہے۔

احادیثِ رسول کے بیان ہونے کی تفصیل

احادیث میں قرآن کے مجمل احکام کی تشریح

اس ربط کی تشریح[1] کے لئے ہمیں قدرے اور تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے امام شاطبیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ سنت کیا ہے؟ وہ درحقیقت قرآن ہی کی دوسری ایک مفصل شکل ہے۔ اس کے مجملات کی تفصیل، اس کی مشکلات کا بیان اور اس کے مختصر اشارات کی شرح ہے۔ مجملات کی تفصیل سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ بلکہ تمام عبادات و معاملات کی کوئی تفصیل ذکر نہیں کی گئی۔ سنت نے اس اجمال کی تفصیل کی ہے۔ قرآن نے اگر نماز کا حکم دیا ہے تو سنت نے اس کی ایک ایک جزء کی تفصیل کی ہے مثلاً شروع میں ہاتھ اٹھائے تو کس طرح، ہتھیلیوں کا رخ کس جانب رکھے، کہاں تک اٹھائے، اٹھاتے وقت کیا کہے پھر ہاتھ چھوڑے یا باندھے، اگر باندھے تو کہاں باندھے، بہرکیف عمل کے لئے ان تمام سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔ یہاں منکرِ حدیث تو ان سوالات میں کسی ایک کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھتا کیونکہ قرآن نے ان امور کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ مولوی اسلم صاحب البتہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرمائیں گے کہ اسوۂ رسول ان تمام تفصیلات کے جواب کے لئے کافی ہے مگر آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ جواب بھی قطعاً غیر تشفی بخش ہے۔ یہ امتیاز صرف اہلِ سنت کو حاصل ہے کہ وہ حدیثِ رسول کی مدد سے چھوٹی سی چھوٹی بات کا جواب دے سکتے ہیں وہ بھی تاریکی میں نہیں بلکہ پوری روشنی میں وہ اپنے ہر دعویٰ کے لئے اصولی طور پر ایک حدیث، پھر حدیث کے لئے سند اور ہر سند کے راوی اور ہر راوی کی پوری تاریخ پیش کر سکتے ہیں۔ گویا اس ذریعہ سے

---

[1] حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ احادیث کے ذخیرہ پر نظر ڈالی جاتی ہے تو کل تین قسم کی احادیث نظر آتی ہیں (۱) بعض احادیث وہ ہیں جن میں بعینہ وہی حکم مذکور ہے جو قرآن میں ذکر کیا گیا ہے (۲) بعض میں کسی مجمل کی مراد یا کسی لفظ کی تفسیر مذکور ہوتی ہے۔ ان دونوں قسموں میں آپ کی اطاعت کا کوئی خاص مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اگر یہ احادیث بھی نہ ہوتیں جب بھی یہ احکام قرآن میں مذکور ہونے کی وجہ سے واجب الاطاعت تھے۔ پس یہ اطیعوا اللہ کے (خدا کی اطاعت کرو) تحت میں درج ہیں۔
(۳) بعض احادیث میں جن میں وجوب و حرمت کے ایسے احکام مذکور ہیں جن سے قرآن نے سکوت اختیار کیا ہے۔ ان ہی احکام کے ماننے کے لئے واطیعوا الرسول کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر یہ تیسری قسم واجب الاطاعت نہ ہو تو پھر خاص اطاعتِ رسول کا کوئی مصداق ہی نہیں نکلتا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کی پوری آیت پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب ہر سہ اقسام کی اطاعت کی جائے۔ قرآن کریم نے رسول کی مستقل اطاعت کو بھی خدا کی اطاعت کی دوسری شکل قرار دیا ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ رسول کی اطاعت ایک لحاظ سے خدا ہی کی اطاعت ہے۔
(اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۲)

وہ اسوۂ رسول کو آج بھی دنیا کو دکھلا سکتے ہیں اور بتا سکتے ہیں کہ رسول نے قرآن کے اس اجمال پر کس طرح عمل کرکے دکھلایا تھا حدیث کا ایک حصہ تو یہ ہے۔

احادیث میں مشکلات قرآن کا حل

اس کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں قرآنی مشکلات کا خود صاحب رسالت نے حل فرما دیا ہے اس کی چند مثالیں پہلے گذر چکی ہیں یہاں ایک مثال اور پیش کی جاتی ہے جب یہ آیت نازل ہوئی

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا — جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسکو اللہ کی راہ

فِیْ سَبِیْلِ اللہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ — میں خرچ نہیں کرتے انکو دردناک عذاب کی خوشخبری دیجئے

صحابہ کو یہ سن کر بہت فکر ہوئی کیونکہ ان میں اگرچہ بیشتر غریب تھے لیکن کچھ مالدار بھی تھے ان کے پاس سونا اور چاندی جمع بھی رہتا تھا اور قرآن کی اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کو سخت عذاب ہوگا اس لئے انھوں نے آپ سے استفسار کیا آپ نے فرمایا کہ آیت کا وہ مطلب نہیں ہے جو تم سمجھے ہو، جمع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نہ دی جائے، جس مال کی زکوٰۃ دیدی جائے وہ کنز اور خزانہ کی تعریف میں نہیں آتا، اور ان کی مزید تسلی کے لئے فرمایا۔

ان اللہ لم یفرض الزکوٰۃ الا لیطیب — اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ اسی لئے تو لازم کی ہے تاکہ

بھا ما بقی من اموالکم۔ — تمہارا باقی مال پاک وصاف ہو جائے۔

اگر شریعت میں مطلقاً مال جمع کرنا حرام ہوتا تو میراث کی آیت کا مطلب کیا ہوتا جب قرآن نے میت کے مال تقسیم کرنے کا قانون خود بتایا ہے تو یہ اس کی صاف دلیل ہے کہ اس نے کسی حد تک مال جمع کرنا بھی جائز قرار دیا ہے کیونکہ مال کی تقسیم کا قانون اسی وقت نافذ ہو سکتا ہے جب پہلے مال موجود ہو، اگر مال نہ ہو تو تقسیم کس چیز کی کی جائے گی، یہ سن کر صحابۂ کرام کا شبہ حل ہوگیا اور مال جمع کرنے کے حدود بھی انھیں معلوم ہو گئے اگر سنت نہ ہو تو یہ بیان کہاں سے آئے، حدیث کی دوسری قسم یہ تھی۔

احادیث میں قرآن کی تفسیر

تیسری قسم اُن اشارات کی تفصیل ہے جو نظم قرآنی میں متفرقاً موجود ہیں جیسے (۱) وَعَلَی الثَّلٰثَۃِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا (وہ تین شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ جنگ میں شامل نہ ہوئے اور پیچھے رہ گئے تھے) یہ اور اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جو قصہ طلب ہیں جب تک وہ پورا واقعہ معلوم نہ ہو ان آیات کا پورا مفہوم ہی روشن نہیں ہوتا حدیث میں ان قصوں کی پوری تفصیل موجود ہے۔ قصوں کے علاوہ بعض تفسیری اجزاء بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں جن کے بغیر قرآن کا پورا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ یہاں تفسیری اجزاء سے ہماری مراد حسب ذیل امور ہیں۔

(۲) فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ (جنھوں نے ظلم کیا تھا انھوں نے جو کلمات

کہنا انھیں بتائے گئے تھے وہ بدل ڈالے) قرآن میں وہ کلمات مذکور ہیں جن کے کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وَقُولُوا حِطَّةٌ۔ جب دروازہ میں داخل ہو تو حطۃ کہنا (اے اللہ ہمارے گناہ بخشدے) لیکن ضد میں آکر جو مہمل اور گستاخانہ کلمات انھوں نے بکے وہ اس قابل کب تھے کہ قرآن ان مہملات کو بھی نقل کرتا۔ رسول نے ان کو بیان کر کے اس اس قوم کے تمرد اور سرکشی کا حال ظاہر فرمایا ہے۔ قالوا" حبۃ فی شعرۃ" یعنی حطہ کی بجائے انھوں نے حبۃ فی شعرۃ کا مہمل کلمہ بکنا شروع کیا۔

(۳) یا مثلاً قرآن کریم میں ارشاد ہے۔ وَکذلک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا (ایسا ہی ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو، اور تمہارا رسول تمہارے لئے گواہی دے) قرآن کی یہ آیت واقعہ طلب ہے حدیث نے اس کی تشریح کی کہ جب قیامت میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں آئیں گی تو اس وقت انبیاء علیہم السلام سے تبلیغِ دین کا سوال کیا جائیگا ان کی قوم جھوٹ بول دے گی اور کہے گی۔

مَاجَاءَنَا مِنْ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ ہمارے پاس تو نہ کوئی خوشخبری سنانے والا آیا نہ ڈرانیوالا،

رسولوں سے پوچھا جائے گا تمہارا کوئی گواہ ہے وہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت۔ اس وقت یہ امت آکر اُن رسولوں کے لئے گواہی دے گی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی امت کے لئے گواہی دیں گے۔

(۴) وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ (ہم نے آپ کو سبع مثانی مرحمت کیں اور قرآن عظیم دیا) حدیث نے تفسیر کی کہ سبع مثانی سورۂ فاتحہ ہے۔

(۵) حدیث کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس سے قرآن کریم کا شانِ نزول معلوم ہوتا ہے اگر وہ معلوم نہ ہو تو قرآن کریم کی مراد ہی مختل ہو جاتی ہے۔ خوارج کا تمام مذہب اسی مغالطہ پر مبنی تھا وہ ان سب آیات کو جو کفار کے حق میں تھیں مسلمانوں پر چسپاں کر کے ان سے جہاد کرنا لازم سمجھتے تھے۔ ہم یہاں اُس کی ایک مثال لکھتے ہیں مروان نے اپنے ایک خادم کو حضرت ابن عباسؓ کی خدمت میں بھیجا اور ان سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا

وَیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا۔ اور وہ لوگ چاہتے ہیں کہ جو کام انھوں نے نہیں کئے اس پر اُن کی مدح سرائی کی جائے۔

اس میں اشکال یہ ہے کہ اگر محض اس خصلت پر عذاب ہونا لازم ہو تو فطرۃً ہر انسان کے دل میں پوشیدہ طور پر یہ خواہش موجود ہوتی ہے وہ چاہتا ہے کہ بہت سے وہ کام جو وہ نہیں کرتا لوگ سمجھیں کہ وہ کرتا ہے اور اس پر لوگوں کی تعریف کا متمنی رہتا ہے اس لحاظ سے تو اکثر لوگ عذاب میں گرفتار ہو جائیں گے۔ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں، یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں اتری تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے تورات کی کوئی بات دریافت کی انہوں نے ازراہِ شرارت اس کو چھپا لیا اور دوسری بات آپ کو بتلا کر یہ امید کی کہ آپ ہمارے مشکور ہوں گے اور ہماری تعریف کریں گے اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوگئی اور ان کا فریب اور دھوکا دہی کھول دی گئی۔[۱]

ہمارے مضمون کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو حدیثیں بظاہر قرآن کریم سے باہر سمجھی جاتی ہیں، ان کے متعلق بھی کچھ تشریح کردی جائے۔ یہاں جو بحث سنت سے کتاب اللہ پر زیادتی کے متعلق حافظ ابن قیم نے فرمائی ہے قابلِ مراجعت ہے۔[۲]

یہ واضح رہنا چاہئے کہ جب قرآن کی جامعیت بلحاظ اقامت اصول ہے تو اب یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ہر جزئی اس میں مذکور ہو۔ اگر ایسا ہو تو نہ حدیث کی ضرورت رہے نہ رسول کی صرف خدا کی کتاب براہِ راست اتار دی جائے۔ اور وہی تمام ضروریات کے لئے کافی ہو جائے، جب ایسا نہیں کیا گیا بلکہ کتاب کے بیان کے لئے اس کے ساتھ ایک رسول بھی بھیجا گیا تو یہ ضروری ہوا کہ قرآن کو صرف ایک اصولی قانون بنا دیا جائے اور اس کے دفعات کی تشریح رسول کے سپرد کردی جائے یہ تشریحات تمام کی تمام خدا کی مراد کے مطابق ہوں گی مگر سب رسول کے زبان سے ہوں گی۔

احادیث رسول کو بیان کہنے کے چند اصول اور قواعد

ان تمام تشریحات کو قرآن کا بیان سمجھنے کا ایک کلی طریقہ تو وہ تھا جو حضرت ابن مسعودؓ کی زبانِ مبارک سے آپ نے سنا یعنی جب قرآن میں اجمالاً یہ حکم دیا گیا کہ رسول جو تمہیں دے اُسے قبول کرو تو اسی ایک قانون میں احادیثِ صحیحہ کا تمام ذخیرہ آگیا اس لئے جب کبھی صحابہ کو آپ نے

[۱] مولانا اسلم صاحب شاید یہ فرمائیں گے کہ یہ سب تاریخی امور ہیں اور تاریخی امور میں حدیث ہمارے نزدیک بھی حجت ہو سکتی ہے مگر ہمارا سوال یہاں یہ ہے کہ اگر ان احادیث کی اسانید اس درجہ سمجھی جا سکتی ہیں کہ قرآن کی تفسیر میں پیش کی جا سکیں تو حلال و حرام کی آیات میں وہ اس درجہ کیوں نہیں سمجھی جاتیں چلئے اگر وہ قطعیت کو مفید نہ ہوں مگر ظنیت کو مفید ہونا تو آپ کو بھی تسلیم ہے۔ اس تقدیر پر اُن سے اتنا تو ثابت ہو ہی جائے گا کہ حلال و حرام کے متعلق بھی آپ نے کچھ نہ کچھ تفصیلات ضرور فرمائی تھیں اس کے ساتھ ہی اگر اس قسم کی تمام احادیث کو آپ ایک جگہ جمع کرلیں تو ہر حدیث اپنی جگہ اگرچہ خبر واحد ہوگی مگر ان سب کے مجموعے سے کیا یہ یقین حاصل نہیں ہوگا کہ حلال و حرام کے متعلق بھی آپ نے کچھ تفصیلات ارشاد فرمائی تھیں پس ان تمام مجموعے سے جو یقین حاصل ہوا ہے اس کے رد کرنے کے لئے ایک ایک حدیث کی ظنیت ثابت کرنا کیا کارآمد ہو سکتا ہے۔ پھر آپ کو تو یہاں ظنیت کا بھی اقرار نہیں۔ آپ کے نزدیک تو یہ سب احادیث موضوعات کا ذخیرہ ہیں۔ معلوم نہیں کہ جب وہی راوی وہی سند، حلال و حرام کے سوا، دوسری جگہ آئیں تو مفیدِ ظن ہو جائیں اور جب حلال و حرام کے باب میں آئیں تو بجائے مفیدِ ظن ہونے کے یقینی موضوع سمجھی جائیں، کیا یہ انصاف ہے اس لئے انصاف اس کا اقرار کرلینا چاہئے کہ حلال و حرام کے بارے میں بھی آپ نے بہت سی تقیید بیان فرمائی ہیں۔ جنہیں ظنی ہونے کی وجہ سے ہم تسلیم نہیں کرتے یکسر انکار کرنا بڑا ظلم ہے۔

[۲] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۱ تا ۲۴۹

کوئی حکم دیا تو انھوں نے آپ سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ بات قرآن میں کہاں لکھی ہے۔ البتہ زمانۂ نبوت کے دور کے بعد یہ سوالات ضرور کئے گئے تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ اس وقت تک حدیث متفرق طور پر لوگوں کے پاس تھی قرآن کی طرح پورے کا پورا ذخیرہ بلا بحث و تفصیل کئے ہر شخص پر واجب التسلیم نہ تھا۔ ہاں جب یہ ثابت ہوجاتا کہ یہ آپ کا فرمان ہے تو اس کے بعد کبھی کسی کا پس و پیش کرنا ثابت نہیں ہوتا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ان تشریحات کو قرآن کی مجمل آیات کی تشریح یا تفسیر کہا جائے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں کبھی دو قسم کے احکام ہوتے ہیں اور کوئی چیز ایسی ہوتی ہے جن کے متعلق یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے کہ وہ کس میں درج کی جائے اس لئے اس کا حکم معلوم نہیں ہوسکتا۔ احادیث یہ فیصلہ کردیتی ہیں کہ یہ چیز ان دو حکموں میں سے فلاں حکم میں درج ہونے کے قابل ہے اور اس طرح یہ احادیث اس کا بیان سمجھی جاتی ہیں مثلاً

تیسرے قاعدہ کی چند مثالیں

قرآن نے حلال و حرام کے متعلق ایک ضابطہ کلیہ یہ بیان فرمادیا ہے کہ جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں اور جو خبائث ہیں وہ حرام ہیں لیکن اب درندے اور شکاری پرند، خرگوش اور فاختہ وغیرہ کے متعلق یہ قطعی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کس نوع کو کس حکم میں درج کیا جائے، حدیث نے اس کو بیان کردیا کہ پہلی قسم خبائث میں داخل ہے اور دوسری طیبات میں۔ اب منکرِ حدیث تو یہ سمجھتا ہے کہ ذی ناب من السباع اور ذی مخلب من الطیر کی حدیث قرآن کے مخالف ہے مگر منصف شخص جانتا ہے کہ یہ عین قرآنی حکم ہی کی تشریح اور اسی کا بیان ہے۔ اگر یہاں طیبات اور خبائث کی تشریح صرف عقل کے سپرد کردی جائے تو حرام خوروں کی جماعت تمام خبائث کو طیبات کہہ کہہ کر حلال بنا ڈالے۔ موجودہ دور میں شراب کو بھی کسی معین مقدار میں بہت مفیدِ صحت سمجھا گیا ہے۔ پھر ایسا حرام کونسا ہے جس میں کوئی نہ کوئی نفع نہ ہو، ایسے خواہشات پرستی کے دور میں فیصلہ صرف عقلِ انسانی پر چھوڑنا مقصدِ شریعت ہی کو فنا کرنا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے پینے کی چیزوں میں جو مسکر اور نشہ آور نہیں وہ حلال فرمائی ہیں اور جو نشہ آور ہیں حرام کی ہیں، درمیان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو تھوڑی پی جائیں تو نشہ پیدا نہیں کرتیں اور زیادہ مقدار میں استعمال کی جائیں تو نشہ پیدا کرسکتی ہیں۔ حدیث نے سدِباب کرنے کے لئے ان کو پہلی قسم میں درج کردیا اور فرمایا۔

ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام۔ جو بہت نشہ لائیں وہ تھوڑی بھی حرام ہیں۔

(۳) قرآن کریم نے سکھائے ہوئے شکاری کتے کا شکار حلال قرار دیا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ جو شکاری نہ ہو اس کا شکار حرام ہے۔ لیکن اگر شکاری اپنے شکار کو کھالے تو اس کا کیا حکم ہے یہ زیرِ تردد ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ کتا تعلیم یافتہ ہے تو اس کا شکار حلال ہونا چاہئے اور اگر اس طرف نظر کی جائے کہ اس کا خود شکار کھالینا اس کی

دلیل ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں ہوا یا نہیں رہا تو اُسے حرام ہونا چاہئے۔ حدیث نے اس کو واضح کردیا کہ اس کا شکار حرام ہے کیونکہ اس کا کھانا اس کی دلیل ہے کہ اس کی تعلیم میں قصور ہے۔

(۴) قرآن کریم نے مُحرم کو مطلقاً شکار کرنا منع فرمایا ہے اور جو عمداً شکار کرے اس پر جزاء واجب کی ہے اور غیر محرم شخص کو مطلقاً شکار کی اجازت دی ہے اور اس پر کوئی جزاء واجب نہیں کی۔ اب اگر کوئی مُحرم غلطی سے شکار مار دے اس کا حکم زیر تردد رہ گیا۔ سنت نے واضح کردیا کہ یہاں عمد و خطار کا کوئی فرق نہیں۔ دونوں صورتوں میں جزا برابر ہے ہاں خطا میں گناہ نہیں۔ امام زہریؒ سے اسی طرح منقول ہے۔

(۵) قرآن نے دریا اور سمندر کا شکار حلال قرار دیا ہے اور مردار جانور کو حرام فرمایا ہے لیکن اگر سمندر کے شکار میں مچھلی مر جائے تو کیا وہ بھی مردار ہونے کی وجہ سے حرام ہوگی آپ نے فرمادیا کہ دریا کے شکار کو ذبح کرنے کی ضرورت نہیں ہے اگر اس کا شکار مر جائے تو حلال ہے۔

ان تمام مثالوں میں دونوں اصول واضح تھے سنت نے صرف یہ بتا دیا ہے کہ یہ جزئی ان دونوں حکموں میں سے کس حکم کے تحت میں درج ہونے کے قابل ہے۔ سوچو کہ اگر ان مقامات پر صرف عقلِ انسانی کو حَکَم مقرر کردیا جاتا یہ بہتر تھا، یا رسول کی معرفت خدا نے اپنی مراد خود بتا دی یہ بہتر ہوا۔ مالکم کیف تحکمون۔

حدیثِ رسول کے بیان ہونے کا ایک اور قاعدہ اور اس کی مثالیں

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک حکم کسی علت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے، حدیث اس علت کے لحاظ سے کچھ جزئیات اُس حکم کے تحت میں اور درج کردیتی ہے مثلاً

(۱) قرآن نے ربوا اور سود حرام فرمایا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں سود کی صورت یہ تھی کہ قرضخواہ قرضدار سے کہتا کہ یا میرا قرض ادا کردے ورنہ مجھے بجائے دس کے پندرہ روپیہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کو قرآن نے اس لئے حرام قرار دیا کہ یہاں بلا وجہ اپنے بھائی سے ایک زیادتی وصول کرنا لازم آتا ہے۔ اس کے مناسب حدیث نے قرض میں ہر قسم کا ناجائز نفع حاصل کرنا منع فرمادیا ہے اور اس کو بھی ایک قسم کا سود قرار دیا ہے مثلاً اگر ایک شخص نے کسی کو دو ہزار روپیہ قرض دیا اب اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس دباؤ میں اس کے مکان میں مفت رہا کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا ناجائز نفع ہے جو وہ اپنے قرض کے دباؤ میں بلاعوض حاصل کر رہا ہے۔ عقلِ انسانی یہاں مختلف فیصلے کرسکتی تھی پھر عقل کے ساتھ دوسرے ادراکات کی مزاحمت کبھی صحیح رائے قائم کرنے میں حائل بھی ہوجاتی ہے اس لئے کیا یہ بہتر نہ ہوا کہ رسول نے ایک نکھری ہوئی بات بتا دی۔

(۲) قرآن کریم نے دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنا حرام قرار دیا ہے اس کی علت یہ ہے کہ اس وجہ سے ان میں فطرۃً قطع رحمی پیدا ہوجائے گی اور دو بہنوں میں جو شرعاً صلہ رحمی واجب تھی وہ نکاح کے اس علاقہ کے بعد

قدرۃً ختم ہو جائے گی۔ حدیث نے اس علت کی وجہ سے بعض اُن رشتوں کو بھی اسی حکم میں درج کردیا ہے جہاں اس صلہ رحمی کے قطع ہونے کا خطرہ پیدا ہوتا ہے جیسے پھوپھی، بھتیجی یا خالہ بھانجی۔ چنانچہ بعض روایات میں اس کی تصریح بھی موجود ہے۔

فانکم اذا فعلتم ذلك قطعتم ارحامکم[1] اگر تم ان رشتوں میں جمع کرو گے تو ان کی باہمی ہمدردی ختم کرنے کا موجب بنو گے

منکر حدیث سمجھے گا کہ یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے لیکن منصف سمجھتا ہے کہ قرآن کے خلاف تو اس وقت ہوتی جب جمع بین الاختین کی حرمت کے خلاف ہوتی۔ یہاں تو دو بہنوں کے درمیان جمع کی حرمت کو تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اس کو ایک اصول بنا کر دوسری جگہ اور جاری کردیا گیا ہے۔ رسول نے بتایا کہ خدا کی مراد صرف یہ دو ہی رشتے نہیں بلکہ اس قسم کے اور رشتے بھی یہی حکم رکھتے ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم نے حرمتِ رضاعت میں صرف ماں اور بہن کو ذکر کیا ہے۔ ماں اصول میں ہے اور بہن اصل قریب کے فروع قریبہ میں۔ حدیث نے ماں بہن کے ساتھ اور نسبی رشتوں کو بھی شریک کیا ہے کیونکہ رضاعت کی وجہ سے جیسا ماں بہن کا رشتہ پیدا ہو سکتا ہے ایسا ہی پھوپھی اور خالہ کا رشتہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اس حرمت کا تعلق جیسا کہ عورتوں کے ساتھ ہے ایسا ہی مردوں کے ساتھ بھی قرار دیدیا ہے۔ حتیٰ کہ جس عورت کا دودھ پیا گیا ہے اس کا وہ شوہر جس کے زیر نکاح یہ دودھ پیدا ہوا ہے باپ بن جاتا ہے۔

ان تفصیلات سے ہماری غرض یہ ہے کہ آپ ان کو ملاحظہ فرما کر احادیث کے بہت بڑے ذخیرہ کا قرآن کے بیان ہونے پر عینی یقین حاصل کرلیں اور جو احادیث کہ محض سطحی نظر کی وجہ سے آپ کو قرآن کریم کے مخالف معلوم ہوتی تھیں وہ مخالف معلوم نہ ہوں۔ حافظ ابن قیمؒ نے بیانِ رسول کے دس اقسام بتلائے ہیں۔[2]

ایک سوال اور اس کا جواب

اب رہا یہ سوال کہ جن جزئیات کو کسی علتِ مشترکہ کی وجہ سے حدیث نے بیان کیا ہے اگر وہ قرآن کی مراد ہوتیں تو وہ خود ہی اُن کو بیان کردیتا محض ایک معقولی سوال ہے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ قرآن نے تمام اشیاء خود ہی کیوں نہ بیان کردیں۔ ہمارے نزدیک ہر متن شارح کے لئے کچھ جگہ چھوڑ جاتا ہے اور ہر شارح کچھ اشیاء محشی کے لئے باقی رکھتا ہے قرآن کا کمال یہ ہے کہ وہ اصولِ محکمہ قائم کرجائے اور رسول کا کمال یہ ہے کہ وہ قرآنی اصول کی ایسی تشریحات کرجائے جو اس کی مرضی کے عین مطابق ہوں۔ اس سوال کا حاصل تو یہ ہے کہ رسول کے علوم ظاہر ہونے کا کوئی محل ہی نہ رہے۔ قرآن کریم سے خود معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی رائے و اجتہاد کا بھی دین میں اعتبار ہے۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ ہم نے آپ پر سچائی کے ساتھ کتاب اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے

---

[1] رواہ ابن حبان کما فی نیل الاوطار (الموافقات۔ ج ۳ ص ۱۹۲)۔ [2] اعلام الموقعین ج ۲ ص ۲۳۸۔ ملاحظہ فرمائیے

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللهُ درمیان اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ آپ کو سمجھائے۔

رسول کی رائے کو یہ رتبہ اس لئے حاصل ہے کہ یہ رائے بھی خدا کی ارادہ سے پیدا ہوتی ہے پس جو اصول کہ خدا نے بتائے یا اس کے رسول نے اس کی کتاب سے خدا کی ارادہ کے بعد سمجھے دراصل وہ سب خدا ہی کی طرف سے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ بعض قانون کے الفاظ بھی الہی الفاظ ہیں اور بعض کے الفاظ خواہ رسول کے ہوں مگر وہ بھی بلا شبہ خدا تعالیٰ کی منشا کے مطابق اور اس کی آرا، ۃ کے تابع ہوتے ہیں۔ دین کی اس طرح تکمیل میں رسول کے علوم و کمالات کے اظہار کے سوا شاید یہ حکمت بھی ہو کہ اگر دین کا ایک ایک جزء ضبط قرآن میں آجاتا تو یہ تمام اجزا اہمیت میں یکساں ہو جاتے اور شاید قانون یسر کے خلاف ہوتا وہ چاہتا ہے کہ دین میں سہولت رکھی جائے اس لئے کچھ مسائل تو منصوص ہو گئے وہ اعلیٰ درجہ کے قطعی سمجھے گئے۔ اس میں کسی کو خلاف کرنے کی گنجایش ہی نہیں دی گئی اس کے بعد دوسرے نمبر کے مسائل حدیث سے ثابت ہوئے وہ قطعیت میں پہلی قسم سے کمتر ہے پھر راویوں کے اختلافات نے یہاں کچھ اور وسعت پیدا کر دی اس کے بعد احادیث کے اشارات کو جب ائمہ نے پھیلایا تو وہ مسائل اجتہادیہ کہلائے اور چونکہ یہاں خدا کی ارادہ کا وعدہ بھی نہ تھا اس لئے اختلاف اور خلاف کو یہاں پوری وسعت مل گئی یہ تینوں مراتب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی موجود تھے مگر حکم کا خلاف کبھی معاف نہیں کیا گیا اور اجتہادی غلطی پر کبھی گرفت نہیں کی گئی۔ ان اختلافِ مراتب کی وجہ سے دین ایک نہایت معتدل صورت میں مکمل ہو گیا اب وہ ہر چھوٹی بڑی ضرورت پر حاوی بھی ہے پھر اتنی وسعت بھی رکھتا ہے کہ معمولی فروگذاشت، انسانی ضعف سب اس میں کھپ سکتا ہے۔ معتزلہ نے دین کو مجرد کر کے اپنے خیال میں تمام تر قطعی بنیادوں پر قائم کر دیا مگر نتیجہ کیا ہوا، آخر انھیں مرتکبِ کبیرہ کو دائرہ اسلام سے خارج کہنا پڑا، خوارج نے دین کی تمام بنیاد قرآن پر قائم کرنے کا ارادہ کیا آخر انھیں بھی مسلمانوں کو کافر بنانا پڑا۔ کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ تمہارے لئے دین میں کوئی وسعت باقی نہ رہے۔

اتباعِ قرآن کے مفہوم میں ایک غلط فہمی

مولانا اسلم صاحب کو یہاں چند آیات کے مفہوم سمجھنے میں خواہ مخواہ کے لئے غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے وہ آیاتِ ذیل کے متعلق یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان میں صرف قرآن ہی کو دستور العمل بتایا گیا ہے اور اس لئے حدیث پر عمل کرنا اُن کے خلاف ہے حالانکہ اُن آیات کو حدیث سے دور کا بھی کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اُن سب آیات کا مفہوم صرف یہ ہے کہ خدا کے حکم کو چھوڑ کر خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنا یا دوسرے لوگوں کی رائے کی اتباع کرنا نہیں چاہئے۔ مولانا اسلم نے ان کا رُخ خواہشاتِ نفس اور عوام الناس سے پھیر کر خود

ﻠﮧ حافظ ابن قیم "بما اراك الله" کے لفظ میں ایک لطیف نکتہ بیان فرما گئے ہیں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں "بما رأیت" اسی لئے نہیں فرمایا گیا کہ دین کے معاملہ میں اطاعت صرف خدا اور رسول کی ہے حتی کہ رسول بھی یہاں اپنی ذاتی رائے کو کوئی نہیں رکھتے۔ ہاں اس کی رائے بھی خدا کی ارادہ کے تابع رہتی ہے۔

(اعلام ج ۱ ص ۱۹۸)

اللہ تعالیٰ کے رسول ہی کی طرف سمجھ لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ — اس کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لئے

وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ — اتارا گیا ہے اور اس کے سوا، اولیا کی پیروی نہ کرو۔

یہاں من دونہ اولیاء میں رسول کو بھی داخل کر لینا قرآن سے انتہائی بدمذاقی کی دلیل ہے یہ لفظ قرآن کریم میں رسولوں کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ رسول خود اللہ تعالیٰ کے داعی ہوتے ہیں قرآن نے کبھی ان کو مخالف پارٹی میں شمار نہیں کیا اور اسی بات کے صاف کرنے کے لئے کہ رسول کی اطاعت من دون اللہ کی اطاعت ہے یا اللہ کی یہ صاف طور پر فرمادیا کہ

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللہَ — جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

پس رسول کی اطاعت کو من دون اللہ کی اطاعت سمجھنا خود قرآن کے صریح خلاف ہے چہ جائے کہ اس پر الٹا قرآن سے استدلال کیا جائے۔ اس سے بڑھ کر غلط فہمی یہ ہے کہ جن آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی اتباع کا امر فرمایا گیا ہے وہ حدیث کی اتباع کے خلاف سمجھی جائیں۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ — اس کی پیروی کیجئے جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر وحی کی گئی

یہاں شاید ما اوحی کے لفظ سے صرف قرآن مراد لے لیا گیا ہے حالانکہ قائلین حدیث، حدیث کو بھی ایک قسم کی وحی کہتے ہیں رسولوں پر کتاب اللہ کے علاوہ اور بھی بہت سے قسم کی وحی اترا کرتی ہے حتیٰ کہ بعض انبیاء پر کوئی کتاب نازل ہی نہیں ہوئی اور یقیناً وحی ان پر بھی اتری ہے پس قرآن اور حدیث کے دو مختلف نام انہوں کے طبقہ میں ہیں رسول کے حق میں چونکہ دونوں بذریعہ وحی ہیں اس لئے دونوں ما اوحی الیک من ربک میں داخل ہیں

دنیا کی تاریخ میں کبھی کسی بادشاہ نے ایسا نہیں کیا کہ پہلے اپنے کسی معتمد شخص کو اپنا سفیر مقرر کر لیا ہو پھر بحالت سفارت ہی اس کے متعلق ایسے احکام بھی بھیجے ہوں جو اس پر بداعتمادی کی مہر لگا دیں اگر من دون اللہ کی اطاعت میں رسول بھی داخل مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو اپنے رسول پر بھی یہ شبہ ہے کہ وہ دنیا میں جا کر شاید میرے احکام کے سوا، اپنی اتباع کی دعوت دیتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ سے ایک طرف تو مخلوق کو اپنی اطاعت کے احکام دیتا ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی تنبیہ کر دیتا ہے کہ رسول کی اتباع مت کرنا کیونکہ وہ من دون اللہ کی اتباع ہوگی۔ اگر درحقیقت رسول کی اطاعت خدا کے مخالف اطاعت ہے تو پھر آیت ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی کا کیا مطلب ہے۔ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی محبت کا معیار قرآن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ رسول کی اتباع کی جائے۔ جو قرآن اس تاکید کے ساتھ رسول کی اتباع کا حکم دے رہا ہے بھلا وہ اسکے اتباع کو من دون اللہ کی اتباع کب کہہ سکتا ہے۔ اگر منکرین حدیث یہ سمجھ لیتے کہ خدا اور رسول کا رشتہ

ناقابلِ انقطاع ہے۔ یہاں اطاعت و معصیت میں تفریق سمجھنا ہی غلط ہے تو حدیث و قرآن میں بھی تفریق پیدا نہ کرتے۔ اب آئیے دوسری قسم کی آیات ملاحظہ فرمائیے جو اس بات کی تصریح کرتی ہیں کہ یہ آیات اتباعِ اہواء سے روکنے کے لئے نازل ہوئی ہیں نہ کہ اتباعِ رسول سے۔

ثم جعلناک علیٰ شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون — پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک راستہ پر لگا دیا ہے تو آپ کا پیچھے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے جو کچھ علم نہیں رکھتے۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ اتباعِ شریعت کا امر لوگوں کی خواہشات کی اتباع سے روکنے کیلئے دیا گیا تھا نہ کہ حدیث کی اتباع سے۔ جو نبی کہ لوگوں کے تمام معاملات میں حکم مقرر کیا گیا ہو اس کے پاس سینکڑوں قسم کے لوگ، ہزاروں قسم کے مقدمات آتے ہوں، ہر شخص اپنی چرب زبانی سے اسے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا ہو اسے ربانی تربیت اس قسم کے نازک موقعوں پر تنبیہ کرتی رہتی تھی کہ خبردار رہے: دوسری جگہ فرمایا

فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون اھواءھم — اگر یہ لوگ آپ کے کہنے کے مطابق کرنہ دکھائیں تو سمجھ لیجئے کہ صرف اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔

یہاں حصر کے طور پر بتا دیا گیا ہے کہ جو لوگ آپ کا اتباع نہیں کرتے ان کے متعلق یہ یقین کرلینا چاہئے کہ وہ اپنی خواہشات ہی کا اتباع کرتے ہیں۔ غرض تمام قرآن میں کبھی رسول کی اطاعت کا صراحۃً حکم دیا گیا ہے کبھی اس کی اطاعت کو بعینہٖ خدا کی اطاعت کہا گیا ہے اس کے خلاف ایک آیت میں بھی اس کی اطاعت کی ممانعت نہیں کی گئی اور جہاں صرف قرآن یا وحی کے اتباع کا امر کیا گیا ہے وہاں کسی شبہ و تردد کے بغیر صرف خواہشات اور قرآنی حکم کے خلاف اتباع کرنے کی ممانعت مقصود ہے۔

حدیث کی تشریعی حیثیت

قرآن و حدیث کا ربط معلوم کرلینے کے بعد اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ حدیث کی حیثیت صرف تشریعی حیثیت ہے کیونکہ احادیث کا تمام ذخیرہ قرآن کریم کا بیان اور اس کی شرح ہے۔ پس اگر قرآن کی حیثیت تشریعی ہے تو اس کے بیان کی حیثیت بھی تشریعی ہونی چاہئے۔ یہی عقیدہ صحابۂ کرام سے لے کر آج تک تمام امت کا ہے حدیث کا انکار اگرچہ بداہت کا انکار ہے مگر حدیث کو تسلیم کرکے اس کی تشریعی حیثیت کا انکار اس سے بڑھ کر بداہت کا انکار ہے۔ احادیث کا بڑا حصہ اگرچہ متواتر نہیں مگر یہ عقیدہ بلاشبہ متواتر عقیدہ ہے کہ مسلمانوں میں حدیث کی حیثیت ہمیشہ تشریعی حیثیت تسلیم کی گئی ہے، کافر اور مسلمان اس بارے میں دو رائیں نہیں رکھتے۔ کیا یہ کوئی باور کرسکتا ہے کہ دورِ سلف سے لیکر آج تک لیل و نہار حدیث کے حفظ کا یہ شغل صرف ایک تاریخ کی حیثیت سے تھا۔

عہدِ صحابہ میں حدیث کی حیثیت

اس موضوع کے دو پہلو ہیں۔ پہلا وہ واقعات ہیں جن سے صحابہ کے دور میں حدیث کی

تشریعی حیثیت واضح ہوتی ہے اور اس کا دوسرا پہلو وہ واقعات ہیں جن سے اس کے خلاف نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔
ہمارے نزدیک صحابہ کے دور میں حدیث کے تشریعی حیثیت کا ہونا اس قدر واضح ہے کہ اس پر گفتگو کرنا بدیہی کو نظری بنانا ہے۔ ہمارے علم میں ایک واقعہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ان کے نزدیک حدیث کی حیثیت تاریخی حیثیت تھی بلکہ انکارِ حدیث کا پہلا قدم ہی اس کی دلیل ہے کہ اس وقت حدیث کی تشریعی حیثیت سمجھی جاتی تھی۔ اگر حدیث صرف ایک تاریخ کی حیثیت رکھتی اور دین کے حلال و حرام سے اُسے کوئی سروکار ہی نہ ہوتا تو معتزلہ کو حدیث کے انکار کی کوئی وجہ ہی نہ تھی پھر معتزلہ کی ایک بڑی جماعت نے جب صحیح حدیث کے لئے عزیز ہونا شرط کیا تو اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ان کے درمیان اگر بحث تھی تو حدیث کی ظنیت و قطعیت کے متعلق تھی نہ کہ تشریعی یا تاریخی حیثیت کی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلا اختلاف آپ کے دفن کے متعلق ہوا لیکن کیا اس کے خلاف کوئی ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے کہ اس مسئلہ کا فیصلہ اس حدیث کے سوا جو اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے پڑھ کر سنائی کسی اور دلیل سے کیا گیا تھا کیا تاریخ سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ اس وقت ایک آواز بھی حدیث کے اس فیصلہ کے خلاف اٹھائی گئی، سب نے اسی کو تسلیم کیا اور اسی کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین عمل میں آئی۔

صحیح بخاری میں موجود ہے کہ حضرت عمرؓ چونکہ مدینہ سے باہر رہتے تھے اس لئے انھوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ ایک دن وہ خود آپ کی مجلس میں حاضر ہوتے اور آپ سے احادیث سنتے دوسرے دن اپنے ایک پڑوسی کو بھیجدیتے وہ آتا اور اس دن کی احادیث سن کر حضرت عمرؓ کو پہنچا دیتا۔ کیا یہ اہتمام ایک معمولی تاریخ کی حفاظت کے لئے ہی کیا گیا تھا اس کے علاوہ خلیفۂ اول سے لیکر خلفاء کے آخری دور تک جب کبھی مذہبی اور سیاسی نزاع پیش آئے تو ہمیشہ جانبین سے قرآن و حدیث ہی پیش کی گئی ہیں حتی کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ میں بھی دونوں طرف سے اپنی اپنی حقانیت میں حدیثیں ہی پڑھی گئی ہیں۔

صحابہ کی نظر میں احادیث کی اہمیت کی چند مثالیں

(۱) حضرت صدیق اکبرؓ نے جب مانعینِ زکوٰۃ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمرؓ اس میں مانع ہوئے اور اُن کے خلاف میں حدیث ہی سے استدلال فرمایا حضرت عمرؓ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ اس کے سامنے گردن تسلیم خم کردی۔

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے پاس ایک عورت آئی اور اپنے پوتہ کے ترکہ میں حصہ مانگنے لگی، انھوں نے فرمایا کہ میں تیرا حصہ کتاب اللہ میں نہیں پاتا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دادی کو ۱/۶ چھٹا حصہ دلوایا۔ فرمایا کہ تمہارے اس قول پر کوئی شاہد ہے؟ محمد بن مسلمہ بولے میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے دادی کو ۱/۶ دلوایا ہے آپ نے اُن کی شہادت پر فیصلہ کردیا۔

(۳) حضرت عثمان غنیؓ نے . . . .
فریعہ بنت مالک بن سنان کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور ان سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں کیا حکم دیا تھا جب انھیں معلوم ہوا کہ آپ نے اسی گھر میں عدت گذارنے کا حکم دیا تھا تو اسی کے موافق انھوں نے بھی فیصلہ صادر کر دیا۔

(۴) حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ بی بی کو اپنے شوہر کی دیت سے وراثت نہ ملنی چاہئے لیکن جب ضحاک بن سفیان نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیتِ زوج سے بھی وراثت دلوائی ہے تو اپنے قول سے رجوع فرمالیا۔

(۵) مجوس سے جزیہ لینے کے متعلق حضرت عمرؓ کو تردد تھا لیکن جب عبدالرحمن بن عوف نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسِ ہجر سے جزیہ لیا ہے تو انھوں نے اپنے خیال سے رجوع فرمایا۔

(۶) طاؤس روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا کہ کیا کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کچھ سنا ہے کہ اگر جھگڑے میں کسی عورت کا حمل ساقط ہو جائے تو اس کی جزا کیا دینی چاہئے تو حمل بن مالک کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ ایک مرتبہ دو عورتوں میں لڑائی ہو گئی ایک نے دوسرے کے خیمہ کی چوب ماری جس کے صدمہ سے دوسری عورت کا حمل ساقط ہو گیا۔ مقدمہ آپ کے سامنے آیا آپ نے اس پر پانچ سو درہم بطور دیت لازم فرمائے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ہم یہ حدیث نہ سنتے اور اپنی رائے سے فیصلہ کرتے تو شاید اس کے خلاف فیصلہ کرتے۔

(۷) حضرت ابنِ عمرؓ مخابرہ (مزارعت کی ایک صورت ہے) کیا کرتے تھے جب رافع بن خدیجؓ نے اس کی ممانعت روایت کی تو انھوں نے مخابرہ کرنا چھوڑ دیا۔

(۸) حضرت زیدؓ حائضہ کے لئے بھی طواف صدر کرنا واجب سمجھتے تھے لیکن جب ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف صدر ترک کرنے کی اجازت دی ہے تو اپنے قول سے رجوع کر لیا۔

(۹) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں ایک غلام فروخت ہوا بعد میں مشتری کو اس میں کوئی عیب ثابت ہوا اس نے واپسی کا دعوی کیا جو آمدنی ان ایام میں غلام کے ذریعہ سے ہوئی اس میں جھگڑا ہوا کس کو دی جائے اُن کی رائے یہ ہوئی کہ وہ آمدنی بائع کو دی جائے لیکن جب حضرت عائشہؓ نے اسی قسم کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ یہ نقل کیا کہ آمدنی مشتری کو ملنا چاہئے کیونکہ اس درمیان میں اگر غلام مرجاتا تو نقصان مشتری ہی کا ہوتا لہذا جس کا نقصان ہوتا نفع بھی اسی کو ملنا چاہئے۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنی رائے سے رجوع کیا۔

یہ تمام واقعات کتب سنن مشہورہ میں موجود ہیں اور امام شافعیؒ نے اس کو باسناد روایت کیا ہے، چونکہ ہماری

غرض یہاں ان مسائل کا اثبات نہیں صرف تاریخی حیثیت سے یہ بتانا ہے کہ صحابہ کے درمیان حدیث کی حیثیت کیا سمجھی جاتی تھی اس لئے ہم نے ان کی اسانید کے متعلق کلام کرنا غیر ضروری سمجھا ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ اگر محدثین نے یہ واقعات کسی ایک باب کے تحت میں شمار کئے ہوتے یا یہ واقعات ایک ہی صحابی کے ہوتے تو شاید یہ شبہ کیا جا سکتا تھا کہ عمداً اسی مقصد کے پیشِ نظر کسی نے وضع کر دیئے ہوں مگر جب قتال، حج، جنایت، بیع، وراثت، عدت، مزارعت، غرضکہ شریعت کے تمام ابواب میں ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن سے حدیث کی حیثیت صرف تشریعی ثابت ہوتی ہے پھر کسی ایک دور میں نہیں بلکہ ہر دور میں یہی عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ سے لے کر حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت تک ہر دور میں حلال و حرام کے مسائل میں ہمیشہ حدیثیں ہی پیش کی گئیں تو اب حدیث کی تشریعی حیثیت کا انکار آنکھوں میں خاک جھونکنا نہیں تو اور کیا ہے۔

(۱۰) بلال حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے بیان کرتے ہیں کہ ایک دن اُن کے والد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے عورتوں کو مسجد میں نماز کے لئے جانے سے روکنے کی ممانعت فرمائی ہے میں نے عرض کیا کہ قبل اب زمانہ نازک ہے میں تو اپنی بی بی کو روکوں گا۔ ابن عمرؓ میری طرف متوجہ ہوئے اور تین مرتبہ لعنک اللہ فرما کر کہا تیرے کان ہیں یا نہیں، میں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تو یہ جواب دیتا ہے'' بعض روایات میں ہے کہ پھر اُن سے ابن عمرؓ نے عمر بھر بات نہیں کی۔

(۱۱) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تمتع کیا ہے۔ عروہ نے عرض کیا کہ شیخین تو تمتع کی ممانعت کرتے تھے اس پر حضرت ابن عباسؓ کو غصہ آگیا اور فرمایا کہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہا ہوں اور تم ابوبکرؓ و عمرؓ کا نام لیتے ہو، میرا گمان ہے کہ ان باتوں سے تباہی آئے گی۔

(۱۲) ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ مجھے امیر معاویہؓ کے بارے میں کون معذور رکھے گا کہ میں ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث روایت کرتا ہوں وہ ادھر سے مجھے اپنی رائے بتاتے ہیں جہاں وہ رہیں اب میں اس سرزمین پر رہنا بھی پسند نہیں کرتا۔ [۱]

اگر اس قسم کی احادیث جمع کی جائیں تو مستقل ایک تصنیف بن سکتی ہے مگر ہم نے صرف چند واقعات اس لئے پیش کئے ہیں کہ مولوی اسلم صاحب کا یہ سمجھانا کہ صحابہ کے دور میں بھی حدیث کی حیثیت تاریخی سمجھی جاتی تھی، صحابہ پر بہت بڑا بہتان ہے۔ ان کی تاریخ کا ایک ایک ورق اس کی تردید کرتا ہے۔

حدیث کی تشریعی حیثیت کا ایک اور ثبوت

اس کے علاوہ ابو عمرؒ نے اس پر مستقل ایک فصل قائم کی ہے کہ بعض تابعین بے وضو یا لیٹ کر حدیث سنانا مکروہ سمجھتے تھے۔ ضرار بن مرہ فرماتے ہیں، ہمارے زمانہ میں دستور یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث وضو کئے بغیر بیان کرنا مکروہ سمجھا جاتا تھا۔ اعمش کا طریقہ یہ تھا کہ اگر انھیں بے وضو حدیث

[۱] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۹۲۔

بیان کرنے کی نوبت آتی تو تیمم کر لیتے۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں حدیث بیان کرنے کے لئے وضو کرنا مستحب سمجھا جاتا تھا۔ شعبہ فرماتے ہیں کہ قتادہ وضو کئے بغیر حدیث کی روایت نہ کرتے تھے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ جعفر بن محمد جب حدیث کی روایت کرتے تو باوضو کرتے۔ ابومصعب فرماتے ہیں کہ خود امام مالکؒ کا طریقہ بھی یہی تھا۔ عبدالرحمٰن بن ابی الزناد فرماتے ہیں کہ ایک دن سعید بن المسیب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کرنے کا ارادہ کیا یہ اس وقت بیمار تھے اور لیٹے ہوئے تھے فرمایا مجھے بٹھاؤ لیٹے لیٹے حدیث بیان کرنا مجھے بہت مکروہ معلوم ہوتا ہے[1]

یہ وہ جماعت ہے جس نے خود صحابہ سے ہی علم حاصل کیا ہے ان کے طور وطریق کو دیکھا ہے اگر ان کے علم میں صحابہ کے نزدیک حدیث کی حیثیت صرف ایک تاریخ کی ہوتی تو کیا وہ اس کا یہ احترام کرتے۔ امام زہریؒ جو بہت بڑے تابعین میں شمار ہیں فرماتے ہیں کہ ہمیں اہل علم صحابہ سے یہ عقیدہ معلوم ہوا ہے۔

الاعتصام بالسنن نجاۃ[2] سنت پر عمل کرنا نجات اسی میں ہے

درحقیقت حدیث کو محض تاریخ کے برابر سمجھنا اس کی سب سے بڑی توہین ہے اور اس کی نہیں بلکہ اس کے قائل کی توہین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کو رسول کی حیثیت بھی ایک امیر کے برابر کر دینا پڑی ہے میرے خیال میں یہ بھی اس تواتر کے خلاف ہے جو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مسلم اور کافر میں مشترک ہے۔ سب جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں جو حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیشہ سمجھی گئی وہ امیر کی حیثیت نہ تھی بلکہ صرف ایک رسول کی حیثیت، بلکہ رسولوں میں بھی سب سے افضل رسول کی حیثیت تھی۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حدیث کی حیثیت کا انکار اور رسول کی حیثیت کا انکار دو مسئلے نہ سمجھنے چاہئیں۔ درحقیقت یہ ایک ہی مسئلہ ہے۔ جو شخص حدیث کی تشریعی حیثیت تسلیم نہیں کرتا اس کو رسول کی تشریعی حیثیت سے انکار کرنا بھی لازم ہے۔ اسی لئے منکرین حدیث کا یہ عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب رسالت صرف تبلیغ قرآن پر ختم ہو جاتا ہے۔ گویا آپ کی حیثیت ایک پوسٹ مین سے زیادہ حیثیت نہ تھی والعیاذ باللہ۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ قرآن میں رسول کی حیثیت کیا ہے۔

قرآن میں رسول کی حیثیت

رسولوں کا تقرر خدا خود فرماتا ہے۔ امیر و حکام کی طرح ان کا تقرر مخلوق نہیں کرتی نہ مخلوق کے مشوروں کی اس میں کوئی رعایت کی جاتی ہے نہ اس کا انھیں حقدار سمجھا جاتا ہے۔

(۱) اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں میں اور انسانوں میں رسول اپنے ہی پسند سے بناتا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ یہ منصب براہ راست خدا کے انتخاب پر موقوف ہے، بندوں کے سپرد نہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس منصب کے لئے تمام مخلوقات میں صرف دو نوع کا انتخاب عمل میں آیا ہے فرشتے اور

[1] جامع بیان العلم ۲۵ [2] ایضاً ۲

انسان، اس لئے بظاہر جنات میں کوئی رسول نہیں ہوا۔ شاید اس معاملہ میں بھی وہ انسانوں کے تابع رہتے ہیں۔
غرض رسالت کا معاملہ رزق کی طرح صرف خدائی تقسیم پر موقوف ہے اسی لئے جب کفار مکہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں اپنی رائے زنی شروع کی تو نہایت تحمیق کے لہجہ میں یہ کہکر ان کو خاموش کردیا گیا۔
أَهُمْ يَقْسِمُونَ رَحْمَتَ رَبِّكَ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ. یعنی نبوت ورسالت رزق کی طرح ربوبیت کا حق ہے جب رزق کی تقسیم اس نے کسی کے حوالہ نہیں کی اپنے ذمہ رکھی ہے تو نبوت کی تقسیم بھی ایسا ہی سمجھنا چاہئے۔ پھر یہ کہ نبوت ایک رحمت ہے اور رحمت کی تقسیم کا حق رحمٰن ہی کو ہو سکتا ہے جو خود رحمت کے محتاج ہوں وہ نبوت جیسی بڑی رحمت کی تقسیم کے ٹھیکیدار کیسے بن سکتے ہیں۔

(۲) اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ یہ بات خدا ہی خوب جانتا ہے کہ اُسے اپنا رسول کسے بنانا ہے۔
علماء لکھتے ہیں کہ آیتِ بالا سے معلوم ہوا کہ رسالت صرف وہبی ہے کسبی نہیں۔ یعنی عبادات وریاضات سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جس میں چاہے نبوت ورسالت کی اہلیت رکھدیتا ہے۔ ہمارے نزدیک آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منصبِ رسالت ونبوت جن خصوصیات کی بناء پر مرحمت ہوتا ہے اُن کا علم بھی سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں۔ اور اُن کا انتخاب کوئی دوسرا نہیں کرسکتا۔ امام اور امیر کی خصوصیات اور شرائط معلوم ہیں اس کا انتخاب بھی مسلمانوں کے سپرد ہے اور اسی لئے اُن کے عزل کردینے سے وہ معزول بھی ہو سکتا ہے۔
(۳) چونکہ قدرت خود ان کا انتخاب کرتی ہے اس لئے خود ہی ان کی تعلیم کا انتظام بھی کرتی ہے۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ۔ ہاں پڑھئے اس پروردگار کے نام کی برکت سے پڑھئے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے۔
(۴) وہ پڑھا کر خود انھیں یاد کراتی ہے اگر اس میں کچھ حصہ وہ بھول جاتے ہیں تو وہ بھی اسی کی مشیت کے ماتحت ہوتا ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ۔ ہم آپ کو پڑھائیں گے پھر آپ نہ بھولیں گے بجز اس کے جس کو خدا چاہے۔
(۵) اس وحی کے بیان کی بھی وہ خود ہی متکفل ہوتی ہے۔ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ اس کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔
(۶) جس طرح وہ ان کی تعلیمی تربیت کرتی ہے اسی طرح اُن کی اخلاقی تربیت بھی خود ہی کرتی ہے اسی لئے عین بداخلاقی کے دور میں وہ ایسے بلند اخلاق کے مالک ہوتے ہیں جہاں دنیا اپنے پورے عروج کے بعد بھی نہیں پہنچتی۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا۔	لوگوں کے ساتھ بے رخی نہ کیجئے اور زمین پر اترا کر نہ چلئے۔
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهٗ	جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار کی یاد صرف اسی کی رضاجوئی کے لئے کرتے ہیں آپ اپنی نشست وبرخاست اُن ہی میں رکھئے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔	مومنوں کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آیئے۔
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ	دنیا کی زندگی کی جو رونق ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو صرف
أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔	کام چلانے کے لئے دی ہے اس کی طرف نظر نہ کیجئے۔
لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ	آپ اپنا ہاتھ اپنی گردن کی طرف سمٹا ہوا نہ رکھئے نہ اس کو بالکل
وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ۔	کھولئے (بلکہ خرچ کرنے میں میانہ روی رکھئے۔

(۷) جس طرح وہ ان کی تعلیمی اور اخلاقی نگہبانی کرتی ہے اسی طرح کبھی اس کی جسمانی تحفظ کی ذمہ داری خود بن جاتی ہے۔

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ آپ غم نہ کریں تبلیغی فرائض کھلے طور پر انجام دیں لوگوں سے آپ کی حفاظت کرنیوالا اللہ خود ہے حدیث میں ہے کہ اس سے پہلے شب میں آپ کی پہرہ داری کی جاتی تھی۔ اس آیت کے نزول کے بعد آپ نے پہرہ منسوخ کر دیا اور خیمہ سے باہر منہ نکال کر فرمایا کہ جاؤ میری حفاظت کا اللہ تعالیٰ کفیل ہو چکا ہے اب مجھے کسی کی حفاظت کی ضرورت نہیں رہی۔

(۸) اس سے بھی بڑھ کر وہ ان کے عواطف و میلانِ قلبی کی بھی نگران رہتی ہے۔

وَلَوْلَا أَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدْتَّ	اگر ہم آپ کو تھام نہ لیتے تو کچھ نہ کچھ آپ ان کی طرف
تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا۔	جھک چلے تھے۔

چونکہ انبیاء علیہم السلام کے عزائم اور افعال تو در کنار قلبی خطرات بھی قدرتِ الٰہیہ کے زیر نگرانی رہتے ہیں اس لئے امت ان کے متعلق معصوم ہونے کا عقیدہ رکھتی ہے یہ صفت صرف نبی و رسول کی ہے کسی امیر و حاکم کے متعلق عصمت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

(۹) اسی خصوصیت کا اعلان کرنے کے لئے یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ان کی غلطی عام انسانوں کے برابر نہیں ہوتی اگر وہ خدا کے متعلق ایک بات بھی جھوٹ کہیں تو نہایت بے دردی سے ان کو ہلاک کر دیا جائے اور دنیا کے دوسرے جھوٹوں کی طرح کبھی ان کو مہلت نہ دی جائے لیکن کسی امیر و حاکم کے متعلق یہ شدت نہیں کی گئی، اسی لئے رسولوں میں کوئی جھوٹا نہیں گذرا اور سیکڑوں حاکم جھوٹے اور ظالم گذر چکے ہیں۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا	اگر بالفرض آپ ہماری طرف کوئی بات بھی اپنی طرف سے لگاتے
مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ	تو ہم آپ کا دایاں ہاتھ پکڑ کر آپ کی رگِ جان کاٹ ڈالتے۔

(۱۰) اس ربانی تربیت و تعلیم، عصمت اور ہمہ وقت نگرانی کی وجہ سے اس کی جو بات ہوتی ہے خواہشِ نفس سے پاک اور صاف ہوتی ہے۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ — وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا جو بولتا ہے وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو اس پر بھیجی جاتی ہے۔

(۱۱) انھیں رائے کی عصمت بھی حاصل ہوتی ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ۔ (نساء) — ہم نے آپ پر قرآن سچائی کے ساتھ اتارا ہے تاکہ آپ لوگوں کے معاملات میں اس رائے کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھائے۔

رسول کے سوا کسی کے ساتھ یہ وعدہ نہیں ہے کہ مخلوق میں فیصلہ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ خود ان میں سمجھ پیدا کردیتا ہے۔

(۱۲) خواہشاتِ نفس سے پاکیزگی خطرات ورائے کی اس عصمت کی وجہ سے وہ عالم کے لئے مجسم نمونۂ عمل بنتے ہیں یہاں حق وناحق کی تفصیل، نیکی اور معصیت کی تقسیمیں سب ختم ہوجاتی ہیں وہ جو بھی کہدیتے ہیں سب خواہشاتِ نفس سے پاک اور جو کرتے ہیں وہ سب نیکی ہی نیکی ہوتی ہے اس لئے ان کی ہستی آنکھ میچ کر قابلِ اتباع ہوتی ہے عالموں کی طرح یہاں کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہوتا اسی لئے فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب) — ہر قوم کے لئے اپنے پیشوا نمونہ ہوتے ہیں تمہارے لئے بہترین نمونہ خدا کا یہ رسول ہے۔

(۱۳) ان کے قلب میں امت کے لئے انتہائی رحمت اور خیر خواہی ڈالدی جاتی ہے حتی کہ پھر ان کو اپنی امت سے اتنی محبت پیدا ہوجاتی ہے جتنی خود کسی کو اپنے نفس سے نہیں ہوتی۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ — نبی کو مومنین مسلمان کی جانوں سے بھی زیادہ محبت ہے

---

[1] مولوی اسلم صاحب اس آیت کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں حالانکہ یہاں رسول کی صفت نطق کی مطلقاً مدح مقصود ہے قرآن کریم پڑھنے کے لئے تمام جگہ تلاوت یا قرات کا لفظ مستعمل ہوا ہے اگر یہاں قرآن مراد ہوتا تو وما ینطق کی بجائے وما یتلو یا وما یقرأ کا لفظ ہونا چاہئے تھا۔ منکرینِ حدیث چونکہ حدیث کے سرے سے مخالف ہیں اس لئے وہ رسول کو کسی ایسی صفت کے ساتھ موصوف دیکھنا نہیں چاہتے جس کے بعد اس کو عام امراء وحکام سے کوئی خصوصی امتیاز حاصل ہوجائے۔ اصل یہ ہے کہ رسول اپنی ذات اور تمام صفات میں عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے اس لئے اس کے کان وہ سنتے ہیں جو عام مخلوق کے کان نہیں سنتے۔ اس کی آنکھیں وہ دیکھتی ہیں جو عام آنکھیں نہیں دیکھتیں۔ اسی لئے فرمایا انی اری مالا ترون۔ یہی حال اس کے نطق کا ہے اسی لئے آپ نے اپنے منہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ اس منہ سے حق بات کے سوا کبھی کچھ نہیں نکلتا حتی کہ اپنی خوش طبعی کے متعلق بھی فرمایا انی لا اقول الا حقا (میں خوش طبعی میں بھی سچی بات کہتا ہوں) اسی لئے فرمایا کہ غصہ اور رضامندی کے ہر حال میں جو میرے منہ سے نکلے سب لکھ لو، وہ حق ہی حق ہوگا۔ جب اس کے عام نطق کا حال یہ ہے تو جو قرآن اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ صدق وصفا کی کس منزل پر ہوگا۔ یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں قرآن نے آپ کے کسی خاص بات کہنے کے متعلق صفائی پیش نہیں کی یعنی وما ینطق بالقرآن وغیرہ نہیں فرمایا بلکہ مفعول کو حذف کیا ہے لہذا بلاغت کے قاعدہ کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں مفعول مقصود ہی نہیں بلکہ صرف آپ کی صفتِ نطق کی پاکیزگی بتلانا منظور ہے یہاں تفتازانی نے جو تقریر ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون میں کی ہے دیکھ لی جائے۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ اَنْ لَا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء) — شاید آپ اپنی جان ہلاک کر دینگے اس غم میں کہ وہ ایمان کیوں نہیں لائے

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ) — تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک رسول آیا ہے ایسا مہربان کہ جو تمہیں تکلیف پہنچے وہ اس پر بھاری ہے تمہاری ہی خواہی کا حریص ہے اور مومنین پر بڑا شفیق اور مہربان ہے۔

(۱۴) امت پر اس کا احترام اتنا واجب ہوتا ہے کہ اس کی بیبیاں ان کی ماؤں کے برابر سمجھی جاتی ہیں جیسا اپنی ماں سے نکاح درست نہیں ہوتا ایسا ہی نبی کی وفات کے بعد اس کی ازواج سے نکاح کرنا درست نہیں ہوتا۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ۔ (احزاب) — نبی کو مومنین سے ان کی جانوں سے زیادہ تعلق ہے اور اس کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں۔

اس کے سامنے آگے بڑھ کر کوئی بات کہنا ممنوع ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ۔ (حجرات) — اے ایمان والو آگے نہ بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔

اس کے سامنے اونچی آواز سے بولنا اس کو عام انسانوں کی طرح آوازیں دینا حبطِ عمل کا موجب ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (حجرات) — اے ایمان والو اونچی نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے اور اس سے نہ بولو تڑخ کر جیسے ایک دوسرے کے سامنے تڑخ کر بولا کرتے ہو، کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ (نور) — رسول کو آپس میں اس طرح مت پکارو جیسا ایک دوسرے کو پکارتے ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (حجرات) — جو لوگ آپ کو دیوار کے باہر سے پکارتے ہیں وہ اکثر عقل نہیں رکھتے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ — اگر وہ اتنی دیر انتظار کر لیتے کہ آپ باہر آجائیں تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔

حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ رسول کی آواز سے اپنی آواز اونچا کرنا جب عمل کو اکارت کر دیتا ہے تو اس کے احکام کے سامنے اپنی رائے کو مقدم کر دینا اعمالِ صالحہ کے لئے کیونکر تباہ کن نہ ہوگا۔ (اعلام۔ ج ا ص ۴۲)

(۱۵) ان کے ساتھ بیعت کرنا خدا سے بیعت کرنا ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللهَ يَدُ اللهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ ۔ (الفتح)

جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔

(۱۶) ان کی اطاعت اور ان کی جنگ خدا کی اطاعت اور جنگ بن جاتی ہے۔

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ

جو رسول کا حکم مانے اس نے خدا ہی کا حکم مانا۔

فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللهِ وَرَسُولِهِ۔

(جو سود باقی رہ گیا) اگر تم نہیں چھوڑتے تو اللہ سے اور اس کے رسول سے لڑنے کو تیار ہو جاؤ۔

(۱۷) خدا کی محبت کا دعویٰ ان کی اتباع کے بغیر قابلِ تسلیم نہیں ہوتا۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي

آپ کہہ دیجئے اگر تمہیں اللہ سے واقعی محبت ہے تو میری اتباع کرو۔

(۱۸) رسول مجلسِ مشاورت کی رائے کا تابع نہیں ہوتا دوسرے لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ

جب آپ کسی بات کا پختہ ارادہ فرمالیں تو پھر خدا پر بھروسہ کرکے اسکو کر گذریئے خواہ اب کسی کا مشورہ کچھ ہو

امام بخاریؒ نے رسول کی مشاورت پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔

باب قول الله وامرهم شوری بینهم۔ وشاورهم فی الامر۔ وان المشاورة قبل العزم والتبین لقوله فاذا عزمت فتوکل علی الله۔ فاذا عزم الرسول لم یکن لبشر التقدم علی الله ورسوله وشاور النبی صلی الله علیه وسلم اصحابه یوم احد فی المقام والخروج فرأوا الخروج فلما لبس لأمته وعزم قالوا أقم فلم یمل الیهم بعد العزم وقال لا ینبغی لنبی یلبس لأمته فیضعها حتی یحکم الله وشاور علیا واسامة فیما رمی بها اهل الافك عائشةؓ فسمع منهما حتی نزل القرآن فجلد الرامین ولم یلتفت الی تنازعهم ولکن حکم بما امره الله۔ وکانت الائمة

قرآن کریم نے امتیوں کے لئے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ ان کے معاملات ان کے باہمی مشوروں سے طے ہوا کریں گے اور رسول کے لئے بھی مشورہ کا حکم دیا ہے لیکن یہاں مشورہ کا حکم اس کے عزم کرنے سے پیشتر ہے جب رسول عزم کرلے یا خدا کی وحی صاف آجائے تو اب مشورہ کا کچھ لحاظ نہیں بلکہ اب اس کے خلاف مشورہ دینا خدا و رسول کے سامنے تقدم اور پیش دستی شمار ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں جنگ کرنے کے لئے صحابہؓ سے طلب فرمایا لیکن جب آپ نے جنگ کا پختہ ارادہ فرمالیا اور زرہ پہن لی تو جن لوگوں نے اب مدینہ میں رہنے کا مشورہ دیا اس پر عمل نہ فرمایا اور کہا یہ بات نبی کی شان سے بعید ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ زرہ پہن لے تو اب خدا کے حکم کے بغیر اس کو اتار دے اسی طرح حضرت عائشہؓ کی تہمت کے قصہ میں بھی آپ نے حضرت علیؓ اور اسامہؓ سے مشورہ فرمایا، ان کے مشوروں کو بغور سنا لیکن جب قرآن نازل ہوگیا اور مسئلہ صاف واضح ہوگیا تو

بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم یستشیرون
الامناء من اھل العلم فی الامور المباحۃ
لیاخذوا باسھلھا فاذا وضح الکتاب
والسنۃ لم یتعدوہ الی غیرہ اقتداء
بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم. ورأی ابوبکر
قتال من منع الزکوۃ فقال عمر کیف تقاتل
الناس وقد قال رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا
لا الٰہ الا اللہ فاذا قالوا لا الٰہ الا اللہ عصموا
منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم
علی اللہ فقال ابوبکر واللہ لاقاتلن من فرق
بین ما جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثم
تابعہ بعد عمر فلم یلتفت ابوبکر الی مشورۃ
اذ کان عندہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
فی الذین فرقوا بین الصلوۃ والزکوۃ وارادوا
تبدیل الدین واحکامہ الخ

ان کے باہمی اختلافِ رائے کی کوئی پرواہ نہیں کی اور قرآن کے
مطابق حکم نافذ کر دیا یہی دستور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
بعد آپ کے خلفاء کا تھا وہ بھی امت کے امین لوگوں سے مشورہ
کرتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں
حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا جو لوگ کلمۂ
توحید پڑھ رہے ہیں آپ بھلا ان سے کیسے جنگ کر سکتے ہیں
حالانکہ حدیث میں یہ موجود ہے کہ جب لوگ کلمۂ توحید پڑھ لیں
تو اب ان کی جان و مال محفوظ ہو گئے، یا احتمال کہ انھوں نے
اوپری طور پر پڑھا ہے یا دل سے ہماری بحث سے باہر بات ہے
یہ خدا کے سپرد ہے۔ کچھ گفت و شنید کے بعد آخر حضرت عمرؓ نے
بھی ان کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ اب دیکھئے کہ حضرت ابوبکرؓ
کے پاس چونکہ اُن لوگوں کے بارے میں جو نماز روزہ میں فرق
کرتے تھے اور دین کی تبدیلی کرنا چاہتے تھے ایک حکم نبوی موجود
تھا اس لئے اس کے سامنے انھوں نے کسی کے مشورہ کی کوئی
پرواہ نہ کی۔ (اگر ان کے پاس یہ حکم نبوی موجود نہ ہوتا تو وہ
صرف اپنی رائے سے خلاف نہیں کر سکتے تھے)۔

خلاصۂ فرق یہ ہے کہ رسول صرف خدا کے حکم کا متبع ہوتا ہے وہ کسی کے مشورہ کا تابع نہیں ہوتا، اس کے سوا تمام امام اور امیر مشیروں کے مشورہ کے پابند ہوتے ہیں، وہ اپنے ذاتی عزم کے مالک نہیں ہوتے۔ انھیں اختلافِ رائے کی صورت میں کوئی آیت یا حدیث پیش کرنا ضروری ہوتا ہے اور صرف حدیث پیش کرنا بھی کافی نہیں ہوتا، جب تک کہ بحث و تمحیص کر کے مجلسِ مشاورت کو پورے طور پر مطمئن نہ کر دیں، یہ صرف ایک رسول ہی کی شخصیت ہے جسے عزم کر لینے کے بعد دوسروں کو مطمئن کرنا ضروری نہیں ہوتا بلکہ خود دوسروں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کا رجحان دیکھ کر اسی جانب بہ مطمئن ہو جائیں۔ پھر جو شخص یہاں جس قدر زیادہ مطمئن ہو جاتا ہے وہ اتنا ہی قابلِ تعریف شمار ہوتا ہے۔ کسی امام اور کسی امیر کی یہ شان نہیں ہے۔ صلح حدیبیہ میں شیخین کے اضطراب و سکون کے حالات احادیث میں موجود ہیں اور جن دلائل سے صدیقِ اکبرؓ کی فضیلت تمام صحابہ پر ثابت ہوتی ہے ان میں سے ایک اہم دلیل یہ بھی ہے کہ اس واقعہ میں جب صحابہ کے سینے اضطراب و بے چینی سے بھرے ہوئے تھے اس وقت جس کا قلب تمام تر اطمینان و

سکون سے لبریز تھا وہ صدیق اکبرؓ ہی تھے۔

آیاتِ بالا میں پورے عموم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اس کا ذمہ لیا گیا ہے کہ وہ جو پڑھ کر سنائیں گے پھر اس کی جو مراد بیان کریں گے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگی جو کلمہ زبان سے نکالیں گے وہ خواہشاتِ نفس سے قطعاً پاک ہوگا۔ قرآن میں جو رائے دیں گے وہ بھی خدا کی پیدا کردہ ہوگی حتی کہ ان کے دل میں جو خطرات بھی گذریں گے وہ بھی قدرت کی حفاظت کے نیچے رہیں گے اس کے بعد کیا یہ حق کسی کو ہو سکتا ہے کہ وہ رسول کے کلام میں اپنی جانب سے یہ تفریق پیدا کردے کہ جو اس نے قرآن کہہ کر سنایا وہ تو واجب الاطاعت ہے لیکن جو اس نے اس کی مراد بتلائی یا جو اس نے خود فرمایا وہ واجب الاطاعت نہیں بلکہ اس کو شرعی کوئی حیثیت بھی حاصل نہیں۔ رسول بذاتِ خود ایک شرعی منصب ہے وہ اس لئے آتے ہیں کہ دنیا کو ہدایت اور خدا کی رضامندی کی راہ دکھلائیں اس لئے اس بارے میں وہ جو کہتے ہیں وہ سب رب العزت کی رسالت کی حیثیت سے کہتے ہیں۔ جو پہنچاتے ہیں وہ خدا ہی کا حکم ہوتا ہے اگر قرآن پہنچانا رسالت میں داخل ہے تو اس کی مراد بیان کرنا اس کی تفصیلات سمجھانا، یا دین کے بارے میں اپنی ہی جانب سے قرآنی آیات کے ماتحت کچھ اور احکام صادر کرنا رسالت کا جزء کیوں نہیں، قرآن کی کسی ایک آیت میں اس طرف کوئی معمولی بھی اشارہ نہیں ملتا کہ رسول کی یہ تمام صفات صرف قرآن کے ساتھ مخصوص ہیں، حتی کہ وہی جب دین کے معاملہ میں قرآن کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے تو اس کی حفاظت نہیں رہجاتی، اس میں خواہشِ نفس کا دخل ہونے لگتا ہے اور یہاں اس کی کوئی تشریعی حیثیت نہیں رہتی۔

اب ایک طرف آپ یہ آیاتِ قرآنی پڑھئے، دوسری طرف رسول کے متعلق مولانا اسلم صاحب کا یہ تصور دیکھئے کہ صرف قرآن سنا کر رسالت کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے، رسالت کا حق صرف یہ ہے کہ جو قرآن انھوں نے پڑھ کر سنایا ہے اس کو ان کے اعتماد پر اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھ لیا جائے اس کے بعد اب وہ اور ہم برابر ہیں جیسا ان کے پاس عقل ہے ہمارے پاس بھی ہے جیسا وہ قرآن سمجھتے ہیں ہم بھی سمجھ لیتے ہیں، دین کے معاملات میں ان کی رائے کا وزن وہی ہے جو ہماری رائے کا۔ خلاصہ یہ کہ اتباع اور اطاعت میں ان کا ایک ذرہ بھی حق نہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ رسول اپنی زندگی کے طویل وعریض عرصات میں بہت ہی مختصر لمحات کے لئے منصبِ رسالت پر مامور ہوتا ہے بقیہ زندگی میں اس کی حیثیت پھر وہی ہوجاتی ہے جو عام انسانوں کی ہے لیکن ان آیات سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ رسول کے لئے یہ آداب اور عظمتیں کسی وقت کے ساتھ خاص ہیں بلکہ اس کا جو احترام تبلیغِ قرآن کے وقت واجب ہے وہی تدبیرِ مہمات اور فصلِ خصومات اور امت کے دوسرے نظم ونسق کے وقت واجب ہوتا ہے حتی کہ جب وہ اپنے گھر میں چلا جائے اور بسترِ خواب پر ہو اس وقت بھی اس تمام احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے بلکہ منکرینِ حدیث کو چھوڑ کر بقیہ امت کا عقیدہ تو یہ ہے کہ اس کے ان آداب میں آج بعد از وفات بھی سرِ مو کوئی

فرق نہیں ہے۔ بس جب اس کا احترام ہمہ وقت واجب ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ ہمہ وقت رسول ہے اور جب وہ ہمہ وقت رسول ہے تو دین کے معاملہ میں اس کا جو حکم ہے وہ ہمہ وقت واجب الاطاعت ہے۔

مولانا اسلم صاحب کا آپ کی ذات میں دو حیثیتیں پیدا کرنا تبلیغ قرآن کے وقت آپ کو رسول اور فصلِ خصومات کے وقت آپ کو صرف ایک امام سمجھنا قرآن کے قطعاً مخالف ہے اگر قرآن کی نظر میں آپ کی یہ دو حیثیتیں ہوتیں تو ضرور قرآن کریم ان کو جدا جدا بیان کرتا، ان کے جدا جدا حقوق بتلاتا، لوگ آپ کے ساتھ ان حیثیتوں کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ معاملات کرتے۔ ایک وقت آپ کے سامنے آواز بلند کرنا حبطِ عمل کا موجب سمجھتے دوسرے وقت آپ سے منازعت کی بھی پرواہ نہ کرتے لیکن تمام قرآن میں، آپ کی تمام حیوۃ میں، صحابہ کے تمام تذکروں میں کہیں آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات ثابت نہیں ہوتے اور ذخیرۂ نقل میں ایک حرف بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ کبھی کبھی آپ منصبِ رسالت سے اس طرح علیحدہ ہو جاتے تھے جیسا ایک پوسٹ مین ڈاک تقسیم کرکے اپنے عہدہ سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ یہ تمام دعاوی قرآن کے خلاف اور اس کی صریح تحریف ہیں۔ پس حق صرف یہی ایک بات ہے کہ آپ ہمہ وقت رسول ہیں اور ہمہ وقت آپ کی اطاعت اور اتباع لازم ہے اخلاقی اطاعت و اتباع نہیں بلکہ شرعی و مذہبی اتباع ایسی اتباع نہیں جو ختم ہونے والی ہو بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی وہ اتباع نہیں، جس میں ہمارا اختیار ہو بلکہ وہ اتباع جو سب سے بڑھ کر ہم پر فرض ہے اور ہمارا اس میں کوئی اختیار نہیں۔

قرآن میں رسول کی اطاعت — رسول کی اطاعت مستقل حیثیت سے بھی واجب ہوتی ہے۔

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ	فرمانبرداری کرو اللہ کی اور فرمانبرداری کرو رسول کی اور ان کی جو
اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ	تم میں حکم کے مالک ہوں (یعنی حکام وغیرہ) پھر اگر تم کسی بات میں
اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔	جھگڑ پڑو تو اسے خدا اور رسول کے سامنے پیش کردو۔

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ خدا کے سامنے پیش کرنے کا مطلب اس کی کتاب کے سامنے پیش کرنا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے سامنے پیش کرنے کا مطلب آپ کی سنت اور احادیث کے سامنے پیش کرنا ہے۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین اطاعتیں واجب فرمائی ہیں، دو مستقل اور ایک غیر مستقل۔ اللہ اور رسول کی اطاعت تو مستقل واجب کی گئی ہے اور اولوالامر کی تیسری اطاعت ان دو اطاعتوں کے ماتحت درج کردی گئی ہے اسی لئے پہلی دو اطاعتوں کے لئے لفظ اطیعوا (فرمانبرداری کرو) مکرر استعمال کیا گیا ہے اور تیسری اطاعت کے لئے جداگانہ امر نہیں فرمایا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت کی طرح ایک مستقل حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت ان اطاعتوں کی طرح

---

[1] جامع بیان العلم۔ ج ۲ ص ۱۸۷۔

مستقل حیثیت[1] نہیں رکھتی یہی وجہ ہے کہ تاریخ سے کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کے حکم کے بعد صحابہ نے کبھی آپ کو اس پر قرآن سے دلیل پیش کرنے کا مطالبہ کیا ہو۔ اس کے برخلاف اماموں کو ہمیشہ اپنی اطاعت کے لئے قرآن و حدیث پیش کرنا پڑی ہیں بلکہ بعض مرتبہ اپنے قول سے رجوع بھی کرنا پڑا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآنی امر میں تشریعی حیثیت کے سوا اور کوئی حیثیت نہیں ہے اس لئے یہاں رسول کی اطاعت بھی صرف تشریعی حیثیت سے واجب ہوگی نہ کسی اور حیثیت سے۔ یہاں منکرینِ حدیث کو بڑا مغالطہ یہ ہو گیا ہے کہ وہ دو اطاعتوں کی وجہ سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ کہ مطاع بھی دو بن گئے اس لئے یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ دو اطاعتیں واجب ہونے کی وجہ سے مطاع دو نہیں بنتے در اصل مطاع دونوں جگہ خدا ہی کی ذات رہتی ہے۔ رسول کی اطاعت میں یہ سمجھنا کہ مطاع خدا کی ذات پاک نہیں ہوتی بڑی غلط فہمی اور قرآن سے ناواقفی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ   جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

گویا رسول کی اطاعت کی صورت میں بھی مطاع خدا ہی کی ذات رہتی ہے پس اطاعت کے تعدد سے مطاع میں تعدد نہ سمجھنا چاہئے اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا بیان اس لحاظ سے کہ اس تفصیل سے قرآن میں مذکور نہیں ہوتا ایک مستقل حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس اعتبار سے یہاں مطاع بظاہر اس کی ذات معلوم ہوتی ہے اور اگر یہ لحاظ کیا جائے کہ یہ تمام تفصیل بعینہٖ قرآن کے اجمال کی مراد ہوتی ہے تو اس کی حیثیت کوئی مستقل حیثیت نہیں

---

[1] حافظ ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اطاعت رسول کے مستقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ہر حکم ماننا چاہئے خواہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم ہو سکے یا نہ ہو سکے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بعض سنتوں کی اصل قرآن میں موجود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسول کی اطاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا مکلف ہی نہیں بنایا کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کی جائے۔ لولوا الامر کی اطاعت اس طرح واجب نہیں ہے وہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کے ماتحت ہے اس لئے جب تک وہ احکام خدا اور رسول کی مرضی کے مطابق حکم دیں ان کی اطاعت کی جائے گی اور جب ان کا خلاف کریں واجب الاطاعت نہ رہیں گے صحیح حدیث میں ہے لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔ (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔ انما الطاعۃ فی المعروف (اطاعت صرف اچھی بات میں کرنی چاہئے) ایک مرتبہ مسلمانوں کے امیر نے اپنی فوج کے دستے کو حکم دیا کہ وہ آگ میں گھس جائیں۔ اس حکم کی تعمیل میں صحابہ نے تامل کیا جب آپ کو خبر ہوئی تو آپ نے فرمایا انھم لو دخلوھا ما خرجوا منہا (اگر یہ لوگ آگ میں چلے جاتے تو پھر انہیں اس سے کبھی نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ حکم شریعتِ اسلامیہ کے خلاف تھا۔ اس میں کسی امیر و حاکم کی اطاعت واجب نہیں ہے حافظ ابن قیمؒ کے اس بیان سے اطاعتِ رسول کے مستقل اور اولوا الامر کی اطاعت غیر مستقل ہونے کا مفہوم واضح ہو گیا (دیکھو اعلام الموقعین۔ ج ۱ ص ۴۱) پھر اسی کتاب کی جلد ۲ ص ۲۳۲ پر فرماتے ہیں کہ اگر رسول کی اطاعت صرف ان احکام تک محدود رہے جو قرآن کریم میں بھی صاف صاف موجود ہیں تو پھر واطیعوا الرسول کی آیت کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی) کی آیت یہ چاہتی ہے کہ خدا کے نزدیک رسول کی اطاعت بھی ایک مستقل مد ہے۔ بیسیوں آیتوں میں اطاعتِ رسول کا علیحدہ حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کی براہِ راست اطاعت کرنا بھی خدا ہی کا ایک حکم ہے اس لحاظ سے جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ خدا کی اطاعت بھی نہیں کرتا۔

رہتی اور یہاں بھی اصل مطاع خدا ہی کی ذات ہو جاتی ہے۔ پس احادیث رسول پر عمل کرنے والا بلحاظِ بیان تو رسول کا مطیع کہلاتا ہے اور بلحاظِ مراد خدا ہی کا مطیع ہوتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے والا خدا کے الفاظ پر بھی عمل کرتا ہے اور حدیث پر عمل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مراد پر عمل کرتا ہے۔ اس بنا پر اطاعتیں اگرچہ دو نظر آتی ہیں مگر مطاع درحقیقت ایک ہی رہتا ہے۔ [۱]

خلاصہ آیت یہ ہے کہ خدا کا اصل قانون تو صرف خدا کی کتاب ہے، اس کی مرادوں کو واضح کرنے والی احادیث رسول ہیں اور اس مفصل قانون کو تا قیامت چلانے والے ائمہ دین ہیں اگر کبھی ان میں کسی معاملہ میں اختلاف پڑ جائے تو ان ائمہ کے لئے بھی اصل مرجع وہی اللہ اور رسول ہیں۔

آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول الخ کے متعلق مولانا اسلم صاحب کی تفسیر

مولوی اسلم صاحب نے جو تفسیر اور نظم اسلامی کی جو تشریح بیان لکھی ہے وہ صرف ان کے دماغ کی تراشیدہ ہے۔ قرآن کریم سے اس کو دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے پہلے ہم ان کے الفاظ بعینہٖ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس پر تنقید کی جائے گی۔

• رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ (۱) پیغمبری یعنی پیغامات الٰہی کو لوگوں کے پاس بے کم و کاست پہنچا دینا۔ اس حیثیت سے آپ کی تصدیق کرنا اور آپ کے اوپر ایمان لانا فرض کیا گیا۔

(۲) امامت۔ یعنی امت کا انتظام۔ اس کو قرآن کے مطابق چلانا، اس کی شیرازہ بندی، ان کے باہمی قضایا کے فیصلے، تدبیر مہمات و جنگ و صلح جیسے اجتماعی امور میں ان کی قیادت اور قائم مقامی وغیرہ۔ اس حیثیت سے آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری لازم کی گئی۔

یہ امامت کبریٰ جو آپ کی ذات سے بنی نوعِ انسان کی صلاح و فلاح کے لئے قائم ہوئی قیامت تک مستمر ہے جو آپ کے زندہ جانشینوں کے ذریعہ سے ہمیشہ رہنی چاہئے۔ قرآن میں اطاعت رسول کے جو احکام ہیں وہ آپ کی ذات اور زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ منصبِ امامت کے لئے ہیں جس میں آپ کے بعد آنے والے تمام خلفاء داخل ہیں۔ ان کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم امت میں موجود تھے، ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی (اور یہ امت ہمیشہ آپ ہی کی امت رہے گی کیونکہ آپ کے اوپر ایمان لائی ہے) اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی۔ اور اطاعت عربی میں کہتے ہی ہیں زندہ کی فرمانبرداری کو، رسول کی اطاعت یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان کے بعد جو کوئی ان کے نام سے کچھ کہدے ہم اس کی تعمیل کرنے لگیں۔ یہ ذہنیت امت میں اس وقت پیدا ہوئی جب کوئی

---

[۱] دیکھو امرافقات۔ ج ۲ ص ۱۹۔

صحیح خلیفۂ رسول نہیں رہا اور مستبدوں نے مرکز پر تغلب حاصل کر کے امت کو اپنا غلام بنالیا اور ان کی دینی قیادت چھوڑ دی، جو علما اور رواۃ حدیث نے لے لی۔ اسی دن سے امت مذہبی انفرادیت اور انتشار میں مبتلا ہو گئی ورنہ دین کی ضروریات قرآن کی اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں امام کے ساتھ امت کے منتخب افراد ہوں گے جن کی مشاورت سے وہ اس کو حسب اقتضاء زمانہ قرآن کے مطابق چلائے گا اور اس میں وحدت مرکزی قائم رکھے گا اور تفرق نہ ہونے دیگا۔ الغرض قرآن امام وقت ہی کے ساتھ امت کی نجات اور کامیابی کا ذریعہ ہے اور حدیثوں کی حیثیت صرف تاریخی ہے ان میں سے جو قرآن کے مطابق ہوں گی قبول کی جائیں گی۔[1]

مولانا اسلم صاحب کی تقریر پر تنقیدی نظر

مولانا موصوف نے اطاعتِ خدا اور رسول کے معنی بیان کرنے میں تقریباً ایک صفحہ سے زیادہ خرچ کیا ہے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ مذہب اسلام صرف مولانا کی دماغی تجویز پر موقوف نہیں ہے بلکہ تیرہ سو سال سے اس پر مسلسل عمل ہوتا چلا آیا ہے جن باتوں کا تحریر مذکور میں دعویٰ کیا گیا ہے ان کے متعلق قطعی طور پر ثبوت پیش کرنا مولانا کے ذمہ ہے کہ آج تک اسلامی نظام کی بنیاد درحقیقت اسی نقشہ کے مطابق سمجھی گئی ہے یا کم از کم عہدِ نبوت اور صحابہ و تابعین میں سمجھی گئی تھی لہٰذا فقرہ نمبر صرف ایک دعویٰ ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔

(۱) مولانا نے پہلا دعویٰ یہ کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ رسالت اور امامت۔ رسالت کی حیثیت سے آپ پر صرف ایمان لانا ضروری تھا اور آپ کی اطاعت کرنا بہ حیثیت امامت تھا نہ کہ بہ حیثیت رسالت۔ ہمارے نزدیک یہ تینوں باتیں واقعات کے بھی خلاف ہیں اور خود قرآن کے بھی خلاف ہیں۔ یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں ذہنی اعتبار سے دو حیثیتیں کیا اس سے زیادہ بھی حیثیات قائم کی جاسکتی ہیں مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو قرآن نے کہیں جدا جدا اعتبار کیا ہے یعنی کبھی بہ حیثیتِ رسول اور کبھی بہ حیثیتِ امام آپ کے دو قسم کے حقوق بتلائے ہیں۔ پھر کیا صحابۂ کرام نے ان دو حیثیتوں کے لحاظ سے کبھی آپ کے ساتھ دو قسم کے معاملات کئے ہیں پھر امتِ مسلمہ نے اپنے تواتر کے باوجود کیا آپ کی ان دو حیثیتوں کو سمجھا ہے میں پورے وثوق کے ساتھ ان تینوں سوالات کے جوابات نفی میں سمجھتا ہوں۔ رسول کی ذات میں یہ حیثیتیں قائم کرنا بالکل ایک منطقی اعتبار ہے جس کا خارج میں کہیں وجود نہیں۔ قرآن کریم نے ہمیشہ آپ کی حیثیت صرف ایک رسالت کی حیثیت بیان کی ہے اور ہمیشہ آپ کو رسول ہی کے لفظ سے پکارا ہے صحابہ نے بھی ہمیشہ آپ کو رسول ہی کہا ہے یہاں تک کہ کفار میں بھی آپ کی جو حیثیت مشہور تھی وہ صرف اللہ کے رسول ہونے کی ایک ہی حیثیت تھی۔

---

[1] علم حدیث۔ ص ۳۴ و ۳۵ و ۳۶۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔ — اے رسول جو کچھ آپ پر آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے، اس کو آپ دوسروں تک پہنچا دیجئے۔

یہاں آپ کو تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے اور رسول ہی کے لفظ سے مخاطب فرمایا ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ۔ — جب خدا اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد یا عورت کو پھر اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اس آیت میں بھی آپ کو رسول ہی کہا گیا ہے اور رسول ہی کے فیصلہ کا یہ حق بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد کسی کو کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔ پس فقرہ نمبر ۱ و نمبر ۲ و نمبر ۳ کی تفریق قرآن کریم کے صریح مخالف ہے۔ اس مضمون کو دوسری آیت میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ — آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ ایمان دار نہ ہوں گے جب تک کہ آپس کے اختلافات میں آپ ہی کو حکم نہ ٹھیرائیں اس کے بعد آپ کے فیصلہ سے اپنے دل میں کوئی تنگی بھی محسوس نہ کریں اور پوری طرح اس کے سامنے سر نہ جھکائیں۔

ایمان کی تکمیل رسول کی اطاعت کے بغیر نہیں ہوتی

اس آیت سے یہ خوب واضح ہو گیا کہ رسول پر ایمان لانا اس کی اطاعت کے بغیر قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں ہے، کوئی انسان صرف ایک لفظ اٰمنت کہہ کر حقوقِ رسالت سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا، جب تک کہ وہ ہر معاملہ میں رسول کو اپنا حَکَم نہ بنائے، باہمی جو اختلاف بھی ہو اُس میں اسی کا فیصلہ ناطق نہ سمجھے اور یہی نہیں بلکہ تکمیلِ ایمان کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ اگر فیصلہ اپنے مخالف ہو تو بھی اپنے دل میں اس میں کوئی تنگی محسوس نہ کرے پھر بھی صرف اس منفی پہلو سے ایمان کامل نہیں ہو گا جب تک کہ اثباتی پہلو میں انقیاد و تسلیم اس کی رگ رگ میں نہ سما جائے۔

پس مولانا تو یہ فرماتے ہیں کہ منصبِ رسالت کو اطاعت سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر رسول پر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا وہ صرف ایک ادھورا اور ناتمام ایمان ہوتا ہے دوسری جگہ فرمایا

إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ — جو لوگ آپ سے اجازت لے کر جاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ایمان کے حدود میں استئذان جیسی معمولی اطاعتیں بھی درج ہیں۔ پس جب آپ کے حکم کے بغیر کہیں جانا بھی درست نہیں تو اپنی رائے سے کوئی شرعی حکم اختیار کرنا کیسے درست ہو گا۔ (اعلام۔ ج ۱ ص ۴۲)

مولانا اسلم صاحب کی ایمان کے معنی سمجھنے میں ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

درحقیقت یہاں مولانا اسلم صاحب کو ایک شدید غلطی ایمان کے معنی سمجھنے میں پیش آگئی ہے اگر وہ ایمان کی صحیح حقیقت معلوم کرلیتے تو اطاعت کو ایمان سے علیحدہ کرہی نہیں سکتے تھے وہ یہ سمجھے ہیں کہ ایمان صرف زبان سے تصدیق کرلینے کا نام ہے اس لئے ان کے نزدیک رسول کا حق صرف تصدیق کرکے ادا ہوجاتا ہے اور اس کے بعد اطاعت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی حالانکہ اگر وہ ذرا تحقیق کرتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ اولاً تو اطاعت کے بغیر ایمان ہی حاصل نہیں ہوسکتا، دوم قلبی تصدیق حاصل ہوجانے کے بعد یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اطاعت کا عہد دل میں نہ پیدا ہوجائے۔ جو شخص رسول کی اطاعت کا عہد نہیں کرتا یقیناً وہ دل میں اس کی تصدیق بھی نہیں رکھتا اسی بنا پر ہرقل بادشاہ کو مسلمان نہیں کہا گیا حالانکہ اس نے آپ کی کھلی محفل میں تصدیق کرلی تھی۔ اگرچہ اپنی قوم کی برہمی دیکھکر بعد میں بات بنادی۔ اسی طرح ابوطالب[1] کی تصدیق بھی ان کے اشعار سے ثابت ہے۔

ودعوتنی وزعمت انك صادق ——— وصدقت فیه وکنت ثم امینا

آپ نے مجھے دعوت اسلام دی اور سمجھ کردی کہ آپ سچے ہیں ——— بیشک آپ ایسے ہی ہیں کیوں نہ ہو کہ آپ ان کے درمیان ہمیشہ کے امین ہیں

وعرفت دینك لامحالة انه ——— من خیر ادیان البریة دینا

میں یہ یقین کرچکا ہوں کہ آپ کا دین ——— یقیناً تمام دینوں سے بہتر ہے

لولا الملامة او حذار مسبة ——— لوجدتنی سمحا بذاك مبینا

اگر ملامت اور لوگوں کے طعن وتشنیع کا خوف نہ ہوتا تو آپ دیکھ لیتے کہ میں بڑی فراخ دلی سے اس کو کھلا کھلا قبول کرلیتا۔

اس کے باوجود جمہور امت نے ان کا ایمان تسلیم نہیں کیا اس کی وجہ یہی ہے کہ انھوں نے ہزار آپ کی تصدیق کی ہو لیکن جب ان کے دل نے معمولی انسانوں کے عار کی خاطر رسول عربی کی اطاعت کرنا قبول نہیں کیا تو ان کو مسلمان کیسے کہدیا جائے۔

حافظ ابن قیم وفد نجران کے قصہ میں ایک کاہن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرنے پر تحریر فرماتے ہیں۔ وفیها ان اقرار الکاهن الکتابی لرسول الله صلی الله علیه وسلم بانه نبی لا یدخله فی الاسلام

---

[1] بعض حضرات ابوطالب کے ایمان کے قائل ہیں ان کو بھی یہی مغالطہ ہوا ہے انھوں نے صرف ان کی تصدیق پر تو نظر کی، رسول کی ہمدردی کی داستان کا تو مطالعہ کیا، مگر یہ نہ دیکھا کہ جو شخص تھوڑی دیر کے لئے قومی عار بھی برداشت نہیں کرتا، اس کے نزدیک رسول کی شخصیت کا وزن کتنا تھا۔ اگر دین بھی صرف ایک معاشرتی قانون ہوتا جس کا تسلیم کرنا صرف اخلاق کی حد تک واجب ہوسکتا ہے تو ابوطالب کے سوا اور لوگوں کو بھی اس کی گرفت سے آزادی مل سکتی تھی مگر وہ تو مذہبی اور الہٰی قانون ہے اس سے آزاد رہنا کسی کیلئے برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ جن بعض علماء نے ابوطالب کے اسلام کی طرف اپنا رجحان ظاہر کیا ہے اس کی بنا یہ نہیں ہے کہ اسلام کے لئے صرف تصدیق کرنا کافی ہے بلکہ چند ضعیف احادیث ہیں۔

جمہور ان کو ثابت شدہ نہیں سمجھتے۔ صرف یہ دیکھکر کہ بعض اور علماء بھی ابوطالب کے ایمان کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ان کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے خواہ عہد اطاعت نہ ہو کوتاہ نظری ہے۔

ژ

عالم یلتزم طاعتہ ومتابعتہ۔ اس واقعہ سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی کتابی کاہن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی اس بات کی تصدیق کرلے کہ آپ نبی ہیں تو صرف اس اقرار کرنے سے وہ اسلام میں داخل نہیں مانا جا سکتا۔
جب تک کہ وہ آپ کی اطاعت اور اتباع کا بھی پورا پورا عہد نہ کرے۔ اسی واقعہ کی نظیر اُن دو یہودی علماء کا
قصہ ہے جنھوں نے آپ کی خدمت میں آکر آپ سے امتحاناً تین سوالات کئے تھے اور جب ان کے جواب باصواب
حاصل کرلئے تو بولے ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
اچھا بولو اب میری اتباع سے تمہیں کیا چیز مانع ہے انھوں نے جھٹ یہ بہانہ کردیا کہ ہمیں یہ ڈر ہے کہ یہود کہیں
ہمیں مار نہ ڈالیں۔ اس واقعہ سے بھی یہی معلوم ہوا کہ صرف نبوت کا اقرار کرلینے سے اسلام کا حکم نہیں لگایا جاتا
جب تک کہ آپ کی اطاعت کا عہد بھی نہ کیا جائے۔ اسی کی تیسری شہادت ابوطالب کا واقعہ ہے، اُن کے اس
پُرزور اقرار کے باوجود کہ ان کے نزدیک آپ کا دین تمام ادیان سے افضل و بہتر ہے، اُن کو اسلام میں داخل
نہیں مانا گیا۔ اس کے بعد حافظ ابن قیم تحریر فرماتے ہیں۔

ومن تأمل ما فی السیر والاخبار الثابتۃ من شہادۃ کثیر من اہل الکتاب والمشرکین لہ صلی اللہ علیہ وسلم بالرسالۃ وانہ صادق فلم تدخلہم ہذہ الشہادۃ فی الاسلام علم ان الاسلام امر وراء ذلک وانہ لیس ہو المعرفۃ فقط ولا المعرفۃ و الاقرار فقط بل المعرفۃ والاقرار والانقیاد والتزام طاعتہ ودینہ ظاہراً وباطناً۔[۵۱]

جو شخص کتب سیرت کا مطالعہ کرے گا اور ان میں بہت سے اہل کتاب اور مشرکین کی تصدیق کے واقعات پڑھے گا تو اُس پر یہ بخوبی روشن ہوجائے گا کہ اسلام صرف آپ کی رسالت کی تصدیق کا نام نہیں نہ وہ صرف معرفت ہے نہ صرف معرفت و اقرار کا نام ہے بلکہ جب تک ان کے علاوہ آپ کی ظاہراً و باطناً فرمانبرداری اور آپ کی پوری پوری اطاعت کا عہد بھی نہ کرے اس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ کہ ایمان میں تصدیق کے ساتھ التزام طاعت ہی ایسا جزء ہے جس سے ایمان و کفر کی پوری پوری
حقیقت جدا ہوسکتی ہے جنھوں نے ایمان کی تعریف میں صرف تصدیق پر اکتفاء کی ہے وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ
رگ و پے میں تصدیق سرایت کرجانے کے بعد رسول کی اطاعت سے روگردانی کیسے ہوسکتی ہے[۵۲]۔ معتزلہ نے تو اس

---

[۵۱] زاد المعاد۔ ج ۳ ص ۵۵۔

[۵۲] جمہور اس کو معتزلہ کا مبالغہ سمجھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس
اعتراض کا مبنیٰ صرف عقلیات پر چلنا اور واقعات سے صرف نظر کرلینا ہے۔ آج بھی سب کو معلوم ہے کہ قتل کی سزا پھانسی اور
چوری کی سزا جیل خانہ ہے مگر کیا یہ جرائم بند ہوگئے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان جرائم پیشہ کو اس قانون کی تصدیق حاصل نہیں ہوتی۔
اصل یہ ہے کہ انسان میں قوت واہمہ بھی ایک زبردست قوت ہے اس کا تصادم بسا اوقات یقین کے مقتضیٰ پر انسان کو عمل کرنے نہیں
دیتا مثلاً جب انسان کسی بلند دیوار پر چلتا ہے تو اگر اس کے وہم کا تصادم نہ ہو تو اس کے اپنے چلنے میں کوئی دشواری نہ ہو مگر اُسے
یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب گرا، اب گرا اور اس لئے اس کو چلنا دوبھر ہوجاتا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

شبہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ ان کے نزدیک تصدیق حاصل ہونے کے بعد معصیت کا ارتکاب ممکن ہی نہیں وہ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرتا ہے درحقیقت اس کو اس پر ایمان ہی نہیں ہوتا کہ گناہِ کبیرہ عذاب کی چیز ہے، اس لئے ان کے نزدیک مرتکبِ کبیرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے پس معتزلہ جن کی عقل کا مولانا اسلم صاحب کو بھی اعتراف ہے تصدیق کے ساتھ رسول کی اطاعت کو اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عاصی کے لئے اسلام میں کوئی گنجائش ہی نہیں دیکھتے۔ اور مولانا اطاعتِ رسول کو اتنا غیر ضروری سمجھے ہوئے ہیں کہ اُسے رسول کا حق ہی قرار نہیں دیتے۔ یہاں قرآن کا فیصلہ آیتِ بالا کے بموجب یہ ہے کہ ایمان کے لئے رسول کی اطاعت اتنی ضروری چیز ہے کہ جو شخص رسول کی اطاعت نہیں کرتا وہ مومن کامل بھی نہیں کہلا سکتا۔ یہ تو رسول کی اطاعت کا پہلو تھا، اب اس کے خلاف کا پہلو سنئے۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ اَمْرِهٖٓ اَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ اَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	تو جو لوگ اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں انھیں ذرا ڈرتے رہنا چاہئے کہیں کوئی فتنہ یا خدا کا دردناک عذاب پکڑ لے

ان تمام مقامات پر یہ کہے چلے جانا کہ رسول کے حکم سے مراد امام کا حکم ہے اور اس کی اطاعت سے مراد بھی امام ہی کی اطاعت ہے قرآن کے صریح الفاظ کو معطل کرنا ہے اگر ایسی تاویلات جائز سمجھی جائیں تو پھر قرآن سے کوئی مراد حاصل کرنا بھی مشکل ہوگا اور اس کے الفاظ سے امن اٹھ جائے گا اور ہر شخص من مانی جو چاہے مراد بیان کرے گا۔ رسولوں کے مطاع ہونے کا قانون اللہ تعالیٰ کا مستمر قانون ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لئے رسول بنایا گیا ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ خدا کے حکم کے ماتحت ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔

پس رسولوں کا مطاع ہونا قرآن کے نزدیک حق رسالت ہے اور ایک ایسا عام قانون ہے جس سے کبھی کوئی رسول مستثنیٰ نہیں رہا اب مولانا کا یہ فرمانا کہ کبھی کسی رسول کو بہ حیثیتِ رسول مطاع نہیں سمجھا گیا، قرآن کے کتنا مخالف دعویٰ ہے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ ہر رسول اطاعت ہی کے لئے مبعوث ہوا ہے، مولانا یہ کہتے ہیں کہ کوئی رسول اطاعت کے لئے نہیں آیا صرف ایمان کے لئے آیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ایمان کے لئے

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) حتیٰ کہ بسا اوقات وہ گر ہی پڑتا ہے۔ اسی طرح پورے یقین کے باوجود کبھی خواہشات انسانی اس کے نفس پر اتنا غلبہ کر لیتی ہیں کہ اُسے توبہ، رحمت وغیرہ کے بھروسہ پر مقتضی یقین کے خلاف کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ بہر حال یہاں تو بحث یہ ہے کہ تصدیق کے بعد اطاعت کرنے کا عزم بھی ایمان کے لئے ضروری ہے یا نہیں، اب آگے اس پر کتنا عمل میسر آتا ہے کتنا نہیں، یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔ مولانا کے نزدیک تو اطاعت رسول کا حق ہی نہیں، یہ حق صرف امام کا ہے۔

اطاعت لازم نہیں، قرآن یہ کہتا ہے کہ اطاعت کے بغیر ایمان ہی نہیں [۱]

اصل یہ ہے کہ قرآن صداقتوں کا ایک مجموعہ ہے اس کی ایک صداقت تسلیم کرنے سے دوسری صداقت تسلیم کرنی ضروری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب اسکی ایک صداقت کا انکار کیا جاتا ہے تو دوسری صداقت کا انکار خود بخود سر پڑ جاتا ہے۔ مولانا نے جب قرآن کے خلاف یہ دعوی کیا کہ منصب رسالت کے لئے اطاعت ضروری نہیں ہے تو ان کو یہ بھی ماننا پڑا کہ رسول کو صرف زبان سے سچا کہدینے کا نام ایمان ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ایک شخص آپ کی تصدیق کرتا ہے مگر آپ کے احکام نہیں مانتا وہ بھی مومن کہا جا سکتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ امام وقت کا حکم نہ ماننے کی وجہ سے اس کو فاسق وغیرہ کہدیا جائے۔ اور اگر کافر کہا جائے تو ہر امام کی اطاعت نہ کرنے سے کفر لازم آئے گا۔ رسول کی پھر کوئی خصوصیت نہ رہے گی۔ ان سب اختلافات کی بنیاد یہ ہے کہ منکرین حدیث کے نزدیک رسول کی وہ حیثیت ہی نہیں جو قرآن نے بتلائی ہے اس لئے وہ اس کو جتنا ہلکا بنا سکتے ہیں بنا دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جب یہ ثابت ہے کہ رسول کی حیثیت امام کی حیثیت سے کہیں برتر ہوتی ہے وہ معصوم ہوتا ہے، اس کے لئے عصمت ضروری نہیں اس پر ایمان لانا ضروری ہے، امام کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں تو یہ کیسے معقول ہے کہ امامت کے لئے تو اطاعت لازم قرار دی جائے اور رسالت کے لئے لازم قرار نہ دی جائے یہ بھی عجیب فلسفہ ہے کہ جس پر ایمان لانا وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو اُس کی اطاعت کوئی ضروری امر نہ ہو۔ درحقیقت یہ تمام شاخیں رسول اور ایمان کی حقیقت سے ناواقفی کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔

کتاب اللہ اور اطاعتِ رسول کا مطلب

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کسی کی اطاعت کا مطلب اس کی ذات کی اطاعت نہیں ہوا کرتا، بلکہ اس کے احکام کی اطاعت ہی ہوا کرتا ہے۔ اسی لئے اللہ کی اطاعت کے معنی اس کی کتاب کی اطاعت ہیں۔ اسی طرح رسول کی اطاعت کے معنی بھی اس کے احکام کی اطاعت ہونا چاہئیں یہاں حیات اور وفات میں اگر کوئی فرق پڑتا ہے تو اتنا ہی کہ حالتِ حیات میں آپ ہمارے سامنے موجود تھے اب دوسرے جہان میں موجود ہیں تو کیا اطاعت کے لئے مطاع کا سامنے موجود ہونا شرط ہے؟ آپ کی حیات میں بھی لوگ دیگر ممالک میں رہ کر آپ کے اسی طرح مطیع کہلائے جیسا مدینہ میں آپ کے احکام کی اطاعت کرنے والے۔

فقرہ نمبر ۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رسول کی اطاعت کا لفظ امام وقت کی اطاعت کے طفیل میں صادق کرنا چاہتے ہیں اور قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امامِ وقت کی اطاعت رسول کے طفیل میں ہے اگر رسول کی اطاعت واجب نہ ہوتی تو کسی امام کی اطاعت بھی واجب نہ ہوتی سا اماموں کی اطاعت اسی لئے ضروری ہے کہ اصل میں رسول

---

[۱] پس اگر یہی تسلیم کر لیا جائے کہ منصبِ رسالت کے لئے صرف ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر بھی رسول کی اطاعت ضروری ٹھیرتی ہے کیونکہ اطاعت کے بغیر ایمان ہی مکمل نہیں ہوتا۔

کی اطاعت واجب ہوچکی ہے اور یہ اس کے جانشین بن کر اسی کی اطاعت کی طرف بلاتے ہیں، اسی لئے اگر ان کی دعوت کا رخ خدا اور رسول کی طرف نہ رہے تو ان کی اطاعت بھی واجب نہیں رہتی۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جب مولانا کے نزدیک آپ کی اطاعت بہ حیثیتِ رسالت ضروری نہ ٹھیری اور جو اطاعت بہ حیثیتِ امامت واجب تھی وہ بعد وفات ختم ہوگئی اس لئے کہ مولانا کے نزدیک اطاعت عربی میں صرف زندہ کی فرمانبرداری کو کہتے ہیں تو مولانا صاف یہ اعلان کیوں نہیں کر دیتے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہی نہیں رہی اور کیوں خواہ مخواہ زندہ جانشینوں کے پردہ میں اس کو مستمر بنانا چاہتے ہیں۔ پھر فقرہ نمبر ۵ میں یہ کیوں لکھ رہے ہیں کہ خلفاء کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ خلفاء کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کہنا ہی غلط ہے اولاً تو اس لئے کہ مولانا کے نزدیک رسول کی اطاعت ہی واجب نہیں۔ پھر فقرہ نمبر ۱۰ میں مولانا نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ دین کی ضروریات صرف قرآن کی اتباع اور امامِ وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں۔ یہاں مولانا نے اطاعتِ رسول کی مد درمیان سے صاف حذف کر ڈالی ہے۔ لہٰذا ہر زمانہ میں ہر امام کی اطاعت اسی طرح مستقل اطاعت ہے جیسا کہ آپ کے زمانۂ امامت میں آپ کی اطاعت۔ اس کو رسول کی اطاعت کہنا بالکل بے معنی بات ہے رسول بھی اپنی عقل سے سمجھ کر قرآن کے تحت میں فیصلے کرتا تھا یہ امام بھی اسی طرح اپنی عقل سے سمجھ کر فیصلے دے گا۔ بلکہ اس امام کے سامنے رسول کے فیصلوں کی وہ حیثیت بھی نہیں ہے جو ماتحت عدالتوں کے نزدیک ہائی کورٹ کے فیصلوں کی ہوتی ہے، وہ اس کے ماننے پر مجبور ہیں یہ مجبور نہیں۔ والعیاذ باللہ

ہمارے نزدیک قرآن میں ہر جگہ اطاعتِ رسول کی مستقل مد کو ختم کرنا اور اطاعتِ امام کی غیر مستقل مد کو مستقل حیثیت دیئے چلے جانا قرآنی آیات کی صریح تحریف ہے اگر نظمِ شریعت اس نقشہ کے مطابق ہوتا جو فقرہ نمبر ۱۰ میں مولانا نے ذکر کیا ہے تو آیتِ بالا میں اطاعت کا امر اس طرح ہوتا۔ اطیعوا اللہ واولی الامر منکم اور اطاعتِ رسول کا ذکر ہی نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو اس کو مستقل حیثیت اور اولوالامر کی اطاعت کو غیر مستقل حیثیت نہ دی جاتی۔ فقرہ نمبر ۶ میں آیتِ بالا کی اس سے بڑھ کر ایک اور تحریف یہ کی گئی ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں اللہ و رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مراد امامِ وقت کی . . . . اطاعت ہے۔

امام کی اطاعت کا وہ مقام نہیں ہو سکتا جو اللہ و رسول کی اطاعت کا ہے۔

اگر یہ تسلیم کیا جائے تو آیتِ بالا میں تین اطاعتوں کی بجائے صرف ایک ہی اطاعت باقی رہ جاتی ہے۔ پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کے بعد اولوالامر یعنی امام کی اطاعت کا دوبارہ حکم دینا بے معنی تکرار بن جاتا ہے۔ نیز پہلے اولوالامر کا ذکر آجانے کے باوجود آخر آیت "فان تنازعتم" میں مرجع نزاع اللہ و رسول کو ٹھیرانا اور فردوہ الیھم کی بجائے فردوہ الی اللہ والرسول فرمانا اور زیادہ غیر مناسب ہے بلکہ صاف فردوہ الی الامام یا اولی الامر ہونا چاہئے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ اللہ اور رسول اور اولوالامر کی

اطاعتیں جدا جدا ہیں۔ اللہ، رسول اور امام یہ تینوں الفاظ عربی زبان کے الفاظ ہیں، اللہ ورسول کے لفظ سے امام کا لفظ مراد لینا کونسا محاورہ اور کونسی لغت ہے۔ اگر اس خیال کی کوئی حقیقت ہوتی تو قرآن میں ایک آیت اس مضمون کی بھی ضرور آجاتی من یطع الامام فقد اطاع اللہ والرسول (جس نے امام کی اطاعت کی اس نے اللہ و رسول کی اطاعت کی) جیسا کہ یہ فرمادیا ہے۔

مَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ   جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا ہی کی اطاعت کی۔

پس یہ کہنا کہ اللہ اور رسول کے لفظ سے قرآن میں امام وقت کی اطاعت مراد لی گئی ہے سب سے بڑھ کر قرآن کی تحریف ہے۔ یہاں منکرین حدیث کا مفسرین کی عبارتوں سے مدد لینا نہایت نامناسب ہے جو لوگ حدیث رسول کو حجت نہیں مانتے وہ مفسرین کی آرائے سے مدد لینا کیونکر جائز سمجھتے ہیں، انھیں جو دعویٰ کرنا ہے اسے قرآن سے ہی ثابت کرنا چاہیے۔ فقرہ ۵ میں مولانا نے اتباع قرآن کو یاد رکھا ہے مگر اس آیت کو فراموش کردیا

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي   آپ کہدیجئے اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ   جو (ہمارے ان) رسول نبی امی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی تھی اے اللہ تو دنیا اور آخرت کی رحمت میرے اور میری امت کے لئے مقدر کے اس پر ان کو یہ جواب ملا کہ خدا کی رحمت کسی فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہو سکتی وہ آیندہ ہر اُس شخص کے نصیب میں آچکی ہے جو منجملہ اور اوصاف کے نبی امی کی اتباع کرے گا۔ اس کے بعد پھر قرآن نے آپ کی اور اپنی اتباع کی دعوت دی ہے یہ کس قدر صریح ظلم ہے کہ جہاں جہاں رسول کی اطاعت اور صرف رسول ہی کی اتباع کا ذکر ہے اس کو صاف حذف کردیا جائے یا اُس سے امام کی حیثیت مراد لے لی جائے۔

امام کی اطاعت کو بعینہ خدا اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جاسکتا

اس کے بعد ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ رسول کی اطاعت چونکہ خدا کے بیان، اس کی ارادہ اُس کی وحی کے بعد ہوتی ہے اس لئے اس کو بعینہ خدا کی اطاعت کہا جاتا ہے، امام پر نہ وحی آتی ہے نہ خدا کی طرف سے اس کی صواب رسی کی کوئی ضمانت دی گئی ہے۔ وہ جو حکم دیتا ہے اپنے صوابدید، اپنی فہم، اپنے علم کے مطابق دیتا ہے۔ اس لئے امام کی اطاعت کو بعینہ خدا اور رسول کی اطاعت کہنا بھی غلط ہے۔ ہاں اگر اس معنی سے کہا جاسکتا کہ امام کی اطاعت خدا اور رسول کے حکم سے کی جاتی ہے تو یہ اور بات ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت بریدہ کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو یہ فرمایا دیکھو جب دشمن کا محاصرہ کرو اور محاصرہ توڑنے کی نوبت آئے تو خدا کے فیصلہ پر محاصرہ مت توڑنا بلکہ یہ کہنا کہ میں اپنے اور اپنے ہمراہیوں کے فیصلے کے مطابق تم سے صلح کرسکتا ہوں، اگر تم خدا کا نام درمیان میں لاؤگے تو تمہارے پاس

اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان کے بارے میں جو خدا کا فیصلہ ہے وہ یقینی تمہارے سمجھ میں بھی آہی جائے گا (وحی تم پر آتی نہیں، عصمت تمہاری صفت نہیں، حفاظتِ ربانی تمہاری ضامن نہیں) اس لئے تم اپنے ہی فیصلہ کا حوالہ دینا، اس میں دوسری حکمت یہ بھی ہے کہ اگر تمہیں اس فیصلہ کا توڑ دینا قرینِ مصلحت معلوم ہو تو بآسانی توڑ بھی سکتے ہو کیونکہ خدا کا فیصلہ کہہ کر توڑنا تو آسان بات نہیں ہے ہاں اپنا فیصلہ جیسا پہلے ایک طرف تھا اب دوسری طرف بھی بآسانی بدلا جا سکتا ہے۔

اس واقعہ سے ثابت ہے کہ امام کی اطاعت کو بےشک اللہ اور رسول کی اطاعت کا مقام نصیب نہیں ہو سکتا تاکہ قرآن میں ہر جگہ اللہ ورسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لی جا سکے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے منشی نے حضرت عمرؓ کے فیصلہ پر یہ الفاظ لکھ دیئے" ھذا ما أری اللہ امیر المومنین عمرؓ (یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیر المومنین عمرؓ کے خیال میں ڈالا ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے منع فرمایا اور کہا کہ یوں مت لکھو بلکہ یہ لکھو ھذا ما رأی امیر المومنین عمرؓ (یہ وہ فیصلہ ہے جو امیر المومنین عمرؓ نے خود اپنے خیال کے مطابق صادر کیا ہے)[۱]۔ ایک مرتبہ منبر پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

ایھا الناس ان الرأی انما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیبا ان اللہ کان یریہ وانما ھو منا الظن والتکلف[۲]	لوگو دیکھو آنحضرتؐ کی رائے دین کے بارے میں اس لئے صواب ہوتی تھی کہ وہ خدا کی طرف سے ہوا کرتی تھی، ہماری رائے تو ہماری جانب سے صرف ایک اٹکل ہوتی ہے وہ قابلِ اعتماد نہیں۔

اطاعتِ رسول کی دس خصوصیات

یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن کریم سے جو خصائص ہمیں اطاعتِ رسول کے معلوم ہوئے ہیں وہ اطاعتِ امام کے ثابت نہیں ہو سکے۔

(۱) اپنے ہر معاملہ کو رسول کے سپرد کر دینا، پھر اس کے ہر فیصلہ کو حق سمجھنا اور اس پر ایسی خوشی سے راضی ہو جانا کہ خلاف ہونے کی صورت میں دل کے اندر بھی کوئی تنگی محسوس نہ ہو۔

(۲) اس کے فیصلہ کا کہیں اپیل نہ ہونا۔

(۳) اس کے فیصلہ پر رضامندی شرطِ ایمان ہونا۔

(۴) اس کا ہر فیصلہ ناطق ہونا۔

(۵) اس کی اطاعت میں ہدایت منحصر ہونا۔ وان تطیعوہ تھتدوا۔ (اگر تم اس کی اطاعت کروگے تو یقیناً راہِ ہدایت پاؤگے۔

(۶) اس کی اطاعت کا بعینہٖ خدا کی اطاعت ہونا۔

---

[۱] اعلام الموقعین۔ ج ۱ ص ۳۲۔ [۲] ایضاً۔ ج ۱ ص ۴۵۔

(۸) اس کی اتباع میں خدا کی محبت اور گناہوں کی مغفرت کا یقینی حاصل ہونا۔

(۹) کسی خاص مشورہ کی مجلس میں اس سے استیذان لازم ہونا اور اس اجازت کا معیار کمالِ ایمان ہونا۔

(۱۰) اس کی اطاعت کے لئے کسی دلیل کا محتاج نہ ہونا۔

یہ دس خصوصیات ہیں جو قرآن کریم سے صرف رسول کے اطاعت کی ثابت ہوتی ہیں۔ امام کے اطاعت کی یہ خصوصیات نہیں اس لئے قرآنِ کریم میں ہر جگہ اللہ و رسول کی اطاعت سے امام کی اطاعت مراد لینا صحیح نہیں۔ نیز اطاعتِ رسول کی ان تاکیدی آیات سے مولانا کے دوسرے خیال کی بھی تردید ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اطاعت رسالت کا حق نہیں ہے اور قرآن یہ کہتا ہے کہ سب سے بڑھ کر اطاعت کرنا رسول ہی کا حق ہے۔

مذکورہ بالا وجوہات کے سوا یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اگر اللہ و رسول سے مراد امامِ وقت ہو تو یہاں سوال یہ ہے کہ اگر امام سے ہر امام مراد ہو تو فاسق امام کی اطاعت کو بھی اللہ و رسول کی اطاعت کہا جا سکے گا اور اگر خاص صالح امام مراد لیا جائے تو خلفاء راشدین کے بعد تیرہ سو سال میں خدا و رسول کی اطاعت کا مصداق ہی شاذ و نادر ہو گا پھر جس دور میں مسلمانوں کا کوئی امام ہی نہ رہے اس میں لازم آئے گا کہ خدا اور رسول کی اطاعت کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے اور اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کا نظام معطل پڑا رہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی بیشمار آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور نجات کا راستہ صرف اطاعت خدا اور رسول میں منحصر ہے، اب اگر یہاں اطاعت سے مراد امام کی اطاعت ہو تو یقیناً تیرہ سو سال میں اماموں کا بڑا حصہ ایسا ہی ہے جن کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا اسلم صاحب کی تفسیر کے مطابق لازم آتا ہے کہ اس تمام دور میں مسلمانوں کے لئے راہِ نجات و ہدایت مسدود ہو اور مسلمانوں کے پاس اپنے باہمی نزاعات رفع کرنے کی کوئی صورت ہی موجود نہ ہو گویا دینِ اسلام ایک ایسا آئین ہو جس پر عمل کرنا دنیا کی طاقت سے باہر ہو، اب ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اس زمانہ میں مولانا کا اپنے متعلق خیال کیا ہے۔ کیا وہ اللہ و رسول کی اطاعت میں مصروف ہیں یا امامِ وقت نہ ہونے کی وجہ سے اس امر کا امتثال کرنے سے معذور ہیں۔

انتشار امت کا سبب احادیث نہیں بلکہ ترکِ احادیث ہے

فقرہ ۶ء میں انفرادیت اور انتشار کا جو باعث قرار دیا گیا ہے وہ بھی محض بے بنیاد ہے، بلکہ اگر نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو رسول کی اطاعت نہ کرنا ہی اس انتشار کا باعث ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کی مجمل آیات کی تشریح اگر عقل کے ذریعہ سے کی جائے تو موجبِ انتشار نہ ہو، اور اگر خود رسول کے بیان کے بموجب کی جائے تو انتشار کا سبب بن جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فہم انسانی کے اختلافِ مراتب ہی کی وجہ سے قرآن فہمی کا مدار انسانی عقول پر نہیں رکھا تھا بلکہ اپنے رسول کے ذریعہ خود اپنی مراد واضح کر دی تھی تاکہ عبارتی احتمالات کا دائرہ مختصر ہو جائے لیکن مولانا نہایت سادگی سے علمِ حدیث کے صفحہ ۴۴ پر یہ فرماتے ہیں۔

"بے شک آیاتِ قرآنی کے معانی سمجھنے میں بھی اختلافات ہو سکتے ہیں مگر یہ اختلافات چونکہ الفاظ وعبارات کے نہ ہوں گے بلکہ صرف فہم کے ہوں گے اس لئے مزید غور وفکر سے مٹ جائیں گے اور ان سے فرقہ بندی نہ ہو سکے گی۔"

شاید مولانا کو یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ تاریخ میں جتنے فرقے پیدا ہوئے ہیں اُن کی اصل بنیاد قرآن ہی پر ہے۔ معتزلہ خوارج، مرجیہ، جہمیہ، سب کو دیکھ لیجیے، سب کے ہاتھوں میں پہلے قرآن ہے بعد میں حدیث ہے بلکہ معتزلہ تو خبر واحد کے منکر ہیں پھر حدیث کو بدنام کرنا فضول ہے حقیقت یہ ہے کہ فرقہ بندی کا باعث نہ قرآن ہے نہ حدیث بلکہ وہ عقل ہے جو صرف اپنے اعتماد پر مذہب کا نقشہ تیار کرنا چاہتی ہے چونکہ عقل وفہم کے مراتب احادیث کے الفاظ سے زیادہ مختلف ہیں اس لئے ان کا اختلاف بھی زیادہ ہونا چاہیئے۔ مزید غور وفکر سے اختلافات نہ آج تک کبھی ختم ہو سکے نہ آئندہ ہو سکتے ہیں۔ یہ طفل تسلی منکرین حدیث کے لئے تو کافی ہے مگر واقعات کے سرتاسر خلاف ہے۔ عقلِ انسانی کی نارسائی اور قصورہی کی وجہ سے آسمان سے کتابیں آئیں، رسولوں کو ان کو سمجھانے کے لئے بھیجا گیا پھر ان کے ذریعہ سے اُس پر عمل کرا کے دکھلا دیا گیا۔ اگر عبادات و معاملات کا نقشہ صرف الفاظِ قرآنی سے تیار ہو سکتا تو رسول کا واسطہ ہی بیکار رہتا۔ پس افتراق وتشتت کا اصل منشا احادیث نہیں بلکہ خود ان کی عقل ہے جب کبھی وہ احادیث کی روشنی کے بغیر ہدایت کا راستہ تلاش کرنے میں پڑ گئی اسی وقت افتراق وانفرادیت نمودار ہونے لگی جیسا کہ ہمارے مضمون "افتراقِ امت" میں اس پر تفصیلی بحث گذر چکی ہے۔ ابو عمر حسن بن واصل سے نقل کرتے ہیں کہ پہلی امتوں میں افتراق وتشتت اسی وقت پھیلا ہے جبکہ انھوں نے اپنے انبیاء کے آثار وسنن چھوڑ کر رائے کی اتباع کرنا شروع کر دی پھر خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔[1]

صحابہ کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت

صحابہ کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سب سے پہلے، بعد کتاب اللہ کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی تلاش کیا کرتے تھے اگر وہ نہ ملتی تو اس کے بعد اپنی جانب سے جو سمجھ میں آتا فیصلہ کرتے اور اگر اس کے بعد بھی آپ کی سنت ہاتھ آجاتی تو اسی کی اتباع کرتے اور اپنے قول سے رجوع کر لیتے جیسا کہ اس کی مثالیں حدیثِ رسول کی حیثیت میں پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔ اگر بقول مولانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ان کی نظر میں صرف ایک امام کی حیثیت ہو تی تو وہ آپ کی اطاعت صرف آپ کے زمانۂ حیات سے وابستہ سمجھتے اور اس کے بعد ان کے نزدیک آپ کے قضایا اور فیصلوں کی حیثیت ایک عدالت کے فیصلے سے زیادہ نہ رہتی مولانا کے نزدیک نظمِ اسلامی کی بنیاد صرف کتاب اللہ پر ہے پھر ہر شخص اپنی عقل کے مطابق اس کے تحت میں فیصلہ کرنے کا حق رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عقل سے سمجھ کر جو فیصلے کئے ان کی حیثیت ایسا ہی ہے جیسا کہ بعد کے خلفاء نے اپنی اپنی اندازۂ عقل سے فیصلے صادر کئے جس طرح ایک خلیفہ کا فیصلہ دوسرے کے لئے حجت

---

[1] اعلام الموقعین۔ ج ا ص ۶۵

نہیں ہوتا اس کو اختیار رہے کہ اس کے ساتھ موافقت کرے یا مخالفت، یہی حیثیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے فیصلوں کی بھی ہے مگر ہمیں صحابہ کی تاریخ سے اس کے بالکل برعکس ثابت ہوتا ہے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نہیں بتا یا جا سکتا جہاں کسی صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ سنا ہو اور اس کے ثبوت کے بعد پھر اس کے خلاف فیصلے کرنے کا اپنے دل میں خطرہ بھی محسوس کیا ہو۔ یہی بات کی صریح دلیل ہے کہ ان کے درمیان آپ کی حیثیت آپ کی وفات کے بعد بھی وہی تھی جو آپ کی حیات میں تھی دونوں حالتوں میں وہ آپ ہی کا فیصلہ تلاش کرتے تھے اور جب آپ کا فیصلہ انھیں مل جاتا تھا تو دونوں حالتوں میں اس پر راضی ہو جانا اور اس کے خلاف میں اپنا اختیار باقی نہ رہنا بالکل یکساں سمجھتے تھے۔ یہ ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کسی ایک متنفس نے بھی آپ کی اطاعت میں زندگی اور وفات کے بعد ایک ذرہ برابر بھی کبھی فرق کیا ہو، ان کے نزدیک جس طرح رسول کی وفات سے اُس پر ایمان لانے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اسی طرح اس کے احکام کی اطاعت میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا، یہ ایمان منکرینِ حدیث ہی کا ایمان ہے جس میں رسول کی وفات کے بعد اس کی اطاعت سے آزادی میسر آجاتی ہے اور اس کی حیثیت ایک امامِ وقت سے بھی گھٹ جاتی ہے کیونکہ امام وقت کی اطاعت کرنا واجب ہوتی ہے اور رسول کی اطاعت اس کے بعد واجب نہیں رہتی۔ رسول کو امام اور حدیث کو اسلام کی محض ایک تاریخ کہنا اسلامی تعلیمات پر سب سے بڑا بہتان ہے جس کی تردید کے لئے ایک دلیل نہیں بلکہ مسلمانوں اور کفار کا تواتر موجود ہے لیکن جس دور میں ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں قلم ہے اپنے خیالات کے اظہار میں آزاد ہو اس میں تواتر کا انکار بھی مشکل نہیں۔

رسالت کی ضرورت

ہم پہلے یہ تفصیل یہ بتلا چکے ہیں کہ قرآن کریم کو اپنی تلاوت کے ابتدائی مرحلہ سے لیکر اپنی مراد کی تعیین اور عمل کی تشکیل کے ایک ایک گوشہ تک رسول کی احتیاج ہے۔ رسول کی ضرورت صرف اتنی بات کے لئے نہیں ہوتی کہ وہ خدا کی کتاب ہم تک پہنچا دیں بلکہ اس سے بڑھ کر اس کو سمجھانے اس پر عمل کرکے دکھلانے اپنی موعظت اور نصائح اور صحبت کے غیر معمولی اثرات سے اس پر عمل کی اسپرٹ بھی پیدا کر دینے اور اس راہ میں جو عملی مشکلات ہوں ان کو بھی دور کرنے کی جد وجہد میں لگا رہنے کے لئے ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں یہ سب فرائض یکساں طور پر نظر آتے ہیں اور یومِ بعثت سے لیکر یومِ وفات کے ایک ایک دن کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ آپ کا نصب العین اور آپ کا اصل مشن ہمیشہ ایک ہی رہا ہے جس میں دین کے قانون کو خدا کی زمین پر بلا زحمت قائم کرنا آپ کی بعثت کا وہ بڑا نصب العین سمجھا گیا ہے کہ جب تک یہ مقصد پورا نہیں ہو لیا آپ کو عالمِ قدس کی طرف بلانے کی دعوت بھی نہیں دی گئی اور جب خدا کا آئین مکمل کر دیا گیا اس کی تعلیم اور عملی تشکیل پورے طور پر کر دی گئی اور خدا کی زمین پر یہ مکمل آئین پوری تمکین وقدرت کے ساتھ نافذ

ہونے لگا تو قرآن نے یہ اعلان کر دیا کہ اب بعثت تامہ کا مقصد پورا ہو گیا ہے لہذا اب رسالت کے فرائض کے بعد صرف خلافت کے فرائض کے انجام دہی باقی ہے اس کو آپ کے خلفاء انجام دیتے رہیں گے اسی کی طرف سورہ "النصر" میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

منکرین حدیث کی یہ بڑی غلطی ہے کہ رسالت کی ضرورت کو انھوں نے صرف کتاب کی تبلیغ میں منحصر کر دیا ہو اس کے بعد اس کے دوسرے اہم گوشوں کو عقلِ انسانی کے حوالہ کر دیا ہے، قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ جن پر براہِ راست قرآن اترا کرتا تھا اگر ان کی حفاظت بھی سماوی طور پر نہ ہوتی رہتی تو بعض بعض مقامات پر پائے نبوت کو بھی لغزش ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔ رسول کی عصمت اور اس حفاظت کے باوجود قدم قدم پر انھیں استقامت اور احتیاط کی تاکیدیں کی جاتی تھیں۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا (اے پیغمبر) جیسا تم کو حکم دیا گیا ہے تم اور جو لوگ کفر و شرک سے توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہوئے ہیں اسلام پر قائم رہو اور حدِ اعتدال سے نہ بڑھو۔

ہمہ وقت وحی الٰہی انھیں متنبہ کرتی رہتی تھی کہ کہیں اُن کے فیصلوں میں خواہشاتِ نفس کا دخل نہ ہو جائے، کامل سے کامل عقل عطا فرما کر ان کو یہ جتایا جاتا تھا کہ یہ علوم صرف خدائی موہبت اور اس کا انعام ہیں تمہاری عقل و ادراک سے بالاتر ہیں۔ مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ کبھی کبھی ان کو ٹوکا بھی جاتا تھا تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ رسول بھی اپنی ذاتی عقل سے ہمیشہ خدا کی مرضیات نہیں پا سکتا اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ اگر کبھی کوئی حرکت ان کے منصب کے خلاف ان سے سرزد ہو جاتی ہے تو وحی الٰہی فوراً اس پر متنبہ کئے بغیر نہیں رہتی پس رسولوں سے عتاب آمیز خطاب اگر ہوتا ہے تو اسی بات کے ثابت کرنے کے لئے ہوتا ہے کہ جس امر کے خلاف وحی الٰہی نہ آئے اس میں رسول کی رائے خدا کا حکم سمجھنا چاہئے۔ سوچئے کہ جب دین کے معاملات میں خود رسول کے حق میں یہ نزاکتیں ہیں تو کیا قرآن فہمی، اس کی عملی تشکیل، اس کے معانی کی تعبیر، عام عقول کے سپرد کی جا سکتی ہیں اور جب اس عصمت و حفاظت کے باوجود اس کمال عقل و فراست کے باوصف رسولوں سے لغزش کا امکان ہے تو عام عقول یہاں کتنی تاریکی پیدا کر سکتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے اس کی بہت سی کوتاہیاں اس کے ذاتی ضعف کا نتیجہ ہیں۔ اگر قدرت ان کے اثرات سے محفوظ نہ رکھے تو ان کا صدور اس کے لئے لازم ہے۔ یہ قصور و تقصیرات ذاتی طور پر قابلِ ملامت نہیں لیکن اگر آئین میں یہ قصور داخل ہو جائے تو وہ ذاتی قصور نہیں رہتا بلکہ عالم کے نقصان کا باعث بن جاتا ہے اس لئے کتاب اللہ کے ساتھ رسول کے آئینی بیان میں کوئی ادنیٰ فروگذاشت برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اگر آئین سازی میں بھی عام عقلوں کا دخل ہو تو کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ اگر حق ان کی خواہشات کی پیروی کرے تو آسمان اور زمین اور

السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۔ — اس میں جو کچھ ہے سب کا نظام بگڑ جائے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَوْ یُطِیْعُکُمْ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ ۔ — اور سمجھ لو کہ تم میں خدا کا رسول ہے اگر بہت سی باتوں میں تمہاری اطاعت کرے تو تم بڑی مشقت میں مبتلا ہو جاؤ۔

معلوم ہوا کہ قانونی معاملات میں رائے عامہ کا کوئی دخل نہیں ہے یہ سب تفصیلات رسول کے حوالہ ہیں مولانا اسلم صاحب رسول کی اس عقلِ کامل کے مقابلہ میں ہمہ شما کی عقول کو ترجیح دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ آپ کے تمام فیصلوں کی وہی قدر و قیمت ہے جو ایک عدالت کے سامنے دوسری معمولی عدالتوں کے فیصلوں کی قیمت ہوتی ہے۔ مولانا کے نزدیک رسول کی ضرورت صرف قرآن کے لئے ہے۔ ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں کے لئے رسول کی ضرورت ہے جو شخص رسول کی احادیث سے مستغنی ہونا چاہتا ہے اور محض اپنی عقل سے قرآن کی تشریحات کرتا ہے وہ درحقیقت کتاب اللہ کے ساتھ آئین سازی میں شرکت کا مدعی ہے اور جو شخص اپنے فیصلوں کو رسول کے فیصلوں کے ہم پلہ سمجھتا ہے وہ درحقیقت رسول کا منکر ہے۔ بلکہ رسالت کی ضرورت ہی کا منکر ہے۔ قرآن کریم سے رسالت کی جو ضروریات ثابت ہوتی ہیں وہ صرف ایک قرآن کی تبلیغ نہیں اس کی تعلیم، اس کا بیان اور اس کی عملی تشکیل بھی اس کے فرائض میں ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ حدیث یعنی بیانِ رسول کا انکار اور رسول کا انکار ایک ہی مسئلہ ہے۔ یہ بات فراموش نہ کرنا چاہئے کہ جو شخص رسول کا صحیح مقام نہیں پہچانتا اس کی عظمت اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا وہ بھی رسولوں کے منکرین ہی کی صف میں شامل ہے فرق صرف یہ ہے کہ ایک صاف منکر ہے اور ایک اقرار نما منکر ہے۔

رسول میں رسالت اور امامت کی دو حیثیتیں نہیں ہوتیں

اسی لئے منکرین حدیث کو رسول کی عظمت ختم کرتے کرتے اس کو صرف ایک پوسٹ مین کی حیثیت دینی پڑتی ہے وہ بھی اس وقت تک جب تک کہ ڈاک کا تھیلا اس کے گلے میں ہو، جونہی کہ وہ تبلیغ رسالت سے فارغ ہوا اس کے بعد پھر فوراً اماموں کی صف میں آکر شامل ہو جاتا ہے اس کی رسالت کے تمام حقوق اس سے مسلوب ہو جاتے ہیں اور وہ عام اماموں کی طرح ایک امام بن جاتا ہے مگر میں یہ کہتا ہوں کہ شاید یہی اس کو یہاں بھی اطمینان کی زندگی نصیب نہ ہو اور جب تک وہ امام کے فرائض انجام دے امام سمجھا جاتا ہو اور جب اس سے بھی فارغ ہوئے تو پھر رسول اور امام دونوں حیثیتوں سے نکل کر اسے عام انسانوں کی صف میں آنا پڑتا ہو۔ کیا کوئی بتلا سکتا ہے کہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) دن بھر میں صرف چند لمحات کے لئے تو بہ حیثیتِ رسول سمجھے جاتے تھے پھر کچھ وقت کے لئے بہ حیثیتِ امام، اس کے بعد عام حیثیات میں صرف معمولی انسانوں کی حیثیت میں سمجھے جاتے تھے اگر منبر اور مصلیٰ، میدانِ جنگ اور مدینہ، محفل اور بستر خواب پر آپ کی ایک ہی حیثیت سمجھی گئی ہے

تو پھر معلوم نہیں کہ مولانا نے ان حیثیات کی تقسیم از خود کہاں سے پیدا کرلی. پھر امامت و رسالت کے حقوق بھی متضاد
حقوق ہیں. رسول پر بقول مولانا صرف ایمان لانا واجب ہے مگر امام پر ایمان نہ لانا ضروری ہے. آپ بیک وقت
لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے تھے اور اسی وقت اپنی اطاعت کا امر بھی فرماتے تھے. مگر کبھی یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ
آپ نے اپنے ان متضاد حقوق کو اپنے دو مختلف منصبوں سے خود متعلق سمجھا ہو یا دوسروں کو اس پر کبھی تنبیہ کی ہو
پھر اس وقت اُن امی مخاطبین کے لیے جنھوں نے منطق کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا رسالہ بھی نہیں پڑھا تھا یہ تقسیم کرنا
کتنا مشکل ہوتا ہوگا. کہ وہ ان متضاد حقوق کو ہمیشہ دو مختلف حیثیتوں کے ساتھ جدا جدا ملحوظ رکھیں جب محمد عربی
(صلی اللہ علیہ وسلم) بہ حیثیتِ رسول ظاہر ہوں تو اُن پر فوراً ایمان لے آئیں اور جب بہ حیثیتِ امام نمودار ہوں تو
ان کا انکار کردیں اور کہدیں کہ یہ انکار بہ حیثیتِ امامت ہے نہ بہ حیثیتِ رسالت. یا یہ اطاعت بہ حیثیت امامت ہے
نہ بہ حیثیتِ رسالت. پس حق بات یہ ہے کہ آپ کی ذات میں ذہنی لحاظ سے خواہ کتنی بھی حیثیات پیدا کردی جائیں
مگر آپ نبوت سے سرفرازی کے بعد سے یوم وفات کے ایک ایک لمحہ تک بھی حیثیتِ رسالت سے علیحدہ نہیں ہوئے
ہمیشہ آپ پر ایمان، آپ کی اطاعت آپ کی عظمت اسی منصب کے ماتحت ہوئی اور آج بھی آپ پر ایمان آپ
کی اطاعت اور آپ کا احترام اُسی منصبِ رسالت کے اعتبار سے ہے اور تا قیامت اسی حیثیت سے کیا جاتا
رہے گا اس کے خلاف جو کچھ ہے وہ سب حق کے خلاف ہے.

اسوۂ رسول کی حیثیت

یہ سوال بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ رسالت اور امامت کی دو حیثیتوں کی تقسیم کے بعد
یہ بتایا جائے کہ اسوۂ رسول کی پیروی کس حیثیت سے ہے اگر حیثیتِ رسالت سے ہو تو اطاعت اس کا حق
نہیں. اس حیثیت سے رسول کا حق صرف اس پر ایمان لانا ہے اور اگر بہ حیثیت امامت قرار دی جائے تو پھر اسوۂ رسول
ہی کی خصوصیت کیا ہے ہر امام اسوۂ حجت بن سکے گا. اگر یہ کہا جائے کہ اسوۂ رسول بعینہ قرآن پاک ہے لہذا
اس کی اطاعت قرآن کی اطاعت میں درج ہے تو یہ بتانا چاہئے کہ جب کتاب اللہ اور اسوۂ رسول میں کوئی
فرق ہی نہ تھا تو پھر قرآن کے بعد اسوۂ رسول کی ضرورت کیا تھی. اور اگر اس اسوہ میں کچھ تفصیلات قرآن سے زیادہ
تھیں تو پھر اس زیادتی میں رسول کی اطاعت کا جواب دیا جائے کہ وہ کس حیثیت سے ہے، رسالت کی حیثیت
سے اطاعت واجب ہو نہیں سکتی اور امامت کی حیثیت اسوہ بننے کے قابل نہیں. مولانا اسلم صاحب ایک طرف
تو رسول کے مطاع ہونے کا انکار کرتے جاتے ہیں دوسری طرف اسوۂ رسول کو متواتر کہہ کر اس کی پیروی کرنا بھی
لازم قرار دیتے جاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ انھوں نے اسوۂ رسول کو متواتر کہہ کر معاملہ کی نوعیت صاف کردی ہے
حالانکہ یہاں سوال تواتر کا نہیں ہے بلکہ یہ سوال ہے کہ اگر رسول اصولاً مطاع ہوتا ہی نہیں تو پھر اس کے اسوہ
کی پیروی کیسے لازم ہو سکتی ہے. دیکھئے امامت کا حق اگر ایمان نہیں تھا تو کسی امام کے اسوہ کے متواتر ہونے سے

کیا اس پر ایمان لانا اس کا حق ثابت ہو سکتا ہے۔ پس اگر رسول خود مطاع نہیں ہوتا تو اس کا اسوہ متواتر ہو یا غیر متواتر کیسے مطاع ہو سکتا ہے ہاں اگر پہلے اطاعت رسول کا حق تسلیم کر لیا جائے تو پھر بعض اعمال کی اطاعت اور بعض کی اطاعت نہ کرنے میں تواتر یا غیر تواتر کا عذر پیش کرنا معقول ہو سکتا ہے۔ پس اسوۂ رسول کو حجت تسلیم کر لینا اس کا اقرار کر لینا ہے کہ رسول مطاع ہوتا ہے بلکہ مطاعوں میں بھی وہ مطاع ہوتا ہے جس کی اطاعت سب سے بڑھ کر واجب ہے۔ اسوۂ رسول کو تسلیم کر کے اطاعتِ رسول سے انکار کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں مولانا نے اس پر غور ہی نہیں فرمایا کہ اسوۂ رسول کی اتباع کا اقرار کر لینا ان کے حق میں اتنی بڑی اطاعت کا اقرار کر لینا ہے جو کسی امام کے لئے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسولوں کا علی الاطلاق اسوہ ہونا ان کی عصمت کا نتیجہ ہوتا ہے جو ہر گناہ سے منزہ اور ہر معصیت سے مبرا ہو حتی کہ اس کے خطرات بھی خدا تعالیٰ کے زیر نگرانی ہوں، اس کی کوئی بات اپنی خواہشِ نفس سے نہ ہو۔ وہی اس قابل ہے کہ اس کی ذات کو علی الاطلاق نمونہ کہہ دیا جائے اسی کا ہر عمل مقبول، ہر قول حق اور ہر ادا محبوب ہو سکتی ہے اور وہی اس قابل بن سکتا ہے کہ تمام مخلوق کو آنکھ میچ کر اس کے اتباع کی دعوت دیدی جائے اس حیثیت کو تسلیم کر کے مولانا اسلم صاحب کا یہ کہنا کہ رسول کی اطاعت کسی معمولی جزئی میں بھی واجب نہیں ہے کتنا عجیب دعویٰ ہے۔

اسوۂ رسول اور حدیث

اسوۂ رسول کو حدیث سے بالکل ایک جدا شعبہ سمجھنا بھی بڑی غلطی ہے اس غلطی کا اصل سبب یہ ہے کہ مولانا اسلم صاحب نے خود بخود یہ خیال قائم کر لیا ہے کہ تمام اسوۂ رسول متواتر ہے اب چونکہ حدیث کا متواتر ہونا وہ تسلیم نہیں کرتے اس لئے انہوں نے اسوۂ رسول کو حدیث سے ایک جدا چیز سمجھ لیا ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حدیث صرف اُس حصہ کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے متعلق ہے اسلئے آپ کے افعال حدیث میں شمار نہیں کرتے۔ حالانکہ آپ کا ہر قول اور آپ کا ہر عمل سب حدیث کا جزء ہے، اسی طرح اسوۂ رسول صرف عمل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ آپ کا قول و فعل جو کچھ بھی ہے وہ سب امت کے لئے نمونہ ہے۔ کچھ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی پر موقوف نہیں بلکہ رسول کی ذات جسطرح ان کے بارے میں اسوہ ہے اسی طرح فصلِ خصومات، امت کے نظم و نسق اور دیگر ضروریات میں بھی اسوہ ہے حتیٰ کہ خوش طبعی، ہنسی اور مسکراہٹ کے طور و انداز میں بھی قرآن کریم نے کسی ادنیٰ تفصیل کے بغیر تمام امور میں آپ کی ذات کو اسوہ کہا ہے اور کوئی معمولی سے معمولی اشارہ بھی اس طرف نہیں کیا کہ نماز روزہ یا عبادات کی تشریح کے سوا بقیہ امور میں آپ کی ذات اسوہ نہیں ہے جن لوگوں نے یہاں کوئی تفصیل کی ہے وہ خود ان کے دماغ کی ایجاد کردہ ہے اور وہ خود ہی اس کے ذمہ دار ہیں۔ قرآن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا اسلم صاحب اسوۂ حسنہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

• بیشک قرآنِ کریم نے ان تفصیلات کو اپنے ذمہ نہیں لیا مگر اس نے اپنے احکام کی عملی تشکیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے سپرد کردی ہے۔ . . . . وہ عملی نمونے بسلسلۂ متواتر چلے آرہے ہیں اور بالکل یقینی ہیں۔ . . . اور یہ آپ کی تعلیم و تبیین دینی ہے لیکن وہ وہی عملی تشریح یعنی اسوۂ حسنہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا۔" (علم حدیث ص ۳۴۶)

صحابہ کے دور میں اسوۂ حسنہ کا عموم

(۱) عبداللہ بن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا گیا، ایک شخص نے یہ نذر کی ہے کہ وہ ہمیشہ روزہ رکھا کرے گا۔ اتفاق وقت کہ اس کے بعد ہی عید الاضحیٰ یا عید الفطر آگئی، کیا وہ ان ایام میں بھی روزہ رکھے فرمایا نہیں اور یہ آیت پڑھی لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. آنحضرتؐ بقر عید اور عید الفطر میں نہ خود روزہ رکھتے تھے نہ روزہ رکھنا پسند کرتے تھے۔[1]

(۲) سعید بن جبیرؒ کہتے ہیں اگر ایک شخص اپنے نفس پر کوئی چیز حرام کرلے تو اُسے کفارۂ یمین ادا کرنا چاہئے اس کے بعد ابن عباسؓ نے یہ آیت تلاوت کی۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔[2]

(۳) عمرو بن دینارؒ کہتے ہیں ہم نے ابن عمرؓ سے ایک شخص کے متعلق مسئلہ دریافت کیا جس نے عمرہ کا طواف تو کرلیا ہے مگر ابھی صفا و مروہ کی سعی نہیں کی کیا وہ اپنی بی بی سے صحبت کرسکتا ہے فرمایا (نہیں) کیونکہ جب آپ مکہ مکرمہ تشریف لائے تھے تو آپ نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پاس رکعتین طواف ادا فرمائیں (پھر درمیان میں حلال نہیں ہوئے) اس کے بعد صفا و مروہ کی سات مرتبہ سعی کی اور یہ آیت پڑھی۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔[3]

(۴) نافع کہتے ہیں ابن عمرؓ نے عبداللہ بن الزبیرؓ کی شہادت کے سال حج کا ارادہ کیا، لوگوں نے عرض کیا ہمیں امسال جنگ کا اندیشہ ہے ایسا نہ ہو کہ لوگ آپ کو حج ادا کرنے سے روک دیں آپ نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ اگر انھوں نے مجھے روکا تو میں وہی عمل کروں گا جو ایسے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور یہ آیت پڑھی لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔[4]

(۵) زیاد بن جبیرؒ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ ابن عمرؓ ایک شخص کے پاس آئے وہ اپنے اونٹ کو بٹھا کر نحر کر رہا تھا فرمایا کہ اسے کھڑا کرکے نحر کرو سنۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اسی طرح تھا۔[5]

(۶) عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں میں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا حجر اسود کو بوسہ دیتے تھے اور فرماتے تھے اگر میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز بوسہ نہ دیتا۔[6]

(۷) ایک شخص نے حجرِ اسود کے استلام کے متعلق ابن عمرؓ سے مسئلہ دریافت کیا انھوں نے فرمایا میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے اُس نے کہا اگر بھیڑ ہو، اگر موقعہ نہ مل سکے فرمایا اگر اگر کو تو یمن میں پھینک، میں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو استلام کرتے اور بوسہ دیتے دیکھا ہے۔[7]

---

[1] بخاری ص ۲۹۲۔ [2] ایضاً ص ۷۲۹، [3] ص ۲۲۱۔ [4] ص ۲۳۱۔ [5] ۲۳۱۔ [6] ص ۲۱۸ [7] ۲۱۹

پہلے چار واقعات میں صراحت کے ساتھ صحابہ نے اسوۂ حسنہ کی آیت پیش کی ہے اور آخر کے تین مواقع میں اگرچہ اس آیت کو تلاوت نہیں کیا مگر یہاں بھی اسی کے ہم معنی الفاظ ادا فرمائے ہیں۔ ان ساتوں واقعات سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ اختلافی مقامات پر بھی کبھی کسی نے اسوۂ حسنہ کو صرف قرآنی احکام یا امورِ متواترہ کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھا بلکہ جس کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فعل ثابت ہو گیا وہ اس کے یہاں اسی اسوۂ حسنہ کا جزء سمجھا گیا۔ یہاں اگر کوئی بحث پیدا ہو سکتی تھی تو صرف یہ کہ اس فعل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد کیا تھا مگر ایک واقعہ میں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسوۂ حسنہ کے مصداق میں صحابہ کے درمیان کوئی اختلاف ہوا تھا اس لئے پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سلف کے دور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جملہ افعال اسوۂ حسنہ کے جزء شمار ہوتے تھے خواہ قرآن کریم نے ان کی صراحت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اسوۂ رسول کا تواتر

یہاں سوال یہ ہے کہ جن احکام کی تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی تھی وہ شریعت کے کسی خاص باب سے متعلق تھی یا تمام ابواب سے۔ پہلی صورت میں بقیہ ابواب کی تشکیل کس کے سپرد رہی اور جن ابواب کی تشکیل آپ نے کی کیا یہ تمام تشکیل بطریق تواتر ہم تک منقول ہے اگر تمام کی تمام منقول نہیں تو جو رہ گئی اس کی تکمیل کی اب کیا صورت ہے۔ دوسری صورت میں اگر تمام ابواب کی تشکیل آپ ہی کے سپرد تھی تو یقیناً اس کو تواتر کے طور پر منقول ہونا چاہئے۔ ہمارے نزدیک شریعت کے ہر ہر باب کی عملی تشکیل کے تواتر کا ثبوت بہت زیادہ تأمل کا محتاج ہے۔ تمام ابواب تو درکنار ایک نماز ہی کو لے لیجئے اس کی کسی ایک صورتِ عمل کے متعلق بھی تواتر کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان چونکہ اکثر حنفی مذہب رکھتا ہے اس لئے اگرچہ یہاں اس کی ایک ہی صورتِ عمل نظر آتی ہے اور اس لئے یہ مغالطہ لگ سکتا ہے کہ نماز کی یہی صورت شاید متواتر ہو لیکن جب آپ بلادِ مغرب اور حجاز پر بھی نظر ڈالیں گے جہاں اکثر مالکی اور شافعی آباد ہیں تو وہاں آپ کو نماز کی شکل ہندوستان سے بالکل مختلف نظر آئے گی اور کسی ایک صورت پر بھی آپ تواتر کا حکم نہ لگا سکیں گے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف مولانا موصوف اسوۂ حسنہ کے عملاً مسلسل اور متواتر ہونے کا دعویٰ کرتے جاتے ہیں اور دوسری طرف امت کے موجودہ عمل کو قرآن کے خلاف بھی کہتے جاتے ہیں۔ اگر درحقیقت نماز کی جو موجودہ تشکیل ہے وہ قرآن اور اسوۂ حسنہ کے مطابق نہیں ہے تو پھر اس کے خلاف جو تشکیل ہے وہ بتانی چاہئے کیا ہے اور کیا اس پر تواتر کے ساتھ عمل ہو رہا ہے۔ اگر نماز کی ان سب صورتوں میں سے کسی قدر مشترک صورت کو مولانا متواتر فرمائیں تو پھر بھی مولانا کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اتنی بات سے نماز کے اجزاء کا تواتر تو ثابت ہو سکتا ہے مگر نماز کی کسی ایک مجموعی صورت کا تواتر پھر ثابت نہیں ہوتا۔ شاید مولانا نے

عملی تواتر کے مفہوم پر بھی غور نہیں کیا ہے اور صرف اپنے ایک ذہنی مجوزہ نقشہ کو متواتر سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ تواتر کوئی ذہنی چیز نہیں اس کو خارج میں ناقابلِ انکار طور پر نظر آنا چاہئے۔

نماز کو چھوڑ کر اب ذرا زکوٰۃ کی طرف توجہ فرمائیے یہاں وہ کونسی تشکیل ہے جس کو عہدِ نبوت سے لیکر آج تک برابر متواتر کہا جاسکتا ہے یاد تیں ہو گئیں کہ حیوانات کی زکوٰۃ، عشر، وخراج کے مسائل کا تخم ہی مٹ چکا ہے حتیٰ کہ آج ہندوستان میں یہ کسی کو یاد بھی نہیں رہا کہ شریعت میں کبھی حیوانات کی زکوٰۃ بھی لی گئی تھی۔ اکثر مسائل طلاق عدت، نفقہ و سکنیٰ اور ایلاء کی عملی تشکیل کا حال بھی یہی ہے۔ اسی طرح جہاد کا تمام باب، غنائم کی سب تفصیلات فدیہ اور قیدیوں کے جملہ احکام، تدبیر و کتابت، ام ولد اور عتق کے سب مسائل کا نام و نشان تک نابود ہو چکا ہے۔ تواتر تو کجا۔ یہی حال معاملات یعنی بیع و شراء، رہن و وقف کا ہے حدود و تعزیرات کا تو دنیا کے کسی خطہ پر نفاذ ہی نہیں بلکہ خود بعض مسلمانوں کو کفار کے اتباع میں ان کی مشروعیت پر بھی اعتراض ہے۔ مولانا تو دین کی بنیاد متواتر اسوۂ حسنہ پر قائم کرنا چاہتے ہیں مگر یہاں ہمیں تواتر کی بجائے آج اس کا وجود ہی نظر نہیں آتا۔ کاش امتِ محمدیہ اگر اس اسوۂ حسنہ پر تواتر کے ساتھ نہ ہی متفرق ہی عمل کرتی رہتی تو مسلمانوں کو آج زوال کا یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ پس یا تو مولانا کو صاف یہ کہنا چاہئے کہ قرآن خود اپنا بیان ہے اس کو کسی اور بیان کی احتیاج ہی نہیں اور اگر یہ احتیاج مسلم ہے تو پھر اس کو صرف اسوۂ حسنہ کے ساتھ مقید کرنا مناسب نہیں اور اگر مخصوص کیا ہے تو اس کے تواتر کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دین کی تشکیل کے متعلق تواتر کا دعویٰ کرنا چاہتا ہے یہ صرف خوشنما اور خوش کن الفاظ ہیں جو موجودہ دین کی صورتِ عمل کی تخریب میں تو کارآمد ہو سکتے ہیں لیکن اس کی کسی جدید صورت کی تعمیر کے لئے ہرگز کارآمد نہیں ہو سکتے۔

مولانا موصوف نے دین کے ہر ہر جزء کے متعلق تواتر کا دعویٰ کر کے دین کو کوئی نفع نہیں پہنچایا بلکہ ایک طرف اس کے بہت بیش قیمت حصہ کو دشمنوں کے ساتھ خود بھی فنا کرنے کا سامان کر دیا ہے اور دوسری طرف اس امت کے اُس خصوصی امتیاز کو بھی مٹا دیا ہے جو اُسے دوسری امتوں کے بالمقابل عطا کیا گیا تھا۔

یہ بات سوچنا چاہئے کہ دنیا ایک محقق فیلسوف، ایک عارفِ کامل، ایک مجرب حکیم یہاں تک کہ ایک شاعرِ بلیغ کے حالات کو بھی جب بنظرِ احترام دیکھنا اپنا فرض سمجھتی ہے اس کے ایک ایک ٹکڑے کی تلاش کرتی ہے، اس کے ایک ایک حرف کو قدیم تاریخوں سے جمع کرتی ہے پھر اگر کسی قدیم شخص کی کوئی ایسی یادگار طبع کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اسے اپنی حیوۃ کے شاہکاروں میں ایک بڑا شاہکار شمار کر لیتی ہے مگر یہاں تذکرہ کسی شاعر یا حکیم کا نہیں بلکہ رسولوں میں بھی اس رسول کا ہے جس کو آخری ہدایت دے کر بھیجا گیا تھا۔ اگر ہم ایک فیلسوف یا ایک حکیم، یا ایک شاعر کے حالاتِ زندگی سے ناواقف رہیں

تو اس کا نقصان ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ تک محدود رہے گا۔ مگر یہاں تذکرہ کسی ایسی ہستی کا نہیں ہے جس کی علمی یادگار کی پراگندگی سے صرف کسی ایک کتاب کے چند اوراق پراگندہ ہوتے ہیں یا صرف کسی ایک جلیل القدر ہستی کی تاریخ زندگی مٹتی ہے یا کسی خاص فرد یا جماعت کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ یہاں اُس کا تذکرہ ہے جس کے آثار ہستی مٹنے سے کتابِ ہستی ہی کے اوراق پراگندہ ہوئے جاتے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ جب کسی شخص کی اندرونی اور بیرونی زندگی کو اس استیعاب کے ساتھ دیکھنے کا قصد کیا جائے تو اس کے لئے بہت بڑی جدوجہد کی حاجت ہونی چاہئے۔ مگر جس کی زندگی کو عالم کے لئے اسوۂ حسنہ بنا دیا گیا تھا اس کو قدرت نے خود کچھ اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اگر آج بھی کوئی شخص اُسے دیکھنا چاہے تو بلاشک وشبہ دیکھ سکتا ہے، صرف اس کی عبادات ومعاملات ہی کا پہلو نہیں، صرف اس کی گفتگو اور غصہ وسکراہٹ نہیں بلکہ ہر گفتگو کا انداز بھی اور غصہ وسکراہٹ کی ایک ایک ادا بھی۔ یہاں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ازسرِ نو تاریخ کے اوراق تلاش کئے جائیں اور آپ کی زندگی کو دنیا کے مشاہیر افراد کی زندگی سے علیحدہ کیا جائے، پھر آپ کی زندگی کے حالات میں صحیح وغلط کو چھانٹا جائے پھر محض قیاسات کے ذریعہ آپ کی زندگی کے واقعات کو اس طرح ترتیب دے لیا جائے جیسا کہ دنیا کی دوسری شخصیتوں کے واقعات ترتیب دے لئے گئے ہیں بلکہ یہاں آپ ہی کے سامنے آپ کی زندگی مرتب ہوئی ایک ایک دن کے واقعات محفوظ کئے گئے اور محض تاریخ کے طور پر نہیں بلکہ آئینِ حیات اور زندگی کے دستور العمل کے طور پر اس کے بعد آپ نے صحابہ پر یہ بھی لازم کر دیا تھا کہ وہ اس زندگی کو بے کم وکاست غائبین تک پہنچا دیں تاکہ آپ کا اسوۂ حسنہ پورے استیعاب کے ساتھ نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتا چلا جائے اور جو فائدہ موجودین کو پہنچا تھا وہی غائبین کو بھی پہنچ جائے۔ ظاہر ہے کہ ان واقعات میں جب آپ کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پھر اجتماعی زندگی میں بہت بڑی جماعت اور محض چند افراد کے درمیان کی زندگی بھی شامل ہے تو لازمی طور پر آپ کی حیاتِ طیبہ کے بعض واقعات بڑی جماعتوں سے منقول ہوں گے اور بعض محض چند افراد یا ایک فرد سے مثلاً حج کا معاملہ ہے جسے ہزاروں نے دیکھا اس کے ناقلین بھی بکثرت ہونے چاہئیں، یہاں ناقلین کی قلت یقیناً یہ شبہ پیدا کر سکتی ہے کہ جو واقعہ اتنی بڑی جماعت کے ساتھ پیش آیا ہے اس کے نقل کرنے والے صرف ایک یا دو افراد کیوں ہیں لیکن جو آپ کی انفرادی زندگی ہے یا اسلام کے ابتدائی دور کے واقعات ہیں یا کسی ایک شخص سے استفسار پر اس کو علیحدہ جواب دیا گیا ہے یا تہجد کے وقت کسی خاص خادم کے ساتھ کوئی گفتگو ہوئی ہے یا حاجتِ انسانی کو جاتے، آتے، کسی سے آپ نے کچھ فرمایا ہے اور اس قسم کے سیکڑوں واقعات ہو سکتے ہیں جن کے سننے والی ہمیشہ جماعتیں نہیں ہوئیں۔ آپ کی یہ زندگی افراد یا فرد واحد ہی کے ذریعہ سے جماعتوں تک پہنچی ہے اس سے آگے وہ واقعات ہیں جن کا

دیکھنے والا ایک شخص بھی نہ تھا یعنی ازواجِ مطہرات کے ساتھ آپ کا اسوۂ حسنہ، شب کے تاریکیوں میں آپ کی آہو زاری آپ کا نالہ و بکا، آپ کی عاجزانہ نمازیں، آپ کی لمبی لمبی قرائتیں، رو رو کر قرآن پڑھنا اور گڑگڑا کر امت کے لئے دعائیں کرنا یہ سب امہات المومنین کے ذریعہ امت کو پہنچا ہے حتیٰ کہ آپ کے تہجد کی رکعات اور اس کے رکوع و سجود کی کیفیت، درمیانی وقفے، اوقات کی تقسیم اس کے طول و قصر کے حالات جتنے بسط و شرح کے ساتھ حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں شاید ہی کسی اور صحابی سے مروی ہوں۔ اگر درحقیقت آپ کا اسوۂ حسنہ ان سب واقعات کو حاوی ہے اور حاوی ہونا چاہئے تو کیا یہاں تواتر کی قید لگانا کوئی صحیح احساس کہا جاسکتا ہے۔ جہاں اصل خبر اور اس کی ابتدا ہی فردِ واحد سے شروع ہو، اس کے لئے تواتر کا مطالبہ کرنا کتنا نامعقول ہے اس قید کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساٹھ سالہ حیات میں سے آپ کی طفولیت، آپ کے حرا کے قیام، اور آپ کے دوسرے انفرادی واقعات سننا ہی نہیں چاہتے، اور چلئے اگر آپ کو قبل از نبوت کے واقعات سے دلچسپی نہیں ہے تو نبوت کے بعد کے واقعات میں بھی آپ صرف وہی واقعات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو اتنے کثیر مجمع میں پیش آئے ہوں جن کو تواتر کی مقدار کہا جا سکتا ہو پھر اس پر بھی آپ راضی نہیں ہیں جب تک کہ ہر زمانہ میں اس کے ناقلین اسی قدر موجود نہ ہوں کیا قرآن نے عالم کے سامنے آپ کا جو اسوۂ حسنہ پیش کیا تھا وہ صرف اُن ہی چند واقعات کا مجموعہ تھا جو آج ہم تک بطریق متواتر پہنچا ہے کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کے دیکھنے والوں کے لئے بھی ظن و یقین کی کوئی بحث تھی یا جتنے واقعات جس کے سامنے گذر گئے وہ اس کے نزدیک ہر تواتر سے بڑھ کر قابلِ یقین تھے۔ پس جب اُن کے سامنے آپ کی زندگی سب کی سب اسوۂ حسنہ تھی تو ہمیں بھی اس پورے اسوۂ حسنہ کو تلاش کرنا چاہئے۔ یہاں تواتر کی قید لگانا دوسرے لفظوں میں اسوۂ حسنہ سے انکار کرنا ہے کیونکہ تواتر کے لحاظ سے آپ کے اسوۂ حسنہ کا جو حصہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ نہ ہماری ضروریات کے لئے کافی ہے نہ قرآن کے ایضاح و بیان کے لئے اس لئے اس قید سے ہمارا شرعی نقصان بھی ہے اور تاریخی بھی۔ اور صرف ہمارا ہی نہیں بلکہ تمام نسلِ انسانی کا کیونکہ اس کی سب سے بڑی محرومی یہ ہوگی کہ جو انسان اس کے شعبۂ حیات مکمل کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا صرف اپنے قول سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی اس کے اکثر حالاتِ زندگی اُس سے پوشیدہ رہ جائیں اور جتنے کچھ پایۂ ثبوت کو پہنچیں اگر ان کو چھانٹے ..... بغیر سب کو متواتر تسلیم کرلیا جائے تو وہ بھی اس کی بہت ہی محدود زندگی کے بہت محدود شعبے ہوں۔ یہاں یہ جواب دینا کہ غیر متواتر اسوۂ حسنہ کو تاریخی طور پر ہم بھی تسلیم کرتے ہیں بہت غلط ہے کیونکہ ہماری بحث اس وقت اس اسوۂ حسنہ سے ہے جو قرآن کریم نے صحابہ کے سامنے بہ حیثیت شرعی پیش کیا تھا۔ یقیناً وہ تواتر اور غیر تواتر کی بحث سے بالاتر تھا اور بلاشبہ اس میں تشریعی حیثیت کے سوا صرف تاریخی

حیثیت نہ تھی۔ آپ کی ذاتِ مجسم اُن کے مشاہدہ میں تھی اور وہ سب کی سب ان کے لئے اسوہ قرار دی گئی تھی اور تواتر کی قید سے اس تمام اسوہ کا صرف وہی حصہ ہمارے لئے بچ رہتا ہے جس میں تواتر کی شروط پائی جائیں یہ مقدار اصل اسوۂ حسنہ کی نسبت عشر عشیر بھی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک قرآن فہمی کے لئے صرف عقل کافی ہے جیساکہ وہ عبارتِ مذکورہ میں اس کو بہت صفائی کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کریم نے لفظِ اسوہ کو بہت تاکیدی طور پر ذکر کیا ہے اس لئے بادلِ ناخواستہ اُسے بھی مولانا کو نبھانا پڑ رہا ہے ورنہ کھلے دل سے ان کے نزدیک اسوۂ رسول کی حاجت بھی نہیں ہے، جب رسول کے کلام سے اس کو استغنا ہو سکتا ہے تو اس کے افعال کی احتیاج چہ معنی دارد۔ ان کے خیال میں رسول قرآن پہنچا کر اپنے منصب سے علیحدہ ہو گیا۔ اب وہ جو چاہے کہے اور جو چاہے کرے یہ سب اس کے شخصی افعال و اقوال ہیں جن کا اسلام میں بشرطِ ثبوت صرف اتنا ہی احترام ہو سکتا ہے جتنا کہ تاریخ کا۔ ہمارے خیال میں اس احترام کے تمام منصف مورخین بھی قائل ہیں۔ پس اگر منکرینِ حدیث بھی اس کی حیثیت اتنی ہی سمجھتے ہیں تو اس میں مسلم و کافر کی بھی کوئی تقسیم نہیں ہے بلکہ دیگر مورخین تو اسلام کی اس امتیازی جدوجہد سے بہت متاثر بھی نظر آتے ہیں مگر مولانا اس تاریخی جدوجہد سے متاثر بھی نہیں بلکہ اپنی تصنیف علمِ حدیث میں اس پر لو بھبتیاں کس رہے ہیں[1] جس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا موصوف کے باطن میں بہ حیثیتِ تاریخ بھی کتنا حدیث کا احترام ہے۔

---

[1] ملاحظہ فرمائیے ڈاکٹر اسپرنگر تو یہ لکھتا ہے " نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔"

ڈاکٹر اسپرنگر کے اس قول سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کا شغف فنِ حدیث سے صرف تاریخ کی حد تک تھا یا تشریعی حد تک۔ اب مولانا کا احساس دیکھئے۔

" مگر حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ لاکھ میں سے ایسے حضرات کے سوا جنھوں نے اعلاء کلمۃ الحق یا ملت کی تعمیر کے کارنامے چھوڑے ہیں بقیہ کے متعلق جن کا کام سوائے روایت کشی کے اور کچھ نہ تھا، یہ دریافت کرنا کہ ان کا نام کیا تھا ان کی کنیت کیا تھی۔ ان کے کون کون استاد تھے اور کون کون شاگرد، ان کی کس قدر روایتیں صحیح ہیں اور کس قدر غلط وغیرہ وغیرہ۔ کوئی مفید یا قابلِ فخر تاریخی علم نہیں ہے بلکہ ملت کے لئے ایک قسم کی دماغی تعزیر ہے جو روایت پرستی کے سبب ملی ہے۔" (علم حدیث ص ۲۷)

اسی کتاب میں آپ دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں " محدثین میں شروع سے لیکر آج تک جو اہم اور معرکۃ الآرا امور زیرِ بحث رہے ہیں بالعموم اس قسم کے ہیں جن کا ملت کی صلاح و فلاح اور اجتماعی زندگی سے کوئی عملی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً حضرت ابو بکرؓ افضل ہیں یا حضرت علیؓ۔ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ رات کے پچھلے پہر اللہ تعالیٰ سماءِ دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے۔ قیام نماز میں ہاتھوں کو باندھنا چاہئے یا نہیں۔ کیا امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنا ضروری ہے۔ آمین زور سے کہی جائے یا آہستہ وغیرہ وغیرہ۔"

ان عبارات سے آپ کو صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ مولانا موصوف کے قلب میں حدیث کا صحیح مقام کیا ہے۔ حدیث پر تشریعی یا تاریخی حیثیت سے بحث کرنا ہے یا اصل مقصد اس سلسلہ کو بے وقعت بنا کر نابود کرنا ہے۔

سند صرف اسلام کی خصوصیت ہے

حافظ ابن حزمؒ تحریر فرماتے ہیں کہ پہلی امتوں میں کسی کو یہ توفیق میسر نہیں ہوئی کہ انبیاء رسول کے کلمات صحیح صحیح ثبوت کے ساتھ محفوظ کرسکے یہ صرف اس امت کا طرۂ امتیاز ہے کہ اس کو اپنے رسول کے ایک ایک کلمہ کی صحت اور اتصال کے ساتھ جمع کرنے کی توفیق بخشدی گئی ہے۔ آج روئے زمین پر کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جو اپنے پیشوا کے ایک کلمہ کی سند بھی صحیح طریق پر پیش کرسکے۔ اس کے برخلاف اسلام ہے جو اپنے رسول کی سیرت کا ایک ایک شوشہ پوری صحت واتصال کے ساتھ پیش کرسکتا ہے۔

دین کے ثبوت کی چھ صورتیں

ہمارے دین کی معتبر اور غیر معتبر طور پر منقول ہونے کی کل چھ صورتیں ہیں۔

(۱) پہلی صورت میں شرق سے لیکر غرب تک مسلم و کافر سب شریک ہیں، یہاں منصف و معاند کی بھی کوئی تفصیل نہیں ہے جیسا قرآن کریم۔ تمام عالم اس کا شاہد ہے کہ جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے یہ وہی قرآن ہے جو آپ پر نازل ہوا تھا۔ اسی طرح پنجوقتہ نماز، رمضان کے روزے، زکوٰۃ، حج اور اسی قسم کے وہ احکام جو قرآن کریم میں منصوص ہیں سب تواتر کے ساتھ ثابت ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے مذہب میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جس کے متعلق وہ اتنا عظیم الشان تواتر پیش کرسکیں۔ ان کی شریعت کا تمام دارومدار توراۃ پر ہے جس کے خود ثبوت ہی میں سو طرح کے شبہات ہیں۔ یہود کو اس کا اعتراف ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد عام ارتداد پھیل گیا تھا زمانہ دراز تک بت پرستی کی جاتی تھی انبیاء علیہم السلام کو ایذائیں دی جاتی تھیں حتی کہ بعض کو قتل بھی کردیا جاتا تھا۔ شر و فساد کے اس دور میں بھلا توراۃ کی حفاظت کا کیا خیال کیا جاسکتا ہے اس کا تواتر تو در کنار۔

نصاریٰ کا حال یہ ہے کہ ان کے کل مذہب کی بنیاد پانچ اشخاص پر ہے جن کا جھوٹ خود ان کے بیانات سے ثابت ہے۔ قرآن کریم کے تواتر سے بھلا اس کا کیا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ بھی متواتر ہے مگر اس کا دائرہ پہلے سے کسی قدر تنگ ہے یعنی پہلی صورت میں اہل علم اور بے علم مسلم اور کافر سب اس میں شریک ہوتے ہیں۔ یہاں صرف ایک محدود دائرہ کو اس کا علم ہوتا ہے اگرچہ اس کا احاطہ بھی ہزاروں کی تعداد سے متجاوز ہوتا ہے جیسا کہ آپ کے معجزات، مناسک حج اور زکوٰۃ کے بعض احکام اہل خیبر سے آپ کا معاہدہ وغیرہ وغیرہ یہود و نصاریٰ کے پاس اس جنس کا ثبوت بھی ندارد ہے۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اس کے نقل کرنے والے اگرچہ حد تواتر کو نہ پہنچیں مگر متعدد اشخاص ہوں پھر وہ اسی قسم کے دوسرے چند اشخاص یا ایک شخص سے ایک بات نقل کریں اور اسی طرح یہ نقل طبقہ بطبقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہوجائے۔ یہود و نصاریٰ کے یہاں اس قسم کی بھی کوئی سند نہیں ہے، یہ امتیاز صرف امت محمدیہ کا ہے کہ اس نے اپنے رسول کا ایک ایک کلمہ ہر ممکن سے ممکن طریق سے محفوظ کرلیا ہے

اور اس خدمت کے لئے شرق و غرب میں اتنے نفوس مارے مارے پھرے ہیں کہ ان کی صحیح تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کسی فاسق کی یہ مجال نہیں رہی کہ وہ دین کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ہٹا سکے۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ اپنے دین کے کسی ایک مسئلہ کے متعلق بھی وثوق کے ساتھ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ یہ اُن کے دین کا جزء ہے۔

(۴) چوتھی صورت مرسل ہے یعنی رسول اور ناقل کے درمیان کا واسطہ مذکور نہ ہو، کوئی تابعی براہ راست آپ کا قول و فعل نقل کرے۔ یہود و نصاریٰ کے پاس بہت سے بہت اپنے دین کی کوئی سند ہے تو اس قسم کی ہے پھر اس طریقہ میں بھی زمانۂ نبوت سے جو قرب ہمیں حاصل ہے انھیں حاصل نہیں، اس پر اُن کے لئے اندرونی اور بیرونی حالات کی ناموافقت مزید براں ہے اس لئے جتنے تردد اور شبہات کے امکانات وہاں پیدا ہو سکتے ہیں یہاں نہیں ہو سکتے۔ ہمارے علم میں یہود و نصاریٰ کے پاس صرف ایک ہی مسئلہ ایسا ہے جس کو اُن کے کسی عالم نے بنی اسرائیل کے کسی آخری نبی سے براہ راست سنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تمام دین کے ثبوت کی درمیانی کڑی غائب ہے۔ ہم ان طریقوں میں سے اپنے تمام دین کی بنیاد صرف پہلے تین طریقوں پر قائم کرتے ہیں۔ [۱]

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ اس کے بعض مجروح اور غیر ثقہ بھی ہوں ہمارے نزدیک ایسی سند کا اعتبار کرنا حلال نہیں۔

(۶) چھٹی صورت یہ ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ہی نہ ہو بلکہ مذکورہ بالا طریق سے کسی صحابی کا قول و فعل ہو، اس کے تسلیم کرنے نہ کرنے میں بھی اختلاف ہے ہم اسے واجب التسلیم نہیں سمجھتے۔ [۲] [۳]

ابن حزم کے اس قول سے معلوم ہو گیا کہ تواتر کے علاوہ خبر واحد بھی دین میں حجت ہے۔ دین کی بنیاد صرف تواتر پر قائم کرنا اس کے بہت بڑے حصہ کو ضائع کر دینا ہے کیونکہ تواتر کے ساتھ اس کا جتنا حصہ ثابت ہے وہ تمام دین کے مقابلہ میں اتنا قلیل ہے کہ اس کو نہ ہونے کے برابر کہا جا سکتا ہے۔

---

[۱] مرسل کے قبول و رد کرنے کے متعلق اصول حدیث میں اختلاف نقل کیا گیا ہے ہر فریق کے دلائل وہاں مذکور ہیں، یہاں طوالت کے خوف سے ان کو نقل نہیں کیا گیا۔

[۲] قول و فعل صحابی کے متعلق بھی بڑی تفصیل ہے مگر حکماً مرفوع ہے تو وہ بھی قابلِ حجت ہے اس کی بحث بھی اصولِ حدیث کی کتابوں میں دیکھ لی جائے۔

[۳] الملل والنحل۔ ج ۲ ص ۶۲ - ۶۹۔

خبرِ واحد کی حجیّت

اصولِ حدیث کی اصطلاح کے لحاظ سے اجمالی طور پر حدیث کی دو قسمیں ہیں (۱) متواتر۔ (۲) خبرِ واحد ہر اُس خبر کو جو متواتر نہ ہو اصطلاحی طور پر خبرِ واحد ہی کہا جاتا ہے۔
لہٰذا خبرِ واحد کے لفظ سے اس کا جو مفہوم دماغ میں پیدا ہوتا ہے اُسی میں خبرِ واحد کا انحصار نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اگر تواتر کا عدد کسی ایک طبقہ میں بھی فوت ہو جائے تو اس خبر کو خبرِ واحد ہی کہا جاتا ہے خواہ وہ خبر کتنے ہی افراد سے روایت کی گئی ہو۔ اس کا صرف یہ مفہوم نہیں ہے کہ اس کا روایت کرنے والا ہر دور میں صرف ایک ہی شخص ہو۔ جو لوگ متواتر کے سوا خبرِ واحد کو مطلقاً حجت نہیں مانتے ان کو ذرا اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی حدیث کے راوی صحابہ و تابعین کے دور میں بکثرت موجود ہوں پھر کسی ایک دور میں اساتذہ و تلامذہ کی نقل و حرکت کی قلت و کثرت، ماحول کی موافقت یا ناموافقت کی وجہ سے کسی قدر کم ہو جائیں تو کیا ایسی خبر کو بھی رد کر دینا عقلاً مناسب ہے یہی وجہ ہے کہ بعض معتزلہ جو خبرِ واحد کے سب سے پہلے منکر ہیں اس پر غور کرتے کرتے اس فیصلہ کے لئے مجبور ہو گئے ہیں کہ اگر ہر دور میں اس کے راوی دو دو موجود ہوں تو پھر ایسی خبر کو حجت کہہ دیا جائے گا اس کی تردید کی اب کوئی وجہ نہیں رہتی حالانکہ صرف دو راویوں سے کسی خبر کو متواتر نہیں کہا جا سکتا۔ وہ خبرِ واحد ہی رہتی ہے مگر اس کو ایسی قوت ضرور حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کو مفید یقین کہا جا سکتا ہے۔ پھر اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ یہ تمام تقسیمیں اس قدر محدود وقت کے اندر اندر ہیں کہ اس میں ذخیرۂ حدیث کو بالکل ساقط الاعتبار قرار دینا بہت بڑی غفلت ہے۔ تدوینِ حدیث کا دور تیسری صدی تک قریب قریب ختم ہو جاتا ہے۔ پہلی صدی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے صحابہ خود موجود تھے۔ اور آپ کی احادیث کا ذخیرہ مختلف طور پر اُن کے پاس محفوظ تھا۔ اس کے بعد دوسری صدی شروع ہونے نہیں پائی کہ تدوینِ حدیث کا باضابطہ آغاز ہو گیا۔ اتنے قلیل عرصہ میں تمام ذخیرۂ احادیث کا یک قلم مشکوک ہو جانا بہت بعید از قیاس ہے۔
اگر تدوینِ حدیث صحابہ و تابعین کے دور کے بعد شروع ہوتی تو حدیث کے ثبوت میں شبہ کرنا معقول ہوتا لیکن جبکہ فقط احادیث کا سلسلہ خود آپ کے زمانے سے برابر متصل طور پر چلا آرہا ہے تو اب اس میں شک و شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں اس پر مستقل ایک مقالہ لکھا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی کے واقعات سے خبرِ واحد کی حجیت ثابت کی ہے۔ ہم یہاں اس کا

مختصر خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔

پہلا واقعہ تحویلِ قبلہ سے پہلے اہلِ قباء کا قبلہ بھی بیت مقدس تھا۔ لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد صبح کی نماز میں تحویلِ قبلہ کی خبر لیکر ان کے پاس پہنچا تو سب نے نماز کے اندر ہی اپنا رخ بیت اللہ کی طرف بدل دیا۔ اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک دینی مسائل میں خبرِ واحد حجت تھی اور اگر بالفرض ان کا یہ اقدام غلط ہوتا تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلہ پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کے قول پر ایک فرضِ قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہِ راست میری ہدایت یا خبرِ متواتر کا انتظار کیوں نہ کیا۔ اگر یہاں اعتراض کرنا تو درکنار اپنی جانب سے فردِ واحد کا بھیجنا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ خود صاحبِ نبوت کے نزدیک بھی دین کے بارے میں ایک ثقہ اور صادق شخص کا قول کافی ہے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت انسؓ فرماتے ہیں، میں ابوعبیدہ، ابوطلحہ، ابی بن کعب کو شراب پلا رہا تھا کہ دفعۃً ایک شخص آیا اور اس نے خبر دی کہ شراب حرام ہوگئی ہے۔ یہ سن کر فوراً ابوطلحہؓ نے کہا انس اٹھو اور شراب کے مٹکے توڑ ڈالو۔ میں اٹھا اور شراب کے برتن توڑ دیئے۔

ظاہر ہے کہ شراب پہلے شرعاً حلال ہی تھی لیکن یہاں صرف ایک شخص کے بیان پر اس کی حرمت کا یقین کر لیا گیا اور اس کے برتن توڑ ڈالے گئے۔ حاضرین میں سے کسی نے اتنا تأمل بھی نہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بالمشافہ جاکر پوچھ آتا اور نہ کسی نے یہ اعتراض کیا کہ قبل از تحقیق یہ اضاعت مال اور اسرافِ بیجا کیوں کیا گیا۔

تیسرا واقعہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے آپ نے زناء کے ایک مقدمہ میں زانی کے اقرار پر اس کو کوڑے لگانے کا حکم دیا اور جس عورت کے متعلق اس شخص نے زناء کرنے کا اقرار کیا تھا اس کے پاس اُنیس کو بھیجا اور فرمایا کہ اس سے دریافت کرو اگر وہ بھی اقرار کرلے تو اس کو رجم کر دو ورنہ اس شخص کو حدِ قذف اور لگاؤ کیونکہ اس نے بلا شرعی ثبوت کے ایک عورت پر زناء کی تہمت کیسے رکھی۔ انیس پہنچے اس عورت نے زناء کا اقرار کیا اور وہ بھی رجم کر دی گئی۔

چوتھا واقعہ عمرو بن سلیم زرقی اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم منیٰ میں مقیم تھے کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ اونٹ پر سوار چیخ چیخ کر یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ یہ کھانے پینے کے دن ہیں کوئی شخص ان میں روزہ نہ رکھے

پانچواں واقعہ یزید بن شیبان کہتے ہیں کہ ہم مقامِ عرفات میں تھے۔ اتفاقاً ہمارا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قیام گاہ سے دور تھا۔ اسی درمیان میں ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد یہ پیام لیکر پہنچا کہ ہم جہاں ٹھیرے ہوئے ہیں اپنی اسی جگہ پر رہیں وہاں سے منتقل ہونے کی ضرورت نہیں، میدانِ عرفات میں

جہاں بھی قیام ہو جائے فریضۂ وقوف ادا ہو جاتا ہے۔

چھٹا واقعہ

ہجرت کے نویں سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبرؓ کو حج کا امیر بنا کر بھیجا تاکہ فریضۂ حج کو انجام دیں اور ان کے بعد حضرت علیؓ کو روانہ کیا کہ وہ کفار کو سورۂ برأت کی آیات سنا کر ہشیار کر دیں کہ انھوں نے خود بدعہدی کی ہے اب خدا کا بھی اُن سے کوئی معاہدہ باقی نہیں رہا۔

ان سب احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایک شخص کو اپنی جانب سے بھیجنا باوجودیکہ آپ کا بنفسِ نفیس تشریف لیجانا بھی ممکن تھا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ دین میں ایک ثقہ اور صادق شخص کی خبر حجت گردانی گئی ہے۔

خبرِ واحد کی حجیت کا ایک اور ثبوت

اس کے سوا آپ نے عامل اور قاصد جہاں جہاں بھیجے ہیں ان میں عدد کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ قیس بن عاصم، زبرقان بن بدر، اور ابن زبیر وغیرہ کو اپنے اپنے قبائل کی طرف روانہ کیا، وفدِ بحرین کے ساتھ ابنِ سعید بن العاص کو بھیجا۔ اور معاذ بن جبل کو یمن کے بالمقابل بھیجا اور جنگ کے بعد ان کو شریعت کی تعلیم دینے کا حکم دیا۔ لیکن کہیں منقول نہیں کہ آپ کے عاملین کے ساتھ کسی نے یہ مناقشہ کیا ہو کہ چونکہ یہ ایک ہی فرد ہے اس لئے اس کو صدقات وعشر نہیں دیئے جائیں گے۔

خبرِ واحد کی حجیت کا تیسرا ثبوت

اسی طرح آپ نے دعوتِ اسلام کے لئے مختلف بلاد میں بارہ قاصد روانہ فرمائے اور صرف اس بات کی رعایت کی کہ ہر سمت میں ایسا شخص بھیجا جائے جو اُس نواح میں متعارف ہو تاکہ اس کے جھوٹے ہونے کا شبہ نہ رہے اور ان کو اس کا اطمینان ہو جائے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے عاملوں اور قاضیوں کے پاس جب بھی آپ کے خطوط پہنچے تو ہمیشہ انھوں نے فوراً ان کو نافذ کیا اور خواہ مخواہ کے شبہات کو کوئی راہ نہیں دی۔ پھر آپ کے بعد بھی آپ کے خلفاء وعمال کا یہی دستور رہا حتیٰ کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک ہی خلیفہ، ایک ہی امام، ایک ہی قاضی، ایک ہی امیر ہونا ایک مسلم مسئلہ تھا جس میں کوئی اختلاف نہ تھا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خبرِ واحد کی حجیت کے لئے یہ چند احادیث بطور مشتے نمونہ از خروارے کافی ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جس پر ہم نے اُن لوگوں کو پایا ہے جن کو کہ ہم نے دیکھا اور یہی عقیدہ انھوں نے اپنے پہلوں کا ہم سے بیان کیا ہے۔

خبرِ واحد کی حجیت کا چوتھا ثبوت

ہم نے تو مدینہ میں ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ سعید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو سعید خدری کی ایک حدیث نقل کر دیتے ہیں اور اس سے دین کی ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے۔ ابو ہریرہؓ ایک روایت کرتے ہیں اس سے ایک سنت ثابت ہو جاتی ہے اسی طرح ایک ایک صحابی کے بیان پر

دین کے مسائل اور سنتیں ثابت ہوتی چلی جاتی تھیں، خبر واحد اور متواتر ہونے کا کوئی سوال وہاں نہیں کیا جاتا تھا آخر میں امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ میں نے مدینہ و مکہ، یمن و شام اور کوفہ کے حضرات ذیل کو دیکھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سے روایت کرتے تھے اور صرف اس ایک صحابی کی حدیث سے ایک سنت ثابت ہو جاتی تھی، اہل مدینہ کے چند نام یہ ہیں:

محمد بن جبیر، نافع بن جبیر، یزید بن طلحة، محمد بن طلحة، نافع بن عجیر، ابو سلمة بن عبد الرحمٰن، حمید بن عبد الرحمٰن، خارجة بن زید، عبد الرحمٰن بن کعب، عبد اللہ بن ابی قتادہ، سلیمان بن یسار، عطاء بن یسار وغیرہم اور اہل مکہ کے چند اسماء حسب ذیل ہیں:۔ عطاء، طاؤس، مجاہد، ابن ابی ملیکہ، عکرمہ بن خالد، عبید اللہ بن ابی یزید، عبد اللہ بن باباہ، ابن ابی عمار، محمد بن المنکدر وغیرہم اور اسی طرح یمن میں وہب بن منبہ اور شام میں مکحول اور بصرہ میں عبد الرحمٰن بن غنم، حسن اور محمد بن سیرین، کوفہ میں اسود، علقمہ اور شعبی غرض تمام بلادِ اسلامیہ اسی عقیدہ پر تھے کہ خبر واحد حجت ہے۔ اگر بالفرض کسی خاص مسئلے کے متعلق کسی کے لئے یہ کہنا جائز ہوتا کہ اس پر مسلمانوں کا ہمیشہ اجماع رہا ہے تو خبر واحد کی حجیت کے متعلق بھی میں یہ لفظ کہہ دیتا مگر احتیاط کے خلاف سمجھ کر اتنا پھر بھی کہتا ہوں کہ میرے علم میں فقہاء مسلمین میں کسی کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

خبر واحد پر عمل نہ کرنے کی چند صورتیں

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر کسی کے پاس خبر واحد پہنچی ہو تو اس نے اس پر اس لئے عمل نہ کیا ہو کہ اس کے نزدیک وہ خبر حد صحت کو نہ پہنچی ہو یا وہ حدیث دو معنوں کو محتمل ہو، اور اس نے دوسرے معنی پر عمل کر لیا ہو یا اس کے معارض اس سے زیادہ صحیح حدیث اس کے پاس موجود ہو، غرض جب تک وجوہِ ترجیح یا اسبابِ ترک میں سے کوئی سبب اس کے پاس موجود نہ ہو ہرگز کسی کے لئے خبر واحد کا ترک کرنا جائز نہیں۔

خبر واحد کے مراتب

اسی کے ساتھ یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ ایک حدیث جس پر سب کا اتفاق ہو اور ایک وہ جو کسی خاص مسئلہ کے متعلق صرف ایک راوی سے روایت کی گئی ہو، اس میں مختلف تاویلوں کی گنجائش بھی نہ ہو دونوں برابر نہیں ہو سکتیں، پہلی حدیث کا تسلیم کرنا بلاشبہ قطعی ہے اگر اس کا کوئی منکر ہو تو اس سے توبہ کرائی جائے لیکن دوسری قسم کی حدیث اس درجہ قوی نہیں اگر اس حدیث میں کوئی شک کرے تو اس سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا لیکن اس پر بھی عمل کرنا واجب ہوگا جب تک کہ اسباب ترک میں سے کوئی سبب پایا نہ جائے جیسا کہ شاہدوں کے بیان پر فیصلہ کر دیا جاتا ہے حالانکہ یہاں بھی غلطی اور شکوک کا احتمال باقی رہتا ہے لیکن پھر بھی جب تک کہ تحقیق نہ ہو ظاہر حال پر عمل کیا جاتا ہے۔

ظن و علم کے مفہوم پر ایک اہم بحث

خبرِ واحد کی حجیت کے برخلاف منکرینِ حدیث کے پاس بڑا استدلال یہ ہے کہ وہ مفیدِ ظن ہوتی ہیں اور دین کی بناء ظنیات پر قائم نہیں کی جا سکتی اس لئے ہم یہاں پہلے ظن و علم کے مفہوم کے متعلق تحقیق کرنا ضروری سمجھتے ہیں صحابہ کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کا استعمال اردو میں ٹھیک اٹکل کے موقعہ پر کیا کرتے تھے۔ پس جو خیال واقعہ کی تحقیق کے بغیر محض اپنی جانب سے پکا لیا جائے ان کے نزدیک ظن کہا جاتا تھا اب وہ خواہ رجحاں کے مرتبہ کو پہنچے یا نہ پہنچے۔

لہ مولانا اسلم صاحب نے معلوم نہیں کس مجبوری سے صحابہ کے دور کے ان واقعات کی جوابدہی حسب ذیل الفاظ میں کی ہے حالانکہ ان کے لئے سیدھی بات یہ تھی کہ وہ ان تمام واقعات کو سرے سے غلط کہہ کر نبٹ جاتے مگر آپ رقمطراز ہیں۔

"مگر عہدِ صحابہ میں شاہد کا ملنا ممکن تھا اس لئے اس وقت یہ طرزِ عمل بالکل حق بجانب تھا لیکن زمانہ ما بعد میں راوی کی حیثیت شاہد کی نہیں رہی بلکہ مدعی کی ہو گئی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کے جملہ افراد پر جن کی تعداد کروڑوں بلکہ ممکن ہے کہ اربوں ہو جائے ایک عقیدہ یا عمل کی پابندی عائد کرنی چاہتا ہے اور اس کا بیان بھی بالواسطہ در واسطہ ہے اس لئے اس کے اوپر لازم ہے کہ وہ دو شاہدِ عدل پیش کرے جو گواہی دیں کہ اس نے فلاں سے ہمارے سامنے سنا ہے پھر اسی طرح سلسلہ کے آخر تک ہر راوی کے سماعت کے دو گواہ ہونے ضروری ہیں۔ بلا ان کے اصولِ عدالت اور قانونِ شریعت کے مطابق اس کا قول تسلیم کے قابل نہیں۔" (علمِ حدیث ص ۲۰)

اس طویل اور بے مغز تقریر کے جواب میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام ذمہ داریوں کا بار جیسا بعد کے راویوں پر ہے اس سے بڑھ کر اس صحابی کی گردن پر ہے جس نے کوئی حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی ہے پہلا مدعی وہ ہے جس نے ابتداً افراد امت کے سر کسی عمل کی پابندی عائد کرنے کی بنیاد رکھی ہے سب سے پہلے یہ اس کے ذمہ ہے کہ وہ اپنے اس دعوی کے لئے دو گواہ لائے اگر وہ گواہ نہیں لاتا یا دوسرا شخص اس سے گواہوں کا مطالبہ نہیں کرتا اور اس کے بغیر بھی اس کا دعویٰ قبول کر لیا جاتا ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ راوی کے لئے دراصل عدد کی شرط ہی غلط ہے۔ اس کا یہ عذر کرنا "کہ اس وقت شاہد کا ملنا ممکن تھا" ایک عذر لنگ ہے اولاً تو یہی صحیح نہیں کہ صحابہ نے سب روایتیں براہِ راست صاحبِ نبوت سے خود سن کر بیان کی ہیں اس لئے ان کی حیثیت مدعی کی حیثیت نہیں کیونکہ ان کی روایتوں میں ایسی روایات بھی شامل ہیں جو انھوں نے خود نہیں بلکہ کسی دوسرے صحابی سے سن کر بیان کی ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔

ما کل ما نحدث بہ سمعناہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولکن کان یحدث بعضنا بعضا (مستدرک حاکم)	جو حدیث ہم بیان کرتے ہیں وہ تمام ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود نہیں سنی ہیں بلکہ ان میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو ہم میں سے بعض بعض سے روایت کرتا تھا۔

اس بناء پر صحابی کی حیثیت بھی ٹھیک وہی حیثیت ہو گئی جو دوسرے راوی کی ہے اس کے علاوہ یہ بھی مسلم نہیں (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

حضرت عمرؓ نے ایک دن اپنے خطبہ میں فرمایا لوگو! دین کے بارے میں رائے تو بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی صواب تھی۔ وانما ھومنا الظن والتکلف۔ ہم تو صرف اٹکل کے تیر لگاتے اور تکلف کر کر کے خیال جماتے ہیں۔ ان مختصر الفاظ میں قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ تھا۔ انا انزلنا الیك الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراك اللہ۔ پس جو رائے خدا کی ارارۃ اور اصابۃ کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور وہی صواب بھی ہو سکتی ہے اور جو محض اپنی جانب سے ایک اٹکل ہو، خدا تعالیٰ کی ارارۃ اس میں شامل نہ ہو اس کا نام ظن اور تکلف ہے۔

عن عبداللہ بن عمر انہ کان اذا لم یجد فی الامر یسأل عنہ شیئا قال ان شئتم اخبرتکم بالظن۔ (اعلام ج ۱ ص ۴۹)	حضرت ابن عمرؓ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی معاملہ کے متعلق انہیں کتاب سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا تو کہتے اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور اٹکل سے بتلا دوں (یعنی فیصلہ نہ دیتے)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کہ جس نے آپ سے براہ راست کوئی حدیث سنی ہے، اس کی حیثیت مدعی کی نہیں ہوتی پھر اس کو بار ثبوت سے کیوں سبکدوش کیا جائے پھر یہ کونسا عقلی یا شرعی قاعدہ ہے کہ کسی مدعی کے دعوی کی ڈگری صرف اس بنا پر دیدی جائے کہ وہ گواہ پیش کر سکتا ہے لہٰذا اس امکان پر اُس سے گواہی کا مطالبہ ہی نہ کیا جائے۔ اور فرض کر لو کہ اگر دو گواہوں سے حدیث کی صحت ثابت ہو سکتی ہے تو چلیے مولانا اسلم صاحب اسی کا اقرار کر لیں کہ اگر کسی خبر کے راوی دو دو ہوں یا اس کے دو دو شاہد ہوں تو وہ اس کو حجت تسلیم کر سکتے ہیں۔ معتزلہ نے تو اس کا اقرار کر لیا ہے جیسا کہ حافظ عراقی نے نکت علی ابن الصلاح میں اس کی تصریح کی ہے۔ لیکن موصوف تو پھر بھی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ چند سطور بعد خود ہی تحریر فرماتے ہیں "اس لئے تمام روایتیں غیر یقینی ہیں۔ روایت کی صرف ایک قسم یقینی ہو سکتی تھی یعنی متواتر۔ . . . اور ایسی کوئی حدیث نہیں ہے بلکہ جملہ حدیثیں خبر واحد ہی ہیں" (علم حدیث ص ۳۰ و ۳۱) مذکورہ بالا تحریر سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مولانا موصوف حدیث متواتر کے سوا خبر واحد کو حجت تسلیم نہیں کرتے پھر صفحہ ۴۱ پر خبر واحد کی تعریف یہ نقل فرماتے ہیں۔ اس مقام پر خبر واحد سے مراد وہ حدیث ہے کہ حد تواتر تک جو مفید یقین ہے نہ پہنچے مثلاً ایک حدیث جس کو کوئی جماعت پانچ یا چھ راویوں سے روایت کرتی ہو خبر واحد ہے۔ جب مولانا موصوف کا عقیدہ یہ ہے تو پھر خواہ مخواہ دو گواہوں کی شرط کس لئے ہے اگر ایک جماعت کسی حدیث کو چھ اشخاص سے بھی روایت کرے وہ بھی مولانا کے نزدیک مسلم نہیں تو دو شخصوں کا بیان کیا مسلم ہوگا۔ گویا کہ اب مولانا کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ حدیث کی کوئی قسم بھی حجت نہیں۔ خبر متواتر اگر بالفرض موجود ہوتی تو نسے تسلیم کر سکتے تھے مگر بد قسمتی سے وہ موجود ہی نہیں اس لئے نتیجہ کورا انکار رہا

یہاں یہ نکتہ اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خبر متواتر کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کا مبنی امر محسوس ہو، اگر کسی غیر محسوس امر کو ایک کروڑ انسان بھی نقل کریں تو بھی وہ متواتر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک ہزار صحابہ و تابعین بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی غیر محسوس امر کو نقل کریں تو وہ بھی مولانا کو مسلم نہ ہو گی کیونکہ ان کے نزدیک وہ خبر واحد رہے گی اور وہ مفید یقین نہیں ہو سکتی انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ایک ہزار اشخاص کے بیانات کا بھی یقین نہیں لاتا اور اس لئے نہیں لاتا کہ وہ متواتر نہیں ہیں اُسے اس دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ پھر اس دنیا میں اس کے نزدیک خبر پر یقین کرنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ اُسے تحصیل یقین کے لئے کوئی دوسرا جہاں تلاش کرنا چاہیے۔

اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور اسی معنیٰ میں قرآن میں رائے زنی کی ممانعت کی گئی ہے یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہدینا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں؟ اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔[۱] حضرت ابوموسیٰ کے الفاظ پر غور کیجئے۔

من كان عنده علم فليعلمه الناس	اگر کسی کے پاس کوئی علم کی بات ہو تو وہ لوگوں کو سکھلائے
ان لم يعلم فلا يقولن ما ليس له به علم	اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو
فيكون من المتكلفين۔ [۲]	علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکلف یہ ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو تو بے علمی کے چھپانے کے لئے اپنی جانب سے کوئی بات گھڑلی جائے اسی کو ظن کہتے ہیں۔ اسی کو حضرت عمرؓ نے اپنے ان الفاظ میں ادا فرمایا تھا۔ وانما هو منا الظن والتكلف۔ حضرت ابوموسیٰؓ کے اس مختصر سے بیان میں حسب ذیل آیات کی طرف اشارہ تھا۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔	اس بات کے پیچھے مت پڑیئے جس کا آپ کو علم نہیں۔
قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا	آپ کہدیجئے کہ میں تم سے اس پر مزدوری نہیں چاہتا اور
أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۔	میں تکلف کرنے والوں میں نہیں ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں۔

ما علمك الله في كتابه فاحمد الله به	کتاب اللہ کا جو علم اللہ تعالیٰ تجھے مرحمت فرمادے اس پر اس
وما استأثر به عليك من علم فكله	کی تعریف کر اور اس کا جو علم اس نے خود اپنے نفس کے لئے رکھا
الى عالمه ولا تتكلف فان الله	ہے اور تجھے نہیں بتلایا اس کے متعلق تکلف مت کر اور جو اس
عز وجل يقول لنبيه قل ما	کا عالم ہے اس کے سپرد کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے
اسئلكم عليه من اجر وما انا	یہی ارشاد فرمایا ہے آپ کہدیجئے کہ میں تم سے مزدوری نہیں
من المتكلفين۔ [۳]	چاہتا اور میں تکلف کرنے والوں میں نہیں ہوں۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے۔

اتقوا الرأي في دينكم۔ [۴]	دین میں رائے لڑانے سے بچو۔

غرض سلف میں بیشتر ظن اور رائے اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کو کہتے ہیں جو رائے کتاب اللہ اور سنت رسول کے تحت ہو اس کو مطلقاً رائے نہیں کہا جاتا تھا نہ وہ مذموم ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے کلام میں

[۱] اعلام ج ۱ ص ۴۴۔ [۲] الموافقات ج ۱ ص ۰۵۔ [۳] اعلام ج ۱ ص ۴۷ و جامع بیان العلم ج ۲ ص ۵۰ [۴] اعلام ج ۱ ص ۴۵

اس تقسیم کی طرف اشارہ موجود ہے۔

من احدث رأیا لیس فی کتاب اللہ ولم	جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو قرآن میں نہیں اور نہ
تمض بہ سنۃ من رسول اللہ لم یدر علی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہو وہ نہیں جانتا کہ
ما ھو منہ اذا لقی اللہ عز وجل۔ [۱]	کل قیامت میں اس کا حشر کیا ہوگا۔

ان الفاظ سے رائے کی دو قسمیں ظاہر ہوتی ہیں ایک وہ جو کتاب اللہ کے ماتحت ہو دوسری وہ جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو اس کے مقابلہ میں علم اس کو کہا جاتا تھا جو قرآن و حدیث نے بتایا، یا صحابہ سے منقول ہوا۔ اوزاعی فرماتے ہیں کہ علم صرف وہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔ [۲]

ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ میں نے عطاء سے ایک مسافر کے متعلق مسئلہ پوچھا کہ اس نے حج کے مہینوں کے سوا کسی اور مہینہ میں عمرہ کیا پھر اس کا خیال ہوا کہ حج کے ایام میں حج کرے کیا وہ متمتع ہو جائے گا فرمایا کہ متمتع نہیں ہو سکتا جب تک کہ اشہر حج میں پھر اپنے میقات پر لوٹ کر نہ آئے میں نے کہا کہ أرأی ام علم یہ جو آپ نے جواب دیا ہے یہ رائے ہے یا علم۔ [۳]

ان کلمات سے ظاہر ہے کہ رائے اور علم، اسی طرح ظن اور علم سلف میں دو متقابل چیزیں تھیں واقعی بات کو علم اور تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا تھا، جانب راجح اور مرجوح کی ان کے یہاں کوئی تفصیل نہ تھی۔ یہی اصطلاح قرآن کی بھی ہے۔

(۱) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ	اے ایمان والو بہت گمان کرنے سے بچا کرو کیونکہ بعض
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔ (حجرات)	خیال و گمان گناہ کی حد تک پہنچتے ہیں۔

آیتِ بالا میں گناہ ہونے کا حکم اس پر نہیں ہے کہ وہ جانب راجح ہے یا مرجوح بلکہ خلاف واقع اور بے تحقیق بات پر ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

(۲) وَاِذَا قِیْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ	جب کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے اور قیامت آنے
السَّاعَۃُ لَا رَیْبَ فِیْھَا قُلْتُمْ مَّا	میں کوئی شبہ نہیں تم نے یہ جواب دیا ہم نہیں جانتے قیامت
نَدْرِیْ مَا السَّاعَۃُ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا	کیا چیز ہے۔ ہمیں تو یہ بات یونہی بے تحقیق سی معلوم ہوتی
وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَیْقِنِیْنَ۔ (جاثیہ)	ہے اور ہم ہرگز اس کا یقین نہیں کر سکتے۔

اسی طرح آیاتِ ذیل بھی اسی معنی میں مستعمل ہیں:۔

---

[۱] اعلام ج ۱ ص ۸۴۔ [۲] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۲۹۔ [۳] ایضاً ج ۲ ص ۳۰

(۳) إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنْ رَبِّهِمُ الْهُدَىٰ۔ (النجم)	"صرف اٹکل اور نفس کی خواہشات پر چلتے ہیں اور ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے۔"
(۴) مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (النجم)	"اور ان کو اس کا کچھ علم نہیں صرف خیالات پر چلتے ہیں اور خیالات حق کی جگہ کچھ کارآمد نہیں ہوتے۔"
(۵) وَلَٰكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ (حم سجدہ)	"لیکن تم کو یہ خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ بہت سی چیزیں جو تم کرتے ہو نہیں جانتا اور تمہارے اسی خیال نے جو تم نے اپنے رب کے متعلق بنا رکھا تھا تم کو ہلاک کیا اور تم نقصان میں رہ گئے۔"
(۶) يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (آل عمران)	"وہ اللہ تعالیٰ کے متعلق جاہلوں کے سے جھوٹے خیال رکھتے تھے"
(۷) وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا۔ (احزاب)	"اور تم اللہ تعالیٰ کے متعلق طرح طرح کے خیالات کرنے لگے"
(۸) وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مَا لَهُمْ بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔ (نساء)	"جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملہ میں کئی باتیں کہتے ہیں وہ یہاں شک میں پڑے ہوئے ہیں اُن کو اس کا کچھ علم نہیں صرف اپنے خیالات کی پیروی ہے۔"
(۹) وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ۔ (یونس)	"اور جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو شریک پکارتے ہیں یہ صرف خیال کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔"
(۱۰) وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (جاثیہ)	"اور کہتے ہیں یہی ہماری زندگی ہے جس میں ہم جیتے اور مرتے ہیں اور ہم کو نہیں ہلاک کرتا مگر زمانہ ان کو کچھ علم نہیں وہ صرف اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔"
(۱۱) وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ۔	"روئے زمین کے اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کی باتیں مان لیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے وہ صرف خیالات کی پیروی کرتے ہیں۔"

ان تمام آیات میں ظن اُن خیالات ہی کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لئے جائیں پھر وہ خواہ حدِ یقین کو پہنچ جائیں یا صرف شک کے مرتبہ میں رہ جائیں پہلی آیت میں ظن سے اجتناب کرنے کا امر فرمایا گیا ہے۔ دوسری آیت میں کفار کا قیامت کے متعلق ظن کا اقرار مذکور ہے تیسری آیت میں ظن اور خواہشاتِ نفس کے مقابلہ میں خدا کی ہدایت کو رکھا گیا ہے اسی طرح چوتھی آیت میں علم اور ظن کو مقابل قرار دیا گیا ہے آٹھویں آیت

میں جن لوگوں کے متعلق شک کی حالت میں ہونا فرمایا گیا ہے، ان ہی کے متعلق اُسی آیت میں یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ ظن کی اتباع کرتے ہیں حالانکہ اصطلاح کے لحاظ سے ظن اور شک متقابل چیزیں ہیں۔ نویں آیت میں ظن اور خرص یعنی تخمینہ کرنے کو قرین اور ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان تمام مقامات میں کہیں بھی ظن کے اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں اور نہ یہ وہ ظن ہیں جو ادلۂ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ قرآن جس ماحول میں آیا اس وقت خدا کی ذات و صفات، قیامت اور اہل کتاب کے معاملات کا مشرکین کو کچھ بھی علم نہ تھا اور جو علم تھا وہ صرف سنی سنائی باتیں یا غلط قیاسات اور باطل ظنون تھے قرآن آیا تو اس نے بنیادی طور پر یہ سکھلایا کہ اب خدائی تعلیم کی اتباع کرو اور اتباعِ ظنون و قیاسات چھوڑ دو۔

ظاہر ہے کہ اس وقت جو ظن مشرکین کو قیامت کے متعلق تھا یا سورۂ آل عمران کی آیت میں جو ظن مسلمانوں کے دل میں پیدا ہونے لگا تھا یا سورۂ حٰم سجدہ میں خدا کے علم کے بارے میں جو ظن کہ مشرکین کے قلوب میں موجود تھا اور اسی طرح دوسری آیات میں جہاں جہاں ظن کا ذکر اور اس کی مذمت کی گئی ہے یہ وہ ظن ہرگز نہیں ہیں جو ادلہ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوئے بلکہ اپنی جانب سے بکائے ہوئے بے بنیاد خیالات تھے جو ظن کہ ادلۂ شرعیہ کے ماتحت پیدا ہوتا ہے قرآن نے اس کی مذمت کا کہیں ایک حرف بھی نہیں کہا ان جملہ مواقع پر جتنے ظنون ہیں یہ وہ ظنون ہیں جو شریعت کے خلاف یعنی خدا اور رسول کے بیان کردہ عقائد کے خلاف ہیں۔ جب خدا کی جانب سے حق بات پہنچا دی جائے تو اس کے خلاف اب نہ ظن معتبر ہوتا ہے نہ یقین۔ چوتھی آیت کا یہی مطلب ہے۔ مولانا اسلم صاحب یہ سمجھتے ہیں کہ ظن کی مذمت اس لئے کی گئی ہے کہ وہ ظن ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے جن ظنوں کی ان آیات میں مذمت کی گئی ہے اگر وہ یقین کے مرتبہ میں پہنچ جائیں تو اور زیادہ قابلِ مذمت ہوں گے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ سلف میں اور قرآنی محاورات میں بیشتر ظن کا اطلاق بے تحقیق بات پر اور علم کا واقعی بات پر کیا گیا ہے۔ ان آیات میں اُن ظنی احکام کے خلاف جو ظنی احادیث سے ثابت ہوں کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ ظنون ہیں جو حق کے صریح خلاف محض اپنی دماغی ایجاد اور خواہشِ نفس کی بنا پر پیدا کر لئے گئے ہیں۔ خدائی ہدایات اور سماوی علوم کو قرآن کے مذمت کردہ ظن کا مصداق سمجھنا قرآن کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔[۱]

---

[۱] امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں "الظن اسم لما یحصل عن امارة ومتی قویت أدّت الی العلم ومتی ضعفت جدا لم یتجاوز حد الوھم" ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو علامات دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے اب اگر قوی ہو گیا تو علم بن جاتا ہے اور اگر بہت کمزور ہوا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب سے کمزور مرتبہ ہے۔

امام راغبؒ نے اس عبارت میں ظن کی ٹھیک وہی حقیقت متعین کی ہے جس کو ہم نے ابھی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے پس لغت کے لحاظ سے ظن، یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینہ کا نام ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

دلیل متواتر بھی مفید ظن ہو سکتی ہے

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن کا حرف حرف اگرچہ متواتر ہے لیکن اس کے باوجود اس کے جو مسائل نحویہ اس سے مستنبط ہوتے ہیں اُن کے متواتر ہونے کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کیونکہ ثبوت کی قطعیت دلالت کی قطعیت کو مستلزم نہیں ہے قرآن کی ایک ایک آیت بلاشبہ قطعی الثبوت ہے لیکن کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہر آیت قطعی الدلالۃ بھی ہے خود صحابۂ کرام کے زمانہ میں بعض آیات کا مفہوم سمجھنے میں خلاف ثابت ہے، اگر ان آیات کے مفہومات بھی متواتر ہوتے تو الفاظ کی طرح ان میں بھی کسی کو خلاف کی مجال نہ ہوتی امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ کسی متواتر کا قطعیت کو مفید ہونا اس پر موقوف ہے کہ اس کے جمیع مقدمات بھی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کے بعد واقعات کے لحاظ سے وہ یقین اور وہم دونوں حالتوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ انسان میں یہ ایک ممتاز صفت ہے اور اس کی فطرت کی سلامتی اور کجی کی بہت بڑی دلیل ہے سلیم الفطرت انسان اکثر واقع کے مطابق ہی ظن کیا کرتا ہے اور کج فطرت ہمیشہ اٹکل کے تیر لگاتا ہے ان ہی دونوں قسموں کا نقشہ ذیل کی دو آیتوں میں کھینچا گیا ہے چنانچہ خاشعین کے متعلق فرمایا

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ۔ — نماز بہت گراں ہوتی ہے بجز ان کے جنہیں یہ خیال لگ رہا ہے کہ انہیں اپنے پروردگار سے ایک دن ضرور ملنا ہے۔

اور کفار کے حق میں فرمایا۔

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ — ان لوگوں نے یہ سمجھنے کیوں نہ کیا کہ انہیں ایک بہت عظیم الشان دن میں حساب کے لئے پھر اٹھ کر کھڑا ہونا ہے۔ یہ وہ دن ہے جس میں سب لوگ رب العالمین کے سامنے آئیں گے۔

ہر شخص جو رب کا قائل ہے اس کی فطرت میں لقاء رب کی تمنا ہونا چاہئے جو لوگ لقاء رب کے خیال میں لگے ہوئے ہیں وہ یقیناً سلیم الفطرت اور قابل مدح انسان ہیں اور جن کو یہ خیال نہیں وہ یقیناً پست فطرت اور قابل مذمت ہیں انہیں یہ خیال ضرور ہونا چاہئے تھا کہ رب العالمین جب حساب کے لئے سب کو بلائے گا تو ہمیں کیوں نہ بلائے گا۔ ان دونوں آیتوں میں فطرت کی اسی صحیح آواز کی طرف دعوت دی گئی ہے ورنہ پہلی آیت میں جن خاشعین کا ذکر ہے انہیں قیامت کا ظن نہیں بلکہ کامل یقین حاصل تھا جیسا کہ ارشاد ہے۔

وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ — یہی لوگ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اور کفار کو قیامت کے متعلق ایک ذرہ برابر بھی یقین نہ تھا۔

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ۔ — ہمیں قیامت کا یونہی خیال سا ہے ہم ہرگز اس پر یقین لانے والے نہیں

چونکہ ظن یقین کے ساتھ جمع ہو سکتا تھا اس لئے کفار نے یہاں یہ تصریح کرنا ضروری سمجھا کہ ہمارا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ اُن اوہام کے قبیلہ کی چیز ہے جو جانب مخالف کے یقین کے حال میں بھی دماغ میں گذر سکتی ہے۔ ہمارے نزدیک ان دونوں آیتوں میں ظن اپنے ہی معنی میں مستعمل ہے اور یہ تنبیہ کرنے کے لئے مستعمل ہے کہ قیامت کا معاملہ انبیاء علیہم السلام کی تمام تعلیمات کی طرح عین فطرت کی آواز کے مطابق ہے اس لئے خاشعین کا یقین ان کی فطرت کی سلامتی کی علامت اور قابل مدح ہے اور مشرکین کی ضد ان کی فطرت کی کجی اور قابل مذمت بات ہے اگر آپ یہ سمجھ گئے ہیں تو یہ نکتہ بھی آپ کے ذہن میں آ سکتا ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ لقاء رب کے لئے ظن اور رجاء کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

متواتر ہوں۔ لیکن اگر اس کے مقدمات ظنی ہیں تو پھر وہ ظن ہی کو مفید ہوگا مثلاً ہر کلام کا سمجھنا لغت اور نحویوں کی رائے پر بھی موقوف ہے۔ پس اگر کسی مسئلہ نحوی میں نحویوں کی رائے مختلف ہے یا کسی لغت میں اہل لغت کا اختلاف ہے تو اس اختلاف کا اثر اس متواتر کلام کے مفہوم پر بھی ضرور پڑتا ہے کیونکہ جن امور پر اس کلام کے مفہوم کا سمجھنا موقوف ہے جب وہی ظنی ہیں تو پھر اس کلام کو مفید قطع کیسے کہا جا سکتا ہے۔ لہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اور آخرت کے لئے یقین کا لفظ کیوں۔ بات یہ ہے کہ آخرت ایک غیبی حقیقت ہے جو انبیاء علیہم السلام نے بتائی اس کا تسلیم کرنا ان کے اعتماد پر ضروری ہے۔ اور لقاء رب انسان کی فطرت کی آواز ہے صرف ایک غیبی حقیقت نہیں وہ از خود ہر انسان کے دل میں گذرنا چاہئے۔ امام بخاری نے کتاب الفرائض میں عقبہ بن عامر کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے۔ الظانین یعنی الذین یتکلمون بالظن۔ ظانین وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے تجربہ سے باتیں بناتے ہیں۔ حافظ ایاکم والظن کی شرح میں فرماتے ہیں وھو الذی لا یستند الی اصل۔ یعنی ظن ممنوع وہ ہے جو کسی دلیل پر مبنی نہ ہو محض اپنی جانب سے ایک اٹکل ہو۔ بہر حال ہمیں حدیث و قرآن سے ایک جگہ بھی یہ ثابت نہ ہو سکا کہ جو ظن دلائل شرعیہ کی روشنی میں پیدا ہو وہ بھی قابل مذمت ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک تمام دلائل کی پرواز صرف ظن ہی کی حد تک ہے اس کے بعد یقین حاصل ہونا صرف خداتعالیٰ کی بخشش کی چیز ہے اس لئے جس حد تک انسان مکلف ہو سکتا ہے وہ صرف تحصیل ظن ہے۔ یقین کی وہ منزل جس میں جانب مخالف کا خطور بھی نہ ہو بہت نادر ہے اگر تمام شریعت کی بنیاد ایسے ہی یقین پر قائم کی جائے تو فروعات تو درکنار اصول کے بہت سے مسائل بھی دلائل کی روشنی میں اس حد تک ثابت ہونا مشکل ہیں اسی لئے تحصیل یقین کا ذریعہ صرف ایک یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اعتماد پر ان کی تمام باتوں کو بے دلیل مان لیا جائے۔ پس جہاں ہمیں بلا تردد یقین رکھنے کا مکلف بنایا گیا ہے وہاں دلائل کی تحصیل کا حکم نہیں دیا گیا اور جہاں اجتہاد و استدلال کا حکم دیا گیا ہے وہاں یقین کے آخری مراتب کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ ظن ہی کو یقین کا حکم دیدیا گیا ہے۔ اگر ہر ہر قدم پر یقین کا حاصل کرنا فرض کر دیا جاتا تو دین و دنیا دونوں کے نظام معطل ہو کر رہ جاتے اب آپ کو اختیار ہے کہ اس تعبیر کو اگر پسند نہیں کرتے تو یوں تعبیر کر لیجئے کہ شہادت اور دلائل کی روشنی میں جو نتیجہ حاصل ہوتا ہے اس کا نام ظن ہی نہیں وہ یقین ہی ہے خواہ عقلی طور پر اس میں کتنے ہی شبہات باقی رہیں مثلاً اگر ایک کنوئیں میں نجاست کا گرنا ثابت نہیں ہو سکا تو اس کو پاک کہنا یقینی ہوگا۔ حالانکہ یہ احتمال ہر وقت ممکن ہے کہ اس میں نجاست گر گئی ہو اور اس کا ہمیں علم نہ ہو۔ لیکن جب اس احتمال کے لئے کوئی شہادت موجود نہیں تو اس کا اعتبار بھی نہیں۔ بہر حال اس میں ایک لمحہ کے لئے بھی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ مسائل فروعیہ میں ہرگز اس یقین کا اعتبار نہیں ہے جو تواتر سے حاصل ہوتا ہے بلکہ ہر یقین جو دلائل کی راہبری سے حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی بلا تردد معتبر ہے خواہ آپ اس کا نام یقین رکھیں یا اُسے ظن سے تعبیر کریں قرآن اور حدیث میں ایک حرف بھی اس کے خلاف نہیں ہے اس کے مقابلہ میں علم صرف یقین کا نام نہیں بلکہ کسی چیز کے واقعہ کے مطابق جاننے کا نام ہے امام راغبؒ فرماتے ہیں العلم ادراک الشئ بحقیقتہ یعنی علم وہ ادراک ہے جو ٹھیک حقیقت کے موافق ہو خلاصہ یہ ہے کہ ظن اور علم میں فرق یہ ہے کہ ظن صرف اٹکل اور اندازہ کا نام ہے اور علم واقعی بات کے ادراک کا یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ یقین کے لحاظ سے بھی علم متواتر کے ہم پلہ ہو۔ یہاں جن کو مغالطہ ہوا ہے وہ صرف اصطلاح منطق کی بدولت ہوا ہے قرآن و حدیث میں ظن یہ شناسی معنی میں نہیں، منطق میں جہل مرکب بھی تصدیق کی ایک قسم ہے۔

لہ دیکھو الموافقات ج ۱ ص ۳۵ ۔

پس اگر ظن ایسا ہی قابلِ تردید چیز ہے تو پھر جو ظنی احکام کتاب اللہ سے ثابت ہوں گے ان کے متعلق بھی یہی فیصلہ کرنا لازم آئے گا۔

اصولِ دین قطعی ہونا چاہئیں فروعی مسائل ظنی ہوسکتے ہیں

مولانا اسلم صاحب کو یہاں اصولی غلطی یہ پیش آگئی ہے کہ انھوں نے اصول اور فروع میں فرق نہیں کیا، اصولِ دین، دین کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اگر ظنی ہوں تو بے شک دین کی بنیاد ظنی امور پر قائم ہونا لازم آتا ہے لیکن فروع پر دین کی بنیاد قائم نہیں ہوتی بلکہ وہ اصولِ دین کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں اس لئے قطعیت کا مسئلہ صرف اصول کے ساتھ خاص ہے۔ فروع میں اگر ظنیت ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اس کی مثال بالکل قانونی دفعات کی سمجھئے قانون کے الفاظ اپنے اجمال کے ساتھ قطعی ہوتے ہیں اور اس کی ضمنی دفعات و تشریحات بسا اوقات ظنی ہوتی ہیں اسی لئے ان میں ہر عدالت کو اختلاف کرنے کی گنجایش ملجاتی ہے۔ امام شاطبی نے مقدماتِ کتاب کے پہلے مقدمہ میں اس موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ پس فروعی مسائل کے ظنی ہونے میں کوئی اشکال نہیں ہے نہ ان مسائل کے تسلیم کرلے سے دین کی بنیاد کا ظنی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہاں امام شاطبی کی ایک اور تحقیق بھی نہایت قابلِ قدر ہے غور سے مطالعہ فرمائیے۔

دلائلِ شرعیہ کی چار قسمیں ہیں (۱) قطعی (۲) ظنی۔ مگر وہ ظنی جو کسی قطعی اصل کے ماتحت ہے جیسے وہ اخبارِ آحاد جو قرآن کریم کا بیان واقع ہوئی ہیں مثلاً وضو، غسل، نماز، روزہ، حج وغیرہ کی تفصیلات اگرچہ یہ تمام تفصیلات اپنی جگہ ظنی ہوں مگر چونکہ یہ ایک قطعی نص قرآنی کا بیان ہیں اس لئے ان کا اعتبار کرنا بھی ضروری ہے۔ (۳) وہ ظنی دلیل جو کسی قطعی کے معارض ہے اور دوسری کوئی قطعی دلیل اس کے لئے شاہد بھی نہیں۔ ایسی ظنی دلیل یقیناً قابلِ قبول نہیں۔ چنانچہ اسی قاعدہ کے ماتحت حضرت عائشہؓ نے چند ظنی احادیث کا انکار فرمایا ہے۔ (۱) ایک مرتبہ ان کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا کہ میت کو زندوں کے رونے پیٹنے سے عذاب ہوتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ یعنی یہ حدیث صرف ایک شخص کا بیان ہے اس کی وجہ سے قطعی آیت کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔

(۲) حضرت عائشہؓ کے سامنے بیان کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار آنکھیں اسکو نہیں پاسکتیں وہ پا سکتا ہے آنکھوں کو

(۳) حضرت ابن عمرؓ نے روایت فرمائی کہ نحوست تین چیزوں میں ہے۔ گھوڑا، عورت، مکان۔ حضرت عائشہ نے اس حدیث کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ۔ جو بات ہوتی ہے خدا کے حکم سے ہوتی ہے۔

اس قسم کے واقعات سے حسب ذیل نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) یہ کہ سلف میں احادیث کی حیثیت تشریعی بھی

(۲) یہ کہ خبر واحد حجت ہے اگر حدیث کی یہ حیثیت نہ ہوتی یا خبر واحد حجت نہ ہوتی تو نہ شرعی معاملات میں اُن سے حجت قائم کی جاتی اور نہ مخاطب کو انکار کے لئے کسی دلیل قطعی پیش کرنے کی ضرورت پڑتی۔ (۳) یہ کہ اگر دلیل قطعی کسی ظنی دلیل کے معارض ہو جائے تو ظنی دلیل کو رد کر دینا چاہئے، لیکن یہ بحث کہ کہاں معارضہ ثابت ہے اور کہاں نہیں۔ اختلاف نظر کے تابع ہے۔ ان ہی مذکورہ بالا صورتوں میں حضرت عائشہؓ کے سوا، دوسرے صحابہ نے یہاں قطعی اور ظنی کا معارضہ ہی تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ پہلی صورت میں زندوں کے نوحہ کرنے کی میت کو عذاب اُس وقت ہوتا ہے جبکہ نوحہ ان کے گھر کا دستور ہو اور میت نے اپنی حیات میں اُس سے روکا بھی نہ ہو ظاہر ہے کہ اب یہ فعل میت ہی کا بن جائے گا اور اس لئے جو عذاب اس کو ہوگا وہ اپنے ہی فعل کا نتیجہ کہلائے گا نہ کہ دوسرے کے افعال کا۔ اسی طرح رؤیت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں بعض صحابہ نے آیت قرآنیہ میں مطلق رؤیت کی نفی تسلیم نہیں کی بلکہ علی وجہ الاحاطہ رویت کی نفی سمجھی ہے جب دنیا میں کسی بادشاہ کے چہرہ پر آنکھ بھر کر نظر ڈالی نہیں جاسکتی تو جہاں ردا، کبریا موجود ہو وہاں باادب نظروں کے سوا، بیباکانہ نظر کب ڈالی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ابن عمرؓ کی حدیث میں بھی وہ نحوست تسلیم نہیں کی جو جاہلیت کے دور میں مانی جاتی تھی بلکہ صرف ناموافقت مراد لی ہے اگرچہ ناموافقت ہر چیز میں ہوسکتی ہے مگر جو ناموافقت دائمی اور زندگی کی تلخ کرنے والی ہوسکتی ہے وہ صرف ان ہی تین چیزوں میں ہے۔ اس کے سوا عرب کے ماحول میں کوئی اور ایسی چیز نہ تھی جس کے ساتھ انھیں اپنی حیات میں اتنی طویل مصاحبت کی نوبت آتی ہو۔

حضرت عمرؓ کو شام کے سفر میں جب وبار کا حال معلوم ہوا تو آپ نے اپنے رفقاء سے شہر میں داخل ہونے نہ ہونے کے متعلق مشورہ کیا۔ رائے یہ طے پائی کہ واپس ہو جانا چاہئے اور شہر میں داخل نہ ہونا چاہئے اس پر ابو عبیدہؓ نے ایک دلیل قطعی سے معارضہ فرمایا اور کہا أفراراً من قدر الله۔ اے عمرؓ کیا آپ تقدیر سے بھاگتے ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسی سطحی بات کہنا تمہارے شایان شان نہ تھا نحن نفرّ من قدر الله الی قدر الله بیشک ہم بھاگتے ہیں مگر خدا ہی کی تقدیر کی طرف بھاگتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مثال دے کر ان کو سمجھایا کہ اگر ایک جنگل خشک ہو اور دوسرا سبز تو چرواہا اپنے جانور خشک جنگل کی بجائے سبز جنگل ہی میں چرائے گا کیا اس کا نام تقدیر سے فرار رکھا جاسکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسباب کا ارتکاب کرنا بھی تقدیر کے اندر داخل ہے اس لئے میری واپسی تقدیر سے فرار نہیں ہے بلکہ یہ بھی تقدیر میں لکھی ہوئی ہے۔ یہاں ایک ظنی معاملہ میں دو قطعی اصل معارض تھے۔ ایک صحابی کی نظر ایک طرف گئی اور دوسرے کی دوسری طرف اسی قسم کے محتمل مقامات پر اختلاف اجتہاد سے احکام کا اختلاف نمایاں ہو جاتا ہے اسی لئے ہم نے کہا تھا کہ دین کے اصول ظنی نہیں ہوسکتے مگر اس کے فروع ظنی ہوسکتے ہیں تمام اصول و فروع کے لئے قطعی دلائل تلاش کرنا قطعاً خلاف واقع ہے۔

العمل بالظن ثابت فی تفاصیل الشریعۃ[۱] شریعت کی تفصیلات میں ظن پر عمل کرنا دین میں ثابت شدہ امر ہے

امام ابو حنیفہؒ پر حدیث کی مخالفت کا طعن اور اس کا جواب

اسی ضمن میں امام شاطبیؒ ایک بڑی الجھن کو حل کر گئے ہیں۔ بعض محدثین نے جن کے مزاج میں حدیث کا رنگ تفقہ پر غالب تھا بہت سے فروعی مسائل میں امام صاحبؒ پر حدیث کی مخالفت کا الزام لگایا ہے حافظ ابن عبد البرؒ اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کثیر من اھل الحدیث استجازوا الطعن	بہت سے محدثین نے امام ابو حنیفہؒ پر اس لئے طعن کیا ہے
علی ابی حنیفۃؒ لردہ کثیرا من اخبار	کہ انھوں نے بہت سی ثقہ شخصوں کی حدیثوں پر عمل نہیں کیا
الاحاد العدول لانہ کان یذھب	اصل بات یہ ہے کہ امام صاحب کا دستور تھا کہ وہ خبر واحد کو
فی ذلک الی عرضھا علی ما اجتمع علیہ	اس باب کی دوسری احادیث اور قرآن کریم کے مجموعے سے
من الاحادیث ومعانی القرآن فما	ملا کر بھی دیکھا کرتے تھے اگر اس کا مضمون ان سے مطابقت
شذ من ذلک ردہ وسماہ	کھا جاتا تو اس پر عمل کر لیتے ورنہ اس کو قبول نہ کرتے اور اس
شاذا۔[۲]	کو شاذ حدیث سمجھتے۔

امام صاحب کا یہ طرز قابل داد تھا مگر کیا کیجئے کہ طبائع اور مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے سب کے نزدیک قابل قبول نہ ہوا۔ یہاں منکرین حدیث کو بہت زیادہ غور کرنا چاہئے۔

(۴) دلیل کی چوتھی قسم یہ ہے کہ وہ خود ظنی ہو لیکن نہ اس کی موافقت میں کوئی دلیل قطعی ہاتھ آئے نہ مخالفت میں اس کے متعلق امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں۔

والاستقراء یدل علی انہ غیر موجود[۳] تلاش کے بعد ایسی کوئی ظنی دلیل نہیں مل سکی۔

امام شاطبیؒ کی اس مفید تفصیل سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دین کے جن گوشوں میں ظنی دلائل کا اعتبار ہے وہ کس قسم کے ظنیات ہیں یعنی یہ وہ ظنیات ہیں جو کسی قطعی اصل کے ماتحت درج ہیں اگر ان کے لئے کوئی قطعی اصل شہادت نہیں دیتی تو ایسی ظنیات کا دین میں اعتبار نہیں بلکہ ان کا وجود ہی نہیں اب انصاف فرمائیے کہ دین کی بنیاد قطعیات پر قائم کرنے کے لئے یہ راہ معتدل ہے یا یہ کہ صرف قطعی دلائل اور قطعی مسائل کے علاوہ تمام دین کا انکار کر دیا جائے اس بنا پر تو سیکڑوں وہ ظنی احکام جو قرآن سے بھی ثابت ہیں قابل انکار ہو جائیں گے۔

خبر متواتر کے مفید علم یقین ہونے میں ایک غلط فہمی

محدثین کے اس بیان نے کہ خبر متواتر علم یقین کو مفید ہوتی ہے اور خبر واحد علم یقین کو مفید نہیں ہوتی، یہاں یہ غلط فہمی پیدا کر دی ہے کہ جب خبر واحد مفید علم یقین نہ ہوئی

---

[۱] الموافقات ج ۳ ص ۲۶ ۔ [۲] ایضاً ج ۳ ص ۲۴ ۔ [۳] ایضاً ج ۳ ص ۲۶

تو یقیناً مفید ظن ہوگی اس لئے یہ نتیجہ نکال لیا گیا کہ خبر متواتر کے علاوہ جتنی حدیثیں ہیں وہ سب ظنیات کا مجموعہ ہیں اور ظن ہی کو مفید ہیں حالانکہ یہ نتیجہ ان کے کلام کو نہ دیکھنے اور نہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محدثین نے جس علم کو متواتر کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ صرف علم بدیہی ہے یعنی وہ علم جو کسی دلیل و برہان کے بغیر حاصل ہوتا ہے جیسا کہ آفتاب کے وجود کا علم یہاں ہر مسلم و کافر، جوان و بوڑھا، سمجھدار اور احمق شخص بھی اس کے وجود کا علم رکھتا ہے اور اس کے لئے کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ اس قسم کا علم صرف خبر متواتر کا خاصہ ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف اپنے مشاہدات پر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس کے سوا اگر ہزاروں افراد بھی کسی بات کو نقل کریں تو یہ علم حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً لاکھوں انسان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ابن اللہ کا عقیدہ رکھتے ہیں اور کروڑوں انسان آواگون کے قائل ہیں مگر اتنے انسانوں کی خبر کے بعد بھی یقین تو درکنار اس کا ظن بھی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہاں خبرِ متواتر کی اور شرطوں کے علاوہ سب سے بڑی یہ شرط مفقود ہے کہ اس کا مبنیٰ امر محسوس نہیں بلکہ امر معقول ہے۔ مولانا اسلم صاحب خود اپنے رسالہ میں تسلیم کرتے ہیں کہ خبرِ متواتر کی شرطوں میں یہ شرطیں بھی داخل ہیں۔

(۱) خبر متواتر کا مبنیٰ محسوس ہو، اگر غیر محسوس ہو تو متواتر نہ ہوگی مثلاً مکہ ایک شہر ہے۔ . . . . . یہ خبر متواتر اور یقینی ہوگی۔

(۲) اس خبر کو سنتے ہی سامع کو یقین حاصل ہو جائے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہ رہے[1]۔ (علم حدیث ص۳۱)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ خبرِ واحد کے متعلق جس علم کی انھوں نے نفی کی ہے وہ علم بدیہی ہے اور ان کا مطلب یہ ہے کہ خبرِ واحد سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ خبر متواتر کی طرح علم بدیہی نہیں ہوتا بلکہ کبھی ظنی اور کبھی علم نظری ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ خبرِ متواتر سے علم حاصل ہونے میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں خواہ ان میں غور و فکر کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن خبرِ واحد سے علم حاصل کرنا صرف ان لوگوں کا کام ہے۔

---

[1] اب مولانا اسلم صاحب اور ان کی جماعت ذرا بتلائیں کہ اس لحاظ سے تمام قرآن کو متواتر کہنے کا کیا مطلب ہے۔ صرف یہی نا کہ یہ وہی قرآن ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا اس کے علاوہ جتنے اس کے غیر محسوس احکام ہیں اور ہزاروں عالم غیب کے اسرار و حقائق ہیں کیا وہ سب متواتر کی تعریف میں آتے ہیں پھر ان کے متعلق کیا سامع کو سننے کے ساتھ فوراً یقین آجاتا ہے۔ فرمایئے آج یہ قرآن شرق و غرب میں پھیلا پڑا ہے کس کس سامع کو اس پر بے دلیل یقین حاصل ہوا پھر "احادیث متواتر نہیں ہیں" کی چکی پیسے چلے جانے سے کیا فائدہ ہے۔ قرآن اگر متواتر ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اس کے الفاظ تواتر کے ساتھ سنے گئے ہیں اس کے علاوہ جب احکامِ شرعیہ کا مرحلہ آئے گا تو اکثر آیات کا مفہوم غیر محسوس ہونے کی وجہ سے ان کو متواتر نہیں کہا جا سکتا لہٰذا منکرینِ حدیث کو ان کا بھی صاف انکار کر دینا چاہئے کیونکہ یہ احکام بھی متواتر کی تعریف میں نہیں آتے اس لئے مفیدِ یقین ان کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔

جن میں نظر و فکر کی اہلیت موجود ہو۔ یہاں ہر شخص کو یکساں علم حاصل نہیں ہو سکتا اسی لئے خبر متواتر میں سند کی بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی اور خبرِ واحد میں یہ ضرورت باقی رہتی ہے۔ [۱]

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ اگر تمام دین کی بنیاد علم بدیہی ہی پر قائم کی جائے تو پھر تمام دین کو قطعی طور پر حاصل کرنے کی بجائے پورے سے ہاتھ ہی دھونا پڑے گا۔ عقائد، اصولِ شرائع، مغیبات اور دین کے تمام نظری مسائل سب ظنی ہو جائیں گے اور حسب زعم منکرینِ حدیث قابلِ اعتبار نہ رہیں گے۔ امام شاطبی تحریر فرماتے ہیں

وانما الادلة المعتبرة ههنا المستقرأة	عام طور پر جو دلائل یہاں معتبر ہیں وہ اس قسم کے ہیں جو علیحدہ
من جملة ادلة ظنية تضافرت على	علیحدہ اگرچہ ظنی ہیں مگر کسی ایک مسئلہ میں سب متفق ہو جانے
معنى واحد حتى افادت فيه القطع فان	کی وجہ سے خاص اس مسئلہ میں یقین کا فائدہ دینے لگتے ہیں
للاجتماع من القوة ما ليس للافتراق	ظاہر ہے کہ حسب دلائل کے ملنے کے بعد جو قوت پیدا ہو سکتی
ولاجله افاد التواتر القطع وهذا	ہے وہ ان کی انفرادی حیثیت میں پیدا نہیں ہو سکتی خبر متواتر
نوع منه. فاذا حصل من استقراء	بھی اسی اجتماعی قوت کی وجہ سے یقین کا فائدہ دیتی ہیں
ادلة المسألة مجموع يفيد العلم فهو	جب کسی ایک مسئلہ کے لئے متفرق دلائل جمع ہو جائیں تو ان کے
الدليل المطلوب وهو شبيه بالتواتر	مجموعہ سے ایک یقین حاصل ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک قسم
المعنوی۔ [۲]	کا معنوی تواتر بن جاتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ دین کے ارکان خمسہ بھی اسی طریقہ سے ثابت ہیں ورنہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کی فرضیت پر اگر صرف اقیموا الصّلوٰۃ وغیرہ سے استدلال کیا جائے تو اس میں کئی وجہ سے تردد ہو سکتا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی لغت میں صرف دعا کے ہیں لیکن اس کے ساتھ اگر خارجی قرائن کو بھی ملا لیا جائے صحابہ کے عمل اور اہلِ اسلام کے مجموعی تعامل کو بھی دیکھا جائے تو یہ حکم بدیہی ہو جاتا ہے کہ نصِ قرآنی میں صلوٰۃ کے لفظ سے یہی معروف نماز مراد ہے ان مجموعی قرائن کے بعد بھی اب یہاں وہی شخص شک کر سکتا ہے جن کو مسلمانوں کے اصل دین ہی میں شک ہے۔ [۳]

امام شاطبی کی مذکورہ بالا تحقیق سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ دین کے اکثر مسائل اگرچہ متواتر حدیثوں سے ثابت نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود پھر قطعی اور یقینی کیوں ہیں ان کے بیان کا حاصل یہ ہے کہ یقین کا افادہ صرف تواتر میں منحصر نہیں بلکہ جب متفرق دلائل اور خارجی و داخلی قرائن کسی ایک امر کی شہادت دیتے چلے جاتے ہیں تو یہاں بھی لفظی تواتر نہ سہی مگر ایک قسم کا معنوی تواتر پیدا ہو جاتا ہے اور اس مجموعہ سے یقین حاصل

[۱] دیکھو شرح نخبۃ الفکر مصنفہ حافظ ابن حجرؒ۔ [۲] الموافقات ج ۱ ص ۳۶۔ [۳] الموافقات ایضاً

ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ محدثین میں ایک بڑی بھاری جماعت یہ کہتی ہے کہ صحیحین کی تمام احادیث قطعیت کو مفید ہیں۔

احادیثِ صحیحین مفید یقین ہیں

حافظ ابن حزم سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک حدیث کے لئے کتنے راویوں کی ضرورت ہے جس کے بعد حدیث بداہۃً علم کو مفید ہوجاتی ہے۔ اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کوئی خاص عدد مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ اگر دو شخص بھی کوئی خبر دیں جن کے متعلق ہمیں یہ یقین ہو کہ اس سے پہلے نہ وہ کبھی ایک دوسرے سے ملے ہیں اور نہ اس خبر میں ان کی طمع یا خوف کا کوئی مضمون ہے پھر ایک دوسرے کی لاعلمی میں اس طویل خبر کو ہمارے سامنے بیان کریں وہ بھی از خود نہیں بلکہ ایک ایک جماعت کے واسطے سے تو ہمیں ان کے صدق کا بدیہی طور پر یقین حاصل ہوجاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو دنیا کے معاملات میں گذرتا ہے ہمارے اس بیان کی شہادت دے سکتا ہے۔ کسی کی موت، ولادت، نکاح، عزل، ولایت اور اس قسم کے تمام واقعات کا بدیہی علم ان طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں وہی شخص شک و شبہ پیدا کرسکتا ہے جو اپنے ان دنیوی معاملات کی طرف غور نہ کرے اور روزمرہ کے ان واقعات سے قطع نظر کرلے۔

اگر آپ کسی آدمی سے ایک جھوٹا افسانہ تیار کرنے کے لئے کہیں تو وہ یقیناً ایک لمبا افسانہ گھڑ سکتا ہے لیکن اگر دو مکانوں میں دو شخصوں کو علیحدہ علیحدہ بند کردیں تو یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ وہ کوئی ایسی حکایت اپنی جانب سے تیار کرلیں جس میں دونوں اول سے آخر تک متحد ہوں۔ ہاں شاذ و نادر کبھی ایسا واقع ہوگیا ہے کہ دو شاعروں کے خیالات ایک آدھ مصرعہ میں اتنے مطابق ہوگئے ہیں کہ ان میں لفظی اتحاد بھی پیدا ہوگیا ہے مگر ہمیں اب تک اپنی عمر میں ایک واقعہ بھی ایسا دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا جس میں دو شاعروں کا کسی ایک شعر میں بھی پورا پورا اتفاق ہوگیا ہو۔ اگرچہ لوگوں نے اس بارے میں ایسے کلام کی ایک فہرست پیش کی ہے مگر ہمارے نزدیک وہ اکثر علمی سرقے ہیں جن میں اپنی عیب پوشی کے لئے اتحاد خواطر کے دعوے کردئے گئے ہیں۔ پس کبھی خبر واحد میں بھی ایسے قرائن جمع ہوجاتے ہیں کہ وہ بھی بدیہی طور پر یقین کو مفید ہوجاتی ہے اور کبھی ایک جماعت کی خبر بھی یقین کا فائدہ نہیں دیتی مثلاً اگر کسی خبر سے کسی شہر کے شہر کا نفع و نقصان متعلق ہو تو عقل کے نزدیک اس تمام شہر کا جھوٹ پر متفق ہوجانا بھی محال نہیں ہے۔ بہر حال خبر کے مفید یقین ہونے کا کوئی ایک ضابطہ نہیں ہے یہ حالات اور زمانہ کے تابع ہے۔

خبر واحد کے مفید یقین ہونے پر قرآن سے ایک استدلال

اس کے بعد ابن حزم لکھتے ہیں کہ ایک قسم کی حدیث وہ ہے جس کا خبر دینے والا ایک ہی شخص ہے پھر جس سے وہ نقل کرتا ہے وہ بھی ایک ہی شخص ہے اسی طرح ایک ہی ایک راوی کے واسطے سے یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہوجاتی ہے اگر یہ واسطے حسب ضابطہ سچے اور

عادل اشخاص ہیں تو اس پر عمل کرنا بھی واجب ہے۔ حارث بن اسد محاسبی، حسین بن علی الکرابیسی کا یہی مذہب تھا۔ ابو سلیمان کا مختار بھی یہی تھا اور ابن خویز منداد نے یہی امام مالکؒ سے بھی نقل کیا ہے۔ قرآن کریم بھی اس کی صحت کا شاہد ہے۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ	ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر جماعت میں سے ایک طائفہ دین
لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ	کی تعلیم کے لئے نکل کھڑا ہوتا تاکہ جب وہ لوٹ کر اپنی قوم کے
إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ۔	پاس آتا تو ان کو ڈراتا شاید وہ بھی بری باتوں سے بچنے لگتے۔

لغت میں طائفہ کسی چیز کے ایک حصہ کو کہتے ہیں اس لئے اس کا اطلاق ایک شخص سے لیکر جماعت تک کیا جا سکتا ہے لہذا آیتِ بالا کی بموجب ہر جماعت کا فرض ہے کہ جب ایک شخص یا کوئی جماعت ان کو دین کی باتیں پہنچائے تو وہ ان کو قبول کریں اور مانیں۔ [1]

حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس پر مستقل دو مقالے لکھے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جب ایک واقعہ ایک شخص کی زبانی ہمارے سامنے منقول ہوتا ہے پھر مختلف گوشوں سے مختلف طور پر اس کی مختلف شہادتیں ہمیں ملجاتی ہیں تو اگرچہ ہر ہر شہادت اپنی جگہ خبر واحد ہوتی ہے لیکن ان خبروں کے مجموعہ[2] سے ہمیں یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ یقیناً صحیح ہے عقل یہ ہرگز باور نہیں کر سکتی کہ مختلف اشخاص ایک دوسرے کی لاعلمی میں کوئی ایک واقعہ نقل کریں اور پھر وہ از اول تا آخر کسی ایک بیان میں متفق ہو جائیں مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور جابرؓ کا ایک واقعہ صحیحین میں موجود ہے کہ ایک سفر میں آپ نے جابرؓ سے اونٹ خریدا گو اس اونٹ کی قیمت بیان کرنے میں راویوں کا اختلاف ہے لیکن متعدد طریقوں سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے جابرؓ سے اونٹ خریدا تھا پس جب مختلف اشخاص نے ہمارے سامنے اس ایک واقعہ کو بیان کیا ہے درانحالیکہ ہمارے پاس اس کا بھی کوئی قرینہ نہیں ہے کہ ان اشخاص نے اس سے قبل کہیں بیٹھ کر اس خبر کے بنانے میں کوئی مشورہ کیا تھا یا اس خبر کے بیان کرنے سے ان کی کوئی خاص غرض متعلق ہے تو اس واقعہ کے یقین کرنے میں ہمیں کوئی تامل نہیں رہتا[3] اگر اس کے بعد بھی ہم اس واقعہ میں محض عقلی طور پر شک و تردد کریں تو اس کا نام تحقیق واقعہ نہیں بلکہ وہم پرستی ہے۔

---

[1] توجیہ النظر ص ۴۸ و ۴۹۔ [2] علامہ جزائری نے ضمنی طور پر یہاں ایک اور مفید بات لکھی ہے۔ بہت سی ناواقف اصحاب کو محدثین پر یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے حدیث کی کتابوں میں ضعیف حدیثیں کیوں جمع کر دی ہیں۔ اس کے جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ محدثین مجہول، اور کمزور حافظہ کے اشخاص کی احادیث صرف اس لئے جمع کرتے تھے کہ یہ احادیث کم از کم ایک مضمون کی تقویت اور تائید میں کارآمد ہو سکتی ہیں۔ قال احمد قد اکتب حدیث الرجل لاعتبرہ۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ میں کبھی ایک شخص کی حدیث اس لئے بھی لکھتا ہوں کہ اس کو متابعت اور شواہد کے طور پر کام میں لاسکوں۔ (توجیہ ص ۱۳۴) [3] توجیہ ص ۱۳۴۔

خبرِ واحد کے مفید یقین ہونے پر قرآن کریم کا دوسرا استدلال

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (حجرات)

اے ایمان والو جب کوئی فاسق شخص تمہارے سامنے کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بے تحقیق کسی قوم پر جا پڑو اور بعد میں اپنے کئے پر نادم اور شرمندہ ہونا پڑے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے خبرِ واحد کو قبول کیا ہے اگر ایک شخص کی خبر قابلِ قبول نہ ہوتی تو وہ اس کو تحقیق کی بجائے رد کرنے کا امر کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب سے خبریں پہنچانے کے لئے بھی جو ذریعہ اختیار فرمایا ہے وہ بھی خبرِ واحد ہی ہے یعنی اللہ کا رسول ایک ہی ہوتا ہے اگر دین میں اصولی لحاظ سے ایک شخص کی خبر قابلِ قبول نہ ہوتی تو خود رسول تنہا اپنی خبر پر دوسروں کو ایمان لانے کا حکم کیسے دے سکتا تھا۔ قرآن کریم نے جہاں بھی زور دیا ہے راوی کی عدالت پر اور اس کے صدق پر زور دیا ہے حتی کہ صرف زنا کے ایک معاملہ کے سوا جان کے معاملہ میں بھی دو شخصوں کا بیان اعتبار کر لیا ہے اور ایک جگہ بھی خبروں کی تصدیق کے لئے تواتر شرط نہیں کیا۔ اگر دو شخصوں کے بیان پر ایک مسلمان کو قصاصاً قتل کیا جا سکتا ہے یا ایک چور کا ہاتھ کاٹا جا سکتا ہے، یا ایک شخص پر حدِ قذف لگائی جا سکتی ہے یا لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی مالیت تقسیم کی جا سکتی ہے تو کیا یہ اس بات کا بدیہی ثبوت نہیں ہے کہ شریعت نے یقین کا معیار صرف تواتر نہیں رکھا کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ شریعت نے ایک مسلمان کا قتل، ایک معصوم ہاتھ کا قطع ایک بے گناہ پر حدِ قذف اور لاکھوں کی مالیت کے تقسیم یقین حاصل ہوئے بغیر محض ظن کی بنا پر جائز قرار دیدی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اگر زنا جیسے نازک معاملہ کے لئے بھی قرآن کریم نے چار شخصوں کی گواہی بصراحت لازم نہ کی ہوتی تو امتِ محمدیہ یہاں بھی دو شخصوں کے بیان سے رجم کرنے کا فیصلہ کر دیتی۔ علماء نے اس کی حکمتیں اپنی جگہ مفصل بیان کی ہیں مگر شاید اس کی ایک حکمت یہ بھی ہو کہ چونکہ زنا کے ایک ہی معاملہ کا تعلق دو جانوں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کبھی دو شخصوں کو اس ایک ہی جرم کے ثبوت میں رجم کرنے کی نوبت آ جائے اس لئے یہاں اس جرم کے ثبوت کے لئے وہ شہادت شرط کر دی گئی ہو جو تنہا تنہا دو جرموں کے لئے شرط کی گئی تھی۔

یہاں یہ عذر کرنا کہ دو شخصوں کا بیان ایک مسلمان کے قتل کروانے کے لئے تو کافی ہو سکتا ہے مگر نماز کے ایک واقعہ، آپ کے حج کی ایک صورت، آپ کے روزہ کی ایک سنت نقل کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتا قطعاً غیر معقول ہے۔ معتزلہ بھی دراصل منکرینِ حدیث کے قافلہ کے ساربان ہیں یہ دیکھ کر خبرِ عزیز کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ دینی ثبوت کے لئے یقین کا مطالبہ تو معقول ہو سکتا ہے مگر تواتر کی شرط لگانا بالکل

بے معنی بات ہے۔ پس منکرین حدیث کو دو باتوں میں ایک بات صاف کر دینا چاہیئے یا یہ کہ شریعت نے تواتر کے علاوہ یقین کو یقین ہی نہیں کہا یا خبرِ واحد کسی حال میں مفید یقین ہوتی ہی نہیں۔ اگر خارجی قرائن ملا کر کبھی خبرِ واحد بھی یقین کا فائدہ دے سکتی ہے اور شریعت کے نزدیک بھی یہ یقین معتبر ہے تو پھر یہ تفریق کہ اس قسم کا یقین تو دین کے معاملہ میں معتبر ہے اور اس قسم کا معتبر نہیں محض ایک وہم پرستی ہے۔

اسلام میں تنقید و تبصرہ

خبرِ واحد کی حجیت کے سلسلہ میں یہاں دو غلط فہمیاں اور بھی ہیں ایک یہ کہ محدثین کا گروہ محض ایک جامد گروہ ہے جسے فنِ درایت سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا وہ دقیانوسی خبروں کو آنکھ میچ کر مان لینا علم اور دین سمجھتا ہے اور نقد و تبصرہ کو بددینی تصور کرتا ہے۔ دوم یہ کہ ادیانِ سماویہ کا مبنیٰ صرف روایت پر ہے درایت کو یہاں کوئی دخل نہیں دراصل پہلی غلط فہمی بھی اسی کی ایک فرع ہے۔ ان دو غلط فہمیوں کی وجہ سے بعض ناواقف تو حدیث کا رتبہ تاریخ سے بھی کمتر تصور کرتے ہیں اس لئے ہمیں اس کے متعلق بھی کچھ لکھنا ہے۔

فنِ تاریخ اور حدیث

دائرۃ المعارف میں بستانی نے تاریخ کے متعلق ارسطو کا یہ مقولہ نقل کیا ہے۔

الشعر احسن من التاریخ التاریخ یذکر الاشیاء کما ھی ولکن الشعر یذکرھا کما یجب ان یکون۔	شعر تاریخ سے بہتر چیز ہے کیونکہ تاریخ واقعات کو جوں کا توں نقل کر دیتی ہے اور شعر میں ان کا ذکر اس طرح ہوتا ہے جیسا انہیں واقع میں ہونا چاہیئے۔

ہمارے نزدیک ارسطو کا یہ مقولہ تاریخ کے اس دور تک تو بالکل درست تھا جب تک کہ اس میں نہ روایت کی اہمیت تھی نہ درایت کی بحث۔ لیکن جب علم تاریخ کو کچھ ترقی ہوئی علمِ سیاست، علمِ نفسیات اور علمِ تمدن نے بہت سے واقعات کو نقد و تبصرہ کی روشنی میں چھانٹ ڈالا تو اب علمِ تاریخ کا پایہ ذرا بلند ہو گیا اور اس کا نام فلسفۂ تاریخ رکھا گیا۔ اب علمِ تاریخ کی مثال صرف اینٹوں کے ایک ڈھیر کی نہیں رہی جس میں کارآمد اور بیکار ہر قسم کی اینٹیں ہوتی ہیں، بلکہ فلسفۂ تاریخ کی وجہ سے ایک مورخ کی مثال اب ایک ماہر معمار کی سمجھ لی گئی جو اپنی تعمیر کی موزونیت کے لحاظ سے کچھ اینٹیں بیکار سمجھ کر پھینک دیتا ہے اور کچھ اپنی تعمیر میں استعمال کر کے ان کو ایک خوبصورت قصر کی شکل پر کھڑا کر دیتا ہے۔ اسی لئے محقق ابنِ خلدون لکھتا ہے کہ ایک مورخ کے لئے قواعدِ سیاست، طبائعِ موجودات اور علمِ عمرانیات کا جاننا بھی ضروری ہے، دنیا کے عادات و اخلاق اور مذاہب کے مختلف رنگ ڈھنگ، موجودہ اور ماضی کے حالات کا موازنہ پھر اس کے اتفاق و اختلاف کے اسباب پر

غور و خوض، اصولِ حکمت کی تنقیح اور ان کے اسباب کے ظہور کا علم بھی اس کے فرائض میں داخل ہے اگر کوئی مورخ ان مراحل سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے تو بلا شبہ اس کو عرشِ تحقیق پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے۔ (مقدمہ)

بلا شبہ یہ سب گوشے اپنی جگہ بڑی علمی وسعت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک نقد و تبصرہ کا تعلق ہے وہ تمامتر اب بھی صرف فنِ درایت پر مبنی رہا اور تاریخ کے اس دورِ شباب میں بھی اس کا روایتی سرمایہ یا صرف چند مخطوطات ہیں جو کہنہ الواح یا بوسیدہ ہڈیوں کی شکل پر دستیاب ہو گئے یا وہ ملفوظات جو محض سنی سنائی افواہ پر بلا کسی سند کے زیرِ ترتیب آگئے۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی واقعہ اور حادثہ کے ثبوت کے لئے اس کی سند کا مطالبہ سب سے پہلا سوال ہونا چاہئے تھا۔ مگر یہاں یاس و قنوط نے اس سوال کو ذہن سے ایسا نکال دیا ہے کہ گویا سند کا فقدان تاریخی واقعات کے ثبوت کے لئے کوئی عیب ہی نہ تھا۔ اس کا اقتضاء تو یہ تھا کہ یہ بے سند واقعات اگر فنِ درایت کی بدولت کچھ چھن جاتے تو اس کے بعد بھی ان کا رتبہ صرف قیاسات کے برابر رہتا لیکن چونکہ دوسری طرف نقد و تبصرہ اپنی عقل کی روشنی میں ہوتا ہے اس لئے یہاں انسانی دماغ اس کو یقین کا آخری مرتبہ دیدیتا ہے حتیٰ کہ ایک انسان کو حیوانات کے ساتھ اپنا الحاق کرنے میں کوئی تامل نہیں رہتا۔ وہ یہ اعلان کرنے میں بڑا فخر محسوس کرنے لگتا ہے کہ انسان درحقیقت حیوانات ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے اور اپنی اس ادھوری اور ناکمل تحقیقات کی بنا پر قرآن کریم کے اس بیان کی تکذیب میں ذرا تامل نہیں کرتا۔ جو انسان کی پیدائش کے سلسلہ میں خود خالق نے بتلایا ہے سوچئے اور انصاف کیجئے کہ یہاں بنیادِ ثبوت کیا ہے اور نوعیتِ عقیدت کیا۔ اگر کبھی یہ بے بنیاد تاریخ قرآن کریم سے ہلکی سی ٹکر بھی کھا جاتی ہے تو تاریخ پرست دنیا خوشی خوشی قرآن کے بیان میں ہی شبہ کرتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ حق و یقین کی اس ٹکر کے بعد خود تاریخ کی شکست تسلیم کرے۔ [1]

تاریخ کا ایک دوسرا شعبہ جو تاریخ سے کٹ کر مذہب کے نام سے موسوم ہو گیا تھا اس نے اس کے برعکس درایت کی بحث ختم کر دی اور صرف روایت کا پہلو اپنے سامنے رکھ لیا مگر افسوس کہ وہ بھی اتنا ناتمام تھا کہ نہ تو اس میں تسلسل کی کوئی قید تھی نہ افراد و اشخاص کے کیرکٹر پر کوئی بحث۔ ہماری مراد یہاں یہودیت و نصرانیت ہے۔ احبار و رہبان نے ان کو اس راستہ پر ڈال دیا تھا کہ جسے وہ حلال کر دیں بس وہ حلال ہے اور جسے حرام

---

[1] حال ہی میں ڈاکٹر ٹسڈل نے قرآن کریم پر اعتراض کرتے ہوئے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ گوسالہ بنانے والا درحقیقت سامری نہ تھا بلکہ وہ خود حضرت ہارون علیہ السلام ہی تھے۔ اس اعتراض کو جدید دماغوں نے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا حتیٰ کہ اس کی تردید میں "برہان" کو اس سے بڑھ کر تاریخی ثبوت کے ساتھ ایک مقالہ شائع کرنا پڑا حالانکہ اس اعتراض کی بنیاد یہ ہے کہ قرآنی بیان تاریخی بیانات کے برابر بھی وزن نہیں رکھتا جب تعلیم یافتہ دماغوں میں قرآن کا وزن یہ رہ جائے تو حدیث کا کیا ذکر کیا جائے۔

لکھدیں وہ حرام۔ گویا اب اصل مذہب کی تاریکی میں ایک تاریکی کا اور اضافہ ہوگیا پہلے تو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان صرف ان کتب محرفہ کا ہی ایک واسطہ تھا، اب مذہب کی جگہ ان احبار و رہبان نے سنبھال لی۔ حالانکہ صدیوں کا مندرس شدہ مذہب پہلے خود اپنے ثبوت ہی کا محتاج تھا مگر یہاں اس غلط بنیاد پر احبار و رہبانیت کی قیادت نے اور بہت سی غلط بنیادیں قائم کر دیں اور یہ مذہبی تعمیر گو دیکھنے میں تو بہت اونچی ہو گئی مگر اس میں صدق و راستی کا عنصر بہت ہی کم باقی رہ گیا تھا۔ اس کا تمام مٹیریل وہی تھا جو احبار و رہبان نے محض اپنی خواہشات کی خاطر خود ترتیب دے لیا تھا، ادھر قوم بنی اسرائیل میں اعتدال کلیۃً مفقود تھا، جب وہ تحقیق پر آتے تو کوہ طور پر کلام باری بلا واسطہ سن کر سو طرح کے شبہات نکالنے لگتے اور جب تقلید پر آمادہ ہوتے تو جو ان کے احبار و رہبان ان کے سامنے ڈالتے اُسے اندھوں کی طرح نگلنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ غرض نقد و تبصرہ اور فہم و فکر کی ان میں کوئی استعداد نہ تھی اسی کو قرآن کریم نے ذیل کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ۔	انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا کی جگہ پر سمجھ لیا تھا۔

روایت اور درایت کے اس غیر متوازن دور میں اسلام آیا اور اس نے ان دونوں کا توازن قائم کر کے صحیح تنقید کی راہ دکھلائی اور اس کے لئے ایک ایسا معتدل آئین مرتب فرمایا جس میں نہ افراط ہو نہ تفریط، اس نے بتایا کہ ہر کان پڑی خبر کی طرف دوڑ پڑنا بھی غلط ہے اور تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں بدگمانی کی حد تک پہنچ جانا بھی غلو اور وہم پرستی ہے۔ انسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بے اعتمادی کی حالت میں آنکھ میچ کر تغلیط اور اعتماد کی صورت میں بے دلیل تصدیق کر لیا کرتا ہے مگر قرآن نے یہاں دوست و دشمن اپنے اور پرائے کا فرق ختم کر کے سب کے لئے یکساں تحقیق و تبیین کا قانون مقرر کر دیا ہے اور دوسری طرف وہ تجسس اور تحقیق جس کی بنیاد وہم پرستی اور صرف بدظنی پر ہو اس سے بھی روک دیا ہے۔ امام غزالی مستصفیٰ میں لکھتے ہیں کہ:۔

فرقہ سمینہ کے نزدیک علم صرف حواس کے مدرکات و معلومات میں منحصر ہے ان کے نزدیک خبر متواتر بھی مفید علم نہیں ہوتی وہ یہاں بھی دس طرح کے شبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ (توجیہ ص ۴۸)

سوفسطائی ان سے بھی ایک قدم آگے ہیں انھیں اپنے مدرکات حسی کہ اپنے وجود میں بھی شبہ نظر آتا ہے وہ کہتے ہیں کہ جب بسا اوقات ہماری چشم و گوش اپنے اپنے دائرہ ادراکات میں غلطی کر جاتے ہیں تو پھر ان کے مدرکات کو قطعی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شکوک و اوہام کا دروازہ کھول دیا جائے اور ہر شک کو یقین کی راہ میں حائل تسلیم کر لیا جائے تو پھر عالم میں یقین حاصل کرنے کی کوئی صورت ہی باقی نہ رہے۔ نہ خبر متواتر اور نہ اپنے حواس۔ اس کا نام تحقیق و تنقید نہیں بلکہ یہ ایک جنون کا شعبہ ہے کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو دنیا اور آخرت کے

تمام معاملات معطل ہو کر رہ جائیں لیکن اگر اس کے برخلاف ہر خبر کو تسلیم کر لیا جائے اور ہر جگہ حسن ظن کا دروازہ کھولدیا جائے تو اس کا نتیجہ بھی عالم کے درہم برہم ہونے کے سوا اور کچھ نہیں، اس لئے قرآن نے یہ تعلیم کی کہ ہر خبر کی تحقیق و تبیین کر لیا کرو خواہ وہ فاسق شخص ہی کی خبر کیوں نہ ہو، ہر چند کہ فاسق آدمی کی خبر رد کر دینے میں بھی مضائقہ نہیں تھا مگر قرآن کسی خبر کا بے دلیل رد کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ فاسق آدمی بھی صحیح خبر دے سکتا ہے پس اس کی ہر خبر کا رد کر دینا بھی قرین مصلحت اور طور انصاف نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ	اے ایمان والو جب کوئی فاسق شخص تمہارے پاس کوئی
بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا	خبر لے کر آیا کرے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ
بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ	تم بے تحقیق کسی قوم پر حملہ کر دو بعد میں اپنے کئے پر
نَادِمِينَ۔ (حجرات)	شرمندہ ہونا پڑے۔

دوسری طرف اس نے تجسس اور بدظنی کی بھی ممانعت فرمائی کہ ایسی تحقیق سے بھی نظام عالم برباد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا	اے ایمان والو بہت سی بدگمانیوں سے بچا کرو کیونکہ بعض
مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ	بدگمانی گناہ کی حد تک ہوتی ہیں اور تجسس اور ڈھونڈ ڈھونڈ
وَلَا تَجَسَّسُوا۔ (حجرات)	کر لوگوں کے عیب بھی تلاش کرنے کی خصلت مت اختیار کرو

تیسرے مقام پر یہ بھی بتایا کہ ہر خبر کی تفتیش کا ہر انسان سلیقہ نہیں رکھتا بعض خبریں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی تفتیش خاص افراد ہی کر سکتے ہیں گویا یہ تفتیش کے محکمہ جات کی طرف اشارہ ہے غرض ہر خبر کی تحقیق کیلئے اہلیت درکار ہے

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ	جب ان کے پاس کوئی امن یا ڈر کی خبر آتی ہے تو اس کو
أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَ	مشہور کر دیتے ہیں اگر اس کو رسول یا اپنے علماء و حکام تک
إِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ	پہنچا دیتے تو ان میں ملکہ استنباط رکھنے والے شخص تھے
يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ (النساء)	وہ اس کو پورے طور پر معلوم کر لیتے۔

روایتی پہلو میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہو سکتی ہے وہ مخبر اور شاہدوں کا بیان ہے اس لئے ان کو یہ تعلیم دی گئی کہ اپنے بیان اور گواہی میں پوری احتیاط سے کام لیں جھوٹ یا طرفداری کا شائبہ نہ آنے پائے۔ اس لئے جھوٹ بولنے یا ایک دوسرے پر جھوٹا الزام لگانے کی اتنی مذمت کی گئی کہ اس سے بدتر سوسائٹی کا کوئی عیب نہ رہا لعنت کا لفظ عربی زبان میں انتہائی مذمت و نفرت کا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قرآن کریم نے عام طور پر جھوٹ بولنے والوں پر لعنت کا اعلان کر دیا۔

لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ	جھوٹ بولنے والوں پر خدا کی لعنت ہو۔

دوسری جگہ جھوٹ بولنا مخالف پارٹی یعنی بے ایمانوں کا شعار قرار دیا۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَاذِبُونَ۔	خدا پر جھوٹ کی افترا پردازی وہی لوگ کرتے ہیں جو اس کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے اور در اصل یہ جھوٹے یہی لوگ ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی پاک باز کی عصمت پر تہمت لگا دے تو اس کے لئے دائمی طور پر یہ تعزیر مقرر کردی۔

وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا	ان کی گواہی آئندہ کبھی قبول نہ کرو۔

گویا انسانی سوسائٹی میں ہمیشہ کے لئے ان کے قول کی بے وقعتی آئینی طور پر تسلیم کرلی گئی۔ بوقتِ ضرورت شہادت کا چھپا لینا ایسا گناہ قرار دیا جو انسان کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ	"جو شخص گواہی چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا۔"
وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ	"اگرچہ وہ شخص ہمارا قرابت دار ہی ہو۔"

پھر کذب و افترا کی اس عام مذمت پر ہی کفایت نہیں کی بلکہ یہ خاص طور پر سمجھایا کہ خدا پر افترا پردازی کا نمبر ہر قسم کے جھوٹ اور افترا سے بڑھ کر ہے تاکہ عام طور پر راستبازی کے علاوہ یہاں خاص طور پر بھی اس کا لحاظ رکھا جائے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا۔	اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی ذات پر جھوٹ افترا کرے۔

آئینِ روایت اور درایت کو خوب مرتب اور مہذب کرکے جب اپنے رسول کی خاص وحی کا ذکر کیا تو قانونِ روایت کے مطابق اس کی سند پھر اس کے راوی کی عدالت بھی خود واضح فرمائی۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ۔	یہ قرآن ایسے فرشتے کی زبانی ہے (جو حسب ذیل اوصاف کا مالک ہے) قوت والا ہے، خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے، اور وہاں ایک امانت دار افسر ہے۔

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نطق کے متعلق عام انسانوں سے ایک صفتِ برتری یہ بیان فرمائی۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔	اپنی خواہشِ نفس سے وہ کچھ نہیں بولتے جو بات کہتے ہیں وہ خدا کی وحی ہوتی ہے جو ان پر نازل ہوتی ہے۔

آپ نے درایت پر زور دیتے ہوئے مخاطبین کے سامنے اپنی صفائی ان الفاظ میں پیش کی۔

لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ	آخر اپنے دعویٔ نبوت سے پہلے بھی میں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تمہارے درمیان ہی

قولہ أَفَلَا تَعْقِلُوْن ۔ گذرا ہے (پھر کبھی جھوٹ بولا) تو کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

اس کے روایتی پہلو کی صفائی کے لئے قرآن کریم نے رسول کے بارے میں ایک خاص آرڈیننس کا بھی ذکر فرمایا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۔ اگر بالفرض آپ ایک بات بھی ہماری طرف اپنی جانب سے بنا کر منسوب کرتے تو ہم دایاں ہاتھ پکڑ کر ان کی شہ رگ کاٹ دیتے۔

ان بنیادی اصول کی روشنی میں مذہب اسلام جتنی ترقی کرتا رہا اسی قدر اس کے بنیادی تنقید کے اصول بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے حتی کہ اسناد، جرح و تعدیل، احوالِ رواۃ، ہر ایک کے لئے جدا جدا مستقل فن مرتب ہو گئے۔ علامہ جزائری نے توجیہ النظر میں حدیث کے سلسلہ میں ۵۲ قسم کے علوم بالتفصیل بیان فرمائے ہیں۔ جن کے مطالعہ کے بعد احادیث کے مفیدِ یقین ہونے میں ایک منٹ کے لئے بھی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہتی۔ سمنیہ اور سوفسطائیہ کی طرح شبہات نکالے چلے جانے کا تو کسی کے پاس بھی کوئی علاج نہیں ہے لیکن واقعات کی دنیا میں جہاں ذہنی اوہام کی کوئی قیمت نہیں ہے ہر محکم سے محکم طریق اور ہر جائز سے جائز احتمال کا لحاظ رکھ کر یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص بھی حدیث کے مختلف طرق اس کے راویوں کے صدق و کذب اور اس کے جروح و علل پر نظر کرے گا اس کو اُن کی سچائی پر یقین کئے بغیر کوئی چارہ نہیں رہ سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اُس میں چند لمحات کی محنت و مشقت اٹھائے بغیر پہلے سے اس کے انکار کا ارادہ کر لیا جائے اور محدثین کی شب و روز کی اُن تھک محنتوں کی تردید کے لئے صرف چند مضحکانہ کلمات کو کافی سمجھ لیا جائے۔ علامہ محمد بن ابراہیم وزیر تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام کے تمام فرقے ہر طبقہ میں ہر فن کے بارے میں اسی اہلِ فن کے قول کو دلیل سمجھتے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام علوم باطل ہو جاتے کیونکہ دوسرے فن کا شخص یا تو اس فن سے بحث ہی نہیں کرتا اگر کرتا ہے تو ناکافی بحث کرتا ہے۔ اگر قرآن و سنت کے لغات اہلِ تجوید سے حل کئے جائیں، قرات کا اختلاف اہلِ لغت سے پوچھا جائے معانی و نحو کے مسائل محدثین سے اور علم حدیث اور اسناد کے مباحث متکلمین سے دریافت کئے جائیں تو یقیناً تمام علوم درہم برہم ہو جائیں گے اور یقیناً یہ عقل کے بھی خلاف ہوگا۔" (الروض الباسم ج ۱ ص ۱۱)

یہ مقولہ مشہور ہے

كُنْ يَهُوْدِيًّا صِرْفًا وَإِلَّا فَلَا تَلْعَبْ بِالتَّوْرَاةِ یا ٹھیٹ یہودی بن جا ورنہ تورات سے مت کھیل۔

پس خبر واحد پر یقین یا تو اس طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ جن کو یہاں شب و روز خرچ کرنے کے بعد یقین حاصل ہو چکا ہے ان کے بیان پر اعتماد کر لیا جائے نہیں تو پھر خود اس جانفشانی کے لئے کمرہمت کس لی جائے۔

حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ محدث کی مثال ایک صرّاف کی ہے بسا اوقات روپیہ کی شکل و صورت اور آواز تک میں فرق نہیں ہوتا مگر صرّاف کی چٹکی اس کا کھوٹ بتا دیتی ہے۔ بس اگر انصاف کے ساتھ احادیث کی روشنی میں اسوۂ رسول کو تلاش کرنا منظور ہے تو صرّاف کی طرح یا تو خود مذاق پیدا کیا جائے ورنہ کسی صرّاف کے قول پر اعتماد کیجئے۔ اگر آپ نہ یہ کر سکتے ہیں نہ وہ اور صرف احادیثِ رسول کو ایک غیر دلچسپ افسانہ یا رطب و یابس سے بھری ہوئی ایک تاریخ قرار دیتے ہیں تو اب یہ آپ کی مرضی ہے۔

محدثین اور راویوں کا مجبورِ رائے

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس قوم نے تحقیق و تبیین، استنباط و استشہاد کی اہمیت کذب و افتراء سے نفرت، بدگمانی و بدظنی سے احتراز کے دور میں پرورش پائی ہو، کیا اس کا طبعی مزاج تساہل و غفلت، اغماض اور چشم پوشی ہو سکتا ہے یا ہر معاملہ کی تحقیق و تفتیش کرنا ان کی طبیعتِ ثانیہ ہو جانا چاہئے، اور حسن ظن و بدظنی سے علیحدہ ہو کر واقعہ کی تحقیق کرنا انھیں اپنا ایک فرض منصبی سا نظر آنا چاہئے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل[1] کو آپ پہلے مشاہدہ کر ہی چکے ہیں کہ اگر ان کے سامنے کوئی شخص کوئی حدیث بیان کرتا

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰؓ حضرت عمرؓ کے دروازہ پر آئے اور تین بار سلام کے بعد جب جواب نہ ملا تو واپس ہو گئے چند قدم چلے تھے کہ خادم اندر سے آیا اور اس نے کہا آیئے امیر المومنین آپ کو بلاتے ہیں۔ یہ پہنچے تو اُن سے واپسی کا سبب دریافت کیا گیا انھوں نے اس کے متعلق ایک حدیث سنا دی حضرت عمرؓ نے فرمایا یا تو اس پر گواہی پیش کیجئے ورنہ سزا ملے گی پھر خود ہی یہ بھی فرما دیا کہ

انی لم اتہمک ولکنی خشیت ان یتقول الناس علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (توجیہ ص ۱۶) میں نے تم پر کسی شبہ کی وجہ سے شہادت طلب نہیں کی بلکہ یہ اندیشہ کیا کہ آئندہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر غلط بیانی نہ کریں۔

یہی وجہ تھی کہ سفیان بن عیینہ فرماتے تھے کہ اگر حضرت عمرؓ ہمارے زمانہ میں ہوتے تو ہمیں سزا دیتے۔ (جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۰)

اس ایک ہی واقعہ سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کو حدیث کا کتنا اہتمام تھا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہاں سزا مزید احتیاط کی بنا پر تھی یا حدیث کی روایت کرنے پر اور یہ بھی کہ ابن عیینہ کے اس فرمان کا اصل منشا کیا تھا۔ حیرت ہے کہ مولانا اسلم صاحب ان جیسے تاکیدی احکام کو نقل کر کر کے اس سے انکارِ حدیث کے متعلق کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ انصاف آپ ہی پر ہے کہ جہاں مخلصین صحابہ کے بیان پر گواہیاں طلب کی جاتی ہوں وہاں منافقین کو کذب بیانی اور افترا کا کیا موقع مل سکتا تھا۔

فائدہ سے خالی نہ ہوگا اگر ہم آپکو یہ بتلا دیں کہ جب تک کفر کو طاقت رہی نفاق ظاہر نہیں ہوا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ پہنچے اور اسلام کے ہاتھ میں طاقت آ گئی، کفر مغلوبیت کی زندگی بسر کرنے لگا تو اب کفار کو نفاق کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی ان کے متعلق بھی قرآن نے یہ فرمایا ہے فلتعرفنھم فی لحن القول۔ جب وہ آپ کی خدمت میں آ کر آوازیں بنا بنا کر باتیں کریں گے تو آپ انھیں پہچان بھی لیں گے۔ (کتاب الایمان)

کیا یہ انصاف ہوگا کہ منافقین کی اس مقہور و ذلیل زندگی کے اثرات کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ثابت شدہ اور مستحکم آثار کو مشتبہ تسلیم کر لیا جائے۔ مولانا اسلم صاحب کے لئے تو منافقین کا وجود احادیث کے ماننے میں مانع ہے لیکن ان کو معلوم نہیں کہ منکرین قرآن یہی شبہ قرآن کے بارے میں پیش کرتے ہیں اور قرآن کے تواتر کو مخالفین کا تواتر سمجھ کر اس سے کچھ تسلی حاصل نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک منکرین حدیث کے پاس اکثر شبہات وہی ہیں جو شیعوں نے حفاظتِ قرآن کے سلسلہ میں (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

کواس سے پہلا سوال گواہی کے متعلق ہوتا تھا اگرچہ دوسری مجلس میں یہ بات بھی صاف کردی جاتی تھی کہ یہ تحقیق کسی بدگمانی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ حدیث کی اہمیت آئینی طور پر اس کی مقتضی تھی کہ اس کے نقل میں ہر ممکن سے ممکن احتیاط کو کام میں لایا جائے۔

افسوس ہے کہ صحابہ کے دور میں اس قسم کے جتنے واقعات حدیث کی تشریعی حیثیت اور ان کے یہاں اس کی حفاظت کی سب سے بڑی دلیل تھے۔ ان ہی کو منکرین حدیث نے اس کے برعکس انکار حدیث کی دلیل گردان لیا ہے۔ سلف کے دور سے گذر کر جب ائمہ کے دور میں آیئے تو یہاں بھی ابن ابی حاتم جیسے شخصوں کی کمی نہیں ہے جو بڑے بڑے محدثین پر بھی تنقید کردیتے پھر خود ہی ان کی جلالت قدر کی طرف نظر کرکے بعض اوقات رونے بھی لگتے تھے کہ ہم کیسی کیسی بڑی ہستیوں پر کلام کرجاتے ہیں کہیں ہم سے اس کی باز پرس نہ ہو۔ صحابہ میں حضرت علیؓ کی شخصیت مختلف ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے کچھ اس طرح زیر بحث آگئی ہے کہ محدثین کو مجبوراً فن درایت کی بنا پر اُن کے متعلق بہت سی احادیث سے دست بردار ہو جانا پڑا ہے، حالانکہ ان کے علم، اُن سے محبت، اور اُن سے عقیدت برابر اس کو مقتضی رہی کہ ان کے معاملہ میں جو سنا جائے اس کو سچ ہی سچ یقین کرلیا جائے مگر یہاں رسول کی عقیدت اور اس کی حدیث کی عظمت کا سوال ان سے مقدم تھا وہ ہمیشہ یہ تنبیہ بھی کرتی رہی کہ کہیں ان کی شان میں بیجا عقیدت رکھنے والوں نے لامعلوم طور پر اُن کی احادیث میں کذب وافترا کا زہر داخل نہ کردیا ہو۔ اور اس بنا پر کوئی خلاف واقع کلمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو جائے۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

ولکن قاتل اللہ الشیعۃ فانھم افسدوا	خدا تعالیٰ شیعوں کا برا کرے کہ انھوں نے حضرت علیؓ کے علم کا
کثیرا من علمہ بالکذب علیہ ولھذا تجد	بڑا حصہ ان پر جھوٹ بول کر محدثین کی نظر میں مشتبہ کر دیا ہے
اصحاب الحدیث من الصحیح لا یعتمدون	اس لئے صحیح حدیث جمع کرنے والوں نے بجز خاص خاص
من حدیثہ الا ما کان من طریق اھل بیتہ	حضرات کے ان کے بارے میں ہر شخص کے بیان پر اعتماد
واصحاب عبد اللہ بن مسعود۔ [1]	نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) پیش کئے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ پہلے ہی قدم میں ان میں الجھ کر رہ گئے اور یہ قرآنی تواتر کی وجہ سے یہاں سے تو بچ نکلے مگر دوسرے قدم میں بچ نہ سکے۔ آخر حدیث کے مرحلہ پر پہنچ کر بے طرح پھسلے اور پھسل کر زمین پر گر گئے۔ عقائد شبہات سے بنا نا نہیں چاہئیں ان کے لئے روشن دلائل کی ضرورت ہوتی ہے زائغین اہل حق کے دلائل میں صرف شبہات پیدا کرکے خوش ہو لیتے ہیں کہ انھوں نے بڑا تیر مارا اور گویا بازی جیت لی اور نہیں جانتے کہ اگر قرآن نہ آتا تو لوگوں کو شبہات تو اللہ تعالیٰ کے وجود میں بھی تھے۔ اور آج بھی ایک قوم موجود ہے جو اللہ کا وجود تو درکنار اس کو بلا شبہ ایک وہم پرستی تصور کرتی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) [1] اعلام الموقعین ج اص ۱۶۔

اس لئے جب ان کی احادیث کو وہ اپنے معیار پر پورا اتھار نہ سکے تو انھیں اسی شک کے حال میں حدیث رسول ٹھیرانے سے دست بردار ہو جانا بدرجہا بہتر معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف یہ بھی غور کر لینا چاہئے کہ اگر حدیثوں میں بہت بڑا ذخیرہ موضوعات کا داخل ہو جاتا تو یقیناً ہمیں زیادہ تر حدیثیں شیخین جیسی جلیل القدر ہستیوں کی طرف منسوب نظر آتیں کیونکہ وضاعین کے لئے ان کی شخصیتوں کا احترام ان کی احادیث کو رائج کرنے میں یقیناً بہت کارآمد ہوتا مگر یہاں اس کے برعکس امت میں جو سب سے بڑا صحابی شمار ہے اسی کی احادیث کا ذخیرہ سب سے کم ہے بس یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وضاعین کو ہر جگہ دخل اندازی کا موقعہ نہیں مل سکا اور جہاں ملا ہے وہاں دودھ اور پانی کو علیحدہ کرنے والوں نے حقیقت کو صاف کر دیا ہے اور ہر شک و تردد کے موقعہ پر اصول یہ رکھا ہے کہ کسی مشکوک ذخیرہ کو حدیث میں شمار کر لینے کی بجائے اس کو حدیث سے خارج کر دینا چاہئے۔ اب اس نقد و تبصرہ، حزم و احتیاط کے بعد بھی شک کئے چلے جانا ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔ مانا کہ وضاعین نے احادیث وضع بھی کی ہیں مگر کیا اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ ان کے اس جرم کی پاداش میں صادقین کا قول بھی جھوٹ سمجھ لیا جائے، تمام دنیا میں تنقید اس لئے تعریف کی چیز سمجھی جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ سے صحیح و سقیم میں امتیاز حاصل ہو جاتا ہے اگر نقد کا نتیجہ سقیم کے ساتھ صحیح کو بھی رد کر دینا ٹھیر جائے تو پھر تنقید سے بدتر کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ کونسی معقول بات ہے کہ دنیا میں چونکہ چند جھوٹوں نے جھوٹ بولا ہے اس لئے اب کسی سچے سے سچے شخص کے بیان پر بھی اعتبار نہ کرنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ بھی اُن ہی کی طرح ایک جھوٹا ہی انسان ہو۔ عقل کی روشنی اسی لئے عطا کی گئی ہے کہ اس روشنی میں محنت و جانفشانی کر کے یقین کی منزل طے کی جائے لیکن جن کے نزدیک رسول اور اس کے کلام کی قیمت ہی کچھ نہ ہو اُن کے لئے یہ سرگردانی مفت کا آزار ہے اسی لئے مولانا اسلم صاحب نے محدثین کی ساری جد و جہد کا نام دماغی تعزیر رکھ دیا ہے۔ آج بھی بہت سے روشن خیال ایسے موجود ہیں جو قرآن کریم حفظ کرنے کو بھی دماغی تعزیر سے کم نہیں سمجھتے وہ کہتے ہیں کہ جامیٹری اور الجبرا کے اشکال یاد کرنا اس سے کہیں زیادہ مفید ہے۔ مولانا اسلم صاحب کا احادیث کے متعلق جو عقیدہ تھا وہ تو آپ گذشتہ اوراق میں ملاحظہ کر چکے اب محدثین کے متعلق ان کا خیال سنئے۔ وہ معتزلہ کی بربادی کا مرثیہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں :-

> "معتزلہ اگرچہ اپنی تباہی کے ذمہ دار آپ ہیں مگر اُن کے فنا ہو جانے سے امت کا عقلی اور دینی نقصان ہوا محدثوں نے منقولات سے جو جمود پیدا کر دیا تھا اس کے مقابلہ میں ان کی عقلیت نے توازن قائم کر رکھا تھا ان کے مٹ جانے سے پھر وہی جمود عود کر آیا۔"

اُنھیں محدثین اور فقہاء کے جمود کی شکایت غالباً اسی وجہ سے ہو سکتی ہے کہ معتزلہ کی طرح انھوں نے ذات و صفات کے مسائل میں موشگافیاں نہیں کیں۔ براہینِ عقلیہ کا جو طریقہ فلاسفہ سکھا گئے تھے وہ انھوں نے

اختیار نہیں کیا۔ علمارِ زمانہ کی طرح طویل و عریض دعاوی نہیں کئے جو بات حل ہوگئی اس کا جواب دیدیا اور جو حل نہ ہوسکی اس کے متعلق صاف کہدیا۔ اگر اپنی رائے کے خلاف کوئی بات ثابت ہوگئی تو اپنی بات پر ضد نہیں کی اور اپنی پہلی رائے سے بڑی صفائی کے ساتھ رجوع کرلیا۔ اگر یہ امور قابلِ اعتراض ہیں تو ذرا نظر اٹھا کر صحابہ کی تاریخ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے تاکہ آپ کو معلوم ہوجائے وہاں کتنی بال کی کھال نکالی جاتی تھی۔ قدرت، سمع و بصر، صفت علم و کلام، پر کتنی کتنی بسیط بحثیں کی جاتی تھیں۔ افعالِ عباد کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے پر کیا کیا تبصرے کئے جاتے تھے۔ اگر محدثین کی خدمتیں دماغی تعزیر تھیں تو یقیناً یہ مباحث بھی دماغی عیاشی کا عذاب تھا جو محض عقلیت کی بدولت معتزلہ پر مسلط کردیا گیا تھا۔ منکرین حدیث کے درمیان یہ اعتراض ہمیشہ سے اہمیت لئے چلا آیا ہے یہاں تک کہ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر کو اس پر مستقل ایک مضمون لکھنا پڑا اس لئے ہم بھی یہاں اس اعتراض کے چودہ جوابات میں سے اُن کے ایک جواب کا خلاصہ نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

"اگر عقلیات کی مذمت ہم کسی محدث کی زبانی نقل کریں تو یہ کہنا ممکن ہوگا کہ "الناس اعداء ما جھلوا" لوگ جو فن نہیں جانتے اس کی مذمت ہی کیا کرتے ہیں اس لئے ہم یہاں اُن علمار کے کلمات پیش کریں گے جو فلک عقلیات کے شمس و قمر شمار کئے گئے ہیں"

امام غزالیؒ احیار میں فرماتے ہیں "یہیں یہ ثابت ہوگیا ہے کہ حقائق اشیار کے معرفت کی راہ یہ عقلیات نہیں ہیں اس راہ سے اگر مسائل پر کچھ روشنی پڑتی بھی ہے تو اتنی ہی جتنی کہ ان کے بغیر بھی حاصل ہوسکتی تھی"

المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں "دلائل کلامیہ مفید یقین نہیں ہوتے"

التفرقہ بین الایمان والزندقہ میں لکھتے ہیں "اگر ہم مداہنت نہ کریں تو صاف صاف کہہ سکتے ہیں کہ علم کلام میں غلو کرنا حرام ہے"

امام رازیؒ فرماتے ہیں "میں نے طرقِ کلامیہ اور فلسفیہ سب کا تجربہ کردیکھا ہے جو نفع مجھے قرآن عظیم میں نظر آیا کہیں نظر نہ آیا۔ کیونکہ قرآن اس پر زور دیتا ہے کہ تمام جلال و عظمت خدا ہی کے لئے تسلیم کرلی جائے اور اس کے مقابلہ و معارضہ سے احتراز کیا جائے کیونکہ ان تنگ و تاریک راستوں میں عقلِ انسانی گم ہوجاتی ہے پھر یہ وصیت کرتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین اختیار کرچکا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرا مجمل ایمان ہی قبول فرمالے اور مجھ سے تفصیل کا مطالبہ نہ کرے اسی مضمون پر امام نے حسب ذیل اشعار کہے ہیں۔

العلم للرحمٰن جل جلالہ	علم صرف ایک اللہ جل جلالہ کے لئے ہے
وسواہ فی جھلاتہ یتغمغم	بقیہ سب اپنی جہالتوں میں مبتلا ہیں۔
ماللتراب و للعلوم وانما	اس خاک کے پتلے کو علم سے بھلا کیا واسطہ
یسعی لیعلم انہ لا یعلم	وہ یہی کوشش کرتاہے کہ یہ جان لے کہ وہ نہیں جانتا۔

امام قرطبیؒ مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ائمہ متکلمین نے اپنی عمریں صرف کرنے کے بعد اس علم کو چھوڑ دیا ہے چنانچہ ابوالمعالی فرماتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کو علماء اسلام کے لئے چھوڑ کر میں نے ایک بڑے سمندر کا سفر اختیار کیا تھا تاکہ تقلید کی تاریکی سے نجات میسر ہو اور تحقیق کی راہ نظر آجائے مگر اب میں نے اپنے اس خیال سے رجوع کر لیا ہے۔ تمہیں چاہئے کہ تم پرانی عورتوں کا سا سادہ ایمان رکھو ملے اللہ تو میرا انجام بخیر فرما اس کے بعد حسرت سے فرمایا " اے ابوالمعالی تیری گذشتہ عمر پر افسوس "

امام ابوالمعالی اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے " دیکھو علم کلام کا بہت مشغلہ مت رکھنا اگر مجھے اس کا انجام پہلے معلوم ہوتا تو آج میرا یہ انجام نہ ہوتا "

احمد بن سنان کہتے ہیں کہ " امام ولید بن ابان کرابیسی میرے ماموں تھے جب ان کی نزع روح کا وقت آیا تو انھوں نے اپنی اولاد سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہارے نزدیک مجھ سے زیادہ عالم کوئی اور شخص ہے؟ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا میرے متعلق کوئی بدگمانی کر سکتے ہو؟ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا اچھا تو میں تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں مانو گے؟ انھوں نے کہا ضرور، فرمایا بس اسی طریقہ پر قائم رہنا جس پر محدثین تھے۔ مجھے اب خوب ثابت ہو چکا ہے کہ حق اُن ہی کے ساتھ ہے "

امام ابوالوفا ابن عقیل فرماتے ہیں میں نے اپنی ساری عمر اصول کی تحقیقات ہی میں خرچ کی ہے آخر تھک کر پھر سیدھے سادے ملاحی کے مذہب پر ہی آنا پڑا۔

شہرستانی علم کلام میں ساری عمر صرف کرنے کے بعد نہایۃ الاقدام میں لکھتا ہے۔

لعمری لقد طفت المعاهد کلها	اپنی جان کی قسم میں بڑے بڑے مقامات پر خود گھوما اور اپنی
وسیرت طرفی بین تلک المعالم	نظر کو خوب گھما کر دیکھا مگر جس کو دیکھا اپنی ٹھوری کے نیچے
فلم أر الا واضعا کف حائر	ہاتھ رکھے حیرت زدہ دیکھا اور جس کو پایا شرمندہ شخص کی
علی ذقنه او قارعا سن نادم	طرح دانت کریدتا پایا۔

اس کے بعد یہ نصیحت کرتا ہے کہ دیکھو بوڑھی عورتوں کا سا سادہ دین اختیار کئے رہنا۔ [۱]

ان چند نقول سے عقلا کے نزدیک محدثین کا جمود یا سیلان طبع معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے خود دونوں فن پڑھے اور ان کا کافی مطالعہ بھی کیا ہے۔ ہم بلا کسی حسن عقیدت کے یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ عقل کی جو گہرائی ہمیں محدثین بالخصوص فقہاء محدثین میں نظر آئی اس کا کوئی شمہ فلاسفہ میں نظر نہ آیا اگر یہاں ہم ان کی مثالیں لکھیں تو مضمون اور زیادہ طویل ہو جائے گا۔

---

[۱] الروض الباسم ج ۲ ص ۱۲ - ۱۵ -

حفاظِ حدیث اور حفاظتِ دین

منکرینِ حدیث کو، یہ دیکھ کر کہ تدوینِ حدیث کی تاریخ بالعموم پہلی صدی کا آخر حصہ بتلائی گئی ہے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہے کہ اس سے پہلے گویا حدیث کا وجود ہی نہ تھا اور اس کی بنیاد دوسری صدی کے شروع میں پڑی ہے اسی لئے ہم نے تدوینِ حدیث کا عنوان چھوڑ کر حفظِ حدیث کا عنوان اختیار کیا ہے تاکہ بحث کا مرکزی نقطہ نظروں سے غائب نہ ہونے پائے۔ ہمارے نزدیک اصل بحث یہ ہونا چاہئے کہ تدوینِ حدیث سے پہلے حدیث کا رنگ کیا تھا اگر وہ محفوظ تھی تو پھر اس کی تدوین اگر پہلی صدی میں نہیں چوتھی صدی میں بھی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بعض قاصر الفہم اشخاص نے یہ بے معنی غوغا بھی مچا رکھا ہے کہ فلاں صحابی نے حدیث روایت کرنے کی ممانعت کی ہے، فلاں نے کتابت کی ممانعت کی ہے، فلاں نے حدیث کے مشغلہ سے روکا ہے۔ مگر اُن کے اِن ہی بیانات سے دوسری طرف یہ بھی سمجھ میں آتا جاتا ہے کہ اسی دور میں حدیث کے شغف کا عالم کیا تھا یعنی بہ کثرت اس کی روایتیں کی جاتی تھیں، برغبت انھیں لکھا جاتا تھا اور اُن کے حفظ کا مشغلہ اتنا غالب تھا کہ کسی کسی کو اعتدال قائم رکھنے کے لئے اُس سے روکنے کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ حدیث کی یہ ساری تاریخ وہ ہے جو خود صاحبِ نبوت اور صحابہ کے دور کی تاریخ ہے پس ان ادھوری نقول سے منکرینِ حدیث کو بھلا کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، اُنھیں یہ ثابت کرنا چاہئے کہ پہلی صدی تک حدیث کی کوئی پرواہ نہ تھی، کوئی شخص اُن کا ایک حرف بھی یاد نہ کرتا تھا۔ اچانک دوسری صدی میں لوگوں نے سُنے سنائے قصے تدوین کرنا شروع کر دیئے لیکن ایسا ہرگز ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ ولو کان بعضکم لبعض ظہیرا۔

یہاں حدیث کی تدوین کا معاملہ قرآن کی جمع و ترتیب کے معاملہ سے بہت ہی مشابہت رکھتا ہے، کیا کوئی عثمان غنی کے دور پر نظر کرنے والا یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ قرآن پہلے محفوظ نہ تھا پھر ان کے زمانہ میں محفوظ ہوا ہاں سُن لیجئے کہ خود مدعیین اسلام ہی میں ایک جماعت قرآن کریم کے بارے میں بھی بالکل وہی اعتراضات رکھتی ہے جو منکرین حدیث، حدیث کے متعلق رکھتے ہیں اگر منکرینِ حدیث کو یہ خیال ہے کہ احادیث محض اپنے اغراض کے ماتحت بعد میں جمع کی گئیں تو منکرینِ قرآن بھی قرآن پر یہی تہمت لگاتے ہیں۔ جوابات دونوں ہی جگہ دیئے گئے ہیں مگر شفا ہونا نہ ہونا یہ اپنے مقدر کی بات تھی۔

ہمیں یہاں صرف یہ تنبیہ کرنا ہے کہ منکرین حدیث جس قسم کے شبہات حدیث میں پیدا کر کے اُسے غیر معتبر ٹھیرانے کی سعی کر رہے ہیں اُنھیں ذرا اس پر بھی نظر رکھنا چاہئے کہ اگر ان ہی تمام اعتراضات کو لے کر خصوم نے قرآن کی حفاظت کے مقابلہ میں استعمال کر لیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے یہاں جو الفاظ جمع قرآن کے سلسلہ میں فرمائے تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو الفاظ حدیث کی جمع کے متعلق کہے ہیں اگر ان دونوں کو پاس پاس رکھئے تو آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ دونوں جگہ ان انتظامات کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی ہے جب آئندہ اُس مستحکم طریقۂ حفاظت کے ہمیشہ قائم رہنے میں کسی ضعف کا خطرہ لاحق ہونے لگا ہے ورنہ قرآن اور حدیث ابتدائی دور میں اہل اسلام کی زندگی کا اس طرح جزولاینفک بنے ہوئے تھے کہ ان کی حفاظت کے لئے انہیں کسی اہتمام کی ضرورت ہی نہ تھی۔ تہجد اور فرائض و سنن کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی قرآن کا دور جاری رہا کرتا تھا۔ پھر سال بھر میں تراویح کا ایک مشغلہ ایسا تھا کہ اس سلسلہ سے خواندہ و ناخواندہ حافظ اور غیر حافظ سب کے کانوں تک کئی کئی بار بھی قرآن پہنچ جایا کرتا تھا۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ عبادات تو الگ رہیں یہاں عادات میں بھی اتباع کا یہ عالم تھا کہ ان میں بھی پوری مشابہت پیدا کرنے کے لئے صحابہ کی جدوجہد جاری رہا کرتی تھی۔ آپ ہی کی طرح نشست و برخاست، رفتار و گفتار، طعام و شراب، نوم و بیداری کی ایک ایک حالت گذارنا اُن کا آخری جذبہ تھا اگر کسی نے آپ کی قمیص کا گریبان کھلا دیکھ لیا تو وہ اسی ادا پر مر مٹا، اگر کسی نے لوکی کے ٹکڑوں کی طرف آپ کی انگلیاں چلتی دیکھ لیں تو اسی دن سے اُسے لوکی سے عشق پیدا ہو گیا اور اگر کسی نے کوئی بات کہہ کر ہنستے دیکھا تو اس نے وہ بات نقل کر کے آپ کی طرح ہنس پڑنا بھی اپنے اوپر لازم تصور کر لیا۔ جب تک قرآن کا یہ چرچا نبی کی ہر ہر ادا اور ان کی ہر حرکت کا یہ نقشہ ہر گھر میں موجود ہو تو اس دور میں اس کا کیا گمان ہو سکتا تھا کہ قرآن یا آپ کی حدیثیں جمع کرنے کا کوئی سرکاری طور پر بھی انتظام ہونا چاہئے۔

قرآن و حدیث کی حفاظت کا یہ دور دورِ شباب تھا اس لئے حفاظ کی کثرت، صحابہ کی یکجہتی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت کے عمیق اثرات نے اس ضرورت کا احساس ہی نہ ہونے دیا کہ وہ قرآن کے لئے کسی جدید نظم و نسق کا تخیل اپنے دماغوں میں لاتے اسی طرح حدیث کا معاملہ بھی لوگوں کے اپنے اپنے انفرادی جذبۂ تحفظ کی وجہ سے کسی مزید اہتمام کے قابل نہ سمجھا گیا حتیٰ کہ جب جنگِ یمامہ میں دفعۃً صحابہ کی ایک بڑی تعداد شہید ہو گئی تو اب حاملین قرآن کے اس اچانک اور غیر معمولی نقصان سے قرآن کی حفاظت میں خلل پڑ جانے کا خطرہ بھی محسوس ہونے لگا چنانچہ یہاں حضرت عمرؓ کے جو الفاظ ہیں پورے غور کے ساتھ ملحوظ رکھئے۔

ان القتل قد استحر یوم الیمامۃ لقراء القراٰن وانی اخشی ان استحر القتل بالقراء بالمواطن فیذھب کثیر من القراٰن وانی اری ان تأمر بجمع القراٰن۔	جنگِ یمامہ میں حفاظ بے طرح شہید ہوئے ہیں خدا نہ کردہ اگر کہیں آئندہ اسی طرح حفاظ قتل ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قرآن مجید کا بہت سا حصہ ضائع نہ ہو جائے اس لئے آپ قرآن جمع کرنے کا سرکاری طور پر انتظام کیجئے۔

دوسری طرف اب اس دور پر غور فرمایئے جبکہ صحابہ ایک ایک کرکے اٹھتے جارہے تھے یعنی دیکھنے والوں کا دور تو ختم ہو رہا تھا اور ان کی جگہ اب ان مشاہدات کو الفاظی لباس میں دیکھنے والوں کی باری آرہی تھی، جمالِ جہاں آرا کو بے حجاب دیکھنے والوں کے سینوں میں جو حرارت بھڑک رہی تھی آپ کے انتقالِ مکانی کا حجاب پڑ جانے سے اس کے شعلوں میں بھی وہ تیزی باقی نہ رہنے کا امکان نظر آنے لگا تھا اس لئے یہاں بھی دیکھنے والوں کے دل میں یہ بے چینی پیدا ہونا شروع ہو گئی کہ کہیں اس محبوب عالم کی ادائیں ان کے رخِ انور کے نظارہ کرنے والوں کے ختم ہو جانے سے تاریخ کا ایک صفحہ بن کر نہ رہ جائیں اس لئے وہ انتظام کرنا چاہیے جو عالم کی تاریخ میں ایک یادگار رہ جائے۔ اگر یہ فقط اُن کے اُمتیانہ جذبات ہی کا کرشمہ ہوتا تو رسول اور امتی کے رشتے اس سے پہلے بھی بہت ہو چکے تھے مگر یہاں یہ سب پیرائے ہی پیرلئے تھے۔ اندرونی ہاتھ کوئی اور تھا جس نے اس تمام مشینری کو حرکت دے رکھی تھی جس قدرت نے آپ کو تمام عالم کے لئے راہنما بنا کر بھیجا تھا وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کرسکتی تھی کہ آپ کی تصویر بھی آیندہ نسلوں کے سامنے کرشن اور رامچندر کی صرف کہانیوں کی طرح پیش کی جائے۔ ایک طرف نبوت ختم ہو چکی ہو، رسالت کا دروازہ مسدود ہو، دوسری طرف اس آخری رسول کے صفحاتِ زندگی بھی محو شدہ اور مشتبہ صورت میں رہ جائیں حتیٰ کہ آئندہ رسول کا دیکھنا تو درکنار ان کی سیرت کا صحیح مطالعہ بھی میسر نہ آسکے اس لئے قرآن کریم کی حفاظت کے ساتھ ساتھ حدیث کی حفاظت کی جہاں تک ضرورت تھی اس کا احساس بھی قلوب میں پیدا کر دیا گیا۔

آخر عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن حزم[1] کے نام یہ فرمان لکھ بھیجا۔

---

[1] یہاں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفۂ عدل نے ابوبکر بن حزم کو اس کام کے لئے اس لئے مقرر فرمایا تھا کہ وہ اس وقت مدینہ طیبہ میں ان کے نائب تھے اور ان کا علمی پایہ بھی اتنا بلند تھا کہ امام مالکؒ ان کے حق میں یہ فرماتے ہیں۔

لم یکن احد بالمدینۃ عندہ من علم القضاء ماکان عند ابی بکر بن حزم (توجیہ النظر ص ۷)	اس وقت مدینہ میں علم قضاء کا عالم ان سے بڑھ کر کوئی اور شخص موجود نہ تھا۔

علاوہ ازیں ان کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقات، دیات اور سنن کے کچھ احکام بھی وراثۃً موجود تھے۔

حافظ ابن عبدالبر ابن شہاب المعروف بہ زہری سے نقل کرتے ہیں۔

امرنا عبدالعزیز بجمع السنن فکتبناھا دفترا دفترا فبعث الی کل ارض لہ علیہا سلطان دفترا۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۶)	ہمیں عمر بن عبدالعزیز نے حدیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے ایک ایک کرکے ان کو لکھا پھر انہوں نے اپنی قلمرو میں اس کا ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابن شہاب اپنے زمانہ کے اتنے کثیر العلم شخص تھے کہ ان کے متعلق معمر ایک واقعہ نقل کرتے ہیں پہلے ہمارا خیال تھا کہ ہم نے زہری کا بہت سا علم حاصل کر لیا ہے۔ جب ولید بن یزید کے قتل کا واقعہ پیش آیا تو ہم نے دیکھا کہ اس کے خزانہ سے جانوروں پر لد لد کر کتابیں آرہی ہیں۔ ہم نے جب ان کے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے بیان کیا کہ یہ سب زہری کا علم ہے۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۷۳)
ان کے قلمی ذخیرہ کا تو یہ حال تھا۔ اب ان کے حافظہ کا حال سنئے۔ ابن شہاب خود اپنا حال لکھتے ہیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

انظر ماکان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تلاش کر کے قلمبند کر لو کیونکہ مجھے آئندہ علم کم ہو جانے اور علماء کے اٹھ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

اب حضرت عمرؓ کے وہ الفاظ تقریباً نوّے سال بعد کے ان الفاظ کے پہلو بہ پہلو رکھئے تو آپ کو ان دونوں میں وہ یکسانیت نظر آئے گی جو ایک ہی شخص اور ایک ہی دماغ کے خیالات میں نظر آتی ہے وہاں بھی خدائی حفاظت کے وعدہ نے حضرت عمرؓ کے ارادہ میں جنبش پیدا کی تھی اور یہاں بھی وہی وعدہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے اس اقدام کے لئے محرک بنا ہے باقی ع ما و شما را بہانہ ساختہ اند۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کہ جب میں مقام بقیع سے گذرتا تو اپنے کان اس خوف سے بند کر لیا کرتا تھا کہ کہیں اس میں بیہودہ باتیں نہ گھس جائیں خدا کی قسم ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میرے کان میں کوئی بات پڑ گئی ہو پھر میں اسے بھول گیا ہوں۔ شعبی کا حال بھی یہی تھا۔ (جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۹)

آپ نے دیکھا کہ یہاں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم نامہ میں حدیث کا لفظ تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ ابوبکر بن حزم کے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص خاص ابواب کے احکام موجود ہونے کی بھی شہادت ثابت ہے زہری نہ ہی صنعانی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن جمع کرنے کا لفظ کہہ رہے ہیں اس پر بھی مولانا اسلم صاحب کو یقین نہیں آتا اور وہ علم الحدیث کے صفحہ ۱۲ پر اس کا یہ عذر تراشنے میں ذرا تامل نہیں فرماتے۔

"یہی وجہ ہے کہ تابعین کبار کے عہد تک حدیثیں غیر مدون تھیں اور سوائے قرآن مجید کے امت کے ہاتھوں میں کوئی دوسری کتاب نہ تھی بعض چیزیں محض علمی لحاظ سے لکھی گئی تھیں"۔

ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بعض چیزیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں یا وہ ان کی روشنی میں صحابہ کے علوم کے سوا کوئی اور علمی چیز نہ تھیں۔ صحابہ کی اصطلاح میں علم نام ہی ان ہی چیزوں کا تھا۔ کیا مولانا کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام عمر کا علمی سرمایہ اس قابل بھی نہیں ہے کہ اس کو بعض علمی چیزوں کی فہرست میں ہی شمار کر لیا جائے۔ پھر اس کا ثبوت کون دے سکتا ہے کہ وہ صرف علمی لحاظ ہی سے لکھی گئی تھیں۔ کیا اوزاعی اور زہری جیسے ائمہ ان علمی چیزوں کے لکھنے میں بھی کوئی بار محسوس کر سکتے تھے۔ پھر زہری یہ کیا کہتے ہیں کہ ہم نے امراء کے زور دینے پر حدیثیں جمع کی ہیں اور اوزاعی یہ کیا فرما رہے ہیں کہ جب سے علم مدون ہوا ہے اس کا نور جاتا رہا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ایک علمی خدمت پر زہری اور اوزاعی کو بڑا ناز ہوتا مگر یہاں مولانا نے اس علمی خدمت کے ادا کرنے پر ان کے علاوہ ضحاک بن مزاحم، داؤد طائی، فضیل بن عیاض، سفیان ثوری، شعبہ اور ابن عیینہ کے جو تاسف کے کلمات نقل فرمائے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہے کہ درحقیقت ان حضرات نے کوئی ایسا علم جمع کیا تھا جس میں ایک بال برابر لغزش کا وبال انہیں ایک پہاڑ کے برابر نظر آرہا تھا آخر وہ کونسا علم تھا جس کو ابن عیینہ ایک طرف تو خود ہی روایت فرماتے جاتے ہیں اور دوسری طرف ڈر کے مارے یہ بھی کہتے جاتے ہیں۔

"کاش یہ علم میرے سر پر شیشوں کا ایک ٹوکرا ہوتا اور گر کر چور چور ہو جاتا کہ اس کے خریداروں سے نجات ملتی"۔

آخر ایسی وہ علمی خدمت کونسی تھی جس کو ابن عیینہ سر پر اٹھائے اٹھائے پھر رہے تھے اور جس کو نہ تو ادا کر کے چین نصیب تھا اور نہ ادا کئے بغیر کوئی چارہ نظر آتا تھا۔ بات کیا تھی اگر یہ لوگ اتنے ہی علم کے دشمن تھے تو کس نے انہیں اس علم کی ادائیگی کے لئے مجبور کیا تھا خود ہی لئے لئے پھرنا اور خود ہی ایک علمی خدمت کی ادائیگی کے فریضہ سے سبکدوش ہو کر اس کا نوحہ کرنا۔ آپ نے کبھی سوچا کیا بات تھی کہیں یہ علمی خدمت وہی علم حدیث نہ ہو جس کے کتمان میں بھی آتشیں لگام کا خطرہ ہے اور جس کا پہنچانا بھی تنقیدوں کے سنبھالنے سے زیادہ نازک کام ہے۔ آپ کو اختیار ہے علیحدہ اور حدیث کو چاہے تو مت مانئے مگر خدا را صحابہ اور محدثین کی تاریخ تو مسخ نہ کیجئے کیونکہ یہ صرف مذہبی جرم نہیں تاریخی اور علمی جرم بھی ہے۔

جمع احادیث کے متعلق حضرت عمرؓ کی مجلس مشاورت

یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ صحابہ کرام دین کے معاملہ میں اتنے محتاط تھے کہ وہ اپنی رائے سے ایک قدم اٹھانا بھی پسند نہ کرتے تھے چنانچہ جمع قرآن کا ایک بدیہی معاملہ جب زیر بحث آیا تو وہاں بھی مجلسِ مشاورت منعقد کی گئی اور جب بڑی ردّ و کد کے بعد یہ معاملہ طے پا گیا تو سرکاری طور پر جمع قرآن کا کام شروع کر دیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جمع حدیث کی تحریک کا حال ہے۔ یہ تحریک اصل میں آج سے بہت پہلے حضرت عمرؓ کے دل میں پیدا ہوئی تھی مگر یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دنیا کو قلم سے زیادہ اپنے حفظ پر ناز تھا۔ حفظ ہی کے ذریعہ سے مخطوطات کی تصحیح کی جاتی تھی پھر حدیث کا جتنا حصہ عملی تھا وہ تو ان کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت موجود تھا اور اس کا جو حصہ صرف اقوال سے متعلق تھا وہ والہانہ محبت، انتہائی عقیدت اور ان کے فطری ماحول کی وجہ سے کسی اہتمام کے بغیر دماغوں میں محفوظ تھا۔ ادھر قرآن کریم کے ایک ایک نقطہ اور زیر و زبر کی ذمہ داری سے کاندھے دبے جا رہے تھے اس لئے یہ تحریک صرف دماغوں میں گذر کر رہ گئی۔

ان عمر بن الخطاب اراد ان یکتب السنن فاستفتی اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی ذلک فاشاروا علیہ بان یکتبھا فطفق عمر یستخیر اللہ فیھا شھرا ثم اصبح یوما وقد عزم اللہ لہ فقال انی کنت اریدُ ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیھا وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیٔ ابدا۔ [1]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کیا کہ احادیث قلمبند کر لی جائیں تو اس بارے میں صحابہ سے دریافت کیا انہوں نے مشورہ دیا کہ قلمبند کر لینا چاہئے اس کے بعد حضرت عمرؓ ایک مہینہ تک استخارہ کرتے رہے حتی کہ اللہ کی طرف سے ان کے خیال میں یہ بات آئی کہ پہلی امتوں نے کتاب اللہ کے علاوہ بھی کوئی یادداشت قلمبند کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ اسی پر جھک پڑے اور کتاب اللہ کو چھوڑ بیٹھے۔ خدا کی قسم ہے میں کتاب اللہ کے ساتھ کوئی اور چیز ملانا پسند نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں ہے لا کتاب مع کتاب اللہ۔

اس بیان سے حسب ذیل نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ (۱) حضرت عمرؓ جمع حدیث کے خود محرک تھے (۲) مشیروں کی رائے حدیثوں کے جمع کرنے کی طرف تھی۔ (۳) حدیثوں کو قلمبند نہ کرنے کی وجہ اہل کتاب کی تاریخ تھی۔ (۴) لا اشوب کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس وقت سنت کی کتابت کا خیال قائم ہو جاتا تو شاید کتاب اللہ کے ساتھ ہی حاشیہ پر اُن کو لکھا جاتا۔ دوسرے لفظ "لا کتاب مع کتاب اللہ" بھی اسی کے شاہد ہیں۔ پس اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اس طرح ملی جلی قلمبند کر دی جاتیں تو یقیناً اسلام کے ابتدائی دور میں نوآموزوں کے لئے بڑی مشکل کا سامنا ہو سکتا تھا۔ اتفاق یہ کہ حدیث بھی جب پہلے پہلے کتابت کے دور سے گذری تو اس میں بھی احادیث

[1] جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۴

مرفوعہ اور آثارِ صحابہ کو ایک ساتھ ہی جمع کر دیا گیا تھا۔ پھر افکار اور ضروریات کی تدریجی ترقی نے مرفوعات کو آثار کو جدا جدا کر دیا ہے اس لئے بہت ممکن تھا کہ جمع حدیث کے نقشِ اول میں شاید اتنی ارتقائی ترتیب و تہذیب کے مدارج کی طرف ذہن نہ جاتا۔ بالخصوص جبکہ اُس دور میں قوتِ حافظہ کی وجہ سے قرآن و حدیث میں کسی ادنیٰ اختلاط کا اندیشہ بھی نہ تھا۔ آج بھی تفسیر کی کتابیں اسی طرح کتاب اللہ و تفسیر کے ساتھ ساتھ مخلوط چھپی ہوئی ہیں۔ مگر اس اختلاط سے حفاظ کو کوئی شبہ نہیں پڑتا۔ پھر وہ زمانہ تو کچھ اور ہی تھا مگر حضرت عمرؓ کی شانِ حزم و احتیاط نے یہ طریقہ بھی پسند نہ فرمایا کیونکہ ان کے سامنے اُس قوم کی تاریخ ابھی زندہ تھی جو آسمانی کتاب کو اسی کتابت کی بدولت اپنے ہاتھوں تحریف کے گھاٹ اتار چکی تھی اس لئے شہروں میں یہ حکم لکھ بھیجا کہ اگر کسی کے پاس کوئی یادداشت لکھی ہوئی ہو تو اُسے مٹا دے۔ [1]

حیرت ہوتی ہے کہ چھپی ہوئی کتابوں میں ان واقعات کے ہوتے ہوئے بھی منکرین حدیث پھر بے دریغ یہ کیسے لکھ دیتے ہیں کہ صحابہ کے درمیان حدیث کی کوئی تشریعی حیثیت نہ تھی اور اسی لئے وہ اس کے جلانے اور مٹانے کا حکم دیدیتے تھے۔ حالانکہ یہی ایک واقعہ نہیں، عام طور پر سلف سے ثابت ہے کہ وہ صرف کتابت کے مخالف تھے نہ کہ حدیث کے زبانی یاد کرنے کے بھی۔

سلف کے نزدیک کتابت حدیث کی ممانعت کے اسباب

ابو سعیدؓ سے کسی نے کہا اگر آپ فرمائیں تو ہم آپ کی بیان کردہ حدیثیں لکھ لیا کریں؟ انھوں نے جواب دیا لکھو مت، بلکہ جیسا ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زبانی سُن کر یاد کی ہیں تم بھی ہم سے سُن کر زبانی یاد کرو۔

ابو بردہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰؓ نے بہت سی احادیث روایت کیں جب ہم ان کو لکھنے کے لئے اٹھے تو فرمایا اچھا کیا تم جو مجھ سے سنتے ہو اُس کو لکھتے بھی ہو؟ ہم نے عرض کیا جی ہاں۔ کہا وہ سب لاؤ پھر پانی منگا کر ان کو دھو ڈالا اور فرمایا جیسے ہم نے زبانی یاد کی تھیں تم بھی ہمارے حوالہ سے زبانی یاد کر کے نقل کرو۔

مسروق نے علقمہ سے کہا کہ مجھے قرآن کی منتخب سورتیں لکھا دیجئے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں جانتے کہ سلف کو لکھنا پسند نہیں تھا میں نے عرض کیا معلوم تو ہے مگر میرا ارادہ یہ ہے کہ میں یاد کر کے پھر انھیں جلا دوں گا۔

سلف میں اپنی علمی یادداشتوں کو مٹانے کا ایک اور داعیہ

عبیدہؒ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنے وفات کے وقت اپنی سب کتابیں منگائیں اور ان کو مٹا ڈالا جب ان سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا مجھے اس کا خطرہ ہے، کہ کہیں یہ نااہلوں کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اور وہ اس کی غلط مرادیں بیان کریں۔

اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک یہ علم زبانی چلتا رہا معزز رہا جب کتابوں میں مدون ہو گیا تو نااہلوں کے پلے پڑ گیا

---

[1] دیکھو جامع بیان العلم ج ۱ ص ۶۵۔

اور اس کا نور جاتا رہا۔

ابراہیم کتابت کے ممانعت کی ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں: لکھا مت کرو کیونکہ لکھنے کے بھروسہ پر آدمی یاد کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ ؎۱

ان چند واقعات سے یہ امر روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ صحابہ میں حفظ حدیث کا اہتمام ہمیشہ رہا اور اتنا اہتمام رہا کہ ابتدائی دور میں عام طور پر اس کی کتابت کی اجازت بھی نہیں دی گئی مبادا اس کے حفظ میں کوئی تساہل پیدا ہو جائے اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کتابت کی ممانعت ان کے نزدیک مسئلہ کے طور پر نہ تھی بلکہ وہ صرف ایک وقتی مصلحت مبنی تھی ورنہ حضرت عمرؓ کتابت حدیث کے متعلق مشورہ ہی کیوں کرتے، صحابۂ کرامؓ کی رائے بالاتفاق کتابت کی طرف کیسے چلی جاتی، خود بہت سے صحابہ حدیثیں کیوں لکھتے اور ان سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، عبداللہ بن عمروؓ سے یہ کیسے فرما دیتے۔

• مجھ سے جو سنا کرو سب لکھ لیا کرو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ خواہ غصہ کے حال کا کلام ہو یا خوشی کا، فرمایا ہاں میں دونوں حالتوں میں جو کہتا ہوں حق ہی کہتا ہوں۔ ؎۲

حافظ ابن عبد البرؒ حضرت انسؓ سے مرفوعاً نقل کرتے ہیں۔ قیدوا العلم بالکتاب (علم کو تحریر کر کے مقید کرو) اسی لئے حضرت انسؓ اپنی اولاد کو کتابتِ علم کی وصیت فرمایا کرتے تھے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی الفاظ منقول ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا میں علم کو مقید کر لوں، فرمایا کر لو۔ عطاء کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمروؓ سے پوچھا علم کے مقید کرنے کا کیا مطلب ہے، فرمایا قلمبند کر لینا یہی وجہ تھی کہ ابو ہریرہؓ جیسے مشہور کثیر الحدیث صحابی کہتے ہیں کہ میرے علم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا ذخیرہ مجھ سے زیادہ کسی کو محفوظ نہیں سوائے عبداللہ بن عمرو بن العاص کے کیونکہ ..... وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا۔ ؎۳

پس اس قسم کی احادیث و آثار کے ہوتے ہوئے کتابتِ حدیث کی ممانعت کو ایک مسئلہ بنا ڈالنا انتہائی ناواقفی ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ عرب کے خداداد حافظہ کے ہوتے ہوئے قرآن کے ساتھ عام طور پر ... کتابتِ حدیث کی اجازت دیدینا بالخصوص ان انھیں کو جنھیں ابھی تک کتابت کا پورا سلیقہ بھی حاصل نہیں ہوا تھا یقیناً مناسب نہ تھا جن حضرات کو یہ سلیقہ حاصل تھا ان کو اس وقت بھی اجازت دے دی گئی تھی پھر بعد میں جب کتابت کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی تو عام طور پر بھی اجازت دیدی گئی جو امور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں وہ ہمیشہ زمانہ کی

؎۱ جامع بیان العلم ؎۲ ابو داؤد ج ۲ ص ۷۱۔ ؎۳ ایضاً

ضروریات اور حالات کے تابع رہا کرتے ہیں۔ قرآن ہی کو دیکھیے ایک زمانہ تھا کہ اس میں اعراب اور سورتیں اور رکوع لکھنا بدعت سمجھا جاتا تھا، پھر ایک زمانہ آیا کہ اعراب وغیرہ کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ رہا حتی کہ اب بدعت ہونا تو درکنار اعراب لگانا واجب ہوگیا۔ پھر ایک زمانہ آیا جبکہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا تحت اللفظ ترجمہ بھی علماء میں تشویش کا باعث بن گیا۔ اب ایک زمانہ ہے کہ سب سے اہم ضرورت ترجمہ کی محسوس کی جارہی ہے، بات وہ بھی درست تھی اور یہ بھی درست ہے۔ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ کتابت حدیث کے مسئلہ میں شروع میں کچھ رائے کا اختلاف ضرور رہا ہے پھر یہ اختلاف ختم ہوگیا تھا اور علم کی کتابت سب کا متفقہ دستور العمل بن گیا تھا اگر ایسا نہ کیا جاتا تو آج ہمارے زمانہ میں علم کا نام ونشان بھی نہ ملتا۔[1]

خلاصہ یہ کہ تدوین حدیث تحفظ علم کی ایک ارتقائی شکل تھی جس طرح موجودہ قرآن کی جمع وترتیب کی ارتقائی شکل ہے پہلے وہ عموماً سینوں میں محفوظ تھا پھر صحف میں لکھا گیا پھر صحف سے مصحف بنا، پھر غیر مشکل سے مشکل ہوا، رکوع اور سورتوں کے نشانات قائم کیے گئے، پھر مترجم ہوا، پھر اس کی مختلف تفاسیر اور فہرستیں مرتب ہوئیں اسی طرح حدیث بھی پہلے منتشر طور پر محفوظ رہی۔ پھر زمانے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہاں بھی ایک ارتقاء نمودار ہوا اور اس کے قلمبند کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی پہلے آثار اور مرفوع حدیثیں یکجا لکھی گئیں۔ اسی حال پر ایک دور گذرا دوسرا دور آیا تو مرفوع کو آثار سے جدا کرلیا گیا اس کے بعد صحیح وضعیف کے جداجدا لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی یہ تمام صورتیں فطری ارتقاء کی بناء پر ظاہر ہوتا گزرتی رہیں۔ ہر ارتقائی حرکت پہلے پہل قابل اعتراض نظر آئی۔ آخرکار وہی متفقہ دستور العمل بن گئی۔ اسی بناء پر امام زہریؒ نے بھی حدیث کا جمع کرنا شروع میں پسند نہ کیا اور شکایت کے لہجہ میں کہا کہ ہمیں ان امراء نے مجبور کردیا ہے ورنہ ہم حدیث کی تدوین نہ کرتے مگر کیا آپ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے خلیفۂ عدل کے متعلق یہ گمان کرسکتے ہیں کہ ان کا یہ حکم ایک انچ بھی تعلیماتِ اسلام کے خلاف ہوسکتا تھا یہ کلماتِ ناگواری جیسے ہر حرکت ارتقائی کی ابتداء میں منہ سے نکلا کرتے ہیں یہاں بھی نکلے بالآخر یہی محدثین تھے جن کی عمر کا محبوب ترین مشغلہ ہی تدوینِ حدیث تھا۔ یہاں کسی کے جبر وقہر کا گمان کرنا ایک بدگمانی ہے یا یہ سمجھنا کہ تدوین ہی حدیث سے حدیث کی تاریخ شروع ہوتی ہے بالکل خلاف واقع ہے۔ تدوین سے پہلے بھی حدیث محفوظ تھی، فرق صرف یہ پڑا کہ اب حفظِ صدور کے ساتھ اوراق میں بھی مدون ہوگئی

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہے کہ منکرین حدیث کا یہاں تدوینِ حدیث کے مسئلہ سے مدد لینا محض ایک مغالطہ ہے۔ اسی طرح کسی کسی صحابی کا عام طور پر روایتِ حدیث کی ممانعت کرنا یا روایت کرنے والوں سے گواہی طلب کرنا ہرگز اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا کہ ان کے نزدیک اصولی طور پر حدیث حجت نہ تھی بلکہ یہ تمام واقعات اس کا

---

[1] دیکھو مقدمہ ابن الصلاح۔ ص ۱۷۱۔

سب سے بڑا ثبوت ہیں کہ ان کے درمیان حدیث کی حیثیت قطعاً تشریعی حیثیت تھی اور اسی لئے وہ اس کا اہتمام مذہب کی طرح کیا کرتے تھے۔ ورنہ تاریخی واقعات کی تدوین کے لئے نہ کبھی ممانعت کی گئی ہے اور نہ تاریخ کے ہر ہر جزء کے لئے کبھی شاہدوں کا مطالبہ کیا گیا ہے، یہ اہتمام صرف مذہب اور شریعت کے لئے کیا گیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ اور علامہ جزائری نے اس پر بہت بسط و شرح سے بحث کی ہے ہم یہاں صرف اس کا ایک ٹکڑا نقل کرنے پر کفایت کرتے ہیں۔

وقد ردّ علیهم الجمهور بان الردّ انما کان لاسباب عارضة وهو لا یقتضی ردّ جمیع اخبار الاحاد کما ذهب اولئك علی ان الاخبار التی استندوا الیها انما تدل علی مذهب من یشترط فی قبول الخبر التعدد فی رواته ولا تدل علی مذهب من یشترط التواتر فیه۔

(توجیہ ص ۱۵)

جن چند واقعات سے حدیث کے لئے تواتر شرط کہنے والوں نے استدلال کیا ہے وہ کئی وجہ سے درست نہیں۔ پہلے تو اس لئے کہ اگر کسی صحابی نے کسی حدیث کو کسی عارضی سبب سے تسلیم نہیں کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں نکل سکتا کہ اس کے نزدیک خبرِ واحد قبول نہ کرنا اصولی طور پر بھی مسلم تھا ہو سکتا ہے کہ اصولاً اس کے نزدیک خبرِ واحد حجت ہو لیکن خاص اس جگہ راوی یا متن کے شرائط میں کوئی شرط موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس نے قبول نہ کیا ہو یا کسی وقتی مصلحت کی بنا پر اس نے نصِ حدیث کے لئے گواہ طلب کر لئے ہوں علاوہ ازیں اگر یہ واقعات دلیل بن سکتے ہیں تو اس شخص کی دلیل بن سکتے ہیں جس کے نزدیک خبرِ واحد کے لئے راوی کا تعدد ضروری ہے نہ کہ اس شخص کے لئے جس کے نزدیک تواتر ضروری ہے۔

اس کے بعد اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ قرآن کی حفاظت کا مفہوم کیا ہے اور کیا یہ تسلیم کر کے کہ احادیث کا تمام ذخیرہ تلف ہو گیا ہے، قرآن کو پوری طرح محفوظ کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ابوالحسن بن منتاب اور قاضی ابواسحٰق کا ایک مکالمہ بہت دلچسپ ہے۔ علامہ شاطبی نقل فرماتے ہیں کہ ابوالحسن بن منتاب نے ایک دن قاضی ابواسحٰق سے پوچھا آخر اس کا سبب کیا ہے کہ اہلِ تورات کو تورات کی تحریف پر قدرت حاصل ہو گئی لیکن قرآن کی تحریف پر کسی کو قدرت نہ ہوئی۔ قاضی نے جواب دیا اہلِ تورات کے حق میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ — اس سبب سے کہ ان پر خدا کی کتاب کی حفاظت کا بوجھ ڈالا گیا تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ نہیں لی بلکہ اس کو خود اہلِ تورات کے سپرد کر دیا تھا اس کے بالمقابل قرآن کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ — یہ ذکر ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔

یہ فرق ہے کہ قرآن کی تحریف پر کسی کو دسترس حاصل نہیں ہو سکی۔ (الموافقات)

یہی سوال اگر کسی مؤرخ سے کیا جاتا تو وہ بہت سے بہت اس کا سبب عرب کا ماحول اور ان کا ذوق حفظ ہی قرار دیتا۔ لیکن اگر یہ اثرات اس ماحول کے ہوتے تو ان کا دائرہ بھی یقیناً ان حدود ہی میں محدود رہنا چاہئے تھا مگر یہاں جب عجم پر نظر کی جاتی ہے جو نہ قرآن کی زبان سے آشنا نہ اس کے تلفظ پر پورے قادر نہ قوت حفظ میں کچھ ممتاز تو وہ بھی قرآن کے حفظ میں عرب سے پیچھے نظر نہیں آتے بلکہ اگر انہیں کچھ پیشگام کہدیا جائے تو مبالغہ نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ جب اس پر بھی غور کیا جاتا ہے کہ اس غیر معمولی حفاظت کا دائرہ قرآن کے صرف الفاظ تک محدود نہیں رہا بلکہ ان کی طرز کتابت اور طرز ادا تک پھیلتا چلا گیا ہے اور اس سے بھی گذر کر[1] ان تمام علوم و فنون کو محیط ہو گیا ہے جو اس سلسلہ میں قریب یا بعید طور پر کار آمد تھے تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ حفاظت انسانی حفاظت کا نتیجہ نہیں بلکہ ضرور اسی وعدۂ الٰہی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ جس حفاظت کے حدود اتنے وسیع ہو گئے ہوں قرآن کے معانی اور اس کی ضروری تفصیلات اس کے احاطہ سے باہر نہیں رہ سکتیں۔

یہ بات ہر شخص کو باور کر لینا چاہئے کہ معانی کی حفاظت کو بھی الفاظ کی حفاظت میں بہت بڑا دخل ہے الفاظ اور معانی دونوں کا باہم ایسا علاقہ ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اصول فقہ میں جب قرآن کی بحث شروع ہوتی ہے تو علماء لکھتے ہیں کہ قرآن درحقیقت نظم اور معنی کے مجموعہ ہی کا نام ہے یعنی یہ دونوں قرآن کے دو رکن ہیں جن میں معنی کی رکنیت ایک اعتبار سے بہ نسبت لفظ کے اہم تر ہے۔ ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسا ایمان میں تصدیق و اقرار کی۔ اگرچہ ایمان کے یہ دونوں رکن ہیں مگر تصدیق کی رکنیت بہ نسبت اقرار کے

---

[1] علامہ شاطبی تحریر فرماتے ہیں:۔ وهكذا جرى الامر فى جملة الشريعة فقيض الله لكل علم رجالا حفظه على ايديهم. (الموافقات ج ۲ ص ۵۹) قرآن کریم کی طرح حفاظت الٰہیہ کا دائرہ تمام شریعت کو محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو علم بھی اس سلسلہ میں کار آمد ہو سکتے تھے سب کے لئے کچھ لوگ ایسے مقرر فرما دیئے ہیں جن کے ذریعہ سے اس کی حفاظت ہوتی رہتی ہے۔ لغت قرآن کے لئے اہل لغت الفاظ و اعراب کی تصحیح کے لئے اہل صرف و نحو۔ اسی کے ساتھ ایک ایسی جماعت بھی پیدا فرمائی جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بحث کی، ثقہ اور عادل راویوں کے حالات لکھے۔ ان کی ولادت و وفات کے سنہ مدون کئے تاکہ ایک دوسرے کی ملاقات کا حال صحیح صحیح کھل سکے اور سند کا اتصال روشن ہو جائے اور اس طرح آپ کی صحیح و سقیم احادیث کو ایک ایک کر کے نکھار دیا۔ پھر ایک جماعت ایسی پیدا فرمائی جس نے اغراض شارع سے بحث کی اور ان کے مطابق احکام استنباط کئے حتیٰ کہ قرآن و سنت کو دفعات وار ایک مبوب اور مفصل آئین کی شکل پر مرتب کر دیا۔ ان کے علاوہ وہ علماء پیدا فرمائے جنہوں نے مخالفین کے شبہات اور ملاحدین کے الحاد و زیغ کی تردید کا ذمہ لے لیا پھر آخر میں لکھتے ہیں۔ وهكذا جرى الامر فى كل علم توقف فهم الشريعة عليه او احتيج فى ايضاحها اليه وهو عين الحفظ الذى تضمنته الادلة الشرعية (ج ۲ ص ۶۱)

خلاصہ یہ کہ جس جس علم پر شریعت کا سمجھنا موقوف تھا یا اس کی ایضاح و تفصیل میں اس کی ضرورت پیش آ سکتی تھی سب کے لئے ایک ایک قوم پیدا فرما دی اور یہ سب کچھ ٹھیک اسی حفاظت الٰہیہ کا مصداق تھا جن کا تذکرہ قرآنی آیات میں کیا گیا ہے۔

زیادہ اہم ہے۔ اسی لئے اکراہ کی حالت میں اقرار کی رکنیت تو ساقط ہو سکتی ہے مگر تصدیق کی رکنیت کسی حال میں ساقط نہیں ہو سکتی۔ اکراہ و رضا کے دونوں حالتوں میں قلبی تصدیق قائم رہنا ضروری ہے۔

اسی طرح یہاں الفاظ و معانی کا معاملہ ہے، الفاظ بھی قرآن کا ایک رکن ہیں اور معانی بھی لیکن معانی کی رکنیت بہ نسبت الفاظ کے زیادہ اہم ہے اس لئے چاہئے تو یہ تھا کہ ان کی حفاظت بھی الفاظ کی حفاظت سے زیادہ اہم ہوتی لیکن ہر کلام کا ڈھانچا چونکہ الفاظ ہی سے تیار ہوتا ہے الفاظ نہ ہوں تو کوئی کلام وجود میں نہیں آسکتا جیسے انسان میں جسم و جان، جسم موجود نہ رہے تو انسان کو موجود کون کہے۔ الفاظ ہی ان معانی کا لباس ہیں الفاظ ہی سے قرآن کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے اور الفاظ ہی کے لحاظ سے معانی کے حدود پھیلتے اور سمٹتے ہیں۔ اس کے برخلاف معانی صرف مفہومات ہوتے ہیں جن کی ادائیگی کے لئے پھر الفاظ کی ضرورت ہے اور وہ قرآنی الفاظ سے زیادہ خوبصورت میسر نہیں آسکتے۔ اس اعتبار سے دیکھو تو الفاظ کی حفاظت مقدم ہونی چاہئے۔ اس لئے مقدر یوں ہوا کہ الفاظ کی حفاظت تو بطریقِ تواتر ہو اور معانی قرآن یعنی اس کی تفصیلات کی حفاظت صرف اس حد تک محدود رہے جو اس کی مراد کو تحریفِ معنوی کی زد سے بچائے رکھے اور اس طرح ایک طرف الفاظ کا تواتر معانی کو بکھرنے نہ دے، دوسری طرف معانی کی حفاظت الفاظ کی بندش میں معین رہے اور مرادِ متکلم کے خلاف غیر مقصود احتمالات کا دائرہ پھیلنے نہ دے۔ یہ ہے وہ حفاظت جس کا قرآن میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر قرآن کے صرف الفاظ ہی محفوظ ہوں تو ہر ملحد و زندیق اپنے اغراضِ نفسانی کے مطابق جو معنی چاہے ان میں پہنا دے اور اگر صرف معانی محفوظ ہوں تو ان کے انتشار کے سمیٹنے کا ہمارے پاس کوئی قطعی ذریعہ ہی باقی نہ رہے۔ اب الفاظ و معانی دونوں محفوظ ہیں۔ الفاظ کی گرفت سے معانی باہر نہیں جا سکتے اور معانی کے لحاظ سے الفاظ میں رد و بدل نہیں ہو سکتی۔ دونوں کی حفاظت میں فرق ہے تو یہ کہ الفاظ بعینہا محفوظ ہیں اور معانی قدرِ مشترک محفوظ۔ جیسا کہ حاتم کی سخاوت کی حکایات کہ اس کی ہر ہر جزئی حکایت تو متواتر نہیں مگر ان سب میں مشترک طور پر اس کی سخاوت کا مضمون متواتر ہے اسی طرح قرآن کے معنی کی تمام تفصیلات اگرچہ متواتر نہیں مگر اُن سب میں پھر ایک مشترک امر متواتر ہوتا ہے، وہی اُن مختلف تفصیلات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اگر قرآن کے معنی بھی الفاظ کی طرح کسی ایک صورت میں محدود ہو کر رہ جائیں تو یہ اس کی بلاغت اور بلندی کے شایانِ شان نہیں۔ تجربہ شاہد ہے کہ جس قدر بلند پایہ کلام ہوتا ہے اتنے ہی خوبصورت سے خوبصورت معانی کا حامل ہوتا ہے۔ نظمِ قرآنی کی بلندی بھی اس کو مقتضی ہے کہ اس میں مختلف معانی پیدا ہوں اور ہر معنی ہدایت کا ایک بہتا ہوا چشمہ ہو، اس کے علاوہ قانونِ یُسر بھی یہی چاہتا ہے کہ اختلافِ معانی کی وجہ سے عاملین کو کچھ اور وسعت مل جائے لیکن ان مختلف معانی اور مختلف احتمالات کا معیار اگر صرف لغت دانی اور عقل کو ٹھیرا دیا جاتا تو یسر ہی یسر اور وسعت ہی وسعت رہ جاتی اور ضبطِ آئین کا

جو اصل مقصد تھا وہ سب فنا ہو جاتا۔ اس لئے وسعت کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کے حدود مراد شارع کے اندر ہی اندر دائر رکھے جائیں یہی وسعت و تنگی کے درمیان کا وہ میدان ہے جسے احادیث نے متعین کر دیا ہے۔ اب ایک حد تک یہاں آزادی بھی حاصل ہے اور اسی کے ساتھ بالکل مطلق العنانی بھی نہیں۔

ان تمام تفصیلات کا ہر ہر جزء اگرچہ متواتر نہیں لیکن اس مجموعہ سے جو حدود تحریف ہیں وہ قدر مشترک بطریق تواتر ثابت ہو جاتی ہیں مثلاً قرآن کی آیت "اقیموا الصلوۃ" ہی کو لیجئے اس کی تمام تفصیلات گو متواتر نہیں ہیں لیکن اُن سے یہ بات بداہۃً ثابت ہو جاتی ہے کہ لفظِ صلوٰۃ سے صرف دعاء مراد لے لینا قرآن کی تحریف ہے۔ اسی طرح اگر آج کوئی شخص نماز کی کوئی نئی ہیئت ایجاد کرنا چاہے اور سجدہ کو رکوع سے مقدم یا رکوع کو قرارت کے درمیان یا دو سجدوں کے درمیان رکوع یا دو سجدوں کے درمیان قرارت یا قیام کی حالت میں سلام تجویز کر دے تو یہ سب تحریف شمار ہوگا۔ اور یہ تحریف اسی طرح قرآن کی تحریف کہلائے گی جیسا کہ آیتِ مذکورہ میں لفظ صلوۃ کی بجائے لفظ الدعا کی تحریف۔ پس اگر قرآن کے الفاظ کا تحفظ اس لئے ضروری ہے کہ کتاب اللہ کی صورت محفوظ رہے تو اس کی تفصیلات کی حفاظت اس لئے ضروری ہے کہ ان محفوظ الفاظ کی مرادیں اور ان کے صحیح مصداق بھی محفوظ رہیں۔

ذرا انصاف کرنا چاہئے کہ اس کامل دین کی حفاظت کا وعدہ کیا صرف الفاظ کی حفاظت سے پورا ہو سکتا ہے یہ حفاظت تو شاید تورات و انجیل کو بھی حاصل تھی۔ لیکن کیا محض الفاظ کی حفاظت سے یہودیت و نصرانیت محفوظ رہ گئیں کیا احبار و رہبان نے تحریف معنوی کر کرکے ان کو تباہ و برباد نہیں کیا۔ چلئے اگر راجح کے قول کی بناپر تسلیم کر لیا جائے کہ اس میں لفظی تحریف بھی ہو گئی ہے تو بھی یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ تحریف معنوی کے اثرات لفظی تحریف سے زیادہ مہلک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔ پس قرآن کے صرف الفاظ کو محفوظ کہہ کر دینِ محمدی کے اصل خط و خال کی حفاظت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ حفاظت صرف اُن احادیث کی بدولت ہے جو اگرچہ انفرادی حیثیت سے خبر آحاد کہلاتی ہیں مگر قدرِ مشترک حدودِ تحریف کو بطریقِ تواتر متعین کر دیتی ہیں آج بھی بہت سے منتسبین اسلام محرف عقائد قرآن کے الفاظ میں ٹھونسنا چاہتے ہیں مگر قرآن کی معنوی حفاظت کا یہی دوسرا مضبوط بازو ہے جو انھیں کامیاب ہونے نہیں دیتا۔ بہت سے ہیں جو اپنی زبان سے آیت خاتم النبیین بڑی خوش الحانی سے پڑھتے ہیں پھر اسی آیت سے نبوت کا تا قیامت تسلسل ثابت کرتے ہیں۔ بہت ہیں جو رسول کو عام انسانوں کی صف میں لا کر اُن کے بالکل برابر کھڑا کر دینا چاہتے ہیں اور بہت ہیں جو اس کو اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی ذات میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور سب کے ہاتھوں میں یہی قرآن ہے مگر یہ سب کے سب اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ قرآنی حفاظت صرف اس کے الفاظ تک محدود نہیں رہی اس کے معانی کو بھی شامل ہو گئی

اس لئے اگر کوئی زبان ایک ہزار بار آیت خاتم النبیین پڑھ کر ایک بار بھی نبوت کا دعویٰ کر دیتی ہے تو وہ امت کے نزدیک منکرین ہی کی فہرست میں شمار ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کے الفاظ کا انکار کرنے والا اور اس کے کسی متفق علیہ معنیٰ کا انکار کرنے والا ایک ہی صف میں سمجھا جاتا ہے۔

پس اگر آپ کے نزدیک بھی یہ ضروری ہے کہ قرآن کی حفاظت لفظی اور معنوی دونوں طریقوں پر ہو تو اب صفحاتِ تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھ جائیے کہ وہ کون سی جماعت تھی جس نے اس فریضہ کو ادا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر قرآن کے الفاظ کی حفاظت حفاظ نے کی ہے تو اس کے معانی کے بہتے ہوئے دریا کی نگہداشت محدثین کے سوا کسی نے نہیں کی۔ اگر محدثین کی یہ حفاظت حفاظتِ الٰہیہ کا مصداق نہ ہوتی تو ڈاکٹر اسپرنگر اس حفاظت کا محیر العقول نقشہ دیکھ کر حیرت زدہ نہ رہ جاتا۔

ابن حزم جیسا وسیع النظر مورخ اور عالمِ فنِ اسناد کو اس امت کی خصوصیات میں شمار نہ کرتا لیکن وہ بڑے فخر سے یہ اعلان کرتا ہے کہ دین کی حفاظت کے جو چند طریقے اس امت کو مرحمت ہوئے ان میں سے ایک بھی پہلی کسی امت کو نصیب نہیں ہوا۔ بقول منکرینِ حدیث اگر دین کی حفاظت صرف تواتر کی ایک ہی صورت میں منحصر ہو تو پھر تمام دین کی حفاظت کا دعویٰ یا تو صرف ایک بے دلیل خوش عقیدگی بن جائے یا دین کے بہت بڑے حصہ سے دست بردار ہونا پڑے۔ قرآن کریم اگرچہ متواتر ہے۔ مگر بہت سے مقامات پر اس کی مراد اور معنی کا تواتر ثابت نہیں ہو سکتا لغت میں اشتراک ثابت ہے پھر حقیقت و مجاز استعارات و کنایات کا ایسا وسیع باب ہے جس پر معتزلہ نے تو اپنے سارے مذہب کی بنیاد ہی رکھدی ہے۔ ان کے نزدیک ذات و صفات کی آیات اکثر اسی باب میں داخل ہیں۔ ان احتمالات کے موجود ہوتے ہوئے ہر جگہ تواتر اور قطعیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر احادیث تو در کنار قرآنی احکام کے بہت بڑے حصہ سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا اور اگر ہٹ دھرمی سے یہی دعویٰ کر دیا جائے کہ اس کی تمام تفصیلات بھی قطعی الثبوت اور متواتر ہیں تو مذہبی دنیا میں موجودہ حالت سے بھی زیادہ انتشار برپا ہو جائے گا۔ ہر شخص اپنے اندازۂ عقل کے مطابق ایک معنی تراش لیگا۔ اور اس پر اس زعم میں مبتلا رہے گا کہ یہی معنی متواتر اور قطعی ہیں مثلاً منکرینِ حدیث، اتباعِ وحی کی تمام آیات کا مفہوم یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں حدیث کے انکار کی بہت بڑی دلیل موجود ہے اور قائلینِ حدیث ان ہی آیات کو اثباتِ حدیث کی بہت بڑی حجت سمجھتے ہیں۔ اب سوچئے کہ اگر یہ دونوں معنی متواتر ہوں تو ایک دوسرے سے کہاں تک کشیدگی کی نوبت آجائے گی۔ لیکن اگر مسائل ظنیہ بھی قرآن کے ماتحت داخل رہ سکتے ہیں تو پھر کسی فریق کو یقینی طور پر دوسرے کو باطل کہنے کا حق نہیں ہو سکتا۔ بہت سی آیات کے معانی میں صحابۂ کرام کا اختلاف ثابت ہے اس کے باوجود چونکہ قطعیت کا دعویٰ کسی کو نہ تھا اس لئے ان میں مخالفت کا کوئی اثر بھی نہ تھا۔

انکارِ حدیث کے نتائج و عواقب

انکارِ حدیث اور حصولِ یقین کے لئے تواتر شرط کرنے کے لازمی نتائج حسب ذیل ہیں۔

(۱) قرآن کریم کی معنوی حفاظت اور اسلام کے امتیازی طُرُقِ محافظت کا انکار۔

(۲) قرآن کی جامعیت کا وہ وسیع مفہوم جو احادیث نبویہ پر نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے اس کی دستبرداری

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیش قیمت تشریعی کلمات سے محرومی اور آپ کی پر اسرار حالاتِ زندگی سے لاپرواہی۔

(۴) آپ کی وفات کے بعد آپ کی اطاعت سے اصولی انکار۔

(۵) قرآن کریم میں جہاں بیسیوں جگہ اطاعتِ رسول کا صریح حکم موجود ہے ان سب کی تاویل بلکہ تحریف

(۶) جس دور میں عامل بالقرآن امام نہ ہو اس میں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے تمام نظام کا تعطل۔

(۷) رسول کی ذات میں بلا کسی شرعی ثبوت کے دو حیثیتوں کا اعتقاد پھر ان کے جدا جدا حقوق کی محض اپنے دماغ سے تقسیم۔

(۸) اسوۂ رسول جو قرآن کی جامعیت کا مفصل نقشہ تھا اس کی قطع و برید اور بقیہ کی ذہنی تشکیل۔

(۹) رسول کی ذات میں جو شرعی اور فطری جاذبیت ہے اس سے علیحدگی اور یکسوئی۔

(۱۰) مذہبی آئین سازی میں عقولِ عامہ کی اصولی دست اندازی۔

حدیث کا انکار تو آسان ہے لیکن اس کے انکار کے جو عواقب ہیں اُن کا سنبھالنا ذرا مشکل ہے۔ یہ پہلو دین کی صرف تخریب کا پہلو ہے اس کی تعمیر کا پہلو نہیں۔ منکرینِ حدیث کو چاہئے کہ پہلے وہ صرف قرآن اور اپنی عقل کی مدد سے دین کا ایک مکمل نقشہ تیار کرلیں اس کے بعد اُس مفصل نقشہ سے موازنہ کرکے دیکھیں جو احادیث کی زیرِ ہدایات مرتب ہو چکا ہے اس وقت اُن کو یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ مملکتِ دین کی وسعت، محکمات و متشابہات کے علاقے، حرام و حلال کے حدود، عقائد و اعمال کی باریکیاں، معیشت و تمدن کے شعبے نظام و سیاست کی لائنیں کس میں زیادہ نمایاں اور صاف نظر آتی ہیں۔ ہر مشکل کو غیر ضروری کہکر ٹالدینا ہر مطلق العنانی کو دین کے یسر میں داخل سمجھ لینا، سلف و خلف کی معروف شاہ راہ کو چھوڑ کر نئے راستہ کی بنیاد ڈالنا اپنے خود تراشیدہ خیالات و مزعومات کو حقائق اور حقائق کو خیالات سمجھ لینا دین نہیں بلکہ کوتاہ نظری خود پسندی اور واجب التوقیر ہستیوں کی تحقیر کرنا ہے درحقیقت یہ قدرت کی ایک تعزیر ہے جو انکارِ حدیث کے باعث ملی ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ امت کا جو طبقہ جس قدر صاحبِ نبوت سے قریب تر ہے اسی قدر مذہبی لحاظ سے صحیح تر ہے اس لئے مذہب کی جھلک جتنی صحیح طور پر اُن میں نظر آسکتی ہے بعد کے دور میں نظر نہیں آسکتی۔

لہٰذا خالی الذہن ہو کر آپ براہِ راست ان کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو بلا کسی غور و فکر کے جوبات آپ کے ذہن میں پیدا ہوگی وہ صرف ایک ہی بات ہوگی کہ ان کے درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اپنی ۲۳ سالہ حیاتِ طیبہ میں رسالت ہی کی حیثیت سمجھی گئی ہے اور آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی صرف ایک عام امام یا عام امیر کی حیثیت میں نہیں سمجھا گیا، ان کی نظروں میں آپ پر ایمان لانا، آپ سے محبت کرنا، آپ کی اطاعت کرنا، اور وہ تمام قربانیاں جوان کے بس میں تھیں کر گذرنا صرف رسالت ہی کی ایک حیثیت سے متعلق تھا وہ آپ کی اطاعت کیلئے آپ کی حکم برداری کے لئے کسی ادنیٰ پس و پیش کے بغیر ہر وقت تیار رہتے تھے اور کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن کے حکم یا آپ کے حکم کی بجا آوری میں سرِ مو کوئی تفریق کرتے ہوں، یا آپ کا حکم ثابت ہو جانے کے بعد حیات و وفات کی تفریق ان کے ذہنوں میں کبھی گذری ہو۔ ان کے نزدیک آپ کے احکام اور آپ کی جو حیثیت تھی وہ ہرگز کسی حاکم کسی امیر اور کسی بادشاہ کے حکم کی سی نہ تھی سلف کی تاریخ کا یہی نقشہ اتنا سچا ہے کہ اس میں مسلمان و کافر دو رائیں نہیں رکھتے۔ رہ گئی سند کی تحقیق شاہدوں کی تلاش، ہر شخص کو معنی سمجھے ہوئے بغیر حدیث بیان کرنے کی ممانعت تو وہ صرف بنظرِ احتیاط اور آپ کی طرف غلط انتساب کے سدباب کے لئے تھی۔ اگر قرآن کی طرح لکھنے، قرآن کی طرح حدیث کو اپنا مشغلہ بنائے رکھنے کی کسی دور بین نے ممانعت کی تو اس نے صرف اس تحریف سے حفاظت کی خاطر کی جو اُن کی آنکھوں کے سامنے ابھی تورات و انجیل میں ہو چکی تھی۔ الغرض سند کی تحقیق، شاہدوں کا مطالبہ، کتابت کی ممانعت مگر حفظ کا اہتمام، ہر شخص کو تعلیم کی ممانعت اور ہر قسم کی حدیث کی روایت کی روک تھام، روایتِ حدیث کے وقت خوف و ہراس، تکثیرِ روایات سے احتراز وغیرہ وغیرہ۔ یہی صحابہؓ اور حدیث کی تاریخ کا خلاصہ ہے اب چاہو تو اسے آپ حدیث کی مخالفت کا پروگرام کہہ لیجئے، یا حدیث کی حفاظت، تعلیم دین کی اہمیت، روایتِ احادیث میں فہمِ مخاطبین کی رعایت اپنے احساس ذمہ داری، حدیث میں لاپرواہی سے اجتناب، اور انتہائی تشدد و احتیاط سے تعبیر کیجئے۔

ہر شخص کی زندگی میں کچھ واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر اس کے عام مذاق یا اُس کے زمانہ کے عام مذاق کے بھی خلاف ہو سکتے ہیں، ان کی اصل وجہ وقتی مصلحت یا کوئی اور عارضی سبب بھی ہو سکتا ہے۔ صرف ان واقعات کی بنا پر اس کی ساری زندگی یا اُس زمانہ کے سارے مذاق کو بدل دینا اس دور کی تاریخ کو مسخ کرنے کے مرادف ہے۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں مذہبی لٹریچر اول تو کوئی دیکھتا نہیں اور اگر کوئی دیکھتا ہے تو وہ بھی مخالف ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گیا ہے کہ اسلام کے واضح اور کھلے ہوئے حقائق ہر روز نظری مسائل بنتے چلے جاتے ہیں اسلامی ذہنیت بدل لینے کا یہ پہلا نقصان ہے اور ہر نقصان جو اس کے بعد ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔ ؎

لمثل ھذا یذوب القلب من کمد

ان کان فی القلب اسلام و ایمان

ائمہ اربعہ اور بعض اُن مشہور محدثین کے تذکرے

جن کی تصنیفات اس مجموعہ کی زمین اور ماخذ ہیں

اصل کتاب شروع کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری ہے کہ اُن مقتدر ہستیوں کا اجمالی تعارف کرادیا جائے جن کے خزانوں سے لے کر حدیث کے یہ موتی آپ کے سامنے بکھیرے گئے ہیں۔ اس مرحلے پر یہ کیسے ممکن تھا کہ ائمہ اربعہ کا تذکرہ نہ آتا کہ درحقیقت یہی حضرات ان تمام محدثین اور اُن کی مولفاتِ گرامی کا اصل سرچشمہ ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کردینا بھی ضروری ہے کہ یہ تذکرے ان شخصیاتِ بارزہ کے صرف تعارف کی حد تک ہیں۔ ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات یا اُن پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں کہ اس کے لئے بڑی فرصت درکار ہے۔ پھر یہ اس کا محل بھی نہیں۔ ہاں ان مختصر تر تذکروں سے اجمالاً یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جن بزرگوں کے حفظ، دیانت و عبادت، عادت و اخلاق، عقل و فہم کا حال یہ ہو، ان کی جمع کی ہوئی حدیثوں کے یہ عظیم الشان دفتر کس وزن اور مرتبہ کے ہو سکتے ہیں، چونکہ اصل مقصد حدیث اور حاملینِ حدیث کی وقعت ذہن نشین کرنا ہے اس لئے ہم نے اپنے نزدیک جو ایک نکھری ہوئی حقیقت تھی اس کو سامنے رکھدیا ہے، اس سے قطع نظر کہ اس سے پہلے اس باب میں دنیا کے خیالات کیا تھے اور آئندہ اس پر کس انداز کی تنقیدیں ہوں گی۔ ہمارے دل کی گہرائیوں میں اس موقر جماعت کی عقیدت ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اُن کا عقیدت مند بنادیں۔ امام اعظمؒ کا تذکرہ نسبتۃً بسیط ہوگیا ہے یہ صرف عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ حقیقت کی بناء پر کثرت تبعین اگر انبیاء علیہم السلام کے لئے وجہ فخر ہو سکتی ہے تو یہ فخر امام صاحبؒ کو حاصل ہے۔ اس کے ساتھ جتنے ائمہ ہُدیٰ ہیں وہ سب ہمارے نزدیک آفتاب و ماہتابِ ہدایت ہیں۔ ان سب کی محبت سے الحمد للہ کہ ہمارا قلب معمور ہے اور یہی درخواست اپنے قارئین کرام سے بھی ہے، فقیہانِ ذی شان ہوں یا محدثینِ والامقام، علماء ہوں یا فقراء، ان کے درمیان فرقِ مراتب کی بحثوں میں پڑنا گروہ بندی کی بنیاد ہے اور اگر حد سے تجاوز ہو جائے تو گمراہی بھی ہے، نہ تو یہ اپنا مشغلہ ہے نہ دوسروں کو اس کی تعلیم دینا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان تذکروں میں جرح و قدح کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ ان تذکروں کو بصیرت اور عقیدت کے ساتھ پڑھیے تاکہ اس امت کے بعد والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس کے پہلے کیسے تھے ؎

اولٰئک اٰبائی فجئنی بمثلھم   اذا جمعتنا یا جریر المجامع

ابو حنیفۃ الامامؒ

ولادت ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ

شجرۂ نسب | مورخ ابن خلکان نے امام اعظمؒ کا شجرۂ نسب اس طرح نقل کیا ہے ۔ ابو حنیفۃ النعمان بن ثابت بن زوطی بن ماہ ۔ اور زوطی کو زا کے پیش اور طا کے زبر اور آخر میں یا مقصورہ کے ساتھ ضبط کیا ہے ۔ لیکن امام صاحب کے پوتے نے جو شجرۂ نسب اپنے دادا کا خود بیان کیا ہے وہ اس طرح ہے اسمٰعیل بن حماد بن النعمان بن ثابت بن النعمان بن المرزبان ۔

علامہ شبلی کا خیال یہ ہے کہ جب زوطی اسلام لائے ہوں گے تو ان کا نام نعمان رکھدیا گیا ہوگا اس لئے جب اسمٰعیل نے اپنا شجرہ نسب بیان کیا تو اپنے دادا کا اسلامی نام ہی ذکر کیا ہے ۔

صحیح روایات کی بنا پر یہ طے شدہ ہے کہ امام صاحب کے والد ماجد کی ولادت اسلام ہی پر ہوئی ہے ۔ خطیب بغدادی نے جو کچھ اس کے خلاف لکھا ہے وہ محض بے اصل اور ان کے مشہور تعصب پر مبنی ہے ۔ غالباً اسی خیال کی تائید کے لئے انھوں نے حسب ذیل روایت بھی نقل کی ہے ۔

کان ابو حنیفۃ اسمہ عتیک بن زوطرۃ	"ابو حنیفہ کا نام عتیک اور ان کے والد کا زوطرۃ تھا پھر انھوں نے
فسمی نفسہ النعمان واباہ ثابتا۔	اپنا نام نعمان اور اپنے والد کا ثابت بدل دیا تھا"

اس کا راوی "الساجی" مختلف فیہ ہونے کے علاوہ مشہور متعصب ہے تاہم اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو غالباً ثابت کو زوطرۃ ان کے والد زوطی کی مناسبت سے کہا گیا ہوگا ۔

ہمارے نزدیک نام و نسب کے فیصلہ کے لئے سب سے زیادہ معتبر شہادت خود اہل خاندان ہی کی ہو سکتی ہے لہذا یہاں اسمٰعیل کے بیان کے خلاف جو بیانات بھی ہیں وہ سب مرجوح یا قابل توجیہ ہوں گے ۔ اسمٰعیل یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ ہمارے پردادا ثابت زمانۂ طفولیت میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے آپ نے اُن کے اور ان کی اولاد کے حق میں دعا برکت فرمائی تھی اور ہمیں امید ہے کہ ان کی یہ دعا ہمارے حق میں ضرور قبول ہوئی ہوگی ۔ وہ کہتے ہیں کہ ثابت کے والد نعمان وہی ہیں جو حضرت علیؓ کی خدمت میں ھدیہ لیکر حاضر ہوئے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ کے خاندان کو حضرت علیؓ سے ہمیشہ خاص تعلق رہا ہے اور اسی بنا پر انھوں نے ثابت اور ان کی اولاد کے لئے خصوصیت سے دعا فرمائی ہوگی ۔ اسمٰعیل یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ ہم فارسی النسل ہیں ہمارے سب باپ دادے سب آزاد لوگ تھے اس کے بعد قسم کھا کر کہتے ہیں ۔

واللہ ما وقع علینا رق قط — خدا کی قسم ہے غلامی کی ذلت میں ہم کبھی مبتلا نہیں ہوئے۔

اُن کے اِس تاکیدی بیان سے اس غلط شہرت کی تردید ہوتی ہے جو امام صاحب کے دادا کے متعلق پیدا ہوگئی تھی کہ وہ بنی تیم اللہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اسمٰعیل امام اعظمؒ کے پوتے ہیں، اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کو اپنے دادا کے حالات کی بھی پوری تحقیق نہ ہوگی۔ اسلامی عہد میں رقیت کی غلط فہمی پیدا ہو جانا وہ بھی عجم کے نسب میں کچھ بعید نہیں ہے۔ اور واقعہ کی حقیقت منکشف ہو جانے کے بعد غلط فہمیوں کے اسباب بیان کرنے کی مفت دردسری اٹھانا بھی غیر ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک اس افواہ کو شہرت دینے میں بہت بڑا دخل اس خلش کو بھی ہے جو امام اعظمؒ سے رقابت کے سلسلہ میں بعض علماء کو پیدا ہوگئی تھی۔ علامہ کوثری نے مشکل الآثار کی ایک روایت کی مدد سے یہ ثابت کیا ہے کہ آپ کو مولیٰ حلیف کے معنی میں کہا گیا تھا۔ اگر بالفرض تاریخ سے صحیح طور پر آپ کا اولادِ موالی ہونا ثابت ہو جاتا تو اسلامی نقطۂ نظر سے یہ اتنا بڑا عیب بھی نہ تھا جس کی مدافعت کرنا ہمارے لئے ضروری ہوتا لیکن افسوس یہ ہے کہ عصبیت کی آنکھ جب خشم آلود ہو جاتی ہے تو وہ کوئی ہنر اپنے حریف میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔

مولد و مدفن آپ کی پیدائش کوفہ میں اور وفات بغداد میں ہوئی ہے۔ علمی پایہ کے لحاظ سے کوفہ ہمیشہ ممتاز شہر رہا ہے علامہ کوثری نے نصب الرایہ کے مقدمہ میں اس کی مختصر تاریخ لکھی ہے ہم اس کا خلاصہ یہاں درج کرتے ہیں۔

کوفہ ایک اسلامی شہر ہے جو عہد فاروقی کے ۱۷ھ میں بحکم امیر المومنین تعمیر کیا گیا تھا، اس کے اردگرد فصحاء عرب بسائے گئے اور ان کے تعلیمی نظم و نسق کے لئے سرکاری طور پر حضرت ابن مسعودؓ کو بھیجا گیا۔ ان کی علمی منزلت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہلِ کوفہ کو یہ لکھا تھا کہ ابن مسعودؓ کی مجھے یہاں خود بھی ضرورت تھی لیکن تمہاری ضرورت کو مقدم سمجھ کر تمہاری تعلیم کے لئے ان کو بھیج رہا ہوں۔ انھوں نے یہاں بیٹھ کر عہد عثمانؓ کے آخری دور تک لوگوں کو قرآن پاک اور دین کے مسائل کی تعلیم دی۔ ان کی تعلیمی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ بعض محدثین کے بیان کے مطابق اس نو آباد شہر میں چار ہزار علماء و محدثین پیدا ہوگئے۔ حتیٰ کہ جب حضرت علیؓ کوفہ میں داخل ہوئے تو علم کی یہ شان دیکھ کر بے ساختہ بول اٹھے: "اللہ تعالیٰ ابن مسعودؓ کا بھلا کرے انھوں نے تو اس بستی کو علم سے بھر دیا"۔ کوفہ بحالتِ موجودہ ہی کیا کم تھا کہ اس مدینۃ العلم کی آمد نے اُسے اور چار چاند لگا دیئے۔ ایک سعید بن جبیرؒ تنہا یہاں ابن عباسؓ کے علوم کا ایسا نسخہ موجود تھے کہ جب کوفہ والے اُن کے پاس کوئی فتویٰ پوچھنے جاتے تو وہ فرماتے کیا تمہارے یہاں سعید بن جبیر موجود نہ تھے یعنی ان کے ہوتے ہوئے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔

شعبیؒ کے علم کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابن عمرؓ جب ان کو مغازی پر بحث کرتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے میں ان غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہ چکا ہوں مگر اُن کی یاد داشت ان کو مجھ سے بھی زیادہ ہے۔

ابراہیم نخعی کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ اہلِ نقد کے نزدیک ان کے سب مراسیل صحیح سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ابو سعید خدریؓ اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کا زمانہ پایا ہے ابو عمران نے اُن کو اپنے زمانہ کے تمام علماء سے افضل کہا ہے۔ ۵۹۵ھ میں جب ان کی وفات ہوئی تو ابو عمران نے ایک شخص سے کہا آج تم نے سب سے زیادہ فقیہ شخص کو دفن کر دیا، اس نے کہا کیا حسن بصریؒ سے بھی زیادہ انھوں نے کہا ایک حسن بصریؒ سے نہیں بلکہ تمام اہلِ بصرہ، اہلِ کوفہ، اہلِ شام اور اہلِ حجاز سے بھی۔

شعبی کہا کرتے تھے کہ ابراہیم فقہ کے گہوارہ میں تو پیدا ہی ہوئے تھے اس کے بعد وہ ہمارے پاس آئے اور ہماری وہ حدیثیں جو بے غبار تھیں اپنی فقہ میں شامل کر کے اپنے ساتھ لے گئے

مسروق جو کبار تابعین میں ہیں فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا خلاصہ میں نے ان چھ اشخاص میں دیکھا۔ علی، عبداللہ بن مسعود، عمر، زید بن ثابت، ابوالدرداء اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہم پھر نظر ڈالی تو ان سب کے علم کا خلاصہ پہلے دو شخصوں میں پایا۔ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جو زبانِ رسالت سے اعلم بالحلال والحرام کا تمغہ حاصل کر چکے تھے اپنے خاص شاگرد عمرو بن میمون کو حکم دیا تھا کہ تحصیلِ علم کے لئے تم حضرت ابن مسعودؓ کی خدمت میں کوفہ جاؤ۔

کوفہ کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مصر میں آنے والے صحابہ کی تعداد محمد بن ربیع جیزی اور سیوطی تین سو سے زیادہ پیش نہیں کر سکے۔ اس کے بالمقابل . . . . . . صرف ایک کوفہ میں ڈیڑھ پندرہ سو صحابہ کا قیام لکھ رہے ہیں جن میں ستر صحابہ بدری تھے عراق کے بقیہ شہروں میں بسنے والے صحابہ کا ابھی ذکر نہیں ہے۔ (اور یہ تعداد بھی کم ہے ورنہ جو مقام مرکزی چھاؤنی بنا دیا گیا ہو معلوم نہیں کہ وہاں کتنے اور صحابہ کا گذر ہوا ہوگا) رامہرمزی اپنی کتاب "الفاصل" میں قابوس سے نقل فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا یہ کیا بات ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو چھوڑ کر علقمہ کے پاس جایا کرتے ہیں۔ یہ ابنِ مسعودؓ کے شاگرد تھے۔ فرمایا اے جانِ پدر بات یہ ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو خود ان کے پاس مسائل دریافت کرنے کے لئے آتا دیکھتا ہوں۔ شریح جو یہاں کے قاضی تھے اُن کے حق میں حضرت علیؓ کا یہ ارشاد ہے "اے شریح اٹھو اور فیصلہ کرو کیونکہ تم عرب میں سب سے بڑھ کر قاضی ہو" ان کے علاوہ تینتیس اشخاص یہاں اور بھی ایسے موجود تھے جو صحابہ کی موجودگی میں اربابِ فتویٰ سمجھے جاتے تھے۔

اس دور کے بعد دوسرا دور ان حضرات کے تلامذہ کا شروع ہوتا ہے ان کا عدد بھی ہزاروں سے متجاوز تھا امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ دیر جماجم میں حجاج سے جنگ کرنے کے لئے ایک عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ جو جماعت نکلی تھی اس میں چار ہزار کی تعداد صرف قراء تابعین کی تھی۔ رامہرمزی انس بن سیرین سے نقل کرتے ہیں جب

میں کوفہ پہنچا تو اس وقت وہاں چار ہزار حدیث کے طلبہ اور چار سو فقہاء موجود تھے۔ نیز عفان بن مسلم سے ناقل ہیں کہ جب ہم کوفہ پہنچے تو ہم نے وہاں صرف چار ماہ اقامت کی۔ حدیث کا وہاں یہ چرچا تھا کہ اگر ہم ایک لاکھ حدیثیں لکھنا چاہتے تو لکھ لیتے مگر ہم نے صرف پچاس ہزار حدیثیں ہی پر اکتفار کیا اور صرف وہی حدیثیں جمع کیں جو جمہور کے نزدیک مسلم تھیں انتہیٰ۔ اسی لئے مسلم ائمہ وحفاظ کو بھی طلبِ حدیث کے لئے کوفہ کا سفر کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اگر آج بھی آپ رجال کی کتابیں کھول کر بیٹھیں تو ہزاروں راوی آپ کو کوفہ کے نظر آئیں گے جن کی روایات سے صحیحین اور غیر صحیحین بھری پڑی ہیں۔ حتیٰ کہ خود امام بخاریؒ فرماتے ہیں میں شمار نہیں کر سکتا کہ حدیث حاصل کرنے کے لئے کتنی بار کوفہ گیا ہوں۔ [۲]

خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ کو اگر مہبطِ وحی ہونے کا فخر حاصل تھا تو کوفہ کو ہزاروں صحابہؓ کے مرجع و مسکن ہونے کا بجا فخر حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین کو دیگر بلادِ اسلامیہ کے ساتھ اہلِ کوفہ کا تعامل بھی بڑی اہمیت سے نقل کرنا پڑا ہے۔ یہانتک کہ امام ترمذی نے فقہ کا کوئی باب کم چھوڑا ہے جہاں اعتناء کے ساتھ اہلِ کوفہ کا مذہب نقل نہ کیا ہو۔

یہ ہے امام ابو حنیفہؒ کا مولد اور ان کا علمی گہوارہ جس کے آغوش میں رہ کر ان کی علمی پرورش ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جو فقہ اس سرزمین میں مدون کی گئی ہو وہ سرِ مو بھی کتاب و سنت سے تجاوز کر سکتی ہے۔

حلیہ و اخلاق خطیب بغدادی ابو نعیم سے نقل کرتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ خوش رو، خوش لباس، خوشبو پسند کرنے والے خوش مجلس، نہایت کریم النفس، اور اپنے رفقاء کے بڑے ہمدرد تھے۔ ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ امام صاحب کا قد میانہ تھا نہ بہت کوتاہ نہ زیادہ دراز، گفتگو نہایت شیریں، آواز بڑی دلکش اور بڑے قادر الکلام تھے۔ عمر، امام اعظمؒ کے پوتے فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کسی قدر دراز قامت تھے۔ آپ کے رنگ پر گندم گونی غالب تھی، اچھا لباس پہنتے عام طور پر اچھی حالت میں رہتے۔ خوشبو کا اتنا استعمال کرتے تھے کہ آپ کی نقل و حرکت کا اندازہ خوشبو کی مہک سے ہو جاتا تھا۔ [۳]

آپ ریشم کی تجارت کرتے تھے، قیس بن الربیع بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب مشائخ اور محدثین سے ایک رقم لے کر اُن کے لئے بغداد سے سامان خریدتے اور کوفہ لا کر اُسے فروخت کر دیتے اور سال بہ سال اس کا نفع اپنے پاس جمع رکھتے اور اس نفع سے محدثین کے خورد و نوش لباس وغیرہ کی ضروریات مہیا کرتے اس سے جو بچ رہتا وہ اُن کے حوالہ کر دیتے اور کہتے کہ اسے اپنی دیگر ضروریات میں صرف کر لو اور خدا کا شکر ادا کرو، میرے شکر کی

---

[۱] یہ عفان بن مسلمؒ امام احمدؒ اور بخاریؒ وغیرہ کے شیخ ہیں۔ علی بن مدینی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی عادت تھی کہ اگر حدیث کے کسی حرف میں ان کو ذرا شبہ پڑ جاتا تو اسے سرے سے ترک کر دیا کرتے تھے۔ (تقریب) اب اندازہ فرمائیے کہ جب اس سخت شرط کے ساتھ پچاس ہزار حدیثوں کا ذخیرہ ان کو کوفہ میں مل سکتا ہے تو حدیث کے لحاظ سے کوفہ کا مرتبہ کیا ہو گا۔

[۲] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۹۴۔ [۳] خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۰ و ۳۳۱

ضرورت نہیں کیونکہ میں نے یہ مال اپنے پاس سے تو تم کو دیا نہیں تمہارے ہی مال کا نفع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر کرم ہے کہ اس نے اس کا ذریعہ مجھے بنا دیا ہے۔

حسن بن زیاد کہتے ہیں کہ اہلِ مجلس میں سے ایک شخص پر امام صاحب نے خستہ لباس دیکھا اس سے کہا بیٹھ جاؤ۔ جب محفل برخاست ہوگئی اور یہ تنہا رہ گیا تو فرمایا مصلیٰ اٹھا کر جو اس کے نیچے تم کو ملے وہ لے لو۔ اس نے جانماز اٹھائی تو نیچے ہزار درہم تھے، آپ نے فرمایا یہ لے لو اور اپنا لباس درست کر لو۔ وہ بولا میں خود صاحبِ وسعت ہوں، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، فرمایا تو پھر اپنا حال ایسا بناؤ کہ تمہیں دیکھ کر تمہارے بھائی کو غم نہ ہو کیا حدیث تم کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر اپنے نعمت وکرم کے آثار دیکھنا پسند کرتا ہے۔

جعفر بن عون بیان کرتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے ایک ریشمین کپڑا آپ سے مانگا آپ نے ایک کپڑا اس کے لئے نکالا تو وہ بولی میں بڑھیا عورت ہوں اور یہ معاملہ امانت کا ہے، مناسب ہے کہ آپ کو جتنے میں پڑا ہے اسی قیمت میں میرے ہاتھ فروخت کر دیجئے، فرمایا چار درہم دیدے۔ اس نے کہا بڑھیا کا مذاق نہ بنائیے اور ٹھیک ٹھیک قیمت بتا دیجئے، آپ نے فرمایا میں نے دو کپڑے خریدے تھے اور ایک ہی کپڑے سے چار درہم کم میری پوری قیمت وصول ہوگئی تھی، اب یہ کپڑا مجھے چار درہم میں بچ رہا ہے۔ [1]

ابن مبارک نے سفیان ثوریؒ سے پوچھا۔ ابو حنیفہؒ غیبت کرنے سے بہت دور رہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے دشمن کی غیبت بھی نہیں کرتے۔ سفیانؒ نے جواب دیا ابو حنیفہؒ اس سے بالاتر ہیں کہ اپنی نیکیوں پر اپنے دشمن کو مسلط کریں۔ (کہ وہ قیامت کے دن اپنی غیبت کے بدلہ میں ان کی نیکیاں لے لے)۔ [2]

اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں مفصل تذکروں میں دیکھے جا سکتے ہیں ان چند واقعات میں امام صاحب کی صرف ہمدردی اور مساوات قابلِ غور نہیں ہے۔ دنیا میں سخی اور کریم اور بھی گذرے ہیں دیکھنا تو یہ ہے کہ یہاں آپ نے صرف ہمدردی نہیں کی بلکہ بے منت ہمدردی کرنے کے اصول بھی بتلا دیئے۔ ہمدردی کا اخفاء، محتاج کی حاجت روائی کرنا پھر اس کو سبک روح رکھنا اور ایسے طریقے نکال لینا جن سے اپنے نفس کو محسن اور محتاج کو ندامت کا خطرہ بھی نہ گذر سکے۔ سر دست اس کی حاجت رفع ہو جائے اور آئندہ کے لئے اس کو سوال کی عادتِ بد بھی نہ پڑنے پائے۔ یہ ایک قیمتی سبق ہے جو ان چند واقعات سے ہم کو ملتا ہے۔

طبقۂ امام اعظمؒ ابن خلکان لکھتا ہے کہ امام صاحبؒ نے چار صحابہؓ کو پایا ہے۔ انس بن مالکؓ اور عبد اللہ بن ابی اوفیٰ کو کوفہ میں سہل بن سعد الساعدی کو مدینہ منورہ میں۔ اور ابو الطفیل عامر بن واثلہ کو مکہ مکرمہ میں۔ حافظ ذہبی خود امام صاحبؒ سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے انس بن مالکؓ صحابی کو بارہا دیکھا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ ان کے ساتھ

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۱ و ۳۶۲۔ [2] خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۲

اور بہت سے دیگر حفاظ حدیث نے حضرت انسؓ کی رویت تسلیم کی ہے. خلاف جو کچھ ہے وہ روایت کے ثبوت وعدم ثبوت میں ہے، ہمارے نزدیک ایک ایسے شخص کے متعلق جو صحابہ ہی کے عہد میں پیدا ہوا ہو رؤیت تو درکنار روایت کا دعویٰ بھی بعید نہیں بلکہ بہت ہی قرین قیاس تھا لیکن کیا کیا جائے جن پر امام صاحب کا اولادِ احرار ہونا بھی شاق ہو ان پر آپ کا طبقۂ تابعین میں شمار ہونا کیوں شاق نہ ہوتا، اس لئے یہ بھی ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن کر رہ گیا ہے. متوسط قول یہ ہے کہ رؤیت سے تو انکار نہ کیا جائے اور روایت کا قطعی طور پر دعویٰ نہ کیا جائے. اس کے سوا جو کچھ ہے وہ افراط و تفریط کا میدان ہے۔

تحصیل علم | زفر بن ھذیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے امام اعظمؒ سے سنا ہے کہ مجھے علم کلام کا پہلے اتنا شوق تھا کہ میں اس علم میں شہرۂ آفاق ہو گیا تھا. حماد بن ابی سلیمان[1] کا حلقۂ درس میرے قریب تھا. ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میرے پاس ایک عورت آئی اور اس نے مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا ایک شخص کی بی بی باندی ہے وہ سنت کے موافق اسے طلاق دینا چاہتا ہے کتنی طلاقیں دے. میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کیا جواب دوں. میں نے کہا حماد سے پوچھ اور واپس آکر مجھے بھی بتا. وہ حماد کے پاس گئی، انھوں نے فرمایا جب وہ حیض سے پاک ہو جائے تو جماع کرنے سے پہلے اسے صرف ایک طلاق دینا چاہئے. جب دو حیض اور گذر جائیں تو پھر وہ اپنا دوسرا نکاح کر سکتی ہے. اس نے واپس آکر مجھ سے ان کا جواب نقل کیا میں نے اپنے دل میں کہا کہ علم کلام بھلا کس کام کی چیز ہے اور اپنے جوتے اٹھا حماد کی خدمت میں حاضر ہو گیا وہ مسائل بیان کرتے، میں اُن کو سنتا اور یاد رکھتا. جب دوسرے دن وہ تشریف لاتے پھر ان کا اعادہ فرماتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ میں نے اُن مسائل کو صحیح ضبط کیا ہے اور ان کے دوسرے شاگردوں نے غلطیاں کی ہیں اس لئے انھوں نے فرمایا کہ میرے سامنے صدر مقام پر ابو حنیفہؒ کے سوا اور کوئی شخص نہ بیٹھے. دس سال مسلسل بلکہ ان کی وفات تک میں ان کے ساتھ رہا. حماد کے فرزند کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے والد کسی سفر میں باہر تشریف لے گئے تھے جب واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ اس اثنا میں آپ کو زیادہ یاد کس کی رہی. میرا خیال تھا وہ یہی فرمائیں گے تیری لیکن انھوں نے ابو حنیفہؒ کا نام لیا اور فرمایا کہ اگر مجھے یہ قدرت ہوتی کہ میں ابو حنیفہؒ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی نظر جدا نہ کروں تو نہ کرتا۔[2]

---

[1] حماد ابراہیم نخعی کے خاص تلامذہ میں تھے. تاریخ اصبہان میں ابو الشیخ ذکر کرتے ہیں کہ ایک دن نخعی نے ان کو ایک درہم کا گوشت لانے کے لئے بازار بھیجا. زنبیل ان کے ہاتھ میں تھی ادھر سے ان کے والد کہیں گھوڑے پر سوار آ رہے تھے یہ صورت دیکھ کر انھوں نے ان کو ڈانٹا اور زنبیل لے کر ہاتھ سے پھینک دی. جب ابراہیم نخعیؒ کی وفات ہو گئی تو حدیث کے طلبہ ان کے والد (مسلم بن یزید) کے دروازہ پر آئے اور دستک دی، یہ چراغ لیکر باہر نکلے تو انھوں نے کہا ہمیں آپ کی ضرورت نہیں. آپ کے فرزند حماد کی ضرورت ہے یہ خفیف ہو کر اندر تشریف لے آئے اور حماد سے کہا جاؤ بھئی باہر جاؤ، اب مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ مقام تمہیں ابراہیم کی زنبیل کی بدولت ہی نصیب ہوا ہے ــــ ابن عدی نے "الکامل" میں نقل کیا ہے کہ حماد فرماتے تھے میں قتادہ، طاؤس اور مجاہد سے ملا ہوں. جب ابراہیم نخعی سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے مسائل کا حل کس سے کیا کریں تو انھوں نے حماد ہی کا نام لیا تھا. (مقدمہ زیلعی)

[2] تاریخ خطیب ج ۱۳ - ص ۳۳۳ و ۳۳۴ -

روایتِ مذکورہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی عمر کا ابتدائی حصہ علمِ کلام میں صرف ہوا ہے اور زمانۂ تلمذ سے ہی آپ کی کنیت ابو حنیفہ تھی یہ تحقیق نہیں ہوسکا کہ یہ کنیت امام صاحب نے خود اختیار کی تھی یا دوسروں نے آپ کی یہ کنیت مقرر کی تھی۔ اسی روایت سے امام صاحب کے صحتِ ذوق، سلامتیٔ فطرت اور قوتِ حفظ کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ کے صرف درسِ حدیث کے صدر نشین نہ ہونے سے یہ خیال قائم کرلینا کہ آپ کا حفظ کمزور تھا بہت سطحی نظر ہے۔

ماخذِ علم | خطیب بغدادی روایت کرتا ہے کہ امیر المومنین ابو جعفر نے امام صاحبؒ سے پوچھا آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا ہے۔ فرمایا عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان کے شاگردوں کا۔ فرمایا آپ نے تو بہت صحیح اور پختہ علم حاصل کیا، یہ ہستیاں بہت مبارک اور بڑی مقدس ہستیاں تھیں۔ حضرت عمرؓ کی شان تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے ظاہر ہے کہ میرے بعد اگر کوئی شخص نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔ حضرت علیؓ تو وہ ہیں جن کو آپ نے خود اپنے دستِ مبارک سے قاضی بناکر بھیجا تھا۔ رہ گئے عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ ان کی قرآن دانی اور قرآن فہمی امت میں ضرب المثل ہوچکی ہے اب سوچئے کہ جو علم اتنے جامع اور مضبوط ماخذ سے حاصل کیا گیا ہوگا وہ کتنا عمیق اور کتنا مستحکم ہوسکتا ہے۔ نفسیاتی طریق پر بھی مسائل حنفیہ کا مرجع یہی اصحاب ہونے چاہئیں کوفہ جو امام اعظمؒ کا مسکن تھا حضرت عمرؓ ہی کا بسایا اور آباد کیا ہوا تھا پھر جو صحابی اہلِ کوفہ کی تعلیم و تربیت کے لئے سرکاری طور پر مقرر کئے گئے وہ ابنِ مسعودؓ ہی تھے حضرت علیؓ کا تو کوفہ دارالخلافت ہی رہ چکا تھا اس لئے اہلِ کوفہ کے لئے ان اصحاب میں علمی کشش کے علاوہ ایک فطری کشش بھی موجود تھی۔ کسی مجتہد کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ اس کے استفادہ کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہر ہر جزئی میں ایک مقلد کی طرح اتباع کرتا ہوگا انتہا درجہ کی ناواقفی ہے بلکہ اس کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ ان کے زیرِ تربیت رہ کر اس کا جو علمی مذاق اور اندازِ طبیعت قائم ہوچکا تھا، وہ ان حضرات ہی سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے اصولِ استنباط، اصولِ فکر، مصالح و مضار پر غور و خوض کا زاویۂ نظر سب اُن ہی سے متحد تھا۔ اس لئے دونوں کے مجتہدات اور مسائل میں ایک قسم کی یک رنگی اور یکسانیت پیدا ہوجانا بھی ضروری امر تھا۔

اصول و عقائد | یحییٰ بن ضریس کہتے ہیں میں سفیانؒ کے پاس حاضر تھا ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ کو امام صاحب پر کیا اعتراض ہے انھوں نے فرمایا اعتراض کیا ہوتا میں نے تو خود انھیں یہ فرماتے سنا ہے کہ میں سب سے پہلے قرآن کو لیتا ہوں اگر کوئی مسئلہ اس میں نہیں ملتا تو پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تلاش کرتا ہوں۔ اگر کتاب اللہ اور حدیثِ رسول دونوں میں نہیں ملتا تو پھر میں آپ کے صحابہ کے اقوال تلاش کرتا ہوں اور ان میں جو زیادہ پسند آتا ہے اُسے اختیار کرلیتا ہوں مگر ان کے اقوال سے باہر نہیں جاتا ہاں جب تابعین کا نمبر آتا ہے تو پھر ان کا اتباع کرنا لازم

نہیں سمجھتا جیسا انھوں نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کر لیتا ہوں۔ لہ

ابو یوسف روایت کرتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا خراسان میں دو قسم کے لوگ سب سے بدتر ہیں۔ جہمیہ اور مشبہہ۔ ابو یوسفؒ سے دوسری جگہ اس طرح منقول ہے کہ امام صاحب جہم بن صفوان کی مذمت کیا کرتے تھے اور اس کی باتوں پر نکتہ چینی فرماتے تھے۔ عبدالرحمٰن حمانی کہتے ہیں۔ میں نے ابو حنیفہ کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ جہم بن صفوان کافر ہے۔ یحییٰ بن نصر کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ شیخین کو دوسرے صحابہ پر فضیلت دیتے تھے ختنین سے محبت رکھتے تھے، تقدیر کے قائل تھے اور اس میں کوئی مین میخ نہیں نکالتے تھے مسح علی الخفین کرتے تھے اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے اور متقی عالم تھے۔ ؎ ابو سلیمان جوزجانی اور معلی بن منصور رازی کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ میں کسی نے قرآن کے مخلوق ہونے کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا ہاں بشر مریسی اور ابن ابی داؤد نے اس مسئلہ میں بحث شروع کی اور انھوں ہی نے امام صاحبؒ کے تلامذہ کو بدنام کیا۔ سہ

محدثین کی نظروں میں امام اعظم کی ثقاہت

امام ابو داؤدؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ مالکؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے وقت کے امام تھے شافعیؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے وقت کے امام تھے۔ ابو حنیفہؒ پر رحمت نازل فرمائے اپنے زمانہ کے امام تھے۔ ؎ امام احمدؒ جب کبھی امام ابو حنیفہؒ کے کوڑے کھانے اور قضاء قبول نہ کرنے کا واقعہ ذکر فرماتے تو رو پڑتے تھے اور امام صاحب کے لئے دعاء رحمت فرماتے۔ ۵

حسن بن علی حلوانی شبابہ سے نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کے بارے میں شعبہ اچھا خیال رکھتے تھے علی بن مدینی کہتے ہیں کہ امام صاحب سے ثوری، ابن مبارک، حماد بن زید، ہشیم، وکیع، عباد، جعفر بن عون، جیسے اجلہ محدثین نے روایت کی ہے وہ ثقہ ہیں ان کی روایت میں کوئی سقم نہیں۔ یحییٰ بن معین سے پوچھا گیا اے ابو زکریا (ان کی کنیت ہے) کیا ابو حنیفہؒ حدیث کے بارے میں سچے شمار ہوتے تھے انھوں نے فرمایا نہایت سچے اور بالکل صحیح روایت کرنے والے تھے۔ ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا، کیا ابو حنیفہ کبھی خلاف واقع بھی حدیث روایت کرتے تھے؟ فرمایا محدثین ابو حنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کے حق میں بڑی زیادتی کرتے ہیں۔ اُن کی شان اس سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھی۔ لہ

خطیب یحییٰ بن معین سے نقل کرتا ہے کہ ابو حنیفہؒ کے نزدیک حدیث روایت کرنے کے لئے یہ شرط تھی کہ وہ سننے کے بعد سے برابر یاد رہنی چاہئے اگر یاد نہ رہے تو اس کو روایت کرنا درست نہ سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ امام صاحب کے متعلق اُن سے دریافت کیا گیا تو دو بار فرمایا ثقہ ہیں ثقہ ہیں۔ ایک مرتبہ یہ کہا کہ حدیث و فقہ میں ثقہ اور

لہ خطیب ج ۱۳ ص ۳۶۸ ؎ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۶ سہ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۰ ؎ ایضاً ج ۱۳ ص ۳۷۸

؎ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۳۔ ۵ تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۴ لہ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

سچے ہیں اور خدا کے دین کے بارے میں بھروسہ کرنے کے قابل ہیں۔[1] خارجہ بن مصعب اور ابو وہب عابد کہتے ہیں کہ جو شخص مسح علی الخفین کا قائل نہ ہو یا ابو حنیفہؒ پر نکتہ چینی کرے وہ بلاشبہ ناقص العقل ہے۔[2]

حافظ ابن حجر شافعی نے امام صاحب کے مناقب نقل کر کے یحییٰ بن معین سے اس کے خلاف کوئی نقل پیش نہیں کی اور آخر تذکرہ میں لکھا ہے کہ امام صاحبؒ کے مناقب بہت ہیں اللہ تعالیٰ اُن سے راضی ہو اور جنت فردوس میں ان کو جگہ دے۔ ذہبی نے مناقب امام پر مستقل ایک تصنیف لکھی ہے۔

فقہ حنفی کا امتیاز اس عنوان پر علامہ کوثری مصری نے زیلعی کے مقدمہ میں ایک مختصر مقالہ سپرد قلم کیا ہے، ہم یہاں اس کا اختصار ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

فقہ حنفی صرف ایک شخصی رائے نہیں بلکہ چالیس علماء کی جماعتِ شوریٰ کی ترتیب دادہ ہے۔ امام طحاویؒ اسناد کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب کی یہ جماعت شوریٰ چالیس افراد پر مشتمل تھی جن میں ممتاز ہستیاں یہ تھیں۔ ابو یوسف، زفر بن الہذیل، داؤد الطائی، اسد بن عمرو، یوسف بن خالد السمتی (یہ امام شافعیؒ کے شیوخ میں ہیں) یحییٰ بن زکریا بن ابی زائدہ۔ خطیب نے امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں ان اسماء کا اور اضافہ کیا ہے۔ عافیہ الازدی، قاسم بن معن، علی بن مسہر، حبان، مندل۔

اسد بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب کی خدمت میں پہلے ایک مسئلہ کے مختلف مختلف جوابات پیش کئے جاتے پھر جو اس کا سب سے زیادہ تحقیقی جواب ہوتا آپ ارشاد فرماتے اسی طرح ایک ایک مسئلہ تین تین دن زیر بحث رہتا۔ اس کے بعد کہیں وہ لکھا جاتا تھا۔ صیمری بیان فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ امام کے ساتھ مسائل میں بحث و تمحیص کرتے اگر اس وقت قاضی عافیہ بن یزید موجود نہ ہوتے تو آپ فرماتے، اُن کے آنے تک ابھی مسئلہ کا فیصلہ ملتوی رکھو جب وہ تشریف لے آتے اور وہ بھی دوسروں کی رائے سے اتفاق کر لیتے تو امام صاحبؒ فرماتے اب اس کو لکھ لو۔ جب تک مسئلہ تحقیق و تفتیش کے یہ مراحل طے نہ کر لیتا آپ اس کو لکھنے سے منع کرتے۔ یحییٰ بن معینؒ التاریخ والعللؒ میں لکھتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ نے ایک دن امام ابو یوسفؒ سے فرمایا اے یعقوب جو کچھ مجھ سے سنا کرو اُسے فوراً ہی نہ لکھ لیا کرو کیونکہ کبھی ایک مسئلہ کے متعلق میری رائے آج کچھ ہوتی ہے اور کل کچھ ہو جاتی ہے۔ اس روایت سے موفق مکی کے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ امام صاحب کا مسلک شورائی مسلک ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اپنے تلامذہ پر اپنے مسائل تسلیم کرنے کے متعلق کبھی جبر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی پوری آزادی دی کہ وہ بہت خوشی سے اپنی اپنی رائیں پیش کریں پھر اس پر خوب جرح و قدح ہو، اس کے بعد اگر سمجھ میں آجائے تو اس کو قبول کر لیں۔

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۴۱۹ و ۴۲۰ - [2] ایضاً ج ۱۳ ص ۳۶۴ و ۳۶۸

مذکورہ بالا بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحبؒ کی مجلسِ شوریٰ نقلی و عقلی ہر دو لحاظ سے بہت
مکمل مجلس تھی۔ اس میں اگر حفاظ محدثین، عربیت و تفسیر کے جاننے والے شامل تھے تو زفر بن ہذیل جیسے میزانِ عقل
پر تولنے والے بھی موجود تھے۔ ان ہی اہلِ علم و فہم علماء کے تبادلۂ خیالات کا نتیجہ تھا کہ مسئلہ کا ہر پہلو اتنا صاف
ہو جاتا تھا اس کے مصالح و مضار سب اسطرح سامنے آجاتے تھے کہ زمانہ کی ہر ضرورت کی اس میں پوری پوری رعایت ہو جاتی تھی
خطیب امام ابو یوسفؒ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ کسی شخص نے وکیع سے کہا ابو حنیفہؒ نے اس مسئلہ میں غلطی کی
ہے۔ وکیع نے فرمایا ابو حنیفہؒ غلطی کر کیسے سکتے ہیں جبکہ ان کے ساتھ ابو یوسفؒ و زفرؒ جیسے قیاس کے ماہر، یحییٰ
بن ابی زائدہ، حفص بن غیاث، حبان و مندل جیسے حفاظ حدیث اور قاسم بن معن جیسے لغت و عربیت کے
جاننے والے۔ داؤد طائی اور فضیل بن عیاض جیسے زاہد و متقی شامل ہوں۔ اگر وہ غلطی کھائیں گے تو کیا یہ لوگ ان کی
اصلاح نہ کریں گے۔ در اصل فقہ حنفی کی عام مقبولیت کا منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا مگر اس کا یہی
کمال محدثین کی نظروں میں موجبِ نقصان بن گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عام محدثین کا طورِ فکر بالکل اس سے جداگانہ
تھا۔ وہ اس تمام غور و خوض کو رائے کی مداخلت تصور کرتے تھے اور وہ اس میں بڑی حد تک معذور بھی تھے، کیونکہ
آئینِ شریعت کی اس طرح ترتیب و تشکیل کا امت میں یہ پہلا قدم تھا اُسے اوپری نظروں سے دیکھا جانا چاہئے
تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر شدہ شدہ دوسرے اماموں کو بھی اسی ترتیب کی ضرورت محسوس ہوئی حتیٰ کہ کوئی امام
ایسا نہیں رہا جس کی فقہ بالفعل اسی مرتب شکل پر نہ آگئی ہو مگر "البادی اظلم" کے قاعدہ کے موافق اصحاب الرأی[1]
کا اولین مخاطب صرف حنفیہ رہ گئے۔

یہ مسئلہ بہت اہم اور طویل الذیل ہے کہ فقہ حنفی کے امتیازی اصول کیا کیا ہیں اور کیا اُن کو مداخلتِ رائے
سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام کا استقصار اس مختصر تذکرہ میں نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر یہاں ہم صرف
ایک دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد آپ فقہ حنفی کی گہرائی معلوم کر سکیں گے اور اس کے بعد یہ
یقین کرنا بھی آسان ہو جائے گا کہ محدثین کی فقہ حنفی سے برہمی اور حنفیہ کی معذوری دونوں اپنی اپنی جگہ بجا ہیں،
امام شاطبیؒ ابن عبد البر سے نقل کرتے ہیں کہ بہت سے محدثین امام صاحب پر طعن کرنا اس لئے جائز سمجھتے تھے کہ
کہ ان کے نزدیک آپ نے بہت سی صحیح اخبارِ آحاد کو ترک کر دیا تھا۔ حالانکہ امام صاحب کا ضابطہ یہ تھا کہ آپ
پہلے خبرِ واحد کا اُس باب کی دوسری احادیث کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھتے۔ قرآن کریم کے بیان۔ یہ بھی ان کو

[1] ربیعہ بن ابی عبد الرحمٰن جو امام مالکؒ کے استاد ہیں اپنی اسی خدمت کی وجہ سے ربیعۃ الرائی کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے
عبد العزیز بن ابی سلمہ کہتے تھے اے اہلِ عراق تم تو ربیعۃ الرائی کہتے ہو اور خدا کی قسم ہے میں نے ان سے بڑھ کر کوئی حافظ حدیث
نہیں دیکھا۔ ابن سعد فرماتے ہیں کہ یہ ثقہ اور کثیر الحدیث شخص تھے مگر اس کے باوجود ان کی طرف رائے کی نسبت اتنی مشہور ہو گئی
تھی کہ ان کا لقب ہی ربیعۃ الرائی پڑ گیا تھا۔

ملاتے. اگر وہ قرآن کریم اور ان احادیث کے بیان کے مطابق ہوجاتیں تو اُن پر عمل کر لیتے ورنہ انھیں شاذ قرار دیتے اور عمل نہ کرتے تھے [1]

انصاف کیجئے کہ ایک آئینی نظر کے لئے آئین سازی کا یہ کتنا صحیح راستہ تھا مگر جن مزاجوں میں معیارِ صحت صرف اسناد ٹھیر گیا ہو وہ اس کا نام صحیح احادیث کا ترک رکھ لیتے تھے. اس کی بہت مشہور مثال حدیث مصراۃ ہے حنفیہ پر اس مسئلہ کی وجہ سے ہمیشہ لے دے کی گئی اور یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انھوں نے محض اپنی رائے سے اس حدیث کو ترک کیا ہے. میں سمجھتا ہوں کہ اگر حنفیہ نے تاوان کے وسیع باب میں، اس قسم کا تاوان کہیں نہ دیکھا اور اس لئے یہاں بھی اس باب کے عام ضابطہ ہی پر عمل کر لیا ... تو کچھ بیجا بھی نہیں کیا. بقول حافظ ابو عمرو کون ایسا ہے جس نے ہر باب کی ہر حدیث کو من وعن تسلیم کیا ہو، اپنے استقراء واجتہاد کے بعد جب ایک حدیث کو مختار و معمول بہ بنا لیا گیا ہے تو اس کی مخالف حدیث میں سب نے تاویل و توجیہ جائز قرار دی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ حنفیہ نے اکثر مواضع میں اصول کو جزئیات پر قربان نہیں کیا. جب کسی بات میں ان کے نزدیک صاحبِ شریعت سے ایک قاعدہ کلیہ ثابت ہوگیا تو پھر انھوں نے اس کے برخلاف جزئیات کو عموماً قابلِ تاویل سمجھا ہے. مثلاً انسانی حاجت کے لئے بیٹھنے کا ایک آئین یہ ہے کہ قبلہ کو اپنے سامنے یا پشت کی جانب نہ رکھنا چاہئے. اس ضابطہ کو حنفیہ نے پہلے منقول اور معقول ہر طریق پر جانچا تو لا جب اُن کے نزدیک ادب واحترام کا یہ آئین ثابت ہوگیا تو حضرت ابنِ عمرؓ کے صرف ایک جزئی واقعہ کی بنا پر کہ انھوں نے ایکبار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قضاء حاجت کے لئے قبلہ کی جانب پشت کئے ہوئے بیٹھے دیکھا تھا. اس ضابطہ کلیہ کی تاویل نہیں کی بلکہ اس واقعہ ہی کی کوئی توجیہ کرلینا زیادہ مناسب سمجھا.

دوسری مثال نماز میں بات کرنے کا مسئلہ ہے. عام طور پر احادیث سے نماز میں بات کرنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے. قرآن کریم میں بھی یہاں کسی استثناء کی طرف ادنیٰ اشارہ نہیں ملتا صرف ایک ذوالیدین کی حدیث ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ نماز میں کسی کو سہواً اور کسی کو عمداً کچھ بات چیت کرنے کی نوبت آگئی تھی اس کے باوجود ان کی نمازوں کو فاسد نہیں سمجھا گیا. دیگر ائمہ نے اس ایک جزئی واقعہ کی وجہ سے اصل قاعدہ ہی کی تخصیص و توجیہ شروع کردی ہے حنفیہ نے یہاں بھی قاعدہ میں کوئی تخصیص نہیں کی بلکہ اس کو بدستور اپنے عموم پر قائم رکھا ہے اور اس ایک واقعہ ہی کی کوئی توجیہ یا تاویل کرنا مناسب خیال کیا ہے. اس قسم کی بہت سی مثالیں ہیں جہاں حنفیہ نے قاعدہ کلیہ کے مقابلہ میں جزئیات ہی کی تاویل کا راستہ اختیار کرلیا ہے. ضابطہ ہمیشہ ایک رہتا ہے اور جزئیات منتشر، اس لئے تاویل کرنے والوں کی صف میں زیادہ پیش پیش حنفیہ ہی نظر آنے لگے اب آپ کو اختیار ہے

---

[1] الموافقات ج ۳ ص ۲۴.

کہ اس کا نام ترکِ حدیث رکھ لیجئے یا عمل بالحدیث رکھئے۔ اسی قسم کے امتیازات ہیں جن کی بنا پر ہر دور میں امت کا نصف حصہ اسی فقہ پر عمل پیرا رہا ہے اور اسی اصولی نظر کی وجہ سے حنفی فقہ میں اتنی لچک ہے کہ اتنی دوسری فقہ میں نہیں اگر علماء انسانوں کی ضرورت اور دینِ حنیف کی سہولت دونوں کو پیش نظر رکھتے تو ان کو حنفی کتاب الحیل پر اتنا غصہ نہ آتا اور نہ وہ حنفیہ کو محض رائے کا مقلد قرار دیتے۔

امام اعظمؒ کا علمی پایہ

شداد بن حکیم فرماتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر میں نے کوئی عالم نہیں دیکھا۔ مکی بن ابراہیم نے امام صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ اپنے زمانہ کے سب سے بڑے عالم تھے۔ وکیع فرماتے ہیں میں کسی عالم سے نہیں ملا جو ابوحنیفہؒ سے زیادہ فقیہ ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں لوگ علمِ فقہ سے بے خبر پڑے ہوئے تھے، ابوحنیفہؒ نے آکر انھیں بیدار کیا ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں ہم خدا کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے، واقعی بات یہ ہے کہ ابوحنیفہؒ سے بہتر فقہ ہم نے کسی کی نہیں سنی اور اس لئے ان کے اکثر اقوال ہم نے بھی اختیار کرلئے ہیں۔ یحییٰ بن معینؒ کہتے ہیں کہ فتوے میں یحییٰ بن سعید کوفیوں کا قول اختیار کیا کرتے تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں جسے علمِ فقہ میں مہارت حاصل کرنا ہو اُسے لازم ہے کہ ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کو نہ چھوڑے کیونکہ تمام لوگ فقہ میں اُن کے محتاج ہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ فقہ تو بس امام ابوحنیفہؒ ہی کی ہے جعفر بن ربیع کہتے ہیں میں پانچ سال ابوحنیفہؒ کی خدمت میں رہا، اُن جیسا خاموش انسان میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں جب اُن سے فقہ کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو اُس وقت کھل جاتے اور دریا کی طرح بہنے لگتے تھے۔ عبداللہ بن داؤد فرماتے ہیں کہ اہلِ اسلام پر فرض ہے کہ وہ اپنی نمازوں کے بعد امام ابوحنیفہؒ کے لئے دعا کیا کریں اور اُن کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ انھوں نے امت کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں اور مسائلِ فقہ جمع کرکے رکھدیئے ہیں۔ مروح بن عبادہ کہتے ہیں کہ میں ابن جریج کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ انھیں امام صاحبؒ کے وفات کی خبر پہنچی: اُنھوں نے فوراً انا للہ کہا اور فرمایا افسوس کیسا عجیب علم جاتا رہا۔ اسی سال ابن جریج کا بھی انتقال ہوا۔[۱]

علم فقہ کا انتخاب

جو شخص امام صاحبؒ کے مناظرات وحالات سے ذرا بھی واقف ہے وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ امام صاحب کو جمیع علوم میں پوری دستگاہ حاصل تھی۔ علمِ کلام سے آپ کی ابجد شروع ہوتی ہے اور حدیث وتفسیر وفقہ تو آپ کا مشغلہ ہی تھا۔ مورخ ابن خلکان آپ کے متعلق یہ لکھتا ہے "ولم یکن یعاب بشئی سوی قلۃ العربیۃ" یعنی آپ پر قلتِ عربیت کے سوا اور کوئی نکتہ چینی نہیں کی گئی۔ اس کے اسباب بھی جو کچھ ہیں وہ تحقیق کے بعد کچھ نہیں رہتے لیکن ہم اس سلسلہ میں اُن چند اسباب کو ظاہر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جن کی بنا پر امام صاحب نے دیگر علوم کی بجائے علمِ فقہ کو اپنا دائمی مشغلہ بنا لیا تھا۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ جو شخص حدیث وقرآن نہیں جانتا وہ فقہ سے بھی کوئی مجتہدانہ مذاق نہیں رکھ سکتا۔

[۱] خطیب مناقب امام

ہمارے نزدیک اس موقعہ پر اختیاری اسباب کے ساتھ کچھ قدرتی اسباب بھی ایسے پیدا ہوگئے تھے جن کی وجہ سے فقہ ہی آپ کا سب سے بڑا مشغلہ ہوجانا چاہئے تھا۔ مناقب موفق اور تاریخ خطیب میں مذکور ہے کہ ابراہیم نخعی کی وفات کے بعد علم فقہ کی مہارت کے لحاظ سے جن پر نظریں پڑتی تھیں وہ حماد بن ابی سلیمان مفتی کوفہ تھے جب تک یہ بقید حیات رہے لوگ ان کی وجہ سے دوسروں سے بے نیاز رہے لیکن جب ان کی وفات ہوگئی تو اب اس کی ضرورت محسوس ہونے لگی، کہ لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے ان کا کوئی دوسرا جانشین ہو ادھر اُن کے تلامذہ کو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ ان کے محترم استاد کا نام اور ان کا علم کہیں ختم نہ ہوجائے۔ حماد کے ایک فرزند تھے جو اچھے عالم تھے۔ ان پر اتفاق ہوگیا کہ انھیں اپنے والد کی مسند پر بٹھا دیا جائے۔ ابوبکر نہشلی اور ابو بردۃ وغیرہ جو ان کے شاگرد تھے اب ان کے پاس آنے جانے لگے لیکن ان حضرات پر شعر و سخن کا ذوق غالب تھا یہ اس جگہ کو نبھا نہ سکے۔ پھر لوگوں کا خیال ابوبکر نہشلی کی طرف گیا ان سے درخواست کی گئی تو انھوں نے انکار کردیا۔ اس کے بعد ابوبردہ کی خدمت میں یہ مسند پیش کی گئی مگر انھوں نے بھی انکار کیا۔ آخرکار لوگوں نے امام صاحبؒ کی خدمت میں عرض کیا تو آپ نے فرمایا میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ علم فنا ہوجائے اس لئے ان کی درخواست کو منظور کرلیا اور مسند افتاء پر بیٹھ گئے۔ (مناقب موفق ج ۱ ص ۱۷۱)

واقعہ یہ ہے کہ جب مفتی کوفہ کی مسند پر بیٹھنے کے لئے قدرت نے امام صاحب ہی کو انتخاب کیا ہو تو اس جگہ کوئی دوسرا کیسے بیٹھ سکتا تھا۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ یہ امام ابوحنیفہ وہی ہیں جن کے سامنے جب منصب قضا پیش کیا گیا تو ہر سختی و ذلت برداشت کرنے کے لئے تیار ہوگئے مگر منصب قضا قبول نہ کیا۔ اور یہی ہیں کہ جب ان سے ایک آزاد علمی خدمت کی درخواست کی گئی تو فوراً قبول کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ بہرحال اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ اتفاقات سماویہ کی بنا پر علم کی جو مسند امام صاحب کے لئے مخصوص ہوچکی تھی وہ علم نبوت ہی کی گہرائیوں میں شناوری کی مسند تھی۔ اس لئے قدرتی طور پر آپ کا مشغلہ فقہ ہی بن جانا چاہئے تھا۔

حافظ ابن عبدالبر ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے اعمش نے ایک مسئلہ دریافت کیا اس وقت میرے اور اُن کے سوا وہاں کوئی اور موجود نہ تھا۔ میں نے اس کا جواب دیا انھوں نے فرمایا اے یعقوب یہ جواب تم نے کس حدیث سے اخذ کیا ہے۔ میں نے کہا اُسی حدیث سے جو آپ نے مجھ سے بیان فرمائی تھی انھوں نے فرمایا یعقوب! یہ حدیث تو مجھے تمہاری پیدائش سے بھی پہلے سے یاد تھی مگر میں آج تک اس کا یہ مطلب سمجھ سکا تھا۔

اسی قسم کا ایک واقعہ اعمش اور امام صاحب کے درمیان بھی پیش آیا ہے۔ عبیداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں اعمش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا ایک شخص ان کے پاس آیا اور ایک مسئلہ دریافت کیا وہ اس کا جواب نہ دے سکے

---

[1] خطیب ج ۱۳ ص ۳۳۲۔

دیکھا تو وہاں ابو حنیفہؒ بھی بیٹھے ہوئے تھے فرمایا اے نعمانؒ اس کے متعلق تم کچھ بولو انھوں نے فرمایا اس کا جواب یہ ہے۔ اعمشؒ نے فرمایا کہاں سے کہتے ہو؟ امام صاحبؒ نے فرمایا اسی حدیث سے جو آپ نے ہم سے روایت کی تھی۔ اس پر اعمشؒ نے کہا نحن الصیادلۃ وانتم الاطباء (تم لوگ اطبا ہو اور ہم تو عطار ہیں) یعنی عطار کے پاس صرف دواؤں کا اسٹاک ہوتا ہے وہ اس کی ترکیب و خواص نہیں جانتا، اطبا ان کے اثرات اور ترکیب بھی جانتے ہیں۔ ؎۱

خطیب بغدادی امام ابو یوسفؒ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن اُن سے اعمشؒ نے پوچھا کہ آپ کے استاد نے عبداللہ کا یہ مسئلہ کیوں ترک کر دیا کہ باندی کے آزاد ہونے سے اُس پر طلاق ہو جاتی ہے، انھوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہؓ کی اسی حدیث کی بنا پر جو آپ نے اُن سے بواسطہ ابراہیم و اسود کے نقل فرمائی تھی کہ بریرہ جب آزاد ہوئیں تو اُن کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی بلکہ ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے پہلے نکاح کو قائم رکھیں اور چاہیں تو فسخ کر دیں اس پر اعمشؒ نے کہا بے شبہ ابو حنیفہؒ نہایت سمجھدار شخص ہیں۔ امام ابو یوسفؒ کہتے ہیں کہ اعمشؒ کو امام صاحبؒ کا یہ استنباط بہت پسند آیا تھا۔ ؎۲

امام ترمذیؒ اپنی جامع میں غسلِ میت کے مسئلہ کی تحقیق کرنے کے بعد فرماتے ہیں وکذالک قال الفقہاء وھم اعلم بمعانی الحدیث۔ فقہاء نے اس حدیث کا یہی مطلب بیان کیا ہے اور حدیث کے مطالب یہی لوگ زیادہ سمجھتے ہیں۔

ان روایات سے ظاہر ہے کہ حدیث و فقہ دو علیحدہ چیزیں نہیں۔ فرق ہے تو یہ کہ۔۔ محدث کے نزدیک الفاظِ حدیث کا حفظ مقدم ہوتا ہے اور فقیہ کے نزدیک ان کے معانی کا فہم مقدم۔

نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ امام صاحب نے شغلِ فقہ صرف امت کے نفع کی خاطر اختیار فرمایا تھا اور یہ اختیار فرمایا تھا۔ الفاظِ حدیث تو محفوظ ہو ہی چکے تھے اب جس خدمت کی ضرورت تھی وہ استخراج و استنباطِ مسائل اور ان کی آئینی تشکیل و ترتیب ہی کی تھی۔ محدثین ہزاروں موجود تھے لیکن فقہ کا یہ مقام خالی پڑا ہوا تھا اس لئے امام صاحب نے اس خالی گوشہ کو پُر کرنا زیادہ ضروری سمجھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ امام صاحب فنِ حدیث و قرآن سے ناآشنا تھے۔ ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں کہ محدثین اگر الفاظِ حدیث کے ذمہ دار ہیں تو فقہاء اس کے صحیح استعمال کے جاننے والے ہیں وہ عطار ہیں تو یہ اطباء فقہ کا تمام تار و پود قرآن و حدیث سے ہی قائم ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ کبار ائمہ کی قلت روایت کو ان کی علمِ حدیث سے بے بضاعتی کی دلیل سمجھنا کسی طرح

؎۱ جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۳۰ و ۱۳۱۔ ؎۲ خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۱۔

صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ شریعت کا مأخذ کتاب وسنت ہی ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی شرعی مسائل کے استنباط و ترتیب کا ارادہ کرے گا اس کے لئے کتاب وسنت کے سوا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔ امام صاحب کی قلتِ روایت کا مبنیٰ اس علم سے بے بضاعتی نہ تھی بلکہ درحقیقت روایت و تحمل کے وہ شرائط تھے جن کا معیار آپ نے عام محدثین سے بہت بلند قائم کیا تھا۔ اس لئے آپ کے لئے روایت کا میدان بھی زیادہ وسیع نہیں رہا تھا۔ امام صاحب کے علم حدیث میں ماہر اور مجتہد ہونے کی بڑی دلیل یہ ہے کہ محدثین کے درمیان آپ کی فقہ ہمیشہ بنظرِ اعتبار دیکھی گئی ہے ایک طرف جہاں امام احمدؒ وامام شافعیؒ کا مسلک نقل کیا گیا ہے اسی کے پہلو بہ پہلو امام صاحب کا مسلک بھی نقل کیا گیا ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ محدثین کے نزدیک آپ کی فقہ بھی اسی درجہ پر معتبر تھی جیسا کہ دیگر فقہاء محدثین کی۔ خلاصہ یہ کہ ردّ و قبول کے اعتبار سے اس کا زیرِ بحث رہنا اس کی دلیل ہے کہ آپ کی فقہ بھی دیگر محدثین کی فقہ کی صف میں رہنے کے قابل تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگر ایک جماعت اُسے قبول کرتی رہی تو دوسری جماعت ترک کرتی رہی۔ [1]

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کی صحیح مراد اور اس میں مسائل کے مآخذ امام صاحب سے زیادہ جاننے والا میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا بعض مرتبہ میں آپ کی رائے چھوڑ کر کسی حدیث کے ظاہر پہلو کو اختیار کر لیتا تو بعد میں مجھے تنبہ ہوتا کہ حدیث کی صحیح مراد سمجھنے میں امام صاحب کی نظر مجھ سے زیادہ گہری تھی۔ [2]

اسرائیل جو مسلم ائمہ حدیث میں ہیں امام صاحب کی مدح میں بطریقِ تعجب فرماتے ہیں نعمان کیا خوب شخص ہیں جو احادیث مسائل فقہیہ سے متعلق ہیں وہ ان کو کیسی محفوظ ہیں اور کس خوبصورتی سے وہ ان سے مسائلِ فقہ استنباط فرماتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ محدثین میں وکیع اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے اشخاص امام اعظم کی فقہ کے مطابق فتوے دیتے تھے حافظ ابن عبد البر یحییٰ بن معین سے نقل کرتے ہیں۔

وکان (وکیع) یفتی برأی ابی حنیفۃ و	وکیع امام صاحب کی فقہ کے مطابق فتویٰ دیا کرتے تھے اور
کان یحفظ حدیثہ کلہ وکان قد سمع	آپ کی روایت کردہ تمام حدیثیں یاد کیا کرتے تھے اور انہوں
من ابی حنیفۃ حدیثا کثیرا۔ [3]	نے آپ سے بہت سی حدیثیں سنی تھیں۔

امام صاحب کے اساتذۂ محدثین کی جو تعداد علماء نے لکھی ہے وہ ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن چونکہ دیگر محدثین کی طرح خود امام نے باضابطہ روایتِ حدیث کے حلقے قائم نہیں کئے اور ترویج فقہ کو ترجیح دی، اس لئے بعد کے زمانہ میں آپ کی شانِ محدثیت نظری بن کر رہ گئی۔

---

[1] مقدمہ ص ۲۱۲۔ [2] خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۰۔ [3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹

محدثین کو امام صاحب سے وجہ نکارت

تاریخ کا یہ بھی ایک تعجب خیز ورق ہے کہ وہ ایک طرف تو امام صاحب کی تعریف و توصیف میں بکھری جاتی ہے، وہ جلی حروف میں یہ لکھ جاتی ہے کہ آپ عہدِ صحابہ میں پیدا ہوئے ورع و تقویٰ، جود و سخا، علم و فضل، خرد و عقل کے تمام کمالات آپ میں جمع تھے۔ ائمہ میں امام اعظمؒ آپ کا لقب تھا محدثین و علماء کا ایک جم غفیر ہمیشہ آپ کے زمرۂ مقلدین میں شامل رہا اور امتِ مرحومہ کا نصف سے زیادہ حصہ اب بھی آپ کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے اسی کے ساتھ وہ دوسرے ہی ورق پر دیانت و عقل کا کوئی عیب ایسا اٹھا کر نہیں رکھتی جو آپ کی ذات میں لگا نہیں دیتی۔

خطیب بغدادی نے پورے ۳۰ صفحات پر امام صاحب کا تذکرہ لکھا ہے۔ پہلے امام صاحب کے مناقب میں صفحہ کے صفحہ رنگ دیئے ہیں اس کے بعد پورے ۴۵ صفحات پر آپ کی ذات میں وہ وہ نکتہ چینیاں نقل کی ہیں جو دنیا کے پردہ پر کبھی کسی بدتر سے بدتر کافر پر بھی نہیں کی جا سکتیں، ایک متوسط عقل کا انسان ان متناقض بیانات کو پڑھ کر یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کوئی انسان بھی ایسے دو متضاد صفات کا حامل نہیں ہو سکتا یا اس کے مناقب کی یہ تمام داستان فرضی ہے یا پھر عیوب کی یہ طویل فہرست صرف مخترع حکایات اور صریح بہتان ہے۔ مورخ ابن خلکان نے خطیب کے اس غلط طرز پر حسب ذیل الفاظ میں تنقید کی ہے۔

وقد ذکر الخطیب فی تاریخہ منہا شیئا کثیرا ثم اعقب ذلک بذکر ما کان الالیق ترکہ والاضراب عنہ فمثل ھذا الامام لایشك فی دینہ ولا فی ورعہ ولا فی حفظہ ولم یکن یعاب بشیٔ سوی قلۃ العربیۃ (ج ۲ ص ۱۶۵)

یعنی خطیب نے اپنی تاریخ میں آپ کے مناقب کا بہت سا حصہ ذکر کیا ہے اس کے بعد ایسی ناگفتنی باتیں لکھی ہیں جن کا ذکر نہ کرنا اور ان سے اعراض کرنا مناسب تھا کیونکہ امام اعظمؒ جیسے شخص کے متعلق نہ دیانت میں شبہ کیا جا سکتا ہے، نہ حفظ و ورع میں آپ پر کوئی نکتہ چینی بجز قلتِ عربیت کے اور نہیں کی گئی۔

حافظ ابن عبد البرؒ مالکی کا کلام یہاں نہایت منصفانہ ہے کیونکہ تنقید کا یہ شاخسانہ صرف ایک امام صاحب کی ذات ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اور ائمہ تک بھی پھیلتا چلا گیا ہے۔ اگر دائرہ نظر کو اور وسیع کیجئے تو پھر صحابہ کا استثناء بھی مشکل نظر آتا ہے۔ غصہ اور مسرت انسانی فطرت ہے۔ ان دونوں حالتوں میں انسان کے الفاظ کا صحیح توازن قائم نہیں رہا کرتا اسی لئے غصہ کے حال میں فیصلہ کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ صرف ایک نبی کی شان ہے جس کے منہ سے غضب و رضا کے دونوں حالوں میں جنچے تلے الفاظ ہی نکلتے ہیں اب اگر انسانوں کے صرف ان جذباتی پہلوؤں سے تاریخ مرتب کر لی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پھر صحابہ کے الفاظ صحابہ کے متعلق اور ائمہ کے ائمہ کے متعلق بھی ایسے مل سکتے ہیں جن کے بعد امت کا یہ مقدس گروہ بھی زیر تنقید آ سکتا ہے۔ حافظ محمد بن ابراہیم وزیر نے امام شعبی کا کیسا بصیرت افروز مقولہ نقل کیا ہے۔

قال الشعبی حدثنا م بغضب اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فاتخذوہ دینا۔ [1]

شعبیؒ فرماتے ہیں ہم نے تو لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے باہمی غصہ کی حکایات نقل کی تھیں انھوں نے اٹھا کر انھیں عقائد کی فہرست میں داخل کر لیا۔

اس کے سوا دوسری مشکل یہ ہے کہ محدثین کے جو مبہم الفاظ آج کتب میں مدون نظر آتے ہیں کسے فرصت ہے کہ ان کے اصل معنی سمجھنے کی کوشش کرے۔ مثال کی طور پر ملاحظہ کیجئے ایک مرتبہ امام صاحب اعمش کی عیادت کے لئے گئے۔ اعمش نے کچھ روکھا پن دکھلایا اور امام صاحب کے متعلق کچھ غصہ کے الفاظ کہے۔ اس اخلاق پر اعمش کا یہ رویہ آپ کو ناگوار گذرا اور گذرنا چاہئے تھا۔ جب آپ باہر تشریف لائے تو فرمایا کہ اعمش نہ تو رمضان کے روزے رکھتا ہے اور نہ کبھی جنابت سے غسل کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی امام دین پر ان الفاظ کو کتنا ہی چسپاں کیجئے مگر چسپاں نہیں ہو سکتے اگر کہیں ان الفاظ کی تشریح ہمارے سامنے نہ ہوتی تو معلوم نہیں کہ اس مقولہ سے ہمارے خیالات کتنا کچھ پریشان ہو جاتے لیکن جب ان الفاظ کی مراد ہاتھ آگئی تو آنکھیں کھل گئیں اور معلوم ہوا کہ ائمہ غصہ کے حال میں بھی ایک دوسرے کے متعلق عوام کی طرح بے سروپا کلمات منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ چنانچہ اسی واقعہ میں جب فضل بن موسیٰ سے اس کا مطلب دریافت کیا گیا (اس واقعہ میں وہ امام صاحب کے ساتھ ساتھ تھے) تو انھوں نے فرمایا کہ اعمش التقاء ختانین سے غسل کے قائل نہ تھے بلکہ جمہور کے خلاف اسی مسئلہ پر عمل کرتے تھے جس پر کبھی ابتداء اسلام میں عمل کیا گیا تھا یعنی انزال کے بغیر غسل واجب نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض صحابہ کا مذہب یہ تھا کہ طلوع فجر کے بعد روشنی پھیلنے تک سحری کھانا درست ہے، ان دو مسئلوں کے لحاظ سے امام صاحب کی یہ دونوں باتیں بھی درست تھیں اور اعمش کا عمل بھی اپنے مختار کے مطابق درست تھا۔ [2]

اگر اسی طرح امام کے حق میں بھی بہت سے مشہور مقولوں کی مرادیں تلاش کی جائیں تو ہاتھ آسکتی ہیں اور اس کے بعد اصل بات بھی اتنی قابلِ اعتراض نہیں رہتی جیسا کہ الفاظ کی سطح سے معلوم ہوتی تھی۔ کتبِ تذکرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے محدثین کی ناراضگی کا بڑا سبب صرف اختلافِ مذاق تھا نہ کہ اختلافِ مسائل امام صاحب کے دور تک عام مذاق یہ تھا کہ مسائل کے متعلق بہت ہی محدود پیمانہ پر غور و خوض کیا جاتا تھا، صرف پیش آمدہ واقعات کا شرعی حکم وہ بھی بڑی احتیاط کے ساتھ معلوم کر لیا جاتا اس کے بعد مسئلہ کی فرضی صورتوں سے بحث کرنا ایک لایعنی مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ خطیب بغدادی نے یہاں ایک بہت دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔

نضر بن محمدؒ روایت کرتے ہیں کہ قتادہ کوفہ آئے اور ابوبردہ کے گھر اترے، ایک دن باہر نکلے تو لوگوں کی بھیڑ ان کے اردگرد جمع ہو گئی۔ قتادہ نے قسم کھا کر کہا آج جو شخص بھی حلال و حرام کا کوئی مسئلہ مجھ سے دریافت کرے گا

---

[1] الروض الباسم ج ۱ ص ۱۴۸۔ [2] دیکھو جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۵۷۔

میں اس کا ضرور جواب دونگا۔ امام ابو حنیفہ کھڑے ہوگئے اور سوال کیا اے ابو الخطاب (ان کی کنیت ہے) آپ اُس عورت کے متعلق کیا فرماتے ہیں جس کا شوہر چند سال غائب رہا اُس نے یہ یقین کرکے کہ اُس کا انتقال ہوگیا ہے اپنا دوسرا نکاح کرلیا اس کے بعد اس کا پہلا شوہر بھی آگیا اب آپ اس کے مہر کے متعلق فرمائیے کیا فرماتے ہیں اور جو بھیڑ اُن کو گھیرے کھڑی تھی اُن سے مخاطب ہوکر کہا اگر اس مسئلہ کے جواب میں یہ کوئی حدیث روایت کریں گے تو وہ غلط روایت کریں گے اور اگر اپنی رائے سے فتوے دیں گے تو وہ بھی غلط ہوگا۔ قتادہ بولے کیا خوب! کیا یہ واقعہ پیش آچکا ہے؟ امام صاحب نے فرمایا نہیں انھوں نے کہا پھر جو مسئلہ ابھی تک پیش نہیں آیا اس کا جواب مجھ سے کیوں دریافت کرتے ہو، امام صاحب نے فرمایا کہ ہم حادثہ پیش آنے سے قبل اس کے لئے تیاری کرتے ہیں تاکہ جب پیش آجائے تو اُس سے نجات کی راہ معلوم رہے۔ قتادہ ناراض ہوکر بولے خدا کی قسم ہم حلال وحرام کا کوئی مسئلہ اب میں تم سے بیان نہیں کروں گا۔ ہاں کچھ تفسیر کے متعلق پوچھنا ہو تو پوچھو اس پر امام صاحب نے ایک تفسیری سوال کیا قتادہ اس پر بھی لاجواب ہوئے اور ناراض ہوگئے۔ آخر کار غصہ ہوکر اندر تشریف لے گئے۔ [۱]

ابو عمرو نے سلف کے اس مذاق کی شہادت پر بہت سے واقعات لکھے ہیں اور بے شبہ علم وتقوٰی کے اُس دور میں مناسب بھی یہی تھا لیکن جب مقدر یہ ہوا کہ علم کا بازار سرد پڑجائے، ورع وتقوی کی جگہ جہل وفریب لے لے اِدھر روز مرہ نئے سے نئے واقعات پیش آنے لگیں تو اس سے پہلے کہ جہلا شریعت میں دست اندازی شروع کردیں یہ بھی مقدر ہوگیا کہ شریعت کی ترتیب وتہذیب ایسے ائمہ کے ہاتھوں ہوجائے جنھوں نے صحابہ وتابعین کے دور میں پرورش پائی ہو، انصاف کیجئے اگر قتادہ کے زمانہ کی یہ احتیاط اسی طرح آئندہ بھی چلی جاتی تو کیا شرعی مسائل اسی ضبط وصحت کے ساتھ جمع ہوجاتے جیسا کہ اب جمع ہوئے۔ درحقیقت یہ امام صاحب کی بڑی انجام بینی اور امت کی بروقت دستگیری تھی کہ آپ نے اُن کے سامنے شریعت کو ایک مرتب آئین بناکر رکھدیا، اسی لئے عبداللہ بن داؤد فرماتے تھے کہ امت پر آپ کا یہ حق ہے کہ وہ آپ کے لئے نمازوں کے بعد دعائیں کیا کریں۔ یہ خدمت اپنی جگہ خواہ کتنی ہی ضروری اور بروقت سہی مگر واقعہ یہ ہے کہ تھی محدثین کے مذاق کے خلاف۔ جس دور میں آثار ومرفوعات کو علیحدہ علیحدہ ضبط کرنا بھی عام دستور نہ ہو اُس دور میں صرف ابواب فقہیہ کی اونچی اونچی تعمیریں کھڑا کردینا کب قابلِ برداشت ہوسکتا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مسائل منصوصہ سے آپ ذرا قدم اِدھر اُدھر ہٹائیں گے تو آپ کو اجتہاد سے کام لینا ہوگا۔ ایسے دور میں جہاں خاموشی کے ساتھ عمل کرنے کے علاوہ ایک قدم اِدھر اُدھر اُٹھانا بھی قابلِ اعتراض نظر آتا ہو، احادیث وآیات کے اشارات، دلالات اور اقتضاء سے

---

[۱] خطیب ج ۱۳ ص ۳۴۸۔

ہزاروں مسائل اخذ کر کے اُن کو احادیث سے ایک علیحدہ شکل دیدینا گوارا کیا جا سکتا تھا۔ آخر جب آپ کا دور گذر گیا تو بعد کے علماء کے سامنے صرف پہلے علماء کی ان ناگواریوں کی نقل باقی رہ گئی۔ پھر استادی و شاگردی کے تعلقات نے حقایق کو ایسا پوشیدہ کر دیا کہ جس نے جہم کو کافر کہا تھا اُسے خود جہمی اور کافر کہا گیا۔ جس نے کتاب و سنت کے مقابلہ میں اپنی رائے ترک کرنے کی وصیت کی تھی اسی پر کتاب و سنت کی مخالفت کرنے کی تہمت رکھی گئی ہاں اگر خوش قسمتی سے ماحول کے تاثرات سے نکل کر کسی اللہ کے بندے نے تحقیق کی نظر ڈالی تو بہت جلد اس کی آنکھوں سے یہ حجاب اُٹھ گیا اور اس نے اپنے خیال سے رجوع کر لیا ورنہ تاریخ اُن ہی افواہوں پر چلتی رہی جو استادی و شاگردی کے انسلاک سے علماء کے حلقوں میں گشت لگا رہی تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کسی شخص کی زندگی میں اس کے متعلق مختلف خیالات قائم ہو سکتے ہیں اور فیصلہ کی راہ آسانی سے نہیں نکل سکتی، بہت سی زبانیں اس کی موافقت اور بہت سی اس کی مخالفت میں بولتی ہیں تو اس کی وفات کے بعد جبکہ اس کی شخصیت بھی سامنے نہیں رہتی فیصلہ کرنا کتنا مشکل ہوگا۔ اسماء الرجال کے فن میں تاریخ کی اس تاریکی کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے اور ایک معتدل مزاج انسان کے لئے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا مشکل بھی نہیں رہا لیکن تاریخ کی جو نقول اوراق میں درج ہو چکی ہیں، اُس سے ہر خیال کا انسان اگر مزاجی اعتدال نہیں رکھتا تو اپنے خیال کے موافق فائدہ اٹھانا اپنا فرض سمجھتا ہے اور اس لئے اسماء الرجال کی پیدا کردہ روشنی تاریخ کی پھیلائی ہوئی تاریکی کے دور کرنے میں بسا اوقات ناکام ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ امام صاحب پر جرح کرنے والوں کی صف پر نظر ڈالیں گے تو اُن میں زیادہ تر آپ کو وہی افراد نظر آئیں گے جو آپ کے عہدِ حیات کے بعد پیدا ہوئے ہیں یا نرے محدث ہیں فقاہت سے زیادہ بہرہ ور نہیں صرف سنی ہوئی خبریں اُن تک پہنچیں اور وقتی ماحول کی وجہ سے باور کر لی گئیں۔ یوں تو امام صاحب کے تلامذہ کا دائرہ بھی کچھ مختصر نہ تھا ایک ابوالمحاسن شافعی کی تحریر کی بنا پر ان کی جو تعداد نام و نسب کی قید کے ساتھ ثابت ہوتی ہے وہ نو سو آٹھ تک پہنچتی ہے لیکن ان میں اکثر شاگرد بسلسلہ فقہ تھے کاش آپ کا درسِ حدیث کا حلقہ بھی اسی پیمانہ پر قائم ہو جاتا تو شاید امام کی تاریخ کا نقشہ آج آپ کو کچھ دوسرا نظر آتا۔ چنانچہ حسن حنفی نے بھی اس شغل کو قائم رکھا ہے اس کے ساتھ تاریخ زیادہ بے دردی کا سلوک نہیں کر سکی۔

ذیل کے ایک ہی واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ افواہ کیا ہوتی ہے اور جب حقیقت سامنے آجاتی ہے تو پھر اس کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

عبداللہ بن المبارکؒ کہتے ہیں کہ میں شام میں امام اوزاعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے مجھ سے پوچھا اے خراسانی کوفہ میں یہ کون بدعتی شخص پیدا ہوا ہے جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے یہ سن کر میں گھر واپس آیا اور تین دن لگ کر امام صاحب کے عمدہ عمدہ مسائل انتخاب کئے۔ تیسرے دن اپنے ہاتھ میں کتاب لیکر آیا یہ اپنی مسجد کے

امام و مؤذن تھے انھوں نے دریافت کیا یہ کیا کتاب ہے میں نے اُن کے حوالہ کردی۔ اس میں وہ مسئلے بھی اُن کی نظر سے گذرے جن کے شروع میں میں نے یہ لکھدیا تھا "اور نعمان اس کے متعلق یہ فرماتے ہیں"۔ اذان دے کر جب کھڑے کھڑے وہ کتاب کا ابتدائی حصہ دیکھ چکے تو کتاب اٹھا کر اپنی آستین میں رکھ لی، اور اقامت کہکر نماز پڑھی پھر نکالی اور پڑھنا شروع کی یہاں تک کہ ختم کردی پھر مجھ سے پوچھا اے خراسانی یہ نعمان کون شخص ہیں؟ میں نے عرض کیا ایک شیخ ہیں، اُن سے عراق میں میری ملاقات ہوئی تھی، فرمایا یہ تو بڑے پایہ کے شیخ ہیں جاؤ ان سے اور علم سیکھو۔ اب میں نے کہا جی یہ تو وہی ابو حنیفہؒ ہیں جن کے پاس جانے سے بھی آپ نے مجھے منع کیا تھا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام صاحبؒ کے متعلق انھوں نے سُن کیا رکھا تھا اور جب حقیقت سامنے آئی تو بات کیا نکلی اس لئے خارجی شہادات اور واقعات سے آنکھیں بند کرکے صرف کالے کالے حروف سے تاریخ مرتب کرنا کوئی صحیح عمل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انسان میں حسد تنافس کا بھی ایک کمزور پہلو موجود ہے اس کی بدولت بہت سے تاریخی حقایق پوشیدہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سوء اتفاق سے یہاں یہ سب باتیں جمع ہو گئی ہیں۔

عبداللہ بن المبارکؒ فرماتے ہیں، میں نے حسن بن عمارہؒ کو امام ابو حنیفہؒ کے گھوڑے کی رکاب پکڑے ہوئے دیکھا، وہ امام صاحبؒ کی توصیف کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہے تھے کہ لوگ آپ کے متعلق صرف ازراہ حسد چہ میگوئیاں کرتے ہیں۔ حافظ ابن ابی داؤدؒ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہؒ کے متعلق چہ میگوئیاں کرنے والے دو ہی قسم کے لوگ ہیں یا حاسد یا ان کی شان سے ناواقف، میرے نزدیک ان دونوں میں ناواقف شخص پھر غنیمت ہے۔ وکیع کہتے ہیں کہ میں امام صاحبؒ کے پاس آیا دیکھا تو سر جھکائے کچھ فکرمند سے بیٹھے ہیں۔ مجھ سے پوچھا کدھر سے آرہے ہو میں نے کہا قاضی شریک کے پاس سے۔ آپ نے سر اٹھا کر یہ اشعار پڑھے۔

ان یحسدونی فانی غیر لائمھم	اگر لوگ مجھ پر حسد کرتے ہیں تو کریں میں تو انھیں کچھ ملامت نہیں کروں گا۔
قبلی من الناس اھل الفضل قد حسدوا	کیونکہ اہل فضل پر مجھ سے پہلے بھی لوگ حسد کرتے آئے ہیں۔
فدام لی ولھم ما بی وما بھم	میرا اور اُن کا ہمیشہ یہی شیوہ رہے گا۔
ومات اکثرنا غیظا بما یجد	اور ہم میں اکثر لوگ حسد کرکرکے مرگئے ہیں۔

وکیع کہتے ہیں شاید امام صاحبؒ کو ان کی طرف سے کوئی بات پہنچی ہوگی اس لئے انھوں نے یہ اشعار پڑھے۔

جعفر بن الحسنؒ ابو عمر کے شیخ کہتے ہیں کہ میں نے ابو حنیفہؒ کو خواب میں دیکھا تو اُن سے دریافت کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ فرمایا بخشدیا۔ میں نے کہا علم و فضل کے طفیل میں کہا بھئی فتوی تو مفتی کے لئے بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ میں نے کہا پھر۔ فرمایا، لوگوں کی اُن ناحق نکتہ چینیوں کے طفیل میں جو لوگ مجھ پر کیا کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ وہ مجھ میں نہ تھیں۔ (جامع بیان العلم۔ ج ۲ ص ۱۶۶)

ابو عمر تحریر فرماتے ہیں کہ اصحابِ حدیث نے امام صاحب کے حق میں بڑی زیادتی کی ہے اور حد سے بہت تجاوز کیا ہے آپ پر جو زیادہ سے زیادہ نکتہ چینی کی گئی ہے وہ صرف ان دو باتوں پر ایک آثار کے مقابلہ میں رائے اور قیاس کا اعتبار کرنا، دوسری ارجاء کی نسبت حالانکہ جس جگہ امام صاحب نے کسی اثر کو ترک کیا ہے کسی نہ کسی موزوں تاویل سے کیا ہے۔ اس کی نوبت بھی ان کو اس لئے آئی ہے کہ انھوں نے مسائل میں بیشتر اپنے اہل بلد کا اعتبار کیا ہے جیسے ابراہیم نخعی اور ابن مسعودؓ کے تلامذہ اس سلسلہ میں مسائل کی صورتیں فرض کرنے پھر اپنی رائے سے ان کے جوابات دینے اس پر اس کو مستحسن سمجھنے میں آپ نے اور آپ کے تلامذہ نے بھی افراط سے کام لیا ہے ان وجوہ سے سلف میں اُن سے مخالفت پیدا ہوگئی ورنہ میرے نزدیک اہلِ علم میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جسے کسی حدیث کے اختیار کرنے کے بعد کسی نہ کسی حدیث کا ترک یا تاویل یا دعوئ نسخ کرنا لازم نہ آیا ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسروں کو ایسا موقعہ کم پیش آیا ہے اور امام صاحبؒ کو زیادہ۔ اس پر ان کے ساتھ حسد اور بہتان کی مصیبت مزید براں ہے۔ لیث بن سعد کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کے ستر مسئلے مجھے ایسے معلوم ہیں جو سنت کے خلاف ہیں امام مالکؒ نے صرف اپنی رائے سے نکالے ہیں اس بارے میں اُن سے خط و کتابت بھی کر چکا ہوں۔ ابو عمر کہتے ہیں علماءِ امت میں یہ حق تو کسی کو حاصل نہیں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث صحت کو پہنچ جائے تو وہ اس کی سند میں طعن یا اسی درجہ کی حدیث سے دعوئ نسخ یا اس کے مقابلہ میں امت کا اجماع پیش کئے بغیر اس کو ترک کر دے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی عدالت ہی ساقط ہو جاتی ہے چہ جائیکہ اس کو دین کا امام مانا جائے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ امام صاحبؒ سے روایت کرنیوالے اور آپ کو ثقہ کہنے والوں کی تعداد اُن سے زیادہ ہے جنھوں نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے پھر جنھوں نے نکتہ چینی کی بھی ہے تو وہ صرف اُن ہی دو باتوں پر کی ہے جو ابھی مذکور ہوئیں پھر تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں یہ مشہور تھا کہ بزرگی و برتری کا یہ بھی ایک معیار ہے کہ اس کے متعلق لوگ افراط و تفریط کی دو راہوں پر نکل جائیں جیسا کہ حضرت علیؓ یہاں بھی ایک جماعت افراط اور دوسری تفریط میں مبتلا نظر آتی ہے۔[1] آخر میں حافظ ابو عمر بطور قاعدہ تحریر فرماتے ہیں کہ جس شخص کی عدالت صحت کے درجہ کو پہنچ چکی ہو علم کے ساتھ اس کا مشغلہ ثابت ہو چکا ہو۔ کبائر سے وہ احتراز کرتا ہو، مروت اور ہمدردی اس کا شعار ہو، اس کی بھلائیاں زیادہ ہوں اور برائیاں کم تو ایسے شخص کے بارے میں بے سروپا الزامات ہرگز قابلِ قبول نہیں ہونگے[2] سچ تو یہ ہے کہ مخلوق نے جب اپنی زبان خالق سے بند نہیں کی تو اب ہمہ و شما سے اس کی توقع فضول ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک بار دعا کی اے پروردگار بنی اسرائیل کی زبان سے میرا پیچھا چھڑا دے وحی آئی جب میں نے مخلوق کی زبان اپنے نفس سے، بند نہیں کی تو تم سے کیسے بند کر دوں۔[3]

---

[1] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۸ و ۱۴۹۔ [2] اس قاعدہ کی پوری تفصیل کے لئے طبقات الشافعیہ میں احمد بن صالح مصری اور حاکم کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے انھوں نے اس کے ہر گوشہ پر تفصیلی بحث کر دی ہے اور اس مجمل ضابطہ میں جن جن قیود شرط کی ضرورت تھی سب ذکر کر دی ہیں۔

[3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۶۳۔ [4] ایضاً ج ۲ ص ۱۶۱

امام مالک بن انس بن مالکؒ

ولادت ۹۳ھ وفات ۱۷۹ھ

آپ امت میں امام دارالہجرت کے لقب سے مشہور ہیں، دراز قامت، فربہ جسم، زردی مائل سفید رنگ، کشادہ چشم، بلند ناک اور خوبصورت تھے۔ آپ کی پیشانی کی طرف سر پر بال کم تھے۔ ریش مبارک دراز اور گھنی تھی؛ مونچھ منڈانے کو مثلہ فرماتے تھے۔ صرف لب کا بالائی حصہ ترشوا لیتے تھے اور دونوں طرف کے بال چھوڑتے تھے اس بارے میں حضرت عمرؓ کی تقلید فرماتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے حالات میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ کسی معاملہ میں متفکر ہوتے تو اپنی موچھوں پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی موچھوں کے دو طرفہ بال دراز تھے۔ آپ خوش پوشاک تھے۔ آپ کا نسب غیمان بن خثیل پر پہنچتا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اصابہ میں اس کو بصیغہ تصغیر خا معجمہ کے ساتھ ضبط کیا ہے اور دار قطنی نے جیم کے ساتھ، خثیل، عمرو بن الحارث کے فرزند تھے اور حارث کا لقب ذو اصبح تھا۔ اسی لحاظ سے آپ کو اصبحی کہتے ہیں۔ [1]

آپ تبع تابعین کے طبقہ میں تھے۔ آپ کے شیوخ اور تلامذہ کا کیا پوچھنا نووی تہذیب الاسماء میں لکھتے ہیں کہ امام کے شیوخ کی تعداد نو سو تھی جن میں تین سو تابعین اور چھ سو تبع تابعین تھے۔ سفیانؒ فرماتے تھے، رجال کی چھان بین کرنے والا مالکؒ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے تھے کہ مالکؒ کو جب حدیث کے کسی ٹکڑے میں شک پڑ جاتا تھا تو پوری کی پوری ترک کر دیتے تھے۔ وہب بن خالد کہتے ہیں کہ مشرق و مغرب کے درمیان احادیث نبویہ کے بارے میں قابل اطمینان شخص مالک سے بڑھ کر نہیں ہے۔ ترمذی صحیح اسناد کے ساتھ ابوہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں۔ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ دور دور کا سفر کریں گے لیکن "عالم مدینہ" سے بڑھ کر عالم انھیں کہیں میسر نہ آئے گا۔" سفیان بن عیینہ کے نزدیک اس حدیث کا مصداق امام مالکؒ تھے۔ خلف بن عمر کہتے ہیں، میں امام مالکؒ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ مدینہ کے قاری ابن کثیرؒ نے امام مالکؒ کو ایک پرچہ دیا، امام نے اسے پڑھا اور اپنی جانماز کے نیچے رکھ لیا جب وہ کھڑے ہوئے تو میں بھی ان کے ساتھ ہی چلنے لگا فرمایا بیٹھ جاؤ اور وہ پرچہ مجھے دیا کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں یہ خواب لکھا ہوا تھا کہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع ہیں اور آپ سے کچھ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ میں نے اس منبر کے نیچے ایک بہت بڑا خزانہ دفن کیا ہے اور مالکؒ سے کہہ رہا ہے وہ تمہیں تقسیم کر دیں گے اس لئے مالکؒ کے پاس جاؤ، لوگ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے بتاؤ مالکؒ تقسیم کریں گے یا نہیں کسی نے جواب دیا جس بات کا مالکؒ کو حکم دیا گیا ہے وہ ضرور اسے پورا کریں گے۔ اس خواب سے مالک پر گریہ طاری ہو گیا اور اتنا روئے کہ میں تو انھیں روتا ہی چھوڑ آیا۔

[1] بستان المحدثین

عبدالرحمن بن مہدی کہتے ہیں کہ ہم مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اور بولا میں چھ ماہ کی مسافت سے ایک مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں فرمایا کہو کیا ہے؟ اس نے بیان کیا آپ نے فرمایا مجھے اچھی طرح معلوم نہیں وہ حیران ہوکر بولا اچھا تو اپنے شہر والوں سے کیا کہوں، فرمایا کہدینا کہ مالکؒ نے اپنی لاعلمی کا اقرار کیا ہے۔ آپ کی ہمشیرہ سے پوچھا گیا مالکؒ گھر میں کیا کرتے ہیں فرمایا تلاوتِ قرآن۔ آپ کی محفل ایسی بارعب تھی کہ بادشاہوں اور سلاطین کو تابِ سخن نہ تھی ایک خاموشی کا عالم رہا کرتا تھا۔[1]

محدثین کے نزدیک اصح الاسانید میں بحث ہے۔ مشہور یہ ہے کہ جس کے راوی مالک نافع سے اور نافع ابن عمرؓ سے ہوں وہ اسناد سب سے صحیح ہے۔ امام زہریؒ جو آپ کے شیوخ میں شامل تھے وہ بھی آپ سے مستفید تھے۔ لیثؒ ابن مبارکؒ، امام شافعیؒ اور امام محمدؒ جیسے مشاہیر آپ کے زمرۂ تلامذہ میں داخل تھے۔ امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے، اگر مالکؒ وسفیانؒ نہ ہوتے تو حجاز کا علم ختم ہوجاتا۔ آپ کے حفظ کا یہ عالم تھا کہ جو بات ایک مرتبہ سُن لیتے پھر کبھی نہ بھولتے حدیث روایت کرنے کے لئے جب بیٹھتے تو پہلے وضو کرتے اچھی پوشاک پہنتے خوشبو لگاتے ریشِ مبارک میں کنگھی کرتے لوگوں نے اس تجمل کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی توقیر کرتا ہوں۔

عبداللہ بن المبارک روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام مالکؒ نے درسِ حدیث شروع کیا تو اثنارِ درس میں آپ کا رنگ بار بار متغیر ہوجاتا تھا مگر آپ نے نہ درسِ حدیث بند کیا نہ آپ سے حدیث کی روایت کرنے میں کسی قسم کی لغزش واقع ہوئی۔ فارغ ہونے کے بعد میں نے مزاج مبارک دریافت کیا تو فرمایا کہ اثنارِ درس میں تقریباً دس بار بچھو نے ڈنک مارا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ میں نے یہ صبر اپنی شجاعت واستقامت جتانے کے لئے نہیں کیا بلکہ صرف حدیثِ پیغمبر کی تعظیم کے لئے کیا ہے۔[2]

یافعی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ امام مالکؒ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک سے عشق تھا حتی کہ آپ اپنے ضعف وپیری کے باوجود مدینہ میں سوار نہ ہوتے اور فرمایا کرتے تھے کہ جس شہر میں آپ کا جسدِ مبارک مدفون ہو اس میں میں ہرگز سوار ہونے کی طاقت نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ ہارون رشید مدینہ طیبہ آیا اس کو پتہ معلوم ہوچکا تھا کہ امام مالکؒ نے کتاب موطا تالیف فرمائی ہے لوگ آپ لوگوں کو اُس کی تعلیم بھی دیتے ہیں۔ ہارون الرشید نے اپنے وزیر جعفر برمکی کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ سلام عرض کر دے اور یہ عرض کردے کہ آپ موطا لاکر مجھے سنادیں برمکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور امیرالمومنین کا سلام پہنچا کر اس کی درخواست پیش کی۔ امام نے جواب دیا میرا اُن سے سلام کہنا اور کہدینا کہ علم خود کسی کے پاس نہیں آیا کرتا لوگ اس کے پاس آیا کرتے ہیں جعفر واپس آیا اور امام مالکؒ کا فرمان عرض کردیا اتنے میں امام عالی مقام بھی خود تشریف لے آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ رشید نے کہا میں نے آپ کے پاس ایک پیغام بھیجا تھا آپ نے میرا حکم نہیں مانا۔

[1] تہذیب الاسمار۔ [2] بستان المحدثین۔

امام مالکؒ نے سند کے ساتھ وہ روایت سنائی جس میں زید فرماتے ہیں کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زانوئے مبارک میرے زانو پر تھا صرف کلمہ غیر اولی الضرر نازل ہوا تھا کہ اس کے وزن سے میرا زانو چور چور ہو جانے کے قریب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جس قرآن کا ایک حرف حضرت جبرئیل علیہ السلام پچاس ہزار سال[1] کی مسافت سے لے کر آئے ہوں کیا میرے لئے زیبا نہیں کہ میں بھی اس کی عزت و احترام کروں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت و بادشاہت سے نوازا ہے اگر سب سے پہلے آپ ہی اس علم کی مٹی خراب کریں گے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں آپ کی عزت برباد نہ کر دے، یہ سن کر وہ موطا سننے کے لئے آپ کے ساتھ ہو گیا۔ امام مالکؒ نے اپنے ساتھ اس کو مسند پر بٹھا لیا۔ جب موطا پڑھنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا آپ ہی مجھے پڑھ کر سنائیے۔ امام نے فرمایا عرصہ ہوا میں خود پڑھ کر سنانا چھوڑ چکا ہوں اس نے کہا اچھا تو اور لوگوں کو باہر نکال دیجئے تاکہ میں خود آپ کو سنا دوں۔ امام نے فرمایا علم کی خاصیت یہ ہے کہ اگر خاص لوگوں کی رعایت سے عام لوگوں کو اس سے محروم کر دیا جاتا ہے تو پھر خواص کو بھی اس سے نفع نہیں ہوتا۔ اس کے بعد آپ نے معن بن عیسٰی کو حکم دیا کہ وہ قرارت شروع کر دیں جب انہوں نے قرارت شروع کی تو امام نے ہارون سے کہا اے امیر المومنین اس شہر میں اہل علم کا دستور یہ ہے کہ وہ علم کے لئے تواضع کرنا پسند کرتے ہیں، ہارون یہ سن کر مسند سے اتر آیا اور سامنے آ بیٹھا اور موطا سننے لگا۔

ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان سے کسی نے شکایت کر دی کہ امام صاحب آپ کی خلافت کے مخالف ہیں اس نے آپ کے ستر کوڑے لگانے کا حکم دیدیا۔ اس کے بعد آپ کی عزت اور بڑھتی گئی گویا یہ کوڑے . . . . آپ کا زیور بن گئے منصور جب مدینہ آیا تو اس نے انتقام لینے کا ارادہ کیا امام مالکؒ نے قسم کھا کر فرمایا میں تو اس کا ایک ایک کوڑا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کی خاطر معاف کر چکا ہوں ۔ مورخین کہتے ہیں کہ یہ سزا آپ کو اس جرم میں دی گئی تھی کہ آپ نے کوئی فتوی ان کی غرض کے موافق نہیں دیا تھا۔[2]

ذہبی کا بیان ہے کہ پانچ باتیں جیسی امام مالکؒ کے حق میں جمع ہو گئی ہیں میرے علم میں کسی اور شخص میں جمع نہیں ہوئیں۔ (۱) اتنی دراز عمر اور ایسی عالی سند۔ (۲) ایسی عمدہ فہم اور اتنا وسیع علم (۳) آپ کے حجت اور صحیح الروایۃ ہونے پر ائمہ کا اتفاق۔ (۴) آپ کی عدالت، اتباعِ سنت اور دینداری پر محدثین کا اتفاق (۵) فقہ اور فتوی میں آپ کی مسلمہ مہارت۔[3]

ائمہ اربعہ میں صرف ایک آپ ہیں جن کی تصنیف فنِ حدیث کے متعلق امت کے ہاتھ میں موجود ہے بقیہ جو تصانیف دوسرے ائمہ کی طرف منسوب ہیں وہ ان کے شاگردوں کی جمع کردہ ہیں حتی کہ مسند امام احمد بھی گو اس کی تسوید خود امام موصوف

---

[1] حضرت استاد مرحوم فرماتے تھے کہ اس حکایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی مسافت کا پچاس ہزار سال کی مدت ہونا ائمہ کے درمیان بھی مشہور تھا۔ [2] شذرات الذھب۔ [3] تذکرۃ الحفاظ۔

نے کی ہے۔ مگر اس کی موجودہ ترتیب خود امام کی نہیں ہے[1]۔ ہارون الرشید کے نام بیس صفحات پر آپ کا جو خط ہے قابل دید ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں اس کا خلاصہ بھی درج نہیں کیا جا سکتا اور جو خود ہی خلاصہ ہو اس کا خلاصہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

مطرف بن عبداللہ منجملہ آپ کے نصیحت آمیز کلمات کے نقل کرتے ہیں کہ بیکار اور غلط باتوں کے پاس پھٹکنا بربادی ہے غلط بات زبان پر لانا سچائی سے دوری کی بنیاد ہے۔ اگر انسان کا دین و مروت بگڑنے لگے تو دنیا بہت بھی جمع ہو جائے پھر بھی کس کام کی ہے۔ ابن وہب کہتے ہیں کہ مالکؒ کہا کرتے تھے کہ علم آئندہ اور گھٹے گا بڑھے گا نہیں اور ہمیشہ انبیاء علیہم اور کتب سماویہ کے نزول کے بعد گھٹا ہی کرتا ہے۔ سلف میں علم ہدایت کے علوم ہی کا نام تھا۔ اس لحاظ سے اس مقولہ کے صدق میں کیا تردد ہے۔[2]

قعبنی نقل کرتے ہیں کہ میں مرض الوفات میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا سلام کرکے بیٹھ گیا دیکھا تو امام رو رہے تھے۔ میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کیسے نہ روؤں اور مجھ سے زیادہ رونے کا اور کون مستحق ہو سکتا ہے میری آرزو ہے کہ جو مسئلہ بھی میں نے اپنی رائے سے بتایا ہے ہر مسئلہ کے بدلہ میرے ایک کوڑا مارا جائے۔ کاش میں نے اپنی رائے کا ایک مسئلہ بھی نہ بتایا ہوتا مجھے گنجایش تھی کہ اس کے جوابات مجھ سے پہلے دیئے جا چکے تھے ان ہی پر سکوت کر لیتا۔ ماہِ ربیع الاول میں آپ کا انتقال ہوا اور جس تمنا میں عمر گذاری تھی آخر وہ پوری ہوئی یعنی دیار حبیب کی خاک پاک نے ہمیشہ کے لئے آپ کو اپنی آغوش میں لے لیا آپ سرزمین مدینہ ہی میں آسودۂ خواب ہیں۔

فقہ مالکی امام مالکؒ کی فقہ میں اہلِ مدینہ کے تعامل کو خاص اہمیت حاصل ہے اُن کے نزدیک مدینہ ہبط وحی ہے۔ اس کا تعامل حجت ہونا چاہیے۔ حافظ ابو عمر دراوردی سے نقل کرتے ہیں کہ امام مالکؒ جب یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر کا عمل اسی مسئلہ پر دیکھا ہے تو اُس سے ان کی مراد ربیعۃ بن ابی عبدالرحمٰن اور ابن ہرمز ہوتے ہیں[3]۔

فقہ مالکی کا زیادہ چرچا اہلِ مغرب اور اندلس میں ہے۔ ابنِ خلدون اس کی وجہ یہ لکھتا ہے کہ اہلِ مغرب اور اندلس کا سفر اکثر حجاز ہی کی جانب ہوا کرتا تھا اس زمانہ میں مدینہ طیبہ علم کا گہوارہ بن رہا تھا۔ یہیں سے نکل کر علم عراق پہنچا ہے ان کے راستہ میں عراق نہ پڑتا تھا اس لئے ان کے علم کا ماخذ صرف علماءِ مدینہ تھے علماءِ مدینہ میں امام مالکؒ کا رتبہ معلوم ہے اس لئے مغرب اور اندلس کے اصحاب کا علم امام مالکؒ اور ان کے بعد ان کے تلامذہ میں منحصر ہو گیا تھا ان ہی کے وہ مقلد تھے اور جن کا علم انھیں نہیں پہنچا ان کے وہ مقلد بھی نہیں تھے۔

---

[1] بستان المحدثین۔ [2] تذکرہ۔ [3] جامع بیان العلم ج ۲ ص ۱۴۹۔

الشافعیؒ الامام

ولادت ۱۵۰ھ وفات ۲۰۴ھ

آپ کی کنیت ابوعبداللہ اسم مبارک محمد بن ادریس بن العباس بن عثمان بن شافع ہے۔ نسباً آپ قریشی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ عبدمناف میں آپ کا نسب مل جاتا ہے۔

بیت المقدس سے دو مرحلہ کے فاصلہ پر غزہ یا عسقلان میں آپ کی ولادت ہوئی، دو سال کی عمر میں آپ کے والدین آپ کو مکہ مکرمہ لے آئے تھے۔ نہایت تنگدستی میں آپ کی پرورش ہوئی یہاں تک کہ علمی یادداشتوں کے لکھنے کے لئے جب آپ کو کاغذ بھی میسر نہ آتا تو جانوروں کی ہڈیوں پر لکھ لیتے آپ کی عمر کا ابتدائی حصہ شعر، تاریخ، ادب وغیرہ کی تحصیل میں گذرا، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں منیٰ میں تھا کہ پشت کی جانب سے مجھے ایک آواز آئی "علیک بالفقہ" فقہ سیکھ۔ اسباب ظاہر میں ایک واقعہ یہ بھی پیش آیا کہ مسلم بن خالد زنجی سے آپ کی ملاقات ہوئی، انھوں نے فرمایا صاحبزادہ کس ملک کے باشندہ ہو میں نے کہا مکہ مکرمہ کا۔ فرمایا مکان کس محلہ میں ہے؟ میں نے کہا خیف میں۔ پھر پوچھا کس قبیلہ کے ہو میں نے کہا عبدمناف کی اولاد فرمایا بہت خوب بہت خوب، اللہ تعالیٰ نے تمہیں دونوں جہان کا شرف بخشا ہے۔ اچھا یہ تھا کہ اپنی اس فہم و ذکاوت کو علم فقہ میں خرچ کرتے۔ یہ سن کر آپ نے ان کی شاگردی قبول کی ان کے بعد پھر امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ مؤطا حفظ کر چکے تھے اور آپ کی عمر کل تیرہ سال کی تھی۔ مؤطا میں شریک ہوگئے۔ جب قرأت کا وقت آیا تو آپ نے برزبان قراءت شروع کی۔ امام مالکؒ کو اس پر تعجب ہوا، اور آپ کی قراءت کو بہت پسند فرمایا جب یہ ختم کرنے کا ارادہ کرنے لگے تو فرمایا اور پڑھو اور پڑھو۔ امام مالکؒ نے ان کے حق میں فرمایا تھا کہ تم تقویٰ اپنا شعار رکھنا ایک زمانہ آئے گا کہ تم بڑے شخص ہوگے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل میں ایک نور ودیعت رکھا ہے معصیت کرکے اسے ضائع نہ کرنا اس کے بعد آپ عراق تشریف لے گئے۔ پندرہ سال کی عمر میں آپ کے شیخ مسلم بن خالد نے آپ کو فتویٰ نویسی کی اجازت دیدی تھی۔ حدیث و تفسیر، فقہ ادب و عربیت کی جملہ خصوصیات کے ساتھ آپ بڑے تیرانداز بھی تھے، دس میں ایک تیر بھی نشانہ سے خطا نہ کرتا تھا۔

نووی مقدمہ شرح مہذب میں تحریر فرماتے ہیں کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی کے فرمانے پر امام شافعیؒ نے اصول فقہ میں "الرسالہ" تصنیف فرمایا تھا (اسی وجہ سے آپ کو اصولِ فقہ کا مؤسس کہتے ہیں۔

فقہ میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ صحیح احادیث کو لیتے اور ضعیف کو ترک کردیتے تھے کسی اور مذہب میں فقہ کی تعمیر اس معیار پر نہیں کی گئی۔ عبادات کے مسائل میں آپ احتیاط کا پہلو اختیار فرمایا کرتے تھے"۔ آپ کی تصنیف کتاب الأم اور الرسالہ دونوں طبع ہوکر آج امت کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

ان تمام فضائل وکمالات کے باوجود نکتہ چینی سے آپ بھی خالی نہیں رہے حتیٰ کہ یحیٰی بن معین جیسے شخص سے آپ کے متعلق ایسے کلمات منقول ہیں جن کو سن کر آخرکار امام احمد کو یہ کہنا پڑا۔ ومن این یعرف یحیی لشافعی .. ومن جہل شیئا عاداہ بھلا یحیی بن معین امام شافعیؒ کو کیا جانیں اور جو شخص کسی کو جانتا نہیں وہ اس سے خفا ہی رہتا ہے حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ یحییٰ بن معین سے متعدد طریقوں سے ثابت ہے کہ وہ امام شافعیؒ میں کلام کرتے تھے یہاں تک کہ امام احمدؒ نے ان کو اس سے روکا اور فرمایا کہ تمہاری ان دو آنکھوں نے بھی اُس جیسا شخص نہ دیکھا ہوگا۔

تمام علم وفضل کے ساتھ سخی اس درجہ تھے کہ حمیدی ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ آپ صنعاء سے تشریف لائے تھے اس وقت آپ کے پاس دس ہزار دینار تھے۔ آپ کا خیمہ مکہ مکرمہ سے باہر لگا ہوا تھا لوگ ملاقات کے لئے آتے تھے اور آپ ان کو دینار تقسیم کرتے یہاں تک کہ بیٹھے بیٹھے آپ نے وہ تمام رقم لوگوں پر تقسیم کر ڈالی۔

ابن خلکان ربیع بن سلیمان مرادی سے نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے وفات کے بعد امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا اُن سے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا امام شافعیؒ نے فرمایا مجھے ایک سنہری کرسی پر بٹھا کر میرے اوپر تازہ بتازہ موتیوں کی بکھیر کی۔ ۱۹۵ھ میں بغداد گئے تھے دو سال وہاں قیام فرمایا پھر مکہ مکرمہ آئے ۱۹۸ھ میں پھر بغداد تشریف لے گئے۔ چند ماہ قیام فرما کر ۱۹۹ھ میں مصر آئے پھر وفات تک یہیں رہے۔ جمعہ کے دن انتقال ہوا اور بعد عصر مدفون ہوئے قبر مبارک قرافہ صغریٰ میں مخلوقِ خدا کے لئے زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

ابو عبد اللہ احمد بن حنبل الشیبانی الامام

ولادت ۱۶۴ھ وفات ۲۴۱ھ

ابن خلکان لکھتا ہے کہ آپ کی پیدائش بغداد میں ہوئی اور وہیں آپ کی وفات بھی ہوئی آپ کا مزار مبارک باب حرب میں واقع ہے یہ جگہ حرب بن عبد اللہ کی طرف منسوب ہے۔ عباس بن محمد دوری کہتے ہیں کہ آپ عرب کے مشہور خاندان بنی ذہل بن شیبان بن ثعلبہ سے متعلق تھے۔ خطیبؒ بغدادی کہتا ہے یہ عباس دوری کی غلطی ہے۔ آپ کا خاندان بنی شیبان بن ذہل بن ثعلبہ تھا۔ . . . یہ ذہل بن ثعلبہ رشتہ میں ذہل بن شیبان کا چچا ہے۔ آپ کے دو بیٹے تھے۔ صالح اور عبد اللہ اسی دوسرے بیٹے کے نام پر ابو عبد اللہ آپ کی کنیت تھی۔ آپ نہایت خوبصورت تھے قد میانہ تھا، ہلکا سرخ خضاب لگاتے تھے۔ ریش مبارک میں کچھ بال سیاہ تھے۔ سفید رنگ کے موٹے کپڑے پہنتے تھے۔ آپ کا عام لباس ازار اور عمامہ تھا اپنے زمانہ کے متفق علیہ امام تھے۔ قتیبہ آپ کو اور اسحاق بن راہویہ کو امام الدنیا کہا کرتے تھے۔ اسحاق بن ابراہیم کہتے ہیں کہ امام احمد اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان اس کی حجت ہیں۔ علی بن مدینی فرمایا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس

دین کو دو شخصوں کے ذریعہ سے عزت نصیب فرمائی ہے جیسا مجھے کوئی اور شخص ایسا معلوم نہیں ہے، پہلے شخص ظہور ارتداد کے وقت ابوبکر صدیق تھے اور دوسرے فتنہ خلقِ قرآن کے زمانہ میں امام احمد تھے۔ اسمٰعیل بن خلیل فرماتے تھے کہ اگر امام احمد بنی اسرائیل میں پیدا ہوتے تو اللہ تعالیٰ کے معجزوں میں ایک معجزہ شمار ہوتے۔ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ طلب علم کے لئے امام احمدؒ نے کوفہ، بصرہ، حرمین شریفین یمن اور شام وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی نے امام شافعیؒ امام ابویوسفؒ، وکیع بن الجراحؒ، یحییٰ بن ابی زائدہؒ وغیرہم کو آپ کے اساتذہ میں اور ائمہ ستہ میں بخاری ومسلم وابوداؤد کو تلامذہ کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ ابن خلکان لکھتا ہے کہ آپ امام شافعیؒ کے مخصوص تلامذہ میں تھے جب تک امام شافعیؒ بغداد میں رہے آپ اُن کی خدمت سے کبھی جدا نہ ہوئے جب امام شافعیؒ بغداد چھوڑ کر مصر جانے لگے تو چلتے وقت فرمایا میں نے بغداد میں ان جیسا متقی اور فقیہ شخص کسی اور کو نہیں چھوڑا۔

ربیع بن سلیمان کہتے ہیں کہ امام شافعیؒ مصر تشریف لے گئے تو مجھ سے فرمایا میرا ایک خط امام احمدؒ کو پہنچا دو اور اس کا جواب مجھے لا دو۔ میں خط لیکر بغداد پہنچا صبح کی نماز میں امام احمدؒ سے ملاقات ہوئی جب محراب سے اٹھے تو میں نے خط پیش کیا اور عرض کیا یہ امام شافعیؒ کا خط ہے۔ امام احمدؒ نے دریافت فرمایا تم نے اس کو دیکھا تو نہیں میں نے عرض کیا نہیں، اس کے بعد آپ نے مہر توڑی اور پڑھا تو آپ کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں، میں نے پوچھا اے ابوعبداللہ خیر ہے فرمایئے تو کیا لکھا ہے۔ فرمایا لکھا ہے کہ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تھا فرماتے تھے کہ ابوعبداللہ کو میرا سلام کہدو اور کہدو کہ اس کا امتحان ہوگا اور خلقِ قرآن کے قائل ہونے پر اُسے مجبور کیا جائے گا وہ اس کو منظور نہ کریں اللہ تعالیٰ اس کے صلہ میں تاقیامت ان کا علم ونام روشن رکھے گا۔ ربیع کہتے ہیں، میں نے کہا اے ابوعبداللہ بشارت مبارک ہو، فوراً امام احمدؒ نے اپنی دو قمیصوں میں نیچے والی قمیص جو جسم سے متصل تھی اتار کر مجھے انعام میں دیدی۔ میں اس کا جواب لیکر مصر آیا اور امام شافعیؒ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ امام شافعیؒ نے دریافت فرمایا بولو بشارت کے صلہ میں کیا انعام لائے ہو، میں نے کہا امام کا اُتارا ہوا کرتا ہے فرمایا کہ یہ تکلیف تو میں تجھے نہیں دے سکتا کہ وہ قمیص ہی مجھے دیدے البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اُسے پانی میں بھگو کر نچوڑ اور وہ پانی مجھے دیدے تاکہ میں اسی کو تبرک رکھوں۔ (طبقات)

اس واقعہ سے امام احمدؒ کی منقبت کے علاوہ یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ پہلے محدثین وعلماء کے درمیان کیسے تعلقات ہوئے ہیں ان کی جو کچھ جنگ تھی وہ صرف ایک اللہ کے نام پر تھی۔ اس امتحان کی مفصل روئداد شیخ تاج الدین سبکی نے طبقاتِ شافعیہ میں بیان کی ہے۔ قتیبہ بن سعید امام احمد اور وکیع کے ایک مذاکرہ کا حال نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ امام احمد دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر کھڑے ہوگئے اور سلسلہ سے سفیان کی جو روایات ہیں ان کا تذکرہ ہونے لگا۔ دونوں آپس میں کچھ ایسے محو ہوئے کہ تمام رات یونہی کھڑے کھڑے کٹ گئی اور کسی کو خبر نہ ہوئی

صبح ہونے لگی تو آپ کی باندی حاضر ہوئی اور کہا کہ زہرہ ستارہ نکل چکا ہے۔

آپ کی مشہور تصنیفات میں مسند احمد سب سے زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ حنبل بن اسحاق آپ کے بھتیجے کہتے ہیں کہ امام احمدؒ نے ہم سے کہا ہے کہ یہ کتاب میں نے سات لاکھ سے زیادہ احادیث کے ذخیرے سے منتخب کی ہے اور اس لئے منتخب کی ہے کہ مسلمانوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے لئے ایک معیار بن جائے جو حدیث اس میں مل جائے اُسے حجت سمجھا جائے جو نہ ملے اُسے حجت نہ سمجھا جائے۔ ابو زرعہؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کو دس لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ آپ کی وفات کے بعد جب آپ کی کتابوں کا تخمینہ لگایا گیا تو دس ذنٹوں کے بوجھ سے زیادہ تھا اور وہ سب آپ کو زبانی محفوظ تھیں۔ جمعہ کے دن آپ کا انتقال ہوا آپ کے جنازہ پر نمازیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ متوکل بادشاہ کے حکم سے جب نمازیوں کے قیام کی جگہ ناپی گئی تو پیمائش کے حساب سے وہ دو لاکھ پچاس ہزار آدمیوں کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی۔ ورکانی امام احمدؒ کا پڑوسی بیان کرتا ہے کہ آپ کی وفات کے دن بیس ہزار یہود و نصاریٰ اور مجوس مسلمان ہوئے تھے لیکن ذہبی نے اس حکایت کو تسلیم نہیں کیا اور منکر کہا ہے۔ احمد بن محمد کندی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمدؒ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھا اے ابو عبد اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ فرمایا بخشدیا اور مجھ سے کہا اے احمد ہمارے ہی لئے تم نے کوڑے کھائے تھے۔ میں نے عرض کیا اے پروردگار جی ہاں۔ ارشاد ہوا تو اے احمد لے میرا دیدار دیکھ لے۔" راقم الحروف کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں نے بھی اس کی راہ میں مصیبتیں جھیلی ہیں، ان کے نامۂ اعمال میں وہی ان کا سب سے زیادہ وزنی عمل ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ اسی قسم کا ایک خواب آپ امام اعظمؒ کے حالات میں بھی ملاحظہ کر چکے ہیں۔

فقہِ حنبلی کے پانچ زرّیں اصول

(۱) جب کسی مسئلہ کے متعلق صریح نص موجود ہو تو پھر کسی کے اختلاف کی پرواہ نہ کی جائے اسی لئے امام احمدؒ کے نزدیک مبتوتہ عورت کے لئے نفقہ و سکنیٰ دونوں واجب ہیں کیونکہ اس بارے میں فاطمہ بنت قیس کی صریح حدیث موجود ہے۔ حضرت عمرؓ نے اگرچہ اپنے زمانہ میں ان کے قول کو تسلیم نہیں کیا تھا لیکن امام احمدؒ نے حدیث کی صحت کے بعد ان کے خلاف کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اسی طرح ان کا مذہب یہ تھا کہ حج کو فسخ کر کے عمرہ بنایا جا سکتا ہے۔ دوسرے ائمہ اور اکثر صحابہ اس کے منکر تھے لیکن چونکہ اس کے متعلق حدیث ثابت ہو چکی ہے اس لئے یہاں بھی امام نے کسی کے اختلاف کی رعایت نہیں کی۔

(۲) جب کسی مسئلہ میں صحابی کا فتویٰ معلوم ہو جائے اور اس کے مخالف کسی صحابی کا قول معلوم نہ ہو سکے تو پھر وہی مختار ہونا چاہئے۔ ایسے مقام پر امام احمد بنظرِ احتیاط اجماع کا لفظ استعمال نہیں فرمایا کرتے تھے بلکہ یہ فرما دیتے تھے کہ مجھے اس کے خلاف کسی کا قول معلوم نہیں۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ کے نزدیک فتاویٰ صحابہ کی اہمیت حدیثِ مرسل سے بھی زیادہ تھی۔ اسحاق بن ابراہیم نے امام احمد سے پوچھا آپ کو صحیح مرسل حدیث زیادہ

محبوب ہے یا صحابی کا صحیح اثر۔ فرمایا صحابی کا صحیح اثر۔

(۳) جس مسئلہ میں صحابہ کا اختلاف ہو اس میں جس کا قول کتاب و سنت کے قریب نظر آئے اسی کو اختیار کر لینا چاہیے۔ اگر یہ ترجیح ثابت نہ ہو سکے تو پھر صحابہ کے مختلف اقوال نقل کر دینے چاہئیں اور کسی ایک قول پر جزم نہ کرنا چاہیے

(۴) اگر کسی مسئلہ میں ضعیف یا مرسل حدیث موجود ہو تو اس کو بھی قیاس پر مقدم رکھا جائے گا بشرطیکہ اُس مسئلہ کے متعلق کوئی اور حدیث یا قول صحابی یا اجماع مخالف نہ ہو۔ امام احمدؒ کے نزدیک یہاں ضعیف سے منکر یا باطل مراد نہیں بلکہ حسن لغیرہ مراد ہے۔ ان کے نزدیک حدیث کی دو ہی قسمیں تھیں صحیح و ضعیف اور حدیث حسن صحیح میں داخل تھی۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ اصول اجمالی طور پر دوسرے ائمہ کے نزدیک بھی مسلم ہیں اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے نماز میں قہقہہ نواقضِ وضو میں شمار کیا ہے حالانکہ یہ قیاس کے مخالف ہے لیکن اس کے متعلق ایک ضعیف حدیث موجود ہے لہٰذا اس کے مقابلہ میں قیاس ترک کر دیا گیا ہے۔

(۵) قیاس اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کسی مسئلہ کے متعلق منقول سامان نہ مل سکے اور وہ بھی بقدر ضرورت[1]

ضرورت تھی کہ ان اصولِ خمسہ کی تشریح کی جاتی اس کے بعد امام صاحبؒ کے اصول سے مقابلہ کر کے یہ بتایا جاتا کہ کن کن گوشوں میں ان کو اختلاف ہے اور کیوں ہے اور دلائل کی روشنی میں اقرب کیا ہے۔ مگر اس مختصر تذکرہ میں یہ مباحث کب سما سکتے ہیں پھر ائمہ کے اصولوں پر تبصرہ کرنا مجھ جیسے بے بضاعت کا کام نہیں علماء کی طرف مراجعت کی جائے

الامام القاضی یعقوب ابو یوسفؒ

ولادت ۱۱۳ھ وفات ۱۸۲ھ

کوفہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد ایک غریب آدمی تھے۔ خطیب بغدادی لکھتا ہے کہ ان کے والد نے اُن کو امام صاحب کی خدمت میں حاضری سے روکا اور کہا ابو حنیفہؒ تو صاحبِ استطاعت شخص ہیں اور تم تنگدست یہ سن کر انھوں نے امام صاحب کی خدمت میں جانا چھوڑ دیا۔ ادھر امام صاحب نے جب مجھے نہ دیکھا تو میری تلاش شروع کی۔ میں پھر حاضر ہونے لگا۔ غیر حاضری کے بعد جب آپ کے درس میں پہلے دن پہنچا تو آپ نے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا۔ میں نے کہا معاشی ضروریات اور والد کی حکم برداری۔ یہ کہہ کر میں بیٹھ گیا جب لوگ رخصت ہو گئے تو آپ نے مجھے ایک تھیلی عنایت فرمائی اور فرمایا اسے خرچ کرو اور سبق میں پابندی سے آیا کرو جب صرف ہو جائیں پھر مجھ سے کہدینا میں نے دیکھا تو اس میں سو درہم تھے اس کے بعد ہمیشہ کچھ دنوں بعد ہی آپ سو درہم دیدیا کرتے مجھے خود کبھی یہ کہنے کی نوبت نہیں آئی کہ اب میرے پاس خرچ نہیں رہا ہے۔ ہلال بن یحییٰ فرماتے ہیں تفسیر و مغازی اور تاریخ عرب کے حافظ تھے اور فقہ تو آپ کے علوم کا ایک ادنیٰ جزء تھا۔

[1] اعلام الموقعین ج ۱ ص ۲۳ تا ۲۵۔

حافظ ذہبیؒ نے آپ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور منجملہ دیگر ائمہ حدیث کے امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین کو آپ کے تلامذہ میں لکھا ہے۔ علی بن جعد فرماتے ہیں کہ میں نے ابو یوسفؒ کو فرماتے سنا ہے جو شخص یہ کہے کہ میرا ایمان جبرئیل علیہ السلام جیسا ایمان ہے وہ بدعتی ہے۔ اور آپ کے پُرحکمت مقولوں میں یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ تھوڑا علم بھی اس وقت تک تم کو نہیں آسکتا جب تک تم اپنے آپ کو ہمہ تن اس کے حوالہ نہ کردو۔ بشر بن ولید کہتے ہیں میں نے ابو یوسفؒ سے سُنا ہے، جو اندھا دھند حدیثوں کے پیچھے پڑا وہ جھوٹ میں مبتلا ہوا۔ جس نے کیمیا کے ذریعہ سے مال طلب کیا وہ فقیر بنا اور جس نے کلام کے ذریعہ سے دین کے عقائد حاصل کرنے کی کوشش کی وہ زندیق بنا۔ آپ اپنے زمانۂ قضاء میں دو دو سو رکعت یومیہ ادا فرمایا کرتے تھے۔ ان کے تذکرہ کے خاتمہ پر ذہبیؒ نے ماعز بن مالک کی حدیث ابو یوسفؒ اور ابو حنیفہؒ کی سند سے نقل کرکے لکھا ہے ھذا اسنادہ متصل عال۔ اس کی اسناد متصل اور عالی ہے۔

ابن خلکان لکھتا ہے ولم یختلف یحییٰ بن معین واحمد بن حنبل وعلی بن المدینی فی ثقتہ فی النقل یعنی نقل کے بارے میں یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور علی بن مدینی کو آپ کی ثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس مقولہ کو خطیب نے اپنی تاریخ میں بھی نقل کیا ہے۔

ابن خلکان فرماتے ہیں یہ پہلے شخص تھے جن کو قاضی القضاۃ کا خطاب دیا گیا تھا۔ ابن عماد حنبلی لکھتا ہے کہ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں اپنے زمانہ میں مشرق و مغرب میں ابو یوسف پہلے شخص تھے جن کو قاضی القضاۃ کا لقب دیا گیا تھا۔ آپ امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں سے ہیں، ۱۷ سال آپ کے ساتھ رہے .... سب سے پہلے حنفی اصول فقہ کو انھوں ہی نے مرتب فرمایا.... آپ کی وفات کے بعد معروف کرخیؒ نے خواب میں جنت میں ایک بہت عمدہ محل دیکھا پوچھا یہ کس کا ہے، کہا گیا ابو یوسفؒ قاضی کا۔ انھوں نے تعجب سے کہا ایسا محل ان کو کس خدمت کے صلہ میں ملا جواب ملا، لوگوں کو تعلیم دینے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنے کے صلہ میں۔ [1]

اپنی وفات کے وقت حسرت سے فرمایا کرتے تھے کاش میں اپنے اسی فقر کے حال میں مرجاتا اور قضاء قبول نہ کرتا۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے جان بوجھ کر کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا اور بادشاہ و رعایا میں سے فیصلہ کے باب میں کسی کی رعایت کی۔ خطیب بغدادی نے اپنی عادت کے موافق یہاں بھی امام ابو یوسفؒ کی توصیف میں پہلے تو خوب کشادہ دلی سے نقول پیش کی ہیں پھر ایک طومار اس کے خلاف لکھ مارا ہے اور لطف یہ کہ اس متناقض بیان پر دلائل کی روشنی میں کوئی محاکمہ بھی نہیں کیا۔ ابن خلکان یہاں بھی امام ابو یوسفؒ کے مناقب نقل کرکے لکھتا ہے کہ خطیب نے بڑے بڑے ائمہ حدیث سے ان کے متعلق ایسے کلمات نقل کیے جن کو کان سننا بھی گوارا نہیں کرسکتے۔ اکثر علماء آپ کو قابلِ تعظیم اور افضل سمجھتے تھے اس لئے ہم ان کا ذکر نہیں کرتے۔

---

[1] شذرات الذہب۔

امام محمد بن الحسن رح

ولادت ۱۳۵ھ وفات ۱۸۹ھ

آپ امام صاحب کے مشہور تلامذہ میں ہیں۔ امام صاحبؒ کے بعد امام ابو یوسفؒ سے تکمیل کی ہے۔ امام مالکؒ کی زبان سے آپ نے مؤطا سنا ہے اور تین سال مسلسل آپ کی خدمت میں رہے ہیں۔ امام شافعیؒ جیسا امام وقت آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتا ہے۔ ابن عماد حنبلی لکھتا ہے کہ آپ کی شان میں امام شافعیؒ کے تعریفی کلمات تواتر کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ امام محمد بن الحسنؒ سے زیادہ حلال و حرام، علل حدیث، ناسخ و منسوخ کا جاننے والا میرے علم میں کوئی اور شخص نہیں اگر لوگوں میں انصاف ہوتا تو وہ یقین کرتے کہ محمد بن الحسنؒ جیسا انہوں نے کوئی شخص اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں نے امام محمدؒ سے ایک اونٹ کے بوجھ کی برابر علم حاصل کیا ہے اگر وہ نہ ہوتے تو جو علم مجھ پر کھلا ہے نہ کھلتا۔ [1]

امام احمدؒ سے دریافت کیا گیا یہ باریک باریک مسائل آپ کے پاس کہاں سے آئے فرمایا امام محمدؒ کی کتابوں سے ابو عبیدہؒ کہتے ہیں کہ امام محمدؒ سے بڑھ کر قرآن کا عالم میں نے کوئی اور شخص نہیں دیکھا۔ مشہور ہے کہ آپ نے نوسو نوے کتابیں تصنیف کی ہیں اور وہ سب علوم دینیہ میں ہیں۔ [2]

ابن عماد حنبلی حافظ ابن عبد البرؒ سے امام شافعیؒ کے تذکرہ میں نقل کرتے ہیں ایک مرتبہ امام شافعیؒ علوی خاندان کے نو اشخاص کے ساتھ گرفتار کر کے بغداد لائے گئے۔ رشید اس وقت مقام رَقّہ میں تھا اس لئے یہ لوگ بغداد سے رقہ آئے اور اس کے سامنے پیش کئے گئے وہاں رَقّہ کے قاضی محمد بن الحسنؒ موجود تھے یہ امام شافعیؒ کے محب تھے جب ان کو معلوم ہوا کہ امام شافعیؒ ہارون رشید کی خلافت پر طعن کے الزام میں گرفتار ہو کر آرہے ہیں تو بہت بے چین ہوئے کیا کریں اور برابر اس کے منتظر رہے کہ یہ لوگ کب پیش ہوتے ہیں پیشی کے بعد اور لوگ تو قتل کر دیئے گئے۔ ایک علوی نوجوان اور امام شافعی بچ گئے۔ جب اس نوجوان کی باری آئی تو اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی بات کا دعویٰ کرتا لیکن اس کے بھی قتل کا حکم دیدیا گیا۔ اس نے کہا اگر آپ مجھے قتل ہی کرتے ہیں تو ذرا اتنی مہلت دیجئے کہ میں اپنی بوڑھی ماں کو خط لکھدوں اُسے میرے حال کا کچھ پتہ نہیں ہے آخر اس کے بھی قتل کا حکم دیدیا گیا۔ اس کے بعد پھر میرا نمبر آیا مجھ سے بھی ہارون رشید نے وہی بات دریافت کی جو اس علوی سے دریافت کی تھی۔ میں بولا اے امیر المومنین میں تو علوی ہی نہیں ہوں۔ زبردستی ان کے ساتھ گرفتار کر کے لایا گیا ہوں۔ میں بنی عبد المطلب میں ہوں اور اسی کے ساتھ کچھ علم سے شُد بُد بھی رکھتا ہوں آپ کے یہ قاضی صاحب بھی ان سب باتوں سے واقف ہیں۔ ہارون رشید نے کہا اچھا آپ محمد بن ادریس ہیں، میں نے کہا

[1] شذرات الذہب۔ [2] الفوائد البہیہ۔

اے امیرالمومنین جی ہاں۔ اس نے کہا محمد بن الحسنؒ نے مجھ سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے بعد محمد بن الحسن کی طرف مخاطب ہو کر کہا اے محمدؒ یہ کیا کہتے ہیں۔ کیا واقعہ یونہی ہے انھوں نے کہا بیشک ایسا ہی ہوا اور یہی کہ علم کے بلند میں ان کا پایہ بہت بلند ہے جو شکایت ان کی کی گئی ہے ان کی شان سے بہت دور ہے۔ اس نے کہا اچھا اب تو آپ انھیں اپنے ہمراہ لیتے جائیے میں ان کے معاملہ میں ذرا غور کرلوں۔ امام محمدؒ مجھے اپنے ساتھ لے گئے اور اس طرح وہی میری گلو خلاصی کا سبب ہوئے۔" اب اس تاریخی شہادت کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امام محمدؒ نے ہارون کے دربار میں ان کی خود شکایت کی ہوگی۔

امام محمدؒ اور کسائی نحوی کی وفات ایک ہی تاریخ میں ہوئی ہے۔ اس وقت رشید نے افسوس سے کہا تھا آج ہم مقام رَیّ میں عربیت اور فقہ کے دونوں اماموں کو ایک ساتھ دفن کر آئے۔ [1]

شیخ الاسلام ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاریؒ

ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ

امام بخاریؒ کا شجرۂ نسب امام بخاریؒ کا شجرۂ نسب یہ ہے محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن مغیرۃ بن بروزبہ[2] البخاری الجعفی۔ امام بخاریؒ کے جد اعلیٰ بروزبہ مجوسی مذہب تھے اور اسی دین پر اُن کا انتقال ہوا ہے۔ مغیرہ ان کے فرزند یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا کرتے تھے اس کے ساتھ اُن کا ایک خاص ربط بھی قائم ہو جاتا تھا جس کو وہ ولاء سے تعبیر کرتے تھے اور جیسا کہ عتق ومحالفت کے صدود ان کے یہاں وسیع تھے اسی طرح اس ولاء کی شاخیں بھی دور تک پھیلی چلی جاتی تھیں حتیٰ کہ اسی ولاء کے رشتہ سے وہ اپنی نسبتیں قائم کر لیتے تھے۔ امام بخاریؒ کو بھی جعفی اسی رشتۂ ولاء کے لحاظ سے کہا جاتا ہے ورنہ خود امام اس خاندان سے نہ تھے لیکن ان کے جد اعلیٰ چونکہ یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے اس لئے وہ جعفی کہلائے ان کے بعد پھر ان کے فرزند اسمٰعیل بھی اسی نسبت کے لحاظ سے جعفی کہے گئے۔

تاریخ ولادت ووفات نماز جمعہ کے بعد ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو علوم نبوت کا یہ آفتاب نواحی بخاریٰ سے طلوع ہوا اور عید الفطر ۲۵۶ھ سنیچر کی شب میں سمرقند کے قریب قریہ خرتنگ میں جاکر روپوش ہو گیا اور نماز ظہر کے بعد

---

[1] شذرات الذہب۔ [2] عام طور پر مورخین وشارحین نے اس لفظ کو اسی طرح ضبط کیا ہے اور اس کے معنی کسان لکھے ہیں۔ لیکن روس کے ایک مشہور عالم سے میری مکاتبت ہوئی تو انھوں نے اس لفظ کی صحیح تعریب بردازبہ قرار دی یعنی دال کے بعد الف اور زائد ہے اور اس کے معنی صیقل وماہر کے بتائے۔ یہ تصریف ونحو کے بہت بڑے عالم ہیں اور اُن بلاد کی زبانوں سے بھی پورے طور پر واقف ہیں اس لئے اُن کی تحقیق قابل اعتماد ہے۔

تدفین عمل میں آئی[1]۔ آپ نے اپنے بعد کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔

بچپن میں ردِ بصر کا واقعہ دنیا میں آکر ابھی اچھی طرح آنکھیں کھولنے بھی نہ پائے تھے کہ بصارت زائل ہوگئی۔ ان کی والدہ کو سخت صدمہ ہوا۔ بارگاہِ ایزدی میں روئیں، عجز و انکسار کے ہاتھ پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں، آخر ماں کی دعا تھی درِ استجابت وا ہوگیا اور خواب میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اُن کی بے چین و مضطرب والدہ کو بشارت دی کہ جا تیری دعا رقبول ہوگئی اور تیرے نورِ نظر کو پھر نورِ بصر عطا کر دیا گیا۔ صبح کو اٹھتی ہیں تو دیکھتی ہیں کہ بیٹے کی آنکھوں کی بینائی لوٹ آئی۔[2]

قوتِ حافظہ خطیب[3] بغدادی نے امام بخاریؒ کے طلبِ حدیث کے حالات خود ان کی زبانی اس طرح نقل کئے ہیں کہ مجھے بچپن ہی سے اللہ تعالیٰ نے حفظِ حدیث کے لئے بنایا تھا ابھی میری عمر دس سال ہی کی تھی کہ میں محدث عصر داخلی کے حلقۂ درس میں شریک ہوا کرتا تھا ایک دن اُن کی زبان سے یہ سند نکلی "سفیان عن ابی الزبیر عن ابراھیم" میں نے فوراً ٹوکا اور عرض کیا کہ ابو الزبیر تو ابراہیم سے روایت نہیں کرتے۔ داخلی نے مجھے جھڑک دیا۔ میں نے پھر گذارش کی کہ ذرا اپنی اصل کتاب کی تو مراجعت کیجئے انھوں نے اصل کتاب جا کر دیکھی اور واپس آکر مجھ سے کہا کہو میاں لڑکے پھر یہ سند ہے کس طرح؟ میں نے کہا کہ ابراہیم سے روایت کرنے والے زبیر ہیں اور یہ عدی کے فرزند ہیں ابو الزبیر نہیں۔ داخلی نے اسی وقت قلم اٹھا کر اپنے نسخہ کی اصلاح کرلی اور فرمایا جو تم نے کہا وہی درست تھا۔ اس واقعہ کے وقت ان کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی جب ان کی عمر سولہ سال کی ہوگئی تو انھوں نے عبد اللہ بن المبارک اور وکیع کی جمع کی ہوئی حدیثیں یاد کرلیں۔ اور اٹھارہ سال کی عمر میں ایک تصنیف صحابہ و تابعین کے فیصلے اور ان کے مختلف اقوال کے بارے میں مرتب کرنا شروع کر دی۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کے قریب چاندنی راتوں میں کتاب التاریخ تصنیف کی۔

حاشد بن اسمٰعیل بیان کرتے ہیں[4]، مشائخ بخاریؒ کی خدمت میں امام بخاری ہمارے ساتھ بھی جایا کرتے تھے اس وقت یہ بہت نو عمر تھے مگر یہ کچھ لکھا نہ کرتے تھے۔ ہم اُن کو بہت ملامت کرتے کہ جب تم کچھ لکھتے ہی نہیں تو خواہ مخواہ درس میں شریک کیوں ہوتے ہو، سولہ دن کے بعد انھوں نے تنگ آکر فرمایا کہ تمہاری ملامت کی حد ہوگئی ہے۔ اچھا اب لاؤ دکھلاؤ تم نے کیا لکھا ہے۔ ہم اس وقت تک پندرہ ہزار حدیثیں لکھ چکے تھے وہ سامنے رکھدیں۔ امام بخاریؒ نے وہ تمام حدیثیں برزبان اس طرح فرفر سنادیں کہ ہمیں ان کی یادداشت سے اپنے اپنے نسخوں کی تصحیح کرنا پڑی۔"

امام بخاریؒ کی اس خداداد ذکاوت و حفظ کا ہر طرف شہرہ ہو چکا تھا اس لئے جہاں جہاں جاتے اس سے

[1] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۶۔ [2] ایضاً ج ۲ ص ۶ و ۷۔ [3] ایضاً ج ۲ ص ۱۴

[4] خطیب ج ۲ ص ۱۰

آگے آگے ان کا نام پہنچ جاتا تھا۔ جب یہ تشریف لاتے تو عجب عجب انداز پر ان کے لئے مجالس امتحان مرتب ہوتیں اور ہر مجلس کے خاتمہ پر اہل مجلس کو یہ کہنا پڑتا کہ امام بخاری کے متعلق اب تک جو کچھ مبالغہ آمیز تعریفی کلمات ان کے کانوں میں پڑے تھے وہ بھی ناتمام تھے امام بخاریؒ کی شانِ رفیع اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہی ہے' ان کی طفلانہ صورت اور یہ بزرگانہ علم دیکھ دیکھ کر دنیا حیرت میں مبتلا تھی۔

بصرہ میں ایک مجلسِ امتحان کا تذکرہ

ایک مرتبہ بصرہ میں داخل ہوئے تو اسی وقت امام بخاری، امام بخاری، کا شور غل مچ گیا ہزاروں نظارہ، فقہاء و محدثین جمع ہوگئے اور ان تشنگانِ علم نے فوراً مجلسِ استفادہ آراستہ کرنے کا بندوبست کیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہو کر باادب اپنی درخواست پیش کی۔ امام ہمام نے فرمایا میں ابھی بہت نوعمر ہوں اور تم مجھ سے ایسی فرمائش کرتے ہو اچھا تو لو میں خود تمہارے شہر ہی کی ایسی حدیثیں تمہارے سامنے بیان کروں گا کہ انھیں سن کر تم بھی جدید فائدہ حاصل کروگے یہ کہہ کر حدیث "المرءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ" سنائی اور فرمایا کہ میں اس حدیث کو سالم سے بواسطہ منصور نقل کر رہا ہوں اور تمہارے شہر میں یہ روایت سالم کے علاوہ دوسرے اور اشخاص سے روایت کی جاتی ہے اس لئے تم کو یہ نفع ہوگا کہ اپنی سندوں کے ساتھ اس طریق کو بھی شامل کرلو تاکہ اور موجبِ تقویت ہو، پوری مجلس میں امام بخاری نے صرف اسی قسم کی حدیثیں سنائیں جو ان کے شہر میں مشہور تھیں لیکن جب امام بخاریؒ نے ان کو روایت کیا تو اُن کے لئے اس میں استفادے کا کوئی نہ کوئی جدید پہلو موجود تھا۔

بڑے بڑے اساتذہ و محدثین نے ان کے سامنے ایسے زمانہ میں زانوئے تلمذ تہ کیا تھا جبکہ ان کے قرطاسِ وجہ[1] پر آثارِ شباب کا ایک خط بھی نمودار نہ ہوا تھا۔ اپنے زمانہ کے مشاہیر جیسے ابوزرعہ، ابوحاتم، ترمذی، محمد بن نصر، ابن خزیمہ اور امام مسلم صحیح مسلم کے علاوہ ان سے روایت کرتے تھے۔

امام بخاریؒ کی جلالتِ قدر

ابراہیم خواص کہتے ہیں[2] کہ میں نے ابوزرعہ کو امام بخاریؒ کے سامنے بچوں کی طرح عللِ حدیث دریافت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔[3] دارمی جو عمر میں امام بخاریؒ سے بڑے تھے اور جن کے امام بخاری بھی خود معتقد تھے فرمایا کرتے تھے کہ ہم سب میں بڑے عالم، سب سے بڑے فقیہ اور علم کے لئے سب سے زیادہ جفاکش امام بخاریؒ ہیں۔ ایک مرتبہ ایک حدیث کے متعلق اُن سے پوچھا گیا اور یہ بتادیا گیا کہ امام بخاریؒ اس کو صحیح فرماتے تھے تو دارمی نے بیساختہ یہ الفاظ کہے۔

"بخاری فنِ حدیث میں مجھ سے کہیں زیادہ بصیرت رکھتے ہیں۔ خدا کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر عقلمند ہیں اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کو انھوں نے خوب ہی سمجھا ہے۔ جب قرآن پڑھنے بیٹھتے ہیں تو ہمہ تن اس کے معنی سمجھنے میں

[1] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۵۔ [2] طبقات الحفاظ ج ۲ ص ۸ [3] مقدمہ فتح الباری ج ۲ ص ۱۹۹۔

غرق ہوجاتے ہیں اور اس کے امثال اور حلال و حرام کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ کیا کہنا؟ [۱]

مطالعۂ حدیث میں شب بیداری

محمد بن ابی حاتم وراق بخاری اور محمد بن یوسف فربری (صاحب نسخہ) اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری ایک رات میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ اٹھ اٹھ کر چراغ روشن کرتے حدیث کا مطالعہ کرتے اور پھر سوجاتے۔ [۲]

تالیفِ بخاری کا سبب

صحیح بخاری کی تصنیف کا واقعہ خود اُن سے اس طرح منقول ہے کہ ایک دن یہ اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھے کہ امام اسحٰق نے فرمایا کاش تم حدیث کی کوئی ایسی کتاب جمع کرتے جس میں صرف صحیح صحیح حدیثیں ہوتیں یہ بات سب نے سنی مگر دل میں اسی کے اتری جس کے نصیب میں یہ سعادت روزِ ازل سے مقدر ہوچکی تھی۔ اس مجلس کے بعد ہی امام بخاری اس خدمت کے لئے کھڑے ہوگئے اور اس سلسلہ میں یہ خواب دیکھا کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا پنکھا جھل رہا ہوں اور مکھیاں اُڑا رہا ہوں۔ فنِ تعبیر کے ماہرین سے جب اس کی تعبیر پوچھی تو انھوں نے کہا کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے کذب و افترا کی مکھیاں اڑاؤ گے۔ [۳]

تالیفِ بخاری میں حیرت انگیز شرائط کا التزام

غرض امام بخاریؒ نے کمرِ ہمت کس لی اور اُن چھ لاکھ حدیثوں میں سے جو اُن کے حافظہ میں محفوظ تھیں، سخت سے سخت شرط کے مطابق حدیثیں انتخاب کرنا شروع کردیں۔ صرف ذکاوت و حفظ ہی کا زور خرچ نہیں کیا بلکہ خلوصِ نیت تقویٰ و طہارت کے آخری مرحلے بھی ختم کرڈالے یعنی جب کوئی حدیث لکھنے کا ارادہ کرتے تو پہلے غسل فرماتے، دو رکعت نماز نفل ادا کرتے پھر کہیں کتاب میں ایک حدیث درج کرتے۔ اسی طرح جب فقہی و حدیثی اشارات کے لئے تراجم و ابواب قائم کرتے اس وقت بھی یہی عمل کرتے۔ عبدالقدوس بن ہمام اپنے چند مشائخ سے ناقل ہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کے تراجم "ریاض الجنہ" میں بیٹھکر لکھے ہیں اس جانکاہی اور ریاضت کے ساتھ سولہ سال کی مدت میں یہ عظیم الشان اور عدیم النظیر کتاب مکمل ہوئی اور صفحۂ ہستی پر ایک ایسی تصنیف وجود میں آگئی جس کا لقب کسی تردد کے بغیر "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" قرار پایا۔ امت کے لاکھوں اور کروروں محدثین و علماء نے سخت سے سخت کسوٹی پر اس کو کسا، بہت کچھ سعی و کوشش کے بعد وقت وار سال کی چہ میگوئیاں ضرور کی گئیں مگر جو لقب اس تصنیف کا مشہور ہوچکا تھا وہ پتھر کی لکیر تھا، نہ مٹنا تھا نہ مٹا۔

خلوصِ نیت کے آثارِ برکت

اس میں برکت کا یہ عالم ہوا کہ نوے ہزار اشخاص نے اس کتاب کو بلاواسطہ امام بخاریؒ سے سنا، اس کی ۵۳ شرحیں لکھی گئیں جن میں بعض بعض شرح چودہ چودہ ضخیم جلدوں کی ہے

---

[۱] مقدمہ بخاری [۲] تاریخ خلیب ج ۲ ص ۱۳ و ۱۴ [۳] ایضاً ج ۲ ص ۸ [۴] ایضاً ج ۲ ص ۹ [۵] خطیب ج ۲ ص ۱۴۔

۲۲ مستخرج لکھے گئے۔ محدثین کو چھوڑ کر نحویوں اور صرفیوں نے بھی اعراب و تصریف کی جو خدمت بن پڑی کی حتی کہ جب متون و تراجم اعراب و نسخ کی تمام خدمتیں ختم ہو گئیں تو خدمت بخاری کی فہرست میں نام درج کرانے والے مشتاقوں نے قرآن کریم کی طرح اس کے حروفِ ہجی ہی شمار کر ڈالے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے جو کام اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لئے کیا جاتا ہے اس کے آثارِ قبولیت دنیا میں بھی ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

بخاری شریف کی علمی خصوصیات کے متعلق اگر کچھ لکھا جائے تو بغیر کسی مبالغہ کے اس کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ عوام کا تو ذکر ہی کیا بعض خواص کے ذہن میں بھی اتنا ہی ہے کہ یہ کتاب صحیح حدیثوں کا مجموعہ ہے لیکن جن کو کتاب بخاری پر کافی غور و مطالعہ کا وقت ملا ہے۔ انھیں یہ کتاب اصول و عقائد، عبادات و معاملات، غزوات و سیر، اسلامی معاشرت و تمدن، سیاست و سلطنت کی ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا نظر آتی ہے۔

خودداری امام بخاریؒ کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ عمر بن حفص اشقر کہتے ہیں۔ بصرہ میں ہم اور وہ ساتھ ہی علم کی تحصیل کرتے تھے۔ ایک دن امام بخاریؒ درس میں نہ آئے، ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس تن پوشی کے لئے کپڑے نہیں ہیں لیکن امام نے اس مرحلہ پر بھی اپنی فطری غیرت کی قربانی برداشت نہ کی۔ اور اپنے بے تکلف رفقاء سے بھی اس راز کو راز ہی کے درجہ میں رکھا۔ اُن کا یہ حال دیکھ کر فوراً کپڑے مہیا کئے گئے اس کے بعد امام بخاریؒ پھر اُسی طرح پابندی کے ساتھ درس گاہ میں آنے لگے۔ ؎۲

ایک مرتبہ خالد بن احمد امیر بخارا نے درخواست کی کہ وہ ان کی مجلس میں آ کر اپنی تصنیف جامع اور تاریخ اس کو سنا دیں۔ امام نے اس سے صاف انکار کر دیا تو دوسرے درجہ پر اُس نے اِس کے لئے مجبور کیا کہ شاہزادوں ہی کے لئے ایک مجلس ایسی مخصوص کر دیں جس میں ان کے سوا کوئی دوسرا شریک نہ ہو سکے۔ مگر امام بخاریؒ نے علم نبوی کی دولت کی تقسیم میں یہ تخصیص بھی گوارا نہ کی۔ آخر یہ ناگواریاں اتنی بڑھتی گئیں کہ امام بخاریؒ کو اپنا وطنِ مالوف چھوڑ دینا پڑا۔ ؎۳

خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا علم دربدر مارے مارے پھر کر ہزاروں مصائب جھیل کر حاصل کیا اور جب اُس بے بہا خزانہ کو اپنے سینہ میں جمع کر لیا تو اپنے مورث اقدس کی طرح ہر خاص و عام کے سامنے اس کو بے منت لٹا دیا، اس کی خود عزت کی، دنیا کی نظروں میں اس کا احترام قائم کیا اور اسی کے احترام کی خاطر وطن سے بے وطن ہوئے، جان دیدی مگر علم کی آن بان اسی طرح قائم رکھی۔

؎۱ حضرت استاد مرحوم فرماتے تھے کہ یہ نسخہ میں نے خود دیکھا ہے بلکہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ بھی فرمایا تھا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔ ؎۲ تاریخ خطیب ج ۲ ص ۱۳ ؎۳ ایضاً ج ۲ ص ۳۳۔

سانحۂ وفات | تذکروں میں لکھا ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ چند صحابہ کے ساتھ کھڑے کسی کا انتظار فرما رہے ہیں انھوں نے باادب سلام عرض کیا آپ نے جواب سلام دیا. انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کس کا انتظار ہے؟ فرمایا محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ آرہے ہیں. ان کے انتظار میں ہوں جب امام بخاریؒ کی وفات کی خبر ان کو پہنچی انھوں نے حساب لگایا تو ان کی وفات کا ٹھیک وہی وقت نکلا جس میں ...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں منتظر دیکھا تھا[۱] - خرتنگ میں دفن ہوئے،

آپ کی قبر سے مشک و عنبر سے زیادہ عمدہ خوشبو پھوٹی یہ عجیب ماجرا دیکھکر لوگ ٹوٹ پڑے اور اس مٹی کو تبرک سمجھ کر لوٹ لوٹ کرلے جانے لگے. حتیٰ کہ مزار مبارک کا نشان باقی رکھنے کے لئے اس کا انتظام کرنا پڑا کہ اس کی مٹی لوگ نہ لیجا سکیں لوگوں کو اس مٹی کی خوشبو پر تعجب ہوگا لیکن ہمیں اس پر کوئی تعجب نہیں ہے ؎

جمالِ ہمنشیں درمن اثر کرد   وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ابو محمد عبد اللہ بن عبد الرحمٰن بن الفضل بن بہرام الدارمی

ولادت ۱۸۱ھ وفات ۲۵۵ھ

جس سال عبد اللہ بن المبارک کی وفات ہوئی ہے اسی سال حافظ دارمی کی ولادت ہوئی ہے، دیانت، علم، اجتہاد، اور عبادت میں ضرب المثل تھے. حدیث کی تلاش میں بلادِ اسلامیہ کا دور دور سفر کیا ہے. ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا ہے کہ دارمی اپنے زمانہ کے امام تھے. مسلم صاحب صحیح، ترمذی، ابوداؤد صاحبِ سنن اور امام احمدؒ کے فرزند جیسے ائمہ حدیث ان کی تلامذہ کی فہرست میں داخل ہیں. حافظ ذہبی تحریر فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے بھی سننِ صغریٰ کے علاوہ ان سے روایت کی ہے. امام احمدؒ کے فرزند اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ خراسان میں چار شخص حافظِ حدیث ہیں. ابوزرعہ رازی. محمد بن اسمٰعیل بخاری. عبد اللہ ابن عبد الرحمٰن دارمی. حسن بن شجاع بلخی.

مسند دارمی آپ کی مشہور تصنیف ہے اس کو مسند کہنا محدثین کی اصطلاح کے خلاف ہے اس کتاب میں ثلاثیات سب کتابوں سے زیادہ ہیں. مجموعۂ کتاب تین ہزار پانچسو ستاون حدیثوں پر مشتمل ہے. عرفہ کے دن آپ کی وفات ہوئی اور عید اضحیٰ جمعہ کے دن مدفون ہوئے. امام بخاریؒ کو جب ان کے وفات کی خبر پہنچی تو انتہائی صدمہ سے سر جھکا لیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور بے ساختہ آپ کی زبان سے حسرت آمیز شعر

---

[۱] تاریخ خطیب ج ۲ ص ۳۴ ۵۳ مقدمہ فتح الباری

نکل گیا حالانکہ بجز اُن اشعار کے جو حدیث میں روایت کئے گئے ہیں آپ کبھی کوئی شعر نہیں پڑھتے تھے۔

ان تبق تفجع بالاحبۃ کلھا — اگر تو زندہ رہیگا تو تمام دوستوں کی مفارقت کا درد تجھ ہی کو اٹھانا پڑے گا۔

وفناء نفسک لا اباک اجمع — مگر تیری موت کا سانحہ ان سب سے دردناک ہے۔

اسی سنہ میں نیشاپور کے مشہور محدث عبدالرحمٰن اور واسط کے محمد بن حرب نسائی اور دمشق کے موسیٰ بن عامر اور گروہ کرامیہ کے بانی محمد بن کرام کی وفات ہوئی۔ [۱]

ابوداؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی

ولادت سنہ ۲۰۲ھ وفات سنہ ۲۷۵ھ

سجستانی کی تحقیق میں یہاں مؤرخ ابن خلکان نے ایک مشہور غلطی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بصرہ میں ایک قریہ کا نام ہے۔ شیخ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں کہ یہ ان کا وہم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ سیستان قندھار و چشت کے قریب ایک مقام ہے یہ نسبت اسی کی طرف ہے اور سجزی کی نسبت بھی اسی کی طرف ہے انھوں نے مصر و شام، حجاز و عراق اور خراسان وغیرہ بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ حفظ و اتقان، روایت و عبادت، تقویٰ و صلاح میں یگانۂ روزگار تھے۔ حاکم کہا کرتے تھے کہ ابوداؤد کسی پس وپیش کے بغیر اپنے زمانہ کے امام تھے۔ موسیٰ بن ابراہیم جو اُن کے معاصر تھے فرمایا کرتے تھے کہ ابوداؤد دنیا میں حدیث کے لئے اور آخرت میں جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ابراہیم بن حربی کا مقولہ ہے کہ علم حدیث ابوداؤد کے لئے اس طرح نرم کردیا گیا تھا جیسا حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا۔ حافظ سلفی نے بھی اس مضمون کو دہرایا ہے اور اس کو نظم کردیا ہے۔ ترمذی و نسائی جیسے ائمہ حدیث ان کے تلامذہ میں شمار ہیں۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود امام احمدؒ تو ان کے اساتذہ میں ہیں لیکن امام احمدؒ کے بعض استادوں نے اُن سے روایت کی ہے بلکہ امام احمدؒ نے بھی عتیرہ کی حدیث ان سے روایت کی ہے۔

سننِ ابی داؤد ان کی مشہور تصنیف ہے اس میں ۴۸۰۰ حدیثیں حسن و صحیح جمع کی ہیں۔ اور اپنے نزدیک کوئی ایسی حدیث درج نہیں کی جو قابلِ حجت نہ ہو۔ ابوداؤد نے جب اس کتاب کو امام احمدؒ کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے بہت پسند فرمایا۔ ان کے فقہی مسلک میں اختلاف ہے۔ ابنِ خلکان نے لکھا ہے کہ شیخ ابواسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں انھیں حنبلیوں میں شمار کیا ہے۔ حافظ ذہبی کے بیان سے بھی

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵ دبستان المحدثین۔

ہی قیاس ہوتا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ابوداؤدؒ اپنے عام طور، طریق میں امام احمدؒ کے قدم بقدم تھے۔ اور امام احمد وکیع کے اور وکیع سفیان کے اور سفیان منصور کے اور منصور ابراہیم کے اور ابراہیم علقمہ کے اور علقمہ ابن مسعودؓ کے اور ابنِ مسعودؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔

لباس میں آپ کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ اپنے قمیص کی ایک آستین فراخ اور دوسری تنگ رکھا کرتے تھے، جب آپ سے سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا ایک آستین تو اس لئے کشادہ رکھتا ہوں کہ اس میں اپنی کتاب کے کچھ اجزاء رکھ لوں دوسری آستین کشادہ رکھنا اسراف میں داخل سمجھتا ہوں۔ آپ کا مرقدِ مبارک بصرہ میں ہے۔[1]

حجۃ الاسلام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری النیشاپوری

ولادت ۲۰۶ھ وفات ۲۶۱ھ

حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں مشہور یہ ہے کہ ان کی ولادت ۲۰۴ھ میں ہوئی ہے لیکن مورخ ابنِ خلکان نے لکھا ہے کہ میں نے کسی حافظ کو ان کے سنہ ولادت کی تصریح کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ۲۰۰ھ کے بعد ہے۔ میرے شیخ حافظ ابن الصلاح ضرور کچھ تصریح فرماتے تھے مگر جہاں تک میرا گمان ہے اُن کے نزدیک سن ولادت ۲۰۶ھ تھا اور اس کا اصل ماخذ حاکم کی ایک تصنیف تھی لیکن جب مجھے اصل کتاب دستیاب ہوگئی اور وہ نسخہ میری ملکیت میں آگیا تو اس میں سنہ ولادت کی بجائے صرف سنہ وفات ۲۶۱ھ لکھا ہوا تھا۔ ہاں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ ان کی عمر ۵۵ سال کی ہوئی ہے اس حساب سے ان کی ولادت ۲۰۶ھ میں ثابت ہوتی ہے۔

ابوالحسین کنیت، عساکرالدین لقب اور مسلم ان کا اسم گرامی تھا۔ بنی قشیر عرب کے مشہور قبیلہ کی طرف منسوب تھے۔ نیشاپور خراسان میں ایک بہت خوبصورت اور بڑا شہر ہے اس لحاظ سے نیشاپوری بھی کہے جاتے تھے۔ ابوزرعہ اور ابوحاتم نے ان کی امامتِ حدیث کی گواہی دی ہے۔ ابوحاتم رازی اور ابن خزیمہ ان سے روایت کرنے والوں کی فہرست میں داخل ہیں۔ امام ترمذیؒ نے بھی ان سے ایک روایت کی ہے۔ بہت کثیرالتصانیف شخص تھے۔ صحیح مسلم ان کی تصانیف میں اس پایہ کی کتاب ہے کہ بعض مغاربہ نے اس کے متعلق یہ الفاظ تک کہدیئے ہیں کہ آسمان کے نیچے اس سے زیادہ کوئی صحیح کتاب نہیں یہ دعویٰ اپنی جگہ جیسا کچھ بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ تصنیف فنِ حدیث کے بہت سے عجائبات پر مشتمل ہے۔ سرد اسانید، متون کا حسن سیاق، تلخیص طرق اور ضبطِ انتشار میں صحیح بخاری پر بھی فائق ہے۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۲ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۴ و بستان المحدثین۔

ابن عقدہ فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی اکثر روایات اہل شام سے بطریق مناولہ ہیں یعنی ان کی کتابوں سے لی گئی ہیں خود اُن کے مؤلفین سے نہیں سنی گئیں اس لئے ان کے راویوں میں کبھی کبھی امام بخاریؒ سے غلطی واقع ہو جاتی ہے ایک ہی راوی کہیں اپنی کنیت اور کہیں اپنے نام سے مذکور ہوتا ہے امام بخاریؒ اس کو دو شخص سمجھ لیتے ہیں۔ یہ مغالطہ امام مسلم کو پیش نہیں آتا۔ نیز حدیث میں امام بخاریؒ کے تصرفات مثلاً تقدیم و تاخیر حذف و اختصار کی وجہ سے بعض مرتبہ تعقید پیدا ہو جاتی ہے ہر چند کہ خود بخاری ہی کے دوسرے طرق دیکھکر وہ صاف بھی ہو جاتی ہے لیکن امام مسلم نے یہ طریقہ ہی اختیار نہیں کیا بلکہ متونِ حدیث کو موتیوں کی لڑی کی طرح اس طرح مرتب روایت کیا ہے کہ تعقید کی بجائے اس کے معانی اور چمکتے چلے جاتے ہیں۔

خطیب بغدادی ان کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ انھوں نے حدیث کی تلاش میں عراق، حجاز، مصر، شام وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ قتیبہ، اسحاق بن راہویہ، امام احمد جیسے ائمہ اور اجلۂ محدثین سے علم حاصل کیا ہے۔ ابتدا میں امام بخاریؒ سے کچھ مانوس نہ تھے لیکن جب امام بخاریؒ آخر عمر میں نیشاپور پہنچے اور امام مسلمؒ نے ان کی محیر العقول حدیث کی معرفت اپنی آنکھوں سے دیکھی تو ان کے تمام پہلے خیالات، عقیدت اور جذبات محبت سے بدل گئے۔ امام کی آنکھوں کو بوسہ دیا اور قدموں کو بوسہ دینے کی خواہش ظاہر کی۔ استاد الاساتذین سید المحدثین طبیب الحدیث فی علله کے محبت بھرے خطابات سے یاد کیا۔ خلق قرآن کے مسئلہ میں محمد بن یحییٰ ذہلی اور امام بخاریؒ کا اختلاف جب حد سے بڑھ گیا حتیٰ کہ ذہلی نے یہ اعلان کر دیا کہ جو امام بخاریؒ کے مشرب پر ہو وہ ہمارے حلقۂ درس میں شریک نہ ہو تو یہ سن کر اکثر لوگ امام بخاریؒ سے کٹ گئے۔ لیکن ایک امام مسلم تھے جو علوم بخاری کچھ ایسے مخمور ہو چلے تھے کہ انھیں کسی دوسرے محدث کے علوم میں اب کوئی ذائقہ ہی نہ آتا تھا فوراً چادر سنبھال عمامہ سر پر رکھ، ذہلی کی مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے علوم کا جو ذخیرہ اب تک حاصل کیا تھا وہ بھی ایک خادم کے سر پر رکھکر ان کے مکان پر واپس کر دیا اور امام بخاریؒ کے مقابلہ میں اپنے استاد محمد بن یحییٰ ذہلی کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہدیا۔

ان کی وفات کے بعد ابو حاتم رازی نے ان کو خواب میں دیکھا حال پوچھا تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت کو میرے لئے مباح کر دیا ہے جہاں چاہتا ہوں پھرتا ہوں۔ ابو علی زاغونی کو ایک ثقہ شخص نے خواب میں دیکھا اور اُن سے پوچھا کس عمل سے آپ کی نجات ہوئی انھوں نے، صحیح مسلم کے چند اجزار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ان اجزار کی بدولت۔

(تاریخ خطیب ج ۱۳ ص ۱۰۰۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۵۰ و ابن خلکان ج ۲ ص ۹۱)

ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ الترمذی

ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۹ھ

شیخ تقی الدینؒ فرماتے ہیں کہ ترمذی تا کے کسرہ کے ساتھ قریب قریب متواتر ہے۔ نہر جیحون کے کنارہ پہ ایک قدیم شہر ہے۔ لفظ ماوراء النہر میں نہر سے بیشتر یہی نہر مراد لی گئی ہے۔ یہ امام بخاریؒ کے سب سے مشہور تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ خود امام بخاری سے ان کے حق میں بہت سے کلماتِ تعریف منقول ہیں۔ محدثین ان کو امام بخاریؒ کا خلیفہ کہتے ہیں، ان کے افتخار کے لئے یہ کافی ہے کہ خود امام بخاریؒ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ مسلم، ابوداؤد اور ان کے شیوخ سے بھی روایت کرتے ہیں۔ کوفہ، بصرہ، رَیّ، خراسان اور حجاز میں طلبِ حدیث کے لئے سالہا سال سفر کرتے رہے ہیں۔ ان کا واقعہ مشہور ہے کہ ایک شیخ کی روایات کے دو جزء انھوں نے نقل کئے تھے مگر اب تک ان کو پڑھ کر سنانے کا موقعہ نہ ملا تھا۔ مکہ مکرمہ کے راستہ میں اتفاقاً اُن سے ملاقات ہو گئی۔ ترمذی نے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر اُن سے ان اجزاء کے قراءت کی درخواست پیش کی۔ شیخ نے قبول فرمایا اور کہا ان اجزاء کو نکال لو، میں پڑھتا ہوں تم مقابلہ کرتے جاؤ۔ امام ترمذیؒ نے تلاش کیا تو اتفاقاً وہ اجزاء ان کے ساتھ نہ تھے۔ ترمذی بہت گھبرائے لیکن اس وقت ان کی سمجھ میں سوائے اس کے اور کچھ نہ آیا کہ دو اجزاء اور سادے کاغذ کے ہاتھ میں لیکر فرضی طور پر سننے میں مشغول ہو جائیں۔ شیخ نے قراءت شروع کی اتفاقاً ان کی نظر کاغذات پر پڑ گئی تو سادے نظر آئے۔ شیخ کو طیش آیا اور فرمایا کیا میرا مذاق بناتے ہو ترمذی نے مجبوراً جو واقعہ تھا صاف عرض کر دیا اور کہا اگرچہ وہ اجزاء میرے ساتھ نہیں ہیں لیکن مجھے لکھے ہوئے سے زیادہ محفوظ ہیں۔ شیخ نے فرمایا اچھا ذرا پڑھ کر تو سناؤ۔ ترمذی نے وہ تمام حدیثیں پڑھ کر سنا دیں۔ شیخ بہت متعجب ہوئے اور فرمایا یقین نہیں آتا کہ صرف میرے ایک بار پڑھنے سے یہ سب حدیثیں تم کو محفوظ ہو گئی ہوں گی۔ ترمذی نے عرض کیا اچھا اب امتحان کر لیجئے۔ شیخ نے خاص اپنی چالیس حدیثیں اور پڑھیں ترمذی نے فوراً ان کو بھی اس صحت کے ساتھ سنا دیا کہ کہیں ایک جگہ غلطی نہیں ہوئی۔ اس ایک واقعہ کے علاوہ ان کے حفظ کے اور بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

جامع ترمذی ان کی بہت مشہور اور مقبول تصنیف ہے۔ مجموعی حدیثی فوائد کے لحاظ سے اس کتاب کو تمام کتابوں پر فوقیت دی گئی ہے۔ عراقیین و حجازیین دونوں کے مسائل پر علیحدہ علیحدہ باب قائم کرتے ہیں ہر باب کے تحت میں اگرچہ حدیث کا ذخیرہ تفصیلاً تو زیادہ پیش نہیں کرتے لیکن اس باب میں جتنے صحابہ کی حدیثیں ان کے زیرِ نظر ہوتی ہیں سب کی طرف صحابہ کے نام گنوا کر اشارات کر جاتے ہیں۔ رواۃ کی

جرح و تعدیل مشہور اسماء کی کنیتیں اور مشہور کنیتوں کے اسماء سلف کا تعامل، ائمہ کے مذاہب پر تقریباً ہر باب میں تنبیہ کرتے چلے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے اگرچہ یہ کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے مختصر ہے لیکن فوائد کے لحاظ سے بہت بڑی کتاب ہے۔ ترمذی سے پہلے بھی گو حدیث کی ثلاثی تقسیم کا پتہ ملتا ہے مگر حسن و صحیح کو ہر جگہ اتنا روشن کرنے والے یہی پہلے شخص ہیں۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں دو حدیثوں کے علاوہ کوئی حدیث ایسی نہیں ہے جس پر امت میں کسی نہ کسی کا عمل نہ ہو۔ [1]

حفظ و اتقان، علم و فہم کے ساتھ بہت خدا ترس بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ کا خوف و خشیۃ ان پر اتنا غالب تھا کہ روتے روتے آخر کار ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

ان کی کنیت ابوعیسیٰ تھی۔ ابوداؤد میں اس کنیت کی ممانعت منقول ہے۔ شارحینِ حدیث نے اس کی مختلف توجیہات نقل کی ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے بستان المحدثین میں عام شارحین کے علاوہ ایک جدید توجیہ کی بھی مراجعت کی جائے۔

ابوعبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابنِ ماجۃ الربعی

ولادت ۲۰۹ھ وفات ۲۷۳ھ

لفظ ماجہ جیم کی تخفیف کے ساتھ ہے صحیح یہ ہے کہ یہ ان کی والدہ کا نام تھا۔

ابویعلیٰ خلیلی فرماتے ہیں کہ ابنِ ماجہ متفق علیہ ثقہ تھے۔ فنِ حدیث و تفسیر کے علاوہ علم تاریخ کے بھی بڑے عالم تھے ان کا قول قابلِ حجت تھا۔ حدیث کی تلاش میں انھوں نے کوفہ، بصرہ، عراق، شام مکہ مکرمہ اور مصر وغیرہ کا سفر کیا ہے۔ سنن ابنِ ماجہ حدیث میں ان کی مشہور تصنیف ہے۔ یہ کتاب چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔ ابنِ ماجہ فرماتے ہیں کہ تصنیف کرنے کے بعد جب یہ کتاب میں نے حافظ ابوزرعہ کے سامنے پیش کی تو انھوں نے فرمایا کہ اس کتاب میں تیس سے زیادہ ضعیف حدیثیں نہیں ہیں۔ حافظ ذہبیؒ لکھتے ہیں کہ اگر چند کمزور حدیثیں اس میں نہ ہوتیں تو یہ کتاب بہت عمدہ ہوتی۔ [2]

---

[1] حضرت استاذؒ فرماتے تھے کہ ترمذی کی اس تصریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حدیث پر عمل کرنے کے لئے صرف سند کی قوت درکار نہیں ورنہ ترمذی کی بہت سی وہ حدیثیں جن پر خود انھوں نے ضعف کا حکم لگایا ہے معمول بہ کیسے ہو سکتی ہیں۔

[2] تذکرۃ ج ۲ ص ۱۸۷ و ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۴۔ بستان المحدثین

[3] تذکرۃ ج ۲ ص ۱۸۹ و ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۴۔

ابو عبد الرحمٰن احمد بن شعیب النسائی

ولادت ۲۱۵ھ وفات ۳۰۳ھ

نسا، خراسان میں ایک مشہور شہر ہے۔ اس کی طرف نسبت میں نسوی بھی کہا جاتا ہے۔ بہت بڑے حافظ حدیث تھے۔ ذہبی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ سے پوچھا مسلم زیادہ حفظ رکھتے ہیں یا نسائی، فرمایا نسائی۔[1] پھر میں نے اپنے والد سے یہی سوال کیا انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔

ابن ظاہر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سعد بن علی زنجانی سے میں نے ایک شخص کا حال دریافت کیا انھوں نے اس کو ثقہ فرمایا۔ میں نے کہا نسائی تو اس کو ضعیف کہتے تھے فرمایا عزیز من راویوں کے متعلق نسائی کی شرائط بخاری و مسلم سے بھی زیادہ سخت تھیں۔ ابن الحداد شافعی فرماتے ہیں کہ میں اپنے اور اللہ کے مابین نسائی کو واسطہ بنا چکا ہوں۔ طلب حدیث کے لئے انھوں نے حجاز، عراق، شام اور مصر وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ بڑے بڑے شیوخ سے ملاقات کی تھی۔ سب سے پہلے یہ قتیبہ بن سعد کے پاس گئے ہیں اس وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی اور ایک سال دو ماہ ان کی خدمت میں قیام کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ فروع میں یہ شافعی مسلک پر تھے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ پہلے انھوں نے سنن کبریٰ تصنیف فرمائی تھی۔ امیر وقت نے اُن سے پوچھا کہ اس کتاب میں جتنی حدیثیں آپ نے جمع کی ہیں کیا وہ سب صحیح ہیں۔ فرمایا نہیں حسن بھی ہیں۔ اس نے کہا میرے لئے ایک ایسا مجموعہ مرتب فرما دیجئے جس میں صرف صحیح حدیثیں ہوں۔ اس کے بعد امام نے سنن صغریٰ[2] تالیف کی جس کو مجتبیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی وفات کا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ حضرت علیؓ اور اہل بیت کے مناقب لکھ کر فارغ ہو گئے تو انھوں نے چاہا کہ ان کو دمشق کی جامع مسجد میں پڑھ کر سنائیں تاکہ بنو امیہ کی سلطنت کے اثر سے عوام میں ناصبیت کی طرف جو رجحان پیدا ہو گیا تھا اس کی اصلاح ہو جائے۔ ابھی اس کا تھوڑا سا حصہ ہی پڑھنے پائے تھے کہ ایک شخص نے پوچھا امیر معاویہؓ کے فضائل کے متعلق بھی آپ نے کچھ لکھا ہے؟ نسائی نے جواب دیا اگر وہ برابر سرابر چھوٹ جائیں تو بسا غنیمت ہے مناقب تو اُن کے کہاں ہیں۔ پھر کیا تھا لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور شیعہ، شیعہ، کہہ کر اتنا مارا کہ نیم جان کر دیا، خادم انھیں اٹھا کر گھر لے آئے۔ امام نسائی نے فرمایا مجھے ابھی مکہ مکرمہ پہنچاؤ تاکہ میرا آخر وقت وہیں ہو۔ کہتے ہیں کہ جب امام مکہ مکرمہ پہنچے تو ان کا انتقال ہو گیا اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کئے گئے۔ (تذکرہ ج ۲ ص ۲۴۱ والطبقات ج ۲ ص ۸۳ وابن خلکان ج ۱ ص ۳۱)

---

[1] واضح رہے کہ جو سوال و جواب یہاں مذکور ہے وہ خود امام مسلم و نسائی کے متعلق ہے، ان کی تصنیفات کے متعلق نہیں ہے مسلم کی کتاب نسائی سے بلاشبہ زیادہ صحیح ہے۔ [2] واضح رہے کہ بعض مرتبہ شارحین سنن نسائی کا حوالہ دیتے ہیں اور وہ حدیث سنن صغریٰ میں نہیں ملتی ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا سہو ہے حالانکہ ان کی مراد سنن کبریٰ ہوتی ہے۔

احمد بن محمد ابو جعفر الطحاوی الامام

ولادت ۲۳۷ھ وفات ۳۲۱ھ

ابوجعفر ان کی کنیت ہے اور طحا مصر میں ایک قریہ ہے اسی کی طرف یہ منسوب ہیں۔ ابواسحٰق شیرازی طبقات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں حنفیہ کی سیادت کا ان پر خاتمہ تھا۔ ذہبیؒ نے ان کو علامہ اور حافظ کے لقب سے یاد کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ تصانیفِ عجیبہ کے مالک تھے۔ ابنِ یونس نے ان کے حق میں ثقہ، ثبت، فقیہ اور عاقل کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔

مزنی ان کے ماموں تھے اور اُن ہی کی زیرِ تربیت انھوں نے ابتداء میں تعلیم حاصل کی ہے اور اسی لئے شافعی مسلک رکھتے تھے ایک دن کسی بات پر ناراض ہو کر مزنی نے ان سے فرمایا خدا کی قسم … تجھ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ یہ سُن کر امام طحاویؒ کو بہت غیرت آئی اور وہاں سے اٹھ کر قاضی ابن ابی عمران حنفی کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور حنفی مذہب میں ایسی مہارت پیدا کی کہ اپنے زمانہ میں تو کیا بعد کے زمانوں میں بھی حنفیوں کے مقتدا کہلائے۔ امام طحاویؒ کے انتقالِ مسلک کے سلسلہ میں عام طور پر اسی واقعہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ صرف اتنی سی بات کسی شاگرد کو اپنے استاد کا مسلک چھوڑنے کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کا اصل سبب خود امام طحاویؒ کی زبانی ہی کیوں نہ معلوم کیا جائے۔

مورخ ابنِ خلکان نقل کرتا ہے کہ امام طحاوی سے پوچھا گیا آپ نے اپنے ماموں کے خلاف حنفی مسلک کیوں اختیار فرمایا۔ امام نے جواب دیا اس لئے کہ میں اپنے ماموں کو اکثر حنفی مسلک کی کتابوں کا مطالعہ کرتے دیکھا کرتا تھا اس لئے میں نے بھی اس مسلک کو اختیار کر لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ البتہ معقول ہو سکتی ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ اس ارادہ کا ظہور امام مزنی کی اس ناراضگی پر ہوا ہو۔

امام طحاویؒ بہت کثیر التصانیف[1] شخص ہیں۔ اختلاف العلماء اور شروط کے موضوع پر ان کے علاوہ کسی نے کم قلم اٹھایا ہے۔ تاریخِ کبیر، احکام القرآن، معانی الآثار اور آخر میں مشکل الآثار ان کی بہت مشہور تصنیفیں ہیں۔ حافظ ابنِ حزم اندلسی تو طحاوی کی تصانیف کو مُوطا مالک پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک اگر ان کا یہ حکم احادیث کی نشست اور مسائل کی فقہی تقریر کے لحاظ سے ہو تو صحیح ہے ورنہ اگر صحتِ اسانید و متون کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مقولہ ابن حزمؒ کی جلالتِ شان کے کسی طرح موزوں نہیں۔ امام طحاویؒ جب مختصر الطحاوی

---

[1] حضرت استاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے جس قدر استفادہ کیا ہے افسوس ہے کہ اتنا خود حنفیہ نے استفادہ نہیں کیا۔ اگر کاش معانی الآثار کی پوری مدت خدمت کردی جاتی تو وہ رتبہ میں ابوداؤد … سے کم نہ ہوگی۔

تالیف کر چکے تو فرمایا۔ کاش ابوابراہیم (مزنی کی کنیت ہے) آج زندہ ہوتے تو اُن کو اپنی قسم کا کفارہ دینا پڑتا۔

جس سال امام طحاویؒ کی وفات ہوئی۔۔۔ اسی سال علم حدیث کے بہت سے چراغ گل ہوئے۔۔۔

مصر میں طحاوی کے شیخ "ابوبکر احمد بن عبدالوارث" ہرات میں "ابوعلی احمد بن محمدؒ" اصبہان میں ابوعلی الحسن

بغداد میں "ابوعثمان سعید بن محمدؒ" اور ابوعلی جبائی کے فرزند اور شیخ المعتزلہ ابوہاشم وغیرہم۔

امام طحاویؒ کے سنہ ولادت میں اختلاف ہے۔ ابن خلکان کہتے ہیں کہ صحیح ۲۲۹ھ ہے۔ [۱]

ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی

ولادت ۲۶۰ھ وفات ۳۶۰ھ

ملک شام موضع عکا ر میں ان کی ولادت ہوئی ہے۔ طبرانی طبریہ کی طرف منسوب ہے ابن خلکان لکھتا ہے کہ طبرستان کی طرف نسبت طبری آتی ہے۔ طلب علم کے لئے حرمین شریفین، یمن، شام، کوفہ، بصرہ، مصر، بغداد، اور اصفہان وغیرہ کا سفر کیا ہے آپ کے والد بزرگوار کو علم حدیث سے بڑا شغف تھا۔ بڑے بڑے اساتذہ کی خدمت میں انھیں خود لیجایا کرتے تھے۔ تحصیل علم میں انھوں نے بڑی بڑی مشقتیں جھیلی ہیں۔ تیس سال مسلسل بوریئے پر سوئے ہیں۔ وسعت علم میں اپنے زمانہ میں ضرب المثل تھے۔

ابوالعباس احمد بن منصور کہتے ہیں کہ میں نے طبرانی سے تین لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔ ان کی اکثر تصانیف اس وقت ناپید ہیں حافظ ابن مندہ نے ان سب کا ذکر کیا ہے۔ کتاب المسالک، کتاب عشرۃ النساء، کتاب النوادر، کتاب دلائل النبوۃ کے سوا انھوں نے ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔۔۔۔ اور حدیث میں تین معجم بھی لکھے ہیں جن کے حوالجات اکثر شرح حدیث میں ملتے ہیں۔ ابن عمید مشہور ادیب اور وزیر تھا اس کا گمان تھا کہ علم و سلطنت کے دونوں عہدے میرے پاس ہیں آج مجھ سے زیادہ عزت کس کو حاصل ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ ابوبکر جابی اور ابوالقاسم طبرانی کے درمیان ابن عمید کے سامنے ایک مکالمہ ہوا۔ دوران گفتگو میں ابوبکر کا پلہ ذکاوت میں اور ابوالقاسم کا کثرت محفوظات میں بھاری نظر آرہا تھا۔ اتفاقاً اثناء گفتگو میں ابوبکر نے کہا کہ ایک حدیث میرے پاس ایسی ہے جو اس وقت دنیا میں کسی کے پاس نہیں ہے پھر یہ سند پڑھی حدثنا ابوخلیفہ ثنا سلیمان بن ایوب ابوالقاسم۔ اس پر طبرانی نے کہا آپ جانتے بھی ہیں سلیمان بن ایوب کون ہیں وہ خود میں ہی تو ہوں اور یہ ابوخلیفہ میرے شاگرد ہیں آب آپ اس روایت کو

---

[۱] تذکرہ ج ۳ ص ۲۸ و ابن خلکان ج ۱ ص ۱۹۔

ابو خلیفہ کی بجائے براہِ راست مجھ سے ہی روایت کیا کیجئے تاکہ ایک واسطہ اور گھٹ جائے اور آپ کی سند عالی ہو جائے۔ یہ سن کر ابو بکر کو بڑی خفت ہوئی۔ ابن عمید کہتے ہیں کہ اس وقت طبرانی کا اعزاز دیکھکر مجھے ان پر رشک ہونے لگا۔ کاش کہ میں آج طبرانی ہوتا اور وزیر نہ ہوتا کہ فتح وظفر کا یہ علمی تمغہ مجھے نصیب ہوتا۔ شاہ عبدالعزیز لکھتے ہیں کہ یہ رشک بھی ابن عمید میں وزارت کے بقیہ اثرات کا نتیجہ تھا ورنہ علماء ربانیین پر ایسے امور کچھ اثر انداز نہیں ہوتے۔ آخر عمر میں قرامطہ نے ان پر جادو کر دیا تھا اور اس کے اثر سے ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی۔ حافظ ابو نعیم اصبہانی نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی ۔ [1]

ابوالحسن علی بن عمر الدارقطنی

ولادت ۳۰۶ھ وفات ۳۸۵ھ

دارقطن بغداد میں ایک بڑا محلہ ہے وہی ان کا مسکن تھا۔ طلب حدیث کے لئے انھوں نے کوفہ، بصرہ، شام، واسط، مصر اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ مشہور شافعی المذہب تھے۔ حاکم۔ عبدالغنی منذری تمام رازی صاحبِ فوائد اور ابو نعیم صاحب الحلیہ جیسے ائمہ حدیث ان کے زمرہ تلامذہ میں شامل تھے۔ فنِ علل و اسماء الرجال میں استاد مانے جاتے تھے اور اپنا نظیر نہ رکھتے تھے۔ خطیب وحاکم وغیرہ کو آپ کے اس تفوق کا اعتراف تھا۔ فنونِ حدیث کے علاوہ فنِ قرارت ونحو میں بھی آپ کو کافی دستگاہ تھی۔ قوتِ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اپنے زمانۂ شباب میں اسمٰعیل صفار کی مجلسِ املاء میں بیٹھے ہوئے کچھ تحریر فرما رہے تھے حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس طرح تو تمہارا اسماع معتبر نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف لکھنے میں مشغول ہو اور دوسری طرف حدیث بھی سن رہے ہو۔ دارقطنی نے کہا اچھا جناب کو یاد ہے کہ اب تک شیخ نے کتنی حدیثیں املاء کرائی ہیں انھوں نے کہا نہیں۔ دارقطنی نے فرمایا اٹھارہ حدیثیں۔ پھر ان تمام حدیثوں کو بالترتیب حفظ پڑھ کر سنا دیا یہ دیکھ کر اہلِ مجلس حیران رہ گئے۔

ابوالحسن بیضاوی ایک شخص کو اپنے ہمراہ لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ یہ شخص بڑی دور دراز سے علمِ حدیث طلب کرنے کے لئے آیا ہے برائے مہربانی چند حدیثیں اس کو بھی املاء کرا دیجئے۔ دارقطنی نے پہلے تو عذر کیا جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو ازراہِ ظرافت بیس سند کے ساتھ یہ ایک حدیث روایت کی۔

نعم الشئ الهدية امام الحاجة　　اپنی حاجت ظاہر کرنے سے قبل کچھ ہدیہ پیش کرنا بہت اچھا ادب ہے۔

---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۱۱۸ وابن خلکان ج ۱ ص ۲۱۵۔

دوسرے دن وہ شخص مناسب ہدیہ لے کر حاضر ہوا۔ آپ نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور ستّرہ سندوں کے ساتھ حدیث کا یہ متن املار کرایا۔

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ — جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز شخص آئے تو اس کی توقیر کیا کرو۔

آپ کی علمی ظرافتوں میں سے ایک واقعہ یہ بھی مشہور ہے کہ ایک دن آپ نماز میں مشغول تھے اور کوئی شخص غلطی سے نُسیر کو بشیر پڑھ رہا تھا۔ دار قطنی نے سبحان اللہ کہا تاکہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے مگر وہ نہ ہوا اور اب کی بار یُسیر یا ر کے ساتھ پڑھنے لگا۔ جب دار قطنی نے دیکھا کہ یہ کسی طرح اصلاح پر نہیں آتا تو آواز بلند نون والقلم وما یسطرون پڑھنا شروع کر دیا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ اس راوی کا نام نون کے ساتھ ہے۔ اسی طرح ایک شخص عمرو بن شعیب کو عمرو بن سعید پڑھ رہا تھا، یہاں بھی دار قطنی نے سبحان اللہ کہا جب وہ ادا کرنے میں اٹکنے لگا تو دار قطنی نے یہ آیت تلاوت کی " یا شعیب اصلوتك تامرك"

حافظ ابو نصر ماکولا کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں فرشتوں سے دار قطنی کا حال پوچھ رہا ہوں انھوں نے مجھے یہ جواب دیا ہے کہ جنت میں ان کا لقب امام ہے۔

مقبرۂ باب حرب میں معروف کرخیؒ کے پاس آپ کا مزار مبارک بنا ہوا ہے۔ [1]

ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم

ولادت ۳۲۱ھ وفات ۴۰۵ھ

حاکم نیشاپور کے باشندے تھے اور ابن البیّع کی کنیت سے مشہور تھے۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ بیوپاری لڑکا ہے۔ چونکہ یہ قاضی تھے اس لئے حاکم ان کا لقب پڑ گیا تھا۔ طہمان ان کے جد تھے اس مناسبت سے ان کو طہمانی بھی کہہ دیتے تھے۔ بچپن میں ہی ان کو علمِ حدیث کا شوق تھا، ان کے والد اور ماموں کو بھی علمِ حدیث سے بڑا شغف تھا۔ حدیث کی تلاش میں انھوں نے خراساں، ماوراء النہر اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے ان کے شیوخ کی تعداد دو ہزار تھی جن میں ایک ہزار صرف نیشاپور کے شیوخ تھے۔ ابو ذر ہروی صاحب روایت بخاری ابو یعلیٰ، ابو القاسم قشیری اور بیہقی وغیرہ جیسے ائمہ حدیث ان سے روایت کرنے والوں کی صف میں داخل ہیں۔ ابو حازم نقل کرتے ہیں کہ حاکم نے آبِ زمزم پی کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی کہ مجھے حسنِ تصنیف مرحمت ہو، ان کے زمانہ میں تین حافظ حدیث اور تھے، ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ان کے مابین فیصلہ

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۱۸۶ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۱

یہ کیا گیا ہے کہ علل حدیث کی معرفت میں تو دارقطنی ممتاز تھے۔ ابن مندہ کثرت احادیث میں، عبدالغنی منذری انساب میں اور حاکم حسن تصنیف میں۔

خطیب نے ان کو ثقہ کہنے کے باوجود ان میں شیعیت کی نکتہ چینی کی ہے۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ سلف میں جو شخص حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دیتا تھا وہ شیعیت سے متہم ہو جاتا تھا۔ رفض اور شیعیت میں بہت فرق تھا۔ طبقات الشافعیہ میں بہت تفصیل کے ساتھ ان کی برات پر کلام کیا ہے اور اس کا سب سے کھلا ثبوت خود ان کی تصنیف سے یہ پیش کیا ہے کہ حاکم نے مستدرک میں شیخین کی خلافت پر ایک۔ نص صریح پیش کی ہے اسی طرح حضرت عثمانؓ کی فضیلت کے متعلق بھی ایک حدیث روایت کی ہے اور ان دونوں حدیثوں کو صحیح کہا ہے حالانکہ دونوں کی سند میں کلام کرنے کی بہت گنجایش ہے اسی لئے حافظ ذہبی نے حاکم کی تصحیح پر تعقب کیا ہے۔ حاکم کی صفائی کے لئے اس سے زیادہ کھلا ہوا ثبوت اور کیا پیش کیا جاسکتا ہے ان کی تصانیف بہت ہیں۔ ابن خلکان نے اُن کی تعداد ڈیڑھ ہزار لکھی ہے۔ کتاب الاکلیل ان کی بہت مفید تصنیف ہے ہر مفسر کو اس کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔

علم حدیث کے علاوہ ان کو دیگر علوم میں بھی کافی مہارت تھی لیکن چونکہ یہ زیادہ مشغلہ حدیث ہی کا رکھتے تھے اس لئے محدث مشہور ہو گئے تھے۔ مستدرک حاکم ان کی بہت مشہور تصنیف ہے اور حال میں طبع بھی ہو گئی ہے حاکم کا خیال ہے کہ اس کی تمام حدیثیں شیخین کی شرط پر ہیں مگر علما نے ان کے اس دعویٰ کو تسلیم نہیں کیا۔ ذہبی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں اور اسی ضرورت سے انھوں نے تلخیص مستدرک تصنیف فرمائی ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ حاکم کی تصحیح پر کسی کو اعتماد کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ میرے تعقبات نہ دیکھ لے۔ حاکم کے دعوی کے بالکل بالمقابل ابو سعید کا دعوٰی ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو از اول تا آخر دیکھا ہے اس میں ایک حدیث بھی شیخین کے شرط پر نہیں ہے۔ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابو سعید کا یہ بیان بھی سریح زیادتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی نصف حدیثیں صحیحین یا اُن میں سے ایک نہ ایک کی شرط پر ضرور ہیں اور ایک چوتھائی حصہ ایسا ہے جو اگرچہ شیخین کی شرط پر نہ ہو لیکن صحیح ضرور ہے۔ البتہ کتاب کا بقیہ چوتھائی حصہ کمزور اور منکر احادیث پر مشتمل ہے بلکہ اس میں موضوعات بھی ہیں جن پر تلخیص المستدرک میں تنبیہ کر دی گئی ہے اور ان چند حدیثوں کی وجہ ہی سے مستدرک تمام کی تمام بے رونق ہو گئی ہے۔

طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ابو الفضل ہمدانی جن کا لقب بدیع الزمان مشہور ہے، نیشا پور آیا۔ اسے اپنے حافظہ پر بڑا ناز تھا سو سو اشعار ایک مجلس میں سنتا اور ایک ہی بار سُن کر اس کو اس طرح محفوظ ہو جاتے کہ اول سے آخر تک پھر آخر سے اول تک بالترتیب ان کو سناجاتا۔ جب اس کے سامنے

حفاظِ حدیث کا ذکر آیا تو اس نے اپنے حفظ کے مقابلہ میں اُن کو ہیچ سمجھا۔ حاکم کو یہ خبر ملی تو انھوں نے حدیث کا ایک جزء اس کے پاس بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ ایک ہفتہ کی مہلت ہے یاد کر کے سنا دو۔ ایک ہفتہ بعد وہ اجزاء اس نے واپس کر دیئے اور کہا کہ ان مختلف الفاظ، مختلف مضامین اور راویوں کے غیر مرتبط ذخیرہ کو بھلا کون یاد کر سکتا ہے حاکم نے کہا تو اب اپنی حیثیت پہچانو اور آئندہ شیخی کبھی مت بگھارو۔

ان کی وفات اچانک واقع ہوئی ایک دن غسل کے لئے حمام میں تشریف لے گئے جب غسل سے فارغ ہوئے اور لنگی باندھ لی تو ابھی قمیص پہننے نہیں پائے تھے کہ ایک آہ کھینچی اور طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔[1]

ابو محمد علی بن احمد بن حزم الاندلسی

ولادت ۳۸۴ھ وفات ۴۵۷ھ

یہ فارسی النسل تھے۔ قرطبہ میں ان کی ولادت ہوئی ہے فقیہ، مجتہد اور صاحبِ تصانیف شخص تھے۔ حفظ نہایت قوی تھا اور انتہا درجہ کے ذکی تھے۔ علوم کی وسعت بے نہایت تھی۔ پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے پھر داؤد ظاہری کا مسلک اختیار کر لیا تھا۔ قیاس کے سرے سے منکر تھے۔ فنِ منطق محمد بن حسن مذحجی سے حاصل کیا تھا امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اسماء الٰہیہ کے متعلق میں نے ان کی ایک تصنیف دیکھی اُسے دیکھکر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کس غضب کے حافظ اور ذکی تھے۔ صاعد بن احمد فرماتے ہیں کہ ابنِ حزم مختلف زبانوں کی مہارت رکھتے تھے اور علومِ اسلامیہ کے علاوہ بلاغت اور شاعری وغیرہ میں تمام اہلِ اندلس پر فائق تھے۔ ان کے فرزند بیان کرتے ہیں کہ میرے والد کی تصنیفات کے اسّی ہزار ورق میرے پاس موجود ہیں۔ حمیدی کہتے ہیں ابو محمد حافظِ حدیث اور مجتہد ہونے کے سوا دیگر علوم میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اور اس کے ساتھ باعمل بھی تھے۔ ہم نے ان جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا جس میں سرعتِ حفظ، ذکاوت، تدیّن اور شرافتِ مزاج کے سب اوصاف بیک وقت جمع ہوں۔ فی البدیہہ اشعار کہنے میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ ان کی تصانیف میں کتاب الاحکام، المحلی والمجلی، اور الفصل فی الملل والنحل وغیرہ دنیا کے ہاتھوں میں موجود ہیں۔

شیخ عزالدین بن عبد السلام فرماتے تھے کہ جتنا علم میں نے محلی ابنِ حزم اور مغنی ابنِ قدامہ میں دیکھا ہے اتنا کسی اور کتاب میں نہیں دیکھا۔ ذہبی نے بھی ان کی جلالتِ قدر کو تسلیم کیا ہے۔ ان تمام اوصاف کے باوجود ان میں ایک خطرناک کمزوری بھی تھی۔ اپنی رائے پر انتہا درجہ جمود اور اپنے مخالف کی سخت الفاظ میں

---

[1] تذکرہ ج ۳ ص ۲۲۷ و الطبقات ج ۳ ص ۶۴ و ابن خلکان ج ۱ ص ۴۸۴ و بستان۔

تجہیل وتحمیق حتیٰ کہ ائمہ ومحدثین کی بھی نہایت درشت اور نازیبا لہجہ میں تردید کرتے تھے۔
ابنِ خلکان ابوالعباس سے ناقل ہیں کہ حجاج کی تلوار اور ان کی زبان ہموزن مشہور تھی اور اسی وجہ سے ان کو جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ انھوں نے مداواۃ النفوس میں خود یہ تحریر فرمائی ہے کہ میری تلی بڑھ گئی تھی اور اس لئے میرے مزاج میں اتنا تغیر پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے خود اس پر تعجب ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے مقدمہ ابن الصلاح کی تلخیص میں حافظ ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے ترمذی کے تذکرہ میں یہ تصریح کی ہے کہ ابن حزم اپنی علمی وسعت کے باوجود ترمذی اور ان کی تصنیف سے ناواقف تھے۔ [1]

ابوبکر احمد بن الحسین البیہقی

ولادت ۳۸۴ھ وفات ۴۵۸ھ

شافعیہ کے بہت بڑے اور مشہور محدث ہیں۔ حاکم، ابوطاہر، ابن فورک متکلم، اور ابوعلی روذباری صوفی اور ابوعبدالرحمٰن سلمی صوفی وغیرہم سے علوم حاصل کئے تھے۔ طلبِ علوم کے لئے کوفہ، بغداد، خراسان، حجاز اور دیگر بلادِ اسلامیہ کا سفر کیا ہے۔ بہت کثیر التصانیف محدث تھے۔ ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد ایک ہزار تک شمار کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے علم میں بڑی برکت مرحمت فرمائی تھی۔
ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ پہلے وہ شخص ہیں جنھوں نے نصوصِ شافعی جمع کی ہیں سبکی نے اس پر تعقب کیا ہے اور طبقات میں لکھا ہے کہ ان کو پہلا شخص کہنے کی بجائے آخری شخص کہا جائے تو صحیح ہے ان کے قلم سے ایسی ایسی تصانیف نکلی ہیں جن کی نظیر سابقین میں بھی خال خال ملتی ہے۔ کتاب الاسماء والصفات کی نسبت سبکی فرماتے ہیں کہ اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ دلائل النبوۃ، مناقب الشافعی، دعوات الکبیر، شعب الایمان کو سبکی نے قسم کھا کر بے نظیر کہا ہے۔ سننِ کبریٰ، سننِ صغریٰ، خلافیات، کتاب الزہد، اربعین کبریٰ وصغریٰ کتاب الاسرار بھی ان کی تصانیف میں بہت بلند پایہ تصنیف ہیں۔
امام الحرمین فرماتے تھے کہ ہر شافعی مذہب والے پر امام شافعیؒ کا احسان ہے لیکن ایک بیہقی ہیں جن کا احسان خود امام شافعیؒ پر ہے۔ کیونکہ ان کی فقہ کو اس طرح مضبوط و مدلل طور پر مدون کرنے اور اس کے رائج کرنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔
معرفۃ السنن والآثار کی تصنیف کے دوران میں متعدد اشخاص نے امام شافعیؒ کو خواب میں دیکھا

[1] تذکرہ ج ۲ ص ۳۲۱ و ابنِ خلکان ج ص ۳۴۰ و تہذیب التہذیب

کہ ان کے ہاتھ میں اس کتاب کے چند اجزاء ہیں اور وہ فرماتے ہیں کہ آج فقیہ احمد کی کتاب کے سات اجزاء ہم نے پڑھے ہیں۔ ان تمام فضائل و کمالات کے باوجود یہ تعجبات میں سے ہے کہ جامع ترمذی، نسائی اور سنن ابنِ ماجہ ان کے پاس نہ تھیں۔ اس لئے ان ہر سہ کتابوں کی احادیث کی انھیں اطلاع نہ تھی۔

شہر نیسا پور میں ان کی وفات ہوئی، پھر ان کا تابوت خسروجرد جو بیہق کا سب سے بڑا شہر تھا منتقل کر کے لایا گیا اور یہیں آپ کو ہمیشہ کے لئے سپردِ خاک کر دیا گیا[1]

نورالدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الہیثمی

ولادت ۷۳۵ھ وفات ۸۰۷ھ

قاہرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی اور بچپن سے لے کر وفات تک حضر و سفر میں شیخ زین الدین عراقی کے ساتھ رہے۔ حرمین شریفین، بیت مقدس، دمشق، بعلبک، حمص، حلب، اور طرابلس وغیرہ کے تمام سفر عراقی کے ہمراہ کئے۔ حتیٰ کہ ایسی حدیثوں کی تعداد بہت ہی کم ہے جو انھوں نے کسی شیخ سے تنہا حاصل کی ہیں۔ عراقی کو ان پر بڑا اعتماد تھا اپنی صاحبزادی کو ان سے منسوب کر دیا تھا اور یہی ان کے بعد ان کے جانشین قرار دیئے گئے تھے۔

مصری علماء میں ابوالفتح میدومی، ابن ملوک، ابنِ قطروانی۔ اور شامیوں میں ابن الخباز ابن الحموی اور ابن قیم ضیائیہ وغیرہم کے سامنے زانوئے تلمذ کیا تھا۔ مجمع الزوائد[2] ان کی مشہور ترین تصنیف ہے اس کتاب میں تینوں معجم، مسند امام احمد، بزار، اور ابو یعلیٰ کے زوائد جمع کی ہیں۔ راویوں پر جرح و قدح اور روایات پر صحیح و ضعیف کا تفصیلی حکم بیان کیا ہے۔ ابن حبان اور عجلی کی کتاب الثقات جمع کر کے حروفِ معجم پر اور کتاب الحلیہ کو ابواب کی شکل پر مرتب کر دیا ہے۔

ان علمی خدمات کی وجہ سے متونِ حدیث ان کو بہت حاضر تھے۔ نہایت نرم مزاج، سلیم الفطرت اور اہلِ خیر محدث تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے مجمع الزوائد کا تقریباً نصف حصہ ان کے سامنے پڑھا ہے اور اس کے علاوہ بھی بعض کتابیں پڑھ کر سنائی ہیں۔ حافظ بھی جن کے متعلق کہا جاتا ہے نہ دنیا میں ان کے بعد دوسرا کوئی حافظ ان کی ٹکر کا پیدا نہیں ہوا ان کی حدیثی مہارت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۹ والطبقات ج ۳ ص ۲
[2] یہ کتاب دس ضخیم جلدوں میں مصر سے شائع ہو چکی ہے۔

ارادہ کیا تھا کہ مجمع الزوائد میں جو معمولی وہم پیش آگئے ہیں ان کو تلاش کر کے جمع کر دیں لیکن حافظ نورالدین کی ناگواری کی خاطر یہ ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ قاہرہ میں آپ کی وفات ہوئی اور باب البرقوقیہ کے باہر مدفون ہوئے۔ [1]

---

[1] شذرات الذہب ج ۷ ص ۷۰ والبدر الطالع ج ۱ ص ۱۴۴ والضوء اللامع ج ۵ ص ۲۰۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کِتَابُ التَّوۡحِیۡدِ

اِنَّ مَعۡرِفَۃَ اللّٰہِ تَعَالٰی مِمَّا فُطِرَ عَلَیۡہِ الۡاِنۡسَانُ

قال اللہ تعالٰی وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّکَ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُہُوۡرِہِمۡ ذُرِّیَّتَہُمۡ وَاَشۡہَدَہُمۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی شَہِدۡنَا اَنۡ تَقُوۡلُوۡا یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ اِنَّا کُنَّا عَنۡ ہٰذَا غٰفِلِیۡنَ ۔ اَوۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَشۡرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنۡ قَبۡلُ وَکُنَّا ذُرِّیَّۃً مِّنۡۢ بَعۡدِہِمۡ اَفَتُہۡلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الۡمُبۡطِلُوۡنَ ۔ (الاعراف)

اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اعتراف انسانی فطرت کی آواز ہے

اور وہ وقت یاد کیجئے جبکہ آپ کے پروردگار نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو اپنی جانوں پر گواہ بنایا، کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انھوں نے جواب دیا بیشک ہے، ہم گواہی دیتے ہیں (یہ اس لئے کیا) کہ کبھی قیامت کے دن عذر کرنے لگو کہ ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی، یا یہ کہنے لگو کہ شرک تو ہم سے پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا، ہم ان کے بعد ان کی اولاد تھے (تو مجبوراً اسی راستے پر چلے) تو کیا تو ہمیں اس کام پر ہلاک کرتا ہے جو ہم سے پہلے غلط کاروں نے کیا تھا۔[1]

---

[1] تمام ادیانِ سماویہ اور عقائدِ حقہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے۔ مذہب کی ساری عمارت اسی سنگِ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے جب تک یہ اعتقاد نہ ہو مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی کچھ نفع نہیں پہنچا سکتی، عقلِ سلیم اور وحی و الہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں۔ پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبدء و منتہی اور تمام ہدایاتِ ربانیہ کا وجودِ مجمل کہنا چاہئے۔ عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تاکہ ہر آدمی عقل و فہم اور وحی و الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجرِ ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔ اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی و جوہری عقدہ کا حل ناخنِ عقل و فکر کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ جاتا جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

(۱) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يُقَالُ لِلرَّجُلِ مِنْ اَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَرَأَيْتَ لَوْ كَانَ مَا عَلَى الْاَرْضِ مِنْ شَيْءٍ أَكُنْتَ مُفْتَدِيًا بِهِ، قَالَ فَيَقُولُ نَعَمْ قَالَ فَيَقُولُ قَدْ اَرَدْتُ مِنْكَ اَهْوَنَ مِنْ ذٰلِكَ قَدْ اَخَذْتُ عَلَيْكَ فِي ظَهْرِ اٰدَمَ اَنْ لَا تُشْرِكَ بِي شَيْئًا فَاَبَيْتَ اِلَّا اَنْ تُشْرِكَ بِي (رواه احمد والشيخان وغیرہم)

(۱) انس بن مالک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک دوزخی شخص سے کہا جائے گا بتلا اگر (تیرے پاس آج) تمام زمین کا مال ہوتا تو کیا تو وہ سب اس عذاب کے فدیہ میں دیدیتا وہ عرض کرے گا ضرور، باریتعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ میں نے تو تجھ سے اس سے بہت ہلکا مطالبہ کیا تھا (یعنی) جب تو آدمؑ کی پشت میں تھا تو تجھ سے یہ عہد لیا تھا کہ میرا کسی کو شریک مت ٹھہرانا مگر تو نہ مانا اور شریک ٹھیرا کر رہا۔ اس حدیث کو امام احمد اور شیخین وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ فکر و استدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف پر منتج ہوتی ہیں۔ اس لئے قدرت نے جہاں غور و فکر کی قوت اور نور وحی و الہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی وہیں اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی مذاہب و ہدایات کی تفصیل موجود تھی اور جس کے بدون مذہب کی عمارت کا ستون کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ آج یہ اسی ازلی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے اور جن معدود افراد نے کسی روحانی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے جیسا کہ ایک بخار کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ و بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہرحال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر طبقہ کا خدا کی ربوبیتِ کبریٰ پر عام اتفاق اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول و افکار کی دوادوش سے پہلے ہی فاطرِ حقیقی کی طرف سے اولادِ آدم کو بلا واسطہ تلقین فرمادیا گیا تھا ورنہ فکر و استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہوجانا تقریباً ناممکن تھا۔ بلا شبہ ہم کو یاد نہیں کہ یہ تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی تاہم جس طرح ایک انشاپرداز کو یقین ہوتا ہے کہ ضرور اس کو ابتداء عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھلائے جس سے ترقی کرکے آج وہ اس رتبہ کو پہنچا ہے گو اس کی تفاصیل اس کے ذہن میں اس وقت مستحضر نہیں۔ اسی طرح بنی نوع کا ہر دور میں عقیدۂ ربوبیت پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز ان کی فطرت ہی میں کسی مربی و معلم کی طرف سے ودیعت رکھدی گئی ہے۔ اسی ازلی اور فطری تعلیم نے ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کردیا ہے۔ اب ہر منکر کے مقابلہ میں خدا کی یہی حجتِ قاطعہ جس پر فطرتِ انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جاسکتی ہے [۱]

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کیسی ارقام فرماتے ہیں کہ کسی فن کے مبادی کی تعلیم کی اصل غایت و غرض خود ان مبادی کے یادداشت یا اس کی تعلیم کے شمائل و خصائص کا تحفظ نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقصد (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

[۱] مختصر فوائد حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی۔

(۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ كَمَا تُنْتِجُ الْبَهِیْمَةُ بَهِیْمَةً جَمْعَاءَ

(۲) حضرت ابوہریرۃؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ہر بچہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں جیسا کہ چوپائے صحیح و سالم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) متعلم و مستفیض میں ایک ایسی استعداد پیدا کر دیتا ہے جو آئندہ تحصیلِ علوم کے لئے بطور ایک بنیادی اساس کار آمد ہو، مثلاً الف و بار کی تعلیم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ اصل نقوش یا زمانۂ تعلم یا اس کا خاص معلم یاد رہے بلکہ اس ابتدائی تعلیم کا مقصد صرف ملکۂ حرف شناسی ہے خواہ پھر تمام علوم و فنون میں پیر جانے کے بعد ذہن کبھی ادھر متوجہ نہ ہو کہ یہ سب کرشمہ کسی استاد شفیق کا مرہونِ منت تھا۔ اگر زمانۂ کم سنی میں تعلیمی دور شروع ہو جاتا ہے تو بہت کم کسی کو یاد رہ سکتا ہے کہ اس قاعدہ کب اور کس طرح اور کس ماحول میں پڑھا تھا بلکہ بسا اوقات اُس استاد کا خیال بھی نہیں رہتا مگر اس تعلیم کا اثر (یعنی حرف شناسی) ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ اسی طرح عہدِ بلیٰ کی غایت و غرض اس ابتدائی سبق یا اس ماحول کی یادداشت نہیں بلکہ فطرت میں ایک ایسی صلاحیت پیدا کر دینا ہے جس کے بعد ہر بدوی و شہری، تعلیم یافتہ و غیر تعلیم یافتہ، مسلم و کافر کے دل میں غیر شعوری طور پر اس مافوق الفہم مسئلہ کے مان لینے کا خود بخود داعیہ پیدا ہو جائے اور جب کبھی کوئی داخلی یا خارجی معمولی سی تحریک بھی ہو تو اس کی طرف فطرتِ انسانی کو ایک غیر معمولی انجذاب و کشش محسوس ہونے لگے (یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی آمد کے بعد جتنی شدت سے رسالت کا انکار کیا گیا ہے اتنا وجودِ باری کا نہیں کیا گیا)۔ اس بنا پر یہ سوال ہی وارد نہیں ہوتا کہ جب عہدِ بلیٰ ہم کو یاد ہی نہیں رہا تو پھر اس عہد کا فائدہ کیا نکلا۔

امام شعرانیؒ فرماتے ہیں کہ اگر عالمِ ارواح کا عہد اس عالمِ اجسام میں یاد نہ رہا تو تعجب کیا ہے جبکہ معلوم نہیں کہ اس کی صورتِ مثالیہ کتنی بار بنی اور بگڑی، کتنے آباء و امہات میں منتقل ہوئی، پھر نطفہ، علقہ، اور مضغہ کے کتنے قالب بدلا کی، پھر کتنے اجزاء کا اس میں اور اضافہ کیا گیا، پھر نہ معلوم کہ کتنے زمانہ بعد احسن الخالقین کے کرشمہ سازی کی شہادت دینے کے لئے ساحتِ وجود میں آئی۔ اگر ان ارتقائی مراتب کی ایک کڑی بھی فراموشی کے لئے معقول سبب بن سکتی ہے تو جو انسان ایک غیر محدود مدت سے اس گرداب میں پڑا چکر ہی کھاتا رہا ہے اس کی عہدِ بلیٰ کی فراموشی اتنی قابلِ الزام نہیں ہے بایں ہمہ حضرت علیؓ اور سہل بن عبداللہ تستریؒ سے منقول ہے کہ ان کو اتنی طویل مسافت طے کرنے کے بعد بھی اپنا قدیم عہد یاد تھا۔[۱] معلوم نہیں کہ خدائے قدوس کے کتنے بندے اور ہوں گے جنہیں تصفیۂ روح کے بعد اپنا قدیم عہد یاد آ گیا ہوگا مگر مزاج سلف میں نہ اس سوال کی اہمیت تھی نہ اس کے جواب کی ضرورت۔ اس لئے ذخیرۂ نقل کسی لمبی فہرست پیش کرنے سے خاموش ہے سلسلۂ اشہاد کی تفاصیل میں احادیثِ موقوفہ و مرفوعہ کا ایک صحیح ذخیرہ موجود ہے۔ معتزلہ کے نزدیک صرف انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور فطرتِ انسانی میں اقرارِ ربوبیت کی صلاحیت ہی اس سوال و جواب کی حقیقت ہے اس لئے اس آیت میں انھیں تو کوئی اشکال نہیں۔ البتہ محدثین کا قدم کچھ اس سے آگے ہے۔ یہاں تفسیر ابنِ کثیر کا مطالعہ کیجئے انھوں نے اس مقام کو خوب مرتب و مہذب کر دیا ہے۔

---

[۱] دیکھو الیواقیت والجواہر ج ا ص ۱۰۶۔

هَلْ تُحِسُّوْنَ فِيْهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ يَقُوْلُ اَبُوْهُرَيْرَةَ وَاقْرَؤُا اِنْ شِئْتُمْ فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۔ (رواہ الاربعۃ)

بچہ جنتے ہیں، کیا تم اس میں کوئی ناک، کان کٹا دیکھتے ہو۔ اس کے بعد حضرت ابوہریرۃ فرماتے کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق قرآن کریم میں پڑھ لو۔ ارشاد ہوتا ہے کہ یہ خدا کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اس کی فطرت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں، دینِ قیم (صحیح دین) یہی ہے (اس حدیث کو چار کتابوں میں روایت کیا ہے)

حاشیہ حدیث ۲

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ہر نوع کے لئے کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات علیحدہ مقرر فرمائی ہیں جن کی وجہ سے ان انواع میں باہمی امتیاز قائم ہے۔ مثلاً طیور کے لئے، پر، پنجے، چونچ، چوپایوں کے لئے جسم پر بال ایک پھیلا ہوا قامت اور ایک مخصوص انداز کے پاؤں ہر ہر نوع کے لئے مخصوص مخصوص رنگ جدا جدا مقدار و صورت مقرر کی ہے۔ یہ تو ان کی ظاہری خصوصیات ہوئیں اب اسی طرح ان کی کچھ باطنی خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کا مخصوص پھولوں سے عرق نکال کر کیمیاوی طریق پر شہد تیار کرنا۔ بعض پرندوں کا اس نزاکت سے گھونسلہ بنانا کہ عقلِ انسانی بھی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائے۔ جب سے عالم پیدا ہوا ہے شہد کی مکھی سے لیکر ایک ہاتھی تک اپنی اپنی ظاہری و باطنی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتے چلے آئے ہیں۔ اس لئے یہ خصوصیات ان کی فطرت کہلاتی ہے۔

اب حضرتِ انسان پر ذرا غور کیجئے۔ اس میں بھی نوعی طور پر کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات ہیں جو ان ہی خصوصیات کو لئے ہوئے ہر دور زندگی میں مشترک طور پر نظر آتی ہیں یہی اس کی فطرت کہلاتی ہیں۔ مثلاً اس کی ظاہری خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے جسم پر نہ پرندوں کے سے پر ہیں نہ حیوانات کے سے بال ایک مخصوص انداز کا سیدھا او صاف قامت ہے، ایک مخصوص قسم کا دلکش رنگ اور ایک مخصوص انداز کی دلربا صورت، اس کی باطنی خصوصیات، اس کی عقل وہ عقل ہے جس میں اپنے خالق کی معرفت کی طلب، اس کی عبادت کا جذبہ، اس کی رضامندی کی تڑپ ہے۔ پیدائشِ عالم سے لیکر اگر نوعِ انسانی پر غور کرو گے تو جس طرح دیگر حیوانات اپنے ان باطنی خصوصیات میں متفق نظر آتے ہیں اسی طرح نسلِ انسانی اس مطالبہ میں اختلاف نہیں رکھتی اس لئے یہ اس کی فطرت کہلانا چاہئے۔ جمہور عالم کو مذہبی تلاش اسی فطری آواز کے ماتحت ہے۔ ہاں کبھی بیرونی اسباب اور اس کے ماحول کے اثرات اسے اتنا متاثر کردیتے ہیں کہ اس میں خالق کی تلاش نہیں رہتی اور اگر رہتی بھی ہے تو طبیعت غلط راستہ کی طرف بھٹکنے لگتی ہے۔ مگر ان اثرات کو فطرت نہیں کہا جاسکتا۔ خلافِ فطرت کہا جائے گا جیسا کہ بھوک لگنا، مذکر کا مونث کی طرف میلان، اسبابِ زینت سے اپنے نفس کو آراستہ کرنا۔ یہ انسان کی فطرت ہے مگر جب یہودیت و نصرانیت کا بھوت اس کی فطرت کو مسخ کردیتا ہے تو رہبانیت کی زندگی اسے محبوب نظر آنے لگتی ہے۔ گرسنگی اور عزوبت (نکاح نہ کرنا) کی زندگی مرغوب بن جاتی ہے یہ فطرت نہیں خلافِ فطرت ہے۔ فابواہ یھودانہ کی یہی شرح سمجھنا چاہئے۔ علہ

مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ حدیث میں فطرت سے مراد بھی عہدِ ربوبیت ہے۔

علہ حجۃ اللہ البالغہ ج ص ۳۶ و ۷۹ ، ۱۶۶ و ۱۶۷ -

النهي عن الخوض في ذات الله تعالىٰ

(۳) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَأْتِي الشَّيْطَانُ اَحَدَكُمْ فَيَقُوْلُ مَنْ خَلَقَ كَذَا. مَنْ خَلَقَ كَذَا حَتّٰى يَقُوْلَ مَنْ خَلَقَ رَبَّكَ فَاِذَا بَلَغَ ذٰلِكَ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللّٰهِ وَلْيَنْتَهِ (رواه الثلاثة)

اللہ تعالیٰ کی ذات پاک میں کھود کرید کرنے کی ممانعت

(۳) ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا شیطان تمہارے پاس آتا ہے اور کہتا ہے یہ چیز کس نے پیدا کی؟ یہ چیز کس نے بنائی؟ یہاں تک کہ کہتا ہے اچھا تو تمہارے پروردگار کو کس نے پیدا کیا؟ جب یہاں تک نوبت پہنچے تو خدا کی پناہ لینا چاہئے اور اس کے ساتھ سوال و جواب کا سلسلہ ختم کر دینا چاہئے (اس حدیث کو تین کتابوں میں روایت کیا ہے)

(۳) امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں مداخلِ شیطان پر طویل بحث کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ وہ کیا کیا ہیں، کن کن راستوں سے شیطان آتا ہے اور کن کن وساوس میں مبتلا کرتا ہے، ان تمام تفصیلات کو تو یہاں نقل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ حدیث کی شرح کے لئے اتنا لکھنا ضروری ہے کہ اس کے بہکانے کا ایک راستہ یہ ہے کہ پہلے وہ دماغ میں سوالات کا ایک مرتب سلسلہ قائم کر دیتا ہے اور نہایت سادگی کے ساتھ اس ضمن میں ایک غلط کلیہ ذہن نشین کر دیتا ہے جس میں بظاہر کوئی سقم نظر نہیں آتا۔

دیکھو یہ کتنی سیدھی اور سچی بات ہے کہ مخلوق کے دائرہ میں جس طرف نظر اٹھاؤ خالق کا سوال بجا ہی بجا نظر آئے گا، اس لئے یہ بدیہی ہوگا کہ جو چیز ہے اس کا کوئی خالق ضرور ہے۔ اس قاعدہ کو کلیہ تسلیم کرنے کے لئے اس مشاہدہ سے زیادہ سہل طریقہ اور کیا تھا مگر اس کے بعد اب دھوکا یہ ہے کہ اللہ کو مخلوق کے دائرہ میں شامل کر کے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ جب کلیۃً ہر چیز کے لئے خالق ہونا مسلم ہو گیا تو پھر اللہ کے لئے بھی کوئی خالق ہونا چاہئے۔ گو یہ سوال غلط در غلط تھا کیونکہ اللہ اسی کو کہتے ہیں جو سب کا خالق ہو اور وہ کسی کی مخلوق نہ ہو پھر اس کے متعلق خالق کا سوال کرنا تناقض سوال ہے۔ مگر وسوسہ ایسی ہی باطل حقیقت کا نام ہوتا ہے۔ بسا اوقات خود انسان کا ضمیر بھی اس پر نفرین کرتا ہے مگر دل ہے کہ تذبذب میں ڈوبا چلا جاتا ہے۔ مصیبت یہ ہو جاتی ہے کہ جب ایک مسلسل اور مرتب مشاہدہ کے بعد دل میں ایک بات اثر کر جاتی ہے تو اس کی تردید کے لئے جب تک اسی درجہ کا مرتب و مسلسل مشاہدہ میسر نہ ہو اطمینان نصیب نہیں ہوتا مگر یہاں سوائے ایک اللہ کے اور کوئی ایسا ملتا ہی نہیں جس کا خالق کوئی نہ ہو اس لئے ذہن اندر ہی اندر اپنے قدیم تاثر کے ماتحت خالق کے لئے خالق کا مطالبہ کرتا ہی رہتا ہے۔ عقل گو ہزار دفعہ اُسے سمجھاتی ہے مگر اپنی آنکھوں کا مشاہدہ ہر دفعہ اسے ناسمجھ بنا دیتا ہے۔

ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے شبہات پر اگر غور کرو گے تو اس کا حاصل بھی اتنا ہی پاؤ گے یعنی مصنوعات کے سطحی مطالعہ کے پہلے ایک قاعدہ ذہن نشین کر لیا جاتا ہے۔ اگر واقعات نے اپنی خاموش زبان سے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِنَّ اُمَّتَكَ لَا يَزَالُوْنَ يَقُوْلُوْنَ مَا كَذَا مَا كَذَا حَتّٰى يَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ خَلَقَ الْخَلْقَ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ۔ (رواہ الشیخان)

(۵) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَزَالُوْنَ يَسْئَلُوْنَكَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا هٰذَا اللّٰهُ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ قَالَ فَبَيْنَا اَنَا فِي الْمَسْجِدِ

(۴) انس بن مالکؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ نے ایک حدیث قدسی ارشاد فرمائی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (اے پیغمبر) آپ کی امت برابر یہ کہتی رہے گی یہ کیسے ہوا، یہ کیسے ہوا، یہاں تک کہ یہ کہے گی خدا نے تو ساری مخلوق کو پیدا کیا پھر خدا کو کس نے پیدا کیا۔ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

(۵) ابوہریرۃؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اے ابوہریرۃؓ لوگ تجھ سے برابر سوالات کرتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ سوال کریں گے یہ تو اللہ ہے (جس نے مخلوق بنائی)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کی تردید نہ کی تو پھر اس کا نام فلسفہ بن جاتا ہے اور اسی فلسفہ کی بنا پر الٰہیات کے بلند پایہ حقائق اور عالم غیب کے برتر از عقول اسرار کا نہایت دلیری سے انکار کردیا جاتا ہے اور اس طرح دنیا ہے کہ صانع کو مصنوع پر، عالم غیب کو عالم شہود پر قیاس کر کر کے اپنی بے عقلی کا ہر دن ایک نیا ثبوت دیتی رہتی ہے مگر شیطان ہے کہ ہر روز نئے فلسفہ کے نام سے اُسے دماغوں میں اتارتا رہتا ہے اور نئی نئی گمراہی کے سامان مرتب کرتا رہتا ہے۔ شریعت نے راہ منحصر کردی اور متنبہ کردیا کہ اللہ کی ذات پاک عقل کی جولانگاہ نہیں بن سکتی اس کی ذات و صفات عقل کی سرحد سے بلند تر ہیں۔ جہاں دعوت غور و فکر ہے وہ دائرۂ مخلوق ہے خالق نہیں۔ بیرون از قیاس ہمیشہ قیاس سے باہر رہے گا۔ خدا تعالیٰ کا خالق ہونا بدیہی ہے یہاں یقین و معرفت کا راستہ صرف وہ وجدان ہے جو ہر شخص اپنے دل میں بلا غور و فکر محسوس کرلیتا ہے۔ بشرطیکہ شکوک و شبہات کو اس کو مکدر نہ کیا جائے اس فطری سوز کے ساتھ اگر سازِ انفس و آفاق کی آواز سنو تو اس کے ہر تار سے ایک ہی نغمہ سنو گے اور وہ خدا کی خالقیت کا اقرار ہوگا پھر مخلوق کا ہر ذرہ اس کے وجود کی ایک بڑی دلیل نظر آنے لگا اور اس طرح خدا کی ذات کا تم کو وہ یقین میسر آجائے گا جہاں وساوس خود بخود فنا ہو جائیں گے۔ بدیہیات میں جس قدر دلائل کی آزلی جاتی ہے اسی قدر الجھاؤ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ وجدانیات اور مشاہدات ہمیشہ وجدان اور مشاہدہ سے ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ذات پاک کا مشاہدہ تو ہو نہیں سکتا اس لئے یہاں یقین کی راہ آفاق و انفس میں غور و تفکر سے کھلتی ہے۔

وسوسہ ہے کیا؟ انسان کی خود اپنے ہی نفس کی تراشیدہ باتیں، یہاں جو متکلم ہے وہی مخاطب ہے جو مسیحا ہے وہی بیمار ہے، اس لئے وسوسہ کو کتنا ہی ختم کیجئے ختم نہیں ہوتا۔ اگر مخاطب کوئی دوسرا ہوتا تو دلائل و براہین سے اس کا منہ بند کیا جا سکتا، یہاں تو دل ہی دل میں یکے بعد دیگرے لایعنی سوالات کا ایک سلسلہ زلفِ مسلسل کی طرح کھنچا چلا جاتا ہے اس لئے معالج حقیقی نے مناظرہ کی راہ نہیں بتلائی کہ یہ اور شکوک و شبہات کی راہ ہے بلکہ ایسی چار باتوں کا امر فرمایا ہے جن میں سے ہر ایک اس نادیدہ دشمن پر فتح حاصل کرنے کا ایک مستقل سامان ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

إِذْ جَاءَنِي نَاسٌ مِنَ الْأَعْرَابِ فَقَالُوْا يَا أَبَا هُرَيْرَةَ هٰذَا اللّٰهُ فَمَنْ خَلَقَ اللّٰهَ قَالَ فَأَخَذَ حَصًى بِكَفِّهٖ فَرَمَاهُمْ بِهٖ ثُمَّ قَالَ قُوْمُوْا قُوْمُوْا صَدَقَ خَلِيْلِي صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ مسلم)

(۶) عَنْهُ قَالَ جَاءَ نَاسٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلُوْهُ إِنَّا نَجِدُ فِي أَنْفُسِنَا مَا يَتَعَاظَمُ أَحَدُنَا أَنْ يَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ وَقَدْ وَجَدْتُمُوْهُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذٰلِكَ صَرِيْحُ الْإِيْمَانِ. وَفِي رِوَايَةٍ مَحْضُ الْإِيْمَانِ (رواہ مسلم)

تو اللہ کو کس نے بنایا ہے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں بیٹھا ہوا تھا دفعۃً چند گنوار میرے پاس آئے اور بولے اے ابوہریرہؓ یہ تو اللہ ہے (جس نے مخلوق کو پیدا کیا ہے) پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے۔ ابوسلمہ راوی حدیث کہتا ہے کہ ابوہریرہؓ نے اپنی مٹھی میں کنکریاں لیکر ان پر پھینکیں اور فرمایا اٹھو اٹھو میرے پیارے رسولؐ نے سچ فرمایا تھا (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)۔

(۶) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند صحابہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں ایسے خطرات محسوس کرتے ہیں کہ انھیں زبان سے ادا کرنا ہمارا معلوم ہوتا ہے آپ نے جواب دیا کہ کیا تمہیں یہ ناگواری ہوتی ہے؟ وہ بولے جی ہاں، آپ نے فرمایا پھر یہ تو کھلا ہوا ایمان ہے اور ایک روایت میں ہے خالص ایمان ہے۔ (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۱) اپنے آقائے حقیقی کی پناہ کہ جو اس کی پناہ لیتا ہے اسے پناہ مل جاتی ہے (۲) تذلیل خصم بقول شخصے جواب جاہلاں باشد خموشی، پہلی حدیث کا مفہوم یہی ہے (۳) ذکر اللہ۔ ان الذین اتقوا اذا مسہم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ہم مبصرون۔ (۴) تجدید ایمان۔ مبادا کہ وساوس کی رَو نے کہیں ایمان زخمی کر دیا ہو تو اس کی تلافی ہو جائے جیسا کہ صحیح مسلم کے لفظوں میں ہے لیکن اگر وساوس اپنی حد سے گذر کر کچھ دلائل کے ساتھ دل میں گھر کر چکے ہیں تو پھر ان کی توڑ کے لئے دلائل سے ہی مقابلہ کرنا ہوگا اب یہ وسوسہ نہیں عقیدہ کہلائیں گے۔

(۵) واضح رہنا چاہئے کہ جاہلوں سے مناظرہ کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت نہیں بلکہ ان کی سنت اعراض کرنا ہے۔ قرآن کریم میں ہے فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین۔ جو آپ کو حکم ملے اس کو دو ٹوک بیان کر دیجئے اور کافروں سے اعراض فرمایئے۔ معاند سے مناظرہ کرنا اپنے وقت کی اضاعت اور اس کی درشت فطرت کو اور ضد پر آمادہ کرنا ہے اس لئے ابوہریرہؓ نے یہاں اعراض کرنا ہی مناسب سمجھا۔ نیز وسوسہ غیر اختیاری چیز ہوتی ہے۔ بعض مرتبہ بحث کے الجھاؤ میں خود اپنے دل میں وساوس گذرنے لگتے ہیں اس لئے سلف ہمیشہ ایسی جھاڑیوں میں گھستے ہوئے ڈرا کرتے تھے۔ جہاں ان کے یقین میں شک و تردد کا کانٹا بھی لگنے کا اندیشہ ہوتا تھا

(۶) بعض علماء کا یہ خیال ہے کہ خود وساوس ہی ایمان کی علامت ہیں جیسا کہ چوری ہونا مالداری کی نشانی ہے مفلس کے ہوتا تو چور کیا آتے، اسی طرح نہ یہاں ایمان ہوتا نہ وساوس آتے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ اِنِّيْ اُحَدِّثُ نَفْسِيْ بِالشَّيْءِ لَاَنْ اَكُوْنَ حُمَمَةً اَحَبُّ اِلَيَّ مِنْ اَنْ اَتَكَلَّمَ بِهٖ قَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ رَدَّ اَمْرَهٗ اِلَى الْوَسْوَسَةِ (رواہ ابوداؤد)

(۷) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور کہا میرے دل میں ایسی باتیں پیدا ہوتی ہیں کہ مجھے (جل کر) کوئلہ ہو جانا ان کے ادا کرنے سے زیادہ پسند ہے۔ آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے کہ اس کے معاملہ کو اس نے صرف وسوسہ کی حد تک رکھا۔ (اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اسی لئے بندہ جتنا تقرب کی راہ چلتا ہے اتنا ہی وساوس اُسے ادھ گھیرتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ وساوس جس قدر نماز میں آتے ہیں اتنا عام حالات میں نہیں آتے ادھر شیطان اپنی سعی میں لگا رہتا ہے اُدھر بندہ اپنے مولیٰ کی پناہ لیکر اُسے دفع کیا کرتا ہے جتنا وہ اس کے ایمان کو گندہ کرنے کی فکر کرتا ہے اتنا ہی یہ اپنی انتہائی بیزاری کرکے اسے پاک و صاف کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وساوس نذارد ہو جاتے ہیں اور اس کا ایمان صاف و خالص رہ جاتا ہے۔ حدیث میں صریح ایمان اور خالص ایمان کی شرح یہ ہے۔ (کتاب الایمان ص ۱۱۳)

(۷) آپ کے جواب کی دو شرح کی گئی ہیں۔ پہلی شرح اس پر موقوف ہے کہ "امرہ" میں ضمیر کا مرجع شیطان قرار دیا جائے اس وقت مطلب یہ ہوگا کہ آپ نے خدا کا شکر اس بات پر ادا فرمایا کہ اس نے شیطان کو وسوسہ ڈالنے سے زیادہ پر قدرت ہی نہیں دی۔ دوسری شرح میں ضمیر کا مرجع خود یہ شخص ہے اور اب مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس شخص کا معاملہ صرف وسوسہ کی حد تک رہ گیا اور اس سے آگے تجاوز نہ کر سکا۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ جب خالق کے لئے خالق کا تسلسل دماغ میں پیدا ہونے لگے تو اس کے دفع کرنے کے لئے آپ نے یہ کلمات پڑھنا تعلیم فرمائے ہیں "هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ"۔ ابوزمیل نے ابن عباسؓ سے عرض کیا کہ میرے سینہ میں ایک بات کھٹکتی ہے فرمایا کیا ہے؟ انہوں نے کہا زبان پر نہیں لا سکتا فرمایا کہ اس قسم کے وساوس سے کس کو چھٹکارا ہے۔ جب ایسی بات پیش آئے تو کلمات مذکورہ بالا پڑھ لیا کرو۔ ان کلمات کا حاصل یہ ہے کہ علل میں تسلسل عقلاً محال ہے اس لئے مخلوقات کا سلسلہ ضرور کہیں جا کر خالق پر ختم ہونا چاہئے۔ پھر جس سے پہلے اور جس کے بعد کوئی نہ ہو وہی اول و آخر ایک ذات ہے اس کے لئے پھر خالق کا تصور کرنا موجبِ تسلسل ہے۔ شیطان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو آنکھوں سے نظر آئیں یہ شیطان الانس ہیں۔ دوم جو آنکھوں سے نظر نہ آئیں یہ شیطان الجن ہیں۔ جو آنکھوں سے نظر آئیں ان کے شر سے حفاظت کی صورت اعراض و درگذر کرنا یا معقول جواب دینا ہے جیسا کہ ابوہریرہؓ نے کیا تھا۔ دوسری قسم کا علاج استعاذہ اور خدا سے پناہ مانگنا ہے۔ ان دونوں صورتوں کو کسی شاعر نے نظم کر دیا ہے ؎

فما هو الا الاستعاذة ضارعا	دو باتیں (وسوسہ کا) بہترین علاج ہیں ایک تضرع کے ساتھ استعاذہ کرنا۔
او الدفع بالحسنى هما خير مطلوب	دوم معقول پیرایہ میں جواب دینا۔
فهذا دواء الداء من شر ما يرى	پہلی بات تو اس شیطان کے شر کا علاج ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا اور دوسری بات
وذاك دواء الداء من شر محجوب	اس شیطان کا جو آنکھوں سے نظر آتا ہے۔ یعنی بہکانے والے انسان)

إِسْمُ اللّٰهِ الْأَعْظَمُ

اسمار دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن میں صرف ذات ملحوظ ہوتی ہے اِن کا مقصد صرف اس ذات کا تعارف ہوتا ہے، براہِ راست اِن کی صفات کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہوتا، دوسرے وہ جن میں خاص کسی نہ کسی صفت کا لحاظ ہوتا ہے، ان اسما سے اس ذات کی کسی خاص صفت ہی کا تعارف ہوتا ہے اور یہی پہلی قسم اسمِ ذات اور دوسری اسمِ صفت کہلاتی ہے، خدا کا ذاتی نام یا "اللہ" ہے یا "رحمٰن" بقیہ جتنے نام ہیں اس کے صفاتی نام ہیں۔ ذات میں چونکہ جملہ صفات کا وجود لپٹا ہوا ہوتا ہے اس لئے اسمار میں اسمِ اعظم شاید وہی اسم ہو سکتا ہے جس کو اسمِ ذات کہا جائے اس لحاظ سے اسمِ اعظم یا "اللہ" یا "رحمٰن" ہونا چاہئے۔ رحمٰن گو اسمِ صفت ہے مگر بارگاہِ الوہیت میں رحمت کا اتنا غلبہ ہے کہ اس کی ذات ہی گویا عین رحمت ہے اس لئے بنی اسرائیل میں "رحمٰن" خدا کے اسمِ ذات کی جگہ مستعمل تھا۔ شریعتِ اسماعیلیہ میں جو اصل اسمِ ذات تھا وہ خدا کو پکارنے کے لئے بتلا دیا گیا اور اسی لئے جو شریعت آخری شریعت اور سب شرائع کی جامع تھی اس نے بسم اللہ میں ان دونوں ناموں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث میں جہاں جہاں نظر ڈالئے وہاں اسمارِ الٰہیہ میں پہلے لفظِ اللہ مذکور ہوتا ہے بقیہ نام اس کے بعد بطور تابع ذکر ہوتے ہیں۔ یہی حال اسم "رحمٰن" کا ہے۔ جہاں یہ اسمِ مبارک اور اسمار کے ساتھ مستعمل ہے وہاں اس کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے اس لحاظ سے بسم اللہ میں دو اسمِ ذاتی ہیں اور ایک اسمِ صفتی، اس لئے رحمٰن و رحیم کے یکجا جمع کرنے میں جو پُر از تکلفات جواب دئے گئے ہیں احقر کے نزدیک ان کی ضرورت نہیں ہے۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ شریعتِ موسویہ چونکہ جلالی شریعت تھی اس لئے ضرورت تھی کہ اس میں خدا کو ہمیشہ "الرحمٰن" کہہ کر پکارا جائے، شریعتِ اسماعیلی جمالی شریعت ہے یہاں اسمِ ذات وہ رہیگا جو در اصل ذاتِ باری تعالیٰ کے لئے موضوع ہو وہ لفظ اللہ ہے۔

(۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ بُرَيْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْأَلُكَ اِنِّىْ اَشْهَدُ اَنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ

اللہ تعالیٰ کا اسمِ اعظم

(۸) عبد اللہ بن بریدہؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص

۱؎ شیخ اکبرؒ کو اس میں کچھ تردد ہے۔ دیکھو الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۱، ۲۔ ۲؎ اسمائے الٰہیہ میں تفاصیل کی بحث دیکھنا ہو تو الیواقیت والجواہر ج ۱

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ
فَقَالَ لَقَدْ سَاَلْتَ اللّٰهَ بِالْاِسْمِ الَّذِیْ اِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰی وَاِذَا دُعِیَ بِهٖ اَجَابَ
(رواہ اصحاب السنن)

کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا "اے اللہ میں درخواست پیش کرتا ہوں کہ میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تو ہی ہے تیرے سوا کوئی خدا نہیں، یکتا ہے، بے نیاز ہے، نہ کسی کا باپ ہے، نہ اس کا کوئی بیٹا، نہ اس کا کوئی ہمسر، آپ نے فرمایا کہ تو نے خدا تعالیٰ کو وہ نام لیکر پکارا ہے کہ جب اس نام کے ساتھ اس سے سوال کیا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے اور جب اس کو پکارا جاتا ہے تو ضرور جواب دیتا ہے۔ (اس حدیث کو اصحاب سنن نے روایت کیا)

(۸) مشرکین عرب جو خدائی تنزیہ سے یکسر نابلد تھے ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے تخیل کے مطابق نہایت بے باکی سے یہ سوال کر بیٹھے "انسب لنا ربک" ہمیں ذرا اپنے پروردگار کا نسب تو بتلایئے، گویا ان کے نزدیک خدا تعالیٰ بھی انسانوں کی طرح حسب و نسب کے میزان میں تولا جا سکتا تھا۔ ان کے اس جاہلانہ سوال کے جواب میں ایک نہایت مختصر ترین سورت اتری، جس نے خدا کی ذات کا سب سے اعلیٰ اور سب سے پاک تعارف اس طرح پیش کیا کہ وہ یکتا و یگانہ ہے، نہ ذات میں اس کا کوئی شریک ہے نہ صفات میں اس کا کوئی سہیم، یہی احدیۃ کا مفہوم ہے۔ یہ وہ صفت تھی کہ اس سے زیادہ آسان اور اس سے زیادہ صحیح تعارف کسی اور صفت کے ساتھ مشکل ہے۔ ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ایک صفت واحدیت بھی ہے مگر احدیت اس سے کامل تر ہے تمام سورۂ اخلاص اسی کی تفسیر ہے۔ صمدیت اسی احدیت کی تکمیل ہے اور لم یلد ولم یولد اسی کی تشریح۔ صمد بے نیاز کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ ایک اور اکیلا ہو کر بھی اپنے کمال میں کسی کا محتاج نہیں۔ والد کی طرح نہیں جو اپنے بیٹے کے لئے محتاج الیہ ہو کر بھی اپنے کمالات کی شہرت و بقا میں تمام تر اپنے بیٹے کا محتاج ہے اور نہ اس ولد کی طرح ہے جو ایک جہت سے محتاج الیہ بن کر بھی اپنے وجود میں والد کا سرتا سر محتاج ہوتا ہے۔ نسب وہاں قائم ہو سکتا ہے جہاں رشتۂ اشتقاق پیدا ہو سکے۔ جہاں اوپر اور نیچے کی دونوں جانبوں میں رشتۂ اشتقاق نہیں وہاں نسب کا تصور بھی نہیں۔ اصول و فروع سے گذر کر نسب کا دوسرا تخیل شعب و اطراف میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر جس کا کوئی کفو و نظیر بھی نہیں اس کے لئے نسب کا تصور اطراف و جوانب میں بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ صرف یہ جواب کہ اس کا کوئی نسب نہیں ان کے مذاقِ فطرت کے موافق نہ تھا۔ اسلئے آپ نے پہلے وجودی دو صفتیں ایسی ذہن نشین کر دیں جس کے نتیجہ میں دو سلبی صفتیں پیدا ہو جائیں اور اس کے بعد نسب کا سوال خود بخود ذہنوں سے نکل جائے۔ یہ واضح رہنا چاہئے کہ غنی و صمد میں بڑا فرق ہے۔ صمد اس کو کہتے ہیں جو خود کسی سے برآمد نہ ہو سکے اور نہ کوئی دوسرا اس سے برآمد ہو سکے جیسا کہ والد اور ولد، اس لئے خدا کے نسب کی بجائے (جو ایک ذاتی چیز تھی اس کی) صمدیۃ کو پیش کیا گیا ہے۔ غنا و فقر نسب کی جگہ نہیں آ سکتے، یہ خارجی اوصاف و عوارض ہیں۔ نسب ایک رشتۂ خون کا نام ہے جس میں جزئیت کا مفہوم کسی نہ کسی پہلو سے ضرور سامنے آتا ہے۔ صمدیۃ اس رشتہ کے بالمقابل غنا و بے نیازی کا نام ہے یعنی اس ذات پاک میں اس اندرونی اشتقاق کی صلاحیت ہی نہیں ہے کہ کسی نوعیت سے بھی وہاں نسب کی شرکت کا تصور لایا جا سکے۔ اسماء الٰہیہ میں بسا اوقات الفاظ کا ترجمہ یکساں نظر آتا ہے مگر اس کے مصداق و صحیح مفہوم میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ان مختصر نوٹوں میں ان تمام تفاصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں پر تشریح صرف اس مقصد کے پیش نظر ہے کہ ابتداءِ کتاب میں خدا تعالیٰ کے مختصر تعارف کے ساتھ ان اسماء کی مقبولیت و محبوبیت کی وجہ بھی کچھ نہ کچھ ذہن نشین ہو جائے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۹) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِسْمُ اللّٰهِ الْاَعْظَمُ فِيْ هَاتَيْنِ الْاٰيَتَيْنِ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ وَفَاتِحَةُ سُوْرَةِ اٰلِ عِمْرَانَ. الٓمّٓ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (رواه الامام احمد وابوداؤد والترمذی)

(۱۰) عَنْ اَنَسٍ اَنَّهٗ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا فِي الْمَسْجِدِ وَرَجُلٌ يُّصَلِّيْ ثُمَّ دَعَا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ بِاَنَّ لَكَ الْحَمْدُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْمَنَّانُ

(۹) اسماء بنت یزیدؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ "تمہارا خدا ایک ہے، معبود کوئی نہیں مگر وہی ایک اللہ جو بہت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے" اور دوسری آیت سورۂ آل عمران کے شروع میں ہے الٓمّٓ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (الم اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ سدا رہنے والا اور تمام مخلوق کی ہستی قائم رکھنے والا ہے (اس حدیث کو امام احمدؒ ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے)۔

(۱۰) انسؓ سے روایت ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں بیٹھے تھے ایک آدمی نماز پڑھ رہا تھا (نماز سے فارغ ہو کر) اس نے یہ دعا کی "اے اللہ میں یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ تعریف صرف تیرے لئے ہے، خدا کوئی نہیں مگر تو، زبردست محسن ہے۔ زمین و آسمان کو بلا کسی نمونہ کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لم یولد اور خود جنا نہیں گیا۔ شیخ اکبرؒ یہاں ایک لطیفہ لکھتے ہیں کہ عقل انسانی غور و فکر اور ترتیب مقدمات کے بعد جو نتیجہ بھی نکالتی ہے وہ اس کا مولود اور پیدا کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں خدا تعالیٰ کی صفات میں یہ پہلی صفت ہے کہ وہ کسی کا مولود نہیں۔ اب بھلا اس عاقل کو خدا کی ذات کی کیا معرفت ہے جس کی معرفت خود اپنی تراشیدہ اور اپنی ہی پیدا وار ہے۔ ملہ

(۹) خدا کی ایک نمایاں صفت "حی" بھی ہے مگر وہ ایسا "حی" نہیں جس پر موت آسکے اونگھ یا نیند کا گذر ہو سکے۔ بلکہ ایسا "حی" جس کے وجود کے ساتھ تمام عالم کا رشتۂ حیوٰۃ قائم ہو، ایسا "حی" کہ اگر وہ نہ ہو تو عالم کی حیوٰۃ اور حیوٰۃ سے پہلے اس کا وجود مٹ جائے۔ عالم میں جن کو "حی" کہا جاتا ہے ان کی طرح نہیں کہ اپنے قیام وجود میں ہر لحظہ دوسرے کا محتاج ہو بلکہ ایسا "حی" جس کی حیوٰۃ دوسروں کے لئے منشاء حیوٰۃ ہے اسی وجہ سے اس کا دوسرا نام قیوم ہے اسی کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (الفاطر)	اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو تھام رکھا ہے کہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں، اور اگر ٹلنے لگیں تو اس کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھام سکے۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

ملہ الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۵۰

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ دَعَا اللّٰهَ بِاسْمِهِ الْعَظِيْمِ الَّذِيْ اِذَا دُعِيَ بِهٖ اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِهٖ اَعْطٰى۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی)۔

(۱۱) وَعَنْ سَعْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَعْوَةُ ذِي النُّوْنِ اِذَا دَعَا رَبَّهٗ وَهُوَ فِيْ بَطْنِ الْحُوْتِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ لَمْ يَدْعُ بِهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا اسْتَجَابَ لَهٗ (رواہ احمد والترمذی)

(۱۲) وَعَنْ بُرَيْدَةَ قَالَ دَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَسْجِدَ عِشَاءً فَاِذَا رَجُلٌ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَقُوْلُ هٰذَا مُرَاءٍ قَالَ بَلْ مُؤْمِنٌ

پیدا کرنے والا ہے، اے جلال و اکرام والے، اے ناقابلِ فنار اور مخلوق کی ہستی قائم رکھنے والے۔ (یہ سن کر) آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے اللہ کا وہ نام لیکر دعا کی ہے کہ جب وہ اس نام کے ساتھ پکارا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے اور جب اس سے مانگا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے۔ (اس حدیث کو ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۱) سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ذوالنونؑ نے جب اپنے پروردگار کو مچھلی کے پیٹ میں پکارا تھا تو یوں پکارا تھا۔ لا الہ الا انت الخ سوا تیرے کوئی معبود نہیں تیری ذات پاک ہے، بیشک میں ظلم کرنے والوں میں سے تھا۔ کوئی مسلمان کسی حاجت میں خدائیتعالیٰ کو ان کلمات سے یاد نہیں کرتا مگر وہ ضرور اس کی سنتا ہے (اس حدیث کو احمدؒ ترمذیؒ نے روایت کیا ہے)۔

(۱۲) بریدہؓ فرماتے ہیں کہ عشار کے وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسجد میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص بلند آواز سے قرارت کر رہا ہے میں نے عرض کیا آپ اس کے متعلق کیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آیۃ الکرسی میں اسی لئے الحی کے بعد القیوم پھر اس کے بعد "لاتاخذہ سنۃ ولا نوم" کا لفظ رکھا گیا ہے۔ یہ نہایت اہمیت کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اسمار الہیہ ہیں جس جس نام کا ذکر ہے پھر جو ترتیب ان اسمار میں رکھی گئی ہے وہ اپنی جگہ بڑے اسرار کی حامل ہوتی ہے محض اسمار شماری منظور نہیں ہوتی، پہلی حدیث میں "احدیۃ" و "صمدیۃ" اور یہاں "الحی القیوم" کے ارتباط کا کوئی شمہ بیان کر دیا گیا ہے۔ تفسیر ہمارا موضوع نہیں کہ زیادہ بسط کیا جائے۔

(۱۰) جس طرح خدا کی ذات مبارک ہے اسی طرح اس کے اسمار بھی مبارک ہیں اس لئے اس کے نام کی برکتوں سے دعائیں قبول ہوتی ہیں جب وہ ان کے وسیلہ سے پکارا جاتا ہے تو ہر پکار کی اجابت کرتا ہے "بسم اللہ" میں لفظ اسم اسی لئے اضافہ کیا گیا ہے کہ ہر کام کے شروع میں اس کے نام کی برکت ڈھونڈی جائے۔ اقرأ باسم ربک الذی خلق۔ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کی برکت سے جس نے آپ کو پیدا کیا۔

مُنِيبٌ قَالَ وَأَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ يَقْرَأُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهُ فَجَعَلَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
يَسْتَمِعُ لِقِرَاءَتِهِ ثُمَّ جَلَسَ وَأَبُو مُوسَى يَدْعُو فَقَالَ اللَّهُمَّ إِنِّي أُشْهِدُكَ أَنَّكَ أَنْتَ اللهُ
لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَحَدًا صَمَدًا لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ سَأَلَ اللهَ بِاسْمِهِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى وَإِذَا دُعِيَ بِهِ
أَجَابَ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ أُخْبِرُهُ بِمَا سَمِعْتُ مِنْكَ قَالَ نَعَمْ فَأَخْبَرْتُهُ بِقَوْلِ
رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لِي أَنْتَ الْيَوْمَ لِي أَخٌ صَدِيقٌ حَدَّثْتَنِي
بِحَدِيثِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ رزین)

خیال فرماتے ہیں، کیا یہ ریاکار ہے؟ فرمایا نہیں بلکہ وہ اپنے خدا کی طرف جھکنے والا مرد مومن ہے۔ راوی کہتا ہے کہ یہ زور سے پڑھنے والے شخص ابو موسیٰؓ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کی قرأت بغور کان لگا کر سننے لگے۔ پھر ابو موسیٰؓ دعا کرنے کے لئے بیٹھے تو بولے اے اللہ میں تجھے ہی گواہ بناتا ہوں کہ اللہ بس تو ہی ہے، یکتا، بے نیاز ہے، نہ کسی کو جنا، نہ کسی نے اس کو جنا، نہ اس کا کوئی نظیر و ہمسر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس نے خدا کا وہ نام لیکر سوال کیا ہے کہ جب وہ اس نام سے سوال کیا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے اور جب پکارا جاتا ہے تو ضرور جواب دیتا ہے۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ بات جو میں نے آپ سے سنی ہے کیا ان سے بھی کہدوں؟ آپ نے فرمایا کہدو۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ خوشخبری ان کو سنادی۔ انھوں نے کہا آج کے بعد تم میرے سچے بھائی ہو کیونکہ تم نے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ خوشخبری سنائی ہے (اس حدیث کو رزین نے روایت کیا ہے)۔

---

(۱۲) عرب میں مواخاۃ صرف لفظی بات نہ تھی بلکہ یہ تعاون و ہمدردی کا ایک بڑا رشتہ تھا جو ان کے نزدیک خونی رشتہ سے کم نہ تھا۔ یہاں یہ رشتہ صرف اتنی بات پر قائم ہو رہا ہے کہ بریدہؓ نے انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے ایک بشارت سنائی تھی، مبشر کے ساتھ سلوک کرنا ان کا عام دستور تھا، جب اس وقت کچھ اور سلوک ممکن نہ ہوا تو انھوں نے عقد مواخاۃ ہی قائم کرلیا۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے اس کا اندازہ لگتا ہے کہ ان کے قلب میں اسلام اور بانی اسلام کے لئے جذبات کیا تھے۔

اذا دعی بہ اجاب واذا سئل بہ اعطی۔ ان دونوں جملوں میں فرق ہے پہلے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ خدا مرد مومن کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ کفار کی طرح نہیں کہ اس کا جواب تک نہیں آتا۔ "وَمَا دُعَاءُ الْكَافِرِينَ إِلَّا فِي ضَلَالٍ" کافروں کی پکار رائیگاں ہے۔

سوال، خاص حاجت کی طلب کو کہتے ہیں۔ دعا، عام ہے، اجابتِ دعا، سے مقصد داعی کا شرف اور اس کی قدر و منزلت بتلانا ہے۔ اس کی حاجت روائی، یہ ضمنی فائدہ ہے۔ جیسے کہ پکارنے کا مقصد بھی سوال نہیں بلکہ اس کی یاد ہے۔ اپنی حاجت پیش کرنا یہ ضمنی غرض ہے۔ اس لئے پہلا جملہ دوسرے سے ابلغ ہے۔

أَسْمَاءُ اللّٰهِ الْحُسْنٰى

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى۔ وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا۔ وَقَالَ تَعَالٰى۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى۔

(۱۳) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ

اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ

خدا کے لئے اسماءِ حسنیٰ ہیں انھیں سے اس کو پکارا کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ اے پیغمبر! ان سے کہدیجئے تم خدا کو اللہ کہکر پکارو یا رحمٰن کہکر جس نام سے بھی پکارو یہ سب اس کے حسن وخوبی کے نام ہیں۔

(۱۳) ابوہریرۃؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ کے لئے

۱۳) شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ بارگاہِ الٰہی میں ادب یہ ہے کہ وہاں بجائے لفظ صفت اسم کا اطلاق کیا جائے اسی لئے قرآن کریم میں اللہ کیلئے اسماء کا تو ذکر کیا گیا ہے مگر صفات کا نام نہیں لیا گیا حالانکہ وہ اسماء بحقیقت اس کی صفات ہی ہیں۔[1] کاش اگر شیخ اکبرؒ کے اس ادب کا لحاظ رہتا تو شاید عین وغیرہ کے جو نزاعات لفظِ صفت کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہیں اتنے طویل نہ کھنچتے۔ (ب) شیخ اکبرؒ نے یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ اسماءِ الٰہیہ توقیفی ہیں جو نام جس طرح شریعت میں استعمال کیا گیا ہے اس سے تجاوز کرنا درست نہیں اس لئے خدا تعالیٰ کو "حی" کہا جائے گا مگر "ذوحیوۃ" نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح جہاں کسی صفت کی نسبت بطریق فعل وارد ہے اس کو بھی بدلا نہیں جا سکتا جیسا کہ "اللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ" اس لحاظ سے خدا تعالیٰ پر "مستہزا" کا اطلاق جائز نہ ہوگا۔ (ج) خدا تعالیٰ کے جتنے اسماء ہیں سب حسن وخوبی کے اسماء ہیں اس لئے "وھو خادعھم" کی وجہ سے خدا تعالیٰ کو "خادع" نہیں کہا جا سکتا۔ مفسرین نے تو اس کے جوابات اور دیئے ہیں مگر شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ ان آیات کو تلاوت کرتے ہوئے چاہئے کہ ایک انسان بحرِ ندامت میں غرق ہو جائے کیونکہ یہاں ہماری تفہیم وفہمائش کے لئے قرآنِ کریم نے تنزل کرکے بارگاہِ صمدیت میں ایسے الفاظ استعمال کرلئے ہیں جو اس کی شایانِ شان نہ تھے۔ مگر کیا کیجئے کہ عالمِ انسانیت اپنے قصور ونقصان کی وجہ سے عالمِ تجرد کے بہت سے مخاطبات کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اس لئے جب ناقص رتبہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر کامل ہی کو کچھ تنزل اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جاہل ان الفاظ کو پڑھتا اور بے محابا استعمال کرتا ہے اور عاقل فرطِ ندامت سے گڑ جاتا ہے اس کا اعتقاد ان الفاظ کو سن کر ڈگمگانے لگتا ہے اور اس کی عقیدت دوگنی دوگنی بڑھتی جاتی ہے۔[2] (د) شیخ اکبرؒ نے یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ گو بلحاظ لغت بعض اسماءِ الٰہیہ کا اطلاق انسانوں پر بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ "نافع" "وکیل" "نور" مگر شرعاً وعقلاً بطریق اسم اعظم ممنوع قرار دیا جائے گا اور اگر بالفرض کہیں اطلاق ہوگا تو اس کے اصل معنی سے ذہول ضروری ہوگا۔ مثلاً "مومن" ایماندار ہونے کی جہت سے درست ہو سکتا ہے مگر جس لحاظ سے خدا پر مومن کا اطلاق کیا گیا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔[3] اس لئے جو اسماء خدا تعالیٰ کی بارگاہ کے لئے عرفِ عام یا خاص میں مشہور ہو چکے ہیں ان کا استعمال دائرہ انسان میں ممنوع رہنا چاہئے۔

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

[1] الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۷۷۔ [2] ایضاً ص ۷۶۔ [3] ایضاً ص ۷۲

اِسْمًا مَنْ حَفِظَهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَاِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ۔ (رواہ الشیخان والترمذی)۔

۹۹ ننانوے نام ہیں جو انھیں یاد کرلے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات یکتا ہے اور اس لئے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔ اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۸) عام شارحین نے لفظ احصار کی مراد صرف زبانی یاد کرلینا قرار دی ہے مگر ارباب حقائق لکھتے ہیں کہ مقصد صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے آگے اُن اسماء کے ساتھ تخلق و تشبہ حاصل کرنا بھی ہے۔ خدائے تعالیٰ بار بار اپنے اسماءِ حسنیٰ کا ذکر کرکے چاہتا ہے کہ اس کی مخلوق میں بھی اپنے اپنے مبلغ پرواز کے موافق ان کی طلب و تمنا کا جذبہ پیدا ہو تاکہ عالم انسانیت ان اسماء کی تجلیات کی بدولت قعرِ اسفل السافلین سے نکل کر سطح اعلیٰ علیین پر فرد کش ہوسکے وہ اگر رب العالمین ہے تو یہ بھی اپنی مقدرت و استطاعت کے بقدر کمزوروں کی تربیت سے غافل نہ رہے وہ اگر ارحم الراحمین ہے تو یہ بھی رأفت و رحمت کا نمونہ دکھائے اور اسی طرح صفات مختصہ کے علاوہ ہر ہر صفت کا مظہر بننے کی سعی میں لگا رہے تاکہ خلافت اپنے صحیح معنی میں نمودار ہو اور اِنَّ اللّٰہ خلق آدم علیٰ صورتہ کا رمز طشت ازبام ہوجائے۔ شارحین حدیث نے ہر ہر اسم کے ساتھ تخلق کی شرح کردی ہے تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ — (۹) خدائے تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں اور ایسی بہت سے وہ بھی ہیں جو ہمیں بتلائے نہیں گئے۔ حدیث کے الفاظ او استاثرت بہ فی علم الغیب عندک یا او علمتہ احدا من خلقک سے اسی طرف اشارہ نکلتا ہے (یعنی وہ اسماء جو تونے صرف اپنے ہی علم کے لئے مخصوص رکھے ہیں یا وہ جن کو تونے اپنی مخلوق میں کسی کو بتلائے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ ذات کے تعارف کی دو ہی صورتیں ہیں یا وہ خود یا اس کی صفات۔ عالم امکان میں مشاہدہ کی طاقت نہ تھی اس لئے یہاں مشاہدۂ ذات تو ممکن نہ ہوا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولو العزم کو بھی آخر "لن ترانی" کا زخم کھانا ہی پڑا اس لئے صورت صرف اسماء و صفات کے ذریعہ تعارف کی باقی ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اسماء الٰہیہ بتلادیئے جائیں اور اتنے بتلادیئے جائیں کہ ایک معرفتِ ذات کا متلاشی اس راہ سے گذر کر در مقصود تک بسہولت رسائی حاصل کرلے۔ اسی لئے قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ جگہ جگہ اسماء صفاتی استعمال کرتا ہے پھر اپنے ماقبل و مابعد میں ان صفات کے مظاہر بطریق استشہاد پیش کرتا جاتا ہے تاکہ پہلے ان صفات کی عظمت ذہن نشین ہو، اور انسانی قصور ادراک و الفاظ کی وجہ سے ان کے بلند حقائق فہمی میں جو کوتاہی و خامی باقی رہ جائے وہ ان کے مظاہر دیکھ کر پوری ہوتی رہے اگر وہ اس کی عزت و قہر کا تذکرہ کرتا ہے تو بتلا دیتا ہے کہ یہ وہ عزت و قہر نہیں جس کی اس کے تصور میں سمائی ہو یا اگر جود و مہر کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی یہ سمجھا دیتا ہے کہ یہ اس نوع کا جود و مہر نہیں کہ وہاں تک عقل کی رسائی ہو اس کے اسماء و صفات اصل مقاصد نہیں بلکہ ذات کی معرفت کا صرف ایک راستہ ہیں جن میں سے گذر کر ذات پاک کی جھلک نظر آتی رہتی ہے اگر ان اسماء و صفات کا توسط نہ ہوتا تو داغِ مہجوری عالم امکان کے لئے ہمیشہ نقد وقت رہتا ذات پاک اپنی بے نیازی میں اور ممکن اپنے ادراک کے عجز و قصور میں ہمیشہ سرگرداں نظر آتا، یہ ذات اقدس کی بڑی فیاضی تھی کہ اس نے اپنی معرفت کے لئے حجاب صفات ڈال دیا ہے کہ جو مشتاق اس ذات مجمع جمیع صفات کا نظارہ کرنا چاہے وہ اس حجاب میں آج بھی نظارہ کرسکتا ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

سورۂ ملک کو پڑھئے اس کی ابتداء "تبارک الذی بیدہ الملک" سے ہوتی ہے اس میں خدائی ملک کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کی وسعت کے وہ حدود بتلائے گئے ہیں جو انسانی دست رس سے وراء الورا ہیں اس ضمن میں ایک ملک والے کے لئے جو اسماء و صفات درکار ہیں ان کو موقعہ بموقعہ ایسا چسپاں کیا گیا ہے کہ گویا وہ آیت اسی اسم کی حقیقت کی تشریح و تفہیم کے لئے آئی ہے اسی لئے علماءِ معانی نے اعجاز آیات کو قرآن کا ایک اعجاز قرار دیا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ)

(۱۴) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَىٰ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ اِسْمًا

(۱۴) ابوہریرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے ۹۹ نام ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بہرحال اگر اس تخیل و استحضار کے ساتھ آپ سورۂ ملک پڑھیں تو ابھی آپ آخر سورت تک پہنچنے نہیں پائیں گے کہ الٰہی جبروت و ملکوت کا ایک قاہرانہ تسلط آپ کے دل و دماغ پر مستولی ہو جائے گا۔ استواء علی العرش، اور سبع سماوات و ارضین عرش و کرسی کا تذکرہ بھی اس لئے نہیں ہے کہ خدا کے لئے کسی بڑے مکان کا تصور قائم کیا جائے بلکہ اس لئے ہے کہ ایک عاجز مخلوق کو ایک نادیدہ ذات کا تعارف ہو تو کیسے ہو اس لئے اس کی ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند تخیل کو اس کے سامنے رکھا گیا ہے تاکہ وہ خدائی عظمت و جلال کی بلند سے بلند رفعتوں کو عبور کرنے کے قابل ہو جائے، یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ بلا مصداق ہیں یہ تو معتزلہ کا مذہب ہے، ہرگز نہیں قرآن شاعرانہ خیال بندی سے بہت دور ہے وہ اسی لئے شعر کی مذمت کرتا ہے کہ اس میں حقیقت نہیں ہوتی اور یہاں صرف حقیقت ہی حقیقت ہے بلکہ عالم قدس نے درحقیقت ان اشیاء کو پیدا فرمایا ہے اور ان کی حقیقتیں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ذات پاک کا تصور پھر اس سے وراء الوراء ہے یہاں شیخ اکبرؒ کے الفاظ کس قدر قیمتی ہیں وہ فرماتے ہیں۔

ذلك لان صور المعتقدات والمعقولات	معتقدات اور معقولات کی صورتوں میں خدائی تجلیات اس لئے
هي جسور يعبر عليها بالعلم اي يعلم ان	ہوتی ہیں کہ وہ علم انسانی کی رسائی کے لئے ایک گذرگاہ اور پل
وراء هذه المظاهر امرًا لا يصح ان يعلم	بن سکیں جن سے عبور کرکے یہ علم حاصل ہو جائے کہ ان تجلیات
ولا يشهد وليس وراء ذلك المعلوم	کے پس پردہ کوئی ایسی باکمال ذات موجود ہے جو ہمارے احاطۂ
الذي لا يشهد ولا يعلم حقيقته ما يعلم	علم و مشاہدہ سے وراء الوراء ہے بس ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں
اصلًا۔ عله	کہ اُسے جان نہیں سکتے۔

کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نار یا نور دیکھا اور حقیقۃً دیکھا "انا ربك فاخلع نعليك" کی آواز سنی اور حقیقۃً سنی، مگر یہ سب تھا اس لئے باندھا گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس ذریعہ سے یہ فطری علم حاصل ہو جائے کہ اس نار کے پس پردہ کوئی نور اعظم ہے اور حقیقۃً ہے جس کے لئے یہ نار اس وقت تجلی گاہ بن رہی ہے جیسا کہ ایک انسان خواب میں خدائے عزوجل کو دیکھتا ہے اور اسے یقین ہوتا ہے کہ آج رات میں نے حقیقۃً خدا کو دیکھا ہے یہاں بھی دراصل اس نے معتقدات کی صورت ہی ہوتی ہے جس میں سے گذر کر اس کے دماغ میں صرف ایک یہ علم آجاتا ہے کہ اس نے خدا کو دیکھا ہے ورنہ خود وہ صورت خدا نہیں ہوتی۔ احادیث میں جہاں جہاں محشر میں رؤیۃ باری تعالیٰ کا ذکر ہے وہ بھی تجلیات ہیں جو ہر ہر عمل کے مناسب اہل محشر کے سامنے ہوں گی مشاہدہ تجلیات کا ہوگا اور اس ضمن میں علم، ماوراء تجلیات کا ہوتا رہے گا اور یہ علم اسی طرح صدی و فطری ہوگا جیسا کہ ایک ناواقف شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھتا اور کہتا ہے کہ میں نے آج شب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے حالانکہ بسا اوقات جو صورت وہ دیکھتا ہے وہ حلیۂ مبارک سے مطابقت بھی نہیں رکھتی۔ پس جس طرح عالم رؤیا کی یہ صورتیں کسی ذات کی معرفت کے لئے جسور (پل) اور راستہ بن جاتی ہیں، اسی طرح تجلیات خدائی معرفت کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ جو مشہود ہوتا ہے وہ مخلوق ہے اور جو معلوم ہوتا ہے وہ غیر مخلوق ہے اس لئے نہ ان الفاظ میں تاویل کی ضرورت ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

عله الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۴۹

مَنْ اَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ الْغَفَّارُ

جو انھیں یاد کرے وہ جنّت میں جائے گا۔ وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہایت مہربان، بہت رحم والا، وہ بادشاہ ہے، پاک ہے، ہر نقص و آفت سے سالم ہے، امان دینے والا، پناہ میں لینے والا ہے زبردست، دباؤ والا ہے، صاحبِ عظمت بنانے والا، نکال کھڑا کرنے والا، صورت بنانے والا، بہت بخشش والا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اور نہ ذات پاک کے لئے تجسیم و تشبیہ کی حاجت ہے[1]

کیف الوصول الی سعاد ودونها — سعاد (محبوبہ کا نام ہے) تک رسائی ہو تو کیسے ہو کہ اس سے پہلے بلند پہاڑیاں ہیں

قلل الجبال ودونهن حتوف — اور ان سے پہلے ایک موت نہیں بہت سی موتیں ہیں (ان سے گذرنا ممکن نہ ہو تو سلوک کیسا)

(۱۴) ۔ ف[5] خدا تعالیٰ کے یہ اسماء دو حال سے خالی نہیں ہیں یا ذات پاک کی تنزیہ و تقدیس، عظمت و جلال کا مظہر ہیں تو انھیں صفاتِ ذات کہا جاتا ہے اگر ان کا عالم مخلوق سے بھی تعلق ہو تو ان کا نام صفات افعال ہے۔ اس لحاظ سے اسماء دو قسم کے رہ جاتے ہیں صفات ذات و صفات افعال[2] ہر اسم کی تحقیق بہت تفصیل طلب ہے ترجمہ میں اس کی طرف کچھ اشارات موجود ہیں۔ شارحین حدیث اور ارباب حقائق نے اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔

(الرحمٰن الرحیم) اگر اس کے معنی بارادۂ رحمت کے ہوں تو صفتِ ذات ہے اور اگر بالفعل رحمت کرنے والا ہوں تو صفتِ فعل ہے (الملك) اگر اس کا ترجمہ ملک والا ہو تو صفتِ ذات ہے اور اگر اپنی ملکیت میں ایجاد و اعدام کا تصرف کرنے والا ہو تو صفتِ فعل ہے (القدوس) شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ تنزیہ کے لئے عیب کا تصور میں آنا ضروری ہے اس لئے تنزیہ یہ ہے کہ جو عیوب خدا کے لئے کسی ذہن میں آئے یا آسکتے ہیں اُن سے اس کی برتری و پاکی بیان کرنا اور تقدیس کا تعلق خود صفاتِ کمالیہ سے ہے اس لئے تقدیس تنزیہ سے اکمل ہے۔ عیوب سے پاکی اور صفاتِ کمالیہ کی پاکی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہی تنزیہ و تقدیس میں فرق سمجھنا چاہئے[3] یہ صفت ذات ہے۔ (الخالق الخ) کسی چیز کو معدوم سے موجود کرنا خلق ہے۔ پھر اس میں سے بقدر ضرورت علیحدہ کر لینا "برء" ہے اس کے بعد حسب ارادہ اس کا تسویہ و ترتیب یہ تصویر ہے۔ موجودات میں کاٹ تراش اور اس کی تصویر بنانا بھی کرتا ہے مگر معدومات میں یہ تینوں صفتیں اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہیں۔ پہلے وہی اس کا خالق ہوتا ہے پھر وہی باری و مصور بنتا ہے۔ (الغفار) مخلوق کی پردہ پوشی اور بلا مواخذہ گناہوں کی مغفرت کرنے والا۔ (البدیع) انسان کسی چیز کے بنانے سے پہلے اس کے نقشہ کا محتاج ہوتا ہے۔ یہ نقشہ خواہ کہیں پہلے موجود ہو یا اس کا ذہن تیار کرے لیکن خدا کی ذات پاک اس کی محتاج نہیں جب اس کے علم سے کوئی چیز باہر ہی نہیں تو پھر نقشہ کی تلاش اس کی بارگاہ میں مقصود ہی نہیں۔ م[4]

ف[1] حدیث ایک جدید اور عمیق فن ہے اس لئے یہاں ہم حدیث فہمی کے لئے کچھ مزید تشریحات کرتے جاتے ہیں تاکہ شروع سے اس کے سمجھنے کا ایک سلیقہ آجائے یہ اس طرح نہیں ہوگا کہ آپ ایک مرتبہ سُن لیں اور بس بلکہ پے در پے جب مختلف احادیث آپ کے سامنے آتی رہیں گی اور ہر جگہ آپ اس حقیقت سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے رہیں گے تو اس مشق کے بعد پھر کہیں آپ کا دل و دماغ اس کی حقیقت تک پہنچ سکے گا۔ یہ مضمون ارباب حقائق سے لیا گیا ہے مگر اس کی طرف رہنمائی کا احسان صرف حضرت استاذ کا ہے۔

ع[1] دیکھو الیواقیت ص ۹۶، ۹۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۹ ۔ ع[2] ایضاً ص ۷۱ ۔ ع[3] ایضاً ص ۷۵ ۔ ع[4] ایضاً ص ۶۸ ۔

المعزّ	الرّافع	الخافض	الباسط	القابض	العليم	الفتّاح	الرزّاق	الوهّاب	القهّار	
الغفور	العظيم	الحليم	الخبير	اللطيف	العدل	الحكم	البصير	السّميع	المذلّ	

بہت غلبہ والا، بہت دینے والا، روزی دینے والا، فیصلہ کرنے والا، جاننے والا، تنگی اور فراخی کرنے والا، پست و بلند کرنے والا، عزت و ذلت بخشنے والا، سننے والا، دیکھنے والا، اٹل فیصلہ والا، منصف، بھید جاننے والا، خبردار، بردبار، عظمت والا، مغفرت کرنے والا، تھوڑے

اسلام میں خدا کا تصور

یہ تو سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ہستی ہے اور ضرور ہے مگر کیسی ہے اس ادراک سے عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے۔ متاخرین فلاسفہ و حکما نے بزورِ عقل مقامِ معرفت تک رسائی چاہی تو تجرید و تنزیہ کی راہ پر اتنے دور نکل گئے کہ آخر میں سوائے عدمِ محض کے ان کے ہاتھ کچھ نہ آیا وہ یہی سوچتے رہے کہ لا کیف و لا این و لا وضع و لا اضافة و لا عرض و لا جوہر و لا کم وہ کیسا، کہاں، کتنا، کس طرح، کس طرف، خود قائم، یا دوسرے وجوہ کے ساتھ قائم۔ ان سب سوالات سے بیرون اور بالاتر ہستی ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ ان کا قدم تنزیہ ذرا اور آگے بڑھا تو صفات کا وجود بھی ہستیِ باری تعالیٰ کے لئے انہیں مادیہ کی طرح ایک عیب نظر آیا لہذا اس کی بھی نفی کر بیٹھے۔ آخر ان تمام اعلیٰ سے اعلیٰ تنزیہات کا میدان جہاں جا کر ختم ہوا وہ یہ تصور تھا کہ خدا یہ نہیں، یہ بھی نہیں، مگر پھر ہے کیا اس کے جواب میں "یہ نہیں" تسلی بخش نہیں ہے۔ یہاں اثباتی پہلو درکار ہے، انسان موجود ہے محدود اور ذو جہتہ ہے، صرف مجرد نہیں مادی بھی ہے اس کا تصور کسی ایسے موجود کا متلاشی ہے جسے وہ خوف و ہراس میں پکارے تو پکار سکے عیش و راحت میں یاد کرنا چاہے تو یاد کر سکے، جتنا یہ اس کا متلاشی ہو اس سے زیادہ وہ اس کا منتظر ہو، یہ گرنے لگے تو وہ سہارا دے یہ بھوکا ہو تو کھانا کھلائے یہ پیاسا ہو تو وہ پانی پلائے، یہ بیمار ہو تو وہ شفا دے اور اگر یہ سو جائے تو وہ اس کی نگہداشت و محافظت کرے خلاصہ یہ کہ اس کے ماضی و حال و مستقبل کے تینوں زمانوں کی زندگیاں اسی کی نظرِ تربیت و رحمت کے نیچے پھولتی پھلتی رہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ۔ وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ۔ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْۤ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔ (الشعراء)	(جہان کا پروردگار) وہ ہے جس نے مجھکو بنایا تو اب وہی مجھے راہ دکھلاتا ہے، جو مجھکو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے اور وہ جو مجھکو ماریگا تو وہی زندہ کرے گا، اور وہ جو مجھے توقع ہے کہ انصاف کے دن میری تقصیر بخشے گا۔

اسی عالمِ حیرت و سراسیمگی میں جب اس کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی تو اس نے گنگا و جمنا پر نظر ڈالی، اپنا رشتۂ حیوٰۃ اس کی عام دامنِ فیض سے کچھ نہ کچھ وابستہ پایا اس کے پانی نے کھیتوں کو سیراب کیا اور ایک من گیہوں کے عوض سیکڑوں من گیہوں کے ڈھیر اس کے لئے مہیا کر دیئے جب بھوک کے حال میں سامانِ غذا اس راستہ سے پہنچتا نظر آیا تو اس نے تلاشِ ربوبیت کی مقدس پیاس کو اس کے گدلے پانی سے ہی بجھانے کا ارادہ کر لیا۔ اگر کچھ اور بلند فطرت نے بہت تیر مارا تو اس کی نظر شمس و قمر اور کرۂ فلک کے ان نورانی اجسام پر جا پہنچی جن کے حسنِ صورت نے آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا اور جن کے جود و سخا نے کرۂ ارضی کو مالا مال بنا دیا تھا۔ ابر و بارش، رنگ و روپ، غذا و ثمار، نور و ظلمت کا سارا کارخانہ (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ)

اَلشَّكُوْرُ اَلْعَلِيُّ اَلْكَبِيْرُ اَلْحَفِيْظُ اَلْمُقِيْتُ اَلْحَسِيْبُ اَلْجَلِيْلُ اَلْكَرِيْمُ اَلرَّقِيْبُ اَلْمُجِيْبُ
اَلْوَاسِعُ اَلْحَكِيْمُ اَلْوَدُوْدُ اَلْمَجِيْدُ اَلْبَاعِثُ اَلشَّهِيْدُ اَلْحَقُّ اَلْوَكِيْلُ اَلْقَوِيُّ اَلْمَتِيْنُ

عمل پر بہت دینے والا، بلند، بڑائی والا، حفاظت کرنے والا، حصہ بانٹ کر دینے والا، حساب کرنے والا،
بزرگی والا، بے مانگے بخشش والا، نگراں، جواب دینے والا، وسعت والا، حکمت والا، بڑی محبت والا،
مجد و شرف والا، اٹھانے والا، گواہ، ثابت، کارساز، زور آور، مضبوط، دوست و مددگار،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان کے ساتھ وابستہ دیکھکر اس کو پورا یقین ہو رہا تھا کہ ہو نہ ہو میری تشنگی فطرت کے بجھنے کا سامان یہاں ہے کہ ناگہاں ایک وہ بلند تخیل اس کے سامنے آیا اور یکایک اس نے اس تمام سامانِ تسلی کو اسبابِ تشنگی بنا دیا اور وہ یہ تھا کہ جو خود ڈوبنے اور طلوع ہونے میں سرگرداں نظر آ رہا ہے وہ تمام مخلوق کے لئے مرکزِ توجہ بننے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا۔

غرض تنزیہ میں اتنا اونچا اڑکر اور بادیہ میں اتنا گر کر خدا کی ہستی کیسی ہے؟ اس سوال کا جواب پھر بھی کچھ نہ مل سکا۔ یہ سوال اسی طرح لاجواب رکھا ہوا تھا کہ ملتِ حنفیہ کے مؤسس نے راہِ حقیقت کا سراغ نکال لیا اور تمام عالم کے سامنے نہایت فیاضی کے ساتھ اس کو ان الفاظ میں پیش کر دیا۔

فَلَمَّا اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ۔ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (الانعام)	(جب آسمان کا ایک ایک بادشاہ اور شہزادہ تاریکی میں روپوش ہو چکا تو وہ بولا اے قوم میں ان سے بیزار ہوں جنھیں تم شریک مانتے ہو میں اپنا رخ ایسی ذات کی طرف کر چکا جس نے آسمانوں اور زمین سب کو پیدا کیا ہے اور میں شریک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

گویا اثباتی پہلو میں یہاں ایسے وجود کو سامنے رکھا جس کی طرف سارے وجود منتہی ہیں اور سلبی پہلو میں صرف اجمالاً شرکت کے حدود کی نفی پر کفایت کی گویا اس بیان میں اب خدا ایک موجود کو بتلایا گیا اور موجود بھی وہ جس نے تمام مخلوق کو خلعتِ وجود سے سرفراز فرمایا۔ آگے چل کر ہر شخص نے بمقدار عقل و فہم یہ خود فیصلہ کر لیا کہ صفاتِ ثبوتیہ تابع وجود ہیں لہذا جس کا وجود ذاتی اور حقیقی ہو اس میں صفاتِ ثبوتیہ بھی لامحالہ حقیقیہ ہوں گی اور جب مخلوق اپنے وجودِ ہستی پر ہی اس کی محتاج ہو گی تو ضرور اپنے صفات میں بھی اسی کی محتاج نظر آئے گی جب اس تلاش میں اس نے اپنی صفات پر نظر ڈالی تو حیوۃ، قدرت، ارادہ، کلام، علم، سمع و بصر کے آثار دیکھ ان کی حقیقت کو پرتا اور سمجھا ان کی کمالیت کو سمجھا بوجھا تو اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ جو ہستی وجود کی اصل ہو اس میں ان صفات کا ہونا لازمی ہے اس لئے اس نے صاف کہدیا۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (مریم)	جب ابراہیم نے اپنے والد سے کہا اے والد آپ اس کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ کچھ آپ کے کام آئے۔

اس کے بعد جب اس نے اپنے اطراف و جوانب پر نظر ڈالی تو وہ بھی کسی کی رعنائیوں کی آرائش گاہ نظر آیا، اس نے کان لگائے تو بلبلِ خوشنوا کی داستانوں نے اس کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا، آنکھیں کھولیں تو گلہائے رنگ رنگ نے اپنا گرویدہ بنا لیا غرض حس و حواس عقل و ہوش جہانتک پہنچے کوئی میدان بھی اس پُر از کمال و جمال ہستی کے اثرات سے خالی نہ ملا۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے گوش و بصر کے محسوسات کی تکذیب کر دیتا

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

اَلْوَلِیُّ اَلْحَمِیْدُ اَلْمُحْصِیْ اَلْمُبْدِیُٔ اَلْمُعِیْدُ اَلْمُحْیِیْ اَلْمُمِیْتُ اَلْحَیُّ اَلْقَیُّوْمُ اَلْوَاجِدُ اَلْمَاجِدُ
اَلْوَاحِدُ اَلْاَحَدُ اَلصَّمَدُ اَلْقَادِرُ اَلْمُقْتَدِرُ اَلْمُقَدِّمُ اَلْمُؤَخِّرُ اَلْاَوَّلُ اَلْاٰخِرُ اَلظَّاھِرُ
اَلْبَاطِنُ اَلْوَالِیْ اَلْمُتَعَالِیْ اَلْبَرُّ اَلتَّوَّابُ اَلْمُنْتَقِمُ اَلْعَفُوُّ اَلرَّءُوْفُ مَالِکُ الْمُلْکِ ذُوالْجَلَالِ
وَالْاِکْرَامِ اَلْمُقْسِطُ اَلْجَامِعُ اَلْغَنِیُّ اَلْمُغْنِیْ اَلْمَانِعُ اَلضَّارُّ اَلنَّافِعُ اَلنُّوْرُ اَلْھَادِیْ اَلْبَدِیْعُ
اَلْبَاقِیْ اَلْوَارِثُ اَلرَّشِیْدُ اَلصَّبُوْرُ (رواہ الترمذی وابن حبان والحاکم)

تعریف کا مستحق، ہر چیز کی شمار رکھنے والا، عدم سے وجود میں لانے والا، معدوم کو پھر موجود کرنیوالا، زندہ کرنیوالا، مارنیوالا، سدا زندہ، مخلوق کی ہستی تھامنے والا، ہر کمال بالفعل رکھنے والا، شرف والا، یکتا، یگانہ، بے نیاز، قدرت والا، ہر شے پر قبضہ والا، آگے کرنے والا اور پیچھے کرنے والا، سب سے پہلے اور سب سے بعد باقی رہنے والا، سب پر عیاں، نگاہوں سے اوجھل، ہر چیز کا ذمہ دار، بہت بلند، بڑا محسن، توبہ کی توفیق بخشنے والا اور قبول کرنے والا، بدلہ لینے والا، معاف کرنے والا، بڑی رحمت والا، سارے ملک کا مالک، جلال و بخشش والا، انصاف والا، جمع کرنے والا، سب سے بے نیاز، دوسروں کو غنی بنانے والا، روکنے والا، نقصان پہنچانے والا، نفع پہنچانے والا، خود بخود ظاہر، ہدایت دینے والا، بلا نمونہ بنانے والا، ہمیشہ رہنے والا، تمام مخلوقات کے فنا کے بعد اُن کے مال کا مالک، درست راہ بتلانے والا، ضبط کرنے والا (اس حدیث کو ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور عقل وحواس کو معطل کر کے خدا کا تصور صرف ایک سلبی صورت میں اختیار کر لیتا جس کو تنزیہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اگر ذرا تنزیہ سے قدم پیچھے پڑتا ہے تو تشبیہ کا نقص لازم آتا ہے۔ قرآن کریم نے اس عقدہ کو حل کیا اور بتلایا کہ خدا کی ہستی اس تنزیہ اور اس تشبیہ کے درمیان ہے اس کے لئے صفات، نعوت، شئون ہیں مگر ایسی نہیں جن کا خیال دو وہم ادراک کر سکیں۔ لہٰذا اُن تمام صفات کے ساتھ اُسے یاد کئے جاؤ، جن سے کہ خود اس نے اپنے آپ کو یاد کیا ہے مگر کسی مثال و تشبیہ کو اپنے گوشۂ خیال میں گھسنے نہ دو۔ اور اس عقلی تنزیہ اور خیالی تشبیہ کے درمیان اپنے رب کا تصور کرتے رہو۔

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَّھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ
قال الشیخ الاکبر التنزیہ میل والتشبیہ میل والاعتدال ما بین ھذین[1] علمہ
قال الشیخ الاکبر اعلم ان جمیع المشاھدین للحق لا یخرجون عن ما بین النسبتین نسبۃ التنزیہ لہ تعالیٰ ونسبۃ التنزل للخیال بضرب من التشبیہ[2] فاما نسبۃ التنزیہ فھی تجلیہ تعالیٰ فی نحو لیس کمثلہ شیء واما نسبۃ التنزل للخیال فھی تجلیہ فی قولہ تعالیٰ[3]

کوئی چیز اس کی مانند نہیں (مگر) وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔
تنزیہ اور تشبیہ دونوں میں ایک طرف جھکتا ہے، اعتدال ان دونوں کے درمیان میں ہے۔
شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ خدائی تجلیات کا مشاہدہ کرنے والے دو نسبتوں سے خالی نہیں ہوتے ایک طرف خدائی تنزیہ کی نسبت دوسری طرف عالم خیال میں تشبیہات کی انعکاسی نسبت پہلی نسبت کو لیس کمثلہ شیء میں اور دوسری کو وھو السمیع البصیر میں بیان فرمایا گیا ہے۔

[1] اس آیت کے بعض نادر دقائق کے لئے دیکھئے الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۶۵۔ یہاں ان مباحث کا ذکر کرنا مخاطبین کیلئے مشکلات کا موجب ہو
[2] ایضاً ص ۷۴ [3] ایضاً ص ۹۹۔

بَابُ فِيْ عَظَمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰى وَكِبْرِيَائِهٖ وَكَمَالِ قُدْرَتِهٖ وَافْتِقَارِ الْخَلْقِ اِلَيْهِ

(۱۵) وَعَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ قَامَ فِيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاَرْبَعٍ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِيْ لَهٗ اَنْ يَّنَامَ يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهٗ يُرْفَعُ اِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ بِالنَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ بِاللَّيْلِ (رواہ احمد ومسلم وابن ماجۃ)

اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اسکی کبریاء و کمال قدرت اور مخلوقات کی سرتاسر احتیاج کا بیان

(۱۵) ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے درمیان کھڑے ہو کر چار باتیں بیان فرمائیں (۱) خدائے قدوس سوتا نہیں اور نہ یہ اس کے شایانِ شان ہے۔ میزانِ عدل[۱۵] کو جھکاتا ہے اور اونچا کرتا ہے۔ رات کے کام دن میں اور دن کے کام رات میں اس کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ (اس حدیث کو امام احمد و مسلم اور ابنِ ماجہ نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) الغرض اسلام نے انسان کی کمزور فطرت کے سامانِ تسلی کے لئے اس حد تک عالمِ خیال[۱] میں تشبیہ کی وسعت دیدی ہے[۲] جہاں تک کہ تنزیہ کے حدود باطل نہ ہونے پائیں، نماز میں رخ کرنے کے لئے بیت اللہ بنا دیا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی فہمائش کر دی ہے کہ خدا کا وہ مسکن نہیں ہے بادشاہت اور ملوکیت[۳] کا تصور جمانے کے لئے عرش کا ذکر آگیا ہے مگر یہ وجدی تصور بھی ایسا نہ ہونا چاہیے کہ تنزیہ کے خلاف ہو جائے۔ اسی تنزیہ و تشبیہ کے درمیان آپ احادیث کے باب کو پڑھ جائیے پورے مزے اور پورے ذائقہ کے ساتھ پڑھ جائیے اور جھجکئے مت، بشرطیکہ ہر موقعہ پر تنزیہ بھی کئے جائیے۔ خدا کا صحیح تصور اس کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا کرنیکا یہی ایک راستہ ہے اگر ان الفاظ سے باہر آپ خدا کو تلاش کریں گے تو اس تصور میں آپ کے لئے کوئی جاذبیت نہ ہوگی اور اگر ان الفاظ کی صورت اور مفہوم کا کوئی فرضی نقشہ تجویز کریں گے تو وہ عین تشبیہ ہو جائے گی نہ وہ خدائی سرحد تھی نہ یہ خدائی سرحد ہے عملی طور پر سب سے آسان اور صحیح راستہ تو یہ ہے، عقلی طور پر بحث و جدل کی راہ دوسری ہے، خدا کا تصور اس سے زیادہ صاف اور بلند آج تک نہ کوئی بتلا سکا نہ بتلا سکتا ہے اس سے زیادہ بحث کرنا ممکن کو اپنے حدود سے تجاوز کرنا ہے اور لا حاصل بھی ہے ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چیں ۔۔۔ کایں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(۱۵) میزانِ عدل دنیا میں مخلوق کی روزی اور آخرت میں ان کے اعمال کی مقدار کے لئے مقرر کی گئی ہے اعمال و رزق کی قلت و کثرت دونوں جہان میں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے کسی کے اچھے عمل زیادہ ہوں گے اور کسی کے کم کسی کو روزی فراخ ملتی ہے اور کسی کو تنگ مگر اس حقیقت کے باوجود جد و جہد کا حکم دونوں جگہ موجود ہے گویا تم سعی کے مکلف ہو اور قدرت دینے کی مختار ہے۔

رفع اعمال۔ یہ اس نظم کا ایک شعبہ ہے جس پر بساطِ عالم کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ خدا کے معصوم فرشتے مقرر ہیں، عصر و صبح کی نماز[۱] میں ان کی ڈیوٹی بدلی جاتی ہے اور اس درمیان میں جو اچھے اور برے کام مخلوق کرتی ہے وہ ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ عالمِ تکوین کے گوشہ گوشہ میں نظم موجود ہے دنیا اس کے عمیق اسرار دریافت کرنے کے درپے ہے اس کے انکار یا ابطال کے درپے نہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ اگر عالمِ غیب کا کوئی نظم آپ کے سامنے مذکور ہو تو آپ اس کے انکار یا اس سے آگے بڑھ کر استہزاء کے لئے آمادہ ہوں۔

[۱] یہ واضح رہنا چاہیے کہ شیخ اکبر کے نزدیک عالمِ خیال ایک واقعی عالم ہے اس کے مستقل احکام ہیں۔ ہماری اصطلاح میں خیال صرف ایک بے بنیاد بات کا نام ہوتا ہے۔ دیکھو الیواقیت ج ۱ ص ۵۴۔ [۲] ایضاً ص ۴۶۔ [۳] ایضاً ص ۹۲۔

(۱۶) وَعَنْہُ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ مِنْ طَرِیْقٍ اٰخَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنَامُ وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یَّنَامَ یَخْفِضُ الْقِسْطَ وَیَرْفَعُہٗ حِجَابُہُ النَّارُ لَوْ کَشَفَھَا لَاَحْرَقَتْ سُبُحَاتُ وَجْھِہٖ کُلَّ شَیْءٍ اَدْرَکَہٗ بَصَرُہٗ ثُمَّ قَرَأَ اَبُوْ عُبَیْدَۃَ فَلَمَّا جَآءَھَا نُوْدِیَ اَنْ بُوْرِکَ مَنْ فِی النَّارِ وَمَنْ حَوْلَھَا وَسُبْحَانَ اللّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (رواہ احمد ومسلم وابن ماجۃ)

(۱۷) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ رَاَیْتَ رَبَّکَ قَالَ نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ (رواہ مسلم)

(۱۶) ابوموسیٰ اشعریؓ دوسرے طریقہ پر یوں روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے باری تعالیٰ نہ سوتا ہے اور نہ سونا اس کی شان کے مناسب ہے میزان عدل کو پست کرتا ہے اور بلند کرتا ہے (اس کے اور مخلوق کے درمیان) خود اس کا نور اس کا حجاب ہے، اگر وہ یہ حجاب اٹھادے تو اس کی ذات کے انوار جہاں تک نظر جائے سب کو پھونک ڈالیں، اس کی تائید میں ابوعبیدہؓ نے یہ آیت پڑھی فلمّا جاءھا جب موسیٰؑ آگ کے نزدیک پہنچے تو آواز آئی آگ میں جو تجلی ہے وہ مبارک اور جو ہستیاں اس کے اردگرد ہیں وہ مبارک، اور پاک ہے اللہ کی ذات جو سب جہان کا پروردگار ہے (اس حدیث کو احمد مسلم اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)

(۱۷) ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کیا آپ نے اپنے پروردگار کو (شبِ معراج میں) دیکھا تھا آپ نے جواب دیا "نورانی دیکھا تھا" (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

۱۶) یہاں اصل روایت میں نار کا لفظ ہے اور صحیح مسلم میں اس کی بجائے نور کا لفظ کو ہے چونکہ حقیقت کے لحاظ سے یہاں نور و نار میں چنداں فرق نہیں ہے اس لئے ہم نے اس کا عام فہم ترجمہ نور ہی کردیا ہے، ابوعبیدہؓ نے لفظِ نار ہی کی مناسبت سے قرآن کی آیت تلاوت فرمائی ہے یعنی جب حضرت موسیٰؑ کو صورتِ نار میں تجلی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ذات پاک کا حجاب نار تھا جس کے پس پردہ اس کی تجلی ہو رہی تھی۔ اس بابرکت نار اور بابرکت ماحول سے کسی نافہم کو یہ دھوکا نہ لگے کہ معاذ اللہ خدا کی ذات پاک میں حقیقۃً آگ میں حلول کر آئی تھی اس لئے فرمایا کہ وہ خود اس آگ اور سارے جہان کا پالنے والا ہے وہ جسم وجہت، حدوث و حلول کے آثار سے پاک و برتر ہے ــــــ حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کا حجاب مخلوق کی طرح باہر سے نہیں یہاں خود اس کے عظمت وجلال کے انوار ہی اس کا حجاب ہیں جس طرح کہ خود آفتاب کی کرنیں اور حسین کا حسن کبھی کبھی اس کے دیدار کے لئے حجاب بن جاتا ہے، اسی طرح یہاں خود اس کی عظمت وجلال کے انوار ہی اس کا حجاب بن رہے ہیں۔ عقولِ انسانی نے بارہا شوخی کی اور چاہا کہ بے حجاب نظارہ کریں مگر ہمیشہ خیرہ و متحیر ناکام واپس آئیں۔ اب اس عالم میں بے حجاب دیدار کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ خود اس حجاب کو اٹھادے تو اس پر اس کو تو قدرت ہے مگر ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کی تاب لاسکیں۔ اربابِ عقول کا حصہ یہاں صرف اعتقادِ عظمت ہے اور اربابِ کشوف کا ذوق و وجدان ؎ آنکہ جشد داند

۱۷) اس روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے کوئی "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاہُ" پڑھتا ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۱۸) وَعَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَا أَهْلُ الْجَنَّةِ فِي نَعِيْمِهِمْ إِذْ سَطَعَ لَهُمْ نُوْرٌ فَرَفَعُوْا رُؤُسَهُمْ فَإِذَا الرَّبُّ قَدْ أَشْرَفَ عَلَيْهِمْ مِنْ فَوْقِهِمْ فَقَالَ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ الْجَنَّةِ قَالَ وَذٰلِكَ قَوْلُهُ تَعَالٰى سَلَامٌ قَوْلًا مِنْ رَبٍّ رَحِيْمٍ قَالَ فَنَظَرَ إِلَيْهِمْ فَيَنْظُرُوْنَ إِلَيْهِ فَلَا يَلْتَفِتُوْنَ إِلٰى شَيْءٍ مِنْ نَعِيْمِهِمْ مَا دَامُوْا يَنْظُرُوْنَ إِلَيْهِ حَتّٰى يَحْتَجِبَ عَنْهُمْ وَيَبْقٰى نُوْرُهٗ (رواہ ابن ماجۃ)

(۱۹) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللهَ خَلَقَ إِسْرَافِيْلَ مُنْذُ يَوْمَ خَلَقَهُ صَافًّا قَدَمَيْهِ لَا يَرْفَعُ بَصَرَهٗ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الرَّبِّ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى سَبْعُوْنَ نُوْرًا مَا مِنْهَا مِنْ نُوْرٍ يَدْنُوْ مِنْهُ إِلَّا احْتَرَقَ (رواہ الترمذی وصححہ)

(۱۸) جابرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں جبکہ جنتی جنت کی نعمتوں میں مشغول ہوں گے، اچانک ان کے سامنے ایک نور بلند ہوگا وہ سر اٹھائیں گے، کیا دیکھیں گے کہ پروردگار عالم ان پر جلوہ فرما ہے اور فرما رہا ہے اے اہل جنت السلام علیکم، قرآن کریم کی آیت سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبِّ الرَّحِیْمِ (سلام کہا جائے گا پروردگار مہربان کی طرف سے) کا یہی مطلب ہے، وہ انہیں دیکھیگا اور وہ اسے دیکھا کریں گے اور (دیدار الٰہی میں ایسے مستغرق ہو جائیں گے کہ) جب تک ادھر نظر رہے گی جنت کی کسی نعمت کی طرف التفات تک نہ کریں گے یہاں تک کہ دیدار ختم ہو جائے گا اور صرف اس کا نور باقی رہ جائے گا۔ (اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)۔

(۱۹) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جب سے اسرافیلؑ (صاحب صور فرشتہ) کو پیدا فرمایا ہے وہ دونوں پاؤں برابر کئے کھڑا ہے نظر اوپر نہیں اٹھاتا، اس کے اور پروردگار کے درمیان نور کے ستر پردے ہیں، ہر پردہ ایسا ہے کہ اگر اس کے قریب بھی جائے تو خاک ہو جائے (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہم نے "نُوْرَانِیٌّ" کے لفظ کو ترجیح دی ہے کیونکہ بعض روایات میں "رَأَیْتُ نُوْرًا" کا لفظ بھی موجود ہے ترجمہ اسی کے مطابق کیا گیا ہے۔ اگر "نُوْرَانِیٌّ اَرَاہُ" پڑھا جائے تو ترجمہ ہوگا کہ وہ نور تھا میں اسے نظر جما کر بھلا کیسے دیکھ پاتا، اس بناء پر بھی بارگاہ الٰہی میں نوری کا اطلاق ثابت ہوگا۔ شب معراج میں رویت کی بحث یہاں نہیں ہے اس پر اپنے محل میں گفتگو کی جائے گی۔ قرآن و حدیث خدائی بارگاہ کا جہاں ذکر کرتے ہیں ماحول میں نوری نور کا پتہ دیتے ہیں۔ کیوں نہ ہو جبکہ اسماء الٰہیہ میں اس کا ایک اسم ہی "النور" ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ ہی کا نور و جمال روشن ہے۔ مادیات کا عالم سرتاسر ظلمت و تاریکی ہے (باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ)۔

(۲۰) عَنْ زُرَارَةَ بْنِ اَوْفٰى اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِجِبْرِيْلَ هَلْ رَأَيْتَ رَبَّكَ فَانْتَفَضَ جِبْرِيْلُ وَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اِنَّ بَيْنِىْ وَبَيْنَهٗ سَبْعِيْنَ حِجَابًا مِّنْ نُّوْرٍ لَوْ دَنَوْتُ مِنْ بَعْضِهَا لَاَحْتَرَقْتُ (هكذا فى المصابيح ورواه ابونعيم فى الحلية عن انس الا انه لم يذكر فانتفض)

(۲۰) زرارہ بن اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا تم نے اپنے پروردگار کو دیکھا ہے؟ یہ سن کر وہ کانپ اٹھے اور بولے اے محمدؐ! میرے اور اس کے درمیان تو نور کے ستر پردے ہیں اگر میں کسی ایک کے نزدیک بھی پہنچ جاؤں تو جل جاؤں۔ اس حدیث کو مصابیح میں ایسا ہی روایت کیا ہے لیکن ابونعیم نے اپنی کتاب الحلیہ میں بجائے زرارہؓ کے انسؓ سے روایت کیا ہے اور جبرئیل علیہ السلام کے کانپنے کا ذکر نہیں کیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور مجردات کا سرتاسر نور، یہ نور جس قدر لطیف اور قوی ہوتا جاتا ہے اسی قدر ادراک نظر و بصر سے باہر ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جو ذات پاک کہ تجرد کے انتہائی مراتب میں ہے وہ تمام دنیا کے ادراکِ نظر و بصر سے بھی باہر ہے۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔ خدا کو کسی کی بصر نہیں پا سکتی۔ . . . .

احادیث میں عالم مجردات کا جہاں تذکرہ ہے وہاں اس کو نور ہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کو اس نور پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ نور آفتاب سے نور بصر زیادہ اہم ہے اور نور بصر سے نور عقل زیادہ اہم پھر ان میں جس قدر اہم اور قوی ہے اسی قدر غیر محسوس ہے جب مادیات میں یہ نسبت ہے تو اس سے مجردات کا اندازہ کر لیجئے۔

(حاشیہ حدیث نمبر ۱۸ و ۱۹ بقیہ صفحہ گذشتہ)

ؔ والد و اولاد، حاکم و محکوم، احباب و اعزہ کے سلام کی لذت سے تمام دنیا آشنا ہے۔ خالق کے سلام سے لطف اندوزی صرف اہل جنت کا حصہ ہے، یہ تشریف و تکریم کی انتہا ہے۔ جو ذات کہ نور حقیقی ہے اس کے احتجاب کے بعد نور کا بقا۔ ایسا ہی ہے جیسا کہ غروب آفتاب کے بعد روشنی کا۔

ؔ اس حدیث میں حجاب کا عدد ستر مذکور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں صرف کثرت مراد ہو، جیسا کہ اردو میں بھی یہ عدد صرف کثرت کے لئے مستعمل ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عام مخلوق اور خاص نورانی مخلوق کے درمیان حجاب کا کچھ فرق بھی ملحوظ ہو بہرحال نفسِ حجاب کا ثبوت یہاں بھی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھٰذا)

(۲۰) جبرئیل علیہ السلام جیسے ملک معظم بھی سراپردۂ عظمت و جلال سے دور دور گھوم رہے ہیں وہ ذات ایک اور صرف ایک ہی ذات تھی جس کے لئے سب حجابات اٹھا کر اعلان کر دیا گیا تھا کہ آؤ اور اپنے پروردگار کے جمال کا بے پردہ نظارہ کر لو، سبحان اللہ وہ بندہ بھی کتنا مقرب بندہ ہوگا جس کے لئے وہ سارے حجابات اٹھا دیئے گئے جن میں سے جبرئیل جیسے ملک مقرب کے لئے ایک بھی نہ اٹھ سکا۔

(۲۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَمِیْنُ اللّٰهِ مَلْاٰی لَا یَغِیْضُهَا نَفَقَةٌ سَحَّآءُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَقَالَ اَرَاَیْتُمْ مَآ اَنْفَقَ مُنْذُ خَلَقَ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ فَاِنَّهٗ لَمْ یَغِضْ مَا فِیْ یَمِیْنِهٖ قَالَ وَعَرْشُهٗ عَلَی الْمَآءِ بِیَدِهِ الْاُخْرٰی الْمِیْزَانُ یَخْفِضُ وَیَرْفَعُ (رواه احمد والشیخان والبیهقی والاربعة)

(۲۱) حضرت ابو ہریرہ رض روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ خدا کا دستِ مبارک ہمیشہ پُر ہے فیاضی کرنے سے خشک نہیں ہوتا، شب و روز انعامات کی بارشیں برساتا رہتا ہے آپ نے فرمایا کہ جب سے اس نے آسمان و زمین بنایا ہے بھلا کتنا خرچ کیا ہوگا اس پر بھی اس کے دستِ مبارک میں کوئی کمی نہیں آئی اور آپ نے فرمایا کہ (پہلے) اس کے عرش اور پانی کے درمیان کچھ نہ تھا (پھر بعد میں مخلوق پیدا ہوئی) خدا تعالیٰ کے دوسرے ہاتھ میں میزانِ عدل ہے اُسے پست کرتا ہے اور بلند کرتا ہے۔ (اس حدیث کو امام احمد اور شیخین اور سنن اربعہ وغیرہم نے روایت کیا ہے)۔

۲۱) یہ خدائے قدوس کے خزائن اور اس کی فیاضی کی تفہیم ہے تاکہ اس کی محتاج مخلوق میں اس کی طرف ایک فطری انجذاب پیدا ہو جائے۔ اس کا عرش جہاں تھا اب بھی وہاں ہے لیکن پہلے درمیان میں کوئی اور مخلوق نہ تھی پانی ہی پانی تھا اب آسمان و زمین بن گئے اس لئے اس کے نیچے بجائے پانی کے آسمان کہا جائے گا۔ جامع ترمذی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سمٰوات پر اب بھی ایک سمندر ہے۔ اور اس سمندر پر عرشِ عظیم ہے۔ اگر محدثین اس روایت کو صحیح مان لیں، تو پھر یہاں پانی سے یہ پانی مراد لے لینا اچھا ہے۔ حدیث میں اس کو بحر سے تعبیر کیا گیا ہے مگر وہ بحر نہیں ہے جس کی حقیقت ہم کو معلوم ہو۔ بہرکیف حدیث میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ پہلے عرش پانی پر رکھا ہوا تھا پھر کہیں اور اٹھا کر رکھا گیا ہے۔ بلکہ صرف اس کا بیان ہے کہ پہلے اس کے نیچے کیا تھا۔ اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ پانی یہی پانی ہو بلکہ ممکن ہے کہ جس کو جامع ترمذی کی روایت میں بحر کہا گیا ہے وہ پانی مراد ہو۔ یہاں حدیث میں دستِ قدرت کے ایک ہاتھ کو یمین یعنی مبارک کہا گیا ہے دوسرے ہاتھ کو اخریٰ سے تعبیر کیا گیا۔ یسار کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ بلکہ مشکوٰۃ میں یہ تصریح ہے کلتا یدی الرحمٰن یمین رحمٰن ہر جہت سے پاک ہے۔ اس لئے اس کے دونوں ہاتھ یمین و مبارک ہیں وہاں دایاں یا بایاں نہیں بعض رُواۃ نے آخری کی بجائے یسریٰ کا لفظ لکھ دیا ہے، یہ یقیناً راویوں کا تصرف اور روایت بالمعنیٰ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عالمِ غیب کے حقائق ادا کرنے کے لئے جب نطاق الفاظ تنگ ہونے لگتا ہے تو عقولِ انسانیہ اسے معاف نہیں کرتیں یا پھر اپنے ادراک کے مطابق اس کی شکل و صورت اختراع کرنے لگتی ہیں ورنہ سرے سے انکار کے لئے آمادہ ہو جاتی ہیں۔ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ انسان بیرونِ عقل و فکر کو اپنے میزانِ عقل و فکر میں تولنا چاہتا ہے حالانکہ اس کو اپنی عقل کا قصور معلوم پھر اپنی قوتِ حافظہ و مخیلہ کا قصور معلوم اس پر قوتِ واہمہ کا تصادم معلوم اس کے باوجود جب اس کے سامنے معاملاتِ ربانیہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اپنی ہی عقل و فکر کی تقلید کرنے لگتا ہے کیا اس کا یہ فرض نہ تھا کہ جو خدا تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق بتلایا ہے اُسے و بے چون و چرا مان لیتا اور اپنے اس فکر کی تقلید نہ کرتا جو اسی کے خیال کا مقلد ہے اور جس کا خیال اس کے حواس کا مقلد (الیواقیت ص ۹۸-۹۹)

(۲۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقْبِضُ اللّٰهُ الْأَرْضَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَطْوِي السَّمَآءَ بِيَمِينِهِ ثُمَّ يَقُولُ أَنَا الْمَلِكُ أَيْنَ مُلُوكُ الْأَرْضِ (رواه احمد الشيخان وغيرهم)

(۲۳) وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي أَرَى مَا لَا تَرَوْنَ وَأَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُونَ أَطَّتِ السَّمَآءُ وَحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ مَا فِيهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلَّا عَلَيْهِ مَلَكٌ سَاجِدٌ لَوْ عَلِمْتُمْ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا وَلَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَآءِ عَلَى الْفُرُشَاتِ وَلَخَرَجْتُمْ عَلَى أَعْلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُونَ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى قَالَ أَبُو ذَرٍّ وَاللّٰهِ لَوَدِدْتُ أَنِّي شَجَرَةٌ تُعْضَدُ (رواه احمد والترمذی وابن ماجة)

(۲۲) ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا قیامت کے دن خدائے قدوس اپنے ایک دستِ مبارک میں زمین کو لیگا اور آسمانوں کو لپیٹ کر فرمائیگا کہ میں ہی بادشاہ ہوں، اب زمین کے بادشاہ کدھر ہیں۔ (اس حدیث کو امام احمد اور شیخین نے روایت کیا ہے)۔

(۲۳) ابوذرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ باتیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے، آسمان چرچرا آواز کررہا ہے اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے کیونکہ اس میں چار انگشت برابر بھی کوئی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ سجدہ میں پڑا نہ ہو اگر تم وہ باتیں جانتے جو میں جانتا ہوں تو رویا بہت کرتے اور ہنستے کم، اور اپنے بستروں پر اپنی بیویوں سے لطف اندوز نہ ہوتے اور خدا کی طرف شور مچاتے ہوئے جنگلوں میں نکل جاتے۔ ابوذرؓ فرماتے ہیں، اے کاش میں ایک درخت ہوتا (جو جڑ سے) کاٹ دیا جاتا (کہ حساب کا خطرہ نہ رہتا) اس حدیث کو امام احمد ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(۲۲) زمین کے لئے لفظ قبض اور آسمانوں کے لئے طی (لپیٹنا) کا لفظ قرآن نے بھی استعمال کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زمین میں طی کی صلاحیت نہیں اور آسمان کا مادہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں لپٹنے کی صلاحیت ہے۔ موجودہ سائنس اگر آج افلاک کے وجود کی منکر ہے تو ابھی جلدی نہ کیجئے شاید کہ بہت جلد دوسرے حقائق کی طرح اسے یہاں بھی رجوع کرنا پڑے۔ حدیث کا حاصل عنوان باب سے ظاہر ہے۔

(۲۳) جو بات یہاں شروع میں بطور مقدمہ ارشاد ہوئی ہے وہ تمام عالم غیب پر ایمان وایقان کی روح ہے یعنی عالم غیب ایک ایسا عالم ہے جو ہمارے حواس کے ادراک سے بالاتر ہے اس لئے رسول اس عالم کی جو چیز بھی دیکھتا یا سنتا ہے وہ سب کچھ ہمارے لئے اسی کے اعتماد پر قابلِ تسلیم ہونا چاہئے یہ عقلی بحث وتمحیص کا میدان نہیں سمع ومشاہدہ کا مقام ہے۔ یہ رسول کا ہی ظرف ہے کہ وہ اس عالم کے خوفناک سے خوفناک مناظر کو دیکھتا اور تحمل کرلیتا ہے۔ ابوذرؓ جیسا صحابی اس جہان کا ایک مجمل سا حال صرف سن پاتا ہے تو اپنی موت کو حیوٰۃ پر ترجیح دینے لگتا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عالم غیب عوام کی نظروں سے کیوں پوشیدہ رکھا گیا ہے معلوم ہوا کہ نہ ہر علم ہر مخاطب کے قابل ہے نہ ہر تماشہ ہر ایک کے دیکھنے کے لائق پھر جب رسول جیسا قلب وجگر نہیں میسر نہیں تو اس سے جھگڑو مت اور جو وہ کہتا ہے بس اسے مان لو۔

(۲۴) وعن ابی ذرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللہ عز وجل یا عبادی
کلکم مذنب الا من عافیت فاستغفرونی اغفر لکم ومن علم انی اقدر علی المغفرۃ
فاستغفرنی بقدرتی غفرت لہ ولا ابالی وکلکم ضال الا من ھدیت فاستھدونی
اھدکم وکلکم فقیر الا من اغنیت فاسألونی اغنکم ولو ان اولکم واخرکم (وفی
روایۃ وانسکم وجنکم وصغیرکم وکبیرکم وذکرکم وانثاکم) وحیکم ومیتکم و
رطبکم ویابسکم اجتمعوا علی اشقی قلب من قلوب عبادی ما نقص فی ملکی جناح
بعوضۃ ولو اجتمعوا علی اتقی قلب عبد من عبادی ما زاد فی ملکی من جناح بعوضۃ
ولو ان اولکم واخرکم (وفی روایۃ وانسکم وجنکم وصغیرکم وکبیرکم وذکرکم
وانثاکم) وحیکم ومیتکم ورطبکم ویابسکم اجتمعوا فسألنی کل سائل منھم

(۲۴) ابوذرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کہتا
ہے اے میرے بندو! تم سب قصوروار ہو مگر وہ جسے میں بچا لوں، تو مجھ سے بخشش طلب کیا کرو میں تمہیں
بخشدوں گا جو شخص یہ جانتا ہے کہ مجھے بخشش کی طاقت ہے پھر مجھ سے بخشش مانگتا ہے تو میں اُسے بخشدیتا
ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا، تم سب گم کردہ راہ ہو مگر وہ جس کو میں راہ دکھلاؤں تو مجھ سے ہدایت مانگا کرو میں
تمہیں ہدایت دونگا، تم سب محتاج ہو مگر وہ جس کو میں بے نیاز کردوں تو مجھ سے مانگو میں تمہیں بے نیاز
کردونگا۔ اگر تمہارے اگلے پچھلے (اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ انسان اور جن، چھوٹے اور بڑے، مرد اور
عورت) زندہ اور مردہ، تر اور خشک، سب مل کر میرے بندوں میں سب سے زیادہ شقی القلب بندہ کی
طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں مچھر کے پر کی برابر کوئی کمی نہیں آسکتی اور اگر سب کا دل متقی سے متقی انسان
کی طرح ہو جائے تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کی برابر زیادتی نہیں ہو سکتی۔ اگر تمہارے اول و آخر

(۲۴) اس حدیث میں خدا کی توحید و عظمت کی وہ روح پھونکی جارہی ہے کہ اس کے بعد اب کوئی ہاتھ نہ رہے جو خدا کے سوا کسی
دوسرے کی طرف اٹھے کوئی دوسری بارگاہ نہ رہے جس پر حاجت روائی کا گمان کیا جاسکے۔ عاصی اگر معصیت کرتا ہے تو
جان لے کہ اس کی مضرت اسی کے لیے ہے عابد اگر عبادت کرتا ہے تو سمجھ لے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک محدود ہے
اس کی بے نیازی کا یہ عالم کہ اگر تمام مجرمین کو بخش ڈالے تو پرواہ نہیں فیاضی کی یہ انتہا کہ اگر ایک ایک کو منہ مانگی
مراد دیدے تو اس کے خزانہ غیب میں کوئی نقصان نہیں۔ سلطنت کی یہ قہرمانی کہ اس کے ارادہ و مراد میں تخلف نہیں
دنیا میں بڑے سے بڑا قادر اسباب و علل کا گرفتار ہے ان کی یہ شان کہ اسباب و مسببات ان کے حکم کے منتظر ہیں ۔
سبحان اللہ اسلام کا خدا کتنا باشوکت و عظمت ہے ۔

مَا بَلَغَتْ اُمْنِيَّتُهٗ فَاَعْطَيْتُ كُلَّ سَائِلٍ مِّنْهُمْ مَا سَاَلَ مَا نَقَصَنِيْ كَمَا لَوْ اَنَّ اَحَدَكُمْ مَرَّ بِشَفَةِ الْبَحْرِ فَغَمَسَ فِيْهَا اِبْرَةً ثُمَّ انْتَزَعَهَا كَذٰلِكَ لَا يَنْقُصُ مِنْ مُّلْكِيْ، ذٰلِكَ بِاَنِّيْ جَوَادٌ مَّاجِدٌ صَمَدٌ عَطَائِيْ كَلَامٌ وَعَذَابِيْ كَلَامٌ (وَفِيْ رِوَايَةٍ عَطَائِيْ كَلَامِيْ وَعَذَابِيْ كَلَامِيْ) اِذَا اَرَدْتُ شَيْئًا فَاِنَّمَا اَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (رواہ احمد ومسلم والترمذی)۔

(۲۵) (وَعَنْهُ فِيْ اُخْرٰى) عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَرْوِيْ عَنْ رَّبِّهٖ عَزَّ وَجَلَّ اِنِّيْ حَرَّمْتُ عَلٰى نَفْسِي الظُّلْمَ وَعَلٰى عِبَادِيْ اَلَا فَلَا تَظَالَمُوْا، كُلُّ بَنِيْ اٰدَمَ يُخْطِئُ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ثُمَّ يَسْتَغْفِرُنِيْ فَاَغْفِرُ لَهٗ وَلَا اُبَالِيْ، وَقَالَ يَا بَنِيْ اٰدَمَ كُلُّكُمْ كَانَ ضَالًّا اِلَّا مَنْ هَدَيْتُ وَكُلُّكُمْ كَانَ عَارِيًا اِلَّا مَنْ كَسَوْتُ وَكُلُّكُمْ كَانَ جَائِعًا اِلَّا مَنْ اَطْعَمْتُ

(اور ایک روایت میں انسان وجن، چھوٹے اور بڑے، مرد وعورت) زندہ اور مردہ، تر اور خشک سب جمع ہوں اور ان میں ہر سائل مجھ سے وہ مانگے جو اس کی انتہائی آرزو ہو پھر ان میں ہر ہر سائل کو میں اس کی منہ مانگی مراد دیدوں تو بھی میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ آئے گی جیسا کہ تم میں کوئی شخص سمندر کے کنارے گذرے اور اس میں سوئی ڈبو کر نکال لے (تو سمندر میں کوئی کمی نہیں آتی) اسی طرح میری سلطنت میں کچھ کمی نہیں آتی یہ اس لئے کہ میں سخی ہوں بزرگی والا ہوں، بے نیاز ہوں، بات میری بخشش اور بات میرا عذاب ہے اور اور ایک روایت میں ہے میری بات (میں) میری بخشش ہے اور میری بات (میں) میرا عذاب ہے (کچھ کرنا نہیں پڑتا) اور جب میں کسی چیز کے کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو صرف یہ کہدیتا ہوں کہ موجود ہوجا وہ موجود ہوجاتی ہے (اس حدیث کو امام احمد اور مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۲۵) ابو ذرؓ سے دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں نے اپنے نفس پر بھی ظلم کرنا حرام کیا ہے اور اپنے بندوں پر بھی ظلم کرنا حرام کیا ہے تو سن لو کہ ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو، تمام اولادِ آدم شب و روز خطا کرتی رہتی ہے پھر مجھ سے معافی مانگتی ہے تو میں اُسے معاف کرتا رہتا ہوں اور کوئی پرواہ نہیں کرتا اور فرمایا کہ اے اولادِ آدم تم سب بے راہ تھے مگر وہ جس کو میں نے راہ دکھائی، سب ننگے تھے مگر وہ جس کو میں نے لباس پہنایا، سب بھوکے تھے

(۲۵) ترغیب و تفہیم کی حد ہوگئی کہ ظلم کے بارے میں خالق نے اپنا بھی استثنار نہیں کیا اور اس کی کراہت و حرمت میں اپنے آپ کو بھی اپنی مخلوق کے برابر ٹھیرا لیا۔ مگر مخلوق کی بے حیائی کی بھی انتہا نہ رہی کہ اس نے اپنے خالق سے آگے بڑھ کر ظلم ہی کو اپنا نصب العین بنالیا۔

وَكُلُّكُمْ كَانَ ظَمْآنًا اِلَّا مَنْ سَقَيْتُ فَاسْتَهْدُوْنِيْ اَهْدِكُمْ وَاسْتَكْسُوْنِيْ اَكْسُكُمْ وَاسْتَطْعِمُوْنِيْ اُطْعِمْكُمْ وَاسْتَسْقُوْنِيْ اَسْقِكُمْ يَا عِبَادِيْ لَوْ اَنَّ اَوَّلَكُمْ وَاٰخِرَكُمْ (فذكر نحو الحديث المتقدم) وَفِيْهِ لَمْ يَنْقُصُوْا مِنْ مُلْكِيْ شَيْئًا اِلَّا كَمَا يَنْقُصُ رَاسُ الْمَخِيْطِ مِنَ الْبَحْرِ (رواہ احمد ومسلم والترمذی)

(۲۶) عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَجِلُّوا اللّٰہَ یَغْفِرْ لَکُمْ قَالَ ابْنُ ثَوْبَانَ (اَحَدُ الرُّوَاۃِ) یَعْنِیْ اَسْلِمُوْا (رواہ احمد والطبرانی وابو یعلی فی مسندہ)

(۲۷) عَنْ حُذَیْفَۃَ بْنِ الْیَمَانِ قَالَ قَالَ اَتٰی رَجُلُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ رَاَیْتُ فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ لَقِیْتُ بَعْضَ اَھْلِ الْکِتَابِ فَقَالَ نِعْمَ الْقَوْمُ اَنْتُمْ لَوْلَا اَنَّکُمْ تَقُوْلُوْنَ مَا شَاءَ اللّٰہُ وَشَاءَ مُحَمَّدٌ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ

مگر وہ جس کو میں نے کھانا کھلایا، سب پیاسے تھے مگر وہ جس کو میں نے پانی پلایا تو مجھ سے ہی ہدایت مانگو میں تمہیں ہدایت دوں گا، مجھ سے ہی لباس مانگو میں تمہیں لباس دونگا، مجھ سے ہی کھانا مانگو میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا، مجھ سے ہی پانی مانگو میں تمہیں پانی پلاؤں گا، اے میرے بندو اگر تمہارا اول و آخر (اس کے بعد پہلی حدیث کے قریب مضمون بیان کیا صرف فرق یہ ہے کہ یہاں یہ الفاظ ہیں "میری سلطنت میں کچھ کمی نہیں پیدا کرسکتے مگر جتنا کہ سوئی کی نوک سمندر کے پانی میں" (اس حدیث کو امام احمد اور مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۲۶) ابو الدرداءؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا احترام کرو، وہ تمہیں بخش دیگا۔ ابن ثوبان (حدیث کا ایک راوی ہے) کہتا ہے آپ کی مراد یہ تھی کہ اسلام لے آؤ (اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی اور ابو یعلیٰ نے روایت کیا ہے)

(۲۷) حذیفہ بن الیمانؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں کسی اہل کتاب سے ملا تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم کیا اچھے لوگ تھے اگر ماشاء اللہ وشاء محمد نہ کہا کرتے (یعنی جو اللہ تعالیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں) آنحضرت

---

(۲۶) معلوم ہوا کہ دوسرے مذاہب خدا تعالیٰ کے احترام کا کتنا ہی دعوی کریں مگر اس کا صحیح احترام اب صرف اسلام قبول کرنے میں ہے۔

(۲۷) عربی زبان میں "واو" شرکت کے لئے آتا ہے اور "ثم" تراخی و تاخیر کے لئے اس لئے عقیدہ خواہ کچھ بھی ہو مگر بارگاہِ خداوندی کی عظمت چاہتی ہے کہ اس کی صفات میں عبارتی شرکت کا بھی شائبہ نہ آنے پائے۔ جہاں عبارتی ادب آتا ہے وہاں عقیدہ کا ادب کتنا ہوگا۔ حدیث تو یہ کہتی ہے مگر آپ سوچیے کہ آپ کیا کر رہے ہیں، اسلام کی توحید کیا ہے اور آپ کا عمل کہاں ہے۔

كُنْتُ أَكْرَهُهَا مِنْكُمْ فَقُوْلُوْا مَا شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ مُحَمَّدٌ (رواه احمد والطيالسی)

(۲۸) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَجَعَلْتَنِيْ وَاللّٰهَ عِدْلًا بَلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ (رواه احمد)

(۲۹) وَعَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ يَقُوْلُ اللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيَّامُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ الْحَقُّ وَقَوْلُكَ الْحَقُّ وَوَعْدُكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں بھی تمہاری اس بات کو ناپسند کیا کرتا تھا لہذا (بجائے اُس کے) یہ کہا کرو ماشاء اللہ ثم محمد (پہلے جو خدا چاہے اس کے بعد جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہیں (اس حدیث کو امام احمد اور ابوداود طیالسی نے روایت کیا ہے)۔

(۲۸) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ماشاء اللہ وشئت (جو اللہ تعالیٰ چاہے اور آپ چاہیں) آپ نے اس شخص سے کہا کہ کیا تو نے مجھے اور اللہ تعالیٰ کو برابر کردیا؟ صرف یہ کہہ کہ جو ایک اللہ چاہے۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۲۹) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب شب میں نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو کہتے اے اللہ تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں زمین وآسمان اور جو مخلوق اس میں ہے سب کا نور تو ہے۔ اور تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں۔ زمین وآسمان اور جو مخلوق اس میں ہے سب کا وجود قائم رکھنے والا تو ہے اور تمام تعریفیں تیرے لئے ہیں۔ تو سچا اور تیرا قول سچا ہے تیرا وعدہ سچا اور تیرا ملنا سچا ہے، جنت حق ہے، دوزخ حق ہے، قیامت کی آمد حق ہے اے اللہ میں تیرا ہی مطیع ہوا، تجھ پر ہی ایمان لایا،

---

(۲۸) یعنی خدا اور رسول کا احترام الگ الگ ہونا اور ہر ایک کے حقوق کو خلط ملط نہ کرو۔ خدا کا احترام یہ ہے کہ جہاں وہ ہے وہاں کوئی نہیں۔ حقیقۃً شرکت تو درکنار وہاں لفظی شرکت ومساوات بھی مکروہ عمل ہے۔

(۲۹) حقیقت یہ ہے کہ ادعیہ واذکار کو لوگ غور سے نہیں پڑھتے۔ حالانکہ اسلام میں خدائی عظمت کا ٹھیک ٹھیک پتہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا صحیح سراغ اسی نیم شب کے نالہ وبکا میں ملتا ہے ایک دعا میں جو تین تین بار ولک الحمد کہہ جاتا ہو ایک نماز میں جو ہر بار رکوع سے اٹھ کر ربنا ولک الحمد کہتا ہو سوچو کہ اس کے قلب میں اپنے خالق کے لئے کتنا جذبہ حمد پنہاں ہوگا پھر وہ محمد نہ ہو تو اور کیا ہو۔ اللھم صل وسلم وبارک علیہ ما ذرت الملوان۔

تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْكَ أَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَإِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَأَخَّرْتُ وَأَسْرَرْتُ وَأَعْلَنْتُ أَنْتَ إِلٰهِي لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ (رواہ احمد و الشیخان و مالک والثلاثۃ)

باب فی صفاتہ عزوجل وتنزیھہ عن کل نقص

(۳۰) عَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ أَنَّ الْمُشْرِكِينَ قَالُوا لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مُحَمَّدُ أُنْسُبْ لَنَا رَبَّكَ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ اللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ۔ (رواہ احمد)

(۳۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ

تجھ پر ہی بھروسہ کیا، تیری ہی طرف متوجہ ہوا، تیری ہی طاقت سے اپنے دشمن کا مقابلہ کیا، تیری ہی طرف فیصلہ کے لئے آیا، میرے گناہ جو میں کر چکا اور جو بعد میں کئے، جو پوشیدہ کئے اور جو کھلے طور پر کئے، سب بخش دے تو میرا معبود ہے، سوائے تیرے میرا کوئی اور معبود نہیں (اس حدیث کو امام احمد، شیخین، امام مالک اور سنن ثلاثہ نے روایت کیا ہے)

خدا تعالیٰ کی تنزیہی صفات

(۳۰) ابی بن کعبؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مشرکین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا اے محمدؐ ہمیں اپنے پروردگار کا نسب تو بتلایئے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔ قل ھو اللہ، تم آپ کہدیجئے کہ وہ اللہ ہے بے نیاز، نہ کسی کو اس نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (احمد)

(۳۱) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرمایا ہے ابنِ آدم نے میری تکذیبؐ کی اور یہ اس کو مناسب نہ تھا اور مجھے برا بھلا کہا حالانکہ یہ اس کے لئے

---

(۳۱) بہت سے الفاظ صرف اعتقادیات کی نجاستوں ہی سے ملوث نہیں ہوتے بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ شریعت اسلام ہر ایک کو ذوقِ فطرت کے مطابق متاثر کرنا چاہتی ہے اگر کوئی عقائد کی تطہیر و تنزیہ کا مذاق نہیں رکھتا تو کم از کم اخلاقی لحاظ سے اس کو معقول کرنا چاہتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ جو الفاظ تم اپنے منہ سے نکالتے ہو یہ صرف عقائد شرکیہ ہی نہیں بلکہ سب و شتم اور خدائے پاک کے تکذیب کے بھی الفاظ ہیں تم کہتے ہو کہ قیامت نہیں آئیگی مگر اس کلمہ کی شناعت صرف ایک عقیدہ کی حد تک نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بس خدا نے نہیں دوبارہ پھر زندہ کرنے کا ذکر کیا ہے گویا اس نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تم کہتے ہو کہ اس کے بیٹا ہے مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس نے کسی کو جنا ہے تو اس کو بھی کسی نے جنا ہوگا اور یہاں جب سلسلہ ولادت ہے تو اس کے لئے بیوی کا ہونا بھی ضروری ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

كَذَّبَنِي عَبْدِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ وَشَتَمَنِي وَلَمْ يَكُنْ لَهُ ذٰلِكَ تَكْذِيْبُهُ إِيَّايَ (وَفِي رِوَايَةٍ فَأَمَّا تَكْذِيْبُهُ إِيَّايَ) أَنْ يَقُوْلَ فَلَنْ يُعِيْدَنَا كَمَا بَدَأَنَا، وَأَمَّا شَتْمُهُ إِيَّايَ يَقُوْلُ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا وَأَنَا الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ أَلِدْ وَلَمْ أُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لِي كُفُوًا أَحَدٌ . . .

(رواہ احمد والشیخان وابوداود والنسائی)۔

(۳۲) وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ يُؤْذِيْنِي ابْنُ آدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَأَنَا الدَّهْرُ بِيَدِي الْأَمْرُ أُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ (رواہ احمد والشیخان وغیرہم)

موزوں نہ تھا۔ اس کا میری تکذیب کرنا (ایک روایت میں یوں ہے کہ بہرحال اس کا مجھے جھٹلانا تو) یہ ہی کہ وہ کہتا ہے اس نے جیسا ہمیں پہلے پیدا کیا تھا ایسے ہی پھر زندہ نہیں کرے گا، اور اس کا برا بھلا کہنا یہ کہ وہ کہتا ہے میں نے کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے حالانکہ میں بے نیاز ہوں نہ میں نے کسی کو جنا ہے نہ کسی نے مجھکو اور نہ میرا کوئی نظیر و ہمسر ہے (اس حدیث کو امام احمد، شیخین اور نسائی نے روایت کیا ہے)۔

(۳۲) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیثِ قدسی میں فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ابن آدم مجھے تکلیف دینا چاہتا ہے، دہر اور زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے حالانکہ زمانہ (کچھ نہیں وہ) تو میں ہی ہوں سب تصرفات میرے قبضہ میں ہیں، شب و روز کی گردش میرے ہی حکم سے ہوتی ہے۔ (اس حدیث کو احمد، شیخین وغیرہم نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سوچو کہ جو ذات مادیات کی ہر ظلمت سے بالاتر ہے اس کے لئے مادیات کے اس نازل تر تخیل کا قائم کرنا اخلاق سے کتنی گری ہوئی بات ہے۔ ایک درشت خو مگر سادہ فطرت رکھنے والے کے لئے کیا خوب طریقہ تفہیم ہے۔

(۳۲) اسلامی ادب کی یہ نہایت نازک ہی کیفیت ہے کہ انسان جب اپنی عام بات چیت میں ایسے محاورات استعمال کرتا ہے جس کی زد بارگاہ صمدیت پر پڑ سکتی ہے تو وہ ان کو عام بول چال میں لانا بھی پسند نہیں کرتا اور خدائی عظمت کو ہر وقت و ہر لحظہ اتنا دل نشین کر دینا چاہتا ہے کہ غفلت کے حال میں بھی ہر چھوٹے بڑے تصرف کی نسبتیں سب ایک ہی ذات کی طرف رکھی جائیں بالخصوص جبکہ اس کے سامنے وہ لوگ بھی موجود ہوں جو زمانیات کو زمانہ ہی کے تاثیر کا نتیجہ قرار دیتے ہوں، اس وقت اگر ایک توحید کا قائل بھی کسی استعارہ و مجاز میں یہی تعبیر اختیار کرلے تو پھر ایک اسلامی اور دھری میں کیا فرق باقی رہے گا۔ اب سوچو کہ جو مذہب تمہارے الفاظ کو بھی شرک سے اتنا دور رکھنا چاہتا ہے وہ تمہارے قلب و دماغ کو کتنا دور رکھنا چاہتا ہوگا۔ دل و دماغ پر معانی کا انعکاس الفاظ ہی کے واسطہ سے ہوتا ہے اس لئے عام بول چال میں بھی غفلت کرنا مناسب نہیں ہے ہمارے دور میں محض وقتی دلچسپی کے لئے شریعت کے عقائد و اعمال کا استہزا کوئی بات نہیں رہی یہ غلط طریقہ ہے اس کا نتیجہ یہ ہو کر رہے گا کہ ایک دن ان کی وقعت حقیقۃً دلوں سے نکل جائے گی اور یہ وقتی خوش مذاقی دائمی بد مذاقی کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔

(۳۳) عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰی اَذًی یَسْمَعُہٗ مِنَ اللّٰہِ یَدَّعُوْنَ لَہُ الْوَلَدَ ثُمَّ یُعَافِیْہِمْ وَیَرْزُقُہُمْ (متفق علیہ)

(۳۳) ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے خدا تعالیٰ سے زیادہ تکلیف دہ کلمات سن کر تحمل کرنے والا کوئی نہیں، مشرکین اس کے لئے بیٹا تجویز کرتے ہیں، وہ اس پر بھی انھیں عافیت بخشتا اور روزی پہنچاتا رہتا ہے (اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)۔

باب فی سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ

انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کا پہلا تعارف اگرچہ صفتِ ربوبیت کے ذریعہ سے قائم ہوا ہے مگر ربوبیت کی اصل روح رحمت ہی ہے اس لئے سورۂ فاتحہ میں رب العالمین کے بعد رحمٰن ورحیم کی صفت کا ذکر ہے اگر رحمت نہ ہوتی تو یہ تربیت بھی نہ ہوتی بلکہ تمام جہان کی پیدائش ہی اسی رحمت کا ثمرہ ہے۔ رحمت ہی کا یہ جوش تھا کہ بلا مطالبہ، بلا استحقاق محض عدم کو لباسِ وجود عطا کیا مگر رحمت کا اقتضاء صرف معدوم کو موجود اور معصوم کو بخش کر پورا نہیں ہوتا تھا اس لئے رحمٰن نے بالقصد نور وظلمت سے ایک مرکب مخلوق بنائی تاکہ وہ گناہ کرے اور جب وہ بھولے سے بھی استغفار کے لئے ہاتھ اٹھائے تو رحمت کو بخشش کا بہانہ مل جائے یہ گناہ کرکر کے شرمندہ ہوا کرے وہ معاف کرکر کے فخر کیا کرے۔ فلاسفہ ومعتزلہ کو صرف عادل خدا درکار ہے مگر ہم گنہگاروں کو وہ عادل درکار ہے جس کے غصہ پر اس کی رحمت غالب ہو، یہ عجیب بات ہے کہ گنہگاروں کو رحمٰن کی اتنی تلاش نہیں جتنی رحمٰن کو گنہگاروں کی، اور یہی وجہ ہے کہ معصومین موجود تھے مگر گنہگاروں کی جگہ پھر خالی تھی، رحمت کا جوش چاہتا تھا کہ ان کو بخشے جن پر فردِ جرم لگ چکی ہو، جب اسے کوئی ایسا نہ ملا تو اس نے ایک مخلوق اسی صفت کی پیدا فرمائی مگر جب یہ مخلوق پیدا ہوئی تو ان میں سے بہتوں نے رحمٰن کا دروازہ چھوڑ دیا رحمت بلاتی رہ گئی اور انھوں نے منہ پھیر کر بھی نہ دیکھا مگر جب عمر بھر روگردانی کے بعد بھی سمجھ آگئی تو رحمت نے پھر گلے لگانے سے کسی کو انکار نہ کیا اور گذشتہ سب گستاخیوں کو

۳۳ے خدا کی ذات پاک کسی کی ایذاء دہی سے بالاتر ہے مگر جب اس کی بنائی ہوئی مخلوق اپنی جانب سے ایذاء دہی کے سامان تیار کر لیتی ہے تو وہ اس کی اطلاع دیدیتا ہے کہ میں اس سے بے خبر نہیں ہوں مگر اس کے جواب میں عافیت و رزق فرماتا رہتا ہے اگر اس کے سوا دوسرے جواب کا ارادہ کرلے تو سب دنیا ویران ہو جائے، ہماری پستی اور اس کی بلندی، ہماری تنگ ظرفی اور اس کی فراخ حوصلگی، ہماری بغاوت اور اس کے تحمل کا یہ نقشہ قیامت تک یونہی جاری رہے گا۔ اسلام چاہتا ہے کہ فردائے قیامت میں اپنے حلقہ بگوشوں کو اس رسوائی سے بچالے۔

قلمِ عفو کھینچنے کا اعلان کر دیا صفت قہر و غضب پوری تمامیتہ و کمال کے باوجود اپنے مستحقین پر اترنے کے لئے بھی مشیت کا انتظار کرتی ہے مگر صفتِ رحمت ہے کہ ہر چیز کو بلا تفریق محیط ہے رحمتی وسعت کل شئ۔ عالم کا کوئی گوشہ نہیں جسے صفتِ رحمت سے کوئی نہ کوئی حصہ نہ ملا ہو۔ اسی اعتبار سے عرش پر اسم رحمٰن کی تجلی ہے تاکہ تمام مخلوق رحمت کے نیچے بسر کرے اور اسی لئے جو نوشتہ کہ عرشِ رحمٰن کی زینت بنا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ان رحمتی سبقت غضبی۔

اس سبقت و غلبہ کے اظہار کے لئے رحمت کی کچھ کرشمہ سازیاں میدانِ محشر میں نظر آئیں گی انھیں پڑھکر خدا کی صفت قہر و غضب سے مطمئن نہ ہونا چاہئے رحمت کی سبقت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں صفتِ غضب نہیں گناہوں کی بازپرس، مظلوموں کی دادرسی نہیں ظالموں کی بیدادی، متکبروں کے غرور، مفسدین کے بگاڑ کا کوئی حساب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک انسان سو قتل کرکے اور ایک کافر عمر بھر کی بغاوت کے بعد بھی رحمت کی طرف متوجہ ہونا چاہے تو رحمت پھر حساب نہیں لگائے گی اور ان جیسے مجرمین کے لئے بھی اس میں وسعت نظر آئے گی۔ لیکن کوئی مجرم اگر صفتِ رحمت کا خود سہارا نہیں ڈھونڈھتا تو پھر اُسے خدائی غضب کی پکڑ سے مامون نہ رہنا چاہئے۔

شیخ اکبرؒ نے سہل تستریؒ اور ابلیس کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے کہ ایک دن ابلیس نے ان سے کہا جب قرآن رحمتی وسعت کل شئ کہتا ہے (یعنی میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہے) تو پھر کس دلیل سے تم مجھے رحمت سے نکال سکتے ہو کیا میں شئے نہیں، سہل کہتے ہیں یہ اعتراض سن کر میں حیران رہ گیا اور دل ہی دل میں بار بار آیت کے سیاق و سباق پر غور کرنے لگا دفعتہً مجھے خیال آیا کہ اس کے آگے ہی اس کا جواب موجود ہے۔ فسأكتبها للذين يتقون (میں اپنی رحمت ان کے لئے لکھدوں گا جو متقی ہیں) میں نے بڑی خوشی خوشی کہا اے ملعون مگر اس رحمت کو اللہ تعالیٰ نے چند قیود کے ساتھ مقید کیا ہے چونکہ تجھ میں وہ صفات نہیں اس لئے تو رحمت کا مستحق بھی نہیں، یہ جواب سن کر ابلیس ہتک آمیز لہجہ میں مسکرایا اور بولا اے سہل میرا خیال تمہارے متعلق یہ تھا کہ تم اور صفاتِ الٰہیہ سے اتنے جاہل ہوگے تقیید تو تمہاری صفت ہے خدا تعالیٰ کی جو صفت بھی ہے وہ قیود کے داغ سے مبرا و منزہ ہے وہاں اطلاق ہی اطلاق ہے، سہلؒ کہتے ہیں اس کا یہ اعتراض سن کر میرا منہ خشک ہوگیا اور مجھے کوئی جواب نہ آیا۔[1]

حضرت استاد قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ آیت میں صرف خدائی رحمت کی وسعت کا بیان کیا گیا ہے جو از خود اس میں نہ آئے یا اس کا قصور ہے رحمت کی وسعت کا نہیں۔ اگر ایک مکان میں سو آدمیوں کی

---

[1] الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۵۶ ۔

گنجایش ہے مگر اس مکان میں آنے والے صرف پچاس ہی آدمی ہوں تو اس میں مکان کی وسعت کا قصور نہیں ہے نہ آنے والوں کی کوتاہی ہے، شیطان اور اس سے بڑھ کر متمرد کے لئے بھی رحمت میں ہر وقت گنجائش ہے مگر وہ خود ہی اگر نہ آئے تو یہ اس کی بدنصیبی ہے۔ انلزمکموھا وانتم لھا کارھون۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ فَسَاَکْتُبُھَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ۔ (اعراف) وَقَالَ تَعَالیٰ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔ (زمر)

(۳۴) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَمَّا خَلَقَ اللّٰہُ الْخَلْقَ کَتَبَ فِیْ کِتَابِہٖ فَھُوَ عِنْدَہٗ فَوْقَ الْعَرْشِ اِنَّ رَحْمَتِیْ تَغْلِبُ غَضَبِیْ۔

(۳۵) وَعَنْہُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ یَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللّٰہِ مِنَ الْعُقُوْبَۃِ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِہٖ اَحَدٌ وَلَوْ یَعْلَمُ الْکَافِرُ مَا عِنْدَ اللّٰہِ مِنَ الرَّحْمَۃِ مَا قَنِطَ مِنْ جَنَّتِہٖ اَحَدٌ

خدا تعالیٰ کی وسعتِ رحمت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ میری رحمت میں ہر چیز کی سمائی ہے تو اس کو ہم ان کے لئے لکھدیں گے جو پرہیزگار ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، اور ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ کہدیجئے، اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جان پر زیادتی کی ہے، اللہ کی مہربانی سے آس مت توڑو، بیشک اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ سب گناہ بخشدے سکتا ہے وہی گناہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

(۳۴) ابوہریرۃؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کر لیا تو لوحِ محفوظ میں یہ لکھدیا میری رحمت میرے غصہ سے بڑھی ہوئی ہے یہ تحریر اس کے سامنے عرش پر موجود ہے۔

(۳۵) ابوہریرۃؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اگر مومن جانتا اللہ تعالیٰ کا عذاب کتنا ہے تو اس کی جنت کی کوئی طمع نہ رکھتا اور اگر کافر جانتا خدا کی رحمت کتنی ہے تو اس کی جنت سے کوئی مایوس نہ رہتا۔

(۳۴) کارخانۂ عالم تمام کا تمام اسباب و مسببات کا محکوم ہے اس لئے احادیث میں اگر کہیں کتاب وکتابت کا ذکر آجاتا ہے تو اس کو نہ مجاز و استعارہ بنانے کی ضرورت ہے نہ کسی اور تاویل یا تامل کی۔ ہاں اس جسارت و دلیری کی بھی ضرورت نہیں کہ عالم غیب کو عالم شہادت پر قیاس کر کے کاغذ، قلم، دوات کے جو آلات یہاں درکار ہیں وہی عالم بالا میں تصور کر لئے جائیں۔ ؎ غیب را ابرو بہارے دگر است۔ (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ)

(۳۶) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ مِائَةَ جُزْءٍ فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ وَأَنْزَلَ فِي الْأَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا فَمِنْ ذَالِكَ الْجُزْءِ تَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ حَتّٰى تَرْفَعَ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ أَنْ تُصِيْبَهُ۔

(۳۷) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ لِلّٰهِ مِائَةَ رَحْمَةٍ أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِ فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ وَبِهَا يَتَرَاحَمُوْنَ وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَلَدِهَا وَأَخَّرَ اللّٰهُ تِسْعًا وَتِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ وفی روایۃ مسلم فی اٰخرہ قال فاذا کان یوم القیامۃ اکملھا بھذہ الرحمۃ (روی ھذہ الاربعۃ الشیخان والترمذی)

(۳۶) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سَو حصے کئے، ننانوے حصے تو اپنے لئے محفوظ رکھے ہیں اور صرف ایک حصہ زمین والوں کو بخشا ہے، یہی ایک حصہ ہے جس سے مخلوق باہم ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتی ہے، یہاں تک کہ جانور اپنا پاؤں اپنے بچے سے ہٹا لیتا ہے اس خوف سے کہ کہیں اس پر جا نہ پڑے۔

(۳۷) ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے لئے سو رحمتیں ہیں جن میں سے اس نے جن وانس، جانور اور موذیات میں رحمت کا صرف ایک حصہ اتارا ہے، اسی ایک حصہ کی وجہ سے وہ باہم ایک دوسرے کی طرف جھکتے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اسی ایک حصہ کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچے سے الفت رکھتا ہے (بقیہ) رحمت کے ننانوے حصوں کو اس نے قیامت کے دن کے لئے رکھ چھوڑا ہے کہ ان سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا! اور مسلم میں ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو ان ننانوے حصوں کو رحمت کے اس ایک حصہ سے پورا کر کے (پوری سَو کی سَو رحمتوں سے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا) ان چار حدیثوں کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رحمت کی سبقت کا یہ مطلب ہے کہ نزولِ قہر کے لئے سبب درکار ہے مگر رحمت کو سبب کا انتظار نہیں اس لئے رحمت ہمیشہ غضب سے بڑھی رہتی ہے۔ یہ کتبہ اس لئے عرش پر رکھا گیا ہے کہ اس کے نیچے بسنے والی مخلوق مطمئن رہے کہ اس کے مقدمہ کی سماعت آئینِ رحمت کے ماتحت ہوگی صفتِ انتقام یا صرف صفتِ عدل کے ماتحت نہیں۔

(۶۴) خدائی صفات کمالیہ کا یہ کمال ہے کہ ہر ایک اپنی جگہ اتنی کامل ہے کہ ایک کا نظارہ دوسرے کے تصور سے غافل بنا دیتا ہے مگر خدا کی ذات کا یہ کمال ہے کہ اس کی ہر شان ہر وقت یکساں ظہور کرتی رہتی ہے وہ عین رحمت کے حال میں غضب اور عین غضب کے حال میں رحمت کرتا رہتا ہے۔ نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی ھو العذاب الالیم (میرے بندوں کو مطلع کر دیجئے کہ غفور رحیم صرف میں ہوں اور میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے۔ (صفحہ ہذا کا حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(۳۸) عَنْ جُنْدُبٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ رَجُلًا قَالَ وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لِفُلَانٍ وَاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَالَ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَتَأَلّٰى عَلَيَّ اَلَّا اَغْفِرَ لِفُلَانٍ فَاِنِّيْ قَدْ غَفَرْتُ لِفُلَانٍ وَاَحْبَطْتُ عَمَلَكَ اَوْ كَمَا قَالَ وَفِيْ رِوَايَةٍ لَا يَسْتُرُ اللّٰهُ عَلٰى عَبْدٍ فِي الدُّنْيَا اِلَّا سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (رواہ مسلم)

(۳۹) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّهٗ قَالَ قَدِمَ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ بِسَبْيٍ فَاِذَا امْرَأَةٌ مِّنَ السَّبْيِ تَبْتَغِيْ اِذَا وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ اَخَذَتْهُ فَاَلْصَقَتْهُ بِبَطْنِهَا وَاَرْضَعَتْهُ فَقَالَ لَنَا

(۳۸) جندبؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے خدا کی قسم کھا کر کہا وہ فلاں شخص کو نہیں بخشیگا، خدائے تعالیٰ نے فرمایا یہ کون ہے جو مجھ پر قسم کھاتا ہے کہ میں فلاں کو نہیں بخشوں گا (جا) میں نے فلاں کو بخشا اور تیرے عمل اکارت کئے (راوی کو تردد ہے کہ یہ یا اس کے مشابہ کوئی اور جملہ فرمایا) اور ایک روایت میں یہ ہے جس بندہ کی اللہ تعالیٰ دنیا میں پردہ پوشی فرمائے (امید ہے کہ) آخرت میں بھی ضرور اس کی پردہ پوشی کرے گا۔ (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(۳۹) عمر بن الخطابؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے، ان میں ایک عورت نظر پڑی جو اپنا بچہ تلاش کرتی پھرتی تھی جونہی کہ اس کو بچہ مل گیا اسی وقت اس نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۳۷) غیر محدود رحمت کے تصور سے انسان عاجز ہے اور اس کو سمجھانا یہ ہے کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی رحمت اور تنہا خدا کی اس رحمت میں جو یوم حساب میں ظاہر ہوگی کیا تفاوت ہے، اس تفاوت کے ذہن نشین کرنے کے لئے یہ ایک فرضی حساب بیان کیا گیا ہے تاکہ فکر انسانی کو غیر محدود رحمت کے اندازہ کرنے کا راستہ مل جائے ورنہ غیر محدود کو نہ سو میں تقسیم کیا جا سکتا ہے نہ دو سو میں۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ درجات جنت سو ہیں اور جنت میں جانا چونکہ بلا رحمت الٰہیہ ہو نہیں سکتا اس لئے ہر درجہ کے مقابلہ میں رحمت کا ایک جزء بتلا دیا گیا ہے۔ حدیث ۳۷ میں اسی کی توضیح و تفہیم مقصود ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) (۳۸) مسند امام احمد میں اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں دو دوست تھے ایک عبادت گذار دوسرا گنہگار تھا۔ یہ اس گنہگار سے کہا کرتا گناہ مت کیا کر، وہ جواب دیتا تجھے کیا پڑی ہے میں جانوں اور میرا رب۔ اس نے ایک دن اسے کوئی بڑا گناہ کرتے دیکھا تو پھر اس کو روکا اس نے کہا تو مجھ پر کوئی داروغہ تو مقرر نہیں ہے اسے غصہ آیا اور خدا کی قسم کھا کر کہا جا خدا تیری مغفرت نہیں کرے گا اور نہ تجھے اپنی جنت میں داخل کرے گا۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے موت کا فرشتہ بھیجا اس نے دونوں کی روح قبض کر لی، جب اس کے دربار میں دونوں کی پیشی ہوئی تو پہلے گنہگار کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ جا تو میری رحمت سے جنت میں چلا جا۔ پھر اس سے کہا تیری طاقت ہے کہ تو میرے بندہ پر میری رحمت روک دے؟ وہ بولا نہ رب ہرگز نہیں، حکم دیا اسے دوزخ میں لیجاؤ۔ اس حدیث میں اس کی صفت قدرت کا مظاہرہ ہے یعنی وہ چاہے تو ایک گنہگار کو صرف اپنی رحمت سے بخشدے اور چاہے تو ایک نیکو کار کو ادنیٰ سی بات پر گرفت فرمالے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَرَوْنَ ھٰذِہِ الْمَرْأَۃَ طَارِحَۃً وَلَدَھَا فِی النَّارِ؟ قُلْنَا لَا وَاللّٰہِ وَھِیَ تَقْدِرُ اَنْ لَّا تَطْرَحَہٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰہُ اَرْحَمُ بِعِبَادِہٖ مِنْ ھٰذِہٖ بِوَلَدِھَا (رواہ الشیخان)

(۴۰) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ الْغِفَارِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا وَاَزِیْدُ وَمَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَجَزَاءُ سَیِّئَۃٍ مِّثْلُھَا

اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور دودھ پلانے لگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے اس بچہ کو آگ میں ڈال سکتی ہے ہم نے عرض کیا خدا کی قسم نہیں بالخصوص جبکہ اس کو آگ میں نہ ڈالنے کی قدرت بھی ہے (کوئی مجبوری نہیں) اس پر آپ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں پر زیادہ پیار ہے بہ نسبت اس عورت کے اپنے بچہ پر (اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے)

(۴۰) ابوذر غفاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا اللہ تعالیٰ کہتا ہے جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا بدلہ ملیگا اور میں اس پر بھی اضافہ کردونگا اور جو برائی کرے گا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) احادیث میں لفظ "لاابالی" اس کی اسی شان بے نیازی کی طرف اشارہ ہے۔ یہاں اس نکتہ نواز کو گنہگار کی اعتمادِ رحمت کی ادا پسند آگئی اور عابد کی خدائی رحمت پر اس وثوق کے ساتھ اپنی جانب سے بندش ناگوار گذری اس کا نتیجہ پلٹ گیا۔ مخلوق کو چاہیے کہ خالق کے عذاب وثواب کی تقسیم میں کسی حال دخل انداز نہ ہو، ہم عمل کے مخاطب ہیں اور جزا کا وہ مختار ہے۔

(۳۹) اس کے ساتھ حدیث ۱۸ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔ دونوں جگہ آنکھوں کے سامنے مخلوق کی محبت وشفقت کا انتہائی جوش نظر آرہا ہے، انسانی فطرت شناس چاہتا ہے کہ اسی تاثر کے حال میں اس کو وہ رحمت یاد دلائے جس کو صرف سمجھانے کے لئے اس سے سوگنا زیادہ کہا گیا ہے اور اس طرح خدا کی رحمت کی عظمت اتنی ذہن نشین کردے کہ یہ مخلوق کی رحمتیں نظروں میں ہیچ ہو جائیں۔ اسلامی عقائد صرف علوم نہیں بلکہ فطرت کے تاثرات اور ان کے نقش ونگار ہیں، خدائی رحمت کا یہیں صرف علم درکار نہیں بلکہ وہ یقین درکار ہے جس کے بعد بے ساختہ قلب میں اس کی طرف ایک انجذاب محسوس ہونے لگے۔

(۴۰) قرب وبعد کو حدود میں محصور تصور کرنے والا انسان جب ان قیود سے بالاتر ہستی کے قرب وبعد کا ذکر سنتا ہے تو اس کو بھی بالشتوں اور گزوں سے ناپنے کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ جو ان حدود سے آزاد ہے اس کے لئے ان حدود کا تصور کیوں کیا جائے۔ انسان خواب کے عالم میں بہت کچھ دیکھتا ہے مگر نہیں بتلا سکتا کہ اس کو اس جہان سے تحت وفوق یا قرب وبعد میں سے کونسی نسبت حاصل ہے وہ دیکھتا ہے کہ وہ اسی جیسے وسیع جہان میں پھر رہا ہے حالانکہ وہ سارا جہان اس میں ہے اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اس میں ہے اس سے کتنا قریب ہے کتنا بعید ہے۔ شریعت الفاظ کی تنگی کی وجہ سے ہماری تفہیم کیلئے ایک موثر انداز بیان اختیار کرتی ہے ہم اس کی صورت ڈھالنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ یہاں حدیث کا خلاصہ صرف اسقدر ہے کہ جتنا بندہ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس سے زیادہ رحمت اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)۔

أَوْ أَغْفِرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَمَنْ أَتَانِي يَمْشِي أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً وَمَنْ لَقِيَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيئَةً لَا يُشْرِكُ

اس کو صرف ایک برائی کا بدلہ ملے گا اور امکان یہ بھی ہے کہ میں اسے معاف کر دوں جو میری طرف ایک بالشت قریب آئے گا میں اس کی طرف ایک ہاتھ قریب آؤں گا اور جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہو گا میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مادی کا قرب مادی کو بیشک مکانی ہو مگر مجرد کا مجرد سے یا مادی کا مجرد کو یا مجرد کا مادی سے مکانی قرب نہیں بایں ہمہ آخری تین قسموں میں جو قرب ہے وہ پہلی قسم کو کہیں زیادہ ہے۔ باپ اور بیٹے میں بعد مسافت کے باوجود جو قرب ہے وہ دو اجنبی شخصوں میں ایک جگہ بیٹھکر بھی نہیں۔ اسی لحاظ سے نبی کو جو قرب و محبت مومنوں کی جانوں سے حاصل ہوتا ہے وہ خود ان کو اپنی جانوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ قرب مکانی کا رشتہ بہت ضعیف و کمتر رشتہ ہے، قرب کی ہر تعبیر کو زمان و مکان کی قیود میں محدود کر دینا ہماری کوتاہی ہے، خدا ایک مطیع و فرمانبردار بندہ سے بہت قریب ہے اور اتنا قریب ہو کہ اس کی رگ جاں بھی اتنی قریب نہیں مگر وہ قرب نہیں جو مادی کا مادی سے ہوتا ہے بلکہ وہ جو مجرد کو مادی سے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح وہ عاصی و نافرمان سے بہت بعید ہے مگر وہ بُعد نہیں جس کا حد و حدود نہایات سے اندازہ کیا جا سکے غرضکہ اگر وہ قریب ہے تو اتنا کہ اس سے زیادہ کوئی قریب نہیں اور بعید ہے تو ایسا کہ اس سے زیادہ کوئی بعید نہیں مگر دونوں صورتوں میں اس کا قرب و بعد وہی ہے جو ایک مجرد کو مادی سے ہو سکتا ہے نہ وہ جو مادی کو مادی سے شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں۔

ومن عجبي اني احن اليهم — واسأل عنهم دائما وهم معي

وتبكيهم عيني وهم في سوادها — وتشتاقهم روحي وهم بين اضلعي [1]

(یعنی مجھے اپنے حال پر تعجب ہے کہ میں کیوں اُن کا مشتاق رہتا ہوں اور اُن کے متعلق ہمیشہ کیوں دریافت کرتا پھرتا ہوں جبکہ وہ ہمہ وقت میرے ساتھ ہیں ـــــ اور اس پر کہ میری آنکھیں اُن کے لئے کیوں رویا کرتی ہیں جبکہ وہ اس کی پتلی میں موجود ہیں اور میری جان اُن کے لئے کیوں مشتاق رہتی ہے حالانکہ وہ میرے دل ہی میں جلوہ گر ہیں)

یہ تحیر و تعجب اس وقت تک دور نہیں ہو گا جب تک یہ مادی ترقی کر کے عالم تجرد کے کچھ قریب نہ ہو جائے، جب قریب ہو جائے گا تو پھر بھی اتنا ہی سمجھ سکیگا کہ اس کا تحیر بجا تھا درست تھا لیکن جب ہر شخص اس مرتبہ عروج کا اہل نہیں تو ورا الورا ذات خود تنزل کر کے اپنے لئے وہی الفاظ استعمال کرنا جائز سمجھ لیتی ہے جو مادی کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں اسی کے ساتھ یہ تنبیہ کر دی جاتی ہے کہ محض ان الفاظ سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا۔ مگر اسی نازک مرحلہ پر پہنچکر انسانی عقل محدود الفاظ اور غیر محدود ذات کا توازن قائم نہیں رکھ سکتی اور پھر یا تشبیہ کی حد میں داخل ہو جاتی ہے اور یا تنزیہ کے ان حدود تک پہنچ جاتی ہے جہاں قرب و بعد کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہتا۔ اسلام عبد و معبود کے درمیان جن علائق کا پتہ دیتا ہے اگر ہم ان کا تصور چھوڑ دیں تو پھر خدا کی ذات میں ہمارے لئے کوئی کشش نہیں رہتی اور اگر انھیں مادیت کے سانچے میں ڈھال لیں تو کفر بنتا ہے اس لئے یا تو اسی طرح اس پر ایمان لاؤ اور اگر اس کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہو تو عملی قدم بڑھاؤ اور اس کا یہ قرب و بعد دیدہ باطن سے اسی طرح دیکھ لو جیسا کہ دیدۂ ظاہر سے محسوسات کا مشاہدہ کر لیتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

[1] الیواقیت والجواہر ص ۶۰۔

بِيْ شَيْئًا لَقِيْتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً۔ رواہ مسلم والترمذی ولفظہ قال اللہ تعالیٰ یا ابْنَ اٰدَمَ
إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ فِيْكَ وَلَا أُبَالِيْ يَا ابْنَ اٰدَمَ لَوْ بَلَغَتْ
ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَا أُبَالِيْ يَا ابْنَ اٰدَمَ إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِيْ
بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً۔
(۴۱) عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى
قَالَ مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ

اس کے دو ہاتھ قریب ہوں گا اور جو میری طرف ٹہلتا ہوا آئے گا میں اس کی طرف لپکتا ہوا آؤنگا جو مجھ سے
زمین کے برابر گناہ کرکے ملیگا میں اس سے اتنی ہی بڑی مغفرت لیکر ملوں گا۔ بشرطیکہ اس نے میرا کسی کو
شریک نہ ٹھیرایا ہو۔ اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیاہے اور ترمذی کے الفاظ یہ ہیں، اللہ تعالیٰ
ارشاد فرماتاہے اے ابن آدم جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا اور مجھ سے امید لگائے رکھے گا میں تجھے بخشتا
رہوں گا خواہ تیرے عمل کیسے ہی ہوں اور میں بے نیاز ہوں اے ابن آدم اگر تیرے گناہوں کا ڈھیر آسمان
تک پہنچ جائے پھر تو مجھ سے معافی مانگنا چاہے تو میں تیرے پاس اتنی ہی مغفرت لیکر آؤں گا بشرطیکہ تونے
کسی کو میرا شریک نہ ٹھیرایا ہو اور میں بے نیاز ہوں اے ابن آدم اگر تو زمین کے برابر خطاؤں کا بوجھ لیکر میرے
پاس آئے اور مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ تونے شرک نہ کیا ہو، تو میں اسی کے برابر تیرے پاس
مغفرت لیکر آؤں گا۔

(۴۱) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا
اللہ تعالیٰ فرماتاہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی میری طرف سے اس کو اعلان جنگ ہے، میرا بندہ میرا تقرب

---

(۴۰) دو انسانوں کے درمیان مراحل محبت طے کرتے کرتے بسا اوقات ایسے اثرات نظر آنے لگتے ہیں جنھیں ایک اجنبی شخص بھی
دیکھکر یہ اندازہ کرلیتاہے کہ ضرور ان دو شخصوں میں کوئی ایسا تاثر و مغلوبیت کا تعلق ہے جس نے ان کے ظاہر کو بھی مسخر کرلیا ہے وہ
دیکھتاہے کہ نشست و برخاست کے اوضاع و اطوار سے گذر کر ان کے خط و خال میں بھی صفت ہمرنگی پیدا ہوگئی ہے، جب آمد
کے اتحاد، الم کے اتحاد، جذبات کے اتحاد کے ساتھ ظاہر کا یہ اتحاد بھی نظر آنے لگتا ہے تو اس اتحاد کی صحیح ترجمانی کے لئے
لفظ اتحاد کے سوا کوئی دوسرا لفظ نہیں ملتا ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

متنبی کہتاہے ؎

ما الخل الا من أود بقلبه وأرى بطرف لا يرى بسوائه

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهٖ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا

کسی اور عمل سے جو مجھے پسند ہو اتنا حاصل نہیں کر تا جتنا کہ اس عمل سے جو میں نے اس پر فرض کیا ہے۔ میرا بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا رہتا ہے تاآنکہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا وہ کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور وہ ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ کام کرتا ہے اور وہ پاؤں جن سے وہ چلتا ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) فارسی و عربی کے شعراء نے آثار محبت کے ادائیگی کے لئے جس مناسب تعبیر کا انتخاب کیا ہے وہ لفظ اتحاد ہے مگر ان الفاظ سے یہاں کسی کو بھی یہ شبہ پیدا نہیں ہوتا کہ اس اتحاد کی وجہ سے ان کی حقیقی اثنینیۃ باقی نہیں رہی پھر جب مخلوق کے دائرہ میں ان الفاظ سے یہ کھلی ہوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوتی تو خالق و مخلوق کے درمیان کسی تعبیری توسع سے عقیدہ کی غلط فہمی کیوں پیدا ہو جاتی ہے۔ بلاشبہ جب ایک بندہ راہ عبدیت پر گامزن ہوتا ہے اور فرائض و نوافل کے سبب عجز و نیاز کے قدم اٹھاتا چلا جاتا ہے تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اب اس کے ظاہر و باطن کو سلطان الوہیت نے پورا پورا مسخر کر لیا ہے اگر وہ سنتا ہے تو وہی سنتا ہے جسے خدا نے سننے کا امر کیا ہے اگر دیکھتا اور بولتا ہے تو وہی دیکھتا اور بولتا ہے جس کی اسے اجازت دی گئی ہے اگر وہ اپنا ہاتھ یا قدم اٹھاتا ہے تو وہیں اٹھاتا ہے جہاں اس کے مولی نے اس کے لئے اٹھانا پسند کیا ہے اس کے سوا نہ وہ کچھ سنتا ہے نہ دیکھتا ہے۔ اور کوئی ادنی جنبش کرتا ہے تو اس ربط محبت کے اظہار کے لئے لامحالہ وہی الفاظ اختیار کرنے پڑتے ہیں جو اس موقعہ و محل کے لئے مانوس ہیں پھر جس طرح وہاں ان الفاظ کا کھلا ہوا مطلب صرف اس رشتہ محبت کی ترجمانی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ان الفاظ کا کھلا ہوا مطلب یہی ہے کہ اب یہ بندہ وادی محبت طے کرتا ہوا اپنے مولی کی رضا و تسلیم میں فنا ہو چکا ہے اور اوامر شریعت کا اس طرح مطیع و منقاد ہو گیا ہے جیسا کہ ایک شایستہ گھوڑا اپنے سوار کے اشارات کا نہ اس گھوڑے کی حس و حرکت اپنی ہے نہ اس بندہ کی نقل و حرکت اپنی دیکھنے میں تو یہ خود ٹھہرتا اور حرکت کرتا ہے اور حقیقت میں اس کی حس و حرکت اس کے مالک ہی کی ہے اس کے جوارح اس کے ارادہ کے مظاہر بنے ہوئے ہیں جب مخلوق کی قوت ارادی اس درجہ فنا ہو جاتی ہے کہ اس کا حرکت و سکون دوسرے کے ارادہ کے تابع ہو جائے تو پھر اس کا حکم اسی صاحب ارادہ کے تابع ہو جاتا ہے۔ کتا جیسا خبیث جانور معلم ہو کر جب اپنی قوت ارادی فنا کر دیتا ہے اور ہمہ تن اپنے مالک کی رضا کے تابع ہو جاتا ہے تو شریعت نے اس کے جوارح کا اپنا کوئی حکم باقی نہیں رکھا بلکہ جو اس کے مالک کا حکم ہے اس کا بھی وہی حکم رکھ دیا ہے اسی لئے اگر وہ کتا مسلمان کا ہے تو اس کا شکار حلال ہے اور اگر کافر کا ہے تو اس کا شکار حرام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس درجہ فنائیت کے بعد اب یہ شکار اس کتے کا ہے ہی نہیں بلکہ اس کے مالک کا ہے اگر وہ مسلمان تھا تو یہ بھی حلال ہے اسی طرح جب بندہ اپنے ارادات کو فنا کر دیتا ہے تو پھر یہ اطلاق درست ہو جاتا ہے کہ اس کے سمع و بصر مشیت ایزدی کا مظہر بن گئے ہیں آپ نے دیکھا کہ فنا ارادہ کے اس مرحلہ پر پہنچ کر کس طرح ایک کتا اپنے مالک کا حکم اختیار کر لیتا ہے مگر جب ایک انسان شریعت کی متابعت کی بجائے اس سے ٹکرانے لگتا ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَیْءٍ اَنَا فَاعِلُہٗ تَرَدُّدِیْ
عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَاَنَا اَکْرَہُ مَسَاءَتَہٗ وَلَابُدَّ لَہٗ مِنْہُ (رواہ البخاری)

اب اگر وہ مجھ سے کوئی سوال کرے گا تو میں اُسے دوں گا اور اگر میری پناہ میں آنا چاہے گا تو میں اپنی پناہ میں لے لونگا۔ اور مجھے کسی کام کرنے میں جو مجھے کرنا ہے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا کہ مومن کی روح قبض کرنے میں اسے موت پسند نہیں ہوتی اور مجھے اس کا دلگیر ہونا گوارا نہیں ہوتا اور موت اس کے لئے ناگزیر ہوتی ہے (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) تو پھر اس کا حکم جانور سے بدتر ہوجاتا ہے۔

اس مضمون کو یہاں پوری احتیاط سے ادا کیا گیا ہے اور اسی لئے یہ نہیں فرمایا کہ "کنت ھو انا" یعنی اتحادِ ذات کی بجائے صرف اس کے ان ظاہری حواس کا ذکر کیا گیا ہے جو اس کے افعال کے لئے محرک بنتے ہیں۔ جہاں تک غور و تجربہ سے معلوم ہوسکا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت میں مجاز و استعارہ کی وہ سب شایستہ تعبیرات جائز رکھی گئی ہیں جو عربی زبان میں کسی غلط فہمی کا موجب نہ ہوں اور جن تعبیرات و مجازات سے کوئی ادنیٰ ابہام بھی پیدا ہوسکتا تھا ان سے تمام تر احتراز کیا گیا ہے۔ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہاں سمع و بصر وغیرہ قویٰ حسیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ قویٰ باطنیہ جیسا کہ فکر و خیال حفظ و وہم ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا یعنی یوں نہیں فرمایا گیا کہ میں اس کا فکر و وہم بن جاتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ حواسِ ظاہرہ اپنے ادراکات میں براہ راست خدا تعالیٰ کے محتاج ہیں اور قوائے باطنیہ بھی گو اس کی احتیاج سے باہر نہیں مگر یہاں برائے نام حواسِ ظاہرہ کا توسط بھی موجود ہے ان قوتوں کا دائرۂ تصرف وہی ادراکات ہیں جو حواسِ ظاہرہ کے ذریعہ ان کے سامنے جمع ہوجاتے ہیں۔ گویا انسانی حواس میں حواسِ ظاہرہ بلاواسطہ خدا کے محتاج ہیں اور حواس باطنہ حواسِ ظاہرہ کے واسطہ سے[۱] اس لئے تا امکان مجاز و استعارہ میں بھی اس پہلو سے احتراز کیا گیا جہاں غیر کی طرف احتیاج کی بو آسکتی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ نکتہ سنجی ایک بڑے محقق کے اندازۂ علم کے موافق ہے ورنہ سہل یہ ہے کہ اس جیسے مقام کے لئے حواسِ باطنہ کا تذکرہ گو بلحاظ قیاس درست ہو مگر عام محاورہ نہیں ہے اس لئے اگر کنت سمعہ و بصرہ کی بجائے کنت فکرہ و وھمہ کہہ دیا جاتا تو شاید یہاں حقیقت کا ابہام پیدا ہونے لگتا اس لئے ایسی ہی تعبیر کا استعمال کرنا مناسب تھا جو مجازی معنی میں اتنی متعارف ہو کہ اس کے استعمال میں حقیقت کی طرف انتقالِ ذہنی کا کوئی شبہ نہ ہوسکے۔ اور اس طرح ان تشبیہی الفاظ میں حقیقی تنزیہ کو کوئی ٹھیس نہ لگے۔ بدقسمتی سے جب قرآن و حدیث کے تراجم اردو زبان میں کئے جاتے ہیں، تو زبان کے محاورات کی ناواقفی کی وجہ سے بلاوجہ دماغوں میں شک و تردد کی گرد اڑنے لگتی ہے جس کو دبانے کے لئے پھر بلاوجہ اور طول دینا پڑتا ہے ورنہ اس حدیث کا مضمون اتنا صاف و واضح ہے کہ کسی سوال و جواب کی ضرورت ہی نہیں یہاں اہلِ علم غور کرلیں کہ اس حدیث میں ان اللہ خلق آدم علیٰ صورتہ کا کتنا پتہ ملتا ہے مگر عقائد صحیح اور علم راسخ ہوتا تو اس کی توضیح کرنے میں بھی مضائقہ نہ تھا مگر اب خاموش ہونا پڑتا ہے۔

"قلم اینجا رسید و سر بشکست"
(باقی صفحہ آئندہ)

؎۱ الیواقیت والجواہر ج ۱ ص ۵۹۔

(۴۲) وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْمَا يَحْكِيْ عَنْ رَبِّهٖ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ أَذْنَبَ عَبْدٌ ذَنْبًا. فَقَالَ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ فَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى أَذْنَبَ عَبْدِيْ ذَنْبًا

(۴۲) ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیثِ قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ ایک بندہ نے گناہ کیا اور کہا اے اللہ میرا گناہ بخشدے اللہ تعالیٰ نے فرمایا میرے بندہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حدیث میں دوسرا مشکل لفظ تردد ہے کیونکہ خدا کی بارگاہ میں تردد کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں مگر یہاں ایک عمیق حقیقت ہے جس کے سمجھانے کے لئے اس کے سوا کوئی اور لفظ بھی نہیں اور وہ ایک معاملہ ہے جو انسان کی موت کے سلسلہ میں خالق کی جانب سے پیش آتا ہے ظاہر ہے کہ موت فطرۃ انسان کے لئے ایک تلخ گھونٹ ہے جو اپنے اختیار سے پسند نہیں کیا جا سکتا رحمت چاہتی ہے کہ اس کے لئے اسے تیار کردے اور اتنا تیار کردے کہ وہ اسے لقاء رب کی شیرینی سمجھکر شوق و محبت خود پینے کی خواہش کرنے لگے یہ کیونکر ہو اس کے لئے وہ اسباب پیدا کرتی ہے یعنی موت سے قبل مصائب کا ہجوم، تجارت میں نقصان، دوستوں کی بیوفائی، عزیزوں کی بے رخی، اولاد کی سرکشی جیسے صبر آزما واقعات پے درپے رونما ہوتے رہتے ہیں ادہر اس کا دل دنیا سے سرد ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آنے سے پہلے کہ دنیا اس سے جبراً چھڑائی جائے خوشی خوشی از خود ترک کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے. یہ بھی ممکن تھا کہ عین عیش و راحت اور پورے لذت و اطمینان کی ساعات میں اسے موت آجاتی مگر رحمت عبد مومن کی موت اس طرح نہیں چاہتی کہ فرشتہ اس کو لقاء رب کی دعوت دیتا رہے اور وہ حیوۃ دنیا کو ترجیح دیتا رہے. بندہ کی فطری حرص زندگی اور رحمت کے اسباب نفرت کی ان تمہیدوں کا صحیح نقشہ کھینچنے کے لئے تردد کے لفظ سے زیادہ پیارا کوئی اور لفظ نہیں ہے یعنی اگر کوئی دور سے بیٹھکر بندہ کو موت پر رضامند کرنے کے لئے ان ترددات کو دیکھے تو یہی سمجھے کہ شاید قدرت کو اس کی موت کے لئے بڑا اہتمام کرنا پڑ رہا ہے یہ موت پسند نہیں کرتا وہ اسے دلگیر کرنا پسند نہیں کرتا اس لئے بڑے لطائف الحیل سے گویا اس کو تیار کیا جا رہا ہے یہ سب سماں کیوں باندھا جاتا ہے صرف مومن کی تشریف و تکریم کے لئے، قدرت اگر چاہے تو بلا کسی ادنیٰ پس و پیش کے ایک آن میں روح قبض کرے مگر اس صورت میں اس کی قدرت و اختیار کا ہی مظاہرہ ہوگا جو بلاشبہ ہے مومن کی تشریف و تکریم کیا ظاہر ہوگی جو ہر طرح محتاج ہی محتاج ہے اس اعزاز و اکرام کی خاطر یہاں بلا کسی ادنیٰ تردد کے وہ سماں باندھا جاتا ہے جس کو بجز لفظ تردد کسی اور طرح تعبیر نہیں کیا جا سکتا اسی کو شیخ اکبرؒ نے فرمایا تھا کہ جب الفاظ کے دائرے حقائق غیب کی صحیح ترجمانی سے تنگی کرنے لگتے ہیں تو وہ خود تنزل کرکے اپنی بارگاہ کے لئے ان الفاظ و تعبیرات کی اجازت دیدیتے ہیں جن کا استعمال ان کی بارگاہ میں سرتاسر گستاخی تھا.

اس تمام قیل و قال سے قطع نظر کرکے سمجھو کہ یہاں اصل مقصد یہ بتلانا ہے کہ اسلام کا خدا تمام تر استغناء و جلال کے باوجود اپنی مخلوق سے لاپرواہ نہیں اور اسی لئے اسلام کے خدائی تصور میں مخلوق کے لئے جتنی جاذبیت و کشش ہے اتنی کسی دوسرے مذہب کے خدائی تصور میں نہیں. وللّٰه المثل الاعلیٰ.

فعلم ان له ربا یغفر الذنب ویأخذ بالذنب ثم عاد فاذنب فقال ای رب اغفرلی ذنبی فقال تبارک وتعالی عبدی اذنب ذنباً فعلم ان له ربا یغفر الذنب ویأخذ بالذنب ثم عاد فاذنب فقال ای رب اغفرلی ذنبی فقال تبارک وتعالی اذنب عبدی ذنباً فعلم ان له ربا یغفر الذنب ویأخذ بالذنب اعمل ما شئت فقد غفرت لک۔

(۴۳) وعنه ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال قال رجل لم یعمل حسنة قط لاھلہ اذا مات فحرقوہ ثم اذروا نصفہ فی البر ونصفہ فی البحر فواللہ لئن قدر اللہ علیہ

گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار بھی ہے جو گناہ بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ اس کی کچھ مدت بعد پھر گناہ کرتا اور کہتا ہے کہ اے رب میرا گناہ بخشدے حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے گناہ کیا اور اتنا سمجھا کہ اس کا کوئی پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد وہ بندہ گناہ کرتا اور کہتا ہے کہ اے رب میرا گناہ بخشدے حقتعالیٰ فرماتا ہے میرے بندہ نے گناہ کیا اور یہ سمجھا کہ کوئی اس کا پروردگار ہے جو گناہ بخشتا اور اس پر گرفت کرتا ہے (اگر تیری انابت کا یہی طور رہے) تو اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخشدیا۔

(۴۳) ابوہریرہ رضہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص نے جس نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا تھا اپنے گھر والوں سے وصیت کی کہ دیکھو جب اس کی وفات ہو جائے تو اسے جلانا پھر اس کی نصف خاک جنگل میں اڑا دینا اور نصف دریا میں بہا دینا۔ خدا کی قسم۔ اگر کہیں حق تعالیٰ نے

(۴۲) یعنی خدا کی رحمت پر اعتماد اور اس کی قدرت پر پورا یقین رکھنے کی دو صفتیں نزدیک مغفرت کا سب سے بڑا سامان ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

حدیث انا عند ظن عبدی بی کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی خدا تعالیٰ کا اپنے بندہ سے معاملہ اس کے اعتماد و وثوق کے بقدر ہوتا ہے اگر اس کو یہ یقین ہے کہ گناہوں پر گرفت یا چشم پوشی کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے اس حسنِ عقیدت کا خلاف کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور اس کے لئے مغفرت کا اعلان کر دیتا ہے: جو چاہے کرو' یہ لفظ تہدید و تخویف' اعزاز و تشریف کے دونوں مقام پر بولا جاتا ہے۔ اور دونوں جگہ اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ قرینۂ مقام کے مناسب یا صرف تخویف مراد ہوتی ہے یا تشریف۔ قرآن کریم میں "اعملوا ما شئتم" اور "من شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" اسی محاورہ پر استعمال ہوا ہے۔ محاورات میں منطق چلانا نہیں چاہیے۔

يَبْعَثْ بَنَّهُ عَذَابًا لَا يُعَذِّبُ بِهٖ اَحَدٌ مِّنَ الْعَالَمِيْنَ فَلَمَّا مَاتَ الرَّجُلُ فَعَلُوْا مَا اَمَرَهُمْ فَاَمَرَ اللّٰهُ الْبَرَّ فَجَمَعَ مَا فِيْهِ وَاَمَرَ الْبَحْرَ فَجَمَعَ مَا فِيْهِ ثُمَّ قَالَ لِمَا فَعَلْتَ هٰذَا قَالَ مِنْ خَشْيَتِكَ يَا رَبِّ وَاَنْتَ اَعْلَمُ فَغَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ۔

(۴۴) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كَانَ فِيْمَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ نَفْسًا فَسَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَاهِبٍ فَاَتَاهُ فَقَالَ اِنَّهٗ قَتَلَ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ نَفْسًا فَهَلْ لَهٗ مِنْ تَوْبَةٍ فَقَالَ لَا فَقَتَلَهٗ فَكَمَّلَ بِهٖ مِائَةً ثُمَّ سَأَلَ عَنْ اَعْلَمِ اَهْلِ الْاَرْضِ فَدُلَّ عَلٰى رَجُلٍ عَالِمٍ فَاَتَاهُ فَقَالَ اِنَّهٗ

اس کو جمع کر لیا تو ایسا عذاب دیگا کہ تمام جہان میں ایسا عذاب کسی کو نہ دیگا۔ اس شخص کا انتقال ہوگیا اور گھر والوں نے اس کی وصیت پوری کردی۔ حق تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا (کہ اس کے اجزاء پریشان کو جمع کرے) اس نے سب جمع کردیئے اور (اسی طرح) سمندر کو حکم دیا تو اس نے بھی اس کے جو اجزاء اس میں تھے جمع کردیئے اس کے بعد فرمایا (بول) تو نے یہ حرکت کیوں کی تھی اس نے عرض کیا اے پروردگار صرف تیرے خوف و ڈر سے اور تو خود خوب واقف و دانا ہے۔ اس پر حق تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔

(۴۴) ابو سعید روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے پہلی امتوں میں ایک شخص تھا اس نے ننانوے قتل کئے اور اپنے شہر کے سب سے بڑے عالم کو دریافت کیا تو اس کو ایک درویش کا پتہ بتا یا گیا وہ اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ اس نے ننانوے قتل کئے ہیں کیا اب بھی اس کے لئے توبہ کی کوئی صورت ہے اس نے جواب دیا، نہیں۔ اس نے اُسے بھی قتل کر ڈالا اور پورے سو کردیئے، پھر کسی بڑے عالم کو دریافت کیا تو کسی اور عالم کا پتہ بتا یا گیا وہ اس کے پاس پہنچا اور

(۴۳) یہاں اس گنہگار نے شدتِ خوف و مایوسی کے عالم میں عذابِ الٰہی سے نجات کا ایک غلط راستہ تجویز کیا تھا اور اس اضطراب میں جو بے مصداق کلمات ایک جاہل کے منہ سے نکل سکتے ہیں نکال دیئے تھے جب قدرت نے ان کی علمی گرفت نہیں کی تو آپ بلاوجہ کیوں اس پر گرفت کرتے ہیں ایک جاہل کے الفاظ سے اس کے عقائد کا اندازہ لگانا نہ چاہیے اس کی عبارت ہمیشہ قاصر اس کے الفاظ ہمیشہ ناتمام ہوتے ہیں۔ غلط عمل ہمیشہ غلط ہے اور کسی وقت قابلِ تحسین نہیں مگر نیت اگر اچھی ہو تو جہالت کی بعض معذوریوں میں رحمت اسے نبھا لیتی ہے اس لئے یہاں اس شخص کی مغفرت اس کے عمل کا نتیجہ سمجھنا نہ چاہیے بلکہ یہ کرشمۂ رحمت ہے۔ رحمت کے ساتھ جب الٰہی قدرت بھی اختیار حاصل ہو تو اس قسم کے کرشموں کا ظہور ضروری ہے۔ (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ)

قَتَلَ مِائَۃَ نَفْسٍ فَھَلْ لَہٗ مِنْ تَوْبَۃٍ فَقَالَ نَعَمْ وَمَنْ یَحُوْلُ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ التَّوْبَۃِ
اِنْطَلِقْ اِلٰی اَرْضِ کَذَا وَکَذَا فَاِنَّ بِھَا اُنَاسًا یَعْبُدُوْنَ اللّٰہَ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مَعَھُمْ وَلَا تَرْجِعْ
اِلٰی اَرْضِکَ فَاِنَّھَا اَرْضُ سُوْءٍ فَانْطَلَقَ حَتّٰی اِذَا نَصَفَ الطَّرِیْقَ اَتَاہُ الْمَوْتُ فَاخْتَصَمَتْ
فِیْہِ مَلَائِکَۃُ الرَّحْمَۃِ وَمَلَائِکَۃُ الْعَذَابِ فَقَالَتْ مَلَائِکَۃُ الرَّحْمَۃِ جَاءَ تَائِبًا
مُقْبِلًا بِقَلْبِہٖ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی وَقَالَتْ مَلَائِکَۃُ الْعَذَابِ اِنَّہٗ لَمْ یَعْمَلْ خَیْرًا قَطُّ
فَاَتَاھُمْ مَلَکٌ فِیْ صُوْرَۃِ اٰدَمِیٍّ فَجَعَلُوْہُ بَیْنَھُمْ فَقَالَ قِیْسُوْا مَا بَیْنَ الْاَرْضَیْنِ
فَاِلٰی اَیِّھِمَا کَانَ اَدْنٰی فَھُوَ لَہٗ فَقَاسُوْہُ فَوَجَدُوْہُ اَدْنٰی اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ اَرَادَ
فَقَبَضَتْہُ مَلَائِکَۃُ الرَّحْمَۃِ (روی ھذہ الثلاثۃ الشیخان)۔

کہا کہ اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے کیا اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ اس نے کہا ہاں کیوں نہیں اور اس کی توبہ کے درمیان بھلا کون حائل ہو سکتا ہے فلاں فلاں بستی میں چلا جا، جہاں خدائے تعالیٰ کے عبادت گذار بندے رہتے ہیں تو بھی جا کر ان کے ساتھ عبادت کر اور اپنے وطن کی طرف واپس مت لوٹ کہ وہ معصیت کی زمین ہے وہ چلا، جب نصف راستہ پر پہنچا تو اس کی موت آگئی یہاں عذاب و رحمت کے فرشتوں میں حجت ہونے لگی رحمت کے فرشتوں نے کہا یہ توبہ کر کے خدا کی طرف دلی توجہ سے آ رہا تھا اور عذاب کے فرشتوں نے کہا اس نے اپنی گذشتہ زندگی میں کبھی کوئی نیک کام کیا ہی نہ تھا۔ اسی درمیان میں ان کے پاس انسانی صورت میں ایک فرشتہ آیا انھوں نے اس کو اپنا پنچ بنا لیا اس نے کہا اچھا دونوں زمینوں کا فاصلہ ناپو جس طرف وہ زیادہ قریب نکلے ادھر ہی کا سمجھا جائے ناپا تو وہ ادھر زیادہ قریب نکلا جدھر اس نے جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس لئے رحمت کے فرشتوں نے اُسے قبضہ لیا۔ (ان تینوں حدیثوں کو شیخین نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) احادیث میں لفظ "لاابالی" مجھے پرواہ نہیں اسی انداز استغنار کی طرف اشارہ ہے خدائی قدرت کے ساتھ اگر رحمت کا غلبہ ہو تو بڑے سے بڑا گناہ بے وزن ہو جاتا ہے اور اگر نعمت و عدل کا رجحان ہو تو بڑی سے بڑی عبادت بے وزن ہے۔ ضعیف انسان کی سرتاسر ناقص عبادت کا وزن ہی کیا ہو سکتا ہے اس میں تمام وزن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شرف قبولیت میسر آجائے۔

(۴۴) ...... ایک بے گناہ قتل پر دائمی عذاب آئین عدل ہے اور سو بے گناہ قتل پر اغماض آئین فضل یہ قادر مختار کی مرضی اور وقت کی بات ہے کہ جس آئین پر چاہے عمل کر لے۔ اس حدیث کے ایک طریق میں تھوڑا سا جزء اور مذکور ہے اور وہ یہ کہ جب فرشتوں نے زمین کی پیمائش شروع کر دی تو اس کو حکم ہوا کہ جس طرف اس قاتل کا رخ تھا اس طرف ذرا قریب ہو جائے اور جس طرف اس کی پشت تھی اس طرف ذرا بعید ہو جائے۔ جب انھوں نے پیمائش کی تو جس جانب اس کا رخ تھا ایک بالشت زمین بڑھی ہوئی نکلی۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۴۵) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ حَدِيْثًا اَكْثَرَ مِنْ سَبْعِ مَرَّاتٍ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ كَانَ الْكِفْلُ مِنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ لَا يَتَوَرَّعُ مِنْ ذَنْبٍ عَمِلَهُ فَاَتَتْهُ امْرَاَةٌ فَاَعْطَاهَا سِتِّيْنَ دِيْنَارًا عَلٰى اَنْ يَطَاَهَا فَلَمَّا قَعَدَ مِنْهَا مَقْعَدَ الرَّجُلِ مِنِ امْرَاَتِهِ اَرْعَدَتْ وَبَكَتْ فَقَالَ مَا يُبْكِيْكِ اَاَكْرَهْتُكِ؟ قَالَتْ لَا وَلٰكِنَّهُ عَمَلٌ مَا عَمِلْتُهُ قَطُّ وَمَا حَمَلَنِيْ عَلَيْهِ اِلَّا الْحَاجَةُ فَقَالَ تَفْعَلِيْنَ اَنْتِ هٰذَا وَمَا فَعَلْتِيْهِ اِذْهَبِيْ فَهِيَ لَكِ وَقَالَ لَا وَاللّٰهِ لَا اَعْصِي اللّٰهَ بَعْدَهَا اَبَدًا فَمَاتَ مِنْ لَيْلَتِهِ فَاَصْبَحَ مَكْتُوْبًا عَلٰى بَابِهِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لِلْكِفْلِ (رواہ الترمذی)

(۴۵) ابنِ عمرؓ کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حدیث سات مرتبہ سے زیادہ فرماتے سُنا ہے آپ فرماتے تھے کہ کِفل بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا (یہ وہ رسول نہیں ہے جن کا قرآن کریم میں ذکر ہے) کسی گناہ سے پرہیز نہ رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک عورت اس کے پاس آئی، اس نے ساٹھ دینار اس شرط پر اس کو دیئے کہ اس سے زنا کرے، جب وہ اس جگہ بیٹھ گیا جہاں مرد اس خیال سے عورت کے سامنے بیٹھا کرتا ہے تو وہ کانپ اٹھی اور رو پڑی، اس نے پوچھا کیوں روتی ہے؟ کیا میں نے تجھے کچھ مجبور کیا ہے؟ وہ بولی نہیں لیکن یہ کام کبھی میں نے اپنی عمر بھر نہیں کیا تھا مگر اب صرف اپنی حاجت روائی کی مجبوری سے کرنا پڑتا ہے اس نے کہا اچھا کبھی تو نے یہ کام نہیں کیا؟ اور اب مجبوراً کرتی ہے، جا یہ دینار میں نے تجھے یونہی بخشے اور قسم کھائی کہ آج کے بعد میں کبھی خدا تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرونگا (اتفاق) کہ اسی شب میں اس کا انتقال ہوگیا صبح کو اس کے دروازہ پر یہ نوشتہ ملا کہ اللہ تعالیٰ نے کفل کو بخشدیا۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) گویا قدرت نے ان دو متضاد آئین میں یہاں خود توفیق کی یہ صورت تجویز کرلی کہ اس کا فضل صورت عدل میں نمودار ہو۔ اس لئے زمین کی ناپ تول تو اس لئے رہی کہ عدل کی صورت محفوظ رکھی جائے۔ صرف ایک بالشت بھر زمین کی زیادتی پر غلبۂ رحمت اس لئے ہوا کہ آئین فضل کا مظاہرہ ہوجائے۔ ہمارے اس بیان سے صرف ایک بالشت بڑھنے کا نکتہ بھی حل ہوگیا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہوگیا ہوگا کہ عدل و فضل کی باگ صرف اختیارِ قدرت میں ہے اس لئے صفتِ عدل پر نظر کرکے مایوسی یا اس کے فضل پر بھروسہ کرکے بے خوفی دونوں راہیں صواب نہیں۔ یدعون ربھم خوفا وطمعا۔ اپنے رب کو اس طرح پکارنا چاہیئے کہ اس کے قہر کا خوف اور اس کے مہر کی طمع ہر وقت لگی رہے۔

(۴۵) ۔۔۔۔۔ بعض عمل اپنے عزم و خلوص کی وجہ سے مقبولیت کا وہ رتبہ حاصل کرلیتے ہیں کہ ان کا تنہا وجود مغفرت کا سامان بن جاتا ہے۔ یہ صرف انسانی عمل کا کمال نہیں بلکہ رحمت کی قدردانی کی بات ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

(۴۶) عَنْ ثَوْبَانَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْعَبْدَ لَيَلْتَمِسُ مَرْضَاةَ اللّٰهِ فَلَا يَزَالُ بِذٰلِكَ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لِجِبْرِيْلَ اِنَّ فُلَانًا عَبْدِيْ يَلْتَمِسُ اَنْ يُّرْضِيَنِيْ اَلَا وَاِنَّ رَحْمَتِيْ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُ جِبْرِيْلُ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلٰى فُلَانٍ وَيَقُوْلُهَا حَمَلَةُ الْعَرْشِ وَيَقُوْلُهَا مَنْ حَوْلَهُمْ حَتّٰى يَقُوْلَهَا اَهْلُ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ ثُمَّ تَهْبِطُ لَهٗ اِلَى الْاَرْضِ (رواه احمد)

(۴۷) عَنْ عَامِرِ الرَّامِ قَالَ بَيْنَا نَحْنُ عِنْدَهٗ يَعْنِيْ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذْ اَقْبَلَ رَجُلٌ عَلَيْهِ كِسَاءٌ وَفِيْ يَدِهٖ شَيْءٌ قَدِ الْتَفَّ عَلَيْهِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَرَرْتُ بِغَيْضَةِ شَجَرٍ فَسَمِعْتُ فِيْهَا اَصْوَاتَ فِرَاخِ طَائِرٍ فَاَخَذْتُهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ فِيْ كِسَائِيْ

(۴۶) ثوبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش رکھتا ہے اور اس تلاش میں لگا ہی رہتا ہے تو اللہ عزوجل جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں فلاں میرا بندہ مجھے راضی کرنے کی تلاش میں ہے تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری رحمت اس کے لئے ہو چکی یہ سن کر جبرئیل علیہ السلام آواز لگاتے ہیں کہ فلاں شخص پر خدا کی رحمت ہی اس کے بعد حاملینِ عرش یہی ندا دیتے ہیں پھر آس پاس کے فرشتے یہی کہتے ہیں یہانتک کہ ساتوں آسمان والے یہی کہتے ہیں اس کے بعد اس کے لئے اہلِ زمین (کے قلوب) میں رحمت پیدا ہو جاتی ہے۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۴۷) عامر رام روایت فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی خدمت میں (راوی تفسیر کرتا ہے) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے ایک شخص آیا اس پر ایک کملی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو اس میں لپیٹ رکھی تھی اس نے کہا یا رسول اللہ میں جھاڑیوں میں گذرا تو مجھے پرندوں کے بچوں کے بولنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہ کفل کتنا ہی بدکار سہی مگر اس موقعہ پر خدائی خوف کا جو نقشہ اس نے پیش کیا شاید ہی کوئی عمر بھر کا نیک مشکل سے پیش کر سکتا ہے اس کا ایسے گناہ سے اس طرح اٹھ کھڑا ہونا جہاں انسان کی کمزور فطرت لغزش کھائے بغیر نہیں رہ سکتی پھر آئندہ کے لئے خدا کی نافرمانی سے احتراز کا عزم کر لینا ایسی پسندیدہ ادا تھی کہ اس ایک ہی ادا پر رحمت نے اس کی ساری عمر کی سیہ کاریوں سے اغماض کر لیا اور بنی اسرائیل کی سنت کے مطابق اس کی مغفرت کا لکھا ہوا اعلان لوگوں نے دیکھ لیا۔ بنی اسمٰعیل میں یہ سنت منسوخ ہو گئی۔ کہ امت کے بہت سے سیہ کاروں کی پردہ دری منظور نہیں

(۴۶) ۔۔۔۔۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عام مقبولیت و نفرت اسباب کا ثمرہ نہیں خالق کی قبولیت و نفرت کا نتیجہ ہے اسی لئے مثل مشہور ہے صدائے خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

فَجَاءَتْ اُمُّهُنَّ فَاسْتَدَارَتْ عَلٰى رَأْسِيْ فَكَشَفْتُ لَهَا عَنْهُنَّ فَوَقَعَتْ عَلَيْهِنَّ فَلَفَفْتُهُنَّ بِكِسَائِيْ فَهُنَّ اُولَاءِ مَعِيْ قَالَ ضَعْهُنَّ فَوَضَعْتُهُنَّ وَاَبَتْ اُمُّهُنَّ اِلَّا لُزُوْمَهُنَّ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَتَعْجَبُوْنَ لِرُحْمِ اُمِّ الْاَفْرَاخِ فِرَاخَهَا فَوَالَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ لَلّٰهُ اَرْحَمُ بِعِبَادِهٖ مِنْ اُمِّ الْاَفْرَاخِ بِفِرَاخِهَا اِرْجِعْ بِهِنَّ حَتّٰى تَضَعَهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَخَذْتَهُنَّ وَاُمُّهُنَّ مَعَهُنَّ فَرَجَعَ بِهِنَّ (رواہ ابوداود)

(۴۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ بَعْضِ غَزَوَاتِهٖ فَمَرَّ بِقَوْمٍ فَقَالَ مَنِ الْقَوْمُ قَالُوْا نَحْنُ الْمُسْلِمُوْنَ وَامْرَاَةٌ تَحْضِبُ بِقِدْرِهَا

کی آواز آئی میں نے ان کو پکڑ لیا اور اپنی کملی میں رکھ لیا، ان کی ماں آئی اور میرے سر پر گھومنے لگی میں نے کملی بچوں کے اوپر سے ہٹا دی وہ بچوں پر آپڑی میں نے سب کو لپیٹ لیا اور وہ سب میرے ساتھ یہ موجود ہیں، آپ نے فرمایا.. ان کو نیچے رکھدو، میں نے رکھدیا، ان کی ماں ان سے پھر جدا نہ ہوئی، آپ نے فرمایا.. کیا تم اس ماں پر اپنے بچوں کی اس محبت سے تعجب کر رہے ہو، اس ذات کی قسم... جس نے مجھے بھیجا ہے جتنی اس کو اپنے بچوں سے محبت ہے، خدائے عز و جل کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ محبت ہے. جاؤ اور جہاں سے تم نے ان بچوں کو پکڑا ہے وہیں رکھ آؤ اور ان کی ماں کو بھی ان کے ساتھ لیجاؤ وہ شخص ان سب کو لیکر واپس چلا گیا۔ (اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

(۴۸) عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ہم ایک غزوہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے آپ کا ایک قوم پر گذر ہوا تو آپ نے ان سے دریافت کیا کون لوگ ہو؟ وہ بولے مسلمان، ان میں ایک عورت اپنی ہنڈیا کے نیچے آگ جلا رہی تھی. اس کے ساتھ اس کا بچہ تھا جب آگ کی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قرآن کریم نے یہ اصول ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ — جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان کے لئے رحمٰن ضرور محبت پیدا کرے گا۔

(۴۷) . . . . یہ انبیاء علیہم السلام کا اندازِ تعلیم ہے کہ بچوں کے کھیل تماشہ میں یہاں ذات و صفات کے عمیق مسائل ایسے پُر تاثیر طریقہ پر ذہن نشین کردیئے جاتے ہیں کہ پھر وہ فطرت کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور کسی غور و خوض تکلف و تصنع کے محتاج نہیں رہتے جس طرح ماں کی محبت ایک بدیہی اور یقینی حقیقت ہے وہ خدا کی محبت کا ایسا ہی یقین پیدا کردیتے ہیں اور اسی لئے ایمانی عقائد میں وہ کیف و سرور لذت و مسرت محسوس ہونے لگتا ہے جو فطری احساسات میں ہوا کرتا ہے۔

وَمَعَهَا ابْنٌ لَهَا فَإِذَا ارْتَفَعَ وَهَجٌ تَنَحَّتْ بِهٖ فَأَتَتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ أَنْتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ نَعَمْ قَالَتْ بِأَبِيْ أَنْتَ وَأُمِّيْ أَلَيْسَ اللّٰهُ أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ قَالَ بَلٰى قَالَتْ أَلَيْسَ اللّٰهُ أَرْحَمَ بِعِبَادِهٖ مِنَ الْأُمِّ بِوَلَدِهَا قَالَ بَلٰى قَالَتْ إِنَّ الْأُمَّ لَا تُلْقِيْ وَلَدَهَا فِي النَّارِ فَأَكَبَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَبْكِيْ ثُمَّ رَفَعَ رَأْسَهٗ إِلَيْهَا فَقَالَ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُعَذِّبُ مِنْ عِبَادِهٖ إِلَّا الْمَارِدَ الْمُتَمَرِّدَ الَّذِيْ يَتَمَرَّدُ عَلَى اللّٰهِ وَأَبٰى أَنْ يَقُوْلَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ (رواہ ابن ماجه)

(۴۹) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا أُحِبُّ أَنَّ لِيَ الدُّنْيَا بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا الْاٰيَةَ

لپٹ اٹھتی اپنے بچہ کو ایک طرف ہٹا لیتی وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور بولی "رسول اللہ آپ ہی ہیں؟" آپ نے ارشاد فرمایا "میں ہی ہوں" وہ بولی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا خدا ارحم الراحمین نہیں؟ آپ نے فرمایا بیشک ہے۔ اس نے کہا کیا خدا اپنے بندوں پر زیادہ مہربان نہیں بہ نسبت ایک ماں باپ کے اپنے بچوں پر؟ فرمایا بیشک ہے اس نے کہا ایک ماں تو اپنے بچہ کو آگ میں نہیں ڈال سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنا سر مبارک جھکا لیا اور رو پڑے پھر سر اٹھایا اور فرمایا خدا اپنے بندوں میں کسی کو عذاب نہیں دیگا مگر صرف اس سرکش کو جس کی سرکشی خدا کے ساتھ بھی قائم ہے جو لا الہ الا اللہ کہنے کو تیار نہیں ہوتا۔ (اس حدیث کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے)۔

(۴۹) ثوبان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے اگر اس آیت کے بدلہ میں مجھے تمام دنیا مل جائے تو بھی مجھے پسند نہیں یا عبادی الخ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی

(۴۸) اس عورت کے سوال پر خدا کی بے نہایت رحمت کا نقشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آگیا اور آپ پر گریۂ رحمت طاری ہوگیا۔ اس تاثر اور بے خودی کے عالم میں اس کو آپ نے اتنا ہی مختصر جواب دیدیا کہ خدا کی رحمت نے تو کسی کو اپنے دامن سے باہر نہیں رکھا مگر کیا جائے کہ اس کی بعض سرکش مخلوق نے خود ہی اس کے دامن میں آنے سے انکار کردیا۔

(۴۹) بغوی معالم السنن میں ابن عباسؓ سے روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشی قاتل حمزہؓ کو جب دعوت اسلام دی تو اس نے کہلا بھیجا کہ میں نے تو قتل، زنا، شرک سب کچھ کیا ہے اور قرآن یہ کہتا ہے وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (جس نے یہ گناہ کئے انھیں اس کا صلہ مل کر رہیگا اور اس کو دونا عذاب ہوگا) پھر میں اسلام میں داخل ہو کر کیا کروں گا۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

فَقَالَ رَجُلٌ فَمَنْ اَشْرَكَ فَسَكَتَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ اَلَا وَمَنْ اَشْرَكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (رواہ احمد)

(۵۰) عَنْ اَسْمَاءَ بِنْتِ يَزِيْدَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَأُ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا وَلَا يُبَالِيْ (رواہ احمد والترمذی)

جانوں پر زیادتی کی ہے خدا کی رحمت سے امید نہ توڑو الخ۔ ایک شخص نے عرض کیا اچھا کیا وہ شخص بھی جس نے کہ شرک کیا ہے؟ آپ خاموش رہے پھر فرمایا سن لے جس نے شرک کیا ہے وہ بھی تین بار فرمایا۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۵۰) اسماء بنت یزید فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت پڑھتے سنا ہے یا عبادی الخ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، خدا کی رحمت سے امید نہ توڑو، خدا کی یہ شان ہے کہ وہ سب گناہ بخش سکتا ہے اور کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ (اس حدیث کو احمد و ترمذی نے روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آپ نے کہلا بھیجا کہ قرآن میں یہ استثناء بھی تو ہے اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا (مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کئے) اس نے جواب میں عرض کیا کہ کٹھن شرط ہے شاید ایمان اور عمل صالح کے معیار پر میں پورا نہ اتر سکوں اگر قرآن میں کوئی اور آیت ہو تو ارشاد فرمایئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ (اللہ یہ تو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا شریک ٹھیرایا جائے اور اس کے علاوہ جسے چاہے گا بخشدیگا) وحشی نے کہا کہ اب بھی معاملہ صاف نہیں ہوا مجھے معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت ایزدی کیا ہے کوئی اطمینان بخش ضمانت دیجئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی قل یا عبادی الخ وحشی نے کہا جی ہاں بیشک یہ نجات کی صاف ضمانت ہے اور اسلام قبول کرلیا۔ حاضرین نے سوال کیا یا رسول اللہ یہ بشارت ان کے لئے مخصوص ہے یا سب کے لئے ہے؟ آپ نے فرمایا سب کے لئے۔

خدا کی یہ شانِ مغفرت سن کر کسی نے مشرک کی مغفرت کا سوال کیا آپ نے یہی جواب دیا کہ مشرک کے لئے بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں وہ بھی توبہ کرے اور اس عام رحمت میں آجائے۔ بعض شارحین کو توبہ سے شرک کی مغفرت بدیہی بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اس سوال و جواب میں اور بہت سی توجیہات کی ہیں ہمارے نزدیک جس دور میں زنا و سرقہ جیسے معاصی کی معافی کا تصور مشکل ہو، اس میں شرک کی مغفرت کا تصور مشکل نظر آئے تو کیا بعید ہے۔ یہ بداہت اسلامی دور کی بات ہے نہ کہ عہد جاہلیت کی۔ ابوذر کی حدیث میں ابھی آنے والا ہے کہ زنا و سرقہ کی مغفرت پر انھیں کتنا تعجب تھا۔

(۵۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فِیْ صَلٰوةٍ وَّقُمْنَا مَعَهٗ فَقَالَ اَعْرَابِیٌّ وَهُوَ فِی الصَّلٰوةِ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِیْ وَمُحَمَّدًا وَّلَا تَرْحَمْ مَعَنَا اَحَدًا فَلَمَّا سَلَّمَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِلْاَعْرَابِیِّ لَقَدْ تَحَجَّرْتَ وَاسِعًا (رواه البخاری وغیره)

باب حق اللّٰہ علی العباد

(۵۲) عَنْ مُعَاذٍ قَالَ کُنْتُ رِدْفَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلٰی حِمَارٍ یُّقَالُ لَهٗ عُفَیْرٌ فَقَالَ یَا مُعَاذُ تَدْرِیْ مَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَی الْعِبَادِ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَی اللّٰهِ قُلْتُ

---

(۵۱) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے کھڑے ہوئے ہم بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہو گئے تو ایک دیہاتی نے نماز میں ہی کہا اے اللہ صرف میرے اوپر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم کر، ہمارے ساتھ کسی اور پر رحم مت کر۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو اس دیہاتی سے فرمایا تو نے تو بڑی وسیع چیز کو تنگ کردیا۔ (اس حدیث کو بخاری وغیرہ نے روایت کیا ہے۔

بندوں پر خدا تعالیٰ کا کیا حق ہے

(۵۲) معاذؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک گدھے پر سوار تھے جس کو عفیر کہا جاتا تھا میں آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا آپ نے آواز دی اے معاذ (بعض روایات میں تین بار آواز دینے کا ذکر ہے تاکہ یہ خوب متوجہ ہو جائیں) جانتے ہو بندوں پر خدا کا اور خدا پر بندوں کا کیا حق ہے میں نے عرض کیا

---

(۵۱) اس ان پڑھ نومسلم کی سمجھ میں بھلا خدا کی رحمت کی وسعت کا تصور کہاں آسکتا تھا یہی اس کے بڑے خلوص کی بات تھی کہ اس نے اس نعمت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت گوارا کرلی مگر اس سے زیادہ شرکت وہ برداشت نہ کرسکا اس بیچارہ کے خیال کے موافق شرکاء کی تعداد جتنی بڑھتی جائے گی اس کا حصہ اتنا ہی گھٹتا جائے گا۔ آپ نے فرمایا کم بخت رحمت تو اتنی ہے کہ سب پر چھا جائے پھر تنگ نہ ہو تو ہی اسے تنگ سمجھ رہا ہے۔ ان الفاظ میں قرآنی لفظ رحمتی وسعت کی طرف اشارہ تھا۔ سبحان اللہ جواب میں کتنی سادگی اور سادگی میں کتنی حقیقت ہے۔

(۵۲) عفیر۔ مسند احمد میں اس کا نام یعفور ہے۔ عرب میں حیوانات کے نام رکھنے کا بھی دستور تھا جیسا کہ انگریز بھی کتوں کے نام رکھتے ہیں۔

مالک پر مملوک کا آقا پر غلام کا بھلا کیا حق مگر صفت رحمت وجود چاہتی ہے کہ محتاجوں کی خود قرضدار بن جائے اور پھر اس حق کو اس اہتمام سے ادا کرے گویا اس کے ذمہ یہ واقعی واجب حق تھا کمال قدرت کے ساتھ اگر کمال جود بھی ہو تو اس کا اقتضاء یہ ہونا چاہیے ورنہ اللہ کی ذات پاک پر کسی کا حق نہیں اسی کا حق سب پر ہے۔

اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ اَنْ يَّعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَحَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَلَّا يُعَذِّبَ مَنْ لَّا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُبَشِّرُ النَّاسَ قَالَ لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (رواهما الشيخان والترمذی)

(۵۳) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ ؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَا اَبَا هُرَيْرَةَ هَلْ تَدْرِىْ مَا حَقُّ النَّاسِ عَلَى اللّٰهِ وَمَا حَقُّ اللّٰهِ عَلَى النَّاسِ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ حَقُّ اللّٰهِ عَلَى النَّاسِ اَنْ يَّعْبُدُوْهُ وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَحَقٌّ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يُعَذِّبَهُمْ (رواه احمد)

اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے. فرمایا اللہ کا حق اس کے بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی بندگی کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ جو اس کا شریک نہ ٹھہرائے اس کو عذاب نہ دے. میں نے عرض کیا یا رسول اللہ اجازت ہو تو یہ خوشخبری اور لوگوں کو بھی سنا دوں؟ فرمایا نہیں کہیں وہ اسی پر بھروسہ کر کے بیٹھ نہ رہیں (اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۵۳) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابوہریرہؓ جانتے ہو لوگوں کا خدا پر اور خدا کا لوگوں پر کیا حق ہے، میں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں فرمایا خدا کا حق لوگوں پر یہ ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور جب وہ ایسا کریں تو اس پر یہ حق ہے کہ پھر ان کو عذاب نہ دے. (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)

(۵۲) عام طور پر اس بشارت کو سنانے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں تھا کہ آپ کو صحابہؓ کے متعلق فرائض چھوڑ بیٹھنے کا کوئی احتمال ہو سکتا تھا. فرض و واجب جن کا شریعت مطالبہ رکھتی ہے بھلا کون ترک کرتا. بلکہ یہاں صرف وہ اعمال مراد ہیں جہاں بندہ رغبت میں سرگرمی اور اطمینان کے حال میں سرد مہری دکھلانے کا خود مختار ہے. حقیقت یہ ہے کہ انسان ایسا کمزور اور بے صبر ہے کہ خوف زیادہ ہو جب عمل سے معطل ہو جاتا ہے اور اگر اطمینان زیادہ ہو تو بھی سست رفتار بن جاتا ہے. رحمت چاہتی ہے کہ ہر حال دے اور اتنا دے جتنا کوئی حریص سے حریص لے سکتا ہے دوزخ سے نجات کوئی شبہ نہیں کہ انسان کے لئے بڑی کامیابی ہے مگر رحمت صرف اس پر راضی نہیں وہ چاہتی ہے کہ اپنے وفاداروں کو اپنے اور خزائن لوٹنے کا موقعہ دے اس لئے مقصود یہ ہے کہ عملی سرگرمی زیادہ سے زیادہ جاری رہے۔ حدیث ۴۲ پر غور کیجئے اس میں کلمۂ شہادت کے ساتھ نماز روزہ کا بھی ذکر ہے اور وہاں بھی بشارت پر یہی سوال و جواب مذکور ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہاں نماز، روزہ جیسے فرائض میں سستی کا ذکر نہیں بلکہ ان عبادات نافلہ کا ذکر ہے جن میں نفسیاتی تاثرات سے انسان سستی یا چستی دکھلانے کا مختار ہے کوئی شبہ نہیں کہ اگر صدر اول کے نو مسلموں کو صرف فرائض پر جنت کی بشارت سنا دی جاتی تو (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

(۵۴) عَنْ سُهَيْلِ بْنِ الْبَيْضَاءِ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ فِي سَفَرٍ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا رَدِيْفُهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا سُهَيْلَ بْنَ الْبَيْضَاءِ وَرَفَعَ صَوْتَهٗ مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا كُلُّ ذَالِكَ يُجِيْبُهٗ سُهَيْلٌ فَسَمِعَ صَوْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَظَنُّوْا اَنَّهٗ يُرِيْدُهُمْ فَحُبِسَ مَنْ كَانَ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَحِقَهٗ مَنْ كَانَ خَلْفَهٗ حَتّٰى اِذَا اجْتَمَعُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّهٗ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ وَاَوْجَبَ لَهُ الْجَنَّةَ (وَفِي رِوَايَةٍ) اَوْجَبَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ لَهٗ بِهَا الْجَنَّةَ وَاَعْتَقَهٗ بِهَا مِنَ النَّارِ (رواه احمد والطبرانی)

(۵۵) عَنْ اَبِيْ مُوْسَى الْاَشْعَرِيِّ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعِيَ

(۵۴) سہیل بن بیضاء رضہ روایت فرماتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور میں آپ کا ردیف تھا۔ آپ نے دو بار یا تین بار بلند آواز سے پکارا اے سہیل بن بیضاء یہ ہر مرتبہ جواب دیتے رہے (مگر آپ کچھ نہ فرماتے تاکہ وہ خوب متوجہ ہو جائیں اور اس تاخیر میں دوسروں کو بھی سننے کا موقعہ مل جائے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ آواز اور صحابہ نے بھی سن پائی اور خیال کیا کہ غالباً آپ اُن سے بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں اس لئے جو لوگ وہاں موجود تھے وہ ٹھہر گئے اور جو پیچھے تھے وہ آملے جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا جو گواہی دیگا کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ وہ اس کو دوزخ پر حرام کر دیگا اور اسے یقیناً جنت دیگا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس شہادت کی وجہ سے یقیناً اس کو جنت دیگا اور دوزخ سے نجات بخشے گا (اس حدیث کو احمد، طبرانی نے روایت کیا ہے)۔

(۵۵) ابو موسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنی قوم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اُن میں نوافل کی ادائیگی کا جذبہ سست پڑ جانے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ حدیث ۵۱ میں اس کی صاف تصریح ہے کہ جنت میں ایک سے ایک بڑھ کر طبقہ ہے، رحمت کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ سب کو اس کی ترغیب دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ سعی کرکے جنت کا بلند سے بلند مقام حاصل کرے اور صرف نجات پر قناعت کرکے مقاماتِ عالیہ سے محروم نہ رہے۔ شارحین نے یہاں اور بہت توجیہات کی ہیں مگر ہمارے نزدیک احادیث کی روشنی میں حضرت استاد مرحوم کی صرف یہی ایک توجیہ دلپذیر ہے۔

(۵۴) کفار دوزخ کی حلال خوراک ہیں وہ اسی طرح انھیں کھائیگی جیسا حلال کھانا بے کھٹکے کھایا جاتا ہے مگر مومن اس پر حرام کیا گیا ہے اس لئے مومن سے اس طرح اجتناب کریگی جیسا حرام سے اجتناب کرنا چاہئے۔ ہمارے بیان سے اب اس تعبیر کا حسن آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ یہاں "دوزخ مومن پر حرام کر دی جائے گی" کے بجائے دوزخ پر مومن کے حرام ہونے کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے۔

نَفَرٌ مِنْ قَوْمِيْ فَقَالَ اَبْشِرُوْا وَبَشِّرُوْا مَنْ وَرَاءَكُمْ اَنَّهٗ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ صَادِقًا بِهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ فَخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نُبَشِّرُ النَّاسَ فَاسْتَقْبَلَنَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ) فَرَجَعَ بِنَا اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِذًا يَتَّكِلُ النَّاسُ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواہ احمد والطبرانی)۔

(۵۶) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ اِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا اُخْبِرُ بِهِ النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْنَ قَالَ اِذًا يَتَّكِلُوْا وَاَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهٖ تَاَثُّمًا (رواہ الشیخان والترمذی)

چند افراد کے ساتھ حاضر ہوا آپؐ نے فرمایا کہ تمہیں خوشخبری ہو اور جو لوگ تمہارے اُس طرف ہیں ان کو بھی یہ خوشخبری سنا دو کہ جو شخص صدق دل سے گواہی دیگا کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ، وہ جنت میں جائے گا۔ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سے یہ خوشخبری سُنانے کے لئے نکلے تو سامنے سے عمر بن الخطابؓ آرہے تھے وہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پھر واپس لے گئے اور عرض کرنے لگے یا رسول اللہ لوگ تو اس پر بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے۔ آپ نے کچھ نہ فرمایا اور خاموش ہوگئے۔ (اس حدیث کو امام احمد اور طبرانی نے روایت کیا ہے)۔

(۵۶) معاذ بن جبلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص صدق دل سے گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں وہ یقیناً اس کو دوزخ پر حرام کردے گا۔ انھوں نے عرض کیا کیا یہ خوشخبری میں اور لوگوں کو بھی سنا دوں؟ فرمایا پھر لوگ بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے اس لئے معاذؓ نے اپنی موت کے وقت یہ حدیث بیان کی، مبادا اخفاءِ حدیث کا گناہ ان کے سر رہ جائے۔ (اس حدیث کو شیخین اور ترمذی نے روایت کیا ہے)

---

(۵۶) اس حدیث سے اندازہ کرو کہ صحابہ کو احادیث کی تبلیغ کی کس درجہ اہمیت تھی یعنی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی مشہور سے مشہور حدیث بھی اپنے سینہ میں لیجانا کتمانِ علم کی برابر سمجھتے تھے۔ اگر احادیث کی حیثیت تشریعی یعنی بالکتاب اللہ کے بعد یہ تشریحات غیر ضروری ہوتیں تو یہ اہتمام کس لئے تھا۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کے نزدیک اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى (میں) (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(۵۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اَنَا مِمَّنْ شَهِدَ مُعَاذًا حِيْنَ حَضَرَتْهُ الْوَفَاةُ يَقُوْلُ اَكْشِفُوْا عَنِّیْ سِجْفَ الْقُبَّةِ اُحَدِّثْكُمْ حَدِيْثًا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَمْنَعْنِیْ اَنْ اُحَدِّثَكُمُوْهُ اِلَّا اَنْ تَتَّكِلُوْا سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا مِنْ قَلْبِهٖ اَوْ يَقِيْنًا مِنْ قَلْبِهٖ لَمْ يَدْخُلِ النَّارَ وَقَالَ مَرَّةً دَخَلَ الْجَنَّةَ وَلَمْ تَمَسَّهُ النَّارُ (رواہ احمد)

(۵۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ لَقِیَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَيُصَلِّی الْخَمْسَ وَيَصُوْمُ رَمَضَانَ غُفِرَ لَهٗ قُلْتُ اَفَلَا اُبَشِّرُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ دَعْهُمْ يَعْمَلُوْا (رواہ احمد)

(۵۹) عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ

---

(۵۷) جابر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں معاذؓ کی وفات کے وقت موجود تھا انھوں نے فرمایا میرے سامنے سے ذرا قبہ کا پردہ ہٹا دو تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سناؤں گا جو اب تک صرف اس لئے نہیں سنائی تھی کہ تم اس پر بھروسہ کرکے بیٹھ نہ جاؤ، میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو صاف دل سے (یا دلی یقین کے ساتھ راوی کو لفظ میں تردد ہے) گواہی دے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ، وہ کبھی دوزخ میں نہیں جائے گا اور ایک مرتبہ یہ لفظ فرمائے کہ جنت میں جائے گا اور آگ اُسے چھو بھی نہ سکے گی۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے)۔

(۵۸) معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے جو خدا سے ملیگا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہو، پانچوں نمازیں پڑھی ہوں، رمضان کے روزہ رکھے ہوں وہ بخشدیا جائے گا میں نے عرض کیا یارسول اللہ اجازت ہو تو یہ خوشخبری مسلمانوں کو سنادوں، فرمایا انھیں عمل میں لگا رہنے دو۔ (اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے) (از مشکوۃ)

(۵۹) معاذ بن جبلؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو رمضان کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جسطرح کہ آیاتِ قرآنیہ داخل تھیں اسی طرح احادیث نبویہ بھی داخل تھیں اور امت کا فریضہ یہ تھا کہ دین اپنی مجموعی تشریحات کے ساتھ ایک قرن سے دوسرے قرن اور ایک دور سے دوسرے دور تک پہنچایا جائے جو لوگ احادیث سے بے نیازی کا اظہار کرتے ہیں وہ احادیث سے نہیں خدا کے رسول سے بے نیازی چاہتے ہیں نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔

(۵۸) ۔۔۔۔ یہ حدیث صرف سابق واقعہ کی مزید تشریح کے لئے نقل کی گئی ہے۔

وَصَلَّى الصَّلٰوةَ وَحَجَّ الْبَيْتَ لَا اَدْرِيْ اَذَكَرَ الزَّكٰوةَ اَمْ لَا اِلَّا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّغْفِرَ لَهٗ اِنْ هَاجَرَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مَكَثَ بِاَرْضِهِ الَّتِيْ وُلِدَ بِهَا قَالَ مُعَاذٌ اَلَا اُخْبِرُ بِهَا النَّاسَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَرِ النَّاسَ يَعْمَلُوْنَ فَاِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَالْفِرْدَوْسُ اَعْلَى الْجَنَّةِ اَوْسَطُهَا وَفَوْقَ ذٰلِكَ عَرْشُ الرَّحْمٰنِ وَمِنْهَا تَفَجَّرُ اَنْهَارُ الْجَنَّةِ فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْاَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ۔ (رواہ الترمذی)

روزے رکھے نماز پڑھے، بیت اللہ کا حج کرے، مجھے یاد نہیں کہ آپ نے زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا تھا یا نہیں تو خدا پر حق ہوگا کہ وہ اس کو بخش دے خواہ اس نے خدا کے لئے ہجرت کی ہو یا اسی جگہ پر رہا ہو جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہے۔ معاذؓ نے عرض کیا کیا لوگوں کو بھی اس کی اطلاع نہ کردوں فرمایا انھیں عمل کرنے دو کیونکہ جنت کے سو درجے ہیں ہر دو درجوں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ آسمان و زمین میں اور فردوس جنت کا سب سے اعلیٰ اور سب سے بہتر طبقہ ہے اس پر رحمٰن کا عرش ہے اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹی ہیں جب تم اللہ سے مانگو تو فردوس مانگو (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۵۹) بعض مصنفین نے یہ سمجھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عام طور پر یہ خوشخبری سنانے کی ممانعت اس بنا پر فرمائی تھی کہ اسلام کے تازہ حلقہ بگوش صرف شہادتین پر فوز و فلاح کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوجائیں مگر سوال یہ ہے کہ جب ایک بار نماز، روزہ کی فرضیت ان کے سامنے واضح کی جاچکی تھی تو پھر اس غلط فہمی کا موقعہ کیا تھا کیا یہ حدیث نماز، روزہ کی فرضیت کو منسوخ کررہی تھی۔ حضرت استاد قدس سرہٗ نے ترمذیؒ کی اس حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ صحابہ کے متعلق یہاں اس غلط فہمی کا کوئی احتمال نہ تھا چنانچہ معاذؓ جب اسی روایت کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں تو اس میں شہادتین کے ساتھ بقیہ اور فرائضِ اسلام کا بھی ذکر کردیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس تفصیلی روایت میں آپ کی بشارت جملہ فرائضِ اسلام کی ادائیگی سے وابستہ ہے تو پھر اُن کے ترک کا تصور کیسے کیا جاسکتا ہے ترمذی کی اس روایت نے یہ بات بالکل صاف کردی ہے کہ آپ کا روئے سخن ہرگز فرائض کی جانب نہیں بلکہ ان اعمال کی جانب ہے جن سے نجات کے سوا جنت کے مراتب کا تعلق ہے اسی لئے آپ نے فرمایا کہ جنت کے سو درجہ ہیں، نجات تو ہر درجہ میں حاصل ہے مگر آپ کی تمنا یہ ہے کہ امت نجات کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب حاصل کرے ابتداءً عبادت نفع و ضرر کی وجہ سے ہوتی ہے اس لئے نجات کی بشارت سن کر شب و روز کی اعلیٰ جد و جہد میں سستی پیدا ہوسکتی ہے لیکن جب نفع و نقصان کا سوال پیش نظر نہیں رہتا اور قرب و رضا کا بلند مقصد سامنے آجاتا ہے تو پھر انسان اتنا حریص بن جاتا ہے کہ نجات جیسی اہم کامیابی پر بھی قناعت نہیں کرتا اور قرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ منزل طے کرنے کے بعد تشنہ ہی رہتا ہے جس کے سامنے مقصد یہ ہے اس کے لئے تو نجات کی بشارت سے کیا خطرہ لیکن جو ابھی تک صرف نجات کو آخری منزل سمجھ رہا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ فرائض کی ادائیگی پر نجات کی بشارت سن کر یہیں تھک کر بیٹھ رہے اور نوافل کی سرگرمی چھوڑ دے۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

(٦٠) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ کُنَّا قُعُوْدًا حَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَعَنَا
اَبُوْبَکْرٍ وَّعُمَرُ فِیْ نَفَرٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مِنْ بَیْنِ اَظْہُرِنَا فَاَبْطَاَ
عَلَیْنَا وَخَشِیْنَا اَنْ یُّقْتَطَعَ دُوْنَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا فَکُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ اَبْتَغِیْ
رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی اَتَیْتُ حَائِطًا لِّلْاَنْصَارِ لِبَنِی النَّجَّارِ فَدُرْتُ بِہٖ هَلْ
اَجِدُ لَہٗ بَابًا فَلَمْ اَجِدْ فَاِذَا رَبِیْعٌ یَّدْخُلُ فِیْ جَوْفِ حَائِطٍ مِّنْ بِئْرٍ خَارِجَةٍ وَالرَّبِیْعُ
الْجَدْوَلُ قَالَ فَاحْتَفَزْتُ فَدَخَلْتُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ۔
اَبُوْهُرَیْرَةَ فَقُلْتُ نَعَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مَا شَاْنُکَ قُلْتُ کُنْتَ بَیْنَ اَظْہُرِنَا فَقُمْتَ

(٦٠) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ ہم چند صحابہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے
(اس وقت) ہمارے ساتھ ابوبکرؓ و عمرؓ بھی تھے، یکایک آپ ہمارے درمیان سے اٹھ کھڑے ہوئے (اور
کہیں تشریف لے گئے) جب بہت دیر گذر گئی تو ہمیں تشویش ہوئی کہ ہم سے علیحدہ ہو کر آپ پر کوئی حادثہ پیش
نہ آجائے۔ اس خیال سے ہم سب گھبرا گئے اور سب سے پہلے گھبرانے والوں میں میں تھا میں آپ کو
ڈھونڈھنے کے لئے نکلا، قبیلہ بنی النجار کے ایک انصاری کے باغ پر پہنچا اس کا دروازہ تلاش کیا مگر نہ ملا
کیا دیکھتا ہوں کہ باہر ایک کنوئیں سے ایک ربیع باغ میں جارہی ہے "ربیع گول اور نالی کو کہتے ہیں"
ابوہریرہؓ کہتے ہیں میں سکڑ کر اسی میں گھس گیا اور آپ کی خدمت میں جا پہنچا آپ نے فرمایا ابوہریرہؓ!
میں نے عرض کیا جی یا رسول اللہ، فرمایا کیا حال ہے؟ میں نے عرض کیا آپ ہم میں تشریف فرما تھے پھر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) رسول خدا چاہتے ہیں کہ یہ شخص بھی سرگرم عمل رہے تاکہ آپ کی امت کا مبتدی اور منتہی سب نجات
کے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب میں کامیاب رہیں۔ اس حدیث کو بغور پڑھئے تو بے تکلف یہی مضمون آپ کے ذہن میں آجائے گا۔
حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت کی چھت کیا ہے اس کے سب سے اونچے درجہ کا نام کیا ہے اور جنت کی
نہروں کا اصل منبع کہاں ہے۔ عالم غیب کی کچھ باتیں ہمیں بتلادی گئی ہیں تاکہ ایمان لانے کے لئے ان کا تھوڑا سا تصور
بھی ہو جائے ورنہ جو عالم کہ مشاہدہ سے تعلق رکھتا ہے اس کی تفصیل میں جانا بلاوجہ دماغ کے لئے ایک پریشانی کا موجب ہے
انگلستان کی پوری حقیقت انگلستان دیکھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے اگر اس کے چمن، روشیں اور سڑکوں کا جدید
ڈیزائن تفصیلی طور پر بیان کیا جائے تو جو اس طور و انداز سے بالکل نا آشنا ہیں ان کے لئے بلاوجہ یہ ایک ناقابل برداشت
بار ہوگا وہ اپنے ملک کے انداز کے مطابق اس کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اور جب اس سے ہٹ کر انہیں سمجھانے
کی کوشش کی جائے گی تو ان کا دماغ الجھے گا۔ شریعت اس بے معنی الجھاؤ میں دماغوں کو مبتلا کرنا چاہتی نہیں جو چیز کل
مشاہدہ کے بعد بہت آسانی سے بغیر الجھاؤ نظر آجانے والی ہے اس کو قبل از وقت کیوں زیر بحث لایا جائے۔ آج
عمل کی تفصیل درکار ہے اور کل جزاء کی تفصیل خود بخود سامنے آجانے والی ہے۔ حکیم وہی ہے جو تفصیل کے موقعہ پر تفصیل
اور اجمال کے محل میں اجمال کی رعایت کرے۔ جدید دماغوں کا قبل از وقت آخرت کے تفصیلی نقشوں کا ہم سے مطالبہ
کرنا ناانصافی اور جلد بازی ہے۔

فَاَبْطَاتَ عَلَیْنَا فَخَشِیْنَا اَنْ تُقْتَطَعَ دُوْنَنَا فَفَزِعْنَا فَکُنْتُ اَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَاَتَیْتُ ھٰذَا
الْحَائِطَ فَاحْتَفَزْتُ کَمَا یَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ وَھٰؤُلَآءِ النَّاسُ وَرَائِیْ فَقَالَ یَا اَبَا ھُرَیْرَۃَ وَ
اَعْطَانِیْ نَعْلَیْہِ فَقَالَ اذْھَبْ بِنَعْلَیَّ ھَاتَیْنِ فَمَنْ لَقِیَکَ مِنْ وَرَاءِ ھٰذَا الْحَائِطِ یَشْھَدُ
اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ فَبَشِّرْہُ بِالْجَنَّۃِ فَکَانَ اَوَّلَ مَنْ لَقِیْتُ عُمَرَ ؓ
فَقَالَ مَا ھَاتَانِ النَّعْلَانِ یَا اَبَا ھُرَیْرَۃَ فَقُلْتُ ھَاتَانِ نَعْلَا رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ
وَسَلَّمَ بَعَثَنِیْ بِھِمَا مَنْ لَقِیْتُ یَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُسْتَیْقِنًا بِھَا قَلْبُہٗ بَشَّرْتُہٗ
بِالْجَنَّۃِ فَضَرَبَ عُمَرُ بَیْنَ ثَدْیَیَّ فَخَرَرْتُ لِاِسْتِیْ فَقَالَ ارْجِعْ یَا اَبَا ھُرَیْرَۃَ فَرَجَعْتُ

آپ اٹھے جب بہت دیر ہوگئی تو ہمیں گھبراہٹ ہوئی کہیں ہماری غیبت میں آپ پر کوئی حادثہ پیش نہ
آجائے سب سے پہلے میں گھبرایا اور اس باغ تک ڈھونڈتا ہوا آگیا (یہاں دروازہ نہ ملا) تو لومڑی کی طرح
سکڑ کر (نالی کے راستہ سے) اندر گھس آیا اور بقیہ لوگ بھی میرے پیچھے آرہے ہیں۔ آپ نے مجھے اپنے
دونوں چپل اٹھا کر دیئے اور فرمایا اے ابوہریرہ جاؤ انھیں لیجاؤ اور باغ کے پیچھے جو شخص یقین کے
ساتھ یہ گواہی دیتا ہوا مل جائے کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اس کو جنت کی خوشخبری سنا دو (یہ روانہ ہوئے)
سب سے پہلے عمرؓ ملے پوچھا اے ابوہریرہؓ یہ چپل کیسے ہیں؟ میں نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
ہیں اور مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ جو بھی مجھے راستہ میں یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہتا ہوا مل جائے اُسے
جنت کی بشارت سنا دوں اس پر عمرؓ نے میری چھاتیوں کے درمیان اس زور سے ہاتھ مارا کہ میں
سرین کے بل پیچھے جا پڑا اور بولے ابوہریرہ جاؤ واپس جاؤ میں آپ کی خدمت میں آیا اور پھوٹ

---

(۶۰) عرب کے دستور کے مطابق یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نعلین مبارک ابوہریرہ کے ساتھ کر دیئے
تھے تاکہ اس کی دلیل ہوں کہ آپ ہی نے ان کو بھیجا ہے۔ چونکہ یہاں ابوہریرہؓ اور چند صحابہ کی آمد بڑے اضطراب
اور بے چینی کی حالت میں ہوئی تھی اس لئے وقت کی مصلحت اس کی مقتضی ہوئی کہ ان کو ایسی بشارت سنادی جائے
جو اس وقت ان کے اضطراب کے لئے مرہم تسکین بن جائے اور آئندہ کے لئے یہ اثر پیدا کر دے کہ جس ذات پاک کے لئے
وہ اتنے مضطرب تھے اگر اس کا دس گنا اور مضطرب ہوتے جب بھی کم تھا۔ یہ تمام بات چیت وقتی تاثرات کے ماتحت
تھی۔ ادھر صحابۂ کرام اپنے رسول کی تلاش میں مدہوش تھے اُدھر رسول کا پیمانۂ محبت ان کی یہ سراسیگی دیکھکر چھلک رہا
تھا۔ عمر فاروقؓ کو کیا خبر تھی کہ صحابہ کی اس پریشانی پر رسول کی محبت کا سمندر کتنا جوش مار رہا ہے اس لئے اپنے
رسول کے مشن کے کامیاب بنانے کا جو بہترین مشورہ اپنی سمجھ میں آرہا تھا اُس کی دھن میں ابوہریرہؓ کو واپس کر دیا
ابھی تک پوری بات کی تحقیق بھی نہ تھی اس لئے پہلے حاضر ہو کر واقعہ کی تحقیق کی جب معاملہ کی حقیقت وہی نکلی
جو ابوہریرہؓ نے سمجھی تھی تو بے تکلف اپنی رائے بارگاہِ رسالت میں پیش کر دی (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَجْهَشْتُ بِالْبُكَاءِ وَرَكِبَنِي عُمَرُ وَإِذَا هُوَ عَلَى أَثَرِي فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا لَكَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ قُلْتُ لَقِيتُ عُمَرَ فَأَخْبَرْتُهُ بِالَّذِي بَعَثْتَنِي بِهِ فَضَرَبَ بَيْنَ ثَدْيَيَّ ضَرْبَةً خَرَرْتُ لِاسْتِي فَقَالَ ارْجِعْ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عُمَرُ مَا حَمَلَكَ عَلَى مَا فَعَلْتَ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللهِ بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي أَبَعَثْتَ أَبَا هُرَيْرَةَ بِنَعْلَيْكَ مَنْ لَقِيَ يَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ بَشَّرَهُ بِالْجَنَّةِ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَلَا تَفْعَلْ فَإِنِّي أَخْشَى أَنْ يَتَّكِلَ النَّاسُ عَلَيْهَا فَخَلِّهِمْ يَعْمَلُونَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَخَلِّهِمْ (رواه مسلم)

پھوٹ کر رونے لگا۔ عمرؓ کا خوف میرے سر پر سوار ہی تھا کیا دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے پیچھے وہ آپہنچے آپؐ نے دریافت فرمایا ابوہریرہ خیریت ہے؟ میں نے عرض کیا مجھے راستہ میں عمرؓ ملے تو جس کام کے لئے آپ نے مجھے بھیجا تھا میں نے انھیں اس کی خبر کر دی انھوں نے اس زور سے میرے سینہ پر ہاتھ مارا کہ میں سرین کے بل پیچھے جا پڑا اور مجھ سے کہا واپس جاؤ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمرؓ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا واقعی آپ نے ابوہریرہؓ کو اس لئے بھیجا تھا کہ جو دلی یقین کے ساتھ لا الہ الا اللہ کی گواہی دیتا ہوا ملے اس کو جنت کی خوشخبری سنا دیں۔ آپ نے فرمایا ہاں، عرض کیا ایسا نہ کیجئے مجھے خطرہ ہے کہیں ایسا نہ ہو لوگ اس پر بھروسہ کر بیٹھیں انھیں عمل میں لگا رہنے دیجئے۔ آپ نے فرمایا اچھا تو رہنے دو۔

(اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مسئلہ کی کچھ بات نہ تھی، حلال و حرام کا کوئی حکم نہ تھا صرف مصلحت کی بات تھی، وہاں بھی ایک سچے مشیر کی رائے کی قدردانی کی گئی اور محبت و مصلحت کے دو پہلوؤں میں مصلحت کو ترجیح دیدی گئی۔

مخاطب اگر متکلم کا مزاج شناس ہو تو اس کے امر و نہی کے مراتب سمجھ لیتا ہے اور مشورہ دینے کا موقع و محل پہچان لیتا ہے۔ حدیث کے معاملات کو بھی اپنے روزمرہ کے معاملات کے ماتحت حل کر لینا چاہئے بلاوجہ دقیق بنا بنا کر سوال و جواب کی زحمت اٹھانا بیکار ہے۔

وجوب الایمان برسالۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

(۶۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ یَهُوْدِیٌّ وَّلَا نَصْرَانِیٌّ وَّمَاتَ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ (رواہ احمد ومسلم)

وَعَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نَحْوَهٗ وَفِیْهِ لَمْ یَدْخُلِ الْجَنَّةَ بَدَلَ قَوْلِهٖ اِلَّا کَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ

(۶۲) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَوْ اٰمَنَ بِیْ عَشَرَةٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے

(۶۱) ابوہریرہ رض روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اس امت میں کوئی یہودی ایسا نہیں ہے اور نہ کوئی نصرانی جو میری خبر پائے پھر اس دین پر ایمان نہ لائے جو میں دیکر بھیجا گیا ہوں اور (اسی حال پر) مرجائے مگر وہ دوزخیوں میں ہوگا۔ (اس حدیث کو امام احمد اور مسلم نے روایت کیا ہے)۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رض سے بھی اسی کے ہم معنی مضمون منقول ہے صرف اتنا فرق ہے کہ اس میں الا کان من اصحاب النار کے بجائے لم یدخل الجنۃ (جنت میں نہیں جائیگا) کا لفظ ہے۔

(۶۲) ابوہریرہ رض روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر یہود کے

(۶۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر یہاں خاص طور پر اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ اہل کتاب تھے۔ جب آپ پر ایمان لائے بغیر ان کی نجات نہیں ہوسکتی تو جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب بھی نہیں ان کی نجات کیسے ہوسکتی ہے۔ نیز یہود و نصاریٰ کا یہ دعویٰ تھا کہ نجات صرف ان ہی کے لئے ہے اس لئے ان کو خبردار کرنا ضروری تھا کہ یہ خیال غلط ہے۔

(۶۲) اس حدیث کو امام بخاری رح نے بھی روایت کیا ہے مگر اس کے الفاظ یہ ہیں لو اٰمن بی عشرۃ من الیھود لاٰمن بی الیھود۔ اگر مجھ پر دس یہود ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ ان الفاظ پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ بہت سے یہود آپ پر ایمان لاچکے تھے مگر اس کے باوجود پھر تمام یہود کا ایمان ثابت نہیں۔ مسند امام احمد کی اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء مراد تھے۔ اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی اتباع میں یقیناً بقیہ یہود بھی ایمان لے آتے جیسا کہ قبائل عرب بھی اسی کے منتظر تھے کہ قریش اسلام لے آئیں تو ان کی اتباع میں ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

مِنْ اَحْبَارِ الْیَھُوْدِ لَا مَنْ بِیْ کُلُّ یَھُوْدِیٍّ عَلٰی وَجْہِ الْاَرْضِ قَالَ کَعْبٌ اِثْنَا عَشَرَ مِصْدَاقُھُمْ فِیْ سُوْرَۃِ الْمَائِدَۃِ (رواہ احمد والبخاری وابوداؤد)

دس بڑے علماء مجھ پر ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ کعبؓ کہتے ہیں (آپ نے دس نہیں فرمایا) بارہ (فرمایا ہے) جن کا مصداق سورۂ مائدہ میں موجود ہے (اس حدیث کو امام احمد بخاری اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) حافظ ابن حجرؒ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے وقت رؤسائے یہود میں سے مشاہیر کے حسب ذیل اسماء لکھے ہیں:۔ عبداللہ بن سلام۔ ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب۔ کعب بن الاشرف۔ رافع بن ابی الحقیق۔ عبداللہ بن حنیف۔ فنحاص۔ رفاعۃ بن زید۔ زبیر بن باطیا۔ کعب بن اسد۔ شمویل بن زید وغیرہم ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا اسلام ثابت ہے۔ سہیلی نے عبداللہ بن صوریا کا اسلام قبول کرنا بھی تسلیم کیا ہے مگر حافظ کو اس میں کلام ہے۔

کعبؓ اور ابوہریرۃؓ کے درمیان یہاں یہ اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے علماء یہود میں دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا۔ کعب کا رجحان دوسری جانب ہے اس کی تائید میں وہ قرآن کریم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں جس میں نقباء یہود کا عدد بارہ ہی مذکور ہے۔ وبعثنا منھم اثنی عشر نقیبا۔

یحیٰی بن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ہو سکتا ہے کہ کعبؓ نے پورا عدد ذکر کیا ہو اور ابوہریرۃؓ نے صرف ان کا ذکر کیا ہو جو حلقۂ اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے۔ عبداللہ بن سلام اور مخیریق اسلام قبول کر چکے تھے[1]۔ بہرحال خلاصۂ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کلمۂ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب کی جگہ سمجھتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لئے ان کے علماء کو بھی بہت کم اسلام کی توفیق میسر آئی۔

بظاہر اسی فطری شقاوت کی وجہ سے جب اس عام ہدایت کے وقت انھیں ایمان نصیب نہ ہوا تو عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد بھی احادیث میں ان کی محرومی ہی کا پتہ ملتا ہے۔ اس وقت یہ فرقہ اکثر دجال کا متبع ہوگا البتہ عیسائی من حیث القوم اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے اور دنیا کے خاتمہ سے پہلے پہلے وحدتِ ادیان کا اہم مقصد پورا ہو جائے گا۔ اسی کی طرف سورۂ نساء کی آیت وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اہل کتاب میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طبعی موت سے پہلے ان پر ایمان نہ لائیگا

یہاں غرض صرف یہ ہے کہ اس حدیث کو آیتِ بالا کے ساتھ ارتباط ہے قرآن کریم بھی اہلِ کتاب کا عام طور پر ایمان لانا ذکر کرتا ہے مگر اس کو ایک خاص وقت پر معلق کرتا ہے اور حدیث بھی یہاں یہود کے عام ایمان کا ذکر کرتی ہے مگر اس کو ایک خاص شرط سے مقید کرتی ہے اس میں اشارہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو فنا ہو کر یا اسلام قبول کر کے ایک دن بہرحال آخری دین یعنی اسلام میں داخل ہونا مقدر ہے۔ وحدتِ قبلہ ظہور پذیر ہو چکی یہ اس .... وحدت کا مرکزی نقطہ تھا جو آئندہ ظہور پذیر ہونے والی ہے۔ عام نظر میں حوادث کا باہمی ارتباط نہیں سمجھتیں تکوینی نظر میں ان میں بڑا گہرا ربط ہوتا ہے۔

[1] فتح الباری ج، باب اتیان الیہود النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۶۳) عَنْ رَبَاحِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ حُوَيْطِبٍ قَالَ حَدَّثَتْنِيْ جَدَّتِيْ اَنَّهَا سَمِعَتْ اَبَاهَا يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَاوُضُوْءَ لَهٗ وَلَاوُضُوْءَ لِمَنْ لَمْ يَذْكُرِ اللّٰهَ تَعَالٰى وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ مَنْ لَمْ يُؤْمِنْ بِيْ وَلَا يُؤْمِنُ بِيْ مَنْ لَا يُحِبُّ الْاَنْصَارَ (رواہ احمد والدار قطنی)

(۶۳) رباح بن عبدالرحمٰنؒ روایت کرتے ہیں میری دادی نے فرمایا کہ انھوں نے اپنے والد کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے جس کا وضو نہیں اس کی نماز نہیں اور جو (شروع میں) خدا کا ذکر نہ کرے اس کا وضو نہیں اور جو مجھ پر ایمان نہ لائے اس کا خدا پر بھی ایمان نہیں اور جو انصار سے محبت نہ کرے اس کا مجھ پر بھی ایمان نہیں (اس حدیث کو امام احمد اور دار قطنی نے روایت کیا ہے)۔

(۶۳) حافظ ابن حجر تلخیص الحبیر میں فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں گو کلام ہے مگر تمام اسنادوں پر نظر کرکے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حدیث بے اصل نہیں۔ ابوبکر بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث ضرور ارشاد فرمائی ہے۔ اس حدیث میں چار مسئلے ہیں پہلا مسئلہ اجماعی ہے۔ دوسرا مسئلہ گو اختلافی ہو مگر وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا سب کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ تیسرا مسئلہ اصولِ دین میں داخل ہے یعنی ایمان بالرسالۃ، چوتھا مسئلہ فروعی ہے اپنے اپنے محل میں ہر مسئلہ سے بحث کی جائے گی۔ یہاں زیر بحث صرف تیسرا مسئلہ ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ مدار نجات ایمان باللہ اور ایمان بالمغیبات ہے۔ مغیبات سے مراد قیامت، فرشتے جنت، دوزخ وغیرہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام ان ہی امور کی تعلیم و تشریح کے لئے تشریف لاتے ہیں۔ عقول انسانیہ ان امور کے صحیح ادراک سے قاصر ہیں اور اگر بہ ہزار دشواری ادراک کر بھی لیں تو وہ بھی ناتمام ادراک ہوگا اس نے خدا کی رحمت نے اس کا بوجھ ہم پر نہیں ڈالا بلکہ فلاح و فوز کا راستہ بتلانے کا خود تکفل فرما لیا ہے اس کے بعد ہمارا کام صرف اس بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے چونکہ یہ ایمان انبیاء علیہم السلام کے بغیر میسر آ ہی نہیں سکتا اس لئے ایمان باللہ کے مفہوم میں رسولوں پر ایمان لانا خود بخود داخل ہو جاتا ہے اسی لئے احادیث میں اور کہیں کہیں آیاتِ قرآنیہ میں صرف توحید کو مدار نجات ٹھیرایا گیا ہے، ان سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ صرف توحید موجب نجات ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے تصنیف کی بجائے خطابت کا اسلوب اختیار کیا ہے اس لئے اس کا مفہوم سمجھنے کے لئے ایک خطیب کے اندازِ بیان کا تصور رکھنا چاہیے وہ جب کسی خاص ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سے امور اس کے ماحول میں اور بہت سے متکلم و مخاطب کے دماغوں میں موجود ہوتے ہیں اور بہت سے اس کے طرزِ تکلم سے مفہوم ہوتے ہیں اور جب ان سب کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تو اس کا کلام سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی یہاں خود رسول خدا کی طرف سے متکلم ہوتا ہے جب وہ بولتا ہے تو خدا تعالیٰ کا ایک ترجمان بن کر بولتا ہے اس کی ہستی آنکھوں سے نظر آ رہی ہے اس لئے اسے اپنے بیان میں زور ان ہی باتوں پر دینا پڑتا ہے جو غائب اور غیر محسوس ہیں جب وہ آمنوا باللہ کا امر کرتا ہے تو یہ جانتا ہے کہ یہ حکم میری آواز پر چو مانے گا (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

مثل النبی صلی اللہ علیہ وسلم ومثل ما جاء بہ

(۶۴) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَ جَاءَتْ مَلَائِكَةٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ نَائِمٌ فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا إِنَّ لِصَاحِبِكُمْ هٰذَا مَثَلًا فَاضْرِبُوا لَهُ مَثَلًا فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین کی مثال

(۶۴) جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چند فرشتے حاضر ہوئے اُس وقت آپ سو رہے تھے ان میں سے کسی نے کہا آپ سوتے ہیں اور کسی نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل جاگتا ہے پھر کہنے لگے تمہاری اس بزرگ ہستی کے لئے ایک مثال ہے، اس مثال کو بیان کرو اس پر کسی نے کہا وہ سوتے ہیں اور کسی نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل جاگتا ہے۔ پھر وہ کہنے

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اس کو پہلے میرا ماننا لازم ہوگا، مخاطبین کو بھی کوئی ضد ہوتی ہے تو زیادہ تر اسی کی شخصیت سے ہوتی ہے وہ بہت سے مسلمات کا اگر انکار کرتے ہیں تو اس ضد سے کہ اس کے منہ سے نکل رہے ہیں اسی لئے ایمان بالرسول جو بحقیقت ایمان باللہ کا ایک ذریعہ تھا اب ایک حیثیت میں رکن رکین اور اصل الاصول بن جاتا ہے جس طرح ایمان میں اللہ اور رسول کے درمیان فرق کی گنجائش نہیں ایک کا منکر دوسرے کا منکر سمجھا جاتا ہے اسی طرح رسولوں میں بھی باہمی یہی نسبت موجود ہے یعنی ایک کا منکر دوسرے کا منکر ہے یہاں ماضی وحال و مستقبل تینوں زمانے برابر ہیں حتیٰ کہ خود انبیاء علیہم السلام بھی اس وصف میں شریک ہیں۔ اعمال واقوال کی صداقت ایمان کی صداقت پر موقوف ہے اور ایمان کی صداقت خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے مربوط ہے اس لئے ایمان بالرسول اور رسول کے فرمانے پر دوسرے رسولوں پر ایمان لانا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے اب آیاتِ ذیل کو پڑھیے۔ (۱) انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ ورسلہ (نور) مومن دراصل وہی ہیں جو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لائے ہیں۔ (۲) ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض۔۔ اولٰئک ھم الکفرون حقا (النساء) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے منکر ہوئے اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی پر ایمان لائیں گے اور کسی کا انکار کریں گے یہی لوگ اصلی کافر ہیں۔ (۳) من یکفر باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الاخر فقد ضل ضلٰلا بعیدا (النساء) جو انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں اور قیامت کے دن کا وہ گمراہی میں بہت دور نکل گیا۔

پہلی آیت میں اللہ اور اس کے رسولوں پر بلا تفریق ایمان لانے کا امر ہے دوسری آیت میں ان کے درمیان فرق کرنے والے کو اصلی کافر کہا گیا ہے اور تیسری آیت میں ایمان میں فرشتوں اور یوم آخر کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اب صرف کسی ایک آیت کو لیکر ایمان کی بحث کا فیصلہ کر ڈالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا مَثَلُهُ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَارًا وَجَعَلَ فِيهَا مَأْدُبَةً وَبَعَثَ دَاعِيًا فَمَنْ أَجَابَ الدَّاعِيَ دَخَلَ الدَّارَ وَأَكَلَ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّاعِيَ لَمْ يَدْخُلِ الدَّارَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ فَقَالُوا أَوِّلُوهَا لَهُ يَفْقَهْهَا فَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّهُ نَائِمٌ وَقَالَ بَعْضُهُمْ إِنَّ الْعَيْنَ نَائِمَةٌ وَالْقَلْبَ يَقْظَانُ فَقَالُوا الدَّارُ الْجَنَّةُ وَالدَّاعِي مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَمَنْ أَطَاعَ مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَى مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ وَمُحَمَّدٌ فَرَّقَ بَيْنَ النَّاسِ (متفق علیہ)

لگے، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے مکان بنایا اور اس میں دعوت کا انتظام کیا پھر ایک بلانے والے کو بھیجا۔ جس نے اس بلانے والے کی بات مانی وہ مکان میں آگیا اور دعوت کا کھانا بھی کھایا اور جس نے اس بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ مکان میں آیا، اور نہ طعامِ دعوت کھایا۔ پھر انھوں نے کہا اس مثال کی توضیح بھی کرو تاکہ آپ اس کو صاف صاف سمجھ لیں تو بعض نے کہا یہ سوتے ہیں اور بعض نے کہا آنکھ سوتی ہے مگر دل بیدار ہے پھر کہنے لگے وہ مکان جنت ہے اور بلانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اس نے خدائے عزوجل کی نافرمانی کی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں نیک و بد کو جدا جدا تمیز کردینے والے ہیں (یہ حدیث متفق علیہ ہے)۔

(۱۳۸) عالمِ غیب میں تفہیم کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی بیداری کو تین بار مکرر کیا گیا ہے اسی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے خواب کو وحی کہا جاتا ہے۔ جب انبیا علیہم السلام کی نوم کا حال یہ ہے تو ان کی موت کا حال اسی پر قیاس کرلینا چاہیے۔ یعنی کیا وہ موت کے بعد عام ارواح کی طرح بیکار و معطل ہوسکتے ہیں یا ان کا ادراک و شعور، فہم و احساس اپنی جگہ بحال رہتا ہے۔ اس مثال میں یہ ذہن نشین کرنا منظور ہے کہ فوز و فلاح کا راز صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضمر ہے۔ نیز یہ تنبیہ کرنا بھی مقصود ہے کہ آپ کی نافرمانی کرکے خدا کی فرمانبرداری کی ہوس کرنا غلط ہے
فَرَّقَ کو بعض نے بصیغۂ ماضی کہا ہے اور بعض نے بسکون را، مصدر بمعنی فارق (فرق کرنے والے) پڑھا ہے بہرحال یہ بھی انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہے کہ مطیع و عاصی، مومن و کافر کا گروہ علیحدہ علیحدہ کردیں۔

(۶۵) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا مَثَلِیْ وَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰہُ بِہٖ کَمَثَلِ رَجُلٍ اَتٰی قَوْمًا فَقَالَ یَا قَوْمِ اِنِّیْ رَاَیْتُ الْجَیْشَ بِعَیْنَیَّ وَ اِنِّیْ اَنَا النَّذِیْرُ الْعُرْیَانُ فَالنَّجَاءَ النَّجَاءَ فَاَطَاعَہٗ طَائِفَۃٌ مِّنْ قَوْمِہٖ فَاَدْلَجُوْا فَانْطَلَقُوْا عَلٰی مَہَلِہِمْ فَنَجَوْا وَکَذَّبَتْ طَائِفَۃٌ مِّنْہُمْ فَاَصْبَحُوْا مَکَانَہُمْ فَصَبَّحَہُمُ الْجَیْشُ فَاَہْلَکَہُمْ وَاجْتَاحَہُمْ فَذٰلِکَ مَثَلُ مَنْ اَطَاعَنِیْ فَاتَّبَعَ مَا جِئْتُ بِہٖ وَمَثَلُ مَنْ عَصَانِیْ وَکَذَّبَ مَا جِئْتُ بِہٖ مِنَ الْحَقِّ۔ (متفق علیہ)

(۶۶) عَنْ اَبِیْ ہُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا اَضَاءَتْ مَا حَوْلَہَا جَعَلَ الْفَرَاشُ وَھٰذِہِ الدَّوَابُّ الَّتِیْ

(۶۵) ابوموسیٰؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے میری اور اس دین کی مثال جو خدا نے مجھے دیکر بھیجا ہے اس شخص کی سی ہے جو اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا اے میری قوم میں نے دشمن اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھا ہے اور میں ایک سچا ڈرانیوالا ہوں لہٰذا نجات کی فکر کرو اس پر اس کی قوم میں کسی نے تو اس کا کہنا مانا اور آہستہ آہستہ شروع رات میں ہی چل پڑے اور دشمن سے نجات پاگئے اور کسی نے اس کو جھوٹا سمجھا اور اپنے بستروں پر صبح تک پڑے سوتے رہے دشمن کا لشکر صبح صبح ان پر ٹوٹا اور ان کو تباہ و برباد کر ڈالا بس ٹھیک یہی مثال ہے اس شخص کی جس نے میری بات مان لی اور میرے لائے ہوئے دین کی پیروی کی اور اس شخص کی جس نے میری بات نہ مانی اور اس سچائی کو جھٹلا دیا جو میں اپنے ساتھ لایا ہوں (یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(۶۶) ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے میری مثل اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی جب اس نے اردگرد کو خوب روشن کردیا تو پروانے اور

(۶۵) عرب میں غارت گری کے لئے بیشتر صبح کا وقت ہی مقرر تھا اسی لئے جس کو وہ دعا دیتے یہی دعا دیتے کہ خدا تیری صبح اچھی رکھے۔ اسی طرح ان کا دستور تھا کہ جب کوئی شخص دشمن دیکھ پاتا تو اپنے کپڑے اتار کر کسی اونچی جگہ ان کو ہلاتا تاکہ یہ وحشتناک صورت دیکھ کر لوگ دشمن کی آمد کا یقین کرلیں اور دشمن کے پہنچنے سے قبل ہوشیار ہوجائیں چنانچہ اس کی خبر بھی چشم دید اور سچی سمجھی جاتی تھی۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے آپ کو "النذیر العریان" سے تعبیر فرمایا ہے جن خوش نصیبوں نے آپ کے فرمان کو مانا خدا کے عذاب سے نجات پائی اور جنھوں نے آپ کی بات پر کان نہ دھرا اور کفر میں عمر گذار دی اور مر گئے عذاب الٰہی نے انھیں آپکڑا اور موتِ ابدی میں دھکیل دیا۔

تقع فی النار یقعن فیہ وجعل یحجزھن ویغلبنہ فیتقحمن فیہا فانا اٰخذ بحجزکم عن النار وانتم تقحمون فیہا ھٰذہٖ روایۃ البخاری وللمسلم نحوھا وقال فی اٰخرھا قال فذٰلک مثلی ومثلکم انا اٰخذ بحجزکم عن النار ھلم عن النار ھلم عن النار فتغلبونی تقحمون فیہا (متفق علیہ)

(۶۷) عن ابی موسٰی قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم مثل ما بعثنی اللّٰہ من الھدٰی والعلم کمثل الغیث اصاب ارضا فکانت منہا طائفۃ طیبۃ قبلت الماء فانبتت الکلاء والعشب الکثیر وکانت منہا اجادب امسکت الماء

یہ کیڑے جو آگ میں گرا کرتے ہیں اس میں گرنے لگے وہ ہے کہ انھیں روک رہا ہے، یہ ہیں کہ اسے عاجز کرکے اس میں گھسے جارہے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ہوں کہ تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں دوزخ سے بچا رہا ہوں اور تم ہو کہ اس میں گھسے جاتے ہو۔ یہ روایت بخاری کی ہے اور مسلم نے بھی اسی کے ہم معنی روایت کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ لفظ ہیں۔ کہ میری اور تمہاری مثل یہ ہے میں تمہاری کمر پکڑے ہوئے (کہہ رہا) ہوں دوزخ سے بچو، دوزخ سے بچو، تم مجھے عاجز کرکے اس میں گھسے جاتے ہو (یہ حدیث متفق علیہ ہے)۔

(۶۷) ابو موسیٰؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے جو ہدایت اور دین کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیکر بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برسی اس زمین کے ایک حصہ نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پی لیا گھاس اور سبزہ خوب اگایا اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے

(۶۶) دنیا کے ناسمجھ انسانوں اور رسول خدا کی انتہائی محبت و خیر خواہی کا جو نقشہ اس مثال میں کھینچا گیا ہے اس سے زیادہ بے اور موثر انداز میں کھینچنا ناممکن ہے۔ نہ پروانہ کو انجام کا ہوش ہوتا ہے نہ آج دنیائے کفر کو فردائے قیامت کا فکر ہے بے رحمی و نادانی سے ان جان قربان کرنے والوں پر سب سے زیادہ رحم کھانے والا پکار رہا ہے کہ تم آگ میں جا رہے ہو کوئی نصیب والا ہوگا جو اس کی آواز سنے گا۔

(۶۷) یہاں زمین کی مفصل اقسام اور لوگوں کی مکمل تقسیم پھر ان میں پوری پوری مطابقت بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ اجمالاً یہ سمجھانا مقصود ہے کہ جس طرح دنیا میں بارش کے پانی سے بعض زمین نفع اٹھاتی ہے اور بعض نفع نہیں اٹھاتی اور جو نفع نہیں اٹھاتی یہ اسی کی خرابی کی دلیل ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی الٰہی کی بارش ہے بعض قلوب اس سے نفع اٹھاتے ہیں، ہدایت کا بیج ان میں اسی طرح پھولنے پھلنے لگتا ہے جیسا کہ اچھی زمین میں کھیتی اور بعض ایسے اوندھے ہوتے ہیں کہ چٹیل میدان کی طرح نہ اس قابل ہوتے ہیں کہ خود کوئی نفع حاصل کریں اور نہ ان میں یہی قابلیت ہوتی ہے کہ اس پانی کو صرف روک لیں کہ کم از کم دوسرے ہی اس سے فائدہ حاصل کرلیں۔ یہ بھی نفع کی ایک صورت تھی۔

فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا وَاَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةً اُخْرٰی اِنَّمَا هِیَ قِیْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَاءً فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ وَ نَفَعَهُ مَا بَعَثَنِیَ اللّٰهُ بِهٖ فَعَلِمَ وَعَلَّمَ وَمَثَلُ مَنْ لَّمْ یَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا وَلَمْ یَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ (متفق علیہ)

(۶۸) عَنْ رَبِیْعَةَ الْجُرَشِیِّ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقِیْلَ لَهٗ لِتَنَمْ عَیْنُكَ وَلْتَسْمَعْ اُذُنُكَ وَلْیَعْقِلْ قَلْبُكَ قَالَ فَنَامَتْ عَیْنَیَّ وَسَمِعَتْ اُذُنَایَ وَعَقَلَ قَلْبِیْ قَالَ فَقِیْلَ لِیْ سَیِّدٌ بَنٰی دَارًا فَصَنَعَ مَادُبَةً وَاَرْسَلَ دَاعِیًا فَمَنْ اَجَابَ الدَّاعِیَ دَخَلَ الدَّارَ وَاَكَلَ مِنَ الْمَادُبَةِ وَرَضِیَ عَنْهُ السَّیِّدُ وَمَنْ لَّمْ یُجِبِ الدَّاعِیَ لَمْ یَدْخُلِ الدَّارَ

وہ پانی جمع کر لیا تو اس کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ نے دوسرے لوگوں کو نفع پہنچایا انھوں نے خود پانی پیا اور اپنے جانوروں کو پلایا اور کاشت کی لیکن زمین کا ایک حصہ تھا جو چٹیل میدان تھا نہ پانی کو روکے نہ گھانس اگائے۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے خدا کے دین کی سمجھ حاصل کی اور اللہ تعالیٰ نے اس دین سے اس کو نفع دیا اس نے خود سیکھا اور دوسروں کو سکھلایا اور اس شخص کی مثال جس نے ادھر سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس ہدایت کو قبول نہ کیا جس کو مجھے دیکر بھیجا گیا تھا۔ (یہ حدیث متفق علیہ ہے)۔

(۶۸) ربیعہ جرشیؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک فرشتہ حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا چاہئے کہ آپ کی آنکھیں سو جائیں (اور کسی طرف نہ دیکھیں) اور آپ کے گوش (میری بات) سنیں اور آپ کا دل (متوجہ ہوکر) سمجھے، آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں (تمام محسوسات کی طرف سے) سوگئیں میرے کان سننے کے لئے تیار اور دل سمجھنے کے لئے ہشیار ہوگیا آپ فرماتے ہیں پھر فرشتے نے کہا ایک سردار ہے اس نے ایک گھر بنایا اور دعوت کا انتظام کیا اور ایک بلانے والا بھیجا اب جس نے اس کی دعوت کو سنا اور مانا وہ اس گھر میں آگیا اور دعوت بھی کھائی سردار اور مالک مکان بھی اس سے خوش ہوا اور جس نے اس بلانے والے کی بات نہ مانی وہ نہ تو گھر میں آیا اور نہ اس نے دعوت کا کھانا

(۶۸) اس باب کی پہلی حدیث میں جنت کو گھر کہا گیا تھا اور یہاں اسلام کو گھر کہا گیا ہے اور جنت کو طعام دعوت قرار دیا گیا ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ دونوں مثالوں کا مشترک نتیجہ ایک ہی ہے۔ یہاں ہر ہر جزء کی تشبیہ مقصود نہیں ہے۔ نیز اسلام چونکہ جنت میں داخل ہونے کا واحد سبب ہے اس لئے اس کو عین مسبب اور مجازاً گھر کہدینا بھی درست ہے۔ بہرحال ان سب مثالوں اور کہاوتوں میں یہی سمجھایا گیا ہے کہ جنت کا گھر بغیر آپ کی تصدیق اور پیروی کئے نہیں ملے گا۔

وَلَمْ يَأْكُلْ مِنَ الْمَأْدُبَةِ وَسَخِطَ عَلَيْهِ السَّيِّدُ قَالَ فَاللّٰهُ السَّيِّدُ وَمُحَمَّدٌ الدَّاعِيْ وَالدَّارُ الْإِسْلَامُ وَالْمَأْدُبَةُ الْجَنَّةُ (رواه الدارمی)

(۶۹) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَعَنْ جَنْبَتَيِ الصِّرَاطِ سُوْرَانِ فِيْهِمَا اَبْوَابٌ مُّفَتَّحَةٌ وَعَلَى الْاَبْوَابِ سُتُوْرٌ مُّرْخَاةٌ وَعِنْدَ رَأْسِ الصِّرَاطِ دَاعٍ يَقُوْلُ اسْتَقِيْمُوْا عَلَى الصِّرَاطِ وَلَا تَعْوَجُّوْا وَفَوْقَ ذٰلِكَ دَاعٍ يَدْعُوْ كُلَّمَا هَمَّ عَبْدٌ اَنْ يَفْتَحَ شَيْئًا مِّنْ تِلْكَ الْاَبْوَابِ قَالَ وَيْحَكَ لَا تَفْتَحْهُ فَاِنَّكَ اِنْ تَفْتَحْهُ تَلِجْهُ ثُمَّ فَسَّرَهُ فَاَخْبَرَ اَنَّ الصِّرَاطَ هُوَ الْاِسْلَامُ وَاَنَّ الْاَبْوَابَ الْمُفَتَّحَةَ مَحَارِمُ اللّٰهِ وَاَنَّ السُّتُوْرَ الْمُرْخَاةَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَاَنَّ الدَّاعِيَ عَلٰى

کھایا اور مالک مکان اس پر ناراض ہوا۔ اس کے بعد اس کی توضیح کی کہ مالک مکان تو اللہ ہے اور اس کے منادی اور بلانے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، وہ گھر اسلام کا گھر ہے اور وہ دعوت جنت (اور اس کی نعمتیں) ہیں۔ (اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے)۔

(۶۹) ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال بیان فرمائی، ایک سیدھی راہ ہے اس کے دونوں طرف دو دیواریں ہیں، ان دیواروں میں کھلے ہوئے دروازے ہیں، دروازوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور اس راہ کے سرے پر ایک پکارنے والا پکار رہا ہے (اے چلنے والو) اسی راستہ پر سیدھے چلے جاؤ اور اپنے دائیں بائیں رخ نہ کرو، اس پکارنے والے سے پہلے ایک اور پکارنے والا ہے جب بندہ ان دروازوں میں کسی دروازہ کو کھولنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے او کمبخت اسے کھول مت اگر کھولے گا تو اس میں ضرور داخل بھی ہوگا، پھر اُس مثال کی خود توضیح کی، یہ سیدھی راہ تو اسلام ہے اور کھلے ہوئے دروازے خدا کی حرام کردہ چیزیں ہیں اور اس پر لٹکے ہوئے پردے خدا کی بیان کردہ حدود

---

(۶۹) حدیث کا حاصل یہ ہے کہ محرماتِ شرعیہ میں فطرتِ انسانی کے لئے ایسی کشش ہے کہ جو اس طرف نظر بھی اٹھائے گا وہ ضرور مبتلا ہو کر رہے گا اس لئے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ خدا کی قائم کردہ حدود سے دور ہی دور رہے تاکہ محرماتِ شرعیہ کی بو بھی نہ پاس آنے پائے۔ قرآن کریم خدا کا داعی کھلم کھلا پکار رہا ہے اور واعظ اللہ لمّۃ ملکی ہے یعنی وہ داعیۂ خیر ہے جو ظاہری فتنوں سے پہلے انسان کو خیر و نصیحت کی دعوت دیا کرتا ہے طیبی فرماتے ہیں کہ لٹکے ہوئے پردے وہ امور ہیں جن میں دلائل کے تعارض یا کسی ابہام کی وجہ سے کوئی شبہ رہ جاتا ہے یہاں شرعی ہدایت یہ ہے کہ ان سے دور ہی رہنا چاہئے تاکہ اشتباہ کی احتمالی مضرت سے بھی حفاظت رہے اسی کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا یہ خدا کی حدود ہیں لہٰذا ان کے قریب بھی نہ آؤ۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

رَأْسِ الصِّرَاطِ هُوَ الْقُرْاٰنُ وَاَنَّ الدَّاعِيَ مِنْ فَوْقِهٖ هُوَ وَاعِظُ اللّٰهِ فِيْ قَلْبِ كُلِّ مُؤْمِنٍ
رواہ رزین واحمد والبیھقی فی شعب الایمان عن النواس بن سمعان وکذا الترمذی عنہ
الا انہ ذکر اخصر منہ)

(۷۰) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَطًّا ثُمَّ قَالَ هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ وَقَالَ هٰذِهٖ سُبُلٌ عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْا اِلَيْهِ وَقَرَأَ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ الاٰية (رواہ احمد والنسائی والدارمی)

ہیں اور راہ کے سرے کا داعی قرآن ہے اور اس سے پہلا داعی خدا کا ناصح ہے جو ہر مومن کے قلب میں موجود ہے۔ اس حدیث کو رزین و احمد نے روایت کیا ہے اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن مسعودؓ کی بجائے نواس بن سمعان سے روایت کیا ہے اور اسی طرح ترمذی نے بھی مگر انھوں نے اس سے ذرا مختصر روایت بیان کی ہے۔

(۷۰) ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایک خط کھینچا اور فرمایا کہ یہ تو اللہ کی طرف جانیوالا راستہ ہے پھر اس خط کے دائیں بائیں اور خطوط نکالے اور فرمایا یہ اور راستے ہیں ان میں ہر راستہ پر ایک شیطان ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اس کے بعد یہ آیت پڑھی ان ھذا الخ یہ میرا سیدھا راستہ ہے لہذا اسی پر چلو (اس حدیث کو احمد و نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک ضعیف انسان کے لئے یہ امتحان کم نہیں کہ اس کی پیاسی نظروں کے سامنے رنگین نظارے ہوں اور ان پر صرف ایک پردہ ڈال کر ان کی دید سے اس کو روکا جائے خانۂ محرمات کی رنگینی ہی خود ایک بلا رہتی اس پر نظر اٹھانے کی ممانعت یہ دوسری بلا ہے جو اس کے لئے اور موجب اشتیاق بن رہی ہے مگر اس کے ساتھ اگر غور کرو تو بات کچھ مشکل بھی نہیں، اندرونی و بیرونی دو دو پہرہ دار ساتھ ہیں جو سمجھاتے جا رہے ہیں۔ نظر فریبی کے سامان گو موجود ہیں مگر ان پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر تمام شریعت کا خلاصہ سمجھنا چاہو تو ایک حرف ہے یعنی ضبطِ نفس، عبادات و معاملات، عقوبات، معیشت اور اخلاقیات کے جتنے بھی احکام ہیں وہ اسی ایک حرف کی تفصیلات اور عملی ٹریننگ ہیں۔ جس کو ضبطِ نفس کی عادت پڑ گئی اس کو شریعت پر عمل کرنا آسان ہو گیا اور جس نے اپنے نفس کو آزادی کا خوگر بنا لیا اس نے آسان شریعت کو خود اپنے لئے مشکل بنا لیا۔

(۷۰) . . . . . یہ حدیث پہلی حدیث کے ہم معنی ہے۔ یہاں اگر شیطانی دعوت کا ذکر ہے تو پہلی حدیث میں واعظ اللہ اور قرآن کریم کی دو دعوتوں کا تذکرہ آچکا ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی راہ صرف ایک راہ ہے جس میں کوئی ناہمواری، نشیب و فراز نہیں ہے اور گمراہی کی راہیں بہت ہیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

لوکان موسیٰ حیا ما وسعہ الا اتباعہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۷) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ عَنْ شَيْءٍ فَإِنَّهُمْ لَنْ يَهْدُوْكُمْ وَقَدْ ضَلُّوْا فَإِنَّكُمْ إِمَّا أَنْ تُصَدِّقُوْا بِبَاطِلٍ أَوْ تُكَذِّبُوْا بِحَقٍّ فَإِنَّهُ لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِيْ۔

(رواہ احمد۔ وابن ابی شیبہ۔ والبزار)

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو آج انھیں بھی آنحضرتؐ کی پیروی کیے بغیر کوئی چارہ نہ ہوتا

(۱۷) جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اہل کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کیونکہ جو خود گمراہ ہو چکے ہیں وہ بھلا تمہیں کیا راہ دکھلائیں گے اگر تم ان کی تصدیق کرتے ہو تو احتمال ہے کہ تم کسی غلط بات کی تصدیق کر بیٹھو، اور اگر تکذیب کرتے ہو تو ممکن ہے کہ کسی حق بات کی تکذیب کر دو آج وہ زمانہ ہے کہ اگر خود موسیٰ علیہ السلام تم میں زندہ موجود ہوتے تو انھیں بھی سوائے میری پیروی کے تورات کی پیروی کرنا حلال نہ ہوتا (اس حدیث کو امام احمد، ابن ابی شیبہ اور بزار نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور وہ بھی پُرخم اور پُرپیچ ہیں صرف نفسانی حرص اور طبعی انجذاب ان کو بیدھا دکھلاتا ہے راہِ مستقیم پر گامزن ہونے میں اگر کوئی اندرونی اضطراب محسوس ہو تو وہ راہ کی ناہمواری نہیں بلکہ چاروں طرف سے دعوتِ شیطانی کے اثرات ہیں جتنا ادھر کان لگاؤ گے اس اضطراب میں اضافہ ہوتا رہے گا اور جتنا ان سے غافل رہو گے اسی قدر اپنے قلب میں اطمینان و سکون دیکھو گے۔

(۱۷)۔ ۔ ۔ ۔ یہاں امت کے سامنے ایک اصولی مسئلہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب تمہارے عمل کے لئے ایک شریعت آچکی ہے تو اب پہلی شریعت سے بحث کرنا ہی غلط ہے، ظاہر ہے کہ اگر پہلی شریعت کو قائم رکھنا منظور ہوتا تو ضرور اس کو محفوظ بھی رکھا جاتا لیکن جب اس کو محفوظ نہیں رکھا گیا تو معلوم ہوگیا کہ آئندہ قدرت کو اس پر عمل درآمد بھی منظور نہ تھا۔ شریعتِ سماویہ گو سب حق تھیں مگر تحریف کے بعد ان میں بہت سا باطل کا حصہ داخل ہو چکا ہے جو نامعلوم ہے اب اس سے بحث کا حاصل یہی ہے کہ اگر تصدیق کرتے ہو تو باطل کی تصدیق کا احتمال اور تکذیب کرتے ہو تو حق کی تکذیب کا احتمال باقی رہتا ہے اس لئے جب عمل کے لئے ایک راہ موجود ہے تو پھر اس گرداب میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان میں تحریف نہیں ہوئی تو بھی ہر صداقت پر عمل کرنا اسی وقت موجب نجات ہو سکتا ہے جبکہ وہ وقت کی شریعت بھی ہو اگر اس کی بجائے دوسری شریعت آچکی ہے تو اب پہلی صداقت پر عمل کرنا وقتی شریعت کی توہین ہوگی۔ اگر دین صرف اپنی رائے پر ہوتا تو شریعت کی حاجت نہ تھی اور جب شریعت کی ضرورت تسلیم ہے تو صرف کسی صداقت کا صداقت ہونا نجات کے لئے کافی نہیں جب تک اس کا وقتی شریعت ہونا بھی ثابت نہ ہو جائے ہر صداقت کا شریعت ہونا کوئی لازمی امر نہیں ہاں ہر شریعت کا صداقت پر مبنی ہونا ضروری ہے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(۷۲) وَعَنْهُ اَيْضًا اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكِتَابٍ اَصَابَهُ مِنْ بَعْضِ اَهْلِ الْكِتَابِ فَقَرَأَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَغَضِبَ فَقَالَ اَمُتَهَوِّكُوْنَ فِيْهَا يَا ابْنَ الْخَطَّابِ؟ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ جِئْتُكُمْ بِهَا بَيْضَاءَ نَقِيَّةً لَا تَسْأَلُوْهُمْ عَنْ شَيْءٍ فَيُخْبِرُوْكُمْ بِحَقٍّ فَتُكَذِّبُوْا بِهٖ اَوْ بِبَاطِلٍ فَتُصَدِّقُوْا بِهٖ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ اَنَّ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ اِلَّا اَنْ يَّتَّبِعَنِيْ۔ رواہ احمد۔ وابن ماجۃ عن ابن عباس و ابن حبان عن جابر وغیرھم وفی الباب عن عبداللہ بن ثابت الانصاری عند احمد وابن سعد والحاکم فی الکنیٰ والطبرانی والبیھقی فی شعب الایمان وعن جابر عند الدارمی۔

(۷۳) عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ جَاءَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اِنِّيْ مَرَرْتُ بِاَخٍ لِيْ مِنْ قُرَيْظَةَ فَكَتَبَ لِيْ

(۷۲) جابرؓ روایت فرماتے ہیں کہ عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک کتاب لائے جو انھوں نے کسی اہل کتاب سے لی تھی اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھا تو ناراض ہوئے اور فرمایا کہ اے ابن الخطاب کیا اپنے دین کے معاملہ میں تم لوگ بھی کچھ حیرت میں مبتلا ہو، اس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تمہارے پاس ایک روشن اور صاف شریعت لیکر آیا ہوں اہل کتاب سے دین کی کوئی بات مت پوچھا کرو کہیں وہ تمہیں کوئی سچی بات بتلائیں اور تم اس کی تکذیب کردو یا غلط بات بتائیں اور اس کی تصدیق کردو، اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو بھی اس کے سوا گنجائش نہ تھی کہ میری ہی پیروی کرتے۔ اس حدیث کو احمد نے اور ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے اور ابن حبان نے جابرؓ سے روایت کیا ہے اور یہی مضمون امام احمد نے عبداللہ بن ثابت انصاری سے روایت کیا ہے اور اسی طرح ابن سعد اور حاکم نے کنیٰ میں اور طبرانی نے روایت کیا ہے اور شعب الایمان میں بیہقی نے روایت کیا ہے اور دارمی نے جابرؓ سے بھی روایت کیا ہے۔

(۷۳) شعبی عبداللہ بن ثابت سے روایت کرتے ہیں کہ عمر بن الخطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ میں قبیلہ بنی قریظہ کے اپنے ایک رفیق کے پاس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس لئے یہ محض ایک بے بنیاد خیال ہو کہ جب سب ادیان سماویہ حق ہیں تو ان پر عمل کرنا بھی ہمیشہ نجات کے لئے کافی ہونا چاہئے جس دور میں خود موسیٰ علیہ السلام کو دینی صداقت پر عمل کرنا ضروری ہو اس میں ان کی کتاب کا تذکرہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ دراصل اس بحث کا منشا انکار نسخ ہر ملل سماویہ کا منسوخ ہونا ایک مسلم مسئلہ ہے علماء کو اگر بحث ہے تو دین اسلام کے احکام کے نسخ میں ہے۔ نیز دیگر ادیان سماویہ کے عقائد و اصول کا باقی رہنا بھی دوسری بات ہے۔

جَوَامِعَ مِنَ التَّوْرَاتِ اَلَا اَعْرِضُهَا عَلَيْكَ؟ قَالَ فَتَغَيَّرَ وَجْهُ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ عَبْدُ اللهِ فَقُلْتُ لَهٗ اَلَا تَرٰى مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عُمَرُ رَضِيْنَا بِاللهِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَسُوْلًا قَالَ فَسُرِّيَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ اَصْبَحَ فِيْكُمْ مُوْسٰى ثُمَّ اتَّبَعْتُمُوْهُ وَتَرَكْتُمُوْنِيْ لَضَلَلْتُمْ اِنَّكُمْ حَظِّيْ مِنَ الْاُمَمِ وَاَنَا حَظُّكُمْ مِنَ النَّبِيِّيْنَ۔ رواہ احمد۔ وعزاہ صاحب المشکوۃ للدارمی وقال صاحب التنقیح رواہ ایضاً ابن حبان باسناد صحیح واحمد باسناد حسن۔

(۴۷) عَنْ جَابِرٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ اَتٰى رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِنُسْخَةٍ مِنَ التَّوْرَاةِ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ هٰذِهٖ نُسْخَةٌ مِنَ التَّوْرَاةِ فَسَكَتَ فَجَعَلَ يَقْرَأُ وَوَجْهُ

گذرا تھا تو اس نے میرے فائدہ کی غرض سے تورات سے کچھ جامع کلمات لکھ دیئے تھے اجازت ہو تو آپ کے سامنے پیش کروں، راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ عبداللہ کہتے ہیں، میں نے کہا (اے عمرؓ) آپ کے چہرۂ مبارک پر آثار ناگواری نہیں دیکھتے؟ (عمرؓ فوراً متنبہ ہوئے) اور کہنے لگے ہم اللہ کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر راضی ہو چکے ہیں۔ راوی کا بیان ہے یہ کلمات سن کر آپ کے چہرے سے وہ اثر زائل ہو گیا اور آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر موسیٰ تم میں موجود ہوں اور تم مجھے چھوڑ کر ان کا اتباع کرو تو گمراہ ہو گے امتوں میں تم میرا حصہ ہو اور نبیوں میں میں تمہارا حصہ ہوں۔ اس حدیث کو احمدؒ نے روایت کیا ہے اور صاحب مشکوۃ نے اس روایت کو دارمی کی طرف منسوب کیا ہے۔ صاحب تنقیح کہتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن حبان نے بھی باسناد صحیح روایت کیا ہے اور امام احمدؒ نے باسنادِ حسن روایت کیا ہے۔

(۴۷) جابرؓ کہتے ہیں کہ عمر بن الخطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لیکر آئے اور بولے یا رسول اللہ یہ تورات کا نسخہ ہے آپ خاموش ہو گئے (یہ ناگواری کی خاموشی

---

(۴۶) یہ حدیث اس کی دلیل ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے سامنے شریعت موسوی کا متلاشی ہے وہ گویا آپ کی نبوت کو چھوڑ کر نبوت موسوی کا قائل ہونا چاہتا ہے۔ جس طرح خدا اور اس کے رسول کے درمیان تفریق نہیں ہوسکتی اسی طرح رسول اور اس کی شریعت کے درمیان بھی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ ایمان بالرسالۃ یہ ہے کہ اس کے لائے ہوئے دین کو مانے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ نبوۃ محمدی مان کر شریعت موسویہ کی پیروی کی جائے۔

رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَتَغَیَّرُ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ ثَکِلَتْکَ الثَّوَاکِلُ مَا تَرٰی مَا بِوَجْہِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَنَظَرَ عُمَرُ اِلٰی وَجْہِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ غَضَبِ اللّٰہِ وَغَضَبِ رَسُوْلِہٖ رَضِیْنَا بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ نَّبِیًّا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَوْ بَدَا لَکُمْ مُوْسٰی فَاتَّبَعْتُمُوْہُ وَتَرَکْتُمُوْنِیْ لَضَلَلْتُمْ عَنْ سَوَاءِ السَّبِیْلِ وَلَوْ کَانَ حَیًّا وَّاَدْرَکَ نُبُوَّتِیْ لَاتَّبَعَنِیْ (رواہ الدارمی)

تھی) عمرؓ اُسے پڑھنے لگے۔ ادھر آپ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ ابوبکرؓ نے کہا۔ اے عمرؓ تجھے رونے والی عورتیں روئیں آپ کے روئے انور پر جو ناگواری کے آثار ہیں کیا تمہیں نظر نہیں آتے عمرؓ نے آپ کے چہرہ کی طرف دیکھا تو فوراً یہ کلمات کہے، میں خدا کے غصہ اور اس کے رسول کے غصہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ ہم اللہ کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی مان کر راضی ہو چکے ہیں آپ نے فرمایا۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے اگر آج موسیٰ کا بھی ظہور ہو جائے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے چل پڑو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے۔ اگر وہ زندہ ہوتے اور میری نبوت کو پاتے تو میرے ہی پیچھے چلتے۔ (اس حدیث کو دارمی نے روایت کیا ہے)

(۲) ان احادیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی کا ذکر صرف اس لئے نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دین جملہ ادیان کے لئے ناسخ بنکر آچکا ہے بلکہ اس لئے بھی ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ اگر انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ملے تو وہ آپ پر ایمان بھی لائیں اور آپ ہی کے ناصر و معین رہیں۔ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ النَّبِیّٖنَ لَمَآ اٰتَیْتُکُمْ مِّنْ کِتٰبٍ وَّحِکْمَۃٍ ثُمَّ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَکُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِہٖ وَلَتَنْصُرُنَّہٗ۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام سے یہ عہد لیا تھا کہ جب میں تمہیں کتاب و حکمت دوں۔ پھر تمہارے پاس خدا کا ایک رسول آئے جو تمہارے پاس والی کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو تو اس پر ایمان لانا اور اس کی نصرت و مدد کرنا۔

اس عہد کی رو سے ہر نبی کا فرض ہے کہ اگر وہ آپ کے زمانہ میں آئے تو آپ پر ایمان لائے اور آپ ہی کا تبع رہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور اسی لئے دنیا میں تشریف لا کر اس فریضہ اتباع کو سب کے سامنے انجام دیں گے۔ دنیا اس سعی میں ہے کہ بزور سائنس مردے زندہ کر دے کسی زندہ کی درازی عمر اور اس کا نزول کیا اس سے زیادہ تعجب خیز ہے ابھی عجائبات کے ساتھ جنگ نہ کرو اور صبر کے ساتھ تھوڑا انتظار کرو شاید مادی ترقیات عنقریب تمہارے سامنے وہ وقت لے آئیں جبکہ دنیا کے عجائبات عجائبات رہیں گے (تنبیہ) بعض کتب حدیث میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ذکر ہے مگر اس کی سند کسی کتاب میر نظر سے نہیں گذری اور اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس کی کوئی سند ہے اور درست بھی ہو تو جس ہستی کی حیوۃ اس عالم میں نہیں (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

من عصی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقد أبی

(۷۵) عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ أُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبٰی قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ یَأْبٰی قَالَ مَنْ أَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ أَبٰی (رواہ البخاری)

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ

(۷۶) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا یُؤْمِنُ

جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے وہ آپ کا انکار کرتا ہے

(۷۵) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری تمام امت جنت میں جائے گی مگر جو انکار کرے، صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ وہ کون ہے جو آپ کا انکار کرتا ہے آپ نے جواب دیا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے نافرمانی کی اس نے مجھے نہ مانا اور میرا انکار کیا۔ (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

کوئی شخص پورا ایماندار نہیں ہوتا جب تک اس کی خواہشات شریعت کے تابع نہیں ہوتیں

(۷۶) عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں کوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ اس عالم میں تشریف لانے سے پہلے مردہ کہا جا سکتا ہے جیسا کہ عام مردے دوسرے عالم میں زندہ ہوتے ہیں مگر اس جہان میں ان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ دنیا اپنے اپنے احساس اور عالم کے موافق بولتی ہے۔ یہ شریعت کی اطلاع ہے کہ وہ عظیم القدر ہستی جس کے متعلق کسی کا گمان بھی نہ تھا ہے اور کسی کا قتل کا زندہ صحیح و سلامت موجود ہے اور اپنے وقت پر پھر آنے والی ہے تفصیلی بحث اپنے محل میں آئیگی۔

(۷۵) انکار دو قسم پر ہے ایک یہ کہ زبان سے انکار کرے ایسا منکر کافر ہے اور کبھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا دوسرا یہ کہ زبان سے اقرار کرتا ہے مگر اپنے طرز عمل میں کھلے منکر کے مشابہ ہے یہ گو اقرار کر رہا ہے مگر جب نافرمانی کرنے میں زبان سے انکار کرنے والے کے برابر ہے تو ایک نظر میں یہ بھی گویا منکر ہے لہذا اسے بھی اُن منکرین کے ساتھ کچھ دن رہنا ہوگا۔ گو اپنے قلبی اقرار کی وجہ سے پھر نجات ہو جائے۔ رسول کے لائے ہوئے دین کو ماننا ایمان ہے اور اس کی اطاعت کرنا اس قلبی ایمان کی علامت ہے۔ نافرمان اور منکر صورت میں یکساں ہیں۔

أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ۔ (رواه فی شرح السنة قال النووی فی اربعینه هذا حدیث صحیح رویناه فی کتاب الحجة باسناد صحیح)۔

وجوب محبة للنبی صلی اللّٰہ وسلم اکثر من نفسه والناس اجمعین

(۷۷) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔ (رواه الشیخان)

شخص ایماندار نہیں ہو سکتا، یہاں تک کہ اس کی خواہش اس دین کی تابع نہ بن جائے جو میں لایا ہوں۔ اس حدیث کو شرح السنہ میں روایت کیا ہے۔ نووی اپنی کتاب اربعین میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور کتاب الحجہ میں ہم نے اس کو صحیح اسناد سے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اپنی جان بلکہ سب جہان سے زیادہ کرنا ضروری ہے

(۷۷) انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم میں کوئی مومن نہیں ہے جب تک کہ میں اسے اپنے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

---

(۷۶) ایمان کا کمال یہ ہے کہ متابعتِ شریعت میں وہ لطف و لذت محسوس ہونے لگے جو طبعی مرغوبات میں محسوس ہوتا ہے۔ نماز کے وقت نماز اور ماہِ رمضان میں روزہ اور نصاب حولی پر زکوٰۃ کی وہ خواہش ہو جو سردی میں گرم کپڑے اور گرمی میں ٹھنڈک حاصل کرنے کی ہوتی ہے۔ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ نفس اپنی سرشت چھوڑ کر شریعت کے تابع ہو جائے اسی کا نام نفس مطمئنہ ہے ظاہر ہے کہ جب نفس میں یہ ذوق پیدا ہو جائے گا تو بلا کلفت شریعت پر دائمی عمل میسر آجائے گا اور اس وقت وہ ایمان حاصل ہوگا جو بڑی حد تک زوال کے خطرہ سے مامون ہوگا۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اس کا نام ولایتِ کبریٰ ہے شریعت میں اس کو ایمان کامل کہا جاتا ہے۔

(۷۷) شیخ بدرالدین عینیؒ لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں۔ کمال، جمال، جود و سخا۔ یہ تینوں اوصاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں۔ آپ کا کمال شریعتِ مطہرہ سے ظاہر ہے آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے۔ آپ کی روحانی و جسمانی بخشش و کرم کا کون اندازہ لگا سکتا ہے پھر آپ کی محبت تمام مخلوق سے زیادہ کیوں نہ ضروری ہو۔ ماں، باپ، بیٹے کی محبت طبعی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت محبت عقلی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ کمالِ ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے۔ ایمان کی تفصیلی بحث میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ایمان صرف عقائد و عمل کا نام نہیں بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے شدہ شدہ مومن کا قلب مزین و رنگین ہو جاتا ہے۔ (باقی بر صفحہ آئندہ)

(۷۸) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ هِشَامٍ قَالَ كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ آخِذٌ بِيَدِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ لَهُ عُمَرُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَأَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ كُلِّ

(۷۸) عبداللہ بن ہشام کہتے ہیں کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپ عمرؓ کا ہاتھ میں ہاتھ لئے ہوئے تھے عمرؓ نے آپ سے عرض کیا یا رسول اللہ آپ مجھے اپنی جان کے سوا ہر چیز سے زیادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شفا میں سیرت محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ، بھائی، شوہر تینوں شہید ہو گئے۔ جب اُسے خبر ملی تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بخیر ہیں لوگوں نے کہا ہاں بخیریت ہیں اس نے کہا چلو مجھے دکھلاؤ تاکہ میں خود آپ کے روئے انور کو دیکھ لوں۔ جب اس نے آپ کو دیکھ لیا تو بولی کل مصیبۃ بعدک جلل جب آپ زندہ وسلامت ہیں تو اس کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ انور ہمیں اپنے مال و اولاد اور والدین اور پیاس میں سرد پانی سے بھی زیادہ پیاری تھی اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کے لئے حرم سے باہر لے چلے تو ابو سفیان بن حرب بولا کہو زید قسم کھا کر بتلاؤ کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے۔ زید نے قسم کھا کر کہا مجھے ہرگز یہ گوارا نہیں کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے۔ ابو سفیان کہنے لگا میں نے کسی کو اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھی اس سے محبت کرتے ہیں۔

قاضی عیاض نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا آپ مجھے اپنے اہل و مال سب سے زیادہ محبوب ہیں مجھے آپ کی یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا جب تک یہاں آکر آپ کو دیکھ نہیں لیتا اب غم یہ ہے کہ وفات کے بعد آپ تو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوں گے وہاں میں آپ کو کیسے دیکھا کروں گا اس پر یہ آیت اتر آئی ومن یطع اللہ والرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا «جو لوگ اللہ و رسول کا کہا مانتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر خدا کا انعام ہے یعنی نبی، صدیق، شہید اور نیک لوگ اور ان لوگوں کی صحبت بڑی غنیمت ہے۔» آپ نے اُسے بلا کر یہ آیت سنا دی۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں معیت سے مراد صرف جنت میں معیت ہے جہاں ہر وقت حاضر ہو کر آپ کا دیدار ممکن ہوگا۔ خاص آپ کے مقام و منزل میں معیت مراد نہیں روایت ہے کہ عبداللہ بن زید بن عبدربہ جو صاحب الاذان کہلاتے تھے اپنے باغ میں کچھ کام کر رہے تھے دفعۃً ان کے فرزند پہنچے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات سنائی اسی وقت انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا اے اللہ مجھے نابینا کر دے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔

یہ اور اس قسم کے بیشمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو آپ سے ایسی ہی محبت تھی جیسا کہ حدیث میں موجود ہے۔ بدقسمتی سے اگر کسی کو یہ مقام حاصل نہیں تو وہ ان کی محبت میں تاویل نہ کرے جن کو یہ مقام حاصل تھا۔

حاشیہ صفحہ ہذا (۷۸) یہ عمر فاروقؓ کی صداقت تھی کہ انھوں نے اپنا اندرونی کھوٹ دربار رسالت میں صاف صاف کہہ ڈالا اور یہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال تھا کہ ایک سیکنڈ میں آپ نے ایمان کے تمام ارتقائی مدارج انھیں طے کرا دیئے۔ وہ سینہ جو ابھی ابھی اپنی جان کو عزیز تر سمجھ رہا تھا دوسری ساعت آنے نہیں پائی کہ رسول کی ذات کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھنے لگتا ہے۔ کہنے کو تو یہ دو ہی فقرہ ہیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

شَیْءٍ اِلَّا مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ لَا وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ حَتّٰی اَکُوْنَ اِلَیْکَ مِنْ نَفْسِکَ فَقَالَ عُمَرُ

عزیز ہیں، آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب تک تم کو میں اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں تم مومن نہیں ہو، عمرؓ نے عرض کیا اچھا اب آپ مجھے اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مگر آپ کی فیض صحبت کی یہ برقی تاثیر عقل انسانی کے لئے موجب حیرت بن رہی ہے اب سوچو کہ جہاں سیکنڈوں کی صحبت کے آثار یہ ہوں وہاں ہفتوں، مہینوں اور سالوں کے اثرات کیا ہوں گے۔

قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا

اس مضمون کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے پہلے اس پر غور کیجئے پھر حدیث کا مطلب سمجھئے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِؕ وَ مَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِیْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ﹰاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ۔ (توبہ ع ۹)

اے مومنو! اگر تمہارے باپ بھائی، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھتے ہوں تو انھیں اپنا دوست نہ بناؤ اور جو ایسا کرے گا تو یہی لوگ ظالم ہوں گے۔ اے پیغمبر آپ کہدیجئے کہ اگر تمہارے باپ، اولاد، بھائی، بی بیاں، کنبہ، تمہارا مال، جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے، تمہارے رہنے کے مکان جو تمہیں بہت پسند ہیں یہ سب چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ پیاری ہوں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو خدا کو کرنا ہے تمہارے سامنے آجائے۔ خدا فاسقوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھولتا۔

آیت بالا میں تفصیل کے ساتھ ان جملہ عواقب کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے کہ جو اسلامی زندگی اختیار کرلینے کے بعد غیر متوقع نہیں ہوتے یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ باپ بیٹے سے اور بیٹا باپ سے بھائی اپنے بھائی سے شوہر اپنی بی بی سے علیحدہ ہوجائے کنبہ قبیلہ روٹھ جائے اپنا جمع کیا ہوا مال ہاتھوں سے نکل جائے، چلتی ہوئی تجارت میں روڑا اٹک جائے، اپنے رہائشی اچھے اچھے مکان ترک کرنے پڑجائیں مگر بتلاؤ ایسے وقت میں تم کس کا ساتھ دوگے اگر کہیں عزیزوں کا ساتھ دیا تو یہ اس کا ثبوت ہوگا کہ جو ایثار و قربانی کا عہد تم نے اپنے خدا سے باندھا تھا وہ غلط تھا پھر جو اس عہد شکنی کی پاداش ہو اس کا انتظار تمہیں کرنا چاہئے۔

اسلام بتلاتا ہے کہ عزیزوں کے بڑے حقوق ہیں اور سب حقوق کی رعایت کرنا انسان کا فرض ہے مگر خدا اور رسول کا حق سب سے مقدم ہے اور اسی لئے جب کسی کے حق کی ادائیگی میں ان کا حق فوت ہو تو پھر ان کا حق مقدم کرنا ہوگا والدین اپنی جگہ بہت بڑے حقدار ہیں مگر خدا و رسول کا حق ان سے بہت زیادہ ہے اسی لئے آیت کے شروع میں پیرایہ بیان یہی اختیار کیا گیا ہے کہ اگر تمہارے والدین ایمان پر کفر کو ترجیح دیں اور خدا کے حق کو فراموش کرنے لگیں تو پھر تمہارا حق ہوگا کہ تم بھی ان کے حق کو فراموش کردو۔ اسی لئے دوسری جگہ فرمایا۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَوْ كَانُوْۤا

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والے ان سے محبت رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول سے عداوت

فَاِنَّکَ الْاٰنَ وَاللہِ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ فَقَالَ الْاٰنَ یَا عُمَرُ (رواہ البخاری فی الایمان والنذور)

جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے آپ نے فرمایا تو اب پکے مومن بھی ہو گئے۔ اس حدیث کو بخاری نے کتاب الایمان والنذور میں روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ)

اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ — رکھتے ہیں، اگرچہ یہ لوگ اپنے والد، اولاد، بھائی،
اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ (مجادلہ ۳) — اور کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔

یہاں پر تقریباً ان ہی رشتوں کا پھر ذکر کیا گیا ہے جس کا اوپر کی آیت میں ذکر کیا گیا تھا۔ ہر دو آیت میں ولایت، مودت کی ممانعت اس صورت میں ہے جبکہ ان عزیزوں میں خدا اور اس کے رسول کی عداوت اور کفر کو اسلام پر ترجیح دینے کا میلان پایا جائے۔ اور اسی وقت اسلام اپنی محبت کا امتحان لیتا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ یوں تو بیشتر احادیث قرآن کریم کی تشریحات ہی کا دوسرا نام ہیں مگر بعض مرتبہ کسی حدیث کے الفاظ کسی آیت کے الفاظ سے اس قدر قریب ہوتے ہیں گویا ایک ہی مضمون کی دو تعبیریں ہیں ایسے مقامات پر پہلے قرآن کریم کی آیت کا بغور مطالعہ کر لینا چاہئے پھر اسی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہئے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو ہم نے بارہا پڑھا اور صرف اتنا ہی سمجھا کہ یہ حدیث صرف ایمان کامل کا معیار بتلاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا و رسول کی محبت سب محبتوں پر غالب ہونا چاہئے۔ لیکن جب آیات بالا پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس حدیث میں ایک اساسی اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے ابتدائی ماحول میں خدا و رسول پر ایمان لانا والد اور اولاد کے درمیان سب سے بڑا تفرقہ کا سبب تھا بہت ممکن تھا کہ ان رشتوں کی محبت اسلامی سعادت کے حاصل ہونے میں مانع آتی۔ تاریخ اسلامی سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مرتبہ یہی محبتیں اسلامی قربانیوں کے لئے سد راہ بن گئی ہیں گو شاذ و نادر سہی۔ اسی کی طرف آیت ذیل میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ — اے ایمان والو تمہاری بیبیوں اور اولاد میں ایسے
عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ (تغابن) — بھی ہیں جو تمہارے لئے باعث فتنہ ہیں ان کو ذرا بچتے رہنا۔

یہ حدیث بتلاتی ہے کہ اگر آپ کے لئے کبھی ایسا موقع آئے کہ اسلام کی وجہ سے اسے اپنی اولاد چھوٹنی پڑ جائے یا اولاد کو ایسا موقعہ ہو کہ اسے اپنے والدین ترک کرنے پڑیں تو ایمان یہ ہے کہ یہ قربانیاں کر گذرنی چاہئیں۔ یہی غلبۂ محبت کے معنی ہیں، اب اگر آپ یہ حُبِّ عقلی سے تعبیر کریں یا حب شرعی سے۔ جس ماحول میں اب ہم ہیں وہ اسلامی ماحول ہے یہاں اولاد بھی مسلمان اور والد بھی مسلمان اس لئے اس طرف ذہن ہی نہیں جاتا کہ خدا اور رسول کی محبت کو والدین یا اولاد کی محبت کی کوئی تقابل ہو سکتا ہے بلکہ یہاں تو خدا اور رسول کی محبت اسی طرف لو دواعی ہے کہ والدین کی محبت اور زیادہ ہو لیکن جب یہ ماحول نہیں تھا اور اسلام دنیا کو کفر کی تاریکیوں سے نور ہدایت کی طرف نکلنے کی دعوت دے رہا تھا اس وقت خدا رسول کی محبت والد و اولاد کی عداوت کے ہم معنی بنی ہوئی تھی۔ جو خدا سے محبت کرتا اسے اپنے مال و اولاد کو چھوڑنا پڑتا اور جو اپنے مال و اولاد کا ساتھ دیتا اسے خدا اور رسول سے بغاوت کرنا پڑتی۔ ایک درمیانی درجہ یہ ہو سکتا تھا کہ خدا اور رسول کی محبت کے ساتھ دشمنوں کی محبت کو بھی نبھا لیا جائے یہ حدیث اس کمزوری کو دفع کرنا چاہتی ہے اور بتلاتی ہے کہ اسلام یہ ہے کہ تم خدا و رسول کی محبت پر سب کچھ قربان کر دو اور اس کے مقابلہ پر کسی کا ساتھ نہ دو۔

(۷۹) عَنْ اَنَسٍ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْاِيْمَانِ اَنْ يَكُوْنَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَاَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ وَاَنْ يَكْرَهَ اَنْ يَعُوْدَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ اَنْ يُقْذَفَ فِي النَّارِ (رواہ الشیخان)

حب الرسول لحب اللہ

(۸۰) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا

(۷۹) انسؓ سے روایت ہے کہ جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ چکھ لیا (۱) اللہ و رسول اس کو سب سے زیادہ محبوب ہوں (۲) جب وہ کسی سے محبت کرے تو خدا کے لئے کرے (۳) کفر میں پھر واپس جانا اس کو اتنا ہی برا لگے جیسے کہ آگ میں داخل ہونا۔

رسول کی محبت خدا کی محبت کی وجہ سے کرنا چاہئے

(۸۰) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اللہ سے محبت رکھو

(۷۹) اس حدیث میں تیسری بات قرآن کریم کی ایک آیت کی طرف اشارہ ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ۔ یہ خدا کا انعام ہے کہ اس نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈالدی ہے اور اس کو خوشنما بنادیا ہے اور کفر گناہ اور نافرمانی کی نفرت پیدا کردی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں یہاں ایمان میں فرائض و مستحبات وغیرہ کی کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے اور اس کے مقابلہ میں کفر فسوق و عصیان کی تفصیل اختیار کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کامل فرائض و مستحبات کے مجموعہ کا نام ہے اس لئے ایمان کی محبت یہ ہے کہ بلا تفصیل اس کے تمام احکام کی محبت ہو اس کے مقابل حالت بعض مرتبہ کفر ہوگی اور بعض مرتبہ صرف فسوق و عصیان کی حد تک رہے گی۔ مومن کامل کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف کفر سے نہیں بلکہ فسق و عصیان سے بھی نفرت رکھے۔ یہ تین الفاظ اس لئے رکھے گئے ہیں کہ ہر فسق و عصیان کفر نہیں ہے اور نہ ہر عصیان فسق ہے (کتاب الایمان ص ۱۷)

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام اشخاص و افراد سے نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔ ہاں زشت افعال سے نفرت و بیزاری کی ضرور تعلیم دیتا ہے۔ حضرت سید الشہداء کا قاتل اسلام قبول کر کے مسلمانوں کا بھائی بن سکتا ہے اور ایک کاتب وحی مرتد ہو کر زمین و آسمان کا مبغوض بن جاتا ہے اس لئے کفر سے نفرت کرنا اسلام کی تعلیم کا جزء ہے بلکہ آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان کی محبت اور کفر کی نفرت دونوں باتیں لازم ہیں جسے اسلام سے محبت ہوگی اسے کفر سے نفرت اور جسے کفر سے رغبت ہوگی اسے اسلام سے نفرت ہونا ضروری ہے۔ اسلام یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ خدا کی زمین پر ایک غلط اور ظلم و عدوان کے قانون کی حمایت بھی اسی طرح کی جائے جیسا کہ عدل و انصاف کے آئین کی کی جاتی ہے اس لئے اسلام و کفر کے درمیان نہ کوئی صلح و آشتی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

يَغْذُوكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ وَاَحِبُّوْنِيْ لِحُبِّ اللّٰهِ وَاَحِبُّوْا اَهْلَ بَيْتِيْ لِحُبِّيْ (رواہ الترمذی)

(۸۱) عَنْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ بْنِ رَبِيْعَةَ اَنَّ الْعَبَّاسَ دَخَلَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُغْضَبًا وَاَنَا عِنْدَهٗ فَقَالَ مَا اَغْضَبَكَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَنَا وَلِقُرَيْشٍ

اس لئے کہ وہ تمہیں طرح طرح کی نعمتیں عطا فرماتا ہے اور مجھ سے محبت رکھو خدا کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہل بیت سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۱) عبدالمطلب بن ربیعہ سے روایت ہے کہ حضرت عباسؓ غصہ میں بھرے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے میں اس وقت آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا آپ نے فرمایا اتنا غصہ کیوں ہے؟ فرمایا یا رسولؐ اللہ ہم میں اور قریش میں بھلا کیا فرق ہے کہ جب وہ باہم

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمان کے لئے کافر کے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہنا ضروری ہے۔ اسلام اشخاص و افراد کے لئے تو سلامتی کا پیغام ہے مگر کفر کے ساتھ کسی علاقہ کا روادار نہیں۔ اس فرق کو سمجھئے تاکہ حدیث میں نمبر ۲ بھی خوب روشن ہو جائے یعنی اسلام میں محبت کا معیار بھی اشخاص و افراد نہیں بلکہ خدا و رسول ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اسلام اور ایمان کامل یہ ہے کہ خدا... اور اس کے رسول کی محبت اس درجہ غالب آجائے کہ پھر تمام عداوت و محبت کا محور و مرکز یہی بن جائے کسی سے محبت ہو تو ان کے نام پر اور عداوت ہو تو ان کے نام پر۔

(۸۰) اس حدیث میں خدا کی محبت کا سب سے آسان راستہ یہ بتلایا گیا ہے کہ پہلے تم ان نعمتوں کا مطالعہ کرو جو شب و روز بلا جدوجہد اور بلا کسی استحقاق کے تم کو میسر ہیں خدا کی محبت پیدا ہو جائے گی۔ جب خدا کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گی تو رسول کی محبت کا پیدا ہونا لازم ہوگا۔ کیونکہ اس کا رشتہ خدا سے یہی ہے کہ وہ تمہارے اور اس کے درمیان پیغام پہنچانے والا ہے۔ بادشاہوں کے درباروں میں نامہ بروں کی جتنی قدر و قیمت ہوتی ہے راہِ محبت میں اس سے کہیں زیادہ ہے اس لئے رسول کی محبت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بارگاہِ محبت کا پیغامبر سمجھو، جب دنیا کے ایلچیوں میں اخلاقِ فاضلہ و اوصافِ کاملہ ہونا ضروری ہیں تو خدا کے رسولوں میں کیوں ضروری نہ ہوں گے پھر اس جہت سے بھی محبت پیدا ہو جائے گی اسلام میں محبت کا اصل محور و مرکز صرف خدا کی ذات بتلائی گئی ہے اور یہی اس کی امتیازی توحید ہے کہ انسان کے قلبی علائق کے گوشے صرف اسی ایک ذات پاک کے نام پر تقسیم ہوتے ہیں۔ اسی لئے آذان و اقامت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "رسول اللہ" کہکر پکارا گیا ہے تاکہ اللہ اکبر کے بعد رسول اللہ کی عظمت و محبت قلب میں خود بخود جاگزیں ہو جائے اور اسی لئے قرآن کریم میں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ارشاد فرمایا ہے یعنی اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری اتباع کرو۔ گویا اصل محور و مرکز خدا ہی کی محبت ہے اور اس کا صحیح معیار رسول کی اطاعت ہے اب جو شخص خدا کی محبت کا مدعی ہے مگر رسول کی عظمت و محبت پوری طرح نہیں کرتا، یا رسول کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر خدا کی عظمت و محبت سے خالی ہے وہ سراسر دھوکے میں ہے۔ رسول کی محبت و عظمت اس کا احترام و ادب دینی فریضہ ہے اور یہ سب اس لئے ہے کہ وہ اس باعظمت ذات کا رسول ہے جس کی تمام کائنات مخلوق ہے۔ رسول کی صحیح عظمت یہ ہے۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

إِذَا تَلَاقَوْا بَيْنَهُمْ تَلَاقَوْا بِوُجُوهٍ مُبَشِّرَةٍ وَإِذَا لَقُونَا لَقُونَا بِغَيْرِ ذَالِكَ فَغَضِبَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَتَّى احْمَرَّ وَجْهُهُ ثُمَّ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يَدْخُلُ قَلْبَ رَجُلٍ الْإِيمَانُ حَتَّى يُحِبَّكُمْ لِلّٰهِ وَلِرَسُولِهِ ثُمَّ قَالَ أَيُّهَا النَّاسُ مَنْ آذَى عَمِّي فَقَدْ آذَانِي فَإِنَّمَا عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ أَبِيهِ۔ (رواہ الترمذی)

(۸۲) عَنْ أُسَامَةَ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا إِذْ جَاءَ عَلِيٌّ وَالْعَبَّاسُ يَسْتَاذِنَانِ فَقَالَا لِأُسَامَةَ اِسْتَاذِنْ لَنَا عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ عَلِيٌّ

ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو بہت خوش خوش ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو اس طرح نہیں ملتے اس پر آپ کو اتنا غصہ آیا کہ چہرۂ مبارک سرخ ہو گیا پھر فرمایا اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس وقت تک آدمی کے قلب میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی خاطر تم سے بھی محبت نہ رکھے۔ اس کے بعد کہا اے لوگو دیکھو جو میرے چچا کو تکلیف دے گا اس نے مجھے تکلیف دی۔ آدمی کا چچا اس کے باپ ہی کے برابر ہوتا ہے (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۲) اسامہؓ سے روایت ہے کہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعۃً حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے اجازت طلب کرنے لگے اور اسامہ سے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اپنے خود تراشیدہ خیالات پر رسول کی محبت کرنا صحیح محبت نہیں عیسائی بھی حضرت مسیح سے محبت کرتے ہیں مگر خدا کا رسول سمجھکر نہیں بلکہ اس کا بیٹا بنا کر کیا تم اس کو صحیح محبت کہو گے اور یہود ان سے بغض و دشمنی رکھتے ہیں مگر انھیں خدا کا دشمن سمجھ کر کیا تم اسے صحیح دشمنی کہو گے پھر صحیح دوستی اور صحیح دشمنی وہ ہے جو محض اس ایک ذات پاک کے نام پر ہو اس کے سوا محبتیں اور دشمنیاں سب آئین اسلام سے باہر ہیں۔ اس علاقہ کو ذرا اور وسعت دو تو رسول کی اولاد سامنے آتی ہے ان سے محبت اس لئے ضروری ہے کہ رسول کی محبت ضروری ہے گویا ان کی محبت پیدا کرنے کے لئے رسول کی ذات سامنے رکھنا چاہئے تو ان کی محبت آپ سے آپ پیدا ہو جائے گی جیسا کہ رسول کی محبت کے لئے خدا کی ذات پیش نظر رکھنا چاہئے اور اس طرح اگرچہ محبت کا دائرہ بہت پھیلتا چلا جائے گا مگر اصل مرکزی نقطہ پھر وہی ایک ذات پاک کی محبت رہے گی اب اگر کوئی شخص رسول کی محبت کا دعویدار ہے مگر اہل بیت کی محبت نہیں رکھتا یا اہل بیت کی محبت کا تو دم بھرتا ہے مگر خدا و رسول کی محبت کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے تو کیا تم اسے صحیح محبت والا کہہ سکتے ہو۔ رسول کا رشتہ جس طرح اہل بیت کے ساتھ ہے اسی طرح اس جماعت کے ساتھ بھی ہے جس میں اس نے اپنے شب و روز گذارے جنھوں نے اس کے لئے جانیں قربان کر دیں اور اس کی رفاقت میں تمام علاقے ختم کر دینے میں تامل نہ کیا پس اگر کوئی شخص اس جاں نثار جماعت سے بغض رکھے تو کیا تم اسے رسول کا محب کہو گے اللہ تعالیٰ ہمیں غلو سے بچائے اور صحیح محبت کی توفیق بخشے۔

وَالعَبَّاسُ يَسْتَاذِنَانِ فَقَالَ اَتَدْرِي مَا جَاءَ بِهِمَا قُلْتُ لَا قَالَ لٰكِنِّي اَدْرِي اِئْذَنْ لَهُمَا فَدَخَلَا فَقَالَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ جِئْنَاكَ نَسْاَلُكَ اَيُّ اَهْلِكَ اَحَبُّ اِلَيْكَ قَالَ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ قَالَا مَا جِئْنَاكَ نَسْاَلُكَ عَنْ اَهْلِكَ قَالَ اَحَبُّ اِلَيَّ مَنْ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتُ عَلَيْهِ اُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ قَالَا ثُمَّ مَنْ قَالَ عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ فَقَالَ العَبَّاسُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ جَعَلْتَ عَمَّكَ اٰخِرَهُمْ قَالَ اِنَّ عَلِيًّا سَبَقَكَ بِالْهِجْرَةِ۔ رواہ الترمذی

(۸۳) عَنْ عُمَرَ اَنَّهٗ فَرَضَ لِاُسَامَةَ فِي ثَلَاثَةِ اٰلَافٍ وَخَمْسِمِائَةٍ وَفَرَضَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ فِي ثَلَاثَةِ اٰلَافٍ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ لِاَبِيْهِ لِمَ فَضَّلْتَ اُسَامَةَ عَلَيَّ فَوَاللّٰهِ مَا سَبَقَنِي اِلٰى مَشْهَدٍ قَالَ لِاَنَّ زَيْدًا كَانَ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَبِيْكَ وَكَانَ اُسَامَةُ اَحَبَّ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْكَ فَاٰثَرْتُ حِبَّ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى حِبِّي۔ رواہ الترمذی

کہا ہمارے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاضری کی اجازت لے لو، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ علیؓ اور عباسؓ اجازت چاہتے ہیں آپ نے فرمایا بھلا جانتے ہو کیوں آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا نہیں فرمایا لیکن میں جانتا ہوں اچھا انھیں آنے کی اجازت دیدو، وہ دونوں آگئے اور بولے یا رسول اللہ ہم آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو اپنے گھر میں سب سے زیادہ کس سے محبت ہے آپ نے فرمایا اپنی بیٹی فاطمہؓ سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم ان گھر والوں کے متعلق نہیں پوچھتے فرمایا تو پھر ۔۔۔ جس پر (اسلام کی توفیق دیکر) اللہ تعالیٰ نے احسان کیا اور (آزاد کرکے) میں نے احسان کیا یعنی اسامۃ بن زید، انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ علیؓ، عباسؓ بولے یا رسول اللہ آپ نے تو اپنے چچا کو سب سے آخر نمبر میں ڈالدیا۔ فرمایا اس لئے کہ علیؓ ہجرت میں تم سے سبقت لیجا چکے ہیں۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(۸۳) عمرؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے اسامہؓ کا وظیفہ ساڑھے تین ہزار اور اپنے بیٹے کا تین ہزار مقرر کیا تھا اس پر عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد سے عرض کیا آپ نے اسامہ کو مجھ پر کن وجوہ کی بناء پر فوقیت دی خدا کی قسم ہے کسی معرکہ میں وہ مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکے عمرؓ نے جواب دیا اس بناء پر کہ اسامہ کے والد یعنی زید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرے والد سے زیادہ پیارے تھے اور خود اسامۃ تجھ سے زیادہ پیارے تھے اس لئے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے کو اپنے پیارے پر ترجیح دی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

ــــــــــــــ

لہ حاشیہ برصفحہ آئندہ ملاحظہ فرمائیے

بعض علامات محبۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محبۃ السنۃ

(۸۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا بُنَیَّ اِنْ قَدَرْتَ اَنْ تُصْبِحَ وَتُمْسِیَ وَلَیْسَ فِیْ قَلْبِكَ غِشٌّ لِاَحَدٍ فَافْعَلْ ثُمَّ قَالَ یَا بُنَیَّ وَذٰلِكَ مِنْ سُنَّتِیْ وَمَنْ اَحَبَّ سُنَّتِیْ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَحَبَّنِیْ کَانَ مَعِیَ فِی الْجَنَّۃِ (رواہ الترمذی)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی کچھ علامات

محبتِ سنت

(۸۴) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا اے فرزند اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ صبح یا شام کسی وقت بھی تمہارے دل میں کسی کے لئے کھوٹ نہ رہے تو کر گذرو کیونکہ صاف سینہ رہنا یہ میرا طریقہ ہے اور جو میرے طریقہ کو پسند کرتا ہے وہ ضرور میری محبت رکھتا ہے اور جو مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مرقاۃ میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عباسؓ، ابو سفیانؓ، بلالؓ، سلمانؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین حضرت عمرؓ کے پاس تشریف لائے اور اجازت طلب کی حضرت عمرؓ نے پہلے حضرت بلالؓ کو اجازت دی۔ ابو سفیانؓ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا آپ دیکھتے ہیں کہ عمرؓ ہمارے غلاموں کو ہم سے بڑھاتے ہیں حضرت عباسؓ نے فرمایا ہم لوگ ہجرت میں پیچھے بھی رہ گئے تھے اس لئے ہماری یہی جزا ہونا چاہئے۔ سبحان اللہ یہ اسلام ہے جس کے نزدیک آزاد و غلام کا کوئی فرق نہیں۔ بڑائی اور چھوٹائی کا مدار اسلامی جانبازی اور قربانی پر ہے۔

(۸۴) عربی زبان میں غش (نصح) کی ضد ہے (نصح) کے معنی خیرخواہی ہیں قلبی کھوٹ میں کینہ، بغض، عداوت وغیرہ سب داخل ہیں صاف سینہ رہنا اخلاق نبوۃ کا جزء ہے اور شریعت میں اس کی بہت تاکید کی گئی ہے اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی ایک کھلی ہوئی علامت یہ بتلائی گئی ہے کہ آپ کے تمام اوضاع و اطوار نظروں میں محبوب ہو جائیں، عبادت کرنا ہر انسان کا فرض ہے اور ہر مسلمان اس میں آپ کی اتباع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے لیکن اس حدیث میں محبت کا ایک اور بلند معیار بتلایا گیا ہے وہ یہ کہ عبادات کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات و نفسیات و طبیعات بھی نظروں میں قابل اتباع بن جائیں۔ بلکہ وہ غیر اختیاری جذبات جو اپنے مخالف کے لئے قلب میں موجزن ہوتے ہیں اس لئے قلب میں جمنے نہ پائیں کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے خلاف ہیں یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ آپ کی محبت رگ رگ میں سرایت کر چکی ہو ؂

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن ۔۔۔ کائینہ ہر چہ دید فراموش می کند

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

محبۃ العرب

(۸۵) عَنْ سَلْمَانَ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تُبْغِضْنِیْ فَتُفَارِقَ دِیْنَکَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ اُبْغِضُکَ وَبِکَ ھَدَانَا اللّٰہُ قَالَ تُبْغِضُ الْعَرَبَ فَتُبْغِضُنِیْ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن غریب۔)

(۸۶) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَحِبُّوا الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ لِاَنِّیْ عَرَبِیٌّ وَالْقُرْاٰنُ عَرَبِیٌّ وَکَلَامُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ عَرَبِیٌّ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان)

وفی حب العرب احادیث کثیرۃ بعضہا صححہا الحاکم وقال الذہبی الحدیث ضعیف لا صحیح ولا موضوع تذکرۃ الموضوعات ص ۱۱۲۔
وفی آخر الرقاق من المستدرک واحب العرب من قلبک ۔ قال الذہبی صحیح ، المستدرک (ج ۴ ص ۲۳۲)

عرب کی محبت

(۸۵) سلمانؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا دیکھو مجھ سے بغض نہ رکھنا ورنہ دین سے بالکل جدا ہو جاؤ گے، انھوں نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ بھلا آپ سے کیسے بغض رکھ سکتا ہوں، آپ ہی کے طفیل میں تو اللہ تعالیٰ نے ہم کو ہدایت نصیب فرمائی ہے فرمایا عرب سے بغض رکھوگے تو مجھ سے بھی بغض رکھنے لگوگے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۶) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت رکھو اس لئے کہ میں عربی ہوں، اس لئے کہ قرآن عربی ہے اس لئے کہ اہلِ جنت کی گفتگو بھی عربی زبان میں ہوگی۔ (اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) جنت میں آپ کے ساتھ ہونے کا مطلب ٹھیک اسی منزلہ و مرتبہ میں ہونا نہیں ہے بلکہ زیارت و ملاقات کی سہولت مراد ہے۔ جنت تمام کی تمام ایک مکان کی مثال ہے اور اس میں رہنے والے سب ایک ہی جگہ رہنے والے سمجھے جاتے ہیں۔ علاقہ محبت کا اثر یہ ہے کہ جنت میں ہر شخص کا مقام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام سے اپنی علاقہ محبت کے بقدر قریب رکھا جائے گا۔

(۸۵) ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ اسلام میں محبت کا مرکز صرف اللہ کی ذات ہے پھر جہاں تک بھی اس کی شاخیں پھیلتی ہیں سب کا منشاء یہی ذات پاک رہتی ہے۔ رسول کی محبت خدا کی محبت کی وجہ سے ہے اور عرب کی محبت اس لئے ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ رسول کا محبوب وطن اور محبوب قوم ہے، محبت اور عداوت دونوں متعدی صفات ہیں، جب محبت پیدا ہوتی ہے تو اپنے اطراف میں بھی پھیلتی ہے یہی حال عداوت کا ہے حتی کہ ایک شخص کی وجہ سے تمام جہان نظروں میں محبوب یا دشمن بن جاتا ہے۔ عرب کی محبت اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے تو پھر اُن کی دشمنی یقیناً آپ سے اندرونی بغض ہی کا نتیجہ ہوگی۔ عرب کے کسی خاص شخص سے اس کی بداعمالی کی وجہ سے عداوت عرب کی عداوت نہیں کہلاتی، عرب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہے اس لحاظ سے ہمیشہ نظروں میں محبوب ہے۔ (باقی حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

محبۃ الصحابۃ والانصار واھل البیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

(۸۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ اَللّٰہَ اَللّٰہَ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْھُمْ غَرَضًا مِنْ بَعْدِیْ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ فَبِحُبِّیْ اَحَبَّھُمْ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَھُمْ وَمَنْ اٰذَاھُمْ فَقَدْ اٰذَانِیْ وَمَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰہَ فَیُوْشِکُ اَنْ یَّاْخُذَہٗ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث غریب)۔

(۸۸) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ الْاَنْصَارُ لَا یُحِبُّھُمْ اِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا یُبْغِضُھُمْ اِلَّا مُنَافِقٌ فَمَنْ اَحَبَّھُمْ اَحَبَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ اَبْغَضَھُمْ اَبْغَضَہُ اللّٰہُ۔ (متفق علیہ)

صحابہ، انصار اور اہلِ بیت کی محبت

(۸۷) عبد اللہ بن مغفل سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتاکید فرمایا کہ میرے صحابہ کے بارے میں خدا کا خوف رکھنا اور میرے بعد ان کو ہدفِ ملامت نہ بنانا (یاد رکھو) جو ان سے محبت رکھے گا وہ میری وجہ سے محبت رکھے گا اور جو اُن سے بغض رکھے گا وہ میری وجہ سے بغض رکھے گا، جو ان کو تکلیف دے گا اس نے گویا مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے خدا تعالیٰ کو تکلیف دینے کا ارادہ کیا تو قریب ہے کہ وہ گرفت کرلے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۸۸) براء روایت فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے
انصار سے کوئی محبت نہیں رکھے گا مگر مؤمن۔ اور ان سے بغض نہیں رکھے گا مگر منافق۔ جو اُن سے محبت رکھیگا اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھیگا۔ اور جو اُن سے بغض رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے بغض رکھیگا (یہ حدیث متفق علیہ ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جیسا کہ اپنی اولاد کہ اس کی محبت کسی صورت بھی جدا ہونے والی نہیں۔ جو بغض بد عملی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس کا سبب بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے وہ اور بات ہے۔

حدیث وقرآن کو نہایت سادگی سے سمجھنا چاہئے اس میں قیدیں لگا لگا کر شبہات پیدا کرنا کجروی ہے کسی محترم ہستی کی وجہ سے اس کے وطن اس کی زبان اس کے طور طریق کا احترام نظروں میں سما جانا ایک فطری بات ہے اسی رشتہ کی وجہ سے صحیحین میں انصار کی محبت کو ایمان کی علامت کہا گیا ہے اور اسی نظر سے یہاں عرب کی محبت کا امر فرمایا گیا ہے اب اس وطن وقوم کے حدود کہاں تک ہیں یہ بات اپنے اپنے تعلق اور محبت کی گہرائی اور خارجی تفصیل پر موقوف ہے۔ رسول کی محبت اگر سچ مچ دل میں ہے تو اس کے تقاضے پورے کرنے پڑیں گے۔ (صفحہ ہذا کا حاشیہ برصفحہ آئندہ ملاحظہ ہو)

(۸۹) عَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَى صِبْيَانًا وَنِسَاءً مُقْبِلِينَ مِنْ عُرْسٍ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اللّٰهُمَّ أَنْتُمْ مِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ اَللّٰهُمَّ أَنْتُمْ وَمِنْ أَحَبِّ النَّاسِ إِلَيَّ. يعني الانصار. متفق عليه

(۹۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ عَلَى عَاتِقِهِ يَقُولُ اللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ۔ (متفق عليه) وفی روایۃ عَنْ ابی هريرة عند هما اَللّٰهُمَّ إِنِّي أُحِبُّهُ فَأَحِبَّهُ وَأَحِبَّ مَنْ يُحِبُّهُ۔

(۸۹) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند بچوں اور عورتوں کو ایک شادی سے واپس آتے ہوئے دیکھا تو کھڑے ہوگئے اور فرمایا، سب لوگوں میں تم مجھے بہت ہی محبوب ہو، بہت ہی محبوب ہو۔ راوی کہتا ہے کہ یہ خطاب آپ کا انصار کے بچوں اور عورتوں کو تھا، یہ حدیث متفق علیہ

(۹۰) براءؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حضرت حسنؓ آپ کے کاندھے پر ۔۔۔ ہیں اور ان کے لئے آپ یہ دعا فرما رہے ہیں اے اللہ میں ان سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ اور ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں شیخین نے یہ روایت کیا ہے اے اللہ میں ان سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے ان سے بھی محبت فرما

(۸۷) شرح السنہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا امت میں میرے صحابہ کی مثال ایسی ہے جیسا کھانے میں نمک کی، بھلا کوئی کھانا بلا نمک درست ہو سکتا ہے۔ حسنؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا نمک ہی ختم ہوا تو بتلاؤ ہم کہاں سے درست ہوں۔ (مشکوۃ شریف)

۸۸) احبہ للّٰہ اور ابغضہ اللّٰہ کو اگر جملہ دعائیہ بنا دیا جائے تو بھی ممکن ہے یعنی خدا ان سے محبت کرے اور خدا ان سے بغض رکھے۔ اس حدیث کی تشریح کتاب الایمان میں کی جا چکی ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا (۸۹) مہاجرین تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ و خاندان تھے۔ انصار نے غیر ہو کر جو آپ کی مدد کی اس میں خدا کے رسول سے محبت کے سوا اور کیا جذبہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے ہر موقعہ پر آپ بھی ان سے محبت آمیز کلمات فرما کر ان کی ہمت افزائی فرمایا کرتے اور یہ بتلایا کرتے تھے کہ خدا کے رسول کو ان کی اس جاں نثاری کی کتنی قدر ہے۔

۹۰) رسول کی محبت رکھو گے تو خدا کی محبت پیدا ہو جائے گی اور اگر رسول تم سے محبت کریگا تو تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللهُ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریگا۔ اس آیت میں اتباع رسول کا ثمرہ خدا تعالیٰ کی محبوبیت قرار دیا گیا ہے۔ یہاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اپنی محبت کا اظہار فرمایا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ درخواست کی ہے کہ وہ انھیں اپنا محبوب بنا لے۔ اصل یہ ہے کہ محبت میں خدا اور رسول کے درمیان تفریق نہیں ہو سکتی، ایک کا محب دوسرے کا محب ہے اور ایک کا محبوب دوسرے کا محبوب بنکر رہتا ہے۔ پہلے روایت میں گذر چکا ہے ۔۔۔ کہ اہل بیت کی محبت کا اصل رشتہ خدا کے رسول ہی کی ذات مقدس کی اسی طرح انصار، صحابۂ عرب کی محبت بھی اسی ایمانی رشتہ سے وابستہ ہے۔

محبة كل ما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يحبه

(۹۱) عَنْ عُبَيْدِ بْنِ جُرَيْجٍ أَنَّهُ قَالَ لِابْنِ عُمَرَ رَأَيْتُكَ تَلْبَسُ النِّعَالَ السِّبْتِيَّةَ قَالَ إِنِّي رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَلْبَسُ النِّعَالَ الَّتِي لَيْسَ فِيهَا شَعْرٌ وَيَتَوَضَّأُ فِيهَا فَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَلْبَسَهَا۔ (رواه الترمذی وغیرہ)

(۹۲) عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ إِنَّ خَيَّاطًا دَعَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَهُ، فَقَالَ أَنَسٌ فَذَهَبْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى ذَالِكَ الطَّعَامِ فَقَرَّبَ إِلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خُبْزًا مِنْ شَعِيرٍ وَمَرَقًا فِيهِ دُبَّاءٌ وَقَدِيدٌ قَالَ أَنَسٌ فَرَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَتَبَّعُ الدُّبَّاءَ حَوَالَيِ الصَّحْفَةِ فَلَمْ أَزَلْ أُحِبُّ الدُّبَّاءَ مِنْ يَوْمَئِذٍ رواه الشیخان وفی روایۃ للترمذی قَالَ أَنَسٌ فَمَا صُنِعَ لِي طَعَامٌ أَقْدِرُ عَلَى أَنْ يُصْنَعَ فِيهِ دُبَّاءٌ إِلَّا صُنِعَ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرغوب چیز کا مرغوب ہو جانا

(۹۱) عبید بن جریج نے ابن عمرؓ سے دریافت کیا۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ ہمیشہ بے بال چمڑے کے چپل پہنا کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے ہی چپل پہنے دیکھا تھا جس پر بال نہ ہوا کرتے تھے اس لئے مجھے بھی ایسے ہی چپل پہننا پسند ہیں (اس حدیث کو ترمذی وغیرہ نے روایت کیا ہے)

(۹۲) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک درزی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کچھ کھانا تیار کیا اور آپ کی دعوت کردی۔ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے پر گیا۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو کی روٹی اور شوربا پیش کیا جس میں لوکی اور گوشت کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوکی کے ٹکڑے پیالے میں چاروں طرف تلاش کر رہے ہیں بس اس دن سے لوکی مجھے محبوب ہو گئی۔ اس حدیث کو شیخین نے روایت کیا ہے اور ترمذی کی ایک روایت میں ہے انسؓ فرماتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے جس سالن میں بھی میں لوکی ڈلوا سکتا تھا ڈلوا لیتا تھا۔

(۹۲) عام محبت بھی جب رسوخ پیدا کر لیتی ہے تو نفسیات وطبیعات بلکہ شکل وشباہت پر اس کا اثر پڑنے لگتا ہے جس محبت کا نام ایمان ہے اس میں چونکہ عقیدت بھی شامل ہو جاتی ہے اس لئے اس کی تاثیر بھی کچھ لو ہے۔ شیخ بدرالدین عینی لکھتے ہیں۔ ذکر اصحابنا ان من قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یحب القرع فقال آخر لا احب القرع یخشی علیہ من الکفر (ج ۵ ص ۲۴۶) ہمارے اصحاب نے بیان کیا ہے اگر کوئی شخص کہے کہ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

الزھادۃ فی الدنیا وایثار الفقر علی الغنی

(۹۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مُغَفَّلٍ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِنِّیْ اُحِبُّکَ قَالَ اُنْظُرْ مَا تَقُوْلُ فَقَالَ وَاللّٰہِ اِنِّیْ لَاُحِبُّکَ ثَلٰثَ مَرَّاتٍ قَالَ اِنْ کُنْتَ صَادِقًا فَاَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا لَلْفَقْرُ اَسْرَعُ اِلٰی مَنْ یُّحِبُّنِیْ مِنَ السَّیْلِ اِلٰی مُنْتَہَاہُ رواہ الترمذی

دنیا سے بے رغبتی اور فقر کی زندگی کو ترجیح دینا

(۹۳) عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا میں آپ سے محبت رکھتا ہوں، آپ نے فرمایا دیکھ کیا کہتا ہے اس نے پھر کہا خدا کی قسم میں آپ سے محبت رکھتا ہوں تین بار کہا۔ آپ نے فرمایا اگر تو سچ بولتا ہے تو پھر فقر کی تکلیفوں کے لئے اپنے واسطے ایک آہنی جھول تیار کر لے کیونکہ فقر مجھ سے محبت رکھنے والے کی طرف اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آتا ہے جیسا نشیب میں رَو کا پانی۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور اس کو حسن غریب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لوکی پسند فرماتے تھے اور اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص بول اٹھے کہ مجھے تو لوکی پسند نہیں ہے تو اس بے محل انکار پر اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کے لئے امراض میں مبتلا ہونے اور اس پر صبر کے ثواب کا ذکر فرمایا تو ایک شخص نے کہا یارسول اللہ وما الاسقام واللہ ما مرضت قط فقال نعم عنا فلست منا (ابوداؤد) یارسول اللہ میں تو بیماری کا نام بھی نہیں جانتا اور نہ خدا کی قسم اب تک کبھی بیمار پڑا ہوں آپ نے فرمایا جا ہمارے پاس سے اٹھ جا تیرا ہم سے کوئی واسطہ نہیں یا جیسا صحیح مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجدوں میں جانے سے روکنے کی ممانعت کی ہے ان کے ایک فرزند نے کہا ہمارے زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں ہم تو ضرور روکیں گے اس پر ابن عمرؓ نے اتنا برا بھلا کہا کہ شاید کبھی عمر بھر کسی کو نہ کہا تھا۔ اور مسند امام احمد میں ہے کہ پھر مرتے دم تک ان کی بات نہ کی۔ ان سب مقامات پر بات خواہ کتنی ہی سچی ہو مگر انداز چونکہ گستاخانہ تھا اس لئے دونوں جگہ عتاب ہوا۔ ایسے وقت جبکہ رسول مسلمانوں کے حق میں بیماری کے فضائل بیان کر رہا ہے یہ کہنا کہ میں تو بیماری کو جانتا بھی نہیں کسے کہتے ہیں یا حدیث رسول سن کر یہ کہنا کہ ہم تو روکیں گے خود رسول اور حدیث رسول کا صورۃً مقابلہ کرنا ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ چیز کو سن کر فوراً یہ کہنا کہ مجھے پسند نہیں انتہائی گستاخی و بدتہذیبی ہے اسی لئے امام ابویوسفؒ نے تو ایسے شخص کے قتل کا حکم دیدیا تھا۔ اگر حب ایمانی اس درجہ پیدا ہو چکی ہے تو بالیقین آپ کے اوضاع و اطوار نفسیات وطبعیات بھی بدل جائیں گے اگر یہ مقام حاصل نہیں ہے تو معارضہ و مقابلہ کرنے کی حاجت بھی کیا ہے اگر آپ کو لوکی مرغوب نہیں ہے نہ سہی، انگریز کی محبت میں آپ نے اپنے لباس وطعام شکل وشباہت کا جو حال بنا ڈالا ہے ایک مرتبہ ذرا اس پر غور کر لیجئے۔ پھر جو حال یہاں آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرغوبات کے متعلق سنا یہی حال مکروہات کا بھی سمجھ لینا چاہئے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

وقال هذا حديث حسن غريب وفي حديث ابي سعيد وحسن اِنَّ الْفَقْرَ اِلٰى مَنْ يُّحِبُّنِيْ مِنْكُمْ اَسْرَعُ مِنَ السَّيْلِ مِنْ اَعْلَى الْوَادِيْ۔

ارتكاب المعصية لا ينافى محبة الله ورسوله

(۹۴) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ رَجُلًا عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِسْمُهٗ عَبْدُ اللّٰهِ وَكَانَ يُلَقَّبُ حِمَارًا وَكَانَ يُضْحِكُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ

کہا ہے اور ابو سعیدؓ کی حدیث میں یہ لفظ ہیں بلاشبہ فقر اس شخص کی طرف جو تم میں مجھ سے محبت رکھتا ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ آتا ہے جیسا وادی کی بلندی سے پانی۔

گنہگار کو بھی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت ہو سکتی ہے

عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص تھا اس کا نام عبد اللہ اور اس کا لقب حمار تھا۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہنسایا کرتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(حاشیہ صفحۂ گذشتہ) (۹۳) (تجفاف) لغت میں اس زرہ یا جھول کو کہتے ہیں جو جنگ میں گھوڑے کی حفاظت کیلئے اس پر ڈالدی جاتی ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوائے محبت رکھتا ہے اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ آپ کی ہمرنگ زندگی اختیار کرے اپنا پیٹ کاٹ کر بھوکوں کو کھانا کھلادے اور خود بھوکا رہ جائے۔ پانی دوسرے پیاسوں کو پلادے اور خود پیاسا رہ جائے۔ اپنی سواری دوسرے ضرورت مند پیادوں کو دیدے اور خود پیدل چلے۔ غرض اپنا مال و اسباب سب دوسروں کو تقسیم کر ڈالے ان کو غنی بنادے اور خود فقیر بن جائے۔

حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کے رسول کی محبت رکھنے والے فقیر ہی ہوتے ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ دوسروں کی ہمدردی میں وہ اپنی زندگی خود فقیرانہ بنالیتے ہیں۔ دنیا میں ہر غمزدہ کا غم ان کے لئے موجب غم ہوتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ دوسرے بھوکے ہوں یہ شکم سیر دوسرے پیاسے ہوں یہ سیراب، دوسرے ننگے پھریں اور یہ لباس فاخرہ پہنیں۔ اب اگر کوئی شخص اتنا وسیع ظرف رکھتا ہے کہ وہ اپنی تمام راحت و رفاہیت کو دوسروں پر قربان کردے تو بیشک اس کو آپ کی محبت کا دعویٰ کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سچے مدعیٔ محبت کو مصائب و آلام کی یہ تمام وادیاں عبور کرنی ہونگی اور خوشی عبور کرنی ہوں گی۔ اب اگر کوئی باہمت ہے تو آئے اور اس میدان میں قدم رکھے ورنہ وہ اپنے دعوے میں سچا نہیں سمجھا جاسکتا ع کوتاہ دیدگان ہمہ راحت طلب کنند ۔ عاشق بلا کہ راحتِ او در بلا رقست

اس کے بعد اب اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ اور اولیاء کرام کے تذکرہ پڑھئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلام میں دولت و حشمت فرمانے کے لئے ہمیشہ ایک رد و بنگ کی حیثیت میں بھی گئی ہے۔

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَدْ جَلَدَہٗ فِی الشَّرَابِ فَاُتِیَ بِہٖ یَوْمًا فَاَمَرَ بِہٖ فَجُلِدَ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ اَللّٰھُمَّ الْعَنْہُ مَا اَکْثَرَ مَا یُؤْتٰی بِہٖ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَلْعَنُوْہُ فَوَاللّٰہِ مَا عَلِمْتُ اَنَّہٗ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ۔ رواہ البخاری

ثواب محبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۹۴) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَتَی السَّاعَۃُ

شراب پینے کے جرم میں ایک مرتبہ اس کے کوڑے لگانے کا حکم دے چکے تھے۔ ایک دن پھر اسی شکایت میں وہ دوبارہ گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پیش ہوا پھر اس کے کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا گیا کوڑے لگا دیئے گئے اس پر ایک شخص بولا یہ شراب کے مقدمہ میں کتنا کثرت سے گرفتار کر کے لایا جاتا ہے (اور باز نہیں آتا) اے خدا تو اس پر لعنت فرما۔ یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس پر لعنت مت برساؤ بخدا میں جانتا ہوں کہ یہ خدا اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ

(۹۴) انس بن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا

(۹۳) ہر دور میں کچھ لوگوں کے مزاج میں خوش طبعی کا مضمون ہوتا ہے اور اپنے اسی طبعی مزاج کے مطابق وہ جہاں بیٹھتے ہیں ہنسی کی باتیں کیا کرتے ہیں۔ اگر اتنی بات اپنے حدود میں رہ کر ہو تو چنداں معیوب بھی نہیں۔ فتح الباری میں ان کے مذاق کی ایک دلچسپ داستان بھی مذکور ہے ملاحظہ کیجئے۔ حافظ ابن حجرؒ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خیبر کا ہے۔ عرب کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی اور اسی لئے اس کی حرمت بھی آہستہ آہستہ نازل ہوئی ہے۔ اسی درمیان میں بعض آزاد طبائع سے اس میں تساہل ہو گیا ہے مگر اس تساہل کا شرعی نتیجہ پھر بھی انھیں بھگتنا پڑا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی نو آموز، کمزور فطرت، کسی صبر آزما منظر کو دیکھ کر استقامت نہیں دکھلا سکا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس پر لعنت برسائی جائے اور بجائے دعا کے اس کے لئے اور بد دعائیں کی جائیں۔ یہ ممکن ہے اور بہت ممکن ہے کہ ایک طرف قلب میں خدا و رسول کی محبت کی تڑپ بھی موجود ہو اور دوسری طرف تقاضائے محبت کے علمی استحضار میں کچھ قصور رہے اور اس تڑپ کا پورا پورا اقتضاء پورا نہ ہو سکے۔

اسی قسم کے ایک دوسرے واقعہ میں مذکور ہے کہ صحابہؓ نے اس شخص کو اخزاک اللہ (خدا تجھے رسوا کرے) کہہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا تقولوا ھکذا، لا تعینوا علیہ الشیطان (بخاری) اور دوسری روایت میں ہے ولکن قولوا اللھم اغفر لہ اللھم ارحمہ (ابو داؤد) یہ کلمات مت کہو اور اس کے مقابلہ میں شیطان کی اعانت مت کرو۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ مَا اَعْدَدْتَ لَهَا قَالَ مَا اَعْدَدْتُ لَهَا مِنْ كَثِيْرِ صَلٰوةٍ وَّلَا صَوْمٍ وَّلَا صَدَقَةٍ وَلٰكِنِّيْ اُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ قَالَ اَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ۔ (رواہ البخاری)

قیامت کب آئے گی آپ نے فرمایا قیامت کے لئے بھلا تو نے کیا تیار کر رکھا ہے؟ اس نے عرض کیا کچھ نہیں نہ بہت سی نمازیں ہیں نہ روزے اور نہ صدقے، ہاں ایک بات ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تو پھر (قیامت میں) تو ان کے ہی ساتھ ہو گا جن سے تجھے محبت ہے (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ بھی اس کو شراب پلا کر رسوا کرنا چاہتا تھا۔ تم بھی بددعائیں کر کے اس کا مقصد پورا کرنا چاہتے ہو مناسب یہ ہے کہ اس کے لئے مغفرت اور رحم کی دعا کرو، بالخصوص جبکہ وہ شراب خواری کی پاداش بھگت بھی چکا ہے، امام بخاریؒ نے اس حدیث پر حسب ذیل باب قائم کیا ہے۔ بلب مایکرہ من لعن شارب الخمر وانہ لیس بخارج من الملۃ شراب خوار پر لعنت کرنا پسندیدہ نہیں ہے (بالخصوص جبکہ اس پر حد بھی قائم ہو چکی ہو) اور اس وجہ سے وہ خارج از ملت بھی نہیں ہوتا۔ امام بخاریؒ کی غرض کی تفصیل فتح الباری میں دیکھی جائے۔ معتزلہ کے لئے بالخصوص یہ حدیث قابل غور ہے جو مرتکب کبیرہ کو ایمان کے دائرہ سے باہر سمجھتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) ۱۹۲ حدیث کا آخری جملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعہ پر ارشاد فرمایا ہے۔ ازانجملہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں جبکہ صحابہ نے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا تھا جو کسی جماعت سے محبت تو رکھتا ہے مگر ان کے سے عمل نہیں کر سکا۔ آپ نے انہیں یہی جواب دیا تھا المرء مع من احب قیامت میں آدمی اسی کے ساتھ ہو گا جس سے دنیا میں محبت رکھتا تھا۔ یہاں بھی اسی جملہ کا اعادہ فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اخروی آئین میں محبت کا صلہ معیت ہے اور درحقیقت ایک عاشق کی منتہائے تمنا اس کے سوا اور ہے بھی کیا۔ اسی لئے بعض روایات میں حدیث مذکور کے آخر میں ہے قَالَ اَنَسٌ فَمَا رَأَيْتُ الْمُسْلِمِيْنَ فَرِحُوْا بِشَيْءٍ بَعْدَ الْاِسْلَامِ فَرَحَهُمْ بِهَا۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اسلام کے بعد صحابہ کو اتنا خوش ہوتے ہوئے کسی بات پر نہیں دیکھا جتنا کہ اس خوشخبری پر۔ صاحب مشکوٰۃ نے بیہقی کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے اس معیت کی مزید تفصیل معلوم ہوتی ہے۔ عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لو ان عبدین تحابا فی اللہ عزوجل واحد فی المشرق واٰخر فی المغرب لجمع اللہ بینہما یوم القیامۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر دو شخص ایک مشرق اور دوسرا مغرب کا رہنے والا خدا کے لئے محبت کریں تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ دونوں کو ایک جگہ جمع کر دے گا۔ ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں المرء علی دین خلیلہ فلینظر احدکم من یخالل۔ آدمی اپنے دوست کا دین اختیار کرتا ہے اس لئے خوب دیکھ بھال کر دوستی کرے کس سے کرتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ محبت کا ثمرہ صرف اخروی معیت نہیں ہے بلکہ اس معیت کے آثار اسی دنیا سے شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر آخرت کی معیت اسی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ جس طرح محبت کا نتیجہ معیت ہے اسی طرح معیت کا نتیجہ محبت ہے۔ اگر صحیح طور پر کسی کی معیت میسر آجائے تو اس کی محبت بھی پیدا ہونا لازمی ہے اس لئے جس طرح دوستی کرنے میں احتیاط ضروری ہے اسی طرح معیت میں بھی احتیاط لازم ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ غیر جنس کی معیت اس کی محبت کا موجب بن جائے۔ یہ اصول صرف آخرت کے لئے نہیں دنیوی زندگی کے لئے بھی بہت کار آمد ہیں۔

(۹۵) عَنْ صَفْوَانَ بْنِ قُدَامَةَ قَالَ هَاجَرْتُ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَتَيْتُهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ نَاوِلْنِيْ يَدَكَ اُبَايِعُكَ فَنَاوَلَنِيْ يَدَهٗ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّيْ اُحِبُّكَ قَالَ الْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (رواه القاضی فی الشفاء)

(۹۶) عَنْ عَائِشَةَ كَانَ رَجُلٌ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَنْظُرُ اِلَيْهِ لَا يَطْرِفُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا بَالُكَ قَالَ بِاَبِيْ اَنْتَ وَاُمِّيْ اَتَمَتَّعُ بِالنَّظَرِ اِلَيْكَ فَاِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ رَفَعَكَ اللّٰهُ بِتَفْضِيْلِكَ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا (رواه الطبرانی وابن مردویہ کما فی الشفاء)

(۹۵) صفوان بن قدامہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں ہجرت کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ لائیے اپنا ہاتھ لائیے میں آپ سے بیعت کروں۔ آپ نے اپنا دستِ مبارک بڑھایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ سے محبت ہے آپ نے فرمایا جس سے محبت ہوگی، آدمی اسی کے ساتھ ہوگا۔ (اس حدیث کو شفا میں روایت کیا ہے)

(۹۶) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ٹکٹکی لگائے ایک نظر دیکھ رہا تھا پلک تک نہ جھپکاتا تھا آپ نے فرمایا تجھے یہ کیا ہوگیا ہے اس نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا ہوں جب قیامت آئے گی اس وقت تو اللہ تعالیٰ آپ کی فضیلتوں کی وجہ سے آپ کو بلند بلند مراتب مرحمت فرمائے گا (پھر ہم کہاں اور آپ کہاں) اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ جو اللہ تعالیٰ اور رسول کی حکم برداری کریں گے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہی ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی نبی، صدیق، شہداء، اور صالحین اور یہ بہت اچھے ساتھی ہیں۔ (اس حدیث کو طبرانی اور ابنِ مردویہ نے روایت کیا ہے)۔

(۹۵) احادیث میں محبت کی جزا معیت بتلائی گئی ہے اور قرآن کریم میں معیت اطاعت کا صلہ قرار دیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح محبت اطاعت ہی کا نام ہے۔ دعویٰ محبت اور نافرمانی یہ دو باتیں جمع نہیں ہو سکتیں۔ نافرمانی یہ ہے کہ جان بوجھ کر خلاف کرنا، بھول، چوک، غلطی، فطری کمزوری نافرمانی نہیں ہے اسی لئے پہلی صورت میں ندامت نہیں ہوتی اور ان سب صورتوں میں ندامت ہوتی ہے پھر محبت کے بھی مراتب ہیں ہر مرتبہ کا تقاضہ علیحدہ ہے اس کے ثمرات بھی جدا ہیں اور ان مراتب کے بقدر معیت کے بھی مراتب ہیں جس کی محبت جتنی بھی اور زیادہ ہوگی اس کو معیت بھی اسی کے موافق نصیب ہوگی۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

توقیر النبی صلی اللہ علیہ وسلم واجلالہ

(۹۷) قَالَ عَمْرُو بْنُ الْعَاصِ مَا كَانَ اَحَدٌ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا اَجَلَّ فِيْ عَيْنِيْ وَمَا كُنْتُ اُطِيْقُ اَنْ اَمْلَأَ عَيْنِيْ مِنْهُ اِجْلَالًا لَّهُ حَتّٰى لَوْ قِيْلَ لِيْ صِفْهُ مَا اسْتَطَعْتُ اَنْ اَصِفَهُ (رواہ فی الشفا وشرح المواھب)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر و تعظیم کرنا

(۹۷) عمرو بن العاص کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مجھے کوئی محبوب نہ تھا اور نہ آپ سے زیادہ میری آنکھوں میں کوئی بزرگ و برتر تھا میں آپ کے جلال و بزرگی کی وجہ سے آپ کو آنکھیں بھر کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا حتی کہ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ کیسے تھے تو میں آپ کی صورت بیان نہیں کر سکتا۔ (اس حدیث کو شفا اور شرح مواہب میں روایت کیا ہے)۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) یہ عجیب بات ہے کہ قرآن کریم نے مطیعین کے لئے صالحین سے لیکر انبیاء علیہم السلام کی معیت تک کا وعدہ فرمایا ہے مگر کسی ایک جگہ بھی نبوۃ کا وعدہ نہیں فرمایا صحابہ کرام دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی تھے ان میں صدیق، شہید، صالح بہت ہوئے مگر نبی کوئی نہیں بنا۔ پس معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ رہنے سے نبوت نہیں ملتی یہ صرف خدائے تعالیٰ کے عطا کی بات ہے اور یہ ہم کو بتلا دیا گیا ہے کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ منصب کسی کو نہیں ملے گا بلکہ دنیا ہی آپ کی رسالت پر ختم ہو جائے گی۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) (۹۷) محبت و اجلال دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایمان بالرسول یہ ہے کہ رسول کی محبت اتنی ہو کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو سکے اور نظروں میں اس کی عقیدت و بزرگی اتنی ہو کہ دوسرے کے لئے اس میں گنجائش نہ ہو۔ بے صرف محبت جرأت و گستاخی ہے اور محض جلال و عظمت بے نمک عقیدت ہے۔ محبت میں ادب اور عظمت میں محبت ملحوظ رہے ایمان ہے۔ قرآن کریم اور احادیث کو پڑھو تو دونوں تم کو یہی سکھلائیں گے کہ انسانی فرض یہ ہے کہ وہ خدا و رسول کی پوری عظمت کرے مگر وہ عظمت نہیں جس میں صرف ادب ہو بلکہ وہ عظمت جس میں شوق بھی شامل ہو۔ مسلمانوں میں ایک فرقہ نے محبت میں اتنا غلو کیا کہ گستاخ بن گئے یہ جاہل صوفی ہے اور ایک فرقہ اعتقادِ عظمت میں اتنا بڑھا کہ محبت کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا یہ ملائے خشک ہے۔ راہِ صواب ان دونوں کے درمیان ہے۔ رہے وہ لوگ جو رسول کو صرف ایک ریفارمر اور لیڈر کی حیثیت تک سمجھتے ہیں وہ نہ اس کی عظمت سے آشنا ہیں نہ محبت سے۔ جس ایمان میں خدا و رسول کے حق نمک خواری کی معرفت بھی حاصل نہ ہو وہ کیا ایمان ہے اصل ایمان وہ ہے جو عمرو بن العاص نے حدیث مذکور میں بیان کیا ہے بقول شاعر۔ اشتاقہ فاذا بدا۔ اطرقت من اجلالہ۔ میں اس کے دیدار کا مشتاق رہتا ہوں مگر جب وہ جلوہ نما ہوتا ہے تو مارے اس کے جلال و بزرگی کے میرا سر نیچا ہو جاتا ہے اور دیدار سے بہرہ محروم رہ جاتا ہوں پس ایمان کو اس اشتیاق و اجلال کے درمیان سمجھنا چاہیے۔

(۹۸) عَنْ أَنَسٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَخْرُجُ عَلٰی أَصْحَابِہٖ مِنَ الْمُھَاجِرِیْنَ وَالْأَنْصَارِ وَھُمْ جُلُوْسٌ فِیْھِمْ أَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ فَلَا یَرْفَعُ أَحَدٌ مِنْھُمْ إِلَیْہِ بَصَرَہٗ إِلَّا أَبُوْبَکْرٍ وَعُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا فانھما کانا یَنْظُرَانِ إِلَیْہِ وَیَنْظُرُ إِلَیْھِمَا وَیَتَبَسَّمَانِ إِلَیْہِ وَیَتَبَسَّمُ إِلَیْھِمَا (رواہ الترمذی)

(۹۹) عَنْ أُسَامَۃَ بْنِ شَرِیْکٍ قَالَ أَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَأَصْحَابُہٗ حَوْلَہٗ کَأَنَّمَا عَلٰی رُؤُوْسِھِمُ الطَّیْرُ (رواہ الاربعۃ وصححہ الترمذی ورواہ الترمذی فی الشمائل فی باب خلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایضا۔

(۹۸) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ مہاجرین و انصار مع ابوبکر و عمرؓ کے (جمع ہوتے تھے) آپ ان کے پاس باہر تشریف لاتے تو ان میں کوئی ایسا شخص نہ ہوتا جو آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا سوائے ابوبکر و عمر کے کہ یہ دونوں صاحبان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کرتے اور آپ انھیں دیکھا کرتے۔ یہ آپ کو دیکھ دیکھ کر مسکرایا کرتے آپ انھیں دیکھ دیکھ کر مسکرایا کرتے تھے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۹۹) اسامۃ بن شریکؓ فرماتے ہیں کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کیا دیکھتا ہوں کہ آپ کے صحابہ آپ کے ارد گرد (ادباً) اس طرح بے حس و حرکت خاموش بیٹھے ہیں گویا ان کے سروں پر کوئی پرندہ (گھوم رہا) ہے۔ (اس حدیث کو چار کتابوں میں روایت کیا ہے اور ترمذی نے اس کو صحیح کہا ہے)۔

۹۸) خالص محبت میں تکلف کی حدود اٹھ جاتی ہیں مگر ادب کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ ابوبکرؓ و عمرؓ جب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے نشاطِ خاطر کا احساس کر لیتے تو شوق نظارہ کے لئے سب سے پہلے ان کی نظریں بے تاب ہوتیں اور جب ذرا طور بدلے ہوئے دیکھتے تو سب سے پہلے آثار خوف ان ہی پر ظاہر ہوتے۔ ذوالیدین کے طویل قصہ میں جہاں آپ کو نماز کے اندر ایک سہو پیش آگیا تھا۔ راوی نے خاص طور پر ان حضرات کا ذکر کر کے کہا ہے فھابا ہ ان یکلماہ۔ یہ دونوں حضرات بات کرتے ہوئے ڈرے اور انھیں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سہو کے متعلق لب کشائی کرتے ہاں ایک شخص ذوالیدین تھے انھوں نے باادب واقعہ عرض کیا۔ یہ ادب کے ساتھ الفت اور الفت کے ساتھ ادب کے رموز ہیں۔ ذوق ایں بادہ نہ دانی بخدا تا نہ چشی۔

۹۹) کانما علی رؤسھم الطیر۔ یہ ایک مثل ہے جو عرب میں انتہائی سکون کے لئے بیان کی جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ شکاری جب کسی پرندہ کے شکار کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے اعضاء کو ساکن رکھنے کی انتہائی کوشش کیا کرتا ہے۔ پھر ہر سکون کے موقعہ پر اس کو بطور مثل استعمال کرنے لگے ہیں۔

(۱۰۰) قَالَ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ حِيْنَ وَجَّهَتْهُ قُرَيْشٌ إِلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْقَضِيَّةِ وَرَأَى مِنْ تَعْظِيْمِ أَصْحَابِهِ لَهٗ مَا رَأَى أَنَّهٗ لَا يَتَوَضَّأُ إِلَّا ابْتَدَرُوْا وَضُوْءَهٗ وَكَادُوْا أَنْ يَقْتَتِلُوْا عَلَيْهِ وَلَا بَصَقَ بُصَاقًا وَلَا تَنَخَّمَ نُخَامَةً إِلَّا تَلَقَّوْهَا بِأَكُفِّهِمْ فَدَلَكُوْا بِهَا وُجُوْهَهُمْ وَلَا تَسْقُطُ مِنْهُ شَعْرَةٌ إِلَّا ابْتَدَرُوْهَا وَإِذَا أَمَرَهُمْ بِأَمْرٍ ابْتَدَرُوْا أَمْرَهٗ وَإِذَا تَكَلَّمَ خَفَضُوْا أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَهٗ وَلَا يُحِدُّوْنَ إِلَيْهِ النَّظَرَ تَعْظِيْمًا لَهٗ فَلَمَّا رَجَعَ إِلَى قُرَيْشٍ قَالَ يَا مَعْشَرَ قُرَيْشٍ إِنِّيْ جِئْتُ كِسْرٰى فِيْ مُلْكِهٖ وَقَيْصَرَ فِيْ مُلْكِهٖ وَالنَّجَاشِيَّ فِيْ مُلْكِهٖ وَإِنِّيْ وَاللّٰهِ مَا رَأَيْتُ مَلِكًا فِيْ قَوْمٍ قَطُّ مِثْلَ مُحَمَّدٍ فِيْ أَصْحَابِهٖ۔ هذا بعض من حديث طويل رواه البخاري ومن هذا الماادنت قريش لعثمان فی الطواف بالبيت حين وجهه فی القضية ابیٰ وقال ما كنت لافعل حتی يطوف به رسول الله صلی الله عليه وسلم ذكره اصحاب السير۔

(۱۰۱) وَفِيْ حَدِيْثِ طَلْحَةَ أَنَّ أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالُوْا لِأَعْرَابِيٍّ جَاهِلٍ سَلْهُ عَمَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَكَانُوْا يَهَابُوْنَهٗ وَيُوَقِّرُوْنَهٗ فَسَأَلَهٗ فَأَعْرَضَ

(۱۰۰) ساتویں سال جب قریش نے عروۃ بن مسعود کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صلح کی گفتگو کرنے کے لئے بھیجا تو اس نے آپ کے صحابہ کی حیرت انگیز تعظیم کا جو نقشہ دیکھا وہ ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ وضو کرتے ہیں تو آپ کے وضو کے پانی پر خلقت اس طرح ٹوٹ پڑتی ہے کہ اب ان میں جنگ ہوئی اور جب آپ کا بلغم یا تھوک گرتا ہے تو ہاتھوں ہاتھ لے کر اپنے چہروں اور جسموں پر مل لیتے ہیں جب ان کا کوئی بال گرتا ہے تو جلدی سے اس کو لپک لے جاتے ہیں جب آپ کوئی حکم دیتے ہیں تو اس کو پورا کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں جب بات کرتے ہیں تو اُن پر خاموشی چھا جاتی ہے کوئی شخص نظر بھر کر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔ عروہ جب واپس ہوا تو اس نے کہا اے گروہ قریش میں نے کسریٰ و قیصر و نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، خدا کی قسم کسی بادشاہ کو اپنی رعایا کے درمیان ایسا باعظمت و رعب نہیں دیکھا جیسا اپنے رفقا میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ یہ بخاری کی طویل روایت کا ایک مختصر ٹکڑا ہے۔ اس واقعہ میں اصحاب سیر نے یہ اور ذکر کیا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جانب سے عثمان غنیؓ کو قریش کے پاس بھیجا اور ان سے عمرہ ادا کرنے کی اجازت مانگی تو انھوں نے کہا اے عثمان اگر صرف تم چاہو تو طواف کر سکتے ہو انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طواف کرنے سے پیشتر میں طواف کر لوں۔

(۱۰۱) طلحہؓ کے قصہ میں ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ آپ کی ہیبت و عظمت کی وجہ سے

عَنْهُ اِذْ طَلَعَ طَلْحَةُ فَقَالَ هٰذَا مِمَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ (رواه الترمذی وحسنہ)

(۱۰۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْحَلَّاقُ يَحْلِقُهٗ وَقَدْ اَطَافَ بِهٖ اَصْحَابُهٗ فَمَا يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَقَعَ شَعْرَةٌ اِلَّا فِيْ يَدِ رَجُلٍ۔ (رواه مسلم فی حدیث طویل)

(۱۰۳) فِيْ حَدِيْثِ قَيْلَةَ فَلَمَّا رَاَيْتُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَالِسًا الْقُرْفُصَاءَ اُرْعِدْتُ مِنَ الْفَرَقِ۔ (رواه الترمذی فی الشمائل)

آپ سے براہِ راست سوال کرتے ہوئے ڈرتے تھے اس لئے انھوں نے ایک دیہاتی شخص سے کہا کہ وہ آپ سے دریافت کرلے کہ قرآنِ کریم میں فمنھم من قضیٰ نحبہ کا مصداق کون شخص ہے۔ اس نے آپ سے پوچھا مگر آپ نے اُسے جواب نہ دیا اس اثنا میں طلحہ آنکلے تو آپ نے فرمایا یہ وہ شخص ہیں جو آیتِ بالا کا مصداق ہیں (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

(۱۰۲) انسؓ فرماتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ حجام آپ کا سر مونڈ رہا ہے صحابہ آپ کو گھیرے ہوئے بیٹھے ہیں اور مقصد صرف یہ ہے کہ جو بال آپ کے سر مبارک سے گرے، وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پڑ جائے۔ (اس حدیث کو مسلم میں روایت کیا ہے)

(۱۰۳) قیلہ ایک طویل حدیث میں بیان کرتی ہیں کہ جب میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرفصاء کی شکل پر بیٹھا ہوا دیکھا تو مارے خوف کے میرے جسم پر لرزہ پڑ گیا (اس حدیث کو ترمذی نے شمائل میں روایت کیا ہے)

---

(۱۰۱) پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے: ان میں کتنے لوگ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے جاں نثاری کا جو عہد کیا تھا سچ کر دکھایا۔ پھر ان میں سے بعض تو اپنی منت پوری کر گئے اور بعض ایسے ہیں جو ابھی منتظر ہیں۔ یہاں منافقین کی عہد شکنی کے برخلاف مسلمانوں کے عہد پورا کرنے کا ذکر ہے یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اللہ و رسول کو زبان دی تو اسے پورا بھی کر دیا۔ ان میں سے کچھ تو اپنی منت پوری کر گئے یعنی جہاد میں جان دے چکے جیسے بدر و احد کے شہداء اور کچھ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں قربان ہونے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ یہاں حضرت طلحہؓ کو آپ نے ممن قضیٰ نحبہ کی فہرست میں شمار کیا گویا اسی زندگی میں ان کو شہید قرار دیدیا۔ جامع ترمذی میں جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جو زمین پر چلتا پھرتا شہید دیکھنا چاہے وہ طلحہؓ کو دیکھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ یہ وہ شخص ہیں جن کا ہاتھ جنگِ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت میں شل ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کی جاں نثاری کی وجہ سے ان کو اس فہرست میں شمار کر لیا گیا جو شہید ہو چکے تھے۔

(۱۰۲) اس حدیث سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار کے ساتھ تبرک کی اصل بھی ثابت ہوتی ہے۔ خفاجی شرح شفاء میں فرماتے ہیں کہ آپ کا حلق کرانا صرف حج و عمرہ میں ثابت ہوتا ہے۔ حجۃ الوداع میں آپ کے بال مونڈنے اور ناخن تراشنے والے کا نام معمر بن عبداللہ عدوی کا ہے۔ ابنِ اثیر نے ان کا نام خراش بن امیہ لکھا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(۱۰۴) عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ كَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْرَعُوْنَ بَابَهٗ بِالْاَظَافِيْرِ (رواه الحاكم والبيهقي)

(۱۰۵) عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ لَقَدْ كُنْتُ اُرِيْدُ اَنْ اَسْاَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الْاَمْرِ فَاُؤَخِّرُ سَنَتَيْنِ مِنْ هَيْبَتِهٖ (رواه ابو يعلى وصححه)

النهي عن رفع الصوت فوق صوت النبي صلى الله عليه وسلم

(۱۰۶) عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِي ابْنُ اَبِيْ مُلَيْكَةَ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ الزُّبَيْرِ اَخْبَرَهُمْ

---

(۱۰۴) مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ (ضرورت کے وقت) آپ کا دروازہ ناخنوں سے کھٹکھٹایا کرتے تھے۔ (حاکم ۔ بیہقی)

(۱۰۵) براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ میں کوئی بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنا چاہتا تو مارے خوف کے دو دو سال تک نہ پوچھ سکتا تھا۔ (اس حدیثؓ کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بلند آواز سے بولنے کی ممانعت

(۱۰۶) ابن جریج روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ عبد اللہ بن زبیرؓ نے ان سے بیان کیا، بنو تمیم کا ایک قافلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو ابو بکرؓ بولے قعقاع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور جنہوں نے مقام جعرانہ میں سر مبارک مونڈا ہے ان کا نام ابو ہند ہے۔ [۱]

(۱۰۳) قرفصاء ایک خاص قسم کی سرسری اور نہایت معمولی نشست ہے اس کی صورت یہ ہے کہ اپنی رانیں پیٹ سے لگالی جائیں اور ہاتھوں کو پنڈلیوں سے باندھ کر سرین کے بل بیٹھ جائے یہ ایک عامیانہ اور غریبوں کی نشست ہے جس کی نظروں میں کسی کی ہیبت و عظمت سما جاتی ہے وہ جس انداز میں بھی دیکھے ہیبت زدہ ہو جاتا ہے یا یوں کہئے کہ خدائی ہیبت ہر حال میں اپنا اثر دکھلاتی ہے یہاں تکلف کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۱۰۴) اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا دروازہ لکڑی کا تھا۔ خفاجی نے یہاں کچھ جوابدہی کی ہے ہمارے نزدیک دروازے کی دیوار کے کھٹکنے پر بھی حدیث کے الفاظ صادق آسکتے ہیں عرف میں دروازہ کی دیوار کو بھی دروازہ کہہ دیا جاتا ہے اس لئے کوئی ضروری نہیں ہے کہ آپ کا دروازہ لکڑی کا ہو بلکہ اگر دروازہ پر پردہ پڑا ہوا ہو جب بھی یہ حدیث بلا تکلف صادق آسکتی ہے

(۱۰۵) یہ اختلاف حالات اور اشخاص کی بات ہے اسے کلیہ بنانا نہیں چاہئے۔

---

[۱] نسیم الریاض ج ۳ ص ۴۳۹۔

اَنَّہٗ قَدِمَ رَکْبٌ مِنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ اَمِّرِ الْقَعْقَاعَ بْنَ مَعْبَدٍ وَقَالَ عُمَرُ اَمِّرِ الْاَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ فَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ مَا اَرَدْتَّ اِلٰی اَوْ اِلَّا خِلَافِیْ فَقَالَ عُمَرُ مَا اَرَدْتُّ خِلَافَکَ فَتَمَارَیَا حَتّٰی ارْتَفَعَتْ اَصْوَاتُہُمَا فَنَزَلَ فِیْ ذٰلِکَ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ حَتَّی انْقَضَتِ الْاٰیَۃُ رواہ البخاری

وفی روایۃ نافع فما کان عمر یسمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعد ھذہ الآیۃ حتی یستفہمہ

وفی الفتح عن ابی بکر قلت یا رسول اللہ آلیت ان لا اکلمك الا کاخی الاسرار۔

(۱۰۷) عَنْ اَنَسٍ قَالَ کَانَ ثَابِتُ بْنُ قَیْسِ بْنِ شَمَّاسٍ خَطِیْبَ الْاَنْصَارِ فَلَمَّا نَزَلَتْ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ اِلٰی اٰخِرِ الاٰیۃ جَلَسَ ثَابِتٌ فِیْ بَیْتِہٖ

بن معبد کو ان کا امیر بنا دیجئے۔ عمرؓ بولے اقرع بن حابسؓ کو بنا دیجئے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا تم نے تو بس میری مخالفت ہی پر کمر باندھ رکھی ہے۔ عمرؓ نے فرمایا کہ میں آپ کی مخالفت نہیں کرتا (بلکہ میری رائے ہی ہے) دونوں میں جھگڑا بڑھ گیا حتی کہ ان کی آوازیں بلند ہوگئیں اس پر یہ آیت اتر آئی۔ اے لوگو جو ایمان لاچکے ہو خدا اور اس کے رسول کے سامنے اُن سے آگے نہ بڑھا کرو (بلکہ ہر بات میں ان کے فیصلہ کا انتظار کیا کرو) آخر آیت تک اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔ نافع جو اس حدیث کے دوسرے طریقہ میں ایک راوی ہیں، روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے بعد عمرؓ اتنی آہستہ گفتگو کرنے لگے کہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان سے دوبارہ دریافت نہ کرتے کچھ سمجھ میں نہ آتا کیا فرماتے ہیں۔ فتح الباری میں ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ اس آیت کے بعد میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں نے قسم کھالی ہے کہ اب میں آپ سے اس طرح آہستہ بات کیا کروں گا جیسے کوئی اپنا راز آہستہ آہستہ کہتا ہے۔

(۱۰۷) انسؓ فرماتے ہیں کہ ثابت بن قیسؓ انصار کے خطیب تھے جب یہ آیت نازل ہوئی۔ اے ایمان والو اپنی آواز نبی کی آواز پر بلند مت کرو۔ (آخر آیت تک) تو ثابت اپنے گھر بیٹھ رہے اور آپ کی خدمت

(۱۰۷) سورۂ حجرات کی ابتدائی کئی آیتیں بارگاہ نبوت کا ادب سکھلانے کے لئے اتری ہیں عرب اپنی سادہ فطرت سے ان دقیق آداب سے اب تک ناآشنا تھے جن کو نبوت کا نازک مقام مقتضی تھا۔ اسلام نے اگرچہ ان کو رفتہ رفتہ بھائی بھائی، ماں باپ اور تمام باہمی رشتوں کے آداب بتلائے۔ اس کے ساتھ ہی اب وقت آگیا تھا کہ انھیں خدا اور رسول کے وہ آداب بھی بتلا دیئے جائیں جن سے غفلت اختیار کرنا کئے کرائے اعمال کو اکارت کر دیتا ہے۔ ان میں سے ایک ادب یہ تھا کہ رسول کے سامنے اس طرح زور زور سے بیباکانہ گفتگو نہ کی جائے جیسے باہمی ایک دوسرے کے سامنے کی جاتی ہے اور نہ اس طرح اس کو پکارا جائے جیسا کہ آزادانہ ایک دوسرے کو نام لیکر پکارا جاتا ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

وَاحْتَبَسَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَعْدَ بْنَ مُعَاذٍ فَقَالَ مَا شَأْنُ ثَابِتٍ اَیَشْتَکِیْ فَاَتَاہُ سَعْدٌ فَذَکَرَ لَہٗ قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ ثَابِتٌ اُنْزِلَتْ ھٰذِہِ الْاٰیَۃُ وَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّیْ مِنْ اَرْفَعِکُمْ صَوْتًا عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَنَا مِنْ اَھْلِ النَّارِ فَذَکَرَ ذَالِکَ سَعْدٌ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلْ ھُوَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ (رواہ مسلم والبخاری مثلہ)

میں آنا جانا بند کردیا۔ آپ نے سعد بن معاذؓ سے دریافت کیا کہو ثابتؓ کیسے ہیں؟ کیا بیمار ہیں؟ سعدؓ اُن کے پاس آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریافت کرنے کا حال ان سے بیان کیا، ثابت بولے کہ اونچی آواز سے بولنے کی ممانعت نازل ہو چکی ہے اور تم لوگ جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں تم سب میں زیادہ میری ہی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ تو مجھے غم یہ ہے کہ میں کہیں دوزخی نہ ہوں سعدؓ نے آکر یہ بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی آپ نے فرمایا کہ وہ دوزخی نہیں بلکہ جنتی شخص ہیں۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ اور بخاری نے بھی اسی کے قریب روایت کیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) یہ طور و طریق احترام نبوت کے خلاف ہے اور جو نبوت کا احترام نہیں کرتا خطرہ ہے کہ اس کے عمل اکارت نہ ہو جائیں۔ ثابت بن قیس قدرۃً بلند آواز تھے یہ سن کر ڈر گئے، اور سمجھے کہ بارگاہِ نبوت میں یہ گستاخی مجھ سے بارہا سرزد ہو چکی ہے اس لئے میرا اب کہاں ٹھکانا ہوگا۔ رحمۃ للعالمین کو جب یہ خبر ملی تو اُن کی اس ادا پر آپ کا دل بھر آیا اور آپ نے اس ادب کی وجہ سے جس سے ان کا قلب معمور تھا ان کو جنت کی بشارت سنادی۔ اور ان کی اس بلند آوازی کو جو قدرۃً تھی قابلِ عفو سمجھا۔ معلوم ہوا کہ ادب کا اصل دارومدار قلب پر ہے پھر ظاہر میں اس کے لئے کچھ علامات بھی مقرر ہیں۔ اگر قلب کی گہرائیوں میں ادب موجود ہے تو ظاہر کی فروگذاشت سے اغماض کیا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب آپ کے کلام یعنی حدیث شریف کو سن کر اس کا معارضہ و مقابلہ کرنا اس کا مذاق اڑانا تن آسانی اور ہوا پرستی کے لئے اس کی تاویلات کرنا، یہ سب آپ کی ہی گستاخی کے برابر ہے۔ دنیا اگر کسی شاعر کا احترام کرتی ہے تو اس کے کلام کو بھی بنظرِ احترام دیکھتی ہے پھر انصاف کرو کہ کیا رسول کا مرتبہ ایک شاعر سے بھی کم ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے اور اپنے رسول کے صحیح احترام و ادب کی توفیق دے

آمین یا رب العالمین

النهی عن رفع الصوت فی مسجد رسول الله صلی الله علیہ وسلم بعد وفاته صلی الله علیہ وسلم

(۱۰۸) عَنِ السَّائِبِ بْنِ يَزِيدَ قَالَ كُنْتُ قَائِمًا فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِي رَجُلٌ فَنَظَرْتُ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اذْهَبْ فَأْتِنِي بِهَذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا قَالَ مَنْ أَنْتُمَا أَوْ مِنْ أَيْنَ أَنْتُمَا قَالَا مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ قَالَ لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْبَلَدِ لَأَوْجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِي مَسْجِدِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (رواه البخاری)

رفع الصوت اذا کان عن الازواج فی مرهن او عن اعرابی جاهل

(۱۰۹) عَنْ سَعْدِ بْنِ وَقَّاصٍ قَالَ اسْتَأْذَنَ عُمَرُ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهُ نِسَاءٌ مِنْ قُرَيْشٍ يُكَلِّمْنَهُ وَيَسْتَكْثِرْنَهُ عَالِيَةً أَصْوَاتُهُنَّ فَلَمَّا اسْتَأْذَنَ عُمَرُ قُمْنَ يَبْتَدِرْنَ

وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت

(۱۰۸) سائب بن یزیدؓ کہتے ہیں کہ میں مسجد میں کھڑا ہوا تھا ایک شخص نے میرے کنکری ماری میں نے دیکھا تو وہ عمر بن الخطابؓ تھے انھوں نے فرمایا جاؤ ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ، میں انھیں لے آیا فرمایا تم کون لوگ ہو، یا یہ فرمایا کہاں کے ہو؟ انھوں نے جواب دیا طائف کے باشندہ ہیں، فرمایا اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں اس وقت تمہیں سزا دیتا۔ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آوازیں بلند کر رہے ہو (اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے)۔

خانگی معاملات میں اہل خانہ کی یا ناواقف بادیہ نشین کی آواز بلند ہو جانا قابل اغماض ہے

(۱۰۹) سعد بن وقاصؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے اجازت طلب کی اس وقت آپ کے پاس قریش کی چند بیبیاں باتیں کر رہی تھیں اور آپ کی اپنی مقرر مصارف سے زیادہ کا مطالبہ کر رہی تھیں اس گفت و شنید میں ان کی آوازیں بھی اونچی ہو رہی تھیں

(۱۰۸) چونکہ یہ لوگ باہر کے رہنے والے تھے اس لئے ان کو معاف کر دیا گیا۔ اہل مدینہ چونکہ ان آداب سے آشنا ہو چکے تھے اس لئے اگر ان سے ایسی غفلت ہوتی تو قابل اغماض نہ ہوتی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب وفات کے بعد بھی اسی طرح تھا جیسا کہ زمانہ حیوۃ میں۔

الحجاب فاذن له رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یضحک فقال عمر اضحک اللہ سنک یا رسول اللہ قال عجبت من ھؤلاء اللاتی کن عندی فلما سمعن صوتک ابتدرن بالحجاب قال عمر فانت یا رسول اللہ کنت احق ان یھبن ثم قال ای عدوات انفسھن اتھبننی ولا تھبن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قلن نعم انت افظ واغلظ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ ما لقیک الشیطان قط سالکا فجا الا سلک فجا غیر فجک۔ (رواہ البخاری)

(۱۱۰) عن زر بن حبیش فی طویل حدیث قال اتیت صفوان بن عسال المرادی

جب حضرت عمرؓ نے اجازت مانگی تو فوراً وہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور جلدی جلدی پردہ میں جا بیٹھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرؓ کو اندر آنے کی اجازت دیدی (عمرؓ آئے) تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسکرا رہے تھے۔ پوچھا یا رسول اللہ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے کیا بات ہے۔ فرمایا مجھے ان عورتوں پر جو ابھی میرے پاس تھیں تعجب ہو رہا ہے (کہ یا تو یہ زور و شور سے گفتگو ہو رہی تھی) تمہاری آواز سنی تو سب جلدی جلدی پردہ میں چلی گئیں۔ عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ خوف اور ڈر کے زیادہ مستحق تو آپ تھے اس کے بعد ان کی طرف مخاطب ہو کر بولے اپنی جانوں کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتیں۔ انھوں نے کہا بیشک آپ زبان کے تیز اور مزاج کے سخت بھی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کہیں شیطان راستہ چلتے تمہیں مل جاتا ہے تو فوراً تمہارا راستہ چھوڑ کر دوسرا راستہ لے لیتا ہے (اس حدیث کو بخاری روایت کیا)

(۱۱۰) زر بن حبیش ایک طویل حدیث میں فرماتے ہیں میں صفوان بن عسال کی خدمت میں حاضر ہوا

(۱۰۹) شارحین بخاری تصریح کرتے ہیں کہ قریشی عورتوں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بی بیاں ہیں اور دوسری روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ گفت وشنید کچھ نفقہ کے متعلق تھی۔ باپ بیٹے، شوہر بی بی، بھائی بھائی، دوست دوست کے آداب علیحدہ ہیں شوہر بی بی کے درمیان بے تکلفی کا بھی ایک تعلق ہے اگر اس بنا پر خانگی معاملات میں انداز بے تکلفی پیدا ہو جائے تو یہ قابل اعتراض ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حرکت پر ہنسی آرہی تھی، آثار ناگواری نہ تھے۔ ایک ہی بات موقعہ و محل اور متکلم وسامع کے اعتبار سے مختلف حکم پیدا کر لیتی ہے یہاں بی بیوں کی بلند آوازی بے ادبی نہیں بلکہ اپنے محبوب تر شوہر کے ساتھ ایک ناز تھا اور آپ کی مسکراہٹ ناز برداری اور کمال خلق تھا۔ آنحضرت حسنینؓ آپ کے کاندھوں پر بھی سوار ہو جایا کرتے تھے پھر کیا اس کو ادب وبے ادبی سے کوئی تعلق ہے خدا سمیع فہم مرحمت

فقال لي ما جاء بك. قلت ابتغاء العلم. قال فقلت فهل حفظت من رسول الله صلى الله عليه وسلم في الهوى شيئا قال نعم كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم في بعض أسفاره فناداه رجل كان في آخر القوم بصوت جهوري جلف جاف فقال يا محمد يا محمد فقال له القوم مه إنك قد نهيت عن هذا فأجابه رسول الله صلى الله عليه وسلم على نحو من صوته هاؤم فقال الرجل يحب القوم ولما يلحق بهم قال فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم المرء مع من أحب. رواه الترمذي في باب فضل التوبة والاستغفار وما ذكر من رحمة الله وقال هذا حديث حسن صحيح۔

تو انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کیسے آنا ہوا؟ میں نے عرض کیا علم کی تلاش میں۔ میں نے ان سے پوچھا آپ کو کسی سے محبت رکھنے کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یاد ہے فرمایا ہاں ہم آپ کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ ایک گنوار احمق، اور درشت طبیعت شخص نے کسی آخری گوشہ سے آپ کو زور سے پکارا اے محمدؐ۔ اے محمدؐ۔ لوگوں نے اسے روکا اور کہا کہ خدا کے رسول کو اس طرح پکارنا (بد تہذیبی ہے) اس کی ممانعت ہو چکی ہے آپ نے بھی اسی آواز میں اسے ھوت کہکر جواب دیا۔ اس نے پوچھا ایک شخص کسی جماعت سے محبت رکھتا ہے مگر عمل میں ان کو نہیں پہنچ سکا (اس کے متعلق کیا مسئلہ ہے) آپ نے فرمایا (آخرت میں) آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ (دنیا میں) محبت کرتا تھا (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن صحیح کہا ہے)

(۱۱) شائستگی اور ناشائستگی کا تمام دارومدار آپ کی معیت اور صحبت پر تھا جو آپ کی صحبت سے دور رہا اتنا ہی اسلامی تہذیب و ادب میں پیچھے رہ گیا۔ یہ شخص تربیت یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی فطری عادت کے مطابق آپ کو چیخ کر پکار رہا تھا۔ صاحب مجمع البحار لکھتے ہیں کہ اسی بلند آوازی کے ساتھ آپ کا جواب دینا اس حکمت پر مبنی تھا کہ اگر یہ اپنی آواز آپ کی آواز سے پست نہ کر سکا تو آپ نے اپنی آواز اس کی آواز سے بلند کر دی تاکہ رسول کی آواز پر آواز بلند کرنے کے نتائج بد سے محفوظ رہے اور اس کے اعمال اکارت نہ ہوں۔ ہمارے نزدیک سیدھی اور بے تکلف بات یہ ہے کہ بلند حیثیت متکلم اپنے مخاطب کی خاطر کبھی قصداً تنزل اختیار کر لیتا ہے تاکہ اس کے درمیان راہ افادہ و استفادہ پورے طور پر کھل جائے اگر متکلم اپنی جگہ رہے اور مخاطب اپنی جگہ تو مخاطب بسا اوقات پورے استفادہ پر قادر نہیں ہوتا اس لئے بادشاہوں میں انداز شہنشاہانہ اور گداؤں میں انداز فقیرانہ اختیار کرنا عین حکمت ہے — دوم یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں معیت سے مراد عام معیت ہے جنت میں رہنے والے سب ایک ہی جگہ رہنے والے ہیں۔ اگرچہ اپنے اپنے رتبہ کے مناسب ان کے منازل و مقامات میں فرق ہو۔ اس محبت کا اثر یہ ہوگا کہ ان کے باہمی منازل نسبۃً قریب قریب کر دیئے جائیں گے یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک محبت کرنے والا جس سے محبت کرتا ہے ٹھیک اسی کے مقام و منزل میں رہے گا۔ خفاجی شرح شفا میں تحریر فرماتے ہیں۔ جنت میں معیت سے مراد باہمی اجتماع و ملاقات کی سہولت ہے اگرچہ مراتب و منازل میں فرق رہے۔ (نسیم الریاض ج ۳ ص ۳۵۲)

التوجه بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم الی اللہ سبحانہ

(۱۱۱) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ حُنَیْفٍ قَالَ اِنَّ رَجُلًا ضَرِیْرَ الْبَصَرِ اَتَی النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اُدْعُ اللّٰہَ اَنْ یُّعَافِیَنِیْ فَقَالَ اِنْ شِئْتَ دَعَوْتُ وَاِنْ شِئْتَ صَبَرْتَ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکَ قَالَ فَادْعُہٗ قَالَ فَاَمَرَہٗ اَنْ یَّتَوَضَّأَ فَیُحْسِنَ الْوُضُوْءَ وَیَدْعُوْا بِھٰذَا الدُّعَاءِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَّبِیِّ الرَّحْمَۃِ اِنِّیْ تَوَجَّھْتُ بِکَ اِلٰی رَبِّیْ لِیَقْضِیَ لِیْ فِیْ حَاجَتِیْ ھٰذِہٖ۔ اَللّٰھُمَّ فَشَفِّعْہُ فِیَّ۔ رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح غریب۔

(۱۱۲) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ کَانَ اِذَا قُحِطُوْا اِسْتَسْقٰی بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ اَللّٰھُمَّ اِنَّا کُنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّنَا فَتَسْقِیْنَا وَاِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَیْکَ بِعَمِّ نَبِیِّنَا فَاسْقِنَا فَیُسْقَوْا۔ (رواہ البخاری)

اللہ تعالیٰ کے دربار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ اختیار کرنا

(۱۱۱) عثمان بن حنیف کہتے ہیں کہ ایک شخص کی نظر میں کچھ نقصان تھا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی آپ اللہ تعالیٰ سے میری صحت کے لئے دعا فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا چاہو تو دعا کروں اور چاہو تو صبر کرلو کیونکہ یہ (رضا بقضا کا مقام) تمہارے لئے بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا آپ دعا ہی فرما دیجئے آپ نے فرمایا اچھا تو اچھی طرح وضو کرو پھر اس طرح دعا کرو۔ اے اللہ میں تجھ سے دعا کرتا ہوں اور تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نبی الرحمۃ ہیں تیرے دربار میں وسیلہ اختیار کرتا ہوں۔ اے نبی میں نے اپنے رب کے دربار میں آپ کا وسیلہ اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ وہ میری یہ ضرورت پوری فرما دے۔ اے اللہ تو ان کی سفارش میرے حق میں قبول فرمالے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح اور غریب ہے)

(۱۱۲) انسؓ سے روایت ہے کہ جب لوگ قحط میں مبتلا ہوتے تو عمر بن الخطابؓ حضرت عباسؓ کے وسیلہ سے بارش کی دعا مانگتے اور کہتے اے اللہ پہلے ہم تیرے دربار میں اپنے نبی کا وسیلہ اختیار کیا کرتے تھے اور تو بارش برسا دیتا تھا اب ہم اپنے (نبی) کے چچا کا وسیلہ اختیار کرتے ہیں۔ تو بارش برسا دے بارش ہو جاتی تھی۔ اس حدیث کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

(۱۱۳) حافظ بدر الدین عینی کعب احبار سے روایت کرتے ہیں کہ اپنے نبی کے اہل بیت کے وسیلہ سے بارش مانگنا بنی اسرائیل میں بھی رائج تھا۔ (ج ۳ ص ۴۳۶) (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

الاستشفاع بالله على احد جهل بعظمة الله تعالى

(۱۱۳) عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ اَتَى رَسُوْلَ اللّٰهِ اَعْرَابِيٌّ وَقَالَ جُهِدَتِ الْاَنْفُسُ وَجَاعَ الْعِيَالُ وَنُهِكَتِ الْاَمْوَالُ وَهَلَكَتِ الْاَنْعَامُ فَاسْتَسْقِ اللّٰهَ لَنَا فَاِنَّا نَسْتَشْفِعُ بِكَ عَلَى اللّٰهِ وَنَسْتَشْفِعُ بِاللّٰهِ عَلَيْكَ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ فَمَا زَالَ يُسَبِّحُ حَتّٰى عُرِفَ ذٰلِكَ فِيْ وُجُوْهِ اَصْحَابِهٖ ثُمَّ قَالَ وَيْحَكَ اِنَّهٗ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلٰى اَحَدٍ

خدا تعالیٰ کی سفارش کسی مخلوق کے سامنے پیش کرنا اس کی عظمت سے ناواقفی اور جہالت کا ثمرہ ہے

(۱۱۳) جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ رسول اللہ کی خدمت میں ایک دیہاتی شخص آیا اور اس نے کہا لوگوں کی جانیں مشقت میں پڑ گئیں، بچے بھوکے مر گئے، مال تباہ ہو گئے، چوپائے ہلاک ہو گئے، اس لئے اللہ تعالیٰ سے ہمارے لئے بارش کی دعا مانگئے۔ ہم خدا کے سامنے آپ کی سفارش چاہتے ہیں اور آپ کے سامنے خدا کی سفارش چاہتے ہیں۔ آپ اس کی اس بیجا بات پر سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے اور اتنی دیر تک تسبیح فرماتے رہے حتیٰ کہ آپ کے رفقاء کے چہروں پر بھی اس کا اثر محسوس ہونے لگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اے بیوقوف! خدا کی سفارش کسی کے سامنے پیش نہیں کی جاتی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) حافظ سہیلیؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے قبل بھی قریش میں مبارک سمجھے جاتے تھے اور اسی لئے ایک مرتبہ قحط کے موقعہ پر عبد المطلب نے قریش کے ساتھ جبل ابو قبیس پر چڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے بارش کی دعا مانگی تھی اور وہ قبول ہو گئی تھی حضرت ابو طالب نے اسی قصہ کی طرف اپنے مشہور قصیدہ میں اشارہ کیا ہے جس کے کچھ اشعار صحیح بخاری میں بھی منقول ہیں — شرح مواہب میں ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں قحط پڑا تو لوگ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارک کی چھت اتنی کھول دو کہ آسمان نظر آنے لگے۔ گویا یہ بھی ایک طور پر توسل تھا۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا بارش آئی اور اتنی زور سے آئی کہ ہر جگہ سبزہ اگ آیا اور جانوروں کے جسم چربی کی وجہ سے پھٹنے لگے اور وہ سال عام الفتق ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

(۱۱۳) خطابیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے اگرچہ اپنی صحیح میں تو روایت نہیں کیا مگر اپنی تاریخ میں روایت کیا ہے۔ یہ بار بار بتلایا جا چکا ہے کہ قرآنی حقائق صرف خیالی اور بے حقیقت نہیں ہوتے کہ ان سے صرف دماغی تفریح مقصود ہو بلکہ وہ پوری وہ حقیقت رکھتے ہیں جو انسانی دماغ خود تصور کر لیتا ہے اس کا تصور صرف اس کے محسوسات کے دائرہ تک محدود ہوتا ہے یہ اس کا ظلم ہے کہ جو عالم اس کے دائرہ ادراک سے بالاتر ہے اس کا نقشہ بھی وہ اپنے اسی عالم محسوسات کے مطابق کھینچنا شروع کر دیتا ہے۔ آسمانوں پر عرش رحمٰن کا وجود ایک حقیقت ہے قرآن نے بھی اس کا اعلان کیا ہے۔ اور احادیث میں بھی اس کو بیان کیا گیا ہے ایک فلسفی اور ایک اعرابی دونوں کے سامنے یہ قرآنی حقیقت پیش کی گئی ہے لیکن ایک اعرابی کا دائرہ محسوسات چونکہ بہت محدود اور سطحی ہوتا ہے — (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

شَأْنُ اللّٰهِ اَعْظَمُ مِنْ ذٰلِكَ وَيْحَكَ اَتَدْرِيْ مَا اللّٰهُ اِنَّ عَرْشَهٗ عَلٰى سَمٰوَاتِهٖ هٰكَذَا وَقَالَ بِاَصَابِعِهٖ مِثْلَ الْقُبَّةِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَيَئِطُّ بِهٖ اَطِيْطَ الرَّحْلِ بِالرَّاكِبِ (رواہ ابوداود)

اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بالا و برتر ہے۔ تو جانتا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کس قدر بلند ہے اس کا عرش آسمانوں پر اس طرح قائم ہے اور اس کا نقشہ آپ نے اپنی انگلیوں سے قبہ کی شکل پر بنا کر دکھلایا اور وہ اس کی عظمت سے اس طرح چرچر کر رہا ہے جیسا نیا کجاوہ سوار کے بوجھ سے چرچر کرتا ہے۔ (اس حدیث کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) اس لئے اس کے سامنے طریقۂ تفہیم یہی ہے کہ اسی کے محسوسات کے مطابق اس کو سمجھایا جائے۔ اونٹ، سوار، کجاوہ، نئے کجاوہ کی آواز، وزنی سوار سے کجاوہ کی چرچراہٹ۔ یہی اس کا دائرہ محسوسات ہے ایک وراء الورا اور مجرد ہستی کی عظمت و بزرگی ذہن نشین کرنے کے لئے یہ مادی مثال اس کے سامنے رکھی گئی ہے تاکہ وہ اپنے مالوف مشاہدات سے ایک مافوق الادراک حقیقت سمجھنے کے قابل ہو جائے۔ اب اگر اس طرز بیان سے خدا کی ذات پاک کو کوئی ان حدود میں محدود سمجھنے لگے تو یہ اس کی نافہمی ہے اور اگر عرش اور ماورا عرش کو صرف ایک فرضی یا دل خوش کن افسانہ قرار دیدے تو یہ بھی اس کا ظلم و کجروی ہے۔ راہ صواب یہ ہے کہ ان حقائق پر ایمان رکھا جائے اور اس کی صورت کشی سے اجتناب کیا جائے۔ دوسری بات جو ایمان بالرسول کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جاننا ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی کمزوریوں میں سے یہ بھی ایک کمزوری ہے کہ وہ یا تو رسول کا انکار کرتا ہے اور اگر اس کا اقرار کرتا ہے تو اس کی ہستی کبھی تو خدائی ہستی میں مدغم کر دیتا ہے اور کبھی اس کی حیثیت سے بھی نیچے گرا دیتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کی گمراہی کا مرکزی نقطہ یہی تھا۔ یہود نے حضرت مسیح کا انکار کیا اور نصاریٰ نے ان کی ہستی کو خدا کی ہستی میں لپیٹ ڈالا اس لئے خاتم النبیین کو ہر موقعہ پر اپنی امت کو تنبیہ کرنا پڑی ہے تاکہ یہ امت اس گمراہی کا پھر اعادہ نہ کرے۔ یہاں اس اعرابی نے بھی خدا اور رسول کا رشتہ دوستی یا اسی قسم کا کوئی اور رشتہ سمجھا تھا جس میں ایک دوسرے سے سفارش کا حق ہوتا ہے اسی لئے اس نے اپنے پرواز خیال کے مطابق خدا کی سفارش رسول کی بارگاہ میں پیش کی تاکہ رسول کی پوری توجہ اپنی درخواست کی جانب مبذول کرے مگر رسول نے اس کو سمجھایا کہ خدا کی ذات اتنی اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس کے لئے کسی بڑے سے بڑے کے سامنے سفارش کا تخیل قائم کرنا اس کی شان عظمت کے منافی ہے سب رسول اسی کے دربار کے سفارشی ہیں اور وہ بھی اس کی اجازت کے بعد۔ یہ اصلاح صرف زبانی نہ تھی بلکہ اس استحضار عظمت کے ساتھ تھی کہ حاضرین کے چہروں پر بھی اس کا اثر نمایاں ہو رہا تھا گویا تعلیم وہ تھی اور تزکیہ یہ تھا۔

رسول کی صداقت کی ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ جب اس کے حدود عظمت خدائی حدود سے ٹکرانے لگتے ہیں تو وہ اس کو اتنی ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے جتنا کہ اپنی توہین کو ایک متوازن سے متوازن طبع انسان اپنی حیثیت سے زیادہ تعریف سن لیتا ہے اور اس پر مسرور بھی ہو سکتا ہے مگر رسول اپنے ادب و احترام، اہانت و حقارت کے دونوں حدود اتنے محفوظ رکھتا ہے کہ گویا یہاں بھی اسے اپنا حفظ نفس مقصود نہیں بلکہ خدائی حدود کا تحفظ منظور ہے۔ اگر اس کے منہ پر اسے کوئی یا خیر البریہ کہکر پکارتا ہے تو اسے شرم آجاتی ہے اور وہ گردن جھکا کر کہہ دیتا ہے کہ یہ کلمہ میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ بلاشبہ وہ سب سے افضل ہے اور جانتا ہے کہ سید و سردار ہے مگر جب اس کے سامنے انت سیدنا کہا جاتا ہے تو اس کے منہ سے بیساختہ نکل جاتا ہے کہ السید ہو اللہ گویا اگر وہ اپنی تعریف سن سکتا ہے تو صرف ایک حقیقت اور واقعہ کی حد تک اور اگر اپنی مذمت سے ناخوش ہوتا ہے تو صرف اس لئے کہ اس میں منصب رسالت کی توہین ہے غرض دونوں جانبوں میں اس کا مقصد صرف خدا ہی کی عظمت کی خاطر ہے، سوچو کہ ایسا انسان کیسا پاک انسان ہوگا جو اپنے نفس کیلئے کسی بات کا طالب نہیں اس کی تمام سعی و کوشش یہ ہے کہ وہ خدا کی عظمت کا نقش لوگوں کے دلوں میں قائم کر جائے اور بس۔ جو لوگ رسول کو خدائی عظمت دیکر خوش کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت اس کی ناراضگی خرید رہے ہیں اور جو محروم القسمت رسول کا ادب بھی نہیں جانتے وہ درحقیقت اپنے خدا کا غصہ مول لے رہے ہیں۔ ؎ محمد از تو می خواہم خدا را + خدایا از تو می خواہم محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم)

كان النبي صلى الله عليه وسلم نبيا وآدم بين الروح والجسد

(۱۱۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ مَتَى وَجَبَتْ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبوۃ سے اس وقت سرفراز ہو چکے تھے جبکہ حضرت آدم میں نفخ روح بھی نہ ہوا تھا

(۱۱۴) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کو نبوت کب

(۱۱۴) حافظ سخاویؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کے مشہور الفاظ "کنت نبیا وآدم بین الماء والطین" ہمیں کسی حدیث کی کتاب میں نہیں مل سکے۔ حافظ سیوطیؒ نے ان کا صاف طور پر انکار کر دیا ہے البتہ اس کا مضمون قابل تسلیم سمجھا ہے۔ خفاجی شرح شفا میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے دو تین باتیں ثابت ہوتی ہیں (۱) آپ کا عالم ارواح میں نبوت سے حقیقۃً سرفراز ہونا۔ (۲) جس طرح صفت وجود میں آپ کی ذات سب سے مقدم تھی اسی طرح صفت نبوت میں بھی آپ کا سب سے مقدم ہونا اس مضمون کی پوری توضیح کے لئے اس تفصیل کا نقل کرنا ضروری ہے جو حافظ تقی الدین سبکی نے آیت میثاق کی تفسیر میں لکھی ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ (آل عمران)	اور وہ وقت یاد دلایئے جبکہ اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ ہم جو تمہیں کتاب و حکمت دیں پھر خدا کا کوئی رسول تمہارے پاس آئے اور جو کتاب تمہارے ساتھ ہو اس کی تصدیق کرے تو (دیکھو) ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا

حافظ موصوف نے اس آیت کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے اور اس کا نام "التعظیم والمنۃ فی معنی قولہ تعالیٰ لتؤمنن بہ ولتنصرنہ" رکھا ہے[1]۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ازل میں انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اسی نمونہ کا عہد لیا گیا تھا جیسا کہ امتوں سے نبیوں کے لئے یا رعایا سے خلفاء کے لئے اطاعت و نصرت کا عہد لیا جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کے درمیان آپ کا منصب عالی وہ تھا جو امتوں میں انبیاء علیہم السلام کا منصب ہوتا ہے اس لئے اور انبیاء تو صرف نبی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء ہیں۔ یہ حقیقت اگرچہ عالم اجسام میں صاف طور پر عیاں نہیں ہو سکی مگر عالم ارواح اور اس عالم سے ماوراء عالم میں جہاں بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کے ساتھ آپ کا اجتماع ہو گیا ہے ظاہر ہو گئی ہے۔ پہلی بار یہ اجتماع شب معراج میں ہوا تھا جبکہ نماز کے لئے امام کی تلاش ہوئی تھی۔ اس وقت تمام انبیاء علیہم السلام کی صفوں میں امامت کی مستحق آپ ہی کی ذات گرامی ٹھہری۔ گویا امت میں امامت کا جو حق کہ نبی کا ہوتا ہے وہی حق انبیاء علیہم السلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قرار پایا۔ دوسرا اجتماع محشر میں ہوگا وہاں بھی سب انبیاء آپ ہی کے زیر لواء اور آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے جیسا کہ ہر امت اپنے اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی تیسری بار شفاعت کا مرحلہ ہے یہاں بھی سب کی خطیب و امام آپ ہی کی ذات مبارک ہوگی۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جو منصب نبوت آپ کو اس امت کے لئے حاصل ہے وہی منصب آپ کو بلحاظ انبیاء بھی حاصل ہے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

[1] یوسف بن اسمٰعیل نبہانی نے جواہر البحار میں اس رسالہ کو بجنسہٖ نقل کیا ہے۔ خفاجی نے صرف اس کے منتشر ٹکڑے لئے ہیں۔

لَكَ النُّبُوَّةُ قَالَ وَآدَمُ بَيْنَ الرُّوحِ وَ

ملی فرمایا اس وقت جبکہ حضرت آدم علیہ السلام ابھی روح و جسم کے درمیان تھی (یعنی ان میں روح

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) البتہ اس کا ظہور ان کے ساتھ اجتماع پر موقوف ہے۔ عالم کی تاریخ میں یہ اجتماع کل تین جگہ ثابت ہوتا ہے اور تینوں جگہ آپ کا یہ منصب عالی ظاہر ہوا ہے۔ مگر اس عالم میں بھی انبیاء علیہم السلام کا آپ کے ساتھ اجتماع ہو جاتا تو یہ حقیقت یہاں بھی آشکارا ہو جاتی۔ چنانچہ آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو ان کا تعلق آپ کی شریعت کے ساتھ وہی ہوگا جو تمام امت کا ہے اور اسی لئے اس اتباع سے ان کی نبوت میں کوئی ادنیٰ شائبہ نقصان بھی لازم نہ آئیگا۔ اسی طرح اگر آپ گذشتہ انبیاء کے زمانہ میں تشریف لے آتے تو وہ بھی اپنی اپنی رسالت پر باقی رہتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع ہی فرماتے اور اس اتباع کی وجہ سے ان کی رسالت میں بھی کوئی نقص لازم نہ آتا۔

رہا مختلف شریعتوں کا معاملہ تو جس طرح مختلف نبوتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماتحت ہیں اسی طرح مختلف شریعتیں مختلف زمانوں اور امتوں کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعتیں ہیں۔ پس یہود و نصاریٰ کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تورات و انجیل تھی اور امت محمدیہ کے لحاظ سے آپ کی شریعت قرآن کریم ہے اگر زمانوں اور اشخاص کے اعتبار سے احکام مختلف ہو جائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

مذکورہ بالا تحقیق سے دو حدیثوں کی مراد روشن ہو گئی۔ (۱) بعثت الی الناس کافۃ۔ میں تمام لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ عام طور پر عموم بعثت کے معنی صرف یہ سمجھے جاتے تھے کہ آپ قیامت تک سب انسانوں کے لئے رسول ہیں، لیکن اس تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ آپ کی نبوت کا تعلق صرف مستقبل سے نہیں بلکہ ماضی و مستقبل دونوں سے ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک سب رسول آپ کی نبوت کے ماتحت ہیں گو وہ ماتحتی کی نوعیت جلی ہو یا خفی۔

(۲) حدیث کنت نبیا و آدم بین الماء والطین۔ اس حدیث کی مراد صرف یہ سمجھی جاتی تھی کہ حضرت آدم کی پیدائش سے پہلے اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت کا علم حاصل تھا مگر اس میں آپ کی کیا خصوصیت ہے۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی نبوتوں کا علم بھی اللہ تعالیٰ کو اسی طرح حاصل تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا۔

اس تحقیق کی بناء پر حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت آدم علیہ السلام میں نفخ روح سے پہلے نبوت سے نوازا جا چکا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے کسی کمال کے افاضہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کبھی وہ عالم وجود میں آنیکے بعد کمال کا افاضہ کرتی ہے اور کبھی وجود سے پہلے عالم ارواح ہی میں اس کمال سے نواز دیتی ہے جس کا ظہور قالب انسانی میں مقدر ہو چکا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کمال کا علم اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو یکساں ہوتا ہے۔ ہاں مخلوق کو پہلی صورت کا علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ وہ کمال اس کے مشاہدہ میں آ جائے۔ اور دوسرے کمال کے علم کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ کوئی مخبر صادق اس کی خبر دیدے۔ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ہمیں اس بات کا علم ہو گیا ہے کہ کمال نبوت آپ کو اس وقت حاصل ہو چکا تھا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام انسانی صورت پر استوار بھی نہ ہونے پائے تھے اور اسی وقت انبیاء علیہم السلام سے آپ کے لئے ایمان و نصرت کا عہد بھی لے لیا گیا تھا تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ کی رسالت عامہ ان کو بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے سب سے پہلے نبی آپ ہوئے مگر چونکہ جسد عنصری کے لحاظ سے آپ کا ظہور سب سے آخر میں ہوا ہے اس لئے آپ آخر الانبیاء بھی کہلائے مگر اس معنی سے نہیں کہ آپ کو نبوت سب سے آخر میں ملی ہے۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر ملاحظہ ہو)

الْجَسَدِ۔ (رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن)۔

نہیں پھونکی گئی تھی)۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے اور حسن کہا ہے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) بلکہ اس معنی سے کہ آپ کا ظہور سب کے آخر میں ہوا ہے ورنہ منصب نبوت کے لحاظ سے آپ کی ولادت سے قبل اور ولادت کے بعد، چالیس سال کی عمر سے پہلے اور اس کے بعد کے زمانہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ اگر ایک شخص اپنی لڑکی کی شادی کے لئے کسی کو وکیل بناتا ہے تو بلاشبہ یہ وکالت صحیح ہے اور اسی وقت سے اس کو تصرف کرنے کا حق بھی حاصل ہے لیکن اس تصرف کا ظہور اس پر موقوف ہے کہ پہلے کہیں اسے کفو ملے تو وہ شادی کرے بعض مرتبہ مدتوں کفو نہیں ملتا اور اس وکالت کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوتا مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شخص وکالت سے موصوف نہیں یا اس کو اس سے پیشتر حق تصرف حاصل نہیں اسی طرح آپ کی نبوت کا معاملہ سمجھنا چاہئے یہاں جسم عنصری کی شرط صرف تصرفات نبوت کے ظہور کے لئے ہے بنفس منصب نبوت کیلئے نہیں اصل یہ ہے کہ کسی حکم کا کسی شرط سے تعلق دو طرح پر ہوتا ہے کبھی فاعل متصرف کے اعتبار سے کبھی محل قابل کے لحاظ سے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لئے جسم عنصری کی شرط فاعل متصرف کی طرف سے نہ تھی کیونکہ حق تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت سے عالم ارواح ہی میں سرفراز کر دیا تھا جسم ناسوتی کی شرط تھی تو صرف اس لئے تھی کہ مبعوث الیہم میں جسم کے بغیر استفادہ کی صلاحیت نہ تھی تصرفات نبوۃ یعنی احکام الٰہیہ کی تبلیغ اس پر موقوف تھی کہ آپ جسم عنصری میں تشریف لا کر ان سے خطاب کریں۔ کلام الٰہی انھیں سنائیں اور سمجھائیں اگر مخاطبین میں ان امور کی اس سے قبل صلاحیت ہوتی تو وہ کمال نبوت کا اس سے قبل بھی ادراک کر لیتے اس لئے قالب انسانی کی شرط یہاں نفس نبوت کے لئے نہیں بلکہ قصور مخاطبین کے لحاظ سے تھی[۱]

خفاجی کو تقی سبکی کی اس رائے سے اختلاف ہے وہ انبیاء علیہم السلام کے حق میں آپ کا یہ علاقہ تسلیم نہیں کرتے اور فرماتے ہیں کہ صرف تعظیم و توقیر، عظمت و نصرت کے عہد سے اتنا اہم علاقہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمارے نزدیک اس کے خلاف ہم جو وجوہات انھوں نے قائم کئے ہیں اس کا جواب ممکن ہے مگر احتیاط یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بحث سے سکوت اختیار کیا جائے نہ ہم اس کا دعوی کرنے کی ضرورت نہ اس سے انکار کرنے کی حاجت۔ آیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے صرف آپ کی سیادت و قیادت کا اعتقاد کافی ہے۔ اب یہ بحث کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے بھی یہ سیادت اسی درجہ کی تھی جس درجہ کی اس امت کے لئے غیر ضروری بحث ہے۔ علامہ خفاجی کو سبکی کی دوسری بحث بلا کسی اختلاف کے تسلیم ہے یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت سب سے پہلے عالم ارواح ہی میں مرحمت ہو چکا تھا اور اس حدیث کا منشا صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت کا علم تھا یہ ایک بدیہی اور غیر مفید سی بات ہے۔[۲] شیخ اکبرؒ نے اس مضمون کو بڑی رنگینی سے ادا کیا ہے اس کا نقل کرنا موجب طوالت ہے۔ اہل علم کی ضیافت طبع کے لئے یہاں صرف چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

الا بابی من کان ملکا و سیدا	سن لو میرے ماں باپ اس پر قربان جو اس وقت بادشاہ اور سرکردہ بن چکا تھا
وآدم بین الماء والطین واقف	جبکہ آدم علیہ السلام ابھی آب و گل کے درمیان ہی پڑے ہوئے تھے۔

[۱] سبکی متوفی ۷۵۶ھ سے پہلے حافظ ابو نعیم اصبہانی نے (متوفی ۴۳۰ھ) اور شیخ محی الدین بن عربی (متوفی ۶۳۸) نے فتوحات مکیہ کے باب ص ۱۴۲ و باب ۱۲ ص ۱۵۱ و باب ۶ ص ۹۴ و باب ۷ ص ۱۰۷ و ۱۸۲ و باب ۳۱۳ ص ۴۳ میں اور امام رازی نے (متوفی ۶۰۶) اپنی تفسیر میں پھر بعد میں ابن حجر ہیثمی (متوفی ۹۷۳) اسفرائنی (۱۱۳۳) وغیرہم نے اسی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔

[۲] دیکھو نسیم الریاض ج ۱۔ از ص ۳۰۰ تا ۳۰۴۔

جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین وآدم بین الماء والطین

(۱۱۵) عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِیَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنِّیْ عِنْدَ اللّٰہِ مَکْتُوْبٌ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ وَاِنَّ اٰدَمَ لَمُنْجَدِلٌ فِیْ طِیْنَتِہٖ رواہ فی شرح السنۃ واحمد فی مسندہ کمافی المشکوۃ والبیھقی والحاکم کمافی المواھب وقال الحاکم صحیح الاسناد وفی شرحہ رواہ ابن حبان فی صحیحہ ایضا وفی الکنز وفی لفظ لھذا الحدیث عند ابن سعد فی ام الکتاب خاتم النبیین الحدیث۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت خاتم النبیین بنادیئے گئے تھے جبکہ حضرت آدم ابھی آب وگل ہی میں تھے

(۱۱۵) عرباض بن ساریہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں خدا کے نزدیک اس وقت خاتم النبیین مقرر ہو چکا تھا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام ابھی گارے کی شکل ہی میں پڑے ہوئے تھے (یعنی ان میں روح نہیں پھونکی گئی تھی) اس حدیث کو شرح السنۃ میں اور امام احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے اور کنز العمال میں بحوالہ ابن سعد اس حدیث کے لفظوں میں بجائے عند اللہ کے ام الکتاب کا لفظ ہے۔ اب حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ میں لوحِ محفوظ میں خاتم النبیین لکھا جا چکا تھا۔ گویا ابنِ سعد کے لفظ کو مسند امام احمد کی شرح سمجھنا چاہیئے۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ)

فذاک الرسول الابطحی محمد	یہ وہی کی رسول ہیں جن کا نام نامی محمد ہے اور
لہ فی العلی مجد تلید وطارف	جن کو ہر قسم کی نئی پرانی بزرگیاں حاصل ہیں۔
اتی بزمان السعد فی آخر المدی	آپ کی آمد رسُل کے بعد ایک خوش بخت زمانہ میں ہوئی۔
وکانت لہ فی کل عصر مواقف	مگر آپ کی شہرت ہر دور میں رہی ہے۔
اتی لانکسار الدھر یجبر صدعہ	آئے اور ایک شکستہ حال زمانہ کی اصلاح کرنے کے لئے آئے۔
فاثنت علیہ السن وعوارف	اس لئے زبان خلق اور بخششیں آپ کی ثناء خواں ہے۔
اذا رام امرًا لایکون خلافہ	جب آپ کسی بات کا عزم کر لیتے ہیں تو پھر اس کا خلاف نہیں ہوتا۔
ولیس لذاک الامر فی الکون صارف	اور نہ عالم میں اس سے کوئی مانع نظر آتا ہے۔

(۱۱۵) مواہب میں ہے۔ واخرج مسلم من حدیث عبد اللہ بن عمرو بن العاص عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال ان اللہ عزوجل کتب مقادیر الخلق قبل ان یخلق السموات والارض بخمسین الف سنۃ وکتب فی الذکر ان محمدا خاتم النبیین۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص صحیح مسلم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کی پیدائش سے پچاس ہزار سال قبل۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

جعل النبی صلی اللہ علیہ وسلم اول النبیین و آخرهم و کذا امتہ آخر الامم و تکون اولهم یوم القیامۃ

(۱۱۶) عَنْ اَنَسٍ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ مَرْفُوْعًا قَالَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی جَعَلْتُ اُمَّتَکَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے نبی بنا دیئے گئے تھے اور سب سے آخر میں تشریف لائے ہیں اور اسی طرح آپ کی امت بھی سب سے آخر میں آئی ہے اور قیامت کے دن سب سے مقدم ہو جائیگی

(۱۱۶) انسؓ سے ایک طویل حدیث میں مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیری امت کو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اپنی ہر مخلوق کا اندازہ لکھ دیا تھا اور لوحِ محفوظ میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں یعنی جب عالم تکوین کی ہر معمولی سے معمولی چیز مقدر ہوئی تو جن کے وجود پر عالم تکوین کی آبادی کا مدار تھا اُن کا خاتم النبیین ہونا بھی اسی وقت مقدر ہو چکا تھا۔ اس روایت کا آخری فقرہ اگرچہ صحیح مسلم کے موجودہ نسخوں میں نہیں ہے تاہم جب مصنف مواہب نے اس کو بحوالہ مسلم نقل کیا ہے تو ضرور اُن کے نسخہ میں موجود ہوگا۔

واضح رہے کہ اس حدیث کا منشا بھی صرف تحریر و کتابت نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ خلعت ختم نبوت آپ کو اس وقت پہنایا جا چکا تھا جبکہ ابوالبشر نے خلعت وجود بھی نہیں پہنا تھا۔ اسی کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اشارہ فرمایا ہے۔ عن ابن عباس فی حدیث الشفاعۃ فیاتون عیسی فیقولون اشفع لنا الی ربنا فیقضی بیننا فیقول انی لست هناکم انی اتخذت وامی الهین من دون اللہ ولکن ارأیتهم لو ان متاعا فی وعاء قد ختم علیہا اکان یوصل الی ما فی الوعاء حتی یفض الخاتم فیقولون لا فیقول فان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم قد حضر الیوم وقد غفر لہ ما تقدم من ذنبہ وما تأخر رواہ الطیالسی ص ۳۵۲۔ وفی لفظ احمد وابی یعلی ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین قد حضر الیوم۔

ابن عباسؓ شفاعت کی طویل حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ (قیامت میں شفاعت کے لئے) آخر کار لوگ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ آپ ہی ہمارے پروردگار سے سفارش کیجئے تاکہ ہمارا حساب لے لے وہ فرمائیں گے میں یہ کام نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے شرمندہ ہوں کہ میری امتیوں نے مجھے اور میری ماں کو خدا بنا لیا تھا لیکن بتاؤ اگر کسی برتن کو بند کرکے اس پر مہر لگا دی جائے کیا اس برتن کی چیز اس وقت تک لے سکتے ہو جب تک اس کی مہر نہ توڑ دو لوگ کہیں گے ایسا تو نہیں ہو سکتا۔ عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جو انبیاء علیہم السلام کے خاتمہ پر مہر ہیں) آج موجود ہیں اُن کی آئندہ و گذشتہ سب لغزشیں معاف ہو چکی ہیں (ان کے پاس جاؤ) مسند احمد اور ابو یعلیٰ کے لفظ یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور آج یہاں موجود ہیں۔ ان الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صرف تقدیر کا ذکر نہیں فرمایا بلکہ اس نوازش الٰہیہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ازل میں خلعت ختم نبوۃ پہنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہو چکی تھی۔ اس لئے شفاعت کا حق ان ہی کا ہے۔

عرض یہ کہ اس حدیث میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عالم کی ہدایت کے وقت ہی اس کی نہایت آپ کے دورۂ نبوت پر مقدر ہو چکی تھی اسی لئے آپ نے فرمایا ہے عن بریدۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعثت انا والساعۃ جمیعا ان کادت لتسبقنی (اخرجہ ابن جریر بحوالۃ مسند احمد)

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

هُمُ الْآخِرُوْنَ وَهُمُ الْاَوَّلُوْنَ (الی قوله) جَعَلْتُكَ اَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ خَلْقًا وَاٰخِرَهُمْ (الی قوله) وَجَعَلْتُكَ فَاتِحًا وَّخَاتِمًا (اخرجه ابو نعیم) (من الخصائص ج ۲ ص ۱۹۷)

(۱۱۷) عَنْ سَلْمَانَ فِيْ حَدِيْثِ الشَّفَاعَةِ. يَأْتُوْنَ مُحَمَّدًا فَيَقُوْلُوْنَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اَنْتَ الَّذِيْ فَتَحَ اللّٰهُ بِكَ وَخَتَمَ وَغَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ وَمَا تَاَخَّرَ (رواه ابن ابی شیبة) (فتح الباری ج ۱۱ ص ۳۶۸)

(۱۱۸) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ فِيْ حَدِيْثِ الْاِسْرَاءِ قَالُوْا يَا جِبْرِيْلُ مَنْ هٰذَا مَعَكَ قَالَ هٰذَا مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ خَاتِمُ النَّبِيِّيْنَ . . . . الی ان قال ۔ فَقَالَ لَهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰی . . .

میں نے سب سے آخر میں بھیجا ہے اور وہ حساب میں سب سے پہلے ہوگی اور میں نے تجھکو نبیوں میں سب سے پہلے پیدا کیا اور سب سے آخر میں بھیجا ہے تجھکو میں نے فاتح یعنی دورۂ نبوت شروع کرنے والا بنایا ہے اور تجھکو ہی اس کا ختم کرنے والا بنایا ہے۔ اس حدیث کو ابونعیم نے روایت کیا ہے۔

(۱۱۷) سلمانؓ شفاعت کی حدیث میں روایت کرتے ہیں۔ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے اللہ کے نبی آپ ہی وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو شروع کیا تھا اور جن پر ختم کیا ہے اور آپ کی آئندہ اور گذشتہ سب لغزشیں معاف کردی ہیں۔ (اس حدیث کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے)۔

(۱۱۸) ابوہریرہ رضؓ معراج کی حدیث میں روایت فرماتے ہیں کہ فرشتوں نے جبرئیلؑ سے دریافت کیا تمہارے ساتھ یہ کون ہیں وہ بولے محمدؐ ہیں جو اللہ کے رسول اور خاتم النبین ہیں۔ (جب آپ کی دربار الٰہی میں رسائی ہوئی) تو ارشاد ہوا (اے محمدؐ) میں نے پیدائش کے لحاظ سے تم کو سب

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) بریدہ رضؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں اور قیامت ساتھ ساتھ بھیجے گئے ہیں (اور مبالغہ کے ساتھ فرمایا) وہ تو قریب تھی کہ مجھ سے بھی پہلے آجاتی۔ اور بخاری میں ہے بعثت انا والساعة کھاتین آپؐ نے اپنی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا میں اور قیامت اس طرح ملے ہوئے بھیجے گئے ہیں یعنی آپ کے زمانۂ نبوت اور قیامت کے درمیان کوئی اور نبوت حائل نہیں۔ قیامت جب بھی آئے آپ ہی کے دورِ نبوت میں آئے گی۔

خلاصہ یہ کہ آپ کا دنیا کے آخری دور میں آنا اس وقت طے ہوچکا تھا جبکہ حضرت آدم علیہ السلام میں نفخ روح نہ ہوا تھا گویا کہ یہ بات عالم کے وجود سے بھی پہلے ایک طے شدہ بات تھی اب اس میں شبہ کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔

(۱۱۸) چونکہ رسولوں کے سلسلہ میں بظاہر سب سے پہلے آنیوالے رسول حضرت آدم علیہ السلام تھے اس لئے احادیث میں اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل اولیت یعنی باعتبار خلق واتصاف نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو حاصل ہے۔ گو بلحاظ وجود عنصری حضرت آدم علیہ السلام کی تشریف آوری سب سے اول ہوگئی ہے۔

جَعَلْتُكَ اَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ خَلْقًا وَّاٰخِرَهُمْ بَعْثًا ..... وَجَعَلْتُكَ فَاتِحًا وَّخَاتِمًا

(رواہ البزار) مجمع الزوائد ص ۲۷ و ۲۹۔

(۱۱۹) عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ مُرْسَلًا اِنَّمَا بُعِثْتُ خَاتِمًا وَّفَاتِحًا وَّاُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَفَوَاتِحَهٗ (رواہ البیھقی فی شعب الایمان) کنز ج ۶ ص ۱۰۶

(۱۲۰) عَنْ قَتَادَةَ كُنْتُ اَوَّلَ النَّاسِ فِي الْخَلْقِ وَاٰخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ۔ رواہ ابن سعد کمافی الکنز ج ۶ ص ۱۰۶ ورواہ ابن ابی شیبۃ مسندا عنہ کمافی الدر المنثور ج ۵ ص ۱۸۴۔

(۱۲۱) عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ الآیہ قَالَ كُنْتُ اَوَّلَ النَّبِيِّيْنَ فِي الْخَلْقِ

نبیوں سے پہلے اور لحاظ بعثت سب سے آخر میں بھیجا ہے نبوت کا شروع کرنے والا اور ختم کرنے والا تم کو ہی بنایا ہے۔ اس حدیث کو بزار نے روایت کیا ہے۔

(۱۱۹) ابو قتادہؓ مرسلاً روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے نبوت کا شروع کرنے والا اور اس کا ختم کرنے والا میں ہی بھیجا گیا ہوں اور مجھے جوامع کلم اور فواتح کلم دیئے گئے ہیں یعنی مختصر جملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا کرنا۔ اس حدیث کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

(۱۲۰) قتادہؓ سے روایت ہے کہ میں سب انسانوں میں بلحاظ پیدائش پہلا ہوں اور سب انبیاء میں باعتبار بعثت پچھلا۔ اس حدیث کو ابن سعد نے مرسلاً اور ابن ابی شیبہ نے مسنداً روایت کیا ہے۔

(۱۲۱) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ ۔ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا میں باعتبار پیدائش کے سب سے پہلا اور

---

(۱۱۹) حکیم ترمذی فرماتے ہیں کہ ہر سید و امیر کو بقدر اپنے دائرہ ولایت کے خزائن، حشم و خدم درکار ہوتے ہیں۔ جو ایک قریہ یا ایک خطہ کا امیر ہوتا ہے اس کے لئے اس کے مناسب اور جو ایک ملک کا امیر ہوتا ہے اس کے لئے اس کے مناسب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ تمام جہان کا سید و امیر بنایا گیا ہے اس لئے آپ کو اسی کے بقدر سامانِ ولایت کی ضرورت اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے کہ اوتیت خزائن الارض مجھے زمین بھر کے خزانے مرحمت فرمادیئے گئے ہیں اور اسی لئے فرمایا اوتیت جوامع الکلم مجھے جامع کلمات مرحمت کئے گئے ہیں جبکہ جس کی مملکتِ تبلیغ تمام جہان ہو اس کے مختصر جملوں میں سمندر کھپانے کی قدرت ملنی چاہئے تاکہ اس کے کچھ جملوں میں سب کچھ آجائے اور ایک اعرابی و فلسفی یکساں طور پر اس کو ہمیشہ مستفید ہوتا رہے اسی بناء پر ترمذی میں ہے کہ ہر نبی کو سات نجیب در قیب ملے ہیں مجھے چودہ مرحمت ہوئے ہیں۔ غرضکہ جوامع الکلم بعثتِ عامہ کے مقتضیات و ضروریات میں داخل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو رسول خاص خاص قوموں کی طرف مبعوث ہوئے ان کو ایسے کلمات جامعہ مرحمت نہیں ہوئے۔ جوامع الکلم کی تفسیر ہمارے مضمون حجیت حدیث میں زیر عنوان قرآن کی جامعیت ملاحظہ کیجئے۔

وَاٰخِرَهُمْ فِي الْبَعْثِ. رواه ابن ابي حاتم وابن مردويه وابو نعيم في الدلائل والديلمي وابن عساكر وابن ابي شيبة وابن جرير وابن سعد (ابن كثير ج ۸ ص ۸۹ والدر المنثور ج ۵ ص ۱۸۴ والكنز ج ۶ ص ۱۱۲)

هذه الامة آخر الامم وخيرها واولها في الحساب

(۱۲۲) عَنْ قَتَادَةَ قَالَ ذُكِرَ لَنَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ذَاتَ يَوْمٍ وَهُوَ مُسْنِدٌ ظَهْرَهُ اِلَى الْكَعْبَةِ. نَحْنُ نُكْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعِيْنَ اُمَّةً نَحْنُ اٰخِرُهَا وَخَيْرُهَا

رواه ابن جرير في تفسير قوله كنتم خير امة الآية (الدر المنثور ج ۲ ص ۶۴)

(۱۲۳) عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ حَزْمٍ ... تُكْمِلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُوْنَ اُمَّةً. نَحْنُ اٰخِرُهَا وَاٰخَيْرُهَا (رواه الباوردي) الكنز ج ۶ ص ۲۳۲

باعتبار بعثت سب سے آخری نبی ہوں. اس حدیث کو ابن ابی حاتم، ابن مردویہ. ابونعیم نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے اور دیلمی، ابن عساکر، ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن سعد نے بھی روایت کیا ہے۔

یہ امت سب امتوں میں آخر، سب سے بہتر اور حساب میں سب سے مقدم ہوگی

(۱۲۲) قتادۃؓ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ سے کمر لگائے بیٹھے تھے اس وقت آپ نے فرمایا ہم قیامت کے دن ستر امتوں میں ستر ویں امت ہوں گے جن میں ہم سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔ (در منثور)

(۱۲۳) محمد بن حزم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ستر امتیں پوری ہو جائیں گی جن میں ہم سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔ (کنز العمال)

---

(۱۲۲) ان جملہ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتح نبوۃ اور خاتم نبوۃ دونوں قرار دیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ ازل میں آپ کی نبوۃ اور ختم نبوۃ صرف تقدیر کے معنی میں نہ تھی تقدیر تو سب کے لئے یکساں ہے بلکہ اس منصب سے سرفرازی کے لحاظ سے ہے۔ آپ کی آخیریت جس طرح خارج میں تھی اسی طرح آپ کی اولیت بھی سمجھنا چاہئے. اور جس طرح آپ کی اولیت تھی یعنی آپ سے پیشتر کوئی رسول نہ تھا اسی طرح آپ کی آخیریت سمجھنا چاہئے یعنی آپ کے بعد بھی کسی قسم کا کوئی رسول نہیں ہوگا۔

(۱۲۳) یہ معلوم نہیں ہے کہ یہاں ستر کا عدد کس مناسبت سے ذکر کیا گیا ہے. جب کوئی متکلم کوئی خاص عدد ذکر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں اس عدد کا کوئی خاص معیار ہوتا ہے جب تک اس کا وہ معیار اور اعتبار ذہنی معلوم نہ ہو جائے اس وقت تک اس عدد پر بحث کرنا بے کار ہے ایک ہی مقدار کو پیسوں کے لحاظ سے ۶۴ اور آنوں کے اعتبار سے ۱۶، اور روپیہ کے لحاظ سے ایک کہا جا سکتا ہے۔ معلوم نہیں کہ یہاں ۷۰ کے عدد میں کسی خاص بات کی رعایت کی گئی ہے۔

(۱۲۴) عن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل یا یہودی انتم الاولون ونحن الآخرون السابقون یوم القیامۃ۔ اخرجہ ابن راھویہ فی مسندہ وابن ابی شیبۃ فی المصنف (الخصائص ج ۲ ص ۲۰۹)

(۱۲۵) عن بھز بن حکیم عن ابیہ عن جدہ مرفوعا تکمل یوم القیامۃ سبعون امۃ نحن آخرھا وخیرھا۔ رواہ ابن ماجۃ والدارمی کذا فی الکنز ج ۶ ص ۲۲۲۔ ورواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن (المشکوۃ ص ۵۸۴)

(۱۲۶) عن ابن عباس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نحن آخر الامم واول من یحاسب۔ این الامۃ الامیۃ ونبیھا فنحن الآخرون الاولون (رواہ ابن ماجۃ کذا)

(۱۲۷) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نحن الآخرون السابقون یوم القیامۃ بید انھم اوتوا الکتاب من قبلنا واوتیناہ من بعدھم رواہ الشیخان والنسائی (الکنز ج ۶ ص ۲۳۰) ومثلہ عند ابی نعیم فی الدلائل ص ۹۔

---

(۱۲۴) حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل حدیث میں فرمایا اے یہودی تم لوگ ہم سے پہلے ہو اور ہم گو تم سے آخر میں ہیں مگر قیامت کے دن حساب میں تم سے پہلے ہوں گے۔ اس حدیث کو ابن راہویہ نے اپنی مسند میں اور ابن ابی شیبہ نے مصنف میں روایت کیا ہے۔

(۱۲۵) بہز بن حکیم اپنے باپ حکیم اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن ستر امتیں پوری ہو جائیں گی ہم ان سب سے آخر اور سب سے بہتر ہوں گے۔ اس حدیث کو ابن ماجہ۔ دارمی اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(۱۲۶) ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم سب سے آخری امت ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہمارا حساب ہوگا۔ پکارا جائے گا امتِ امیہ اور اس کا نبی کہاں ہیں؟ اس لئے گو ہم سب سے آخر میں ہیں مگر (قیامت کے دن) سب سے پہلے ہو جائیں گے۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

(۱۲۷) ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ہم سب سے آخر ہیں، اور قیامت میں سب سے پہلے ہو جائیں گے صرف اتنی بات ہے کہ پہلی امتوں کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی ہے اور ہمیں ان کے بعد ملی ہے۔ اس حدیث کو شیخین اور نسائی نے روایت کیا ہے۔

(۱۲۸) عَنْ حُذَيْفَةَ مِثْلَهُ وَلَفْظُهُ نَحْنُ الْآخِرُوْنَ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا وَالْأَوَّلُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ رواہ مسلم

مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اٰخر مساجد الانبیاء

(۱۲۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ إِبْرَاهِيْمَ بْنِ قَارِظٍ أَشْهَدُ أَنِّيْ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ يَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَإِنِّيْ آخِرُ الْأَنْبِيَاءِ وَمَسْجِدِيْ آخِرُ الْمَسَاجِدِ۔ رواہ مسلم والنسائی ولفظہ خاتم الانبیاء وخاتم المساجد

(۱۳۰) عَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَدِيْثٍ طَوِيْلٍ أَنَا

---

(۱۲۸) حذیفہؓ سے بھی یہی مضمون مروی ہے اس کے لفظ یہ ہیں کہ ہم دنیا میں سب سے آخری امت ہیں اور قیامت میں سب سے پہلے ہوں گے۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد انبیاء کی مسجدوں میں آخری مسجد ہے

(۱۲۹) عبداللہ بن ابراہیم بن قارظ کہتے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے ابوہریرہؓ کو یہ کہتے سنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں سب انبیاء کے آخر میں ہوں اور میری مسجد بھی اب آخری مسجد ہے اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے اور نسائی کے لفظ میں آخر کے بجائے دونوں جگہ خاتم کا لفظ

(۱۳۰) ابوامامہ باہلیؓ ایک طویل حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں

---

(۱۲۸) انجیل متی کے باب ۱۹ میں آیت ۲۷ سے لیکر ۳۰ تک امت محمدیہ کے اس وصف کی طرف اشارہ موجود ہے۔

"پطرس نے جواب میں اس سے کہا کہ دیکھ ہم تو سب کچھ چھوڑ کر تیرے پیچھے ہوئے ہیں پس ہم کو کیا ملیگا یسوع نے ان سے کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو گئے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے اور جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں، یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میرے نام کی خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سوگنہ ملیگا۔ اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہوگا۔ لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول مخ"

ان الفاظ میں قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کی طرف بھی اشارہ ہے قل ان کان اٰباؤکم وابناؤکم وعشیرتکم الآیہ۔

سلہ آپ کی مسجد کے آخری مسجد ہونے کی شرح حدیث ۱۲۱ میں آچکی ہے۔

اٰخِرُ الْاَنْبِیَاءِ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ. رواہ ابن ماجۃ فی باب فتنۃ الدجال وابن خزیمۃ والحاکم والضیاء (منتخب الکنز ج ۶ ص ۱۴)

(۱۳۱) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ وَمَسْجِدِیْ خَاتَمُ مَسَاجِدِ الْاَنْبِیَاءِ. رواہ الدیلمی وابن النجار والبزار (الکنز)

قال الرب تبارک وتعالیٰ لیلۃ الاسراء انہ جعلہ خاتم النبیین

(۱۳۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَمَّا اُسْرِیَ بِیْ اِلَی السَّمَاءِ قَرَّبَنِیْ رَبِّیْ تَعَالٰی حَتّٰی کَانَ بَیْنِیْ وَبَیْنَہٗ کَقَابِ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی قَالَ یَا حَبِیْبِیْ یَا مُحَمَّدُ قُلْتُ لَبَّیْکَ یَا رَبِّ قَالَ ھَلْ غَمَّکَ اَنْ جَعَلْتُکَ اٰخِرَ النَّبِیِّیْنَ قُلْتُ

کہ میں انبیاء میں آخر ہوں اور تم امتوں میں آخر ہو۔ اس حدیث کو ابن ماجہ نے فتنہ دجال کے باب میں روایت کیا ہے اور ابن خزیمہ، حاکم اور ضیاء الدین نے روایت کیا ہے۔

(۱۳۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں انبیاء میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد انبیاء کی مسجدوں میں آخری مسجد ہے۔ اس حدیث کو دیلمی، ابن النجار اور بزار نے روایت کیا ہے۔

شب معراج میں پروردگار عالم کا راز و نیاز کے طور پر کہنا کہ اس نے آپ کو خاتم النبیین بنایا ہے

(۱۳۲) حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب شب معراج میں مجھے آسمان پر لے گئے تو میرے پروردگار نے مجھے قریب بلایا اور بہت قریب بلایا۔ اور کہا اے میرے حبیب، اے محمدؐ! میں نے کہا حاضر ہوں اے پروردگار۔ ارشاد ہوا اگر ہم تمہیں آخر النبیین بنا دیں تو تم ناخوش تو نہ ہوگے۔ میں نے عرض کیا اے پروردگار نہیں۔ پھر ارشاد ہوا اگر تمہاری امت کو

---

(۱۳۰) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر آپ کے بعد کوئی اور نبی ہو تو اس امت کے بعد کوئی دوسری امت ہوگی مگر چونکہ عالم کا فنا مقدر ہو چکا ہے اس لئے نہ کوئی اور نبی آئے گا نہ کوئی نئی امت، یہ نبی بھی آخری نبی ہے اور اس لئے امت بھی آخری امت ہے۔

(۱۳۱) اس حدیث سے مسلم کی حدیث کی شرح ہوگئی اور معلوم ہوگیا کہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام کے ناموں سے دنیا میں مسجدیں تعمیر ہوئیں اب آنحضرتؐ کے کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے اس لئے کوئی نئی مسجد بھی کسی رسول کے نام سے تعمیر نہ ہوگی بلکہ یہ مسجد نبوی ہی انبیاء علیہم السلام کی مسجدوں میں آخری مسجد رہے گی۔

الا یا رب قال حبیبی هل غمز امتک ان جعلتهم آخر الامم قلت یا رب لا قال ابلغهم عنی السلام واخبرهم انی جعلتهم آخر الامم (رواہ الخطیب والدیلمی۔ الکنز ج ۶ ص ۱۱۲)

قال الرب لآدم ان ابنہ احمد هو الاول والآخر

(۱۳۳) عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لما خلق الله عزوجل آدم علیه السلام اخبر ببنیه فجعل یری فضائل بعضهم علی بعض فرأی نورا ساطعا فی اسفلهم قال یا رب من هذا قال هذا ابنک احمد هو الاول وهو الآخر وهو شافع واول مشفع۔ رواہ ابن عساکر کما فی الکنز۔

قال جبرئیل لآدم ان محمدا صلی الله علیه وسلم آخر ولدک من الانبیاء

(۱۳۴) عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لما نزل آدم بالهند

آخری امت بنادیں تو وہ ناخوش تو نہ ہوگی میں نے عرض کیا نہیں اے پروردگار۔ ارشاد ہوا کہ اچھا تو اپنی امت کو میرا سلام کہنا اور انھیں بتلا دینا کہ میں نے انھیں آخری امت بنا دیا ہے۔ (کنز العمال)

حضرت آدمؑ سے حق تعالیٰ کا ارشاد کہ ان کے فرزند احمد و محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلے اور سب سے آخری نبی ہیں

(۱۳۳) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو انھیں ان کی اولاد بھی بتلائی۔ آدم علیہ السلام انھیں دیکھنے لگے کہ بعض بعض پر فضیلت رکھتے ہیں، ان سب کے آخر میں ایک بلند نور دیکھا تو عرض کیا اے میرے پروردگار یہ کون ہیں۔ ارشاد ہوا یہ تمہارے فرزند احمد ہیں، یہی سب سے پہلے نبی ہیں اور یہی سب سے آخر ہیں، یہی قیامت میں سب سے پہلے شفاعت کریں گے اور ان ہی کی شفاعت سب سے پہلے قبول ہوگی۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے

حضرت آدمؑ سے جبرئیلؑ کا ارشاد کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں آپ کے سب سے آخری بیٹے ہیں

(۱۳۴) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آدم علیہ السلام جب ہندوستان میں نازل ہوئے (اور تنہائی کی وجہ سے) گھبرائے تو جبرئیل علیہ السلام تشریف

وَاسْتَوْحَشَ فَنَزَلَ جِبْرِيْلُ فَنَادٰى بِاَذَانٍ اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ مَرَّتَيْنِ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مَرَّتَيْنِ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ مَرَّتَيْنِ قَالَ اٰدَمُ لِجِبْرِيْلَ مَنْ مُحَمَّدٌ قَالَ اٰخِرُ وُلْدِكَ مِنَ الْاَنْبِيَاءِ - رواه ابن عساکر (الکنز ج ۶ ص ۱۱۴ والخصائص ج ۱ ص ۸)

قال جبریل للنبی صلی اللہ علیہ وسلم انک خاتم النبیین کما ان آدم صفی اللہ

(۱۳۵) عَنْ سَلْمَانَ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ قَالَ قَالَ جِبْرِیْلُ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَبَّكَ یَقُوْلُ اِنْ كُنْتُ اِصْطَفَیْتُ اٰدَمَ فَقَدْ خَتَمْتُ بِكَ الْاَنْبِیَاءَ وَمَا خَلَقْتُ خَلْقًا اَكْرَمَ مِنْكَ عَلَیَّ (خصائص ج ۲ ص ۱۹۳)

لائے اور اذان کہی۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر، دو مرتبہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ دو مرتبہ اشہد ان محمدا رسول اللہ دو مرتبہ (جب حضرت آدمؑ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنا تو) فرمایا کہ یہ محمد کون ہیں؟ جبریلؑ نے کہا کہ انبیاء میں آپ کے سب سے آخری بیٹے ہیں۔ اس حدیث کو ابن عساکر نے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جبریلؑ کا فرمان کہ جس طرح حضرت آدمؑ کا لقب صفی اللہ تھا آپ کا لقب خاتم النبیین ہے

(۱۳۵) سلمانؓ سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ جبریل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا آپ کا پروردگار کہتا ہے اگر میں نے آدمؑ کو صفی اللہ کا خطاب دیا ہے تو آپ پر تمام انبیاء کو ختم کر کے (خاتم النبیین کا خطاب دیا ہے) اور میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جو مجھے آپ سے زیادہ عزیز ہو۔

---

(۱۳۴) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اذان ابتداء عالم میں بھی ہوئی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس حدیث کے طرق جمع کئے جائیں تاکہ اس کے تفصیلی کلمات کا پتہ بھی مل جائے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ اذان کا ایک نفع دفع وحشت بھی ہے سوم یہ بھی ثابت ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی جائے نزول ہندوستان میں کوئی جگہ ہے اگر یہ حدیث صحت کو پہنچ جائے تو تاریخی لحاظ سے یہ ایک بڑی حقیقت کا انکشاف ہوگا۔ ہم نے اس حدیث کو یہاں صرف آخری جزء کی وجہ سے نقل کیا ہے۔

(۱۳۵) اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ کا نبیوں میں آخر ہونا صرف ایک زمانی تاخر نہیں ہے بلکہ خدا کے نزدیک وہ خاص فضیلت ہے جو دیگر انبیاء علیہم السلام کے خصوصیات کے بالمقابل آپ کو مرحمت ہوئی ہے۔ عالم کا تدریجی ارتقاء بھی اسی کو مقتضی تھا کہ اس کی آخری کڑی سب میں کامل و برتر ہو۔ اس لئے آخری نبی وہی ہونا چاہئے جو سب میں کامل اور سب سے اکرم ہو۔

مکتوب بین کتفی آدم محمد رسول اللہ خاتم النبیین

(۱۳۶) عَنْ جَابِرٍ قَالَ بَیْنَ کَتِفَیْ آدَمَ مَکْتُوْبٌ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ۔ رواہ ابن عساکر۔ (خصائص ج ۱ ص ۷)

الشہادۃ بختم النبوۃ جزء من الایمان کالشہادۃ بکلمۃ التوحید

(۱۳۷) عَنْ زَیْدِ بْنِ حَارِثَۃَ فِیْ قِصَّۃٍ طَوِیْلَۃٍ لَہٗ حِیْنَ جَاءَتْ عَشِیْرَتُہٗ یَطْلُبُوْنَہٗ مِنْ عِنْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَعْدَ مَا اَسْلَمَ فَقَالُوْا لَہٗ اِمْضِ مَعَنَا یَا زَیْدُ فَقَالَ مَا اُرِیْدُ بِرَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَدَلًا وَّلَا غَیْرَہٗ اَحَدًا فَقَالُوْا مُحَمَّدُ اِنَّا مُعْطُوْکَ

حضرت آدمؑ کے دونوں شانوں کے درمیان یہ لکھا ہوا تھا "محمد رسول اللہ خاتم النبیین ہیں"

(۱۳۶) جابرؓ سے روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان یہ لکھا ہوا تھا "محمد رسول اللہ خاتم النبیینؐ" ہیں۔ اس حدیث کو ابنِ عساکر نے روایت کیا ہے۔

عقیدۂ ختمِ نبوۃ کلمۂ شہادت کی طرح ایمان کا جزء ہے

(۱۳۷) زید بن حارثہ اپنے ایک طویل قصہ میں ذکر کرتے ہیں کہ جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر مسلمان ہو گیا تو میرا قبیلہ مجھے تلاش کرتا ہوا آپ کے پاس آیا اور مجھ سے کہا اے زید ہمارے ساتھ چلو، زید بولے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلہ میں کسی کو پسند نہیں کر سکتا اور نہ آپ کے سوا کسی دوسرے کا ارادہ رکھتا ہوں، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا

(۱۳۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مہرِ نبوۃ بھی دونوں شانوں کے درمیان تھی مگر دجال کا کفر اس کی پیشانی پر لکھا ہوا ہوگا یعنی مہرِ نبوۃ کا مقام دونوں شانوں کے درمیان اور مہرِ دجل و کفر کا محل پیشانی منتخب ہوا ہے۔ اس کی حکمتیں بھی علماء نے لکھی ہیں۔

(۱۳۷) اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح خدا کی توحید پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح اپنی ختمِ نبوۃ پر بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان آپ کی ختمِ نبوۃ پر ایمان لائے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم میں ولکن رسول اللہ کے ساتھ وخاتم النبیین کا لفظ اسی لئے رکھا گیا ہے کہ آپ صرف رسول اللہ نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین بھی ہیں

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

بِهٰذَا الْغُلَامِ دِيَاتٍ فَسَمِّ مَا شِئْتَ فَإِنَّا حَامِلُوهُ إِلَيْكَ فَقَالَ أَسْأَلُكُمْ أَنْ تَشْهَدُوا أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنِّي خَاتَمُ أَنْبِيَائِهِ وَرُسُلِهِ وَأَرْسِلْهُ مَعَكُمْ الحديث ۔
اخرجه الحاكم مفصلاً في المستدرك (ج ۲ ص ۶۱۴)

ختم النبوة من خصائص النبي صلى الله عليه وسلم

(۱۳۸) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ
(رواہ مسلم والبخاری)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس لڑکے کے عوض میں ہم آپ کو بہت سا مال دے سکتے ہیں جو آپ چاہیں بتلا دیجئے ہم اسے ادا کردیں گے آپ نے ارشاد فرمایا میں تو تم سے صرف ایک چیز مانگتا ہوں وہ یہ کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ خدا کوئی نہیں مگر اللہ اور اس کی کہ میں اس کے سب نبیوں اور رسولوں میں آخری نبی اور رسول ہوں۔ بس میں اس لڑکے کو ابھی تمہارے ساتھ بھیجے دیتا ہوں ۔ (مستدرک)

ختم نبوۃ انبیاء علیہم السلام میں صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا طغرۂ امتیاز ہے

(۱۳۸) ابوہریرہ رضی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے انبیاء علیہم السلام پر چھ فضیلتیں دی گئی ہیں (۱) مجھے مختصر کلمات معانی کثیرہ کے حامل دیئے گئے ہیں (۲) دشمن پر رعب ڈال کر میری مدد کی گئی ہے (۳) میرے لئے مال غنیمت حلال کیا گیا ہے۔ (۴) تمام زمین میرے لئے مسجد اور پاک کرنے کا آلہ بنا دی گئی ہے (۵) تمام مخلوق کی طرف مجھے بھیجا گیا ہے۔ (۶) انبیاء کا سلسلہ میری ذات پر ختم کردیا گیا ہے۔ (اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کے برخلاف آپ سے بیشتر جتنے رسول ہوئے وہ صرف رسول اللہ تھے اسی لئے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیین ہے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مخصوص لقب ہے اور آپ نے ہی اس کا دعویٰ کیا ہے اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لقب بطور مدح نہیں بلکہ بہ حیثیت عقیدہ کے ایک عقیدہ ہے۔ خاتم الشعراء اور خاتم المحدثین کی طرح صرف ایک محاورہ نہیں۔

(۱۳۸) اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چند خصوصیات شمار کی گئی ہیں یہ خصوصیات صرف چھ تک محدود نہیں بلکہ بہت ہیں۔ حافظ سیوطیؒ نے اسی موضوع پر دو ضخیم جلدوں کی ایک کتاب لکھی ہے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

خاتم النبوة كان دليلاً على كونه خاتم النبيين

(۱۳۹) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ (رواه الترمذی فی شمائله)

دعوى النبی صلی الله علیه وسلم انه خاتم النبیین و اخرهم

(۱۴۰) عَنْ عِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنِّي عَبْدُ اللهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ۔ رواه البیهقی والحاکم وصححه۔ (کذا فی الدر المنثور ج ۵ ص ۲۰۷)

مہرِ نبوۃ خود اس کی دلیل تھی کہ آپ خاتم النبین ہیں

(۱۳۹) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہرِ نبوۃ تھی۔ کیونکہ آپ خاتم النبین تھے۔ (اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعویٰ کرنا کہ خاتم النبین اور آخری نبی میں ہوں

(۱۴۰) عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں عبد اللہ ہوں۔ (اللہ کا بندہ) اور میں خاتم النبین ہوں (آخری نبی) اس حدیث کو بیہقی اور حاکم نے روایت کیا ہے اور اس کو صحیح کہا ہے)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) جو خصائص الکبریٰ کے نام سے مشہور ہے۔ مفہوم عدد علماء کے نزدیک حجت نہیں۔ یہ متکلم کے وقتی استحضار اور اس کے ذہنی اعتماد کی بات ہوتی ہے۔ یہاں ۵ و ۶ خصوصیتیں زیر بحث ہیں بقیہ خصوصیات پر اپنی اپنی جگہ بحث آئیگی خصوصیت (۵) کا مطلب علماء کے نزدیک یہ ہے کہ آپ کی بعثت آپ کے زمانہ سے لیکر قیامت تک کے لئے ہے لیکن شیخ تقی الدین سبکی فرماتے ہیں کہ آپ کی بعثت آپ سے پیشتر اور آپ کے بعد دونوں زمانوں کو شامل ہے۔ آدم علیہ السلام سے لیکر قیامت تک آنیوالی دنیا سب آپ کی بعثت کے ماتحت ہے جس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے۔ اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ خاتم النبین آپ کی ایک خصوصیت تھی صرف تعریفی لقب نہ تھا جو مجازاً دوسروں پر بھی اطلاق ہو سکتا۔

(۱۳۹) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس معنوی خصوصیت کو حسی شکل میں بھی ظاہر کر دیا گیا تھا کتبِ سابقہ میں بھی مہرِ نبوۃ آپ کی ایک علامت بتلائی گئی تھی۔ اسی لئے بعض طالبینِ حق نے منجملہ دیگر علامات کے آپ کی مہرِ نبوۃ کو بھی تلاش کیا ہے۔ اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خاتم النبین آپ کا شاعرانہ لقب نہ تھا بلکہ مہرِ نبوۃ اور آخری نبی ہونے کی وجہ سے آپ کو خاتم النبیین کہا جاتا تھا۔

(۱۴۰) حضرت مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف معنی ترکیبی کے لحاظ سے "عبد اللہ" نہیں ہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام میں "عبد اللہ" آپ کا لقب بھی تھا۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ ملاحظہ ہو)

(۱۴۱) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ مَرْفُوْعًا اِنِّیْ خَاتَمُ اَلْفِ نَبِیٍّ اَوْ اَکْثَرَ۔ رواہ فی المستدرک (الکنز ج۶ ص۱۲۰)

(۱۴۲) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا اَبَا ذَرٍّ اَوَّلُ الْاَنْبِیَاءِ اٰدَمُ وَاٰخِرُھُمْ مُحَمَّدٌ۔ رواہ ابن حبان فی صحیحہ وابو نعیم فی الحلیہ وابن عساکر والحکیم الترمذی (الکنز ج۶ ص۱۲۰) واخرجہ ابن حبان فی تاریخہ فی السنۃ العاشرۃ ص۶۹ مخطوط

(۱۴۱) ابو سعیدؓ مرفوعًا روایت کرتے ہیں۔ میں ایک ہزار نبی یا اس سے زیادہ کے آخر میں آیا ہوں اس حدیث کو مستدرک میں روایت کیا ہے۔

(۱۴۲) ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے ابو ذر انبیاء علیہم السلام میں سب سے پہلے نبی حضرت آدمؑ اور سب کے آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ابو نعیم نے الحلیہ میں اور ابن عساکر اور حکیم ترمذی نے روایت کیا ہے نیز ابن حبان نے اپنی تاریخ میں ۱۰ھ کے احوال میں اس کو روایت کیا ہے (از قلمی نسخہ)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) قرآن کریم میں "عبد اللہ" بطور لقب صرف آپ کی ذات پر اطلاق ہوا ہے "فلما قام عبد اللّٰہ کادوا یکونون علیہ لبدا" جب عبد اللہ (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو قریب تھا کہ وہ جتھہ ہو کر آپ پر ٹوٹ پڑتے۔ حدیث میں ہے کہ آپ کو اختیار دیا گیا تھا اگر چاہیں رسالت کے ساتھ ملوکیت پسند کر لیں جیسا کہ سلیمان علیہ السلام تھے یا چاہیں تو عبدیت اختیار کر لیں۔ آپ نے عبدیت کو ہی پسند فرمایا اس کے بعد آپ کی نشست و برخاست، طعام و شراب سب میں عبدیت کا پہلو غالب تھا۔ دعاء تشہد میں بھی عبدہ ورسولہ تعلیم کیا گیا ہے یعنی عبدیت کو مقدم رکھا گیا ہے حتی کہ ایک شخص نے اس ترتیب کو بدل کر جب رسولہ وعبدہ کہا تو آپ نے اس کی اصلاح فرمائی اور کہا کہ وہی عبدہ ورسولہ کہو۔ شیخ اکبر تحریر فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ پر مقام عبدیت سوئی کے ناکے کے برابر منکشف ہوا تھا تو میں اس کی بھی تاب نہ لاسکا اور قریب تھا کہ جل جاتا۔ اسی طرح آپ کا دوسرا لقب خاتم النبیین ہے۔ پہلا لقب آپ کی ذاتی صفت اور دوسرا بلحاظ انبیاء علیہم السلام ہے۔ آپ سے پہلے کسی رسول نے یہ دعوٰی نہیں کیا بلکہ دوسرے رسولوں کی آمد کی بشارت دی ہے اگر یہ لقب صرف شاعرانہ مبالغہ ہوتا تو آپ سے پہلے انبیاء پر بھی اس کا اطلاق درست ہوتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوٰی کرنا بتلاتا ہے کہ پہلے صحف میں کسی خاتم النبیین کی بشارت موجود تھی آپ بتلا رہے ہیں کہ اس کا مصداق میں ہوں۔

(۱۴۱) مشکوۃ میں ایک حدیث میں انبیاء علیہم السلام کا عدد ایک لاکھ چوبیس ہزار مذکور ہے چونکہ یہاں راوی نے او اکثر کا لفظ کہدیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کو اصل عدد محفوظ نہیں رہا اس لئے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حدیث میں ہزار کے عدد سے کسی خاص شان کے نبی مراد لئے گئے ہوں۔

(۱۴۲) انبیاء علیہم السلام کے اول و آخر کی اس تحدید سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی شخص جس کو نبی کہہ کر پکارا جائے نہیں ہوگا۔ پہلے آدم علیہ السلام ہیں اور آخری آپ اور بس۔ نیز اس حدیث میں حضرت آدم علیہ السلام کی نبوۃ کی تصریح بھی موجود ہے اسی طرح مشکوۃ میں ہے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ حضرت آدم نبی تھے تو آپ نے فرمایا نعم نبی مکلم۔ ہاں خدا کے نبی تھے۔ خدا تعالیٰ ان سے باتیں کرتا تھا۔

وصية النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ لا نبی بعدہ

(۱۴۳) عن ابن عمر یقول خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوماً کالمودع فقال انا النبی الامی ثلاثاً ولا نبی بعدی (الی قولہ) فاسمعوا واطیعوا ما دمت فیکم فاذا ذہب بی فعلیکم بکتاب اللہ تعالیٰ احلوا حلالہ وحرموا حرامہ (رواہ احمد فی مسندہ) (تفسیر ابن کثیر ج ۸ ص ۹۱)

(۱۴۴) عن ابی امامۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی خطبۃ یوم حجۃ الوداع ایہا الناس انہ لا نبی بعدی ولا امۃ بعدکم فاعبدوا ربکم وصلوا خمسکم وصوموا شہرکم وادوا زکوۃ اموالکم طیبۃ بہا انفسکم واطیعوا ولاۃ امورکم تدخلوا جنۃ ربکم (منتخب الکنز علی ہامش مسند احمد ج ۴ ص ۲۱۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۱۴۳) ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے (اور اس طرح تقریر فرمائی) جیسے کوئی رخصت ہونے والا تقریر کیا کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "نبی امی" (جن کے آمد کی خبر تھی وہ) میں ہی ہوں اور میرے بعد اب کوئی نبی نہ ہوگا۔ (اسی تقریر میں یہ بھی فرمایا) جب تک میں تمہارے اندر موجود ہوں میرے احکام سنو اور ان کی اتباع کرتے رہو اور جب مجھے دنیا سے اٹھا لیا جائے تو تم کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے رہنا جو اس میں حلال ہے اس کو حلال اور جو حرام ہے اس کو حرام سمجھتے رہنا۔ اس حدیث کو احمد نے اپنی مسند میں روایت کیا ہے۔

(۱۴۴) ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا اے لوگو! تو میرے بعد اب کوئی نبی ہوگا اور نہ تمہارے بعد کوئی امت۔ بس اپنے رب کی عبادت کرتے رہو اور اپنی پانچ نمازیں پڑھتے رہو اور رمضان کے روزے رکھے جاؤ۔ اور اپنے مالوں کی زکوۃ خوشی خوشی ..... دیئے جاؤ، اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرتے رہو تو اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(۱۴۴) مطلب یہ ہے کہ نجات اب صرف ان فرائض اسلام پر عمل کرنے میں منحصر ہو گئی ہے اگر پہلے زمانہ کی طرح آئندہ کوئی رسول آنے والا ہوتا تو اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہوتا۔ اب ایمان کا معاملہ تو مکمل ہو چکا ہے صرف عمل کا مرحلہ باقی ہے وہ بھی اتنا مختصر ہے کہ بس فرائض کے یہ چند قدم ہیں انھیں طے کرو اور آگے جنت ہے۔

(۱۴۵) عَنْ اَبِیْ قُبَیْلَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ وَلَااُمَّۃَ بَعْدَکُمْ فَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَاَقِیْمُوْا خَمْسَکُمْ وَصُوْمُوْا شَہْرَکُمْ وَاَطِیْعُوْا وُلَاۃَ اَمْرِکُمْ تَدْخُلُوْا جَنَّۃَ رَبِّکُمْ۔ رواہ الطبرانی والبغوی (کذا فی الکنز)

(۱۴۶) عَنِ الضَّحَّاکِ بْنِ نَوْفَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ وَلَااُمَّۃَ بَعْدَ اُمَّتِیْ۔ رواہ البیہقی فی کتاب الرؤیا۔

تصدیق ماھان عامل الروم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لا نبی بعدہ

(۱۴۷) عَنْ خَالِدِ بْنِ الْوَلِیْدِ فِیْ حَدِیْثٍ طَوِیْلٍ اَنَّہٗ سَاَلَہٗ مَاھَانُ عَامِلُ مَلِکِ الرُّوْمِ عَلَی الشَّامِ ھَلْ کَانَ رَسُوْلُکُمْ اَخْبَرَ اَنَّہٗ یَاْتِیْ بَعْدَہٗ رَسُوْلٌ قَالَ وَلٰکِنْ اَخْبَرَ اَنَّہٗ لَانَبِیَّ بَعْدَہٗ وَاَخْبَرَ اَنَّ عِیْسَی بْنَ مَرْیَمَ قَدْ بَشَّرَ بِہٖ قَوْمَہٗ قَالَ الرُّوْمِیُّ وَاَنَا عَلٰی ذٰلِکَ مِنَ الشَّاھِدِیْنَ (خصائص ص۱۲۳)

(۱۴۵) ابوقبیلہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔۔ میرے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوگا اور تمہارے بعد اب کوئی امت نہیں آئے گی پس تم اپنے پروردگار کی عبادت کرتے رہو، اپنی پانچ نمازیں ٹھیک ٹھیک پڑھتے رہو، ماہِ رمضان کے روزے رکھتے رہو، اور اپنے حکام کی اطاعت کے بعد اپنے پروردگار کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(۱۴۶) ضحاک بن نوفلؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میرے بعد اب کوئی نبی نہ ہوگا اور میری امت کے بعد کوئی امت نہیں ہوگی۔ اس حدیث کو بیہقی نے کتاب الرؤیا میں روایت کیا ہے۔

ملک روم کے گورنر کی تصدیق کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۱۴۷) خالد بن ولیدؓ نے ایک طویل حدیث میں کہا کہ ماہان نے جو شام پر شاہِ روم کا عامل تھا ان سے دریافت کیا، کیا تمہارے رسول نے تم سے یہ کہا ہے کہ ان کے بعد کوئی اور رسول آئیگا۔ انھوں نے کہا نہیں بلکہ یہ خبردی ہے کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے ان کی آمد کی بشارت اپنی قوم کو دی تھی۔ ماہان رومی نے کہا کہ میں بھی اس پر گواہی دینے والوں میں ہوں۔

۱۴۷؎ حضرت ابوعبیدہؓ جب یرموک پہنچے تو روم کے لشکر کے سوار نے ان کے پاس ایک قاصد بھیجا اس نے کہا کہ میں ماہان گورنر کے پاس سے آیا ہوں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی جماعت میں سے ۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

شهادة الضب انه رسول الله وخاتم النبيين

(۱۴۸) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فِي حَدِيثٍ طَوِيلٍ فَقَالَ الْأَعْرَابِيُّ لَا اٰمَنْتُ بِكَ حَتّٰى يُؤْمِنَ بِكَ هٰذَا الضَّبُّ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنَا يَا ضَبُّ فَقَالَ الضَّبُّ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ يَفْهَمُهُ الْقَوْمُ جَمِيعًا لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ يَا رَسُولَ رَبِّ الْعَالَمِينَ قَالَ مَنْ تَعْبُدُ فَقَالَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ عَرْشُهٗ وَفِي الْاَرْضِ سُلْطَانُهٗ وَفِي الْبَحْرِ

گوہ کی شہادت کہ آپ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں

(۱۴۸) حضرت عمرؓ ایک طویل قصہ میں روایت فرماتے ہیں (کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دیہاتی آدمی کو اسلام کی دعوت دی) اس نے کہا جب تک یہ گوہ ایمان نہ لائے میں آپ پر ایمان نہیں لا سکتا۔ آپ نے فرمایا اے گوہ بتلا میں کون ہوں۔ گوہ نے نہایت فصیح عربی میں جواب دیا جسے سب حاضرین نے سمجھا اے رب العالمین کے رسول میں حاضر ہوں اور آپ کی فرمانبردار ہوں آپ نے فرمایا بتلا تو کس کے نام کی تسبیح کرتی ہے وہ بولی جس کا عرش آسمان پر ہے اور جس کا حکم زمین پر نافذ ہے، جس نے سمندر میں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ایک عقلمند شخص ہمارے پاس بھیجدیں تاکہ ہم اس سے گفتگو کرلیں حضرت ابو عبیدہؓ نے اس کام کے لئے خالد بن ولیدؓ کو منتخب فرمایا اور انہوں نے وہ گفتگو کی جو اوپر مذکور ہے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلی بشارات میں نبی منتظر کی ایک علامت یہ بھی تھی کہ اس کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اس لئے دوسری باتوں کے ساتھ اس کی تحقیق بھی کی جاتی تھی کہ اور انبیاء کی طرح آپ نے کسی نبی کی آمد کی خبر تو نہیں دی۔

(۱۴۸) حیوانات کی گفتگو اور ان کی شہادت دینا اگر بطور عادت و فطرت نقل کی جائے تو بیشک تعجب کرنا چاہئے اگر بطریق معجزہ منقول ہو تو اس پر تعجب کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے انبیاء علیہم السلام کے معجزات تمام خارق عادات ہی ہوتے ہیں اور ان کا بہت سے تواتر سے بھی ثابت ہیں لہٰذا صرف اس وجہ سے حدیث کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہاں اگر اس کا روایتی پہلو ناقابل اعتبار ہوتا تو بیشک ایک بات ہوسکتی تھی۔ مگر اس کا روایتی پہلو بھی اتنا مخدوش نہیں ہے۔ یہاں حیوان کی شہادت میں لفظ رسولؐ اللہ کے ساتھ خاتم النبیین کا لفظ ایسا ہی ہے جیسا کہ آیت قرآنی میں یہ دونوں لفظ یکجا رکھے گئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی رسالت کا صحیح اور پورا مفہوم اسی وقت ادا ہوتا ہے جبکہ آپ کو خاتم النبیین بھی سمجھا جائے۔ آپ کو صرف رسول اللہ کہنا اور خاتم النبیین نہ کہنا آپ کی حیثیت کے صرف ایک جزو ہی کو ادا کرتا ہے اور وہ بھی مشترک جزو کو۔ آپ کے منصب عالی کا ممتاز جزو خاتم النبیین ہے لیکن چونکہ یہ دونوں حیثیتیں آپ کی ذات میں جمع تھیں اور اس طرح جمع تھیں گویا ایک ذات کے دو عنوان ہیں اس لئے عام طور پر صرف اقرار رسالت ختم نبوۃ کے اقرار کے لئے کافی سمجھا گیا تھا جیسا کہ کلمہ توحید کا۔ اس کا اقرار گو رسالت کے اقرار سے ایک جدا گانہ شئے ہے مگر جو توحید کہ آپ کی حکم برداری میں تسلیم کی جائے وہ اقرار بالرسالۃ کے ہم معنی تھی اس لئے بعض احادیث میں صرف کلمۂ توحید کی شہادت کو مدار نجات قرار دیدیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کی رسالت اور ختم نبوت کا مسئلہ سمجھنا چاہئے۔

سَبِيلَهُ وَفِي الْجَنَّةِ رَحْمَتُهُ وَفِي النَّارِ عَذَابُهُ قَالَ فَمَنْ أَنَا قَالَ أَنْتَ رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ۔ الحديث۔ اخرجه الطبرانی فی الاوسط والصغیر وابن عدی والحاکم فی المعجزات والبیھقی وابونعیم وابن عساکر ولیس فی اسنادہ من ینظر فی حالہ سوی محمد بن علی بن الولید البصری السلمی شیخ الطبرانی وابن عدی وقال السیوطی فی الخصائص قلت لحدیث عمر طریق آخر لیس فیه محمد بن علی بن الولید اخرجه ابونعیم وروی عن عائشة وابی ہریرة وعلی رضی الله تعالیٰ عنہم مثلہ کما فی الخصائص ج ۲ ص ۶۵۔

شهادة زید بن خارجة بعد وفاته انه صلی الله علیه وسلم لانبی بعده

(۱۴۹) عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ قَالَ كَانَ زَيْدُ بْنُ خَارِجَةَ مِنْ سَرَاةِ الْأَنْصَارِ فَبَيْنَمَا هُوَ يَمْشِي فِي طَرِيقٍ مِنْ طُرُقِ الْمَدِينَةِ بَيْنَ الظُّهْرِ وَالْعَصْرِ إِذْ خَرَّ فَتُوُفِّيَ فَأُعْلِمَتْ بِهِ الْأَنْصَارُ فَأَتَوْهُ فَاحْتَمَلُوهُ إِلَى بَيْتِهِ وَسَجَّوْهُ كِسَاءً وَبُرْدَيْنِ وَفِي الْبَيْتِ نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءِ الْأَنْصَارِ

راستے بنادیئے جس کی رحمت کا مظہر جنت، جس کے عذاب کا مظہر دوزخ ہے۔ آپ نے فرمایا میں کون ہوں؟ اس نے جواب دیا۔ آپ جہان کے پروردگار کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم اوسط اور معجم صغیر میں اور ابن عدی نے اور حاکم نے معجزات اور بیہقی، ابونعیم اور ابن عساکر نے روایت کیا ہے اور اس کے راویوں میں سوائے محمد بن علی بن الولید کے کوئی راوی ایسا نہیں ہے جس کے معاملہ میں غور کرنے کی ضرورت ہو، یہ طبرانی اور ابن عدی کے شیخ ہیں۔ سیوطی خصائص الکبریٰ میں فرماتے ہیں۔ کہ حدیث عمرؓ کے لئے ایک اور طریقہ بھی ہے جس میں یہ راوی نہیں ہے ابونعیم نے ان کو بیان کیا ہے نیز حضرت عائشہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ اور . . . حضرت علیؓ سے بھی اسی کے ہم معنی مضمون مروی ہے۔

وفات کے بعد زید بن خارجہ کی شہادت کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

(۱۴۹) نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ زید بن خارجہ انصار کے سرداروں میں تھے ایک دن وہ ظہر و عصر کے درمیان مدینہ کے کسی راستہ پر جارہے تھے کہ یکایک گرے اور فوراً وفات ہوگئی انصار کو اس واقعہ کی خبر ہوئی وہ آئے اور انھیں اٹھا کر گھر لے گئے اور ایک کمبل اور دو چادروں سے ان کو ڈھانک دیا۔ گھر میں انصار کی کچھ عورتیں اور مرد ان پر رو رہے تھے یہ گریہ وزاری ہوتا رہا حتی کہ جب مغرب و عشاء کا

يَبْكِيْنَ عَلَيْهِ وَرِجَالٌ مِنْ رِجَالِهِمْ فَمَكَثَ عَلَى حَالِهٖ حَتّٰى إِذَا كَانَ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ إِذْ سَمِعُوْا صَوْتَ قَائِلٍ يَقُوْلُ أَنْصِتُوْا أَنْصِتُوْا فَنَظَرُوْا فَإِذَا الصَّوْتُ مِنْ تَحْتِ الثِّيَابِ فَحَسَرُوْا عَنْ وَجْهِهٖ وَصَدْرِهٖ فَإِذَا الْقَائِلُ يَقُوْلُ عَلٰى لِسَانِهٖ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ النَّبِيُّ الْأُمِّيُّ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتَابِ الْأَوَّلِ صَدَقَ صَدَقَ۔

كان النبي صلى الله عليه وسلم رسولا الى اهل زمانه ومن بعدهم سواء

(۱۵۰) عَنِ الْحَسَنِ مُرْسَلًا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا رَسُوْلُ مَنْ أَدْرَكْتُ حَيًّا وَمَنْ يُّوْلَدُ بَعْدِيْ۔ رواه ابن سعد۔ الکنز ج ۶ ص ۱۰۱ والخصائص ج ۲ ص ۱۸۸۔

درمیان ہوا تو دفعۃً ایک غیبی آواز آئی " خاموش رہو، خاموش رہو" اِدھر اُدھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ آواز ان کپڑوں کے نیچے سے ہی آرہی ہے جس میں میت ہے لوگوں نے ان کا منہ اور سینہ کھولا، کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی غیبی شخص ان کی زبان سے یہ کہہ رہا ہے " محمد رسول اللہ نبی، امی، خاتم النبیین ہیں، ان کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوگا۔ یہ تورات و انجیل میں موجود ہے۔ سچ ہے سچ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ اور بعد میں آنیوالے سب انسانوں کے لئے یکساں رسول ہیں

(۱۵۰) حضرت حسنؒ سے مرسلاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں ان کا بھی رسول ہوں جو اب زندہ ہیں اور ان کا بھی جو میرے بعد پیدا ہوں گے۔ اس حدیث کو ابن سعد نے روایت کیا ہے۔

---

(۱۴۹) کرامت کے طور پر میت کا بولنا بھی کچھ تعجب کی بات نہیں تھی مگر راوی نے اس کی ایک اور توجیہ بھی کردی ہے اور وہ یہ کہ یہاں بولنے والا دراصل کوئی فرشتہ تھا میت کی زبان ان کلمات کی ادائیگی کے لئے صرف ایک واسطہ کا کام دے رہی تھی۔ جمادات و حیوانات کے ان خارق عادت شہادات سے مقصود یہ ہے کہ بنی آدم کی فطرت زیادہ سے زیادہ متاثر ہو کر نصیحت و عبرت حاصل کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے لئے اور زیادہ مستعد ہو جائے۔

(۱۵۰) بعثتِ عام اور ختم نبوۃ کو بڑا گہرا ربط ہے اسی لئے پہلی حدیث میں دونوں خصوصیتوں کو ایک جگہ ذکر کیا گیا ہے اگر آپ کی بعثت عام نہ ہوتی اور نبوۃ ختم ہو جاتی تو آنیوالی امت بلا رسول رہ جاتی یہ بجائے نعمت کے اور ایک زحمت ہوتی اس لئے جب نبوۃ کا ختم ہونا مقدر ہوا تو آپ کی بعثت کا دامن قیامت تک کے انسانوں پر پھیلا دیا گیا تاکہ رہتی دنیا تک تمام انسان اس کامل و اکمل رسالت کے نیچے آجائیں اور کسی دوسرے رسول کے محتاج نہ رہیں۔ اور اگر آپ کی بعثت تو عام ہوتی مگر نبوۃ ختم نہ ہوتی تو اب آئندہ اگر کوئی اور کامل رسول آتا اور آپ کی بجائے اس کی اتباع لازم ہوتی تو آپ کا نقصان ثابت ہوتا اور اگر کوئی ناقص رسول آتا تو کامل کے ہوتے ہوئے ناقص کے دامن میں آنا بجائے رحمت کے زحمت بن جاتا۔ والعیاذ باللہ اس لئے بعثت عامہ کے بعد نبوۃ کا ختم ہونا ضروری اور لازم ہوگیا۔

توضيح النبي صلى الله عليه وسلم ختم النبوة بمثال

(۱۵۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ مَثَلِي وَمَثَلَ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَأَحْسَنَهُ وَأَجْمَلَهُ إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلَّا وُضِعَتْ هٰذِهِ اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ رواه الشيخان واحمد والنسائی والترمذی وفی بعض الفاظه فكنت انا سددت مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ وَخُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ۔ رواہ ابن عساکر کما فی الکنز)

(۱۵۲) عَنْ جَابِرٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِي وَمَثَلُ الْأَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى دَارًا فَأَكْمَلَهَا فَأَحْسَنَهَا إِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَكَانَ مَنْ دَخَلَهَا فَنَظَرَ إِلَيْهَا قَالَ مَا أَحْسَنَهَا إِلَّا مَوْضِعَ اللَّبِنَةِ فَخُتِمَ بِيَ الْأَنْبِيَاءُ۔ رواه الشیخان والترمذی وابن ابی حاتم

(۱۵۳) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثَلِي وَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ختم نبوۃ کو ایک مثال دیکر واضح کرنا

(۱۵۱) ابوہریرہؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اسے خوب آراستہ و پیراستہ کیا مگر اس ایک گوشہ میں صرف ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ... لوگ آ آ کر اس کے ارد گرد گھومنے لگے اور تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھدی گئی (تاکہ یہ عیب بھی نہ رہتا) اس کے بعض الفاظ میں یہ ہے کہ میں نے آکر اس اینٹ کی جگہ کو پُر کر دیا ہے اور اب قصرِ نبوۃ میری آمد سے مکمل ہو گیا ہے اور مجھ پر تمام رسول ختم کر دیئے گئے۔ (کنز العمال)

(۱۵۲) جابرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میری مثال اور مجھ سے پہلے انبیا کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا اور خوب عمدہ اور مکمل بنایا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی جو شخص اس میں داخل ہوتا اور اسے دیکھتا تو کہتا تمام گھر کس قدر خوبصورت ہے مگر یہ ایک اینٹ کی جگہ (وہ اینٹ میں ہوں) اور انبیاء مجھ پر ختم کر دیئے گئے ہیں۔ (اس حدیث کو شیخین ترمذی ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے)

(۱۵۳) ابو سعید خدریؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میری اور نبیوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور اس کو پورا بنا دیا مگر ایک اینٹ کی جگہ

مَثَلُ النَّبِيِّينَ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَاَتَمَّهَا اِلَّا لَبِنَةً وَاحِدَةً فَجِئْتُ اَنَا وَاَتْمَمْتُ تِلْكَ اللَّبِنَةَ۔ (رواہ مسلم واحمد)

(۱۵۴) عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَثَلِيْ فِي النَّبِيِّيْنَ كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰى دَارًا فَاَحْسَنَهَا وَاَكْمَلَهَا وَاَجْمَلَهَا وَتَرَكَ مِنْهَا مَوْضِعَ لَبِنَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوْفُوْنَ بِالْبِنَاءِ وَيَعْجَبُوْنَ مِنْهُ وَيَقُوْلُوْنَ لَوْ تَمَّ مَوْضِعُ تِلْكَ اللَّبِنَةِ وَاَنَا فِي النَّبِيِّيْنَ مَوْضِعُ تِلْكَ اللَّبِنَةِ۔ رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن صحیح غریب۔

لا نبی بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم وان کان من غیر تشریع

(۱۵۵) عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِيْ وَقَّاصٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِعَلِيٍّ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (رواہ البخاری ومسلم فی غزوۃ تبوک)

رہنے دی، میں آیا اور اس اینٹ کو بھی پورا کر دیا۔ اس حدیث کو مسلم و احمد نے روایت کیا ہے۔

(۱۵۴) ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نبیوں میں میری مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے گھر بنایا اور نہایت خوشنما مکمل اور آراستہ بنایا لیکن اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ اس محل کے ارد گرد گھومتے اور اسے تعجب سے دیکھ دیکھ کر کہتے ہیں کاش اس اینٹ کی جگہ بھی پوری ہو جاتی۔ تو میں نبیوں میں ایسا ہی ہوں جیسے یہ اینٹ اس محل میں۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں خواہ غیر تشریعی نبی ہو

(۱۵۵) سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ سے تھی، اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

---

(۱۵۴) ان تشبیہات کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح اس تعمیر میں جو ہر طرح مکمل ہو چکا ہو اب کسی اور اینٹ کی کوئی گنجائش نہیں رہی اسی طرح میری آمد کے بعد اب کسی اور نبی کے آنے کا احتمال نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ختم نبوۃ کے اس موٹے سے مسئلہ کو پیرایہ بہ پیرایہ، طریقہ بہ طریقہ آخر کیوں اتنا سمجھا رہے ہیں۔ آپ کا آخری نبی ہونا کوئی دقیق مسئلہ نہیں جس کے لئے اتنی تفہیم کی حاجت ہو پھر یہ اہمیت کیوں ہے۔ اس کا جواب آپ کو ان احادیث کے مطالعہ کے بعد خود واضح ہو جائے گا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدعیین نبوت کے متعلق پیشگوئی کی گئی ہے۔

وفی لفظ مسلم خلفہ علیہ السلام فی بعض مغازیہ فقال لہ علیؓ یا رسول اللہ خلفتنی مع النساء والصبیان فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اما ترضی ان تکون بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبوۃ بعدی وفی لفظ آخر عندہ الا انک لست نبیا۔

(۱۵۶) عن جابر بن عبد اللہؓ قال لما اراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان یخلف قال لہ علیؓ ما یقول الناس فی اذا خلفتنی قال فقال اما ترضی ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا یکون بعدی نبیؓ۔ رواہ احمد وابن ماجۃ والترمذی)

اس حدیث کو بخاری و مسلم نے غزوۂ تبوک کے بیان میں روایت کیا ہے اور مسلم کے الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنگ کے موقعہ پر حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ نہ لیا تو حضرت علیؓ نے آپ کی خدمت میں (حسرت سے) عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جارہے ہیں؟ آپ نے (ان کی تسلی کے لئے) فرمایا کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہ نسبت حاصل ہو جو ہارون کو حضرت موسیٰ سے حاصل تھی مگر فرق یہ ہے کہ میرے بعد نبوۃ باقی نہیں اور مسلم کے دوسرے لفظ یہ ہیں مگر تم نبی نہیں ہو۔

(۱۵۶) جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ ارادہ کیا کہ حضرت علیؓ کو اپنے ساتھ نہ لیجائیں تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اگر آپ مجھے (اپنے ہمراہ نہ لیجائیں گے اور) پیچھے چھوڑ جائیں گے تو بھلا لوگ میرے متعلق کیا کیا باتیں کہیں گے۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے فرمایا کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میری تمہاری وہ نسبت ہے جو ہارون ؑ و موسیٰ ؑ کی تھی اتنا فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ اس حدیث کو احمد، ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔

(۱۵۶) ان دونوں حدیثوں میں حضرت علیؓ کو حضرت ہارون علیہ السلام کی ذات سے تشبیہ دینا مقصود نہیں اسی لئے انت بمنزلتہ ھارون نہیں فرمایا بلکہ اس نسبت اور علاقہ سے تشبیہ مقصود ہے جو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے درمیان تھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے اپنی غیبت کے زمانہ میں اپنی قوم کی نگرانی کے لئے اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کا انتخاب کیا تھا، اسی طرح اپنی غیبت میں میں تمہارا انتخاب کرتا ہوں۔ اتنا فرق مزید ہے کہ وہ نبی تھے تم نبی نہیں ہو۔ حضرت ہارونؑ کو چونکہ نبوت کے ساتھ خلافت ملی تھی اس لئے اس مجمل تعبیر سے یہ وہم پیدا ہو سکتا ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت بھی کہیں خلافت نبوۃ نہ ہو اس لئے اس احتمال کو بھی برداشت نہیں کیا گیا اور اس کو صاف طور پر صاف کر دیا گیا ہے تاکہ آنیوالی امت محض الفاظ کے ابہام سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر حضرت علیؓ کو نبوت ملتی تو وہ یقیناً آپ کے اتباع ہی کی بدولت ہوتی مگر جب اس احتمال کی بھی نفی کر دی گئی تو اب توسط یا بلا توسط کسی نبوۃ کا احتمال باقی نہیں رہا۔ اگرچہ نبوت کا کسی نبی کے اتباع سے ملنا خود ایسا مسئلہ ہے جس کے لئے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل نہیں ہے اور اسی لئے دنیا کی تاریخ میں کوئی نبی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جو کسی نبی م میں انعامی طور پر نبی بنا دیا گیا ہو یہ محض نفسانی اختراع اور خود ساختہ خیال ہے۔

م کے اتباع کے صلہ

(۱۵۷) عَنْ زَيْدِ بْنِ اَبِيْ اَوْفٰى قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (يا على) وَالَّذِيْ بَعَثَنِيْ بِالْحَقِّ مَا اَخَّرْتُكَ اِلَّا لِنَفْسِيْ وَاَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ (رواه احمد وابن عساكر) الكنز۔

(۱۵۸) عَنْ عَلِيٍّ قَالَ وَجِعْتُ وَجَعًا فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاَقَامَنِيْ فِيْ مَقَامِهٖ وَقَامَ يُصَلِّيْ وَاَلْقٰى عَلَيَّ طَرَفَ ثَوْبِهٖ ثُمَّ قَالَ بَرِئْتَ يَا ابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ فَلَا بَأْسَ عَلَيْكَ مَا سَأَلْتُ اللّٰهَ شَيْئًا اِلَّا سَأَلْتُ لَكَ مِثْلَهٗ وَلَا سَأَلْتُ اللّٰهَ شَيْئًا اِلَّا اَعْطَانِيْهِ غَيْرَ اَنَّهٗ قِيْلَ لِيْ اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ فَقُمْتُ كَاَنِّيْ مَا اشْتَكَيْتُ۔ (رواه ابن جرير وابن شاهين فى السنة والطبرانى فى الاوسط وابو نعيم فى فضائل الصحابة) كذا فى الكنز۔

(۱۵۷) زید بن اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے علیؓ اس ذات کی قسم ہے جس نے مجھے دینِ حق دیکر بھیجا ہے میں نے تم کو صرف اپنے لئے پسند کیا ہے اور تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے حاصل تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ (الکنز)

(۱۵۸) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے درد اٹھا۔ میں آپ کی خدمت میں آیا آپ نے مجھے اپنی جگہ کھڑا کر دیا اور خود نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے اور اپنے لباس کا ایک کنارہ میرے اوپر ڈال دیا پھر فرمایا اے علیؓ تم شفایاب ہو گئے اب تم میں کوئی مرض نہیں رہا۔ میں نے جو دعا اللہ تعالیٰ سے اپنے لئے کی ہے، وہی تمہارے لئے مانگی ہے اور جو دعا میں نے مانگی ہے وہ اس نے قبول فرمائی ہے بجز اس کے کہ مجھ سے یہ کہدیا گیا ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے کبھی بیماری نہ ہوا تھا۔ (کنز العمال)

(۱۵۷) یہی مضمون ابو سعید خدریؓ۔ حبشی بن جنادہؓ۔ عقیل بن ابی طالبؓ اور ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ دیکھو کنز العمال۔

(۱۵۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے نبوت کی دعا فرمائی تھی اور وہ قبول ہو گئی تھی۔ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هَارُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ وَاَشْرِكْهُ فِيْ اَمْرِيْ۔ اور میرے خاندان میں میرے بھائی ہارونؑ کو میرا مددگار بنا دے ان کے ذریعہ سے میری کمر مضبوط فرما اور میرا شریک کار بنا دے۔ اس دعا کے بموجب ان کو نبی بنا دیا گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ عالمِ تقدیر میں یہ طے پا چکا تھا کہ اب کوئی نبی نہ ہوگا اس لئے یہ نامناسب تھا کہ دعا کے بعد آپ کو عالمِ تقدیر کے اس فیصلہ کی اطلاع دی جاتی اس لئے اس سے قبل کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ حضرت علیؓ کے لئے نبوت کی دعا فرماتے یہ کہدیا گیا کہ آپ کی ہر دعا قبول ہو گی مگر نبوت کے لئے آپ دعا ہی نہ فرمائیے۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

لا یبقی من النبوۃ شئ الا المبشرات

(۱۵۹) عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُ قَالَ لَا يَبْقٰى بَعْدَهُ مِنَ النُّبُوَّةِ شَيْءٌ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتِ قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ يَرَاهَا الْمُسْلِمُ اَوْ تُرٰى لَهُ ۔ (کذا فی الکنز والحدیث مروی فی الصحاح بتغیر یسیر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوۃ کا کوئی جزء باقی نہیں رہا صرف اچھے خواب باقی ہیں

(۱۵۹) حضرت عائشہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ آپ نے فرمایا ہے میرے بعد نبوۃ کا کوئی جزء باقی نہیں رہا۔ صرف مبشرات باقی ہیں۔ صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ مبشرات کیا چیز ہیں، آپ نے فرمایا اچھے خواب جو مسلمان خود دیکھے یا اس کے لئے کوئی دوسرا دیکھے۔ (کنز العمال)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) غور فرمایئے کہ حدیث مذکور میں موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے ایک معمولی تشبیہ کے اثرات کتنی دور دور تک پھیل رہے ہیں اور ہر گوشہ میں ختم نبوت کا عقیدہ کس کس طرح نظر آتا چلا جا رہا ہے گویا یہ ایک بنیاد ہے اور بقیہ تمام تفریعات اسی عقیدہ پر قائم ہیں اگر کہیں ذرا بھی اس بنیاد کو ٹھیس لگتی نظر آتی ہے تو فوراً صفائی کے ساتھ اس کی اصلاح کر دی جاتی ہے اور معمولی سے ابہام کو بھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ تعجب ہے کہ جہاں نبوت و رسالت کی صریح پیشگوئیوں کی بجائے اتنی گنجائش بھی نہ ہو، وہاں نبوت کے دروازے نہیں بلکہ پھاٹک کھول دیئے جائیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ جب ان میں سے گذرنے والوں کی تعداد دریافت کی جائے تو بمشکل ایک شخص کا نام پیش کیا جائے۔ اور اس میں بھی ابھی تک یہ بحث جاری ہو کہ وہ امام تھا یا مجدد یا نبی و رسول اور اگر معتقدین کا حال چھوڑ کر کہیں خود اس کے دعاوی کو دیکھا جائے تو ایک صحیح الفہم شخص یہ اندازہ کر ہی نہ سکے کہ اتنے مختلف دعاوی کبھی ایک زبان سے ادا بھی ہو سکتے ہیں۔ واللہ المستعان۔

(۱۵۹) انبیاء علیہم السلام کی صفت انذار بھی ہے اور تبشیر بھی۔ اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا رسلاً مبشرین ومنذرین۔ اس لحاظ سے رؤیاء صالحہ کی بھی دو قسمیں ہونا چاہئیں مبشرات اور منذرات مگر چونکہ رؤیاء صالحہ کا غالب حصہ مبشرات پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے رؤیاء صالحہ کی تفسیر میں صرف مبشرات کا لفظ فرمایا گیا ہے نیز جامع ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ آیت "لھم البشری فی الحیوۃ الدنیا" میں بشریٰ سے مراد رؤیا صالحہ ہیں۔ اس بنا پر بھی رؤیا صالحہ کا عنوان مبشرات بن گیا ہے۔ بہر حال یہ ضروری نہیں ہے کہ سچے خواب ہمیشہ خوشی و مسرت کے متعلق ہوں۔ رنج و غم کے متعلق بھی ہو سکتے ہیں مگر رؤیاء صالحہ میں یہ حصہ مغلوب ہوتا ہے اور بشارت کا حصہ غالب اس کے برعکس شیطانی خواب بیشتر خوفناک ہوتے ہیں اور مسرت و خوشی کے لحاظ سے نادر کیونکہ شیطان کا مقصود ہی تحزین مسلم ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے ایک مرفوع روایت ہے۔ الرؤیا الحسنۃ من الرجل الصالح جزء من ستۃ واربعین جزء من النبوۃ نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں جزء ہوتا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ حدیث مذکور میں مسلم سے ہر فاسق و فاجر مراد نہیں بلکہ صالح اور نیک شخص مراد ہے۔ (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ ہو)

ذهبت النبوة والرؤيا ليست بنبوة

(۱۶۰) عَنْ اُمِّ كُرْزٍ قَالَتْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ وَبَقِيَتِ الْمُبَشِّرَاتُ۔ (اخرجہ احمد وابن ماجۃ وصححہ ابن خزیمۃ وابن حبان)۔

نبوۃ بالکل ختم ہوگئی اور صرف خواب نبوۃ نہیں ہیں

(۱۶۰) ام کرز روایت فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے نبوۃ تو ختم ہوئی ہاں صرف مبشرات باقی ہیں۔ اس حدیث کو امام احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اس کو صحیح کہا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس لئے فاسق یا کافر کا خواب اگر سچا بھی ہو تو نبوۃ کا جزء نہیں کہا جا سکتا۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نیک آدمی کبھی شیطانی خواب دیکھتا ہی نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو شخص بیداری میں انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتا ہے، صدق و اخلاص، امانت و دیانت داری اس کا شیوہ ہے اندر باہر دوست و دشمن کسی کے ساتھ جھوٹ بولنا روا نہیں رکھتا۔ اس کی فطرت پر صدق و سچائی کا پورا نقش قائم ہو چکا ہے، سونے کے بعد بھی شیطانی تسلط و حکومت کے ماتحت نہیں آتا۔ اس لئے اس کا جو خواب ہوتا ہے وہ اکثر خدا کی طرف سے ہوتا ہے اگر کبھی اس کے خلاف ہو تو شاذ و نادر ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص بحالت بیداری جھوٹ و دغابازی کا عادی ہے وہ سونے کے حال میں بھی شیطان ہی کے زیر حکومت رہتا ہے اس کے خواب بھی اکثر شیطانی اتصال و تصرف کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری میں روایت ہے الرؤیا الصالحۃ من اللہ والحلم من الشیطان۔ اچھے خواب (جو مومن صالح کا نصیب) خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور برے خواب شیطان کی طرف سے۔ خلاصہ یہ کہ انسان بحالت خواب اپنے بیداری کے حالات کے تابع رہتا ہے۔ مشہور ہے کہ بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ اگر اتنی بات آپ کے نزدیک معقول ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ جس طرح انسان حالت نوم میں بیداری کے حال کے تابع ہوتا ہے اسی طرح موت کے بعد اپنی حیوۃ کے حالات کے تابع رہے گا۔ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى جو اس دنیا کی زندگی میں اندھا بنا رہا وہ آخرت میں بھی اندھا اٹھے گا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حدیث میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر سچا خواب نبوۃ کا جزء ہے بلکہ اس کا خواب نبوۃ کا جزء قرار دیا گیا ہے جو شریعت کی اصطلاح میں صالح کہا جا سکے۔ قرطبی شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ صالح سے مراد وہ شخص ہے جو عادات میں انبیاء علیہم السلام کے قدم بقدم ہو۔ کاہن اور نجومی بھی غیب کی خبریں دیتے ہیں مگر وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتیں اس کا نام اطلاع علی الغیب نہیں اس کے اسباب پر اپنی جگہ مفصل بحث موجود ہے۔ اطلاع علی الغیب نبوۃ کا خاصہ ہے اس کی ابتدا اچھے اور سچے خواب ہیں اور اس کی انتہا وحی نبوۃ یعنی بحالت بیداری خدا تعالیٰ یا فرشتہ کے ساتھ مکالمہ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوۃ سے پیشتر سچے سچے خواب دیکھا کرتے تھے ۶ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد وحی کا دور شروع ہو گیا جس کی مدت تیئس سال ہے بعض علماء نے یہ دیکھ کر کہ ۶ ماہ ۲۳ سال کا چھیالیسواں جزء ہیں یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں رؤیا مومن کو اسی لئے نبوۃ کا چھیالیسواں جزء کہا گیا ہے حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس پر طویل گفتگو کی ہے۔ (اس پر سوال و جواب علماء کے دائرہ کی بحث ہے) باقی رہی یہ بحث کہ اگر مبشرات نبوۃ کا جزء ہیں تو کیا ان کو کوئی مختصر نبوۃ کہا جا سکتا ہے اس پر آئندہ حدیث کے نوٹ میں کلام کیا جائے گا۔

(۱۶۱) عَنْ اَنَسٍ رفعہ اَنَّ الرِّسَالَۃَ وَالنُّبُوَّۃَ قَدْ اِنْقَطَعَتْ فَلَا نَبِیَّ وَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلٰکِنْ بَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ قَالُوْا وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ قَالَ رُؤْیَا الْمُسْلِمِیْنَ جُزْءٌ مِّنْ اَجْزَاءِ النُّبُوَّۃِ۔
(ابو یعلی) فتح الباری۔

(۱۶۱) انسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ رسالت اور نبوۃ دونوں ختم ہو گئیں اب میرے بعد نہ کوئی نبی ہوگا نہ رسول، لیکن مبشرات باقی ہیں۔ صحابہ نے پوچھا مبشرات کیا چیز ہیں۔ فرمایا مسلمانوں کے خواب۔ یہ اجزاءِ نبوۃ کا ایک جزء ہیں۔ (ابو یعلی)

(۱۶۱) قرآن و حدیث اس پر متفق ہیں کہ نبوۃ ختم ہو چکی ہے تشریعی ہو یا غیر تشریعی۔ نبوۃ کی کوئی قسم اب باقی نہیں رہی۔ ہاں اس کے کمالات و برکات باقی رہنا چاہئیں اور وہ باقی بھی ہیں۔ نبوۃ سے قبل عالم کا ظاہر و باطن تیرہ و تاریک ہوتا ہے۔ جب آفتابِ نبوت طلوع کرتا ہے تو عالم کا گوشہ گوشہ اس کے انوار سے منور ہو جاتا ہے۔ ظاہر میں ظلم و فساد کی بجائے رشد و صلاح کی حکومت ہو جاتی ہے۔ انسانی عادات میں افراط و تفریط، عجلت و جلد بازی کی بجائے متانت و بردباری، وقار و میانہ روی پیدا ہو جاتی ہے۔ باطن کا رشتہ شیطان سے یکسر کٹ جاتا ہے اور عالم بالا سے ایسا رشتہ قائم ہو جاتا ہے کہ اس میں مغیبات کے انعکاس کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے ان ہی کا نام اجزاءِ نبوۃ یا آثار و برکاتِ نبوۃ ہے ان اوصاف کے وجود سے کوئی شخص نبی نہیں بنتا ہاں نبی سے مستفیض کہا جا سکتا ہے۔ رؤیاءِ صالحہ یعنی اچھے خواب دیکھنا باطن کی اسی تاثر کی نشانی ہے اور عادات کا انقلاب ظاہر کے تاثر کی .... احادیث میں ایک طرف رؤیاءِ صالحہ کو نبوۃ کا چھیالیسواں جزء کہا گیا ہے دوسری طرف بعض بلند اخلاق کو چھبیسواں جزء قرار دیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے التؤدۃ والاقتصاد وحسن السمت من ستۃ و عشرین جزء من النبوۃ۔ بردباری و متانت، میانہ روی اور اچھی روش نبوۃ کا چھبیسواں جزء ہیں ظاہر ہے کہ ان اخلاق کی وجہ سے کسی کو نبی نہیں کہا جا سکتا۔ جب چھبیسویں جزء کو نبوۃ نہیں کہا جاتا تو چھیالیسویں جزء کو نبوۃ کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں کہ رؤیا صالحہ کو صرف تشبیہی لحاظ سے نبوۃ کا جزء کہا گیا ہے ابن التین کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو غیب کی خبریں وحی کے ذریعہ سے دی جاتی ہیں اب یہ سلسلہ تو منقطع ہوا خواب کا سلسلہ باقی ہے۔ اس اعتبار سے رؤیا کو اجزاءِ نبوت میں شمار کیا گیا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے اس حدیث کے کسی طریقہ میں رؤیا کو رسالۃ کا جزء نہیں کہا گیا ہر جگہ نبوت کا جزء کہا گیا ہے رسالۃ کا زیادہ تعلق احکام سے ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ جو خواب نبوۃ کا چھیالیسواں جزء ہے وہ ہر شخص کا خواب نہیں بلکہ خود نبی کا خواب ہے مگر یہ جواب مخدوش ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ جزء ہمیشہ اپنے کل کے مغایر ہوتا ہے یہی کلمات جو مجموعی طور پر اذان کہے جاتے ہیں علیحدہ علیحدہ اذان نہیں کہلاتے۔ عناصر اربعہ انسان کے اجزاء ہیں مگر ان میں سے کسی کو انسان نہیں کہا جاتا مثلاً آب انسان کا ¼ حصہ ہے مگر انسان نہیں تو رؤیاءِ صالحہ نبوۃ کا چھیالیسواں جزء ہو کر نبوۃ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہے کہ رؤیاءِ صالحہ نبوۃ کے حقیقۃً اجزاء نہیں ہیں۔ کیونکہ نبوۃ کسی ایسی حقیقتِ مرکبہ کا نام نہیں جس کا تجزیہ و تحلیل ممکن ہو وہ ایک منصب ہے جس کا تعلق صرف خدائی اصطفاء و اجتباء پر موقوف ہے ہاں اس کے کچھ لوازم و خصائص ہیں جو اس کی ماہیت کا جزء نہیں ہوتے۔ ان خصائص و خصائل ہی کو مجازاً اجزاء کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ تنقیح بھی ہمیں اسلئے کرنی پڑتی ہے کہ اصطلاح میں خصائص و اجزاء میں فرق ہے ورنہ اہلِ عرف کے نزدیک یہ تدقیقات قطعاً غیر ضروری ہیں۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الالهام والتحديث مع الملائكة ليس بنبوة

(۱۶۴) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَقَدْ كَانَ فِيمَا قَبْلَكُمْ

الہام اور فرشتوں کے ساتھ باتیں کرنا بھی نبوت نہیں ہے

(۱۶۴) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تم سے پہلی امتوں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ان کے نزدیک عوارض مختلفہ اور ذاتیات واجزا میں کوئی فرق نہیں۔

امام بخاریؒ کی دقتِ نظر مشہور ہے انھوں نے یہاں بھی ایک جدت طرازی سے کام لیا ہے۔ پہلے ترجمۃ الباب میں یہ حدیث نقل کی ہے: "اچھا خواب نبوۃ کا چھیالیسواں جزو ہے"۔ اس کے بعد یہ حدیث روایت کی ہے کہ "اچھے خواب خدا کی طرف سے ہوتے ہیں اور برے شیطان کی طرف سے"۔ شارحین کو بحث ہے کہ اس حدیث کو بظاہر باب سے کوئی مناسبت نہیں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ یہاں امام بخاریؒ رؤیا صالحہ کے جزو نبوۃ ہونے کی ایک لطیف حکمت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ انما کانت جزء من اجزاء النبوۃ لانہا من اللہ تعالیٰ بخلاف التی من الشیطان فانہا لیست من اجزاء النبوۃ (ج ۱۲ ص ۳۱۴) یعنی رویاء صالحہ کو اجزاء نبوۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں، اس کے برخلاف وہ خواب جو شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں اجزاء نبوۃ نہیں ہیں۔ بظاہر امام بخاریؒ کی مراد یہ ہے کہ جس طرح حالتِ بیداری میں وحی دو قسم پر ہے ایک وحی نبوۃ جو خدا کی طرف سے ہوتی ہے دوسری ایحاء شیطان۔ ان الشیاطین لیوحون الیٰ اولیائہم۔ اسی طرح خواب کی بھی دو قسمیں ہیں ایک من اللہ دوسرے من الشیطان جو رویا من اللہ ہیں ان کا رشتہ نبوۃ سے ہے وہ بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے اور جو من الشیطان ہے اس کا تعلق وحی شیطان سے ہے۔ حدیث نے بھی اس مشتبہ حقیقت کا فرق واضح کیا ہے یعنی جو خواب من اللہ ہیں ان کا نام رؤیا رکھا ہے اور جو شیطان کے تصرف سے ہیں ان کا نام حُلُم رکھا ہے غالباً اسی لئے سورۂ یوسف میں فرمایا وما نحن بتأویل الاحلام بعالمین۔ یعنی انبیاء کو "احلام" شیطانی خوابوں کی تعبیر کا علم نہیں دیا جاتا۔ ہاں "رویا" عالم قدس کی ایک حقیقت ہے۔ ان کی تعبیر کا علم شان نبوۃ کے مناسب ہے اور احلام بے حقیقت شے ہے۔ ان سے انبیاء علیہم السلام کا کوئی واسطہ نہیں خلاصہ کلام یہ کہ رویاء صالحہ نبوۃ نہیں بلکہ نبوۃ کا حقیقی جزو بھی نہیں اسی لئے ان احادیث میں پہلا عنوان بدل کر نبوۃ کو بالکل ختم کہا گیا ہے اور رویاء صالحہ کو جداگانہ ایک چیز قرار دیا گیا ہے۔ اصطلاحِ نحو کے مطابق پہلی حدیث میں استثناء کو منقطع کہا جائے گا یا اجزاء سے خصائص و آثار مراد ہوں گے۔ اگر سب کچھ تسلیم کر لیا جائے تو نبوۃ کے اس جزو میں کسی بڑے رتبہ باکمال یا دعویٰ کی شرط نہیں بلکہ ہر مرد صالح کا اس میں حصہ ہے

مِنَ الْأُمَمِ مُحَدَّثُوْنَ فَإِنْ يَكُنْ فِيْ أُمَّتِيْ أَحَدٌ فَإِنَّهُ عُمَرُ. وَفِيْ رِوَايَةٍ لَقَدْ كَانَ فِيْمَا قَبْلَكُمْ مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ رِجَالٌ يُكَلَّمُوْنَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُوْنُوْا أَنْبِيَاءَ فَإِنْ يَكُنْ فِيْ أُمَّتِيْ مِنْهُمْ أَحَدٌ فَعُمَرُ. (متفق علیہ)

میں محدَّث ہوا کرتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہے اور بعض روایات میں ہے کہ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں کچھ لوگ ایسے ہوا کرتے تھے جن سے غیبی طور پر باتیں کی جاتی تھیں مگر وہ نبی نہ ہوتے تھے۔ اگر میری امت میں کوئی شخص ایسا ہے تو وہ عمرؓ ہے۔ (متفق علیہ)

(۱۶۳) محدَّث اور مکلَّم دونوں لفظ بصیغہ اسم مفعول ہیں۔ صحیح مسلم کے بعض طرق میں محدثون کے بجائے ملہمون اور مسند حمیدی میں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں "الملہم بالصواب" کا لفظ ہے اور ابن عیینہ کے شاگردوں نے اس کی تفسیر میں "مفہمون" کا لفظ نقل کیا ہے۔ ابو سعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا محدث کیسا ہوتا ہے آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہیں کہ فرشتے ان کی زبان سے بولتے ہیں۔ علماء نے اس کی مختلف تفصیلات کی ہیں۔ اکثر حضرات فرماتے ہیں کہ ھو الرجل الصادق الظن یہ وہ شخص ہے جس کا خیال اکثر صحیح ہو۔ وھو من القی فی روعہ شیء من الملاء الاعلی فیکون کالذی حدثہ غیرہ یہ شخص وہ ہے جس کے قلب میں ملائکہ مقربین کی جانب سے کوئی بات اس طرح ڈالی جائے گویا اس سے کسی نے کہدی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ محدث اسے کہتے ہیں جس کی زبان سے صدق و صواب بلا قصد نکلے۔ کسی نے تحدیث کا ترجمہ فراست کیا ہے۔ علماء محققین میں سے حضرت شاہ ولی اللہؒ وغیرہ نے بھی اس پر کافی کلام کیا ہے۔ ہمارے نزدیک تمام علماء نے حضرت عمرؓ کی ذات کو پیش نظر رکھا ہے پھر ان کی ایک ایک خصوصیت کو اپنے خیال کے مطابق چنا ہے اور اس کو محدثیت کی تعریف میں شامل کر دیا ہے۔ ہمارے نزدیک مناسب یہ ہے کہ ان سب اوصاف کو یکجائی طور پر محدث کی تعریف میں داخل کر لینا چاہئے یہ حقیقت حدیث سے تجاوز کر کے قرآن تک پہنچ گئی ہے چنانچہ آیت وما ارسلنا قبلک من رسول ولا نبی میں ابن عباسؓ ولا محدث کا لفظ اور پڑھا کرتے تھے۔ قرآن کریم میں محدث کو نبی کے بالمقابل رکھا گیا ہے اسی لئے حدیث میں بھی من غیر ان یکونوا انبیاء کہہ کر ان کے نبی نہ ہونے کی تصریح کر دی گئی ہے اس کے ساتھ ہی اگر حضرت عمرؓ کے متعلق اس حدیث کو پیش نظر رکھا جائے لو کان بعدی نبی لکان عمر اگر میرے بعد کوئی نبی ہو سکتا تو عمرؓ ہوتا۔ تو یہ بات اور زیادہ صاف ہو جاتی ہے کہ محدث اور مکلم نبی نہیں ہوتا حضرت عمرؓ کا محدث ہونا اور نبی نہ ہونا دونوں باتیں حدیث سے ثابت ہیں خلاصہ یہ ہے کہ صرف ملائکۃ اللہ کا کسی سے ہمکلام ہونا یا صدق و صواب اس کی زبان پر جاری ہو جانا نبوۃ نہیں ہے۔ جیسا کہ صرف غیب کی خبریں دینا نبوۃ نہیں یا جیسا کہ سچے خواب دیکھنا نبوۃ نہیں ہے۔ یہ سب باتیں انبیاء اور غیر انبیاء بلکہ مسلم و کافر میں بھی پائی جا سکتی ہیں۔ اولیاء کے مکالمات کو الہام کہتے ہیں اور نبی کے مکالمات کو وحی یہ صرف اصطلاحی فرق ہے اس سے پوری حقیقت نہیں نکھرتی۔ اسی طرح قطعیت و ظنیت کے فرق سے بھی ان کی حقیقت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی یہ صرف صاحب وحی جانتا ہے کہ وحی یہ ہے اور الہام یہ ہے۔ یہاں بھی علماء نے محدثیت میں وحی کے لوازم و خصائص تلاش کر کے بہت کچھ لکھا ہے مگر انصاف یہ ہے کہ نبوۃ و وحی کی حقیقت سوائے نبی کے دوسرا نہیں سمجھ سکتا جب اشیاء خارجیہ کے متعلق علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ ان کی حدود حقیقی یا تو غیر ممکن ہیں ورنہ دشوار ضرور ہیں تو روحانیات کے صحیح حدود کیسے ممکن ہیں (دیکھو فتح الباری فضائل عمرؓ)

(۱۶۳) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ لَمْ یُبْعَثْ نَبِیٌّ قَطُّ اِلَّا کَانَ فِیْ اُمَّتِہٖ مَنْ مُحَدَّثٌ وَاِنْ یَّکُنْ فِیْ اُمَّتِیْ مِنْھُمْ اَحَدٌ فَھُوَ عُمَرُ۔ رواہ ابن عساکر۔ کنز)

(۱۶۴) عَنْ عَائِشَۃَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَا کَانَ نَبِیٌّ اِلَّا کَانَ فِیْ اُمَّتِہٖ مُعَلَّمٌ اَوْ مُعَلَّمَانِ فَاِنْ یَّکُنْ فِیْ اُمَّتِیْ مِنْھُمْ اَحَدٌ فَھُوَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ۔ خصائص کبریٰ

سیاستہ الامۃ واصلاح ما فیہا من تغییر الدین لیس بنبوۃ

(۱۶۵) عَنْ اَبِیْ حَازِمٍ قَالَ قَاعَدْتُ اَبَا ھُرَیْرَۃَ خَمْسَ سِنِیْنَ فَسَمِعْتُہٗ یُحَدِّثُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ کَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِیْلَ تَسُوْسُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ کُلَّمَا

---

(۱۶۳) ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھ سے پہلے کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا گیا جس کی امت میں کوئی نہ کوئی محدث نہ ہو، اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمرؓ ہیں (کنز)

(۱۶۴) حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا کوئی نبی نہیں گذرا جس کی امت میں ایک دو معلَّم (محدث) نہ گذرے ہوں، اگر میری امت میں کوئی معلَّم ہے تو وہ عمر بن الخطاب ہے۔

امت کا انتظام اور ان کے دینی تحریفات کی اصلاح کرنا بھی نبوۃ نہیں

(۱۶۵) ابوحازم کہتے ہیں کہ میں ابوہریرۃؓ کے ساتھ ۵ سال رہا ہوں میں نے انھیں یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کا انتظام خود ان کے انبیاء

---

(۱۶۵) حافظ ابن حجرؒ انبیاء بنی اسرائیل کی سیاست کی تشریح میں لکھتے ہیں انھم کانوا اذا ظھر فیھم فساد بعث اللہ لھم نبیا یقیم لھم امرھم ویزیل ما غیروا من احکام التورات۔ یعنی بنی اسرائیل میں جب کوئی فساد رونما ہوتا تو اللہ تعالیٰ کسی نبی کو ان میں بھیج دیتا جو ان کی اصلاح کرتا۔ اور شریعتِ تورات میں ان کی تحریفات کو دور کر دیتا۔ امتِ محمدیہ میں یہ خدمات خلفاء کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ ان احادیث کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھے خواب دیکھنا، الہام اور فرشتوں کے ساتھ مکالمہ کرنا، امت کا دینی اور دنیوی نظم ونسق قائم رکھنا یہ سب محدثین اور خلفاء کے وظائف ہیں، منصبِ نبوت اب ختم ہوگیا۔ اور یہ وظائفِ نبوۃ امتِ محمدیہ کے خلفاء کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ اس سے امت محمدیہ کے کمالات اور عظمت کا اندازہ کرنا چاہئے کہ جن خدمات کے لئے پہلے انبیاء علیہم السلام بھیجے جاتے تھے اب اس امت کے علماء و خلفاء انھیں انجام دیا کریں گے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

هلك نبي خلفه نبي وانه لا نبي بعدي وسيكون خلفاء فيكثرون قالوا فما تأمرنا قال فوا ببيعة الاول فالاول اعطوهم حقهم فان الله سائلهم عما استرعاهم. رواه البخاري ومسلم واحمد وابن ماجة وابن جرير وابن ابي شيبة۔

فرمایا کرتے تھے جب ایک نبی کی وفات ہو جاتی دوسرا اس کا جانشین آجاتا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہاں خلفا ہوں گے اور وہ بہت ہوں گے۔ صحابہ نے عرض کیا پھر ان کے متعلق ہمیں کیا حکم ہے۔ فرمایا جو پہلا خلیفہ ہو اس کی بیعت پوری کرنا تم تو ان کا حق ادا کرتے رہنا اور اس نگرانی کی بازپرس جو اللہ تعالیٰ نے ان کے سپرد کی ہے وہ خود فرمائے گا۔ (بخاری و مسلم واحمد وغیرہم)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) سوچو کہ امت محمدیہ کی ہتک عزت اس میں ہے کہ اسے نااہل قرار دیکر اس میں نبی پیدا کیا جائے یا اس میں کہ اس کے خلفاء وہ خدمات انجام دیں جو پہلے کبھی انبیاء علیہم السلام ادا فرمایا کرتے تھے۔ ابن عساکر نے حضرت ابن عباس سے ایک روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لی النبوۃ ولکم الخلافۃ: نبوۃ صرف میرے لئے ہے اور تمہارے لئے خلافت ہے (کنز العمال ج ۷ ص ۱۸۰) اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تقسیم کرکے اپنا اور امت کا حصہ علیحدہ علیحدہ بیان کر دیا ہے۔ اچھے خواب میں ہماری شرکت ہے۔ الہام اور فرشتوں سے بات چیت میں ہماری شرکت ہے امت کا نظم ان کی تحریفات کی اصلاح ہمارا حصہ ہے مگر نبوت میں ہماری کوئی شرکت نہیں اسی لئے حضرت علیؓ سے حضرت ہارون علیہ السلام کو تشبیہ دیتے ہوئے یہ صاف فرما دیا گیا تھا کہ تم میرے جانشین ضرور ہو مگر نبی نہیں ہو نبوت میرا حق ہے اور خلافت تمہارا۔ عمر فاروقؓ کون وہ کہ جب بولتے تھے تو وحی ان کے موافقت میں بولتی تھی محدث ہو سکتے ہیں مگر یہ بات اُن سے بھی صاف کہدی گئی تھی کہ نبوت میرا حق ہے اور محدثیت تمہارا۔ حالانکہ ان کے خواب ان کے الہام، ان کی امت کی تمہید اور حفاظت اس کی سفارش کر رہی تھیں کہ اگر اس امت میں کوئی ہلکی سی ہلکی نبوت بھی جاری ہو تو وہ ان کو دیدی جائے۔ شب ہجرت میں حضرت علیؓ آپ کے بستر پر ساری رات آپ کی جگہ قربان ہونے کے شوق میں پڑے ہوئے ہیں صدیق اکبرؓ راہ کے ہر ہر خطرناک موقع پر سر بکف حاضر ہیں مگر فنافی الرسول کے ہمنوں کے ان فدائیوں کو نبوت کا چھوٹا سا چھوٹا حصہ بھی ہاتھ نہ آیا بلکہ اگر کسی کے متعلق سیاق کلام میں نبوت کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی پیدا ہوتا نظر آیا تو اس کو بڑی صفائی سے دور کر دیا گیا حتیٰ کہ کسی کے لئے غلط فہمی کی کوئی بھی گنجائش نہیں دی گئی۔ اس لئے یہاں ظلی و بروزی نبوت کی بحث کرنا بھی بالکل بے معنی ہے۔ یہ بحث اس وقت قابل توجہ ہو سکتی ہے جبکہ شریعت میں کہیں امت کے کاملین پر نبی کا اطلاق درست تسلیم کیا جائے لیکن جب بلا تفصیل لانبی بعدی میرے بعد کوئی نبی نہیں کہدیا گیا ہے تو اب یہیں بلا وجہ ظلی و بروزی کی تقسیم کی دردسری اٹھانے کی حاجت نہیں ہے اس کے ماسوا یہ بھی قابل غور ہے کہ جب تاریخ نبوت میں صرف دو ہی قسم کی نبوتیں ملتی ہیں۔ تشریعی، غیر تشریعی، اور یہ دونوں براہ راست نبوتیں ہیں تو نبوت کی اب ایک اور تیسری قسم تراشنا تاریخ نبوت کے خلاف ہے اس کے لئے بہت زبردست شرعی ثبوت درکار ہیں۔ پورے وثوق وتحدی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن و حدیث میں ایک آیت اور کوئی ایک حدیث بھی دستیاب نہیں ہو سکتی جس میں آنیوالی امت کو انبیاء کہا گیا ہو۔ پھر خاتم النبیین کے عموم میں محض اپنی اختراعی تقسیم کی وجہ سے تخصیص پیدا کرنا قرآن دانی کا ثبوت نہیں بلکہ کھلی ہوئی تحریف ہے۔

لو کان بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم نبی لکان عمرؓ

(۱۶۶) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَوْ كَانَ بَعْدِي

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہوتا تو حضرت عمرؓ ہوتے

(۱۶۶) عقبہ بن عامرؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر میرے بعد

(۳۹) حضرت علیؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت اخوت حاصل تھی اس کے باوجود وہ نبی نہیں بن سکے۔ نسبتِ اخوت سے بڑھکر ابنیت کی نسبت ہے گمان ہو سکتا تھا کہ آپ کا کوئی فرزند ہوتا تو شاید وہ نبی ہو جاتا مگر ان کے متعلق بھی حدیث میں یہ ارشاد ملتا ہے لو عاش ابراھیم لکان صدیقا نبیا۔ اگر ابراہیم جیتا تو صدیق نبی ہوتا۔ یعنی جس نے ختم نبوۃ مقدر فرمائی تھی اس نے ان کے لئے عالم تقدیر میں اتنی عمر بھی نہیں لکھی کہ ان کی علو استعداد ظاہر ہو اور ختم نبوت سے ٹکرائے۔ اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ آپ کے بعد نبوت باقی ہے ورنہ حضرت ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کیسے نبی ہو سکتے تھے۔

یہاں شیخ محی الدین نووی تو اپنی مشہور کتاب تہذیب الاسماء میں حضرت ابراہیم کا تذکرہ کرتے ہوئے اس حدیث کے متعلق یہ لکھ گئے ہیں اما ماروی عن بعض المتقدمین لو عاش ابراھیم لکان نبیا فباطل وجسارۃ علی الکلام فی المغیبات ومجازفۃ وھجوم علی عظیم من الزلات واللہ المستعان (ص ۱/۱۰۳) بعض متقدمین سے حضرت ابراہیمؓ کی نبوت کے متعلق جو حدیث مروی ہے وہ بالکل بے اصل اور غیب کے معاملات میں بڑی دلیری اور اٹکل کے تیر اور بڑی لغزش ہے۔ لیکن حافظ ابن حجرؒ باب من سمی باسماء الانبیاء کے ذیل میں اسی کے ہم معنی اور چند احادیث نقل کرکے تحریر فرماتے ہیں فھذہ عدۃ احادیث صحیحۃ عن ھولاء الصحابۃ انھم اطلقوا ذلک فلا ادری ما الذی حمل النووی ..... علی استنکار ذلک ان چند صحابہ سے کئی حدیثیں اس مضمون کی ثابت ہیں جن میں حضرت ابراہیمؓ کی زندگی کی تقدیر پر ان کے نبی ہونے کا ذکر موجود ہے پھر معلوم نہیں کہ نووی کو اس کے انکار کی کیا وجہ پیش آئی۔ [1] اس لئے اس حدیث میں پہلو دپیش کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو اس حدیث میں تشویش لاحق ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث آیۂ خاتم النبیین کے بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہے اس لئے قرآن کے قطعی آیت کے بالمقابل قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نزدیک ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے بات یہ ہے کہ آیۂ خاتم النبیین کا تعلق عالم کے ان نبوتوں کے ساتھ ہے جو اپنی جگہ ایک حقیقتہ ثابتہ ہیں اس کے برخلاف حضرت ابراہیمؓ کی نبوت صرف فرضی ہے۔ فرضی بات چونکہ محض ایک اعتبار ذہنی کا نام ہے اس لئے اُسے عالم کے واقعی نبوتوں کے ساتھ کوئی تعارض نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک منطقی مثال یہ ہے ان کان زید حمارا کان ناھقا۔ اگر زید گدھا ہوتا تو وہ گدھے ہی کی طرح بولتا۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ زید انسان ہے اور اس لئے وہ گدھے کی آواز نہیں بولتا۔ یہ واقعہ بھی اپنی جگہ درست ہے ہاں اگر زید کی انسانیت کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حماریت کو مان لیا جائے تو اب یقیناً تعارض پیدا ہو جائے گا کیونکہ بیک وقت وہ ناطق اور ناہق دونوں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ختم نبوۃ اپنی جگہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اگر حضرت ابراہیمؓ کی نبوت اسی درجہ میں مان لی جائے (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

[1] فتح الباری ج ۱۰ ص ۴۷۶۔

لَوْ كَانَ بَعْدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ ۔ تمام الترمذی ۔ والخطیب عن مالک والطبرانی عن عصمۃ بن مالک کما فی الکنز ص۱۳۰ ج۶

میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطابؓ ہوتے ۔

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) تو یقیناً تعارض پیدا ہو جائے گا ورنہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست رہیں گی ختم نبوۃ خارج میں ، اور نبوۃ ابراہیمؑ فرضی طور پر ۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی متکلم کسی بات کا کوئی پہلو واقعاتِ عالم کے برخلاف فرض کرتا ہے تو اس فرض سے اس کا کچھ مقصد ہوتا ہے پہلے اس کے اس مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہئے اور صرف ایک فرضی پہلو کی وجہ سے اس کے تمام پہلوؤں کی فرضی تفصیلات میں جانا نہیں چاہئے ۔ ظاہر ہے کہ جب عالم میں واقعات کی ایک ترتیب پہلے سے موجود ہے اب اگر اس ترتیب کے خلاف کوئی امر فرض کیا جائے اور اس کو واقعات کی اسی مرتب صف میں ٹھونسنے کی کوشش کی جائے تو یقیناً اس مرتب سلسلہ میں اختلال و بے نظمی پیدا ہو جائے گی ۔ یہاں واقعہ تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے ۔ آپ کے فرزند بھی انتقال فرما گئے ہیں ۔ عالم کے ان دونوں واقعات میں کوئی تعارض نہیں کوئی اختلاف نہیں ۔ اب اگر صرف آپ کی عظمت شان اور ان کا جوہر استعداد سمجھانے کے لئے فرضی طور پر کہہ دیا جائے کہ وہ جیتے تو نبی ہوتے تو اس میں بھی کوئی اشکال کی بات نہیں لیکن اسی فرضی نبوت کو اگر عالم کے ان واقعات کے ساتھ رکھ دو جو بلا فرض کئے ہوئے موجود ہیں تو یقیناً وہ خارجی ترتیب بگڑ جائے گی ۔ اب غور طلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی فرضی نبوۃ کی وجہ سے ختم نبوۃ کے واقعی عقیدہ کو فرضی کہہ دیا جائے یا اس کو واقعی اور اس کو فرضی کہہ دیا جائے مقصود قائل سے یہ کتنا بعید ہوگا کہ وہ تو اپنی ختم نبوۃ کے ساتھ ایک ہستی کا اور اعتقاد عظمت قائم کرنا چاہتا ہے ۔ آپ ختم نبوۃ کا انکار کر کے اسی کا احترام ختم کرنا چاہتے ہیں وہ ایک فرضی نبوۃ کا تصور آپ کے سامنے لاتا ہے آپ اسے واقعی بنا کر ختم نبوۃ کا عقیدہ ہی فرضی بنائے دیتے ہیں اچھا آپ کے بقول مان لیجئے کہ حضرت ابراہیمؑ اگر زندہ رہتے تو نبی ہوتے سا تھ یہ دیکھیں کہ جن کی فطرت ابراہیمی فطرت سے بہت ہی ملتی جلتی تھی اور وہ زندہ بھی رہے پھر کیا نبی بنے ۔ ترمذی کی حدیث آپ کے سامنے ہے ۔ عمر فاروقؓ کی فطرت کو نبوت سے جتنی مناسبت ہے وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے ظاہر ہے یہ زندہ بھی رہے مگر نبی نہ بنے ۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ کسی مستعد نبوت کے نبی نہ ہونے کی اصل وجہ صرف اس کی موت نہیں ہے ورنہ یہاں یہ وجہ نہ تھی یہاں نبوت مل جانا چاہئے تھی ۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی منصب پر تقرر کے لئے ذاتی استعداد و صلاحیت کے علاوہ دو باتوں کی اور بھی ضرورت ہے ۔ عمر (Age) ہر شعبہ میں عمر کی بحث ضروری سمجھی جاتی ہے ۔ دوم تقرر کی جگہ (Vacancy.) خالی ہونا بھی شرط ہے ۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ دونوں نبی نہیں ہوئے اگر اس کی وجہ یہ ہوتی کہ ان حضرات میں اتنی لیاقت و استعداد ہی نہ تھی تو یقیناً یہ اس امت کا نقصان شمار ہوتا لیکن اگر کوئی (Vacancy.) تقرر کی جگہ ہی نہیں ہے تو اس میں امت کا کوئی قصور نہیں نکلتا ۔ یہ بات حکومت کے نظم ونسق کے متعلق ہے کہ وہ کسی جگہ پر کتنے اشخاص کا تقرر کرنا چاہتی ہے اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی نبوت نہیں ملی کیوں نہیں ملی ؟ کیا اس لئے کہ خاتم الانبیا علیہم السلام کے اس جگر پارہ میں استعداد کا کوئی نقصان تھا نہیں اس لئے کہ ان میں عمر (Age) کی کمی تھی ۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبی کی ذریت اس کا قبیلہ بلکہ اس کی عام امت میں بھی استعداد نبوت تو موجود ہے ۔ انسانی بلند سے بلند کمال اسے حاصل ہو سکتے ہیں اس لئے ختم نبوت کا کوئی شخص یہ مطلب تو نہ سمجھے کہ یہ امت کمالات سے محروم ہو گئی ہے بلکہ تمام تر کمالات اور پوری لیاقت کے باوجود جگہ اب کوئی (Vacancy) نہیں رہی ۔ (باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

من زعم بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ نبی فھو کذاب

(۱۶۷) عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّہٗ سَیَکُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ کَذَّابُوْنَ ثَلٰثُوْنَ کُلُّھُمْ یَزْعُمُ اَنَّہٗ نَبِیٌّ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (رواہ مسلم)

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ نبی ہے وہ پرلے درجہ کا جھوٹا ہے

(۱۶۷) ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے آیندہ میری امت میں تیس سخت جھوٹے پیدا ہوں گے ان میں ہر ایک اپنے متعلق گمان کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں سب نبیوں کے آخر میں آیا ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (مسلم)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس لئے اس منصب پر کسی کا تقرر نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیمؑ کے معاملہ میں تقرر کی جگہ ہونے نہ ہونے کی بحث سے پہلے عمر کی بحث حائل ہو گئی تھی اس لئے ان کے حق میں (vacancy) کی بحث دوسرے نمبر کی بحث تھی۔ حضرت عمرؓ کے معاملہ میں عمر کی بحث نہ تھی تو منصب نبوۃ ختم ہونے کا مرحلہ سامنے آگیا۔ بہرصورت ان مختلف اسباب و وجوہ کے باوجود جو واقعہ تھا وہ اپنی جگہ واقعہ رہا یعنی ختم نبوۃ بلا تخصیص اپنے پورے عموم پر باقی رہی اور یہ بعد کی بحثیں اب صرف ذہنی رہ گئیں کہ فلاں کو نبوت کیوں نہیں ملی۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد در حقیقت نبوت جاری تھی تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کی تیس سالہ عمر کے بعد بھی کسی ایک کو نبوت نہ مل سکی۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کے لئے کوئی عذر درپیش تھا تو کیا تمام کے تمام صحابہ معذور ہو گئے تھے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے معاملہ میں ان کی حیوۃ کا عذر اس لئے نہیں ہے کہ در اصل نبوت سے وہی ایک بات مانع تھی بلکہ یہاں اس بات کو بتلانا مقصود ہے جو خاص ان کے حق میں نبوت سے مانع آگئی۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ابراہیمؑ اگر جیتے تو بھی نبی نہ ہوتے تو ممکن تھا کوئی شخص اسے ان کی قصور استعداد و لیاقت پر محمول کر لیتا۔ حالانکہ یہاں لیاقت و استعداد میں کوئی کمی نہ تھی اس لئے ایسے پیرایۂ بیان سے احتراز کر کے وہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے جو ان کی لیاقت پر روشنی ڈالے۔ یہاں ملا علی قاری بلا وجہ حضرت ابراہیمؑ کی فرضی نبوت کے اور دوسرے فرضی پہلوؤں کی تفصیلات میں بھی پڑ گئے ہیں یعنی انہوں نے یہ بحث شروع کر دی ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے اور فرض کر لو کہ نبی ہو جاتے تو آخر کس قسم کے نبی ہوتے تشریعی یا غیر تشریعی یہ سب بحثیں ہمارے نزدیک بے محل ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی فرضی نبوت کا پہلو یہاں صرف ایک خاص مقصد کے پیش نظر ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی بقیہ تفصیلات میں جانا قطعاً غیر ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ نبوت بتلاتی ہے کہ نبوت افراد و اشخاص سے منتقل ہو کر ذریت ابراہیم علیہ السلام میں پھر ذریت ابراہیمؑ سے ذریت اسماعیل میں منتقل ہوئی۔ اب اگر نبوۃ آیندہ جاری رہتی تو اس کو طبعاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں منتقل ہونا چاہئے تھا اگرچہ یہ لزوم نہ عقلی ہے نہ نقلی۔ لیکن صرف نبوت کی تاریخ کی مناسبت یہ چاہتی ہے کہ اگر آیندہ نبوۃ منتقل ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب آپ کے فرزند مبارک کی طرف منتقل ہو۔ اس استعداد و مناسبت کے اظہار کے لئے یہ فرمایا گیا تھا کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام زندہ رہتے تو نبی ہوتے ان مقاصد کے پیش نظر یہ کہنا کہ اگر آپ جیتے جب بھی نبی نہ ہوتے بالکل بے معنی بات تھی یہ اس وقت مناسب تھا۔ (باقی حاشیہ صفحہ آیندہ)

(۱۶۸) عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَ قَالَ اَکْثَرَ النَّاسُ فِیْ اَمْرِ مُسَیْلِمَۃَ الْکَذَّابِ قَبْلَ اَنْ یَّقُوْلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْہِ شَیْئًا ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی النَّاسِ فَاَثْنٰی

(۱۶۸) حضرت ابوبکرہؓ سے روایت ہے کہ مسیلمہ کذاب کے معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ فرمانے سے پیشتر لوگوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ایک دن آپ نے خطبہ دیا اور بعد حمد و صلوۃ کے

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) جبکہ آپ کو ختم نبوۃ کا مسئلہ بیان کرنا مقصود ہوتا یہاں تو یہ بتلانا مقصود تھا کہ تاریخ نبوت جس بات کو چاہ رہی تھی اس کا اقتضاء یہاں پورا ہے۔ خاتم النبیین کے فرزند گرامی کے متعلق جتنی بلندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ اس سے آگے ہیں چونکہ انتقالِ نبوت کا یہ مخصوص تخیل حضرت عمرؓ کے حق میں قائم کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے ان کا جوہرِ استعداد بتلانے کے لئے دوسرا عنوان اختیار کیا گیا اور وہاں ختم نبوت ہی پر زور دیا گیا یعنی اگر کہیں نبوت ختم نہ ہوتی تو یہ اپنے کمالات و لیاقت کے لحاظ سے اس کے اہل تھے کہ انھیں منصبِ نبوت سے سرفراز کر دیا جاتا جنھیں مواردِ کلام سمجھنے کا سلیقہ حاصل تھا انھوں نے اس فرق کو خوب سمجھ لیا تھا وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اس حدیث سے یہ نہیں سمجھے کہ آپ کے بعد نبوت جاری ہے بلکہ انھوں نے اس کو یوں حل کر لیا کہ جب عالم تقدیر میں ختم نبوۃ مقدر ہو چکی تھی تو اس کے مناسب یہی تھا کہ عالمِ تکوین میں حضرت ابراہیمؑ کو عمرِ نبوت نہ دی جائے تاکہ جوان ہو کر پھر آپ کا نبی ہونا مناسب ہو، اور آپ کا جوہرِ استعداد سمجھانے کے لئے آپ کی حیوۃ فرض کر کے یہ کہلا دیا جائے کہ آپ کی فطرت تو نبی کی فطرت تھی مگر چونکہ زمانۂ نبوت باقی نہ تھا اس لئے عمرِ نبوۃ مقدر نہ ہوئی

خلاصہ یہ کہ یہاں ختم نبوت کا مسئلہ چھیڑنا مقصود نہیں تھا اگر آپ کو اس بحث میں پڑنا ہے تو پہلے اس پر بھی غور کیجئے کہ مشیتِ ایزدی نے حضرت ابراہیمؑ کی حیوۃ کا آخر ارادہ کیوں نہیں کیا۔ عطاءؒ فرماتے ہیں۔ ان اللہ لما حکم ان لا نبی بعدہ لم یعطہ ولدا ذکرا یصیر رجلا[1]۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ مقدر فرما لیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہو تو آپ کو کوئی ایسی نرینہ اولاد بھی نہ دی جو جوانی کی عمر کو پہنچتی۔ عامر شعبی آیۃ ما کان محمد کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ما کان یعیش لہ فیکم ولد ذکر[2] یہ آپ کی شان (ختم نبوۃ) کے مناسب ہی نہ تھا کہ آپ کی کوئی نرینہ اولاد زندہ رہتی۔ اسمٰعیل فرماتے ہیں۔ قلت لابن ابی اوفی رأیت ابراھیم بن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال مات صغیرا ولو قدر ان یکون بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی عاش ابنہ لکن لا نبی بعدہ[3] میں نے ابن اوفیٰ سے پوچھا آپ نے ابراہیمؑ آپ کے فرزند مبارک کو دیکھا ہے انھوں نے کہا ان کا لڑکپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی اور نبی مقدر ہوتا تو آپ کے فرزند مبارک جیتے رہتے لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ عن انسؓ قال لو بقی لکان نبیا ولکن لم یکن لیبقی لان نبیکم اخر الانبیاء[4]۔ انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ اگر جیتے تو نبی ہوتے لیکن وہ کیسے جیتے جبکہ آپ نبیوں میں آخری نبی قرار پا چکے تھے"۔ شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں الا تراہ صلی اللہ علیہ وسلم ما عاش لہ ولد ذکر من ظھرہ تشریفا لہ لکونہ سبق فی علم اللہ انہ خاتم النبیین[5]۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ صرف آپ کی تشریف و تکریم کے لئے آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی کیونکہ خدا کے علم میں یہ طے پا چکا تھا کہ آپ خاتم النبیین اور آخری نبی ہیں لہٰذا اگر وہ زندہ رہتے اور نبی نہ ہوتے تو ایک لحاظ سے یہ بھی آپ کی شان کے مناسب نہ تھا اور اگر نبی ہوتے تو یہ آپ کے خاتم النبیین ہونے کے مناسب نہ ہوتا اس لئے ان کے لئے عمرِ نبوت ہی مقدر نہ ہوئی۔

ان بیانات سے ثابت ہے کہ صحابہ، تابعین اور علماء محققین کے نزدیک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نبی نہ ہونے کا اصل سبب یہی تھا کہ اب منصب نبوت کے تقرر کے لئے کوئی (بقیہ صفحہ ۱۷) جگہ ہی باقی نہیں رہی مگر جو مخصوص عنوان یہاں اختیار کیا ہے اس کی مصلحت اور ہے۔

[1] معالم التنزیل [2] جامع ترمذی [3] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [4] مسند احمد، فتح الباری ص ۴۶۰۔ [5] فتوحات باب ۲۳۲ ص ۴۴۶

عَلَى اللهِ بِمَا هُوَ اَهْلُهٗ ثُمَّ قَالَ اَمَّا بَعْدُ فِيْ شَانِ هٰذَا الرَّجُلِ الَّذِيْ قَدْ اَكْثَرْتُمْ فِيْ شَاْنِهٖ فَاِنَّهٗ كَذَّابٌ مِنْ ثَلَاثِيْنَ يَخْرُجُوْنَ قَبْلَ الدَّجَّالِ (رواه الطحاوی فی مشکل الآثار ۲ ص ۱۰۴)

(۱۶۹) عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ

فرمایا جس شخص کے بارے میں تم رائے زنی کر رہے ہو وہ ان تیس جھوٹوں میں ایک جھوٹا ہے جو دجال اکبر سے پہلے آئیں گے۔ (مشکل الآثار)

(۱۶۹) عبداللہ بن الزبیر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت

(۱۶۹) انبیاء علیہم السلام کے بیان میں ان کے اندازۂ علم ویقین کے مطابق ایک طاقت وشوکت ہوتی ہے وہی یہاں ظاہر ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ علم ازلی میں دجالین کی آمد ثابت ہو چکی ہے اس لئے قیامت کے آنے سے پہلے ان کی آمد یقینی امر ہے دنیا کو چاہئے کہ وہ ان کا انتظار کرکے شک نہ جائے۔ رہی یہ بات کہ اس امت میں دجالوں کی اتنی کثرت کیوں ہے تو جو اور فتنوں کے متعلق جواب دیا جائے گا وہی جواب اس فتنے کے متعلق بھی ہو جائے گا۔ ایک سطحی بات یہ ضرور معلوم ہوتی ہے کہ جب اس امت میں نبوت کا ختم ہونا مقدر ہوا تو اس کا مقابلہ بھی شیطانی طاقتوں کے لئے ضروری ہو گیا۔ خدا تعالےٰ چاہتا ہے کہ دنیا کے آخری دور میں پھر ایک ایسی عام وحدت پیدا کردے جیسا آغاز عالم میں ایک مرتبہ ظاہر ہو چکی ہے نسل انسانی ایک ہی باپ کی اولاد تھی جیسا روز اول وہ ایک ہی زمین پر تھی۔ آخر میں پھر اس کا ایک ہی کلمہ ایک ہی قبلہ اور ایک ہی دین ہو جائے۔ درمیان میں نبوتوں اور رسالتوں کے تفاوت سے شریعت اور منہاج کا جو تفاوت پیدا ہو گیا تھا وہ سب ختم ہو کر صرف ایک شریعت اسلام باقی رہ جائے اتنی عظیم وحدت کو شکست دینے کے لئے شیطانی لشکروں کو بھاگ دوڑ کرنا ضروری تھا اس لئے اس عام نبوت کے بالمقابل نبوت کا دعویٰ کرنا لازم ہو گیا۔ اس پیشگوئی کا ظہور آپ کے عہد مبارک ہی سے شروع ہو گیا تھا مسیلمہ اور عنسی آپ کے زمانہ میں ہی ظاہر ہوئے اور آپ کے حکم کے ماتحت صحابہ نے ان کو کاذب سمجھا اور آخر کار جو دجالین کے ساتھ برتاؤ چاہئے تھا وہی ان کے ساتھ کیا گیا۔ رہی یہ بحث کہ دجالوں کے تیس ہونے میں ہی کیا حکمت ہے تو حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

ولیس المراد بالحدیث من ادعی النبوة مطلقا فانهم لا یحصرون نکون غالبهم ینشأ لهم ذلک عن جنون وسوداء وانما المراد من قامت له الشوکة۔

حدیث مذکور میں مدعین نبوت سے ہر مدعی نبوت مراد نہیں کیونکہ مدعی نبوت تو بیشمار ہیں بیشتر یہ دعوے جنون یا سوداویت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں مراد وہ مدعیین نبوت ہیں جو باشوکت ہوں گے ان کا مذہب تسلیم کیا جائے گا، ان کے متبعین کی تعداد زیادہ ہوگی۔

نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جس امت میں لاکھوں اور کروڑوں سے متجاوز اولیاء روات طاب گذر گئے ہوں اس میں تیس دجالوں کا عدد کچھ زیادہ بھی نہیں ہے۔ غور طلب تو یہ ہے کہ اگر آپ کے بعد نبوت کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی قسط بھی باقی تھی تو اس کی بشارت کے لئے آخر ایک حدیث بھی کیوں نہیں آئی اور کذابین و دجالین کے متعلق دسیوں حدیثیں کیوں آگئیں پھر حدیث ۱۶۶ میں ان کے کاذب ہونے کی وجہ یہ نہیں بتلائی گئی کہ وہ حقیقتہً نبی نہ ہوں گے بلکہ یہ تردید کی گئی کہ میں خاتم النبیین ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

(باقی حاشیہ صفحہ آئندہ)

حتّٰی یخرج ثلثون کذّاباً دجّالاً منہم المسیلمۃ والعنسی والمختار۔ (ابو یعلی۔ فتح الباری)

اس وقت تک نہیں آسکتی جب تک کہ تیس جھوٹے دجال نہ نکل آئیں جن میں مسیلمہ، عنسی اور مختار بھی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایک طرف تو احادیث میں ہر قسم کی نبوۃ کی نفی آرہی ہے پھر مطلق نبوت کو کذاب و دجال کہا جارہا ہے دوسری طرف کسی حدیث سے ظلی و بروزی کی تقسیم ثابت نہیں ہوتی تاریخ نبوت میں ظلی نبی کوئی نظر نہیں آتا۔ پھر آخر کس دلیل سے نبوت کی ایک تیسری قسم مان کر اس کو جاری قرار دیا جائے یہاں یہ تفتیش بھی ضروری ہے کہ نبوت کی جو قسم بھی تسلیم کی جائے اس کا آغاز کب سے ہوا تاریخی لحاظ سے وہ افراد کون سے تھے جن کو ظلی نبی کہا جاسکتا ہے اور کیا یہ ثابت ہے کہ انھوں نے اپنی نبوت پر ایمان لانے کی امت کو دعوت دی ہو اور کیا کسی ایسے نبی کی امت نے کبھی تصدیق کی ہے اگر ایسا کوئی نبی اب تک نہیں گذرا، اور اگر گذرا ہے تو امت نے ہمیشہ اس کی تکذیب ہی کی ہے تو پھر کس دلیل سے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ درحقیقت اس امت میں نبوت کی کوئی قسم جاری ہے اور اتنی کثرت کے ساتھ جاری ہے کہ ان کی آمد دجالین کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ یہاں انجیل کا بیان بھی حدیث ہی کے موافق ہے۔

"جھوٹے نبیوں سے خبردار ہو جو تمہارے پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں ان کے پھلوں سے تم انھیں پہچان لو گے کیا جھاڑیوں سے انگور یا اونٹ کٹاروں سے انجیر توڑتے ہیں۔ (متی باب ــــ ۱۵ و ۱۶)

جس قدرت نے اس عالم کو تماشا گاہِ اضداد بنایا ہے۔ نور کے مقابلہ میں ظلمت، تری کے مقابلہ میں خشکی، صحت کے مقابلہ میں مرض، بلندی کے مقابلہ میں پستی پیدا فرمائی ہے۔ اسی نے عالم روحانیات میں ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت، ملائکہ کے مقابلہ میں شیاطین، انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں دجالین بنائے ہیں۔ پس جس طرح خاتم الرسل کی آمد سب رسولوں کے بعد ہوئی ہے اسی طرح مناسب ہے کہ دجال اکبر کے ظہور سے پہلے جو دجالین آنا ہیں آجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ دجال اکبر یعنی خاتم الدجاجلہ کا ظہور خاتم الرسل کے عہد میں ہی مقدر ہوا تاکہ دنیا کے خاتمہ پر ہدایت و ضلالت کی آخری طاقتیں زور آزمائی کرکے ختم ہوجائیں پھر قیامت آجائے۔ وللہ الحکمۃ البالغۃ۔

خاتم النبیین

جہان کا سردار آگیا اب کوئی رسول یا نبی نہیں آئے گا۔ دنیا اسی کے زیر رسالت و ولایت ختم ہو جائیگی۔ عالم کی آبادی کا دارومدار اس کی ہدایت پر ہے اور کارخانۂ ہدایت تمام کا تمام رسولوں کی ذات سے وابستہ ہے اس لئے عالم کی ابتداء و انتہاء اور رسالت کی ابتداء و انتہاء میں بڑا گہرا ربط ہے۔ پروردگار عالم نے جب ایک طرف عالم کی بنیاد رکھی تو اسی کے ساتھ ساتھ دوسری طرف قصرِ نبوت کی پہلی اینٹ بھی رکھدی یعنی عالم میں جس کو اپنا خلیفہ بنایا تھا اسی کو قصر نبوت کی خشتِ اول قرار دیدیا۔ ادھر عالم بتدریج پھیلتا رہا اُدھر قصرِ نبوت کی تعمیر ہوتی رہی۔ آخرکار عالم کے لئے جس عروج پر پہنچنا مقدر تھا پہنچ گیا ادہر قصرِ نبوت بھی اپنے جملہ محاسن اور خوبیوں کے ساتھ مکمل ہو گیا اور اس لئے ضروری ہوا کہ جس طرح عالم کی ابتداء میں رسولوں کی بعثت کی اطلاع دی گئی تھی اس کی انتہاء پر رسولوں کے خاتمہ کا بھی اعلان کر دیا جائے تاکہ قدیم سنت کے مطابق آئندہ اب کوئی شخص رسول کی آمد کا انتظار نہ کرے۔

يَا بَنِيٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔	اے آدمؑ کی اولاد (دیکھو) تمہارے پاس تم میں سے ہی رسول آئیں گے جو میری آیتیں تمہیں پڑھ پڑھ کر سنائیں گے جس نے تقوٰی کی راہ اختیار کی اور نیک رہا تو اس پر نہ گذشتہ کا خوف نہ آئندہ کا غم۔

اس اعلان کے مطابق خدا کی زمین پر بہت سے رسول آئے مگر کسی نے یہ دعوٰی نہیں کیا کہ وہ خاتم النبیین ہے بلکہ ہر رسول نے اپنے بعد دوسرا رسول آنے کی بشارت سنائی حتی کہ وہ زمانہ آگیا جبکہ اسرائیلی سلسلہ کے آخری رسول نے اسماعیلی سلسلہ کے اُس رسول کی بشارت دیدی جن کا اسم مبارک احمدؐ تھا۔ ومبشرا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد۔

عالم کے اس منتظر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس مبشر رسول نے دنیا میں آکر ایک نیا اعلان کیا اور وہ یہ تھا کہ میں اب آخری رسول ہوں، خود عالم کا زمانہ بھی آخر ہے اور ہاتھ کی دو انگلیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ میں اور قیامت اس طرح قریب قریب ہیں عالم اپنے پورے عروج کو پہنچ چکا ہے۔ قصرِ نبوت میں ایک ہی اینٹ کی کسر باقی تھی وہ میری آمد سے پوری ہو گئی ہے دونوں تعمیریں مکمل ہو گئیں ہیں اب صلاح و تقوی کا نتیجہ دیکھنے کا زمانہ آتا ہے۔ قرآن کریم میں آپ کی ختمِ نبوت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین وکان اللہ بکل شیء علیما۔ (احزاب)

یعنی اب تک جتنے رسول آئے وہ صرف رسول اللہ تھے آپ رسول اللہ ہونے کے علاوہ خاتم النبیین بھی ہیں اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تصور کے لئے دو باتوں کا تصور ضروری ہے، یہ کہ آپ رسول اللہ ہیں اور یہ کہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں۔ آپ کے متعلق صرف رسول اللہ کا تصور آپ کی ذات کا ادھورا اور ناتمام تصور ہے بلکہ ان ہر دو تصورات میں آپ کا امتیازی تصور خاتم النبیین ہی ہے۔ ختم نبوت کی اسی اہمیت کی وجہ سے گذشتہ احادیث میں آپ مطالعہ فرما چکے ہیں کہ اس مسئلہ کی نشر و اشاعت نبوتِ آدمؑ بلکہ وجودِ آدم علیہ السلام سے بھی پہلے لوحِ محفوظ اور عرشِ عظیم

پر کردی گئی تھی اور کاتب تقدیر نے حضرت آدم علیہ السلام کے دونوں شانوں کے درمیان آپ کے اسم مبارک کے ساتھ آپ کی خاتم النبیین ہونے کی صفت بھی بصورتِ حرف نقش کردی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام نسل انسانی کی بنیاد تھے لوح محفوظ جملہ حوادث عالم کی بنیاد ہے اور عرش عظیم ان اصول کے اعلان کا سب سے بلند بورڈ ہے جو دربار الٰہی میں طے شدہ اور ناقابلِ ترمیم تصور کئے گئے ہیں اس لئے ان مقامات پر اعلان کا یہ مطلب تھا کہ ختم نبوت بھی عالم کے ان بنیادی اور بدیہی مسائل میں داخل ہے جن کا علم سب پر فرض ہے اور جن میں اب کسی تبدیل و ترمیم کی گنجائش نہیں۔ اسی لئے آسمانوں پر فرشتوں نے زمین پر حیوانات نے محشر میں انبیاء علیہم السلام نے غرض ابتداء سے لیکر انتہا تک عالم بالا سے لیکر عالم اسفل تک ہر ذی شعور اور غیر ذی شعور نے آپ کی ختم نبوت کا نغمہ بلند کیا ہے۔ جب آپ عالم ناسوت میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ کی یہ امتیازی شان مہر نبوت کی صورت میں بھی نمایاں کردی گئی تاکہ جس کی آمد کا غلغلہ اب تک عالم میں بلند ہو رہا تھا اس کی شناخت میں کوئی دشواری نہ رہے۔ خدا تعالیٰ کی یہ عجیب حکمت ہے کہ مہر نبوت کے ظہور کے لئے آپ کے جسم مبارک میں بھی وہی جگہ منتخب ہوئی جو حضرت آدم علیہ السلام کے جسم مبارک میں منتخب ہوئی تھی۔

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا عقیدہ ہر رسول کی دعوت کا جزو اہم رہا ہے اس لئے قیاس کہتا ہے کہ جس رسول کے زمانہ سے قیامت کی آمد مربوط ہے اس کا تذکرہ بھی ان کا فرض منصبی رہا ہوگا۔ گویا ختم نبوۃ کا عقیدہ قیامت کے عقیدہ کے دوش بدوش ہمیشہ تعلیم دیا گیا ہے۔ شفاء قاضی عیاض اور کنز العمال میں ایک ضعیف اسناد کے ساتھ مروی ہے کہ خدا کے سب رسولوں نے خاتم الانبیاء کی آمد کی بشارت سنائی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

وقد اخبر اللہ تبارک و تعالیٰ فی کتابہ و رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السنۃ المتواترۃ عنہ انہ لا نبی بعدہ لیعلموا ان کل من ادعی ھذا المقام فھو کذاب، افاک، دجال، ضال۔	اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اور اس کے رسول نے احادیث متواترہ میں ختم نبوت کا اعلان اس لئے فرمایا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جو شخص اب اس منصب کا دعویٰ کریگا وہ جھوٹا افتراء پرداز، دجال اور پرلے درجہ کا گمراہ ہوگا۔

علماء محققین لکھتے ہیں کہ ختم نبوت کے اعلان میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ دنیا متنبہ ہو جائے کہ اب یہ پیغمبر آخری پیغمبر ہے اور یہ دین آخری دین ہے جس کو جو حاصل کرنا ہے کر لے۔ اس کے بعد دنیا کی یہ پیٹھ اجڑنے والی ہے جیسا شام کے وقت ایک دکاندار اعلان کرتا ہے کہ میں اب دکان بڑھاتا ہوں جسے جو سودا لینا ہے لے لے یا جیسا ایک حاکم بوقت رخصت آخری اسپیچ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میری تم سے اب یہ آخری ملاقات ہے جو کہتا ہوں خوب غور سے سن لو، اسی طرح خالق زمین و زماں کو جو آخری ہدایات دینا تھیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت دیدیں اور اعلان

سلہ قرطبی شرح مسلم میں لکھتے ہیں کہ خاتم نبوت کو اسی لئے ختم نبوت کہا جاتا ہے کہ یہ بھی منجملہ اور علامات کے آپ کی نبوت کی ایک علامت تھی اسی لئے حضرت سلمان فارسیؓ آپ کی غائبانہ تلاش میں جب آپ کی خدمت میں پہنچ گئے تو نہایت متجسانہ نظروں سے خاتم نبوت کو تلاش کرنے لگے آپ نے اُن کے طور و طریق سے ان کا مقصد پہچان لیا اور چادر مبارک خاتم نبوت سے ہٹا دی پھر کیا تھا سلمانؓ دیکھکر بیخود ہو گئے اور اسی عالم بیخودی میں اس کو بوسہ دینے لگے اور فوراً حلقہ بگوش اسلام بن گئے۔ بحیرہ راہب کے قصہ میں بھی موجود ہے کہ اس نے کہا "انی اعرفہ بخاتم النبوۃ" میں خاتم نبوت کی وجہ سے آپ کو پہچانتا ہوں۔ غرض علماء اہل کتاب کے نزدیک نبی منتظر کی یہ ایک بڑی علامت تھی۔ دیکھو زرقانی شرح مواہب۔

کر دیا کہ اب یہ رسول آخری رسول ہے، ایمانیات، اخلاقیات، معیشت، تمدن کے سب اصول مکمل کر دیئے گئے اس لئے یہ دین آخری دین ہے جسے جو عمل کرنا ہے کر لے۔ حیلہ و حجت کا وقت نہیں رہا۔ بحث و جدل کی بجائے عمل کی فرصت نکالنی چاہیئے وقت تھوڑا رہ گیا ہے اور حساب کی ذمہ داری سر پر ہے۔

اب نہ کوئی رسول آئے گا نہ نبی، نہ تشریعی نہ غیر تشریعی، نہ ظلی نہ بروزی مگر اس معنی سے نہیں کہ آئندہ نفوس انسانیہ کو کمال و تکمیل سے محروم کر دیا گیا ہے۔ بلکہ اس معنی سے کہ اب یہ منصب ہی ختم ہو گیا ہے پہلے عالم کی عمر میں بہت وسعت تھی اور اس منصب پر تقرر کی گنجائش بھی کافی تھی اس لئے انبیاء علیہم السلام برابر آتے رہے اب دنیا کی عمر ہی اتنی باقی نہیں رہی کہ اس میں اور تقرر کی گنجائش ہوتی اس لئے اس کے خاتمہ پر آپ کو بھیجکر یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اب نبی نہیں آئیں گے، قیامت آئے گی۔

چونکہ سنتِ الٰہیہ یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو ختم فرمانے کا ارادہ کرتا ہے تو کامل ہی ختم کرتا ہے ناقص ختم نہیں کرتا۔ نبوت بھی اب اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی اس لئے مقدر یوں ہوا کہ اس کو بھی ختم کر دیا جائے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت جاری ہو تو لازم آئیگا کہ اس کا خاتمہ نقصان پر ہو ظاہر ہے کہ ایک نہ ایک دن عالم کا فنا ہونا ضروری ہے پھر اس سے قبل کسی نہ کسی نبی کا آخری نبی ہونا بھی عقلاً لازم ہے اب اگر وہ آپ سے زیادہ کامل ہو تو اس کے لئے اسلامی عقیدہ میں گنجائش نہیں اور اگر ناقص ہو تو نبوت کا خاتمہ نقصان پر تسلیم کرنا لازم ہوگا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب تم فطرتِ عالم پر غور کرو گے تو تم کو جزو کل میں ایک حرکت نظر آئے گی۔ ہر حرکت ایک ارتقاء اور کمال کی متلاشی ہوتی ہے۔ پھر ایک حد پر پہنچکر یہ حرکت ختم ہو جاتی ہے اور جہاں ختم ہوتی ہے وہی اس کا نقطۂ کمال کہا جاتا ہے۔ انواع پر نظر ڈالئے تو جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات پھر حیوانات سے انسان کی طرف ایک ارتقائی حرکت نظر آرہی ہے مگر انسان پر پہنچ کر یہ ارتقائی حرکت ختم ہو جاتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان تمام انواع میں کامل تر نوع ہے خود انسان کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو وہ بھی نطفہ سے متحرک ہو کر دم و علقہ و مضغہ کے قالب طے کرتا ہوا خلق آخر پر جا کر ٹھہر جاتا ہے اور اسی کو اس کی استعدادِ فطرت کا آخری کمال کہا جاتا ہے پیدا ہونے کے بعد اس کے اعضاء میں پھر ایک حرکت اور ایک نشوونما نظر آتا ہے وہ دور شباب پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی کو اس کا زمانۂ کمال کہا جاتا ہے نباتات و اشجار کو دیکھئے تو وہ بھی ایک چھوٹی سی گٹھلی سے حرکت کرتے کرتے ایک تناور درخت بن جاتے ہیں۔ آخر کار اس پر پھل نمودار ہوتے ہیں اور جب پھل نمودار ہو جاتے ہیں تو یہ اس کا کمال سمجھا جاتا ہے اس کمال پر پہنچ کر درخت کا ایک دورِ حیوۃ ختم ہوتا ہے آئندہ اپنے دورِ حیوۃ کے لئے پھر اس کو بہت سے انہیں ادوار کو دہرانا پڑتا ہے جن میں گذر کر وہ اس منزل تک پہنچا تھا یعنی موسم خزاں آتا ہے اور اس کے ایک دورۂ حیوۃ کو ختم کر جاتا ہے۔ اگر قدرت کو اس کی پھر نشأۃ ثانیہ منظور نہ ہوتی تو وہ یونہی سوکھکر ختم ہو گیا ہوتا مگر چونکہ اس کو ابھی باقی رکھنا منظور ہوتا ہے اس لئے پھر اُسے وہی سبز سبز پتیاں، وہی ہری ہری لچکدار ڈالیاں مل جاتی ہیں، پھر اس پر پھول آتے ہیں اور آخر میں پھر پھل نمودار ہو جاتے ہیں اسی طرح جب تک یہ درخت موجود رہتا ہے اپنے ارتقائی مدارج کو ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک دوہرایا کرتا ہے۔ جو درخت اپنی ابتدائی کڑیوں کو پھر نہیں دہراتے وہ ایک مرتبہ پھل دیکر اپنی زندگی ختم کر جاتے ہیں جیسا کیلہ کا درخت۔

اگر یہ صحیح ہے تو عالمِ نبوۃ میں بھی ایک تدریج نمایاں ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تمام شریعتوں پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں۔ ہر پچھلی شریعت پہلی سے نسبۃً ارتقائی شکل میں نظر

آتی ہے اس لئے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جاکر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جائے لیکن جب خود نبوۃ ہمارے ادراک سے بالاتر حقیقت ہے تو اس کے آخری نقطۂ کمال کا ادراک بدرجۂ اولیٰ ہماری پرواز سے باہر ہونا چاہیئے اس لئے ضروری ہوا کہ قدرت خود ہی اس کا تکفل فرمائے اور خود ہی اس کا اعلان کردے کہ نبوت کا ارتقاء جہاں ختم ہوا ہے وہ مرکزی اور کامل ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک ہستی ہے اسی لئے ... قرآن کریم میں ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین کے بعد فرمایا ہے وکان اللہ بکل شئ علیما یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو ہر چیز کا علم ہے وہی یہ جانتا ہے کہ نبیوں میں خاتم النبیین اور آخری کون ہے یہ بات تمہاری دریافت سے باہر ہے کہ تم معلوم کرسکو کہ اس کے رسولوں کی مجموعی تعداد کتنی ہے ان میں اول کون ہے اور آخر کون۔ اگر اسے عالم کا بقا اور منظور ہوتا تو شاید وہ آپ کی آمد ابھی کچھ دن کے لئے اور موخر کردیتا لیکن چونکہ دنیا کی اجل مقدر پوری ہو چکی تھی اس لئے ضروری تھا کہ نبوت کی آخری اینٹ بھی لگادی جائے اور اعلان کردیا جائے کہ دنیا کی عمر کے ساتھ ساتھ قصر نبوۃ کی بھی تکمیل ہوگئی ہے۔ نبوت نے اپنا مقصد پالیا ہے۔ آپ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئیگا کیونکہ اگر کوئی رسول آئے تو یا وہ آپ سے افضل ہوگا یا مفضول۔ اگر افضل ہو تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ نبوت نے ابھی تک اپنے اس کمال کو نہیں پایا جس کے لئے وہ متحرک ہوئی تھی اور اگر مفضول ہو تو کمال کے بعد پھر یہ نزولی حرکت اسی وقت مناسب ہوسکتی ہے جبکہ عالم کی پھر نشأۃ ثانیہ تسلیم کی جائے۔ قرآن کریم سے ثابت ہے کہ نبوت اب اپنے ارتقائی کمال کو پہنچ چکی ہے اب کوئی اور کمال منتظر اس کے لئے باقی نہیں رہا اس لئے اس فطری اصول کے مطابق اسے ختم ہو جانا چاہیے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ یعنی تمہارا دین کمال کو پہنچ چکا ہے اب ناقص نہ ہوگا۔ خدا کی نعمت پوری ہوچکی ہے اب آئندہ اس کی زیادہ اتمام کی توقع غلط ہے اور نظر ربوبیت اب ہمیشہ کے لئے دین اسلام کو پسند کرچکی ہے اس لئے کوئی دین اس کا ناسخ بھی نہیں آئیگا۔ عربی زبان میں کمال و تمام دونوں لفظ نقصان کے مقابل ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ کمال اوصاف خارجیہ کے نقصان کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے اور تمام اجزاء کے لحاظ سے مثلاً اگر انسان کا ایک ہاتھ نہ ہو وہ ناقص ہے یعنی ناتمام انسان کہا جائے گا۔ خواہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو اور اگر اس کے اعضاء پورے ہیں مگر صورت اچھی نہیں، اخلاق نادرست ہیں خصائل درشت و ناہموار ہیں تو اس کو بجائے ناتمام کے ناکمل انسان کہا جائے گا۔ آیت بالا میں یہاں دونوں لفظوں کو جمع کرکے یہ بتلادیا گیا ہے کہ دین اسلام اب ہر پہلو سے مکمل ہوچکا ہے نہ اس میں اجزاء کا نقصان باقی ہے نہ اوصاف کا۔ اس لئے اب اس کی حرکت ارتقائی ختم ہوگئی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ آپ کا آخری نبی ہونا صرف ایک تاخر زمانی نہیں ہے۔ کسی شخصیت کا صرف آخر میں آنا فضیلت کی کوئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ سنۃ اللہ چونکہ یہ ہے کہ ہر شے کا خاتمہ کمال پر کیا جائے اس لئے یہاں آپ کا تاخر زمانی آپ کے انتہائی کمال کی دلیل ہے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قصر نبوۃ سے ایک بلیغ تشبیہ دیکر واضح فرمادیا تھا۔ یہود کو جب خدا کے اس اکمال و اتمام کی خبر پہنچی تو ان سے رہا نہ گیا اور انہوں نے ازراہ حسد کہا اے عمرؓ اگر کہیں یہ آیت ہمارے حق میں اترتی ہم تو اس دن کو عید کا دن بنا لیتے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

هذه اکبر نعم اللہ علی هذه الامة حیث اکمل تعالیٰ لهم دینهم فلا یحتاجون الی دین غیره ولا الی نبی غیر نبیهم صلوات اللہ

اللہ تعالیٰ کا اس امت پر یہ بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے اس امت کا دین کامل کردیا ہے کہ اب اسے نہ کسی اور دین کی ضرورت رہی نہ کسی اور نبی کی اسی لئے آپ کو

وسلام علیہ ولذا جعلہ خاتم الانبیاء — خاتم النبیین بنایا ہے اور انسان و جن سب کے لئے
وبعثہ الی الجن والانس۔ — رسول بنا کر بھیجا ہے۔

معلوم ہوا کہ ختم نبوۃ دینی ارتقاء اور خدا تعالیٰ کے انتہائی انعام کا اقتضاء ہے اور وہ کمال ہے کہ اس سے بڑھ کرامت کے لئے کوئی اور کمال نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ یہود کو بھی ہمارے اس کمال پر حسد ہے۔ پھر حیرت ہے کہ اتنے عظیم الشان کمال کو بر عکس محرومی سے کیسے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوۃ کا صحیح مفہوم سمجھنے ہی میں چند غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ شاید اس کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ نبوۃ پہلی امتوں کے لئے ولایت وصدیقیت کی طرح ایک ممکن الحصول کمال تھا۔ اب یہ امت دوسرے اور مراتب تو حاصل کر سکتی ہے مگر کمالِ نبوۃ کو حاصل نہیں کر سکتی یہ سخت غلط فہمی اور حقیقتِ نبوت سے قطعی جہالت کی دلیل ہے نبوۃ ان کمالات ہی میں نہیں ہے جو ریاضات و مجاہدات کے صلہ میں بطور انعام کسی وقت بھی بخشا گیا ہو بلکہ ایک الٰہی منصب ہے جس کا تعلق تشریعی ضرورت اور براہِ راست خدا تعالیٰ کی منت اجتباء و اصطفاء کے ساتھ ہے وہ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لئے چن لیتا ہے۔ اگر نبوت ان کمالات میں ہوتی جو مجاہدات و ریاضات، پاکبازی و حسن نیت کے صلہ میں انعامی طور پر ملتے ہیں تو یقیناً اس کے لئے سب سے موافق زمانہ خود نبی کی موجودگی کا زمانہ ہوتا کیونکہ ضمنی عملی جدوجہد اتباع شریعت کا جذبہ خود اس کے زمانہ میں ہوتا ہے اس کے بعد نہیں ہوتا مگر نبوت کی تاریخ اس کے برخلاف ہے یعنی جب خدا تعالیٰ کی زمین شر و فساد، طغیان و سرکشی، تکبر و تمرد سے بھر گئی ہے۔ صلاح و تقویٰ کا تخم فاسد ہو گیا ہے، رشد و ہدایت کے آثار محو ہو گئے ہیں۔ وہی انبیاء کی آمد کا سب سے زیادہ موزوں زمانہ سمجھا گیا ہے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسان نہیں کہ نبوت وہ انعام نہیں ہے جو ولایت وصدیقیت کی طرح امتوں میں تقسیم کی جائے بلکہ دنیا کے انتہائی دورِ ضلالت میں خدا کی صفتِ ہدایت کا ذاتی اقتضاء ہے۔ ذاتی اقتضاء سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ یہاں کسب و اکتساب، ماحول کی مساعدت و نامساعدت کا کوئی دخل نہیں۔ نبوت کا ماحول تو چاہتا ہے کہ خدائی رحمت کی بجائے خدا کا قہر ٹوٹے مگر اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں ایک اسم ہادی بھی ہے یہ اس کا اقتضاء ہے کہ جب ملک کا ملک اور قوم کی قوم اس کا راستہ گم کر دے، اور بھولے سے نہیں بلکہ شرارت و شیطنت کی بناء پر تو وہ اپنی طرف سے پھر ان کی ہدایت کے لئے ایک دروازہ کھول دے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب منصب رسالت سے سرفراز کیا گیا ان کا زمانہ انسانی کمالات کے عروج و ارتقاء کا زمانہ نہ تھا بلکہ دنیا فطری پستی، دنائت و خست، اور احسان فراموشی کے اس تاریک گڑھے میں پڑی ہوئی تھی کہ ایک کمزور انسان کو خدائی کا دعویٰ کرتے بھی شرم نہ آتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال بھی نہ تھا کہ انہیں اس دعویٰ کے ابطال کے لئے مامور کیا جائے گا۔ اچانک کوہِ طور کے ایک گوشے سے روحانیت کے بادل اٹھے اور حقیقت موسویہ پر اس طرح برسے کہ دم کے دم میں موسیٰ بن عمران حضرت موسیٰ کلیم اللہ بن گئے۔ بیوی کے لئے آگ لینے کی فکر میں آئے تھے اور سب بھول بھال کر اب آتش کفر بجھانے کی فکر میں جا رہے ہیں۔ اس مدعی الوہیت کا مقابلہ کرنا ہے جس کے پاس سلطنت کی ساری مادی طاقتیں جمع ہیں اور اپنے پاس قوتِ بیان بھی ناقص ہے۔ اس لئے دبے لہجے میں فرماتے ہیں

رب اشرح لی صدری ویسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی یفقھوا قولی واجعل لی وزیرا من اھلی ھارون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری (مریم)

دوسری جگہ سورہ القصص میں فرمایا:۔

واخی ھارون ھو افصح منی لسانا فارسلہ معی ردا یصدقنی انی اخاف ان یکذبون۔

ان دعاؤں کا حاصل یہ ہے کہ اے اللہ میرا سینہ کشادہ فرما اور مجھے ایسا حوصلہ مند بنادے کہ خلاف طبع معاملات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرسکوں اور میرے لئے ایسے سامان فراہم کرکہ یہ عظیم الشان خدمت آسان ہوجائے اور بچپن میں زبان جل جانے کی وجہ سے میری گفتگو میں جو لکنت پیدا ہوگئی ہے اس کو دور فرما کہ وہ میری بات تو سمجھ لیں اور میرے گھر میں میرے بھائی کو میرا معین بنادے کہ وہ میرا کام بٹائیں اور ان کی وجہ سے مجھے سہارا بھی رہے۔ سورۂ قصص میں اس کی تفصیل اور ہے کہ میرے بھائی مجھ سے زیادہ فصیح اللسان ہیں انھیں میرے ہمراہ کردے تاکہ وہ میری اعانت میں میری تصدیق کرتے رہیں مجھے اندیشہ ہے کہ میرے پہلے معاملات کی وجہ سے کہیں وہ سب میری تکذیب نہ کردیں اس وقت کم از کم ایک ایسا شخص تو میرے ساتھ ہو جو میری تصدیق کردے اور اگر مناظرہ کی نوبت آجائے تو ان سے مناظرہ بھی کرلے۔

اس دعا سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے کہ نبوت کو ان کمالات میں سمجھ لینا جو پہلی امتوں کو کسی عبادت و ریاضت کے صلہ میں یا انعام کے طور پر تقسیم کئے گئے ہیں سخت غلط فہمی ہے بلکہ یہ صرف تشریعی ضرورتوں کی تکمیل کا ایک منصب ہے جس میں قدرت اس کی صلاحیت پیدا کرتی ہے اسی کو اس منصب کے لئے انتخاب کرلیتی ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ نے اپنی درخواست میں یہاں حضرت ہارون علیہ السلام کی کسی ایسی جدوجہد کا ذکر نہیں کیا جو ان کی نبوت کی سفارش کرسکتی بلکہ ان صلاحیتوں کا ذکر کیا ہے جو اس منصب کے لئے درکار تھیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کے بعد ذرا اور آگے چلے تو پھر ضلالت و ہدایت میں یہی کشمکش نظر آتی ہے کبھی ضلالت کے جھکڑ ہدایت کی شمعوں کو گل کردیتے تھے کبھی نور ہدایت کفر کی تاریکیوں کے ٹکڑے کرڈالتا تھا حتی کہ دنیا کے آخری دور میں پھر ضلالت کا ابر محیط اٹھا اور اس شان سے اٹھا کہ تمام کرۂ ارضی پر تاریکی چھاگئی کوئی خطہ نہ رہا جہاں آفتاب ہدایت کی کوئی معمولی کرن بھی چمکتی۔ عالم کا وہ مرکزی نقطہ بھی جس کو ام القریٰ کہا جاتا تھا تیرہ و تاریک ہوگیا اور خانۂ خدا پر کفر کا پرچم لہرانے لگا تو اس عالم گمراہی کے ماحول میں اسم ہادی کا پھر تقاضہ ہوا کہ اس کے مقابلہ کے لئے ایسی ہی عام ہدایت بھیجے جو خطہ و ملک قوم و زمان کی قید سے آزاد ہو، وہ ہدایت بصورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں ظاہر ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ میں کفر نے شکست کھائی، کفر کا پھریرا اتار کر پھینک دیا گیا اور اس کی بجائے خدائی نصرت و فتح کا جھنڈا نصب کردیا گیا اور یہ اعلان کردیا گیا کہ اب کفر ہمیشہ کے لئے شکست کھاچکا ہے ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ کلمہ توحید مٹ جائے اور ہدایت کے آثار و نشانات اس طرح تباہ و برباد ہوجائیں کہ خدا کی زمین پھر کسی نبی کو پکارنے لگے۔ مکہ مکرمہ اب اسلامی دارالسلطنت بن گیا ہے اور اسی لئے اب یہاں سے ہجرت کرنا منسوخ ہوگیا ہے شیطان جو سرچشمہ کفر تھا اب مایوس ہوگیا ہے کہ مصلین جزیرۂ عرب میں اس کی عبادت کریں گے۔ دین اسلام کامل ہوچکا ہے اس کی روشنی اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے۔ خدائی نعمت پوری ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہی اور ہمیشہ کے لئے ایک اسلام ہی پسندیدہ دین ٹھہر چکا ہے اس لئے آئندہ نہ گمراہی اتنا تسلط حاصل کرسکتی ہے کہ ہدایت کو فنا کردے اس کے تمام چشمے خشک ہوجائیں۔ اس کی ایک کرن بھی چمکتی نہ رہے اور نہ اس لئے کسی رسول کے آنے کی ضرورت باقی ہے۔ پھر ختم نبوت درحقیقت اس کا اعلان ہے کہ نور نبوت اب تمام عالم کو اس طرح روشن کرچکا ہے کہ کفر کتنا ہی سر پٹکے مگر وہ اس کے بجھائے بجھ نہیں ... سکتا خدا کا اقرار اس کے صفات کی معرفت غیب کا یقین مجموعہ عالم کا اس طرح جزو بن گیا ہے کہ اگر کہیں اس مرتبہ پھر یہ معرفت ختم ہوگئی تو اس کے ساتھ ہی عالم کی روح بھی نکل جائیگی فضاء عالم میں بیماریاں پھیلیں اور صحت عامہ کو خطرہ میں ڈالدیں پھر کوئی ڈاکٹر نہ ملے شفاخانہ نہ ہو تو یقیناً یہ دوہری مصیبت ہے لیکن اگر کسی ملک کی آب و ہوا ہی صاف ہو وہاں کے باشندے شفاخانہ و ڈاکٹر کے محتاج ہی نہ ہوں تو

بتلاؤ کہ یہاں بھی کسی شفاخانہ کے قیام کی حاجت ہے؟ کیا ایسی صحت وتندرستی کے ماحول میں بیماروں کے قیام کے لئے مکانات ڈاکٹروں اور شفاخانوں کا وجود مقامی ضروریات میں داخل سمجھا جائے گا اور اگر یہ بھی فرض کرلو کہ اس خطہ کے باشندوں کو علم طب کی باضابطہ تعلیم دی گئی ہو تو کیا یہ شکوہ بجا ہوگا کہ جس طرح فلاں ملک کے لئے ڈاکٹر مقرر کرکے بھیجا گیا ہے ہمارے لئے بھی اسی طرح ڈاکٹر کیوں نہیں بھیجا گیا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عالم گمراہی کے بعد تشریف لاکر صرف خدائی آیات پڑھ کر ہی نہیں سنائیں بلکہ اس کو سمجھا بھی دیا اور اس پر پریکٹیکل طور سے عمل بھی کرادیا ہے۔ اس لئے اب آپ کی اس ہمہ گیر تعلیم کے بعد اول تو یہ ممکن ہی نہیں کہ جراثیم کفر اس طرح غالب آجائیں کہ عالم کی صحت عامہ کسی بیرونی ڈاکٹر کی محتاج ہوجائے دوم ان کو اس حد تک اصول طب کی تعلیم بھی دیدی گئی ہے کہ اگر کہیں کفر سر نکالے تو اس کا آئینی علاج وہ خود کرسکے ہیں اگر اس پر وہ کاربند نہ ہوں تو یہ ان کا قصور رہے گا۔ پس یہ بڑی غلط فہمی ہے کہ ختم نبوت کو کمالات کے ختم کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارے اس بیان سے روشن ہوگیا کہ نبوۃ کا ختم ہونا تو خدائی نعمت کے اتمام اور دین کے انتہائی ارتقاء وعروج کی دلیل ہے البتہ کمالات وبرکات کا خاتمہ بلاشبہ محرومی اور بڑی محرومی ہے مگر یہ روایات سے ثابت ہے کہ امت مرحومہ کے کمالات تمام امتوں سے زیادہ ہیں اور اتنے زیادہ ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کو بھی اس امت کے کمالات سن کر تمنا ہوسکتی ہے کہ وہ بھی اس امت کے ایک فرد ہوتے۔

خفاجی نسیم الریاض کی شرح میں حضرت انسؓ سے ایک روایت نقل کرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجی جو شخص احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کرکے میرے پاس آئے گا میں اسے دوزخ میں ڈالوں گا انھوں نے عرض کیا یہ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ ارشاد ہوا یہ وہ ہیں جن سے زیادہ مجھے اپنی مخلوق میں کوئی عزیز نہیں۔ زمین وآسمان سے قبل ہی میں نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ساتھ عرش پر لکھ دیا تھا اور یہ بات طے کردی تھی کہ جب تک وہ اور ان کی امت جنت میں داخل نہ ہولیں کوئی اور جنت میں داخل نہیں ہوسکے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس امت کے اوصاف پوچھے۔ ارشاد ہوا کہ وہ امت ہر وقت ہماری تعریف کرے گی بلندی پر چڑھے گی تو تعریف کرتی ہوئی پستی میں اترے گی تو تعریف کرتی ہوئی غرض ہر حال میں ہماری حمد وثنا کرے گی۔ اپنی کمریں باندھنے والی اپنے اعضاء دھونے والی، دن کی روشنی میں شیر کی طرح (بہادر) اور رات کی تاریکیوں میں درویش صفت ہوگی۔ ان کا تھوڑا سا عمل میں قبول کروں گا اور کلمۂ شہادت پر انھیں جنت میں داخل کردوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے اللہ تو مجھے اسی امت کا نبی بنادے ارشاد ہوا کہ اس کا نبی تو خود ان ہی میں سے ہوگا۔ عرض کیا اچھا تو پھر اس نبی کی امت ہی میں بنادے۔ ارشاد ہوا کہ تم ان سے پہلے ہو وہ تمہارے بعد آئیں گے البتہ میں اپنے دار جلال میں تمہیں اُن کے ساتھ جمع کروں گا[1]

مسند ابوداؤد طیالسی واحمد اور ابو یعلیٰ میں ہے۔

کادت ھذہ الامۃ ان تکونوا انبیاء کلھا۔ — یہ امت مجموعی اعتبار سے بلحاظ کمالات انبیاء ہونے کے قریب ہے۔

[1] خفاجی فرماتے ہیں رواہ ابو نعیم فی الحلیہ وورد بمعناہ من طرق کثیرۃ کما فی الخصائص (نسیم الریاض ج ۱ ص ۳۴۲)

شیخ جلال الدین سیوطی ؒ نے اسی مضمون کو بحوالہ توراۃ و انجیل کعب احبار سے نقل کیا ہے۔ کنز العمال میں اسی کے ہم معنی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عمرؓ کے متعلق آپ پڑھ ہی چکے ہیں اگر نبوت باقی ہوتی تو ان کو اس منصب پر فائز کر دیا جاتا۔ مبشرات، الہام، تحدیث مع الملائکہ، نظم و نسق امت بدعت اور تحریف فی الدین کی اصلاح حتیٰ کہ خلافتِ حقہ کا صحیح قیام یہ سب اس امت کے مناصب و کمالات میں داخل ہیں۔ کتاب اللہ کی حفاظت، دین کی تکمیل، ایک ایسی مضبوط جماعت کا بقا جو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر قائم رہنے والی ہو اور حسب ضرورت ایسے افراد و جماعات کی بعثت جو پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریفات کی اصلاح کرتی رہیں ان سب امور کا خود قدرتِ ایزدی تکفل فرما چکی ہے۔ آپ ہی سوچئے کہ اس کے بعد اب کونسا کمال باقی ہے جو پہلی امتوں میں تھا اور اس امت میں نہیں ہے اور جس کے لئے نبوت کی ضرورت ہے بلکہ صحیح بخاری کی حدیث میں تو یہ ہے کہ سیاستِ امت کی جو خدمت پہلے انبیاء علیہم السلام انجام دیا کرتے تھے اب وہ خدمات اس امت کے خلفاء انجام دیا کریں گے۔ پس پہلی امتوں کا ایسا کوئی کمال نہیں ہے جو اس امت کو نہ ملا ہو۔ ہاں اس امت کے بہت سے ایسے خصائص ہیں جن سے پہلی امتیں محروم ہیں۔

دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ ختمِ نبوت کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نبوت کی بندش گویا ختم نبوت کی وجہ سے ہوئی ہے اگر آپ تشریف نہ لاتے تو شاید کچھ اور افراد کو نبوت مل جاتی۔ یہ بھی انتہائی جہل ہے۔ خاتم النبیین کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سلسلہ انبیاء علیہم السلام میں آپ سب سے آخری نبی ہیں اس لئے آپ کی آمد اس وقت ہوئی ہے جبکہ انبیاء علیہم السلام کا ایک ایک فرد آچکا تھا اس لئے آپ کی آمد نے نبوت کو بند نہیں کیا بلکہ جب نبوت ختم ہو گئی ہے تو اس کی دلیل بن کر آپ تشریف لائے ہیں اور اسی معنی سے آپ کو خاتم النبیین کہا گیا ہے۔ اگر علم ازلی میں کچھ اور افراد کے لئے نبوت مقدر ہوتی تو یقیناً آپ کی آمد کا زمانہ بھی ابھی اور مؤخر ہو جاتا۔ آپ کا لقب خاتم النبیین اسی وقت واقع کے مطابق ہو سکتا ہے جبکہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ آئے اگر آپ کے بعد بھی کوئی نبی آتا ہے تو آپ کو آخری نبی کہنا ایسا ہی ہوگا جیسا درمیانی اولاد کو آخری اولاد کہنا۔ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام خدا کے پہلے رسول تھے، پس جس طرح اُن سے پہلے کوئی رسول نہ تھا نہ ظلی نہ بروزی، اسی طرح آپ آخرالنبیین ہیں آپ کے بعد بھی نہ کوئی ظلی نبی ہونا چاہئے نہ بروزی۔

تیسری غلطی یہاں سب سے زیادہ فاحش یہ ہے کہ اس پر غور ہی نہیں کیا گیا کہ پہلے ایک نبی کے بعد دوسرا نبی کیوں آتا تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلی نبوتیں خاص قوم اور خاص زمانہ کے لئے ہوتی تھیں اس لئے ہر نبی کے بعد لامحالہ دوسرے نبی کی ضرورت باقی رہتی تھی لیکن جب وہ نبی آگیا جس کی نبوت کسی خطہ، کسی قوم اور کسی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں تو اب اس کے بعد نبوت کا سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ اُس کی موجودگی کے زمانہ میں۔ اگر اس وقت یہ سوال بجا تھا تو اب بھی بجا ہے اور اگر اس وقت نامعقول تھا تو اب بھی نامعقول ہے۔ یہاں ذہن اس طرف جاتا ہی نہیں کہ آپ کا دورۂ نبوت دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ختم نہیں ہوا۔ پس درحقیقت نبوت تو اب بھی باقی ہے اور وہ نبوت باقی ہے جو تمام نبوتوں سے کامل تر ہے۔ ہاں نبی کوئی اور باقی نہیں رہا۔ عجب بات ہے کہ یہاں بقاءِ نبوت ہی ختمِ نبوت کو مستلزم ہے یعنی آپ کی نبوت کا بقاء اس کو مستلزم ہے کہ کوئی اور نبی نہ ہو۔ نافہم الٹا یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کی ختمِ نبوت دوسروں کی نبوت کے بقاء کو مستلزم ہے یہ اس وقت تو معقول ہوتا جبکہ دوسرے انبیاء علیہم السلام

سلہ اس جگہ اُس حدیث کا نوٹ ضرور دیکھ لیا جائے۔

کی طرح آپ کی نبوت بھی ختم ہو جاتی لیکن جب آپ کی نبوت باقی ہے تو اب جدید نبوت کا سوال خود بخود ختم ہو جاتا ہے
اللہ تعالیٰ نے آپ کو صرف خاتم النبیین نہیں بنایا بلکہ رحمۃ للعالمین بھی بنایا ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ اب خاتم
بذات خود تمام جہان کے لئے رحمت بن کر آ گیا ہے۔ اتنی بڑی رحمت کہ اس کے بعد کسی اور رحمت کی ضرورت نہیں
ہوگی۔ آج تک ہر رسول کے بعد دوسرے رسول کے انکار سے کفر کا خطرہ لگا رہتا تھا خاتم النبیین کی آمد سے یہ کتنی بڑی
رحمت ہوئی کہ اس راہ سے اب کفر کا کوئی خطرہ باقی نہیں رہا نہ کسی اور رسول کے آنے کا امکان ہے نہ کسی کے انکار سے
کفر کا اندیشہ باقی ہے۔ پہلے ہر امت کی داستانِ اطاعت و عصیان دوسری امتوں کے سامنے رکھی جاتی تھی مگر اس
امت مرحومہ کی داستان عمل اب کسی امت کے سامنے نہیں رکھی جائے گی۔ خلاصہ یہ کہ ختم نبوت ایک رحمت نہیں
بلکہ اس کے دامن میں بے شمار رحمتوں اور کمالات کا دریا بہہ رہا ہے اس لئے اس امت کو نبی بننے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ وہ
زمانہ ہے جس میں ایک اسرائیلی نبی کے امتی بن کر آنے کا انتظار ہو رہا ہے۔ کمالات نبوت ختم نہیں۔ ہاں دورِ
ضلالت و گمراہی ختم ہو گیا ہے جس کے لئے جدید نبوت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یاد رکھو اب نبی نہیں آئیں گے بلکہ قیامت
آئیگی یا وہ جھوٹے نبی آئینگے جن کو زبانِ نبوت نے دجال کہا ہے۔ انجیل میں ہے جھوٹے نبیوں سے خبردار رہو جو تمہارے
پاس بھیڑوں کے بھیس میں آتے ہیں مگر باطن میں پھاڑنے والے بھیڑیے ہیں ان کے پھلوں سے تم انہیں پہچان لوگے۔[1]

اس کی طرف سے دل نہ پھیریگا کہ دوستو ۔۔۔ وہ ہو چکا ہے جس کا طرفدار ہو چکا

---

[1] متی باب آیت ۱۵-۱۶

صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی التورات

(۱۷۰) عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ لَقِيتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قُلْتُ أَخْبِرْنِي عَنْ صِفَةِ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرَاةِ قَالَ أَجَلْ وَاللّٰهِ إِنَّهُ لَمَوْصُوفٌ فِي التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهِ فِي الْقُرْآنِ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا وَحِرْزًا لِلْأُمِّيِّينَ أَنْتَ عَبْدِي وَرَسُولِي سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَدْفَعُ بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلَكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ وَلَنْ يَقْبِضَهُ اللّٰهُ حَتّٰى يُقِيمَ بِهِ الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِأَنْ يَقُولُوا لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَيَفْتَحَ بِهَا أَعْيُنًا عُمْيًا وَآذَانًا صُمًّا وَقُلُوبًا غُلْفًا. رواہ البخاری وکذا الدارمی عن عطاء عن ابن سلام۔

(۱۷۱) وَعَنْ كَعْبٍ يَحْكِي عَنِ التَّوْرَاةِ قَالَ نَجِدُ مَكْتُوبًا مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰهِ عَبْدِي الْمُخْتَارُ لَا فَظٌّ وَلَا غَلِيظٌ وَلَا سَخَّابٌ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ وَلَكِنْ يَعْفُو

تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض علامات

(۱۷۰) عطاء بن یسار فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات کے متعلق دریافت کیا انھوں نے فرمایا خدا کی قسم تورات میں بھی ان کی علامات قرآن کریم کے قریب قریب ہی مذکور ہیں چنانچہ تورات میں ہے اے نبی ہم آپ کو امت پر گواہ، خوشخبری سنانیوالا، خدا کے عذاب سے ڈرانیوالا، اور اَن پڑھ عربوں کے لئے حفاظت بنا کر بھیجا ہے۔ آپ ہمارے بندہ اور رسول ہیں۔ آپ کا نام ہم نے متوکل رکھا ہے (خدا پر بھروسہ رکھنے والا) آپ زبان دراز نہیں، سخت دل نہیں، بازاروں میں شور مچانے والے بھی نہیں، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ عفو و درگذر فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس وقت تک نہیں بلائیگا جب تک آپ کے ذریعہ سے اس ملت کو جو ٹیڑھی ہوگئی ہے سیدھا نہ کردے اس طرح پر کہ وہ یہ اقرار کرلیں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور بند آنکھوں سے پردے نہ اٹھا دے اور بہرے کانوں کو شنوا نہ بنادے اور نافہم دلوں میں فہم نہ ڈالدے (اس حدیث کو بخاری اور دارمی نے روایت کیا ہے مگر دارمی نے ابن سلام سے روایت کیا ہے۔

(۱۷۱) کعب تورات سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ تورات میں ہم یہ لکھا ہوا دیکھتے ہیں محمد رسول اللہ میرے بندہ ہیں جن کو میں نے چن لیا ہے۔ زبان دراز نہیں۔ سخت دل نہیں۔ بازاروں میں شور مچانے والے نہیں

وَيَغْفِرُ مَوْلِدُهٗ بِمَكَّةَ وَهِجْرَتُهٗ بِطَيْبَةَ وَمُلْكُهٗ بِالشَّامِ وَاُمَّتُهُ الْحَمَّادُوْنَ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ يَحْمَدُوْنَ اللّٰهَ فِي كُلِّ مَنْزِلَةٍ وَيُكَبِّرُوْنَهٗ عَلٰى كُلِّ شَرَفٍ رُعَاةٌ لِلشَّمْسِ يُصَلُّوْنَ الصَّلٰوةَ اِذَا جَآءَ وَقْتُهَا يَتَأَزَّرُوْنَ عَلٰى اَنْصَافِهِمْ وَيَتَوَضَّؤُنَ عَلٰى اَطْرَافِهِمْ مُنَادِيْهِمْ يُنَادِيْ فِي جَوِّ السَّمَاءِ صَفُّهُمْ فِي الْقِتَالِ وَصَفُّهُمْ فِي الصَّلٰوةِ سَوَاءٌ لَهُمْ بِاللَّيْلِ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ۔ هٰذَا لَفْظُ الْمَصَابِيْحِ وَرَوَى الدَّارِمِيُّ مَعَ تَغْيِيْرٍ يَسِيْرٍ۔

(۱۷۲) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ سَلَامٍ قَالَ مَكْتُوْبٌ فِي التَّوْرَاةِ صِفَةُ مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَعِيْسَى بْنِ مَرْيَمَ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) يُدْفَنُ مَعَهٗ۔ قَالَ اَبُوْ مَوْدُوْدٍ وَقَدْ بَقِيَ فِي الْبَيْتِ مَوْضِعُ قَبْرٍ۔ (رواہ الترمذی)

برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ عفو ودرگذر فرمادیتے ہیں، اُن کی جائے پیدائش مکہ مکرمہ اور ہجرت کی جگہ مدینہ طیبہ اور ان کا ملک شام تک ہوگا، اُن کی امت اللہ تعالیٰ کی ہر وقت ثنا کرنے والی ہوگی نرمی اور گرمی ہر حال میں خدا کی تعریف کرے گی۔ ہر جگہ خدا کی حمد، ہر بلندی پر خدا کی تکبیر کہے گی (اپنے اوقات صلوٰۃ کے لئے) آفتاب (کے تغیرات) کا انتظار کرے گی جب نماز کا صحیح وقت آجائے گا فوراً نماز ادا کرے گی نصف ساق تک لنگیاں باندھے گی، اپنے ہاتھ پیر دھوئیگی (یعنی وضو) ان کا منادی (مؤذن) فضاء آسمان میں اعلان کریگا (یعنی اذان بلند جگہ ہوگی) جہاد میں اور نماز میں ان کی صفیں یکساں ہوں گی، شب میں ان کے (تلاوت قرآن کی) آواز شہد کی مکھیوں کے بھنبھناہٹ کے مشابہ ہوگی۔ (یعنی دھیمی آئے گی)۔ یہ لفظ مصابیح کے ہیں اور دارمی نے بھی تھوڑے تغیر کے ساتھ اس کو روایت کیا ہے۔

(۱۷۲) عبداللہ بن سلامؓ فرماتے ہیں کہ تورات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت لکھی ہوئی ہے اور یہ کہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام آپ کے پاس دفن کئے جائیں گے۔ ابو مودود راوی حدیث کہتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے گھر میں جہاں آپ مدفون ہیں ابھی ایک قبر کی جگہ باقی ہے۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

---

(۱۷) قرآن کریم نے بھی اوقات صلوٰۃ کو آفتاب کے تغیر سے شروع کیا ہے أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ۔ آفتاب کے ڈھلنے سے لیکر رات کی تاریکی تک نماز قائم کیجئے۔ اس آیت کی تفصیل کتاب الصلوٰۃ میں کی جائیگی ہر حال اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب سابقہ میں اس امت کے جو اوصاف بطور شعار مذکور ہیں وہ حسب ذیل ہیں گوان میں مراتب کے لحاظ سے تفاوت ہو۔ (۱) بروقت نماز ادا کرنا۔ (۲) پستی اور بلندی کی ہر تبدیلی میں خدا کی تعریف کرنا۔ (۳) ازار اونچی باندھنا (۴) وضو کرنا۔ (۵) بلند جگہ اذان دینا۔ (۶) نماز میں سیدھا اور پاس پاس صف بنا کر کھڑا ہونا (۷) شب میں متوسط آواز کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت کرنا ــــ تیسرا نمبر عرب کی پوشش کے لحاظ سے ہے ورنہ پاجامہ کا حکم بھی یہی ہے۔ ان ساتوں امور کی تفصیلات اپنے اپنے باب میں آئیں گی۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

(۱۷۳) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ غُلَامًا يَهُوْدِيًّا كَانَ يَخْدِمُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ فَمَرِضَ فَاَتَاهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَعُوْدُهٗ فَوَجَدَ اَبَاهُ عِنْدَ رَأْسِهٖ يَقْرَأُ التَّوْرَاتَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا يَهُوْدِيُّ اَنْشُدُكَ بِاللّٰهِ الَّذِيْ اَنْزَلَ التَّوْرَاتَ عَلٰى مُوْسٰى هَلْ تَجِدُ فِي التَّوْرَاتِ نَعْتِيْ وَصِفَتِيْ وَمَخْرَجِيْ قَالَ لَا قَالَ الْفَتٰى بَلٰى وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَجِدُ لَكَ

(۱۷۳) انس سے روایت ہے کہ ایک یہودی غلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا وہ بیمار پڑ گیا آپ اس کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے گئے دیکھا تو اس کا باپ سرہانے بیٹھا ہوا تورات پڑھ رہا ہے۔ آپ نے اُس سے پوچھا اے یہودی تجھے اُس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام پر تورات نازل فرمائی کیا میری نعت وصفت اور میری آمد کہیں سب تجھے تورات میں ملتی ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ لڑکا بولا خدا کی قسم یارسول اللہ کیوں نہیں، ہمیں آپ کی نعت وصفت اور آپ کی آمد کا ذکر سب چیزیں تورات میں ملتی ہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) یہاں اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ جو امور خدا کی مقدس کتابوں میں اس امت کے شعار قرار دیئے گئے ہیں ان کی نگہداشت کرنا ہر امتی کا فرض ہونا چاہیے ورنہ اپنے شعار کو فنا کرکے اس امت میں ہونے کا دعویٰ بے دلیل رہ جائے گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی حیات اور تشریف آوری ایک ایسی مسلم حقیقت ہے جس کا ذکر انجیل سے لیکر قرآن کریم تک برابر ہوتا چلا آیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث تو اپنی جگہ آئے گی جو بات یہاں توجہ کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ اگر درحقیقت ان کی وفات ہو گئی تھی تو تاریخی لحاظ سے ان کی قبر آج تک کیوں لاپتہ رہی۔ درانحالیکہ ان کی امت کا تسلسل کہیں درمیان میں نہیں ٹوٹا جو امت اپنے بزرگوں کے قبور کی پرستش کی ہمیشہ سے خوگر رہی ہو وہ اپنے نبی کی قبر کو یکلخت فراموش کر بیٹھے یہ کسی طرح قرین قیاس نہیں ہو سکتا۔ یہ حق کسی اور شخص کو نہیں ہے کہ وہ اپنی جانب سے ہر لامعلوم قبر کو حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کی قبر بنا ڈالے اور صرف اس بے بنیاد دعویٰ پر قرآن کریم کے قطعی بیان کا انکار کردے۔ یہ غور کرنا چاہیے کہ جو پیشگوئی یہاں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے حق میں ہے وہی حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمرؓ کے حق میں بھی موجود ہے۔ واقعات یہ ہیں کہ یہ حضرات بعد از وفات آپ کے پہلو میں حقیقۃً ہی مدفون ہوئے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اسی پیشگوئی کا رخ ہم حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے معاملہ میں کسی اور طرف تبدیل کردیں۔ اس لئے تسلیم کرنا ہوگا کہ عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام بھی اسی طرح آپ کے قریب مدفون ہوں گے۔ نیز راویوں کا یہ بیان کرنا کہ ابھی تک بیت عائشہؓ میں ایک قبر کی جگہ خالی ہے ظاہر کرتا ہے کہ یہ پیشگوئی امت میں ہمیشہ اپنے ظاہر پر محمول رہی ہے اور اسی لئے راوی یہ بتاتا چلا آتا ہے کہ اس کے پورا ہونے کے لئے بیت عائشہؓ میں ایک کھلی شہادت موجود ہے صرف تمنا ہی نہیں بلکہ کتب مقدسہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامات میں شمار کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کا دفن آپ کے پاس ہوگا اس لئے ضروری ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سردست زندہ ہوں پھر وفات پائیں اور آپ کے پاس دفن ہوں۔ بہرحال بحث اسی پر ختم نہیں ہوتی یہاں حدیث کے مناسب پھر

فِي التَّوْرَاتِ نَعْتَكَ وَصِفَتَكَ وَمَخْرَجَكَ وَإِنِّي أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَقِيْمُوْا هٰذَا مِنْ عِنْدِ رَأْسِهٖ وَلُوْا أَخَاكُمْ۔ رواه البيهقي في دلائل النبوة۔

(۱۷۴) عَنْ عَلِيٍّ أَنَّ يَهُوْدِيًّا كَانَ يُقَالُ لَهٗ فُلَانُ حَبْرٌ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَنَانِيْرُ فَتَقَاضَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ لَهٗ يَا يَهُوْدِيُّ مَا عِنْدِيْ مَا أُعْطِيْكَ قَالَ فَإِنِّيْ لَا أُفَارِقُكَ يَا مُحَمَّدُ حَتّٰى تُعْطِيَنِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذًا أَجْلِسُ مَعَكَ فَجَلَسَ مَعَهٗ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الظُّهْرَ

خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ اس یہودی کو اس کے سراہنے سے اٹھا دو اور اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کے تم خود متکفل ہو۔ اس حدیث کو بیہقی نے دلائل نبوت میں روایت کیا ہے۔

(۱۷۴) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ فلاں یہودی بڑا عالم ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کے کچھ دینار قرض تھے اس نے آپ پر تقاضہ کیا آپؐ نے فرمایا اے یہودی تیرے دینے کے لئے اس وقت تو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ وہ بولا اے محمدؐ تو میں آپ سے اس وقت تک جدا نہیں ہوں گا جب تک کہ آپ میرا قرض ادا نہ کر دیں آپ نے فرمایا اچھا تو میں تمہارے پاس بیٹھا جاتا ہوں یہ کہہ کر آپ اس کے پاس بیٹھ گئے اور ظہر، عصر اور مغرب و عشا اور صبح کی نمازیں یہیں ادا کیں آپ کے صحابہ (چپکے چپکے) اسے دھمکیاں دیتے اور ڈراتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۱۷۳) اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت کے سوا چند اصولی فوائد بھی معلوم ہو گئے۔ (۱) کافر سے خدمت لینا درست ہے (۲) اپنا خادم خواہ یہودی ہی کیوں نہ ہو اُس کی بھی عیادت کرنا چاہئے۔ (۳) بچے کا اسلام معتبر ہے۔ (۴) مسلمان کی تجہیز و تکفین مسلمانوں کے ذمہ ہے۔

(۱۷۴) توراۃ میں آپ کی جو صفات مذکور ہیں اس کا بہت بڑا عنصر آپ کی اخلاقیات سے متعلق ہے احادیث سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آپ کی بعثت کا بڑا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل تھی جو انسان انسانوں کے ساتھ اخلاقیات میں فیل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں انسانی بلندی کا معیار اخلاق کی بلندی پر رکھا گیا ہے اس لئے خواص کو اخلاقیات میں عوام سے اونچا ہونا چاہئے نبی کو اپنے امتی سے بلند ہونا چاہئے اور اسی لئے انبیاء علیہم السلام میں جو سب سے بڑے نبی ہیں وہ اخلاقیات میں بھی سب سے آگے تھے۔ حتیٰ کہ ان کی نبوت کا معیار بھی ان کی اخلاقی آزمائش تھی اسی لئے اس یہودی نے اپنے نزدیک آپ کے اخلاق کو سب سے سخت کسوٹی پر کس کر دیکھا اور جو رنگ خالص سے خالص سونے کا ہو سکتا تھا وہی آپ کے اخلاق کا دیکھ لیا۔

وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ الْآخِرَةَ وَالْغَدَاةَ وَكَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَدَّدُونَهُ وَيَتَوَعَّدُونَهُ فَفَطِنَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا الَّذِي يَصْنَعُونَ بِهٖ فَقَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ يَهُودِيٌّ يَحْبِسُكَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنَعَنِي رَبِّي أَنْ أَظْلِمَ مُعَاهِدًا وَغَيْرَهُ فَلَمَّا تَرَجَّلَ النَّهَارُ قَالَ الْيَهُودِيُّ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَشْهَدُ أَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ وَشَطْرُ مَالِي فِي سَبِيلِ اللّٰهِ أَمَا وَاللّٰهِ مَا فَعَلْتُ بِكَ الَّذِي فَعَلْتُ إِلَّا لِأَنْظُرَ إِلَى نَعْتِكَ فِي التَّوْرَاةِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ مَوْلِدُهُ بِمَكَّةَ وَمُهَاجَرُهُ بِطَيْبَةَ وَمُلْكُهُ بِالشَّامِ لَيْسَ بِفَظٍّ وَلَا غَلِيظٍ وَلَا سَخَّابٍ فِي الْأَسْوَاقِ وَلَا مُتَزَيٍّ بِالْفُحْشِ وَلَا قَوْلِ الْخَنَا أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّكَ رَسُولُ اللّٰهِ هٰذَا مَالِي فَاحْكُمْ فِيهِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ وَكَانَ الْيَهُودِيُّ كَثِيرَ الْمَالِ۔ (رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ)

صحابہ کی اس حرکت کو محسوس فرمالیا تو صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ایک یہودی اور آپ کو روکے بیٹھا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پروردگار نے مجھے اس بات سے منع کیا ہے کہ میں معاہد یا کسی اور شخص کا حق دباؤں۔ جب دن چڑھ گیا تو یہودی نے کہا میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ۔ اور اس بات کی کہ آپ بلا شبہ اللہ کے رسول ہیں لیجئے میرا نصف مال اللہ کے راستہ میں ہے، خدا کی قسم جو حرکت بھی میں نے آپ کے ساتھ کی تھی وہ صرف اس لئے تھی کہ جو صفت آپ کی توراۃ میں موجود تھی میں اس کو آزما دیکھوں۔ وہ محمد بن عبداللہ ہے ان کی پیدائش کی جگہ مکہ مکرمہ اور ہجرت کی مدینہ ہے اور ان کا ملک شام تک ہے وہ سخت زبان نہیں، سخت دل نہیں، بازاروں میں شور مچانے والے نہیں، فحش اور بیہودہ گوئی سے متصف نہیں، میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ اور بلاشبہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ لیجئے یہ میرا مال حاضر ہے اب آپ اس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں حکم فرمائیں۔ (راوی کہتا ہے) یہ یہودی بڑا مالدار شخص تھا۔

(اس حدیث کو بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے۔

الانبیاء تنام عیناھم ولا تنام قلوبھم

(۱۷۵) عَنْ شَرِيْكِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يُحَدِّثُنَا عَنْ لَيْلَةِ أُسْرِيَ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ مَسْجِدِ الْكَعْبَةِ جَاءَهُ ثَلَاثَةُ نَفَرٍ قَبْلَ أَنْ يُوحَى إِلَيْهِ وَهُوَ نَائِمٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فَقَالَ أَوَّلُهُمْ أَيُّهُمْ هُوَ فَقَالَ أَوْسَطُهُمْ هُوَ خَيْرُهُمْ وَقَالَ آخِرُهُمْ خُذُوا خَيْرَهُمْ فَكَانَتْ تِلْكَ فَلَمْ يَرَهُمْ حَتَّى جَاءُوا لَيْلَةً أُخْرَى فِيمَا يَرَى قَلْبُهُ وَالنَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَائِمَةٌ عَيْنَاهُ وَلَا يَنَامُ قَلْبُهُ وَكَذٰلِكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ فَتَوَلَّاهُ جِبْرِيلُ ثُمَّ عَرَجَ بِهِ إِلَى السَّمَاءِ (رواہ البخاری)

انبیاء علیہم السلام کی آنکھیں سوتی ہیں اور دل بیدار رہتے ہیں

(۱۷۵) شریک بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شب کا واقعہ جس میں آپ کو مسجدِ حرام سے (اعجازی طور پر آسمانوں پر) سیر کے لئے لے گئے تھے حضرت انس سے خود سنا ہے وہ ہم سے بیان کرتے تھے کہ وحی آنے سے پیشتر آپ کے پاس تین فرشتے آئے اس وقت آپ مسجد حرام میں (کچھ اشخاص کے درمیان لیٹے ہوئے) سو رہے تھے ان میں سے پہلے نے کہا بھلا اِن میں وہ شخص کون ہیں؟ درمیانی فرشتہ بولا، جو درمیان میں لیٹے ہوئے ہیں یہی سب میں افضل ہیں۔ آخری فرشتے نے کہا اچھا تو جو ان سب میں بہتر ہیں اُن کو لے چلو۔ اس شب تو اتنی ہی بات ہو کر رہ گئی۔ پھر آئندہ کسی شب میں یہی فرشتے آپ کے خواب میں آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ جب سوتے تو صرف آپ کی آنکھیں سوتی تھیں دل بیدار رہتا تھا اور تمام انبیاء علیہم السلام کا حال یہی ہوتا ہے کہ جب سوتے ہیں تو صرف ان کی آنکھیں سوتی ہیں ان کے دل بیدار رہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اپنی سپردگی میں لیا اور آسمان پر لے گئے۔ (بخاری)

۱۷۵؎ شریک بن عبداللہ کی یہ روایت گو بخاری شریف میں موجود ہے مگر محدثین نے اس میں بہت سے اوہام شمار کئے ہیں۔ از انجملہ یہ کہ اس میں معراج کا واقعہ نزولِ وحی سے پہلا قرار دیا گیا ہے اور سب سے بڑھکر یہ کہ واقعہ اسراء جو کہ جمہور کے نزدیک بیداری کا واقعہ تھا خواب کا واقعہ بتایا گیا ہے۔ ان امور پر اپنی جگہ بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف انبیاء علیہم السلام کی قلبی صفتِ تیقظ کا بیان کرنا منظور ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفت تمام انبیاء علیہم السلام ہی موجود ہوتی ہے پس جہاں آپ کے ساتھ خصوصیت کا شبہ ہو وہاں امت کے مقابلہ میں خصوصیت مراد لینا چاہئے نہ کہ انبیاء علیہم السلام کے مقابلہ میں۔ حافظ ابن حجرؒ کا رجحان بھی کچھ اسی طرف ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ ملاحظہ ہو)

بصر النبی

(۱۷۶) عَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ قَالَ أَشْرَفَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى أُطُمٍ مِنْ آطَامِ الْمَدِينَةِ فَقَالَ هَلْ تَرَوْنَ مَا أَرَى قَالُوا لَا قَالَ فَإِنِّي لَأَرَى الْفِتَنَ تَقَعُ خِلَالَ بُيُوتِكُمْ كَوَقْعِ الْمَطَرِ۔ (متفق علیہ)

نبی کی نظر

(۱۷۶) اسامہ بن زیدؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے بلند مقاموں سے کسی مقام پر چڑھے اور فرمایا کیا تم بھی دیکھ رہے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں، صحابہؓ نے عرض کیا نہیں آپ نے فرمایا کہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے گھروں میں فتنے اس طرح برس رہے ہیں جیسے بارش (متفق علیہ)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کتاب بدء الخلق میں اس باب کی مراجعت کی جائے۔ اصل یہ ہے کہ جن قلوب کو اللہ تعالیٰ مہبطِ وحی بنا لیتا ہے ان کو عالمِ قدس سے ایک غیر معمولی اتصال میسر آجاتا ہے یہ اسی بیداری کا ثمرہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی سمجھے جاتے ہیں اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ذبح کرنیکا خواب ہی دیکھا تھا کہ اتنی بڑی قربانی کے لئے تیار ہو گئے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام بھی اس حقیقت کو سمجھ کر بول اٹھے يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ۔ اے باپ جو حکم آپ کو ملا ہے اُسے پورا کیجئے۔ یہاں خواب کی بات کو امرِ الٰہی فرمایا ہے۔ اس کے بالمقابل جو دجل و شیطنت کی باطل طاقتیں ہیں ان کو بھی ایک فطری بیداری حاصل ہوتی ہے۔ وہ بھی پیشگوئیاں کرتے ہیں مگر عالمِ قدس سے انھیں کوئی مناسبت نہیں ہوتی بلکہ انھیں شیاطین کے ساتھ اتصال میسر ہوتا ہے۔ اسی لئے جب ابنِ صیاد کے حالات کی تحقیق کے لئے آپ تشریف لے گئے تو اس نے بھی اپنی یہی صفت بیان کی کہ صرف میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل بیدار رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اس کا امتحان لیا اور اس کو سمجھایا کہ عالمِ قدس سے اس کو کوئی اتصال حاصل نہیں ہے۔ وہاں ہر بات صاف ستھری اور طے شدہ موجود ہوتی ہے اس کو صرف شیطانوں سے اتصال میسر ہے ابھی غیب پر اُسے کوئی دسترس نہیں صرف قیاسات اور معمولی ادھورے اتے ہیں اسی کو انبیاء علیہم السلام کی صفتِ نبوت کے ہم پلہ سمجھ رکھا ہے اس لئے فرمایا اخسأ فَلَنْ تعدو قدرك۔ (جا بدنصیب تو اپنے رتبہ سے آگے نہیں جاسکتا) انبیاء علیہم السلام کی یہ صفتِ تیقظ دائمی ہوتی ہے صرف حالتِ نوم پر منحصر نہیں۔ اس بیداری کی پوری حقیقت سمجھنا ہمارے ادراک سے باہر بات ہے۔ الفاظ اس غیبی حقیقت کو پورا ادا نہیں کر سکتے۔ صوفیاءِ کرام کی نسبتِ یادداشت شاید اس سے کوئی بعید شباہت رکھتی ہو۔ والغیب عند اللہ العظیم۔

(حاشیہ صفحہ ہذا)

(۱۷۶) یہ وہ فتنے تھے جو صحابہ کے درمیان آئندہ پیش آنے والے تھے آپ کی نظرِ دور بین سالوں پہلے انھیں دیکھ رہی تھی۔

(۱۷۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَبَّاسٍؓ فِیْ قِصَّۃِ صَلٰوۃِ الْکُسُوْفِ قَالُوْا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ رَأَیْنَاکَ تَنَاوَلْتَ شَیْئًا فِیْ مَقَامِکَ ھٰذَا ثُمَّ رَأَیْنَاکَ تَکَعْکَعْتَ فَقَالَ اِنِّیْ رَأَیْتُ الْجَنَّۃَ فَتَنَاوَلْتُ مِنْھَا عُنْقُوْدًا وَلَوْ اَخَذْتُہٗ لَاَکَلْتُمْ مِنْہُ مَا بَقِیَتِ الدُّنْیَا وَرَأَیْتُ النَّارَ فَلَمْ اَرَ کَالْیَوْمِ مَنْظَرًا قَطُّ اَفْظَعَ وَرَأَیْتُ اَکْثَرَ اَھْلِھَا النِّسَاءَ قَالُوْا بِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ بِکُفْرِھِنَّ قِیْلَ یَکْفُرْنَ بِاللّٰہِ قَالَ یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ وَیَکْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدَاھُنَّ الدَّھْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْکَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ۔ (متفق علیہ)

(۱۷۸) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنِّیْ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ وَاَسْمَعُ مَا لَا تَسْمَعُوْنَ اَطَّتِ السَّمَاءُ وَحُقَّ لَھَا اَنْ تَئِطَّ مَا فِیْھَا مَوْضِعُ اَرْبَعِ اَصَابِعَ

(۱۷۷) صلوٰۃ کسوف کے قصہ میں عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ہم نے آپ کو دیکھا کہ اسی مقام پر آپ نے کسی چیز کے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔ پھر دیکھا کہ آپ پیچھے ہٹ گئے (یہ کیا بات تھی) فرمایا میں نے جنت دیکھی تو یہ ارادہ کیا تھا کہ اس میں سے ایک خوشہ لے لوں، اگر لے لیتا تو جب تک دنیا رہتی تم اس میں سے کھاتے رہتے پھر دوزخ دیکھی تو ایسا خوفناک منظر کبھی نہیں دیکھا جیسا آج دیکھا تھا، میں نے دیکھا کہ اس میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ انھوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ کیوں؟ فرمایا اپنی حق ناشناسی کی وجہ سے، پوچھا گیا کیا خدا کی حق شناس نہیں ہوتیں؟ فرمایا اپنے شوہر کا حق نہیں پہچانتی اور احسان فراموش ہوتی ہیں اگر کسی کے ساتھ تم عمر بھر بھی احسان کروگے پھر تمہاری جانب سے کوئی ادنیٰ کوتاہی دیکھ پائے تو یہی کہدیتی ہے کہ ہم نے تمہاری کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں۔ (متفق علیہ)

(۱۷۸) ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں وہ وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور وہ وہ آوازیں سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے، آسمان چرچر کر رہا ہے اور اس کو ایسا ہی کرنا چاہئے کیونکہ اس میں کہیں چار انگشت برابر بھی جگہ خالی نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ

(۱۷۷) جنت خود غیر فانی ہے اس کی ہر نعمت بھی غیر فانی ہے اس لئے اگر آپ اس کی کوئی چیز لے لیتے تو وہ بھی دائمی اور غیر فانی ہوتی۔ اس حقیقت کو بتانا بھی منظور تھا اور عالم غیب کو غیب کی حد تک باقی رکھنا بھی مدنظر تھا اس لئے صرف اتنا بتاکر دستِ مبارک آگے نہ بڑھے۔ اندازہ کیجئے کہ یہ رؤیت کتنی قوی رؤیت ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام اس جہان میں بھی اہلِ جنت کے خواص رکھتے ہیں۔

اِلَّا وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهٗ لِلّٰهِ سَاجِدًا وَاللّٰهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَّلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشِ وَلَخَرَجْتُمْ اِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْاَرُوْنَ اِلَى اللّٰهِ لَوَدِدْتُ اِنِّیْ كُنْتُ شَجَرَةً تُعْضَدُ۔ رواہ الترمذی فی الزھد۔ وقدم فی باب عظمۃ اللہ تعالیٰ۔

خدا کے سامنے سجدہ میں نہ پڑا ہوا ہو، خدا کی قسم ہے جو میں جانتا ہوں اگر کہیں تم جان لیتے تو ہنستے بہت کم اور روتے بہت اور اپنے نرم بستروں پر عورتوں سے لطف اندوز نہ ہو سکتے اور یقیناً اللہ اللہ پکارتے ہوئے جنگلوں میں نکل جاتے۔ یہ کہہ کر ابوذرؓ فرماتے ہیں میری تمنا ہے کاش کہ میں ایک درخت ہوتا جو کٹ کر نابود ہو جاتا۔ (ترمذی)

(۱۷۸) اس حدیث میں صفتِ سمع و بصر اور علم کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں یہ تینوں صفات اتنی کامل ہوتی ہیں کہ عوام میں اُن صفات کی کھپت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ان کے مسموعات و مبصرات و معلومات کی دنیا کسی اور کے سامنے پیش کردی جائے تو اس کا نظامِ زندگی ہی معطل ہو جائے۔ پھر وہ نہ آرام کی نیند لے سکتا ہے اور نہ بستیوں میں آباد رہ سکتا ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کا ہی ظرف ہے کہ وہ قالبِ انسانی میں رہ کر اُن سب امور کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں جن کا نشاۃ ملکیتہ مشاہدہ کرتی ہے اور پھر نظامِ انسانیت کو درہم و برہم ہونے نہیں دیتے۔ کمال یہ نہیں کہ انسان فرشتہ بن جائے۔ فرشتے تو پہلے بھی موجود تھے کمال تو یہ ہے کہ انسان انسان رہے پھر اپنی بہیمیۃ کو قالبِ روحانیۃ میں ایسا ڈھال دے کہ یہ مجموعہ، ملکیت کے لئے قابلِ صد رشک بن جائے۔ یہ ہے وہ انسان جو عام انسانوں کی طرح ایک انسان بھی نہیں اور فرشتہ بھی نہیں بلکہ وہ کامل انسان ہے جس کو ملک پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

انسانِ کامل کے علمی و عملی کمالات دیکھ کر بندۂ مادیت اس کا تصور نہیں لا سکتا اور اس لئے ان کو اتنا سادہ سے سادہ بنا دیتا ہے کہ ایک طور پر وہ ان کے انکار ہی کے مرادف ہو جاتا ہے جب وہ انسانِ کامل کی قوت سمع و بصر کا حال سنتا ہے پھر اس نوع کی قوت انسانِ اسفل میں نہیں دیکھتا تو نہایت سادگی سے اس کو راویوں کی مبالغہ آمیزی اور حاملانِ مذہب کی خوش عقیدگی پر محمول کر کے ان کو بھی اسی صف میں ملانے کی کوشش کرتا ہے جس میں وہ خود کھڑا ہے گویا اس کے نزدیک سمع و بصر کی طاقت صرف اسی قدر ہے جتنا اس کو خود محسوس ہے دوسری طرف ایک سفید عقیدتمند ہے وہ اس پر بھی راضی نہیں ہوتا کہ راوی کی بیان کردہ قوتوں ہی پر بس کردے بلکہ اپنی جانب سے اور ہزار حاشیہ آرائیاں کرتا ہے اور آخرکار وہ بھی ایک بلند حقیقت کو بے حقیقت بنا کر چھوڑتا ہے۔ یہ دونوں راستے افراط و تفریط کے راستے ہیں، ہم نہ اس کے مجاز ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے متعلق ذرہ برابر بھی اس سے زیادہ کوئی عقیدہ رکھ سکیں جتنا کہ خود انھوں نے ہم کو بتایا ہے اور نہ اس کے حقدار ہیں کہ ان کے ان فضائل و کمالات کو بھی ناقابلِ تسلیم کہدیں جو قدرت نے ان عظیم القدر ہستیوں کو اپنا نشانِ قدرت دکھانے کے لئے عطا کئے ہیں۔ افسوس کہ انسان خود اپنے نفس کی طاقتوں کو بھی نہیں پہچانتا کاش اگر وہ ان کو پہچان لیتا تو اس کو اپنے رب کی معرفت بھی آسان ہو جاتی۔ ایک ایٹم بم کی طاقت سے دنیا عالمِ حیرت میں پڑی ہوئی ہے اور ابھی دیکھئے کہ اقوامِ عالم کی مسلسل ریسرچ اس کی طاقت کا اور کہاں تک پتہ دیتی ہے۔ جنھوں نے عالمِ روحانیات کا ذائقہ چکھا ہے اور اس کی طاقتوں کا اندازہ لگایا ہے، ان کے نزدیک یہ کمالات غلامانِ انبیاء علیہم السلام میں بھی بقدر نصیب تقسیم ہو گئے ہیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

النبی قد یریٰ من وراء ظهره

(۱۷۹) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هٰهُنَا وَاللّٰهِ مَا يَخْفَى عَلَيَّ رُكُوْعُكُمْ وَلَا خُشُوْعُكُمْ وَإِنِّي لَأَرَاكُمْ

نبی کبھی اپنے پشت کی جانب سے بھی دیکھ لیتا ہے

(۱۷۹) ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تم میرا قبلہ توجہ صرف سامنے کی طرف سمجھتے ہو، خدا کی قسم تمہارا رکوع کرنا اور تمہارا قلبی خوف بھی مجھ پر پوشیدہ نہیں رہتا، میں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) کمالات انبیاء علیہم السلام کچھ اور ہیں اگر کہیں ان کو ظاہر کر دیا جائے تو ظاہر پرستوں کے ایک تماشہ ہاتھ آجائے اور عقیدتمندوں کی عقیدت سرد پڑ جائے۔ بھائی میرے وہ کمالات ان کی صبر و استقامت، اخلاص و انابت، اولوالعزمی و شہامت، وقار و کرامت، برد یقین و ثلج صدر، اعتماد و انشراح مانند تباشیر فجر، امانت و صدق، رأفت و رحمت خلق، طہارت ذیل، نظافت جیب، انابت الی اللہ و وسائل غیب، خصائل تضرع و تبتل، استقامت عہد و شکر، توریث علم و عمل، و عدم توریث مال و منال، ترک مالایعنی، حفظ ملت لسان، متابعت و مطاوعت حق، حظوظ دنیا میں زہادت، زخارف دنیا سے بے التفاتی اور نشر و اشاعت دین ہیں۔ وہ کمالات ان کے ظاہر و باطن کی یک رنگی ہے ایسی یک رنگی جس میں سر مو کوئی فرق نہ آئے۔ ان کی پہاڑوں کی طرح استقامت ہے جو بادشاہوں کی تہدید و تخویف سے متزلزل نہ ہو، ان کی وہ بے طمعی ہے جس میں ارباب اموال کی دولت کوئی لچک پیدا نہ کر سکے۔ ان تمام کمالات کے باوجود ان کو نہ کبھی ناز ہو نہ تکبر وہ سراپا کمال ہو کر سراپا نقائص مخلوق میں بیٹھنا پسند کریں خود ایذائیں اٹھائیں کسی کو ایذائیں نہ دیں اور یہ جو کچھ ہو کسی ریاضت و کسب کا رہین منت نہ ہو بلکہ سب کچھ عطاء رحمانی اور موہبت ربانی ہو ؎

دلبرما است کہ از حسن خداداد آمد

یہ وہ انسان کامل ہے جس کی طاقتوں کے سامنے تمام عالم ملکوت سر جھکاتا ہے۔ خدا کی تمام کائنات دست بستہ حکم برداری کیلئے حاضر ہے وہ خلیفہ ہے اور سب اس کے زیر دست محکوم مگر افسوس یہ ہے کہ ان تمام طاقتوں سے انسان غافل ہے۔ غافل نہیں بلکہ منکر ہے۔ انبیاء علیہم السلام آکر بھی بتاتے اور دکھاتے ہیں مگر یہ پھر بھی نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔ فصبر جمیل۔

(حاشیہ صفحہ ھٰذا) ۱۷۹) یہ رؤیت تو اس عالم کی رؤیت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم دوربیں اس عالم سے گذر کر کبھی کبھی جنت و دوزخ کا بھی مشاہدہ کر لیتی تھی۔ آپ تو آپ ہی ہیں آپ کے صحابہ تک جنگ کے موقعوں پر کبھی کبھی ملائکہ کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ کسی صحابی کو خدا کا فرشتہ سلام کرتا اور وہ اس کی آواز سن لیتا تھا۔ عمر فاروقؓ مقام نہاوند کی جنگ مدینہ میں بیٹھکر دیکھتے تھے اور آپ کی یا "ساریۃ الجبل" کی آواز آپ کا جرنیل نہاوند میں سن لیتا تھا۔ آج ریڈیو کی ایجاد نے "صوت" یعنی آواز کا مسئلہ تو ختم کر دیا ہے۔ اگر ذرا سی وسعت دیکر بصر کے متعلق بھی آپ اس حقیقت کو تسلیم کر لیں تو چنداں دشوار نہیں ہے۔ اب بھی خوردبین اور دوربین کے ذریعہ سے ہم جن چیزوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں عام آنکھیں ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتیں۔ خوردبین سے بیماریوں کے جراثیم چلتے پھرتے نظر آجاتے ہیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِیْ۔ (رواہ البخاری)

تمہیں اپنی پشت کی جانب سے بھی دیکھتا رہتا ہوں۔ (بخاری)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) دوربین کے ذریعہ سے سیکڑوں میل کا فاصلہ کس طرح کف دست معلوم ہونے لگتا ہے اگر ارباب روحانیت وتزکیہ کی نظر بھی مادیات میں ڈوبی ہوئی نظروں سے کسی بلند عالم کا مشاہدہ کرتی ہیں تو ہمیں اس کا بھی انکار نہیں کرنا چاہئے اور یہ سمجھنا چاہئے کہ بیماری کے باریک جراثیم کی طرح ان کے دیکھنے کا ہمارے پاس کوئی آلہ نہیں ہے۔ اگر فرض کرلو کہ وہ تیزیٔ نظر ہمیں بھی میسر آجائے تو ہم بھی خوردبین کے بغیر ان جراثیم کا مشاہدہ کرلیں یہاں انکار یا تاویل کرنا دونوں راستے غلط ہیں۔ انکار تو اس لئے کہ جو خود دیکھتا ہے نہ دیکھنے والے کو اس کے مشاہدہ کے رد کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اسے اپنی قصور نظر کا اعتراف کرنا چاہئے نہ کہ ایک قوی النظر شخص کی رؤیت کا انکار۔ اسی لئے ایک حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضرت عائشہؓ کو اپنا سلام کہلوایا تو آپ نے جواب دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تری مالا نری یعنی آپ تو ان کو دیکھ رہے ہیں ہم نہیں دیکھتے۔ گویا اپنی قصور نظر کا اعتراف کیا اور آپ کے مشاہدہ کی تصدیق کی عالم روحانیات کے متعلق قرآن نے بطور کلیہ یہ بیان کیا ہے کہ ہماری ایک ایسی مخلوق ہے جسے تم نہیں دیکھتے اور وہ تمہیں دیکھتی ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ

انبیاء علیہم السلام اور ارباب روحانیت کو ایسی حدت نظر مرحمت ہوجاتی ہے کہ وہ ان کا بھی مشاہدہ کرنے لگتے ہیں آخر جب عام طور پر نظروں میں قوت بصر کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے تو اگر انبیاء علیہم السلام کی نظر عام نظروں سے کچھ اور تیز مان لی جائے تو اس کے انکار کی کیا وجہ ہوسکتی ہے اور تاویل کرنا اس لئے غلط ہے کہ جو شخص خود دیکھتا ہے، اپنے متعلق یہی عقیدہ رکھتا ہے، اور دوسروں کو بھی یہی باور کرانا چاہتا ہے کہ وہ درحقیقت دیکھتا ہے اور وہی الفاظ استعمال کرتا ہے جو صرف دیکھنے کے لئے مستعمل ہیں۔ اور اس کے خلاف کوئی ادنیٰ ایما و اشارہ تک نہیں کرتا تو ان کو کشف والہام پر محمول کرلینا یقیناً غلط ہے بلکہ ایک واقعہ کا انکار ہے۔ ہمیں اس کا کیا حق ہے کہ اگر ہماری آنکھیں کچھ چیزوں کو نہیں دیکھتیں تو جو آنکھیں انہیں دیکھتی ہیں ہم ان کے لئے بھی تاویلیں تراشنے بیٹھ جائیں۔ بعض لوگوں نے تو اسی مغالطہ میں تمام جگہ آپ کے چشم دید حالات کو صرف کشف کہہ دیا ہے حتیٰ کہ معراج کو بھی ایک قسم کا کشف ہی کہہ ڈالا ہے تعجب ہے کہ خود دیکھنے والا تو اپنے متعلق دیکھنے کا عقیدہ رکھتا ہے اور یہی باور کرانے کی سعی کرتا ہے مگر سننے والا ہے کہ اس کی خیرخواہی میں صرف اس کے الفاظ کی تاویل کرنے لگتا ہے اس کی آنکھوں نے اس کو نہیں دیکھا۔

بہت سے لوگ چاند نہیں دیکھتے مگر صرف دیکھنے والوں کے اعتماد پر روزہ رکھ لیتے ہیں اور اس بناء پر کہ چونکہ خود انہوں نے نہیں دیکھا روزہ سے انکار نہیں کرتے اور نہ دیکھنے والوں کے لئے کوئی تاویل کرتے ہیں بلکہ اپنا قصور نظر ہی سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے حجم غفیر کے مقابلہ میں مخلوق کو چاہئے کہ وہ اپنے قصور نظر کا اعتراف کرلے نہ یہ کہ ان کے مبصرات ومرئیات کا ہی انکار کردے۔ اس تحقیق سے مقصد یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی رؤیت کے متعلق کسی صاف اشارہ وایماء کے بغیر ہم کوئی تاویل نہیں کریں گے اسی طرح رؤیت کو صرف مخصوص ایک جسم کے حصہ میں منحصر سمجھ لینا بھی غلط ہے۔ کائنات عالم میں سائنس آئے دن نئے سے نئے عجائبات پیش کرتی رہتی ہے اور وہ کبھی اس لئے قابل انکار نہیں سمجھے جاتے کہ پہلے واقعات کے خلاف ہیں بلکہ ہر نئے واقعہ کو قدرت کا ایک نیا شاہکار سمجھا جاتا ہے اگر اس لحاظ سے نبی کی شخصیت بھی کچھ مجموعۂ عجائبات مان لی جائے تو اس میں کیا استبعاد ہے۔ (باقی حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

علم النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۸۰) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَمَرَهُمْ أَمَرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيْقُوْنَ قَالُوْا إِنَّا لَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ فَيَغْضَبُ حَتّٰى يُعْرَفَ الْغَضَبُ فِيْ وَجْهِهٖ ثُمَّ يَقُوْلُ إِنَّ أَتْقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللّٰهِ أَنَا۔ (رواہ البخاری فی الایمان)

نبی کا علم

(۱۸۰) حضرت عائشہؓ روایت فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی بات کا صحابہ کو حکم دیتے تو ایسی بات کا حکم دیتے جو آسانی سے بسہولت ہو سکے وہ (شوق شوق میں) عرض کرتے یا رسول اللہ ہم آپ کی طرح تو نہیں، آپ کی تو اللہ تعالیٰ نے اگلی پچھلی سب ہی لغزشیں معاف کردی ہیں اس پر آپ کو اتنا غصہ آتا کہ اس کا اثر چہرۂ مبارک پر نمایاں ہونے لگتا پھر آپ فرماتے دیکھو تم سب میں زیادہ پرہیزگار اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا سب میں زیادہ عالم میں ہوں۔ (بخاری)

(باقی حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) بالخصوص جبکہ اس کی شخصیت اپنے دور کے انسانوں میں ہی نہیں بلکہ عالم کے عالم میں انقلاب برپا کرنے والی ہو۔ اگر وہ خود بھی قوتوں میں عام قوتوں سے اونچی نظر آئے تو اس کا کیوں انکار کیا جائے۔

ہمارے نزدیک نبی اور امتی کی قوتِ بصریہ میں ایک فرق یہ ہے کہ امتی کی نظر اس عالم میں صرف اسی عالم کی اشیاء تک محدود رہتی ہے جب وہ اس جہاں سے گذر کر برزخ میں جا پہنچتا ہے تو پھر اس کی سیرگاہ عالم برزخ بن جاتا ہے اور جب برزخ سے آخرت کی طرف بڑھ جاتا ہے تو کائناتِ آخرت اس کے نظر کی جولانگاہ ہو جاتی ہے۔ غرض جس عالم میں وہ خود ہوتا ہے اس کی نظر بھی اسی عالم میں محدود رہتی ہے۔ نبی کی نظر اسی عالم میں تمام عالمین کی سیر کر سکتی ہے وہ اسی عالم میں برزخ اور آخرت کی کائنات کا اس طرح مشاہدہ کر سکتی ہے جیسا امتی کی نظر اس عالم میں پہنچ کر کرتی ہے انبیاء علیہم السلام اس جہاں میں بھی اہلِ جنت کے خواص رکھتے ہیں اس لئے دنیا میں بھی ان کی قوتوں کے وہ آثار ملتے ہیں جو اہلِ جنت کے جنت میں منقول ہیں۔

اصل یہ ہے کہ رؤیت کی چار قسمیں ہیں دیکھنے والا اور جس کو وہ دیکھتا ہے دونوں مادی ہوں یا دونوں مجرد، یا ایک مادی ہو، دوسرا مجرد، ان میں سے ہمارے دائرہ میں صرف پہلی صورت معہود ہے اس لئے ہم نے دیکھنے کا مفہوم اسی میں منحصر سمجھ لیا ہے اور جہاں کہیں اس کے خلاف رؤیت کا لفظ نظر آتا ہے تو ہمارا ذہن فوراً اس کی تاویل ہی کی طرف چلا جاتا ہے۔ حالانکہ رؤیت کا یہ صرف ¼ حصہ تھا بقیہ تین صورتوں میں مجرد کی مجرد کو اور مجرد کی مادی کو رؤیت بھی قابلِ تسلیم نظر آتی ہے جہاں عقل چکراتی ہے وہ صرف مادی کی رؤیت مجرد کو ہے۔ یہاں عالم مجردات چونکہ ہمارے مشاہدہ میں نہیں اس لئے جن کے مشاہدہ میں ہے ہم ان کے لئے بھی دیکھنا باور نہیں کرتے یہ قیاس غلط قیاس ہے۔

(باقی حاشیہ برصفحۂ آئندہ)

(۱۸۱) عَنْ عَائِشَةَ صَنَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْئًا تَرَخَّصَ فِيْهِ وَتَنَزَّهَ عَنْهُ قَوْمٌ فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ

(۱۸۱) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کوئی ایسا عمل کیا جس میں رخصت کا پہلو اختیار کیا، بعض لوگوں نے اس عمل کے اختیار کرنے سے احتراز کیا، یہ بات آپ تک پہنچ گئی اسی وقت آپ نے خدا کی حمد و ثنا، (خطبہ) کے بعد فرمایا لوگوں کا بھی کیا حال ہے بھلا

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) انبیاء علیہم السلام کی مادیت اتنی مصفیٰ و مزکی ہوتی ہے کہ ملائکہ کا تجرد ان کے سامنے شرماتا ہے لوہے کی اور شیشہ کی مادیت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، عالم تجرد کے شیشہ میں جب تک مادیت کا حجاب قائم نہیں ہوتا کسی کامل کی تجلی گاہ نہیں بنتا۔ اسی مادیۃ ہی میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خلافت اور فرشتوں کی محرومی کا راز مضمر ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا عنصر مادیۃ بھی ایسا جوہر دار ہوتا ہے کہ جب کبھی عالم تجرد کی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں تو وہ آئینۂ سکندری کی طرح جگمگانے لگتا ہے اس لئے قدرت اگر چاہے تو وہ اسی عالم مادیات میں مجردات کا مشاہدہ کر لیتے ہیں ہاں اگر ماوراء مجردات کا مشاہدہ مطلوب ہو تو انھیں بھی اس عالم کو چھوڑنا پڑتا ہے گویا عالم عنصری میں ان کی مادیت مجردات کے مشابہ ہوتی ہے اس لئے جن امور کا مشاہدہ اہلِ جنت کے لئے موعود ہے وہ ان کے لئے نقدِ وقت بن جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

(حاشیہ صفحۂ ہذا)(۱۸۱) علم دراصل خشیۃ الٰہی کا ہی نام ہے اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اللہ کی ذات پاک سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں۔ خشیۃ اُس خوف کو کہتے ہیں جو کسی ذات کے استحضار عظمت کے ساتھ ہو، ہر خوف کو خشیۃ نہیں کہتے عالِم اگر ڈرتا ہے تو وہ خدا کی ذات کی عظمت و جلال کا تصور کر کے ڈرتا ہے، غیر عالم کو ان امور کا اتنا علم نہیں ہوتا اس لئے وہ ڈرتا ہے تو صرف اس کے عذاب کا تصور کر کے ڈرتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبیِ وقت کے سب سے زیادہ عالم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ خدا کے ذات و صفات کا سب سے زیادہ علم اس کو ہوتا ہے اور اسی لئے سب میں زیادہ خدا سے ڈرنے والا بھی وہی ہوتا ہے۔ جس مقصد کے لئے نبی کو بھیجا جاتا ہے وہ مخلوق کی ہدایت ہے اسی لئے تمام علوم ہدایت اس کو مرحمت کئے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس سب سے زیادہ کامل تر ہے اس لئے آپ کو یہ علوم بھی سب میں کامل تر ملے ہیں۔ اس کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو اور بھی بہت سے امور کا علم مرحمت ہوتا ہے جو مقصد دعوت و تبلیغ میں ان کے لئے کارآمد ہوں۔ اسی طرح بعض علوم وہ ہوتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کو قصداً نہیں سکھلائے جاتے اور اس لئے نہیں سکھلائے جاتے کہ وہ شایان شان نبوت نہیں ہوتے ارشاد ہوتا ہے وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ۔ ہم نے شعر گوئی آپ کو نہیں سکھائی اور یہ آپ کی شایانِ شان بھی نہیں تھی۔ گویا نبوت اور شاعری دو متضاد صفتیں ہیں اسی لئے شعر گوئی تو در کنار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر خوانی بھی ثابت نہیں ہوتی ایک آدھا شعر پڑھنا منقول ہے اس میں بھی علماء کو بحثیں ہیں۔ بہر حال کچھ علوم ایسے بھی ہیں جو بتصریح قرآن کریم شان نبوت کے مناسب نہیں سمجھے گئے۔ معلوم ہوا کہ اصولاً یہ سمجھنا ہی غلط ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو تمام علوم حاصل ہوتے ہیں۔ اساسی طور پر ان کو وہی علوم سکھائے جاتے ہیں جن کی تبلیغ کے لئے ان کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے (باقی حاشیہ صفحۂ آئندہ)

يَتَنَزَّهُوْنَ عَنِ الشَّيْءِ اَصْنَعُهُ فَوَاللّٰهِ اِنِّيْ لَاَعْلَمُهُمْ بِاللّٰهِ وَاَشَدُّهُمْ لَهٗ خَشْيَةً (رواہ البخاری فی الاعتصام)

اُس عمل سے احتراز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں خدا کی قسم ان سب میں زیادہ خدا کا علم رکھنے والا اور سب سے زیادہ اس سے ڈرنے والا تو میں ہوں۔ (بخاری)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اسی لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باوجود اتنے بازو بنانے کے ان علوم کا کوئی حصہ نہیں دیا گیا جس کا دریا حضرت خضر علیہ السلام کے سامنے بہہ رہا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ظرفِ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اُن علوم کے تحمل کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی تھی وہ ہر موقعہ پر تلمذانہ صبر دکھانا چاہتے تھے مگر بیتاب ہوکر معترضانہ تعہد کر گذرتے تھے آخر چند یوم کی صحبت بھی نہ نبھا سکے اور اس پر تیار ہوگئے کہ جس کے سامنے کچھ دن استفادہ کے لئے آئے تھے ہمیشہ کے لئے اس کو ندائے الفراق سنا دیں۔ یہی وہ بات تھی جس کو حضرت خضرؑ نے پہلے دن کہدیا تھا۔ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا اے موسیٰؑ تم میرے علوم کا تحمل نہیں رکھتے اس لئے میرے ساتھ رہ بھی نہیں سکتے۔ وہی ہوا اور حضرت خضر علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بار بار بے صبری دیکھکر آخر یہ کہدینا پڑا هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ. جائیے اب بہت ہولیا میرا اور آپ کا ساتھ ختم ہوتا ہے۔ ورنہ یہیے اب ان علوم کی تشریح بھی سنتے جائیے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ عجائبات موسیٰ و خضر علیہما السلام کا تذکرہ کرکے خاتم الانبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں کاش اگر موسیٰ علیہ السلام کچھ اور صبر سے کام لے لیتے تو ہمیں کچھ اور عجائبات کا حال بھی کھل جاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ جو علوم انبیاء علیہم السلام کے دائرہ سے متعلق ہیں وہ صرف علوم ہدایت ہیں۔ سالم کشتی کے تختہ توڑ دینے، اچھے خاصے کھیلتے ہوئے بچے کے قتل کر ڈالنے، اور ایک ترچھی دیوار کو سیدھا کرکے نااہلوں پر احسان رکھنے کے رموز و حکم ان کے علوم میں داخل نہیں وہ یہ گوارا ہی نہیں کرسکتے کہ کسی محسن کی کشتی کا تختہ اپنے ہاتھوں سے اکھاڑ پھینکیں خواہ اس کا انجام کتنا ہی بہتر کیوں نہ ہو، نہ وہ کسی بچے کے قتل کی اجازت دے سکتے ہیں۔ خواہ اس کے والدین کے لئے اس کی حیوۃ کتنی ہی مضر کیوں نہ ہو اور نہ وہ آئینی طور پر نااہلوں پر ایسے احسان کی ترغیب دے سکتے ہیں جو ان کی جہالت و بے حسی میں اور اضافہ کا موجب بن جائے پس ان کے علم کے متعلق نفی و اثبات کی جو بحث ہوگی وہ ان کی نوعیت علم ہی کے دائرہ تک رہے گی۔ ایک سائنس داں شخص کے متعلق یہ کہنا کہ وہ سب کچھ پڑھ چکا ہے یہ مطلب نہیں رکھتا کہ اس کو طبابت و کتابت کے علوم بھی حاصل ہیں ایک عالم کی علمی منقبت کا مطلب یہ کبھی نہیں سمجھا جاسکتا کہ وہ زراعت یا تجارت کے علوم بھی جانتا ہے۔ پس جس طرح ہر اہلِ فن کو اپنے ہی فن کا علم حاصل ہوتا ہے اور اس میں بھی اس کی مہارت کا معیار یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس فن کے ہر معمولی اور غیر معمولی معلومات کا علم رکھتا ہے بلکہ صرف اس کا اجمالی استحضار اس میں ایک ملکہ و رسوخ کا پیدا ہوجانا اس کے غیر معمولی عالم کہلانے کے لئے کافی ہوجاتا ہے بلکہ اس کے ادنیٰ مسائل کا ذہول اس کے لئے عیب شمار نہیں ہوتا اسی طرح خدا کے برگزیدہ نبیوں کا فن ہدایت کا فن ہے وہ جب دنیا میں آتے ہیں تو کبھی اپنے فن کے سوا دوسرے فن میں دخل انداز نہیں ہوتے نہ اس کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ اگر دنیا کو مجبور کرتے ہیں تو اس علم پر عمل کے لئے مجبور کرتے ہیں جو ان کے منصب نبوت سے متعلق ہیں اس کے سوا دوسرے قسم کے علوم کا نہ انھیں دعویٰ ہوتا ہے نہ اس کے فصول و ابواب پر وہ بحث کرتے ہیں اور نہ اس فن کے ماہرین سے الجھنا پسند کرتے ہیں —— اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہاں غرض صرف رخصت پر عمل نہ کرنے پر نہیں ہے بلکہ ان کے اس احتراز اور تنزہ پر ہے جو ایک غلط بنیاد پر اُن کی دماغوں میں پیدا ہوچکا تھا۔ نبی کے مغفور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اب خدا کی عبادت کا محتاج نہیں رہا بلکہ اس کی عبادت اور بڑھ جاتی ہے اور اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ وہ اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہتا ہے

اور ادا کر نہیں سکتا۔ افلا اکون عبدًا شکورًا کا یہی مطلب ہے۔

(۱۸۲) عَنْ رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمَدِيْنَةَ وَهُمْ يَأْبُرُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ مَا تَصْنَعُوْنَ قَالُوْا كُنَّا نَصْنَعُهُ قَالَ لَعَلَّكُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا كَانَ خَيْرًا فَتَرَكُوْهُ فَنَقَصَتْ قَالَ فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ اَمْرِ دِيْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهِ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِنْ رَأْيٍ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ۔ (رواہ مسلم)

(۱۸۳) عَنْ اَنَسٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰى قَوْمٍ يُلَقِّحُوْنَ فَقَالَ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا لَصَلُحَ قَالَ فَخَرَجَ شِيْصًا فَمَرَّ بِهِمْ فَقَالَ مَا لِنَخْلِكُمْ قَالُوْا قُلْتَ كَذَا وَكَذَا قَالَ

(۱۸۲) رافع بن خدیجؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو اس وقت لوگوں کی عادت یہ تھی کہ وہ اپنے کھجوروں کے درختوں کی "تابیر" کیا کرتے تھے، آپ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو، انھوں نے عرض کیا (پھلوں میں زیادتی کے لئے) ہم یہ کام پہلے سے کرتے آتے ہیں، آپ نے فرمایا اگر اب نہ کرو تو شاید بہتر ہو یہ سن کر لوگوں نے تابیر کرنا چھوڑ دیا، پھل کم آنے لگا اس پر لوگوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا دیکھو میں بشر ہوں جب تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کسی بات کا حکم دوں اُسے تو فوراً بلا پس و پیش اختیار کر لو اور جب (دنیا کے معاملات میں) کوئی بات اپنی رائے سے کہوں تو میں صرف ایک بشر ہوں۔ (مسلم)

(۱۸۳) انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی قوم کی طرف گذرے جو کھجوروں کے درختوں میں "عمل تلقیح" کیا کرتی تھی آپ نے ان سے فرمایا اگر تم لوگ ایسا نہ کرو تو اچھا ہو، راوی کہتا ہے کہ (اُس سال) درختوں پر ردی پھل آئے۔ پھر اُس طرف جب آپ گذرے تو پوچھا تمہارے

سلہ عرب میں تابیر اور تلقیح کا قدیم سے رواج تھا۔ اس عمل کی صورت یہ تھی کہ وہ مذکر نخل کا خوشہ لیکر مؤنث کے ساتھ ملا دیتے تھے اس کے بعد جب پھل آتا تو بہت کثرت سے آتا۔ پہلی حدیث میں آپ نے یہ فرمایا ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا تم سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں۔ یہاں یہ ارشاد ہے کہ دنیا کے دھندوں کو سب سے زیادہ جاننے والے تم ہو۔ یہ علوم نبوت نہیں ہیں۔ ہر اہلِ فن کو اپنے فن کا علم حاصل ہوتا کمال سمجھا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے علوم یہ نہیں ہیں کہ دیسی آموں کو قلمی کیسے بنایا جاتا ہے کس زمین میں کیسا کھاد دیا جاتا ہے، کس فصل میں کیا بویا جاتا ہے، ان علوم کو دنیا ان کے آنے سے پہلے بھی جانتی ہے اور ان کے بعد بھی ان میں ہزاروں ترقیاں کرتی رہتی ہے۔ آج ہماری دنیا کے علوم جہاں تک پہنچ چکے ہیں ان کا ہر شخص کو تو تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ جنگ کے متعلق محیر العقول ایجادات زراعت میں بے موسم پیداوار، بجلی اور بھاپ کے انوکھے سے انوکھے کارنامے آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کیا ان علوم میں سے کسی کی طرف صاحب نبوۃ نے تعرض فرمایا ہے۔ یہاں تمہاری عقول کو آزادی دی گئی ہے اجتہاد اور جد و جہد کے جتنے مدارج ہیں طے کئے جائیں اور اپنی دنیا کو جتنا مزین کر سکتے ہیں کئے جائیں۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْيَاكُمْ (رواہ مسلم فی کتاب الفضائل فی باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً)

درختوں کو کیا ہوگیا، انھوں نے عرض کیا آپ نے اس اس طرح ارشاد فرمایا تھا (حسب الامر ہم نے تلقیح نہیں کی) اس پر آپ نے فرمایا کہ اپنی دنیوی زندگی کو تم خود بہتر جانتے ہو۔ (مسلم)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) ان علوم میں شریعت کوئی دست اندازی نہیں کرتی جب تک کہ آپ اس سے ٹکرائیں نہیں۔ ہاں جن علوم کے لئے انبیاء علیہم السلام آتے ہیں وہ علوم ہدایت ہیں اور وہ اب اتنے مکمل ہو چکے ہیں کہ ایک نقطہ لگانے کی اس میں گنجائش نہیں رہی، یہ وہ علوم ہیں جن کو دنیا نہ انبیاء علیہم السلام کی آمد سے پہلے جانتی ہے نہ ان کے بعد اس میں ایک شوشہ کا اضافہ کرسکتی ہے وہی ان کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہی ان کا کمال سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے سوا اور علوم کا نہ انھیں دعویٰ ہوتا ہے نہ ان میں دخل اندازی وہ پسند کرتے ہیں۔ یہاں کسی کو یہ دھوکا نہ لگے کہ ہم نے دنیا کو دین سے علیحدہ کر دیا ہے اور اپنی دنیا کو ہدایات شریعت سے گویا بے نیاز سمجھ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا بڑا شعبہ ہمارے دین کا جزء ہے مگر وہ دنیا شریعت میں دین کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اس دنیا میں انبیاء علیہم السلام ہی شریک ہوتے ہیں بلکہ اس کے مؤسس اور معلم وہی ہوتے ہیں۔ دنیا کا دوسرا شعبہ وہ ہے جو دین سے متعلق نہیں، وہ انبیاء علیہم السلام کی دنیا نہیں تمہاری دنیا ہے اُسے تم خود جانتے ہو مثلاً زراعت کرنا انسانی زندگی کے لئے کس حد تک مفید ہے اس کے اصول کلیہ کیا ہیں، کب، کس سے، کن شرائط سے کرنا مناسب ہے۔ تجارت میں ایجاب و قبول، نفع کے حدود، بائع و مشتری کے اختیارات، اختلاف کی صورتوں میں فیصلہ کی راہ، جنگ و صلح کے نقض و ابرام کے شرائط وغیرہ وغیرہ یہ سب انبیاء علیہم السلام کی دنیا ہے جسے وہ خود سکھاتے بتاتے ہیں اس کے اصول و فروع، ابواب و فصول خود قائم کرتے ہیں۔ اس دنیا کو دین کہا جاتا ہے لیکن ان اصول و کلیات کے بعد زراعت کی یہ تفصیلات کہ اس کے لئے کس کس سامان کے فراہم کرنے کی ضرورت ہے کس کس قسم کے مصنوعات درکار ہیں یہ تمہاری دنیا ہے اسے تم خود جانتے بوجھتے ہو۔ اسی کی طرف حدیث مذکور میں لفظ "دنیاکم" سے اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ دنیا کا ایک شعبہ خود دین کا جزء ہے۔ اس کی ہدایات بھی اس کے ذمہ ہیں۔ اس کا دوسرا شعبہ دین کا جزء نہیں اس کو تمہارے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ تمہاری دنیا ہے تم اس میں خود مختار ہو۔ ان حدود کو جدا جدا پہچاننے کے لئے ان تفصیلات کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے جو شرعی دنیا کے متعلق موجود ہیں ان کو پیش نظر رکھے بغیر صرف چند سطور لکھ کر کوئی ایسا واضح خط قائم نہیں کیا جاسکتا جو دنیا کے ان دونوں شعبوں میں پورا پورا امتیاز پیدا کردے۔

شیخ عبدالعزیز دباغ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت مشاہدہ کے سلسلہ میں ضمناً اس حدیث پر بھی گذر گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو کائنات عالم کے ہر ہر ذرہ میں قدرت کی کارفرمائی کا ایسا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے کہ پھر مسببات کا اپنے اسباب کے ساتھ ارتباط صرف برائے بیت نظر آنے لگتا ہے یہ یقین و مشاہدہ ان پر ہمہ وقت مستولی رہتا ہے۔ اس لئے وہ عالم کی ہر حرکت و سکون کا حقیقی کارساز حق تعالیٰ ہی کو دیکھتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ دیکھتے ہیں جیسا کہ ہم اسباب کو۔ ایک مومن کو بھی انبیاء علیہم السلام کے طفیل میں اس نوع کا مشاہدہ نصیب ہو جاتا ہے مگر نہ وہ اتنا قوی ہوتا ہے اور نہ دائم آخر بہت جلد اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے پھر لے اپنی طبعی کشش کے مطابق اسباب ہی کی کارفرمائی نظر آنے لگتی ہے۔ جس پر پہلا مشاہدہ غالب ہوتا ہے وہ بیشک اسباب کی ضعیف کڑیوں کو کوئی اہمیت نہیں دیگا قدرت بھی اس کے مشاہدہ و یقین کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرے گی۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

(۱۸۴) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَائِشٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَأَيْتُ رَبِّيْ فِيْ أَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْأَعْلٰى قُلْتُ أَنْتَ أَعْلَمُ قَالَ فَوَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفَيَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَتَلَا وَكَذٰلِكَ نُرِيْ إِبْرَاهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۔ رواه الدارمی مرسلاً

(۱۸۴) عبدالرحمن بن عائش سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے اپنے پروردگار کو ایک بڑے حسین وجمیل انداز میں دیکھا۔ اس نے ارشاد فرمایا (بتایئے) ملائکہ مقربین کس مسئلہ میں گرما گرمی سے گفتگو کر رہے ہیں میں نے عرض کیا آپ ہی زیادہ جاننے والے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد پروردگار عالم نے اپنا دستِ قدرت میرے دونوں شانوں کے درمیان رکھدیا اس کی خنکی میں نے اپنے دونوں چھاتیوں کے درمیان محسوس کی اور آسمانوں اور زمین میں جو بات (چیت ہو رہی) تھی وہ سب جان گیا اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی کہ اسی طرح ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو آسمانوں اور زمین کی سلطنت دکھلائی تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں ہو جائے۔ ترمذی نے حضرت ابن عباس و معاذ بن جبل سے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) لیکن جس پر یہ مشاہدہ غالب نہیں وہ اسباب ہی کو دیکھ رہا ہے وہ اپنے مشاہدہ کا پابند ہوتا ہے۔ قدرت بھی اس کے مشاہدہ کے مطابق اس سے معاملہ کرتی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مقام میں تھے اس لئے آپ نے جو فرمایا درست فرمایا تھا لیکن صحابۂ کرام پر چونکہ اس مشاہدہ کا غلبہ نہ تھا اس لئے انھیں اس درجہ کا جزم و یقین بھی حاصل نہ تھا قدرت نے بھی ان کے ساتھ ان کے اندازۂ یقین کے مطابق معاملہ کیا اور آخر درختوں پر پھل کم آیا، اگر وہ یقین کے اسی درجہ پر آجاتے تو تابیر کئے بغیر بھی پھل کم نہ ہوتا آپ نے یہ محسوس کر کے کہ اس مشاہدہ پر عوام ان کے لئے مشکل ہے۔ جاذب طبعی انھیں اسباب کی طرف ہی مائل کرتا رہے گا انھیں معذور سمجھا اور فرمایا کہ اچھا تو پھر تم اپنی دنیا کو بہتر جانتے ہو۔ علہ (ابریز ص ۱۱۸)

(حاشیہ صفحۂ ہٰذا ۱۸۴) محققین کے نزدیک تجلیاتِ الٰہیہ کی رویت کو اللہ تعالیٰ کی رویت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوہِ طور پر ایک آگ ہی کی صورت دیکھی تھی لیکن جو آواز اس آگ سے آئی وہ "انا ربک" کی آواز تھی۔ اسی طرح خواب میں اللہ تعالیٰ کی رویت درحقیقت تجلیاتِ الٰہیہ کی رویت ہوتی ہے۔ اس حدیث سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ایسے معاملہ کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ پیش آچکا تھا آسمان و زمین کے عجائبات کا مشاہدہ خلیل اللہ کو بھی کرایا گیا تھا۔ اسی قسم کا ایک مشاہدہ یہاں حبیب اللہ کو بھی کرایا گیا ہے لیکن اس تمام مشاہدہ میں سوال و جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل مقصد ان علوم کا ہی افاضہ کرنا تھا (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

علہ یہ شرح اپنی جگہ گو ایک حقیقت ہے مگر اس حدیث کے جو الفاظ صحیح مسلم میں مختلف راویوں نے بیان کئے ہیں افسوس ہے کہ اس پر وہ پورے طور پر منطبق نہیں ہوتے۔ علماء اور عرفاء ان الفاظ پر غور کرلیں۔
واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔

وللترمذی نحوہ عنہ عن ابن عباس ومعاذ بن جبل وزاد فیہ قَالَ یَا مُحَمَّدُ ھَلْ تَدْرِیْ فِیْمَ یَخْتَصِمُ الْمَلَأُ الْاَعْلٰی قُلْتُ نَعَمْ فِی الْکَفَّارَاتِ وَالْکَفَّارَاتُ الْمُکْثُ فِی الْمَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَوَاتِ وَالْمَشْیُ عَلَی الْاَقْدَامِ اِلَی الْجَمَاعَاتِ وَاِبْلَاغُ الْوُضُوْءِ فِی الْمَکَارِہِ فَمَنْ فَعَلَ ذٰلِکَ عَاشَ بِخَیْرٍ وَمَاتَ بِخَیْرٍ وَکَانَ مِنْ خَطِیْئَتِہٖ کَیَوْمِ وَلَدَتْہُ اُمُّہٗ وَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اِذَا صَلَّیْتَ فَقُلْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ فِعْلَ الْخَیْرَاتِ وَتَرْکَ الْمُنْکَرَاتِ وَحُبَّ الْمَسَاکِیْنِ فَاِذَا اَرَدْتَ بِعِبَادِکَ

اس پر اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ ہاتھ رکھنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھر ارشاد فرمایا اے محمد اب بتلایئے کہ ملائکہ مقربین کیا گفتگو کر رہے ہیں، میں نے عرض کیا جی ہاں ان اعمال کے متعلق کر رہے ہیں جن سے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ وہ اعمال یہ ہیں نمازوں کے بعد دوسری نمازوں کے انتظار میں مسجدوں میں رہنا۔ پیادہ پا چل کر نماز باجماعت کے لئے جانا۔ تکلیفیں اٹھا کر وضو پورا پورا کرنا (جیسا جاڑوں میں) جس نے یہ عمل کئے اس کی زندگی بھی مطمئن اور موت بھی مطمئن حال میں ہوگی اور اس کی خطائیں ایسی رہ جائیں گی جیسے ماں سے پیدائش کے دن تھیں (یعنی کچھ نہ رہیں گی) اور نیز یہ فرمایا کہ اے محمد نماز کے بعد یہ کلمات بھی پڑھ لیا کیجئے۔ اللھم انی اسألک اے اللہ میں تجھ سے یہ مانگتا ہوں کہ بھلائیاں کروں، برائیاں چھوڑ دوں، مسکینوں سے محبت رکھوں اور

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) جن کے لئے انبیاء مبعوث ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب آپ سے سوال کیا گیا تو جامیٹری اور الجبرے کے کسی فارمولہ کا سوال نہ تھا اور نہ عالم تکوینیات کے کسی باریک مسئلہ کا سوال تھا بلکہ اُسی دائرہ کا سوال تھا۔ جو انبیاء علیہم السلام سے متعلق ہیں۔ رب العزت نے جب اُن علوم کا افاضہ چاہا تو اس کے لئے عالم رویا میں شفقت وکرم کی ایک نرالی صورت اختیار کی اور اس کے بعد جب پھر سوال ہوا تو وہی پہلا سوال تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں متکلم و مخاطب دونوں کے درمیان جن علوم کا افادہ و استفادہ ہو رہا تھا وہ وہی علوم تھے جو منصب نبوت سے متعلق ہیں جب بحث صرف الفاظ کے عموم وخصوص پر ختم کر دی جائے اور متکلم و مخاطب کا ماحول دماغ سے نکال دیا جائے تو کبھی صحیح مراد حاصل نہیں ہو سکتی قرآن کریم میں بلقیس کے قصہ میں موجود ہے واوتیت من کل شیٔ۔ اُسے ہر چیز میں سے ایک حصہ ملا تھا۔ سیاق وسباق کی رعایت کرنے والے کے نزدیک تو بات صاف ہے وہ جانتا ہے کہ یہاں بلقیس کی صرف عظمتِ مملکت کا بیان کرنا منظور ہے اور اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو خدم وحشم، سازو سامان، کسی بادشاہ کو درکار ہوتے ہیں۔ وہ سب اس کو بھی حاصل تھے لیکن اگر صرف الفاظ کے عموم کو دیکھ کر یہ بحث شروع کر دو کہ جب اس کو ہر چیز دی گئی تھی تو ڈاڑھی بھی ضرور دی گئی ہوگی تو یقیناً نتیجہ غلط ہوگا۔ توراۃ کے متعلق ارشاد ہے تبیانا لکل شیٔ۔ اس میں ہر چیز کا بیان ہے۔ اب اگر یہاں صرف اس عموم پر ہی فیصلہ کرو تو پھر قرآن کی ضرورت کیا رہتی ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ

قال قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما ما ترک شیئا یکون فی مقامہ ذلک الی قیام الساعۃ الا حدث بہ حفظہ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ وعظ فرمایا اور قیامت تک جو حوادث شدنی تھے ان میں کوئی عام نہیں چھوڑا جو بیان نہ کر دیا ہو جس نے یاد رکھا یاد رکھا

فِتْنَةً فَاقْبِضْنِيْ اِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُوْنٍ قَالَ وَالدَّرَجَاتُ اِفْشَاءُ السَّلَامِ وَ
اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَالصَّلٰوةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ۔

جب تو اپنے بندوں کی آزمائش کا ارادہ کرے تو میری آزمائش کے بغیر مجھے اٹھا لینا اور فرمایا کہ جن اعمال سے درجات بلند ہوتے ہیں وہ یہ ہیں، ہر کس و ناکس کو سلام کرنا، اللہ کی راہ میں کھانا کھلانا اور شب میں اس وقت نماز ادا کرنا جبکہ لوگ پڑے سو رہے ہوں۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ)

من حفظہ و نسیہ من نسیہ قد علمہ اصحابی هولاء وانہ لیکون منہ الشئ قد نسیتہ فاراہ فاذکرہ کما یذکر الرجل وجہ الرجل اذا غاب منہ ثم اذا راٰہ عرفہ۔ (متفق علیہ)

اور جو بھول گیا سو بھول گیا، یہ بات میرے یہ سب رفقاء بھی جانتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ مجھے یاد نہیں آتا۔ جب پیش آجاتا ہے اور میں اُسے دیکھتا ہوں تو اس طرح یاد آجاتا ہے جیسے کوئی شخص کسی کو غائبانہ یاد کرے اور یاد نہ آئے، جب دیکھے تو یاد آجائے اور پہچان لے۔ (متفق علیہ)

اس حدیث کو اگر دنیا کے فتنوں پر محمول کیا جائے تو اس کا مضمون بالکل صاف ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس وعظ میں آپ نے قبل از قیامت جو خاص خاص فتنے پیش آنے والے تھے سب بیان فرما دیئے تھے، لیکن اگر نبی اور صحابہ کے مخصوص ماحول کو چھوڑ کر لفظی عموم پر اترا آو اور "ما ترک شیئاً" کا مفہوم یہ لو کہ ہر چھوٹے بڑے واقعات خواہ وہ دنیا کے کسی معاملہ سے متعلق ہوں، آپ نے سب بیان کر دیئے تھے۔ تو پھر یہی حدیث عقل و نقل دونوں کے خلاف ہو جائے گی کیونکہ ایک وعظ میں دنیا بھر کے صرف ایک گھنٹہ بلکہ ایک منٹ کے واقعات بھی تمام نہیں سما سکتے۔ قیامت تک کے واقعات تو کجا اس قسم کی موشگافیاں اگر ہمارے روزمرہ کے محاورات میں پیدا کر دی جائیں تو یقیناً بات کرنا دوبھر ہو جائے بلکہ نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ سوچئے اگر ایک ایسے شخص سے جو اگریکلچر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر چکا ہے آپ یہ دریافت کریں کہ کیا وہ تمام کتابیں پڑھ چکا ہے تو یقیناً اس کا جواب اثبات ہی میں ہوگا اب اگر آپ اس پر یہ اعتراض کریں کہ جب تو نے فلسفہ، علم الارض اور علم الاخلاق وغیرہ وغیرہ کی کتابیں نہیں پڑھیں تو پھر تیرا "تمام" کا لفظ کہنا جھوٹ ہے اس کا حاصل یہی ہوگا کہ اس پر آپ بات چیت کا دروازہ ہی بند کر دیں۔ اس حدیث میں بھی نبی اور رضا کے مابین تعلیم و تعلم کے ایک محفل کا ذکر ہے اس کے سیاق و سباق سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس مجلس کا خلاصہ اُن علوم کا افاضہ تھا جو آسمانوں میں ایک اونچی سوسائٹی کے درمیان زیر بحث تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ازراہ کرم و تکریم ان علوم کو براہ راست آپ کو سکھا دیا آپ نے یہ کرم فرمایا کہ ان کو صیغۂ راز میں نہیں رکھا بلکہ اپنی امت کو بھی پہنچا دیا اور اس طرح "نبی رحمت" کی وجہ سے آپ کی امت نے بھی اُن علوم کو حاصل کر لیا جس سے عام فرشتے بھی ناآشنا تھے۔ ہمیں یہ دعوٰی نہیں ہے کہ اس حدیث میں جتنے امور بتائے گئے تھے بس وہ اتنے ہی تھے۔ نہ اس حسابی ناپ تول کا ہمیں حق ہے ممکن ہے کہ اور بھی بہت سے امور کا انکشاف ہوا ہو، لیکن جن علوم سے منصب نبوت کی عظمت ظاہر ہوتی ہے ان کا جو حصہ ہم تک پہنچا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے اس سے زیادہ کی ہم نفی نہیں کرتے کسی دلیل صریح کے بغیر اس کے اثبات پر تم اصرار مت کرو۔ درحقیقت یہ ایک بڑی گستاخی اور جہالت کی بات ہے کہ ایک حقیر مخلوق خدا اور اس کے رسول کے علوم کا احتساب شروع کر دے۔

(باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

(۱۸۵) أَخْبَرَنِي أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ حِينَ زَاغَتِ الشَّمْسُ فَصَلَّى لَهُمْ صَلٰوةَ الظُّهْرِ فَلَمَّا سَلَّمَ قَامَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَذَكَرَ السَّاعَةَ وَذَكَرَ أَنَّ قَبْلَهَا أُمُورًا عِظَامًا ثُمَّ قَالَ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَسْأَلَنِي عَنْ شَيْءٍ فَلْيَسْأَلْنِي عَنْهُ فَوَاللهِ لَا تَسْأَلُونَنِي عَنْ شَيْءٍ إِلَّا أَخْبَرْتُكُمْ بِهِ مَا دُمْتُ فِي مَقَامِي هٰذَا قَالَ أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ فَأَكْثَرَ النَّاسُ الْبُكَاءَ حِينَ سَمِعُوا ذٰلِكَ مِنْ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَكْثَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَقُولَ سَلُونِي فَقَامَ عَبْدُ اللهِ بْنُ حُذَافَةَ فَقَالَ مَنْ أَبِي يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ أَبُوكَ حُذَافَةُ فَلَمَّا أَكْثَرَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَقُولَ سَلُونِي بَرَكَ عُمَرُ

(۱۸۵) انس بن مالکؓ بیان فرماتے ہیں کہ آفتاب ڈھلنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھائی جب سلام پھیر چکے تو منبر پر کھڑے ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا اس ضمن میں یہ بھی ذکر کیا کہ قیامت سے پہلے بڑے بڑے واقعات رونما ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا جو شخص چاہے وہ مجھ سے جو چاہے پوچھ لے خدا کی قسم جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوا ہوں تم مجھ سے جو دریافت کرو گے میں تم کو بتا دوں گا۔ انسؓ کہتے ہیں لوگ یہ سن کر بہت روئے۔ اِدھر آپ بار بار فرماتے تھے کہ پوچھو پوچھو آخر عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہوئے اور پوچھا یا رسول اللہ میرے والد کون ہیں (ان کے نسب میں لوگ تہمت لگاتے تھے) فرمایا تیرے والد حذافہ ہیں جب اس کے بعد بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ اور پوچھو اور پوچھو تو عمرؓ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا ہم خدا کو رب اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) ہمیں ہرگز اس کا حق نہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کے تمام علوم اٹھا کر نبی کے دامن میں ڈالدیں اور نہ اس کا کہ اپنی جانب سے کوئی ایسی صاف تقسیم کردیں جس کے بعد خدا اور اس کے رسول کے علوم میں پورا پورا امتیاز ہو جائے، یہ سب مباحث تفریق بین المسلمین کی بنیاد ہیں۔ ہمارے ایمان کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے اس میں سے وہ جس رسول کو جتنا چاہے دیدیتا ہے اس غیب الغیب میں سے جتنے علوم اس نے ہمارے رسول کو بخشے اتنا حصہ اپنے رسولوں میں کسی کو نہیں بخشا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔
اس سے زیادہ بحث عبث اور لغو ہے۔

(حاشیہ صفحہ ھذا (۱۸۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر متعلق سوالات کرنے کی ممانعت فرمائی تھی اس پر بھی بعض طبائع سوال سے باز نہ آئیں تو ایک مرتبہ آپ کو اس قدر ناگواری پیش آئی کہ منبر پر کھڑے ہو کر آپ نے یہ اعلان فرما دیا کہ اچھا اب جسے جو پوچھنا ہے پوچھ ہی لے۔ اس ناگواری کا عام لوگوں نے احساس نہ کیا۔ آخر حضرت عمرؓ نے بڑھتے ہوئے آثار ناگواری دیکھ کر معذرت کی کہ ہم میں سے خام طبائع کے یہ سوالات اپنی نااہلیت کی بنا پر ہیں ورنہ نہ تو آپ کی رسالت کی آزمائش منظور ہے، نہ دین اسلام کے سوا کسی اور دین کی تلاش ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

فَقَالَ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا قَالَ فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ قَالَ عُمَرُ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَقَدْ عُرِضَتْ عَلَيَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ اٰنِفًا فِيْ عُرْضِ هٰذَا الْحَائِطِ فَلَمْ اَرَ كَالْيَوْمِ فِي الْخَيْرِ وَالشَّرِّ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ اَخْبَرَنِيْ عُبَيْدُ اللّٰهِ ابْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُتْبَةَ قَالَ قَالَتْ اُمُّ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ حُذَافَةَ مَا سَمِعْتُ بِابْنٍ قَطُّ اَعَقَّ مِنْكَ اٰمِنْتَ اَنْ تَكُوْنَ اُمُّكَ قَدْ قَارَفَتْ بَعْضَ مَا تُقَارِفُ نِسَاءُ اَهْلِ الْجَاهِلِيَّةِ فَتَفْضَحَهَا عَلٰى اَعْيُنِ النَّاسِ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ وَاللّٰهِ لَوْ اَلْحَقَنِيْ بِعَبْدٍ اَسْوَدَ لَلَحِقْتُهٗ۔ (رواہ مسلم فی باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم والبخاری فی کتاب الاعتصام۔

رسول مان کر راضی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ عمرؓ کی اس معذرت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا خبردار اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے ابھی ابھی دیوار کی طرف جنت اور دوزخ مثالی طور پر میرے سامنے پیش کی گئی تھیں میں نے برائی اور بھلائی کا ایسا منظر جیسا آج دیکھا تھا کبھی نہیں دیکھا۔ ابن شہاب اپنی اسناد سے بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حذافہ کی والدہ نے عبداللہ سے کہا کہ تجھ جیسی نالائق اولاد میں نے نہیں دیکھی تیرے پاس اس کی کیا ضمانت تھی کہ تیری ماں نے زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی طرح کوئی ناشایاں حرکت نہیں کی اگر کہیں ایسا ہوا ہوتا تو آج بھری محفل میں تم اپنی ماں کو رسوا کر دیا ہوتا۔ عبداللہ بن حذافہ نے کہا خدا کی قسم اگر آپ مجھے کسی حبشی غلام کی بھی اولاد قرار دیتے تو میں اپنے آپ کو اسی کی اولاد سمجھ لیتا۔ (مسلم و بخاری)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) سنا اللہ تعالیٰ کے سوا ہم نے کسی دوسرے کو اپنا رب بنانے کا ارادہ کیا ہے یہ سن کر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ فرو ہو گیا تو آپ نے اپنا ایک بلند مشاہدہ بیان فرمایا جو جنت وجہنم سے متعلق تھا۔ یہاں جو کچھ آپ نے دیکھا ان ہی آنکھوں سے دیکھا تھا البتہ جنت و نار عالم مثال میں نظر آئیں۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نبی کی نظر عالم اجسام اور عالم مثال کو یکساں دیکھتی ہے۔

امام بخاریؒ نے اس واقعہ کو کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے مگر کتاب الاعتصام میں ایک ایسی قید مذکور ہے جو اور جگہ مذکور نہیں اور وہ ما دمت فی مقامی ھذا ہے۔ یعنی جب تک میں اس جگہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ہر سوال کے جواب کے لئے تیار ہو جانا صرف ایک وقتی کیفیت تھی جیسا کہ سامنے دیوار پر اس وقت جنت اور نار کا تمثل۔ اس کی علت یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو رسالت کے ذیل میں قیامت تک کے انسان اور ان کے باپ دادوں کے نام بھی بتا دیئے جاتے ہیں۔ اگر یہ علوم رسالت ہوتے تو ان کے دریافت کرنے سے آپ کو غصہ ہی کیوں آتا۔ لیکن ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ جب رسول کو زیادہ تنگ کیا جاتا ہے تو کبھی قدرت اس کا تکفل فرما لیتی ہے کہ جو اُن سے پوچھا جائے گا (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الانبياء اشد الناس بلاء

(۱۸۶) عَنْ سَعْدٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ النَّاسِ اَشَدُّ بَلَاءً قَالَ الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ يُبْتَلَى الرَّجُلُ حَسَبَ دِيْنِهٖ فَاِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهٖ صُلْبًا اِشْتَدَّ بَلَاءُهٗ وَاِنْ كَانَ فِيْ دِيْنِهٖ رِقَّةٌ هُوِّنَ عَلَيْهِ فَمَا زَالَ كَذٰلِكَ حَتّٰى يَمْشِيَ مَا لَهٗ ذَنْبٌ -

رواه الترمذی وابن ماجة والدارمی وقال الترمذی هذا حديث حسن صحيح -

مخلوق میں سب سے شدید آزمائش انبیار کی ہوتی ہے

(۱۸۶) سعدؓ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش کس کی ہوتی ہے. فرمایا انبیار کی. اس کے بعد درجہ بدرجہ جو افضل ہو (قاعدہ یہ ہے) کہ آدمی کی آزمائش اس کی دینداری کے اندازہ کے مطابق ہوتی ہے اگر وہ اپنے دین میں سخت ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر نرم ہوتا ہے تو اس کی آزمائش بھی ہلکی ہوتی ہے آزمائشوں کا یہی دور رہتا ہے حتیٰ کہ وہ اس طرح چلتا پھرتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ باقی نہیں رہتا (ترمذی)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کا جواب وہ اسی وقت انھیں القا کر دے گی جیسا کہ سیر معراج کے واقعہ میں جب آپ کا بیت مقدس کا سفر مشرکین مکہ کو بعید نظر آیا تو انھوں نے امتحاناً آپ سے مسجد اقصیٰ کے متعلق سوالات شروع کر دیے حدیث میں آتا ہے کہ اس وقت آپ کو اتنی بے چینی ہوئی کہ کبھی نہ ہوئی تھی. ظاہر ہے کہ ایک دیکھنے والا ہر وقت اتنے غور سے تو دیکھتا نہیں کہ ہر چیز کے سب خط و خال محفوظ کر لے. اب اگر آپ ان کے سوالات کے جوابات نہیں دیتے تو منکرین کو مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے اور اگر جواب دیتے ہیں تو اس ارادہ سے آپ نے بیت مقدس کو دیکھا نہ تھا کہ قریش مکہ کو اس کا امتحان بھی دینا ہے. یہ بے چینی آپ کے مربی حقیقی نے محسوس کی آپ فرماتے ہیں کہ بیت مقدس میرے سامنے کر دیا گیا وہ مجھ سے سوال کرتے جاتے میں بڑی سہولت سے دیکھ دیکھ کر اس کا جواب دیتا جاتا بہرحال اس قسم کی جزئیات بھی رسول کی زندگی میں ملتی ہیں مگر اس کو منصبِ رسالت و نبوت کا نہ جزر سمجھا جاتا ہے نہ کمال بلکہ حق تعالیٰ کی اس وقت مشیت پر موقوف ہے اگر چاہے تو انھوں کی تسلی کے لئے خرق عادت کے طور پر اس قسم کا نقشہ بھی دکھلا دے. یہی حال تمام معجزات کا ہے وہ بھی نبی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں اس کی طاقت سے ظاہر نہیں ہوتے نہ اصولی طور پر معجزات کی ان کو کلی طاقت دی جاتی ہے بلکہ وقت و مصلحت کے لحاظ سے اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو اپنی غیر متناہی طاقت کا ان کے ہاتھوں پر اظہار کر دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا نہیں کرتا. اسی لئے کفار کے اعجوبہ نمائیوں کی فرمائشوں کی بھرمار کے جواب میں آپ سے یہ کہہ دیا گیا تھا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا. آپ کہہ دیجئے میرا رب پاک ہے میں تو صرف بشر اور رسول ہوں. اعجوبہ نمائیاں میرا کام نہیں. یہی وجہ ہے کہ انبیار علیہم السلام کو فتح کے ساتھ شکست بھی کھانی پڑتی ہے۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(۱۸۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یُوْعَکُ فَمَسِسْتُہٗ بِیَدِیْ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّکَ لَتُوْعَکُ وَعْکًا شَدِیْدًا فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَجَلْ اِنِّیْ اُوْعَکُ کَمَا یُوْعَکُ رَجُلَانِ مِنْکُمْ قَالَ فَقُلْتُ ذٰلِکَ لِاَنَّ لَکَ اَجْرَیْنِ فَقَالَ اَجَلْ ثُمَّ قَالَ مَا مِنْ مُسْلِمٍ یُصِیْبُہٗ اَذًی مِنْ مَرَضٍ فَمَا سِوَاہُ اِلَّا حَطَّ اللّٰہُ تَعَالٰی بِہٖ سَیِّئَاتِہٖ کَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَۃُ وَرَقَھَا۔ (متفق علیہ)

(۱۸۸) عَنْ عَائِشَۃَ قَالَتْ مَا رَأَیْتُ اَحَدًا اَلْوَجْعُ عَلَیْہِ اَشَدُّ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ۔ (متفق علیہ)

(۱۸۹) عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ وَاِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاھُمْ فَمَنْ رَضِیَ فَلَہٗ

---

(۱۸۷) عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ کو بخار چڑھ رہا تھا میں نے آپ کے جسم کو ہاتھ لگایا (تو بخار بہت تیز تھا) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو تو بخار بہت تیز ہے فرمایا ہاں مجھے اتنا بخار ہے جتنا تم میں دو شخصوں کو ہوتا ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ اس لئے ہے کہ آپ کو اجر بھی تو دوگنہ ملتا ہے۔ فرمایا ہاں اس کے بعد فرمایا کوئی مسلمان ایسا نہیں جس کو مرض وغیرہ کی کوئی تکلیف لاحق ہو مگر اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کی برائیاں اس طرح ساقط کردیتا ہے جیسا درخت اپنے پتے

(۱۸۸) حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے بیماری کی تکلیف اتنی سخت کسی پر نہیں دیکھی جتنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر دیکھی تھی ۔ (متفق علیہ)

(۱۸۹) انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثواب کی زیادتی کا مدار آزمائش کی سختی پر ہے جتنی سخت آزمائش اسی قدر زیادہ ثواب۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) بلکہ عام انسانوں کی طرح بہت سی آزمائشوں میں سے بھی گذرنا پڑتا ہے بلکہ آزمائش کے جو مراحل انھیں طے کرنا پڑتے ہیں وہ کسی اور کو طے کرنا نہیں پڑتے بلکہ ان کی بزرگیوں اور فضیلتوں کا معیار ہی ابتلاء و محن کا یہی لق ودق خارستان ہوتا ہے۔ یہ آزمائشوں کی پر خار وادیوں میں سے نکل کر اپنی بشریت کا ثبوت دیا کرتے ہیں دنیا اپنی نظریات کے مطابق اسے مختلف رنگ دیا کرتی ہے۔ من درچہ خیالم و فلک درچہ خیال۔

(۱۸۹) ان روایات سے معلوم ہوا کہ ابتلاء اور آزمائش نقص وعیب کی دلیل نہیں بلکہ کمال کی دلیل ہے کوتاہ فہم سمجھتے ہیں کہ مقربین وہ ہیں جو ہر قید سے آزاد ہوجائیں گویا محکومیت سے نکل کر دائرۂ حاکمیت میں قدم رکھدیں۔ سیرت انبیاء علیہم السلام یہ بتاتی ہے کہ یہاں جو سب سے بزرگ ہے وہی سب سے زیادہ پابند ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الرِّضَیٰ وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ (رواه الترمذی ابن ماجہ)

اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۹۰) عَنْ جُبَیْرِ بْنِ مُطْعِمٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ لِیْ اَسْمَاءً اَنَا مُحَمَّدٌ وَاَنَا اَحْمَدُ وَاَنَا الْمَاحِی الَّذِیْ یَمْحُوا اللّٰہُ بِیَ الْکُفْرَ وَاَنَا الْحَاشِرُ الَّذِیْ

اُسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ پھر جو راضی رہا اُس سے خدا بھی راضی رہتا ہے اور جو ناراض ہوا اس سے خدا بھی ناراض ہو جاتا ہے۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماءِ مبارکہ

(۱۹۰) جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ میرے چند نام ہیں، میں محمد ہوں، احمد ہوں، اور ماحی ہوں وہ ماحی جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کفر کو محو کرے گا۔ اور حاشر ہوں

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) جس کے متعلق سب سے زیادہ حاکمیت کا گمان ہے وہی سب سے زیادہ محکومیت وعبدیت کا اقرار کر رہا ہے جس طرح سونے کی حقیقت بھٹی میں کھلتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے صبر و استقامت کے کمالات ابتلاء کی چکی میں پس کر نظر آتے ہیں۔ سونے کا کمال یہ نہیں کہ اس کو کسوٹی پر کسا نہ جائے اگر کسا نہ جائے تو اس کا کمال ظاہر کیسے ہو، کمال یہ ہے کہ جتنا کسا جائے اتنا ہی نکھرا ثابت ہوتا جائے۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا کمال یہ نہیں کہ انھیں شکست نہ ہو سردی نہ لگے، گرمی نہ ستائے، فاقہ نہ پہنچے، بیمار نہ پڑیں، خلق خدا کی ایذائیں نہ اٹھائیں۔ کمال یہ ہے کہ جب شکست کھائیں تو ویسے ہی راضی نظر آئیں جیسے کہ فتح کے حال میں نظر آتے تھے، جب سردی و گرمی، فاقہ و بیماری کی تکلیفیں جھیلیں تو ماتھے پر شکن نہ پڑے، سب کی ایذائیں اٹھائیں اور کسی کو ایذا نہ دیں۔ ان کی بشریت کی ایک ایک خصلت سخت سے سخت آزمائش میں ڈالی جائے اور وہ ہر آزمائش میں کبریت احمر کی طرح کھری ثابت ہوتی رہے۔

وَاِذِ ابْتَلٰی اِبْرٰھِیْمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّھُنَّ — ابراہیم کے پروردگار نے کئی باتوں میں اس کا امتحان لیا وہ ان سب میں پورا اور پکّا نکلا۔

اگر یہ آزمائشیں نہ ہوتیں تو مدعی غیر عاشق اور عاشق غیر مدعی میں فرق کہاں سے نظر آتا۔ قرآن کریم میں غزوات کی ایک حکمت یہ بھی بتائی ہے کہ مومن خالص اور منافق خالص کا امتیاز نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کو آب شمشیر پر پرکھا نہ جائے۔ روزمرہ کی محفلوں میں تو دونوں یکساں نظر آتے ہیں۔ مسجدوں میں شرکت بھی کچھ برابر سرابر ہی ہوتی رہتی ہے۔ مگر جہاں ایمان و نفاق نکھرتا ہے وہ اُحُد کا میدان ہے۔ دشمن یوں خوش ہیں کہ مسلمان شکست کھا گئے مسلمان اس پر نازاں ہیں کہ چلو ایک موقعہ تو ایسا ملا جہاں ہماری عاشقی کی لاج رہ گئی ؎

کوتاہ دیدگان ہمہ راحت طلب کنند ؎ عاشق بلا کہ راحت او در بلائے تست

یہ تو خدا مانِ انبیاء علیہم السلام کے جذبات ہیں انبیاء علیہم السلام کے صبر و رضا کا حال ہی جانیں۔

يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى قَدَمِىْ وَاَنَا الْعَاقِبُ. وَالْعَاقِبُ الَّذِىْ لَيْسَ بَعْدَهٗ نَبِىٌّ (متفق علیہ)

(۱۹۱) عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا تَعْجَبُوْنَ كَيْفَ يَصْرِفُ اللّٰهُ عَنِّىْ شَتْمَ قُرَيْشٍ وَلَعْنَهُمْ يَشْتِمُوْنَ مُذَمَّمًا وَيَلْعَنُوْنَ

وہ حاشر جس کے بعد ہی قیامت میں اور لوگوں کا حشر ہوگا اور عاقب ہوں۔ عاقب اُسے کہتے ہیں جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔ (متفق علیہ)

(۱۹۱) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم نے کیا یہ عجیب اور پر لطف بات بھی دیکھی؟ اللہ تعالیٰ کس خوبی سے قریش کی لعنت ملامت میرے نام پر پڑنے نہیں دیتا

(۱۹۰) حافظ ابنِ قیمؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر نام آپ کی کسی نہ کسی صفت کی جلوہ گاہ ہے صرف ایک عَلَم نہیں جس کا مقصد کسی ذات کا تعارف ہوتا ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اسماء بہت ہیں عرب میں اسماء کنیتوں اور القاب کے تعدد کا کچھ دستور بھی تھا اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو پہلے گذر چکے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی ذات اور ان کے افعال و اقوال خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، عمداً ہوں یا بھول کر سب حقائق و اسرار کا ایک مجموعہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے اسماء بھی صرف تعیینِ شخصیت کے لئے نہیں بلکہ وہ بھی اپنی جگہ ایک گنجینۂ معارف ہوتے ہیں۔ دراصل یہ اسماء ان تمام اوصاف و مبادی کے ترجمان ہوتے ہیں۔ جو دستِ قدرت نے ازل سے ان میں ودیعت رکھے ہیں اگر ان کو رحیم کہا جاتا ہے تو اس لئے کہ وہ درحقیقت پیکرِ رحمت ہوتے ہیں اگر ان کو ماحی کہا جاتا ہے تو اس لئے کہ وہ حقیقۃً آثارِ کفر کو مضمحل و کمزور بنا کر فنا کے قریب کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کو عاقب کہا جاتا ہے تو اس لئے کہ وہ درحقیقت آخر میں آنے والا ہوتا ہے۔ غرض جتنی پُر از حقیقت و اسرار اُن کی ذات ہوتی ہے اسی قدر حقیقت سے لبریز ان کے اسماء ہوتے ہیں اس کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء مبارکہ کو آپ صرف ناموں کا ایک ڈھیر نہ سمجھیں اور نہ ایسا بے حقیقت تصور کریں جیسا کہ ہر ماں صرف محبت کیں اپنے بیٹے کا خوبصورت سے خوبصورت نام رکھ لیتی ہے خواہ اس نام کا اس میں کوئی اثر نہ ہو۔ وہ سیاہ فام بچے کو چاند کہکر پکارتی ہے اور غبی سے غبی لڑکے کا نام ذکی تجویز کر دیتی ہے مگر یہ سب کچھ بے حقیقت ہوتا ہے۔ کہیں عَلَم کی اصل وضع اگر تعریفِ شخصیت کے لئے نہ ہوتی تو کذب اور جھوٹ بھی ہو جاتا آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء کو اس نظر سے نہ دیکھیں بلکہ ان کو کمالاتِ محمدؐ کی رنگین چلمنیں سمجھیں، جن میں چھن چھن کر آپ کے کمالات نظر آتے رہتے ہیں۔

(۱۹۱) کفار جلن کے مارے آپ کا اسم مبارک بھی زبان پر نہ لا سکتے تھے۔ قدرت نے آپ کا اسم مبارک بھی ایسا خوبصورت رکھا تھا کہ اس کا زبان پر لانا آپ کی بے شمار تعریفوں کے قائم مقام ہو جاتا تھا اس لئے محمدؐ کے بجائے وہ آپ کو مذمم کہا کرتے (یعنی مذمت کیا گیا) اور جب اپنے دل کے پھپولے پھوڑنا چاہتے تو "مذمم" نام لیکر بُرا بھلا کہتے اس میں خدا کی یہ عجیب حکمت تھی کہ اگر کفار آپ کا اصل نام لیتے تو صدہا تعریفوں سے بڑھ کر ہوتا۔ اور اگر مذمم کہتے تو وہ یوں خوش ہوتے کہ وہ آپ کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں اور قدرت یوں ہنستی کہ ان کی تمام بیہودہ گوئیوں کی بوچھار بجائے آپ کے ایک فرضی شخص پر جا پڑتی۔ (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

مُذَمَّمًا وَاَنَا مُحَمَّدٌ (بخاری)

وہ مذمم کو بُرا بھلا کہتے ہیں، مذمم پر لعنتیں برساتے ہیں اور میں تو محمد ہوں۔ (بخاری)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم آپ کے ان دو ناموں کی قدرے مزید تشریح کر دیں جو سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

احمد و محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بے نظیر تھی، آپ کے یہ اسماء بھی بے مثل ہیں۔ آپ سے پہلے کسی کے ذہن میں ان اسماء کا خطور بھی نہ ہوا تھا حتی کہ جب آپ کی ولادت کا زمانہ نزدیک آگیا کاہنوں، منجموں اور اہل کتاب نے نام لے لیکر آپ کی آمد کی بشارتیں دیں تو لوگوں نے اس نبی منتظر کی طمع میں اپنی اولاد کا نام محمد و احمد رکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے جن کے نام محمد و احمد رکھے گئے تھے ان کی کل تعداد چھ تک ہے ساتواں کوئی شخص ثابت نہیں ہوتا۔ سہیلی صرف تین ہی بتلاتے ہیں۔ (۱) محمد بن سفیان بن مجاشع۔ (۲) محمد بن احیحہ بن الجلاح۔ (۳) محمد بن عمران بن ربیعہ۔ سہیلی سے پہلے ابو عبد اللہ بن خالویہ کا خیال بھی یہی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ آٹھویں صدی میں جب پھر اس کے درپے ہوئے تو انہوں نے ان کی تعداد بیس تک پہنچا دی اور تکرار و اوہام حذف کرنے کے بعد منقح تعداد پندرہ قرار دی جس میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن عدی بن ربیعہ ہیں۔ ان کا واقعہ بغوی، ابن سعد، ابن شاہین اور ابن السکن وغیرہم نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

"کہ خلیفہ بن عبد اللہ نے محمد بن عدی سے پوچھا۔ تمہارے والد نے تمہارا نام زمانۂ جاہلیت میں محمد کیسے رکھ دیا انہوں نے جواب دیا اس کے متعلق جیسا تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسا ہی میں نے اپنے والد سے پوچھا تھا انہوں نے فرمایا تھا کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے تین اور شخصوں کے ہمراہ ابن جفنہ غسانی کی ملاقات کے لئے ایک مرتبہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسے چشمہ پر جا کر اترے جو گرجا کے قریب تھا۔ گرجا کا منتظم ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں تم دوڑ کر ان کو قبول کر لینا، ہم نے کہا ان کا نام؟ اس نے کہا ان کا نام محمدؐ۔ جب اس سفر سے ہم واپس ہوئے تو اتفاقاً ہم سب کے یہاں لڑکے پیدا ہوئے اور اس لئے ہم سب نے اپنے اپنے لڑکوں کا نام محمد رکھ دیا"

اس کے بعد حافظ ابن حجرؒ نے اور اشخاص کے نام بھی بہ تفصیل تحریر کئے ہیں دیکھو فتح الباری باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ حافظ سہیلیؒ فرماتے ہیں کہ تورات میں آپ کا جو اسم مبارک مذکور ہے وہ احمد ہے۔ حافظ ابن قیم اس رائے سے متفق نہیں وہ اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ تورات میں آپ کی آمد کی پیشگوئی اسم محمد کے ساتھ بھی صاف موجود ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن قیم اسم "محمد" کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں۔ محمود بھی اسم مفعول کا صیغہ ہے مگر جو مبالغہ باب تفعیل میں ہوتا ہے وہ ثلاثی مجرد میں نہیں ہوتا اس لئے محمد، محمود سے زیادہ بلیغ ہے۔ محمد اس کو کہتے ہیں جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جائے اسی لئے تورات میں آپ کا نام محمد ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آپ کے اوصاف حمیدہ، آپ کی امت اور آپ کے دین کے فضائل و کمالات کا اتنی کثرت سے اس میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسے اولوالعزم رسول کو بھی آپ کی امت میں ہونے کی آرزو ہونے لگی۔

احمد:۔ یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں "احمد الحامدین لربہ" یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا۔ دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں "احق الناس واولاھم بان یحمد" تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور ثنا کا مستحق۔ اس بنا پر محمد و احمد میں فرق یہ رہے گا کہ محمد وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصافِ جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جائے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جائے پس محمد بلحاظ کمیت ہے اور احمد بلحاظ کیفیت۔ دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنے خلق و خصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپ کی ہو۔ اس تحقیق کے بعد ان دونوں مفہوموں کے لحاظ سے سطح عالم پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسماء جتنی حقیقت اور جتنی صداقت کے ساتھ آپ کی ذاتِ مبارک پر چسپاں ہیں اتنے کسی اور پر نہیں۔ اگر یہاں اسم تفضیل کو اسم مفعول کے معنی میں لیجئے تو خالق سے مخلوق تک انبیاء علیہم السلام سے لیکر جن و ملک تک حیوانات سے لیکر جمادات تک غرض ہر ذی روح اور غیر ذی روح سب ہی نے آپ کی تعریفیں کی ہیں اور آج بھی چالیس کروڑ انسانوں کی زبانیں دن میں نہ معلوم کتنی بار آپ کی تعریف کے لئے متحرک رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ کفار میں بھی ایک معقول طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ آپ کا دین تسلیم نہیں کرتا مگر آپ کی دیانت و امانت، عدل و انصاف، صداقت و راستبازی، ہوش و خرد کا ثنا خواں ہے اس لئے اگر اپنے خیال میں آپ ذرا علیحدہ ہو کر ازل سے ابد تک کی دنیا کی طرف کان لگائیں تو جس کی سب سے زیادہ اور سب سے بہتر تعریف آپ کے کان سنیں گے وہ مبارک ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہوگی ؎

ندانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد کہ مرغ ہر چمنے گفت گوئے او دارد

اس لئے محمد یا احمد (بمعنی اسم مفعول) نام کی مستحق جتنی کہ آپ کی ذات ہو سکتی ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اور اگر احمد کو اسم فاعل کے معنی میں لیجئے تو بھی اس اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپ ہی کی ذات پاک ہے کیونکہ جس قدر خدا کی تعریف آپ نے کی ہے اتنی کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح اپنی امت کو بھی موقعہ بموقعہ خدا کی اتنی حمد سکھائی کہ کتب مقدسہ میں اس امت کا لقب ہی حمادون پڑ گیا یعنی خدا کی بہت تعریف کرنے والی امت۔ صحیحین میں ہے کہ محشر میں جب شفاعت کے لئے آپ تشریف لے جائیں گے تو آپ پر خدا کی حمد و ثنا کا دروازہ کھولا جائے گا جو اس سے پیشتر کسی پر نہیں کھولا گیا تھا۔ پس سب انبیاء تو حماد ہیں اور ان حمادون میں آپ احمد ہیں۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ پہلے آپ احمد تھے پھر محمد ہوئے کیونکہ سب سے پہلے آپ نے خدا کی تعریف کی پھر آپ کے بعد مخلوق نے آپ کی تعریف کی۔ اسی طرح محشر میں سب سے پہلے آپ ہی خدا کی حمد کریں گے۔ جب آپ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا تو پھر اہلِ محشر آپ کی حمد کریں گے اس لئے آپ پہلے احمد ہیں اور بعد میں محمد۔ بلحاظ وجود بھی پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد۔ اسی وجہ سے کتب سابقہ میں آپ کی بشارت اسم احمد سے مذکور ہے اور جب عالم وجود میں تشریف لے آئے تو محمد کے نام سے پکارے گئے۔ (دیکھو فتح الباری) ؎۱

؎ حافظ سہیلی لکھتے ہیں کہ محمد کے وزن میں ہمیشہ تکرار کے معنی ملحوظ رہتے ہیں اس لئے محمد اس کو کہا جائے گا جس کی بار بار تعریف کی جائے اور احمد وہ ہے جو سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دونوں اسماء واقعہ کے مطابق ہیں یعنی آپ احمد بھی ہیں اور محمد بھی لیکن پہلے آپ احمد ہیں پھر محمد ہیں بلکہ احمد ہونے کی وجہ سے ہی آپ محمد ہوئے آپ نے پہلے خدا کی تعریف کی اس لئے آپ احمد ہوئے۔ نبوت سے سرفرازی کے بعد پھر مخلوق نے آپ کی تعریف کی اس لئے بعد میں محمد ہو گئے۔ محشر میں بھی پہلے آپ خدا کی تعریف کریں گے اس لئے احمد پہلے ہوں گے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

خلاصہ یہ کہ احمد بمعنی محمد ہو یا بمعنی احمد الحامدین یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حمد کو ہر پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے اسی بنا پر سورۂ الحمد خاصکر آپ کو ہی مرحمت ہوئی۔ آپ کی ہی امت کا لقب حمادون ہوا اور محشر میں لواء الحمد (حمد کا جھنڈا) بھی آپ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا اور آپ ہی کے مخصوص مقام کا نام مقام محمود ہے۔ آپ کی شریعت میں بھی کھانے کے بعد پینے کے بعد، دعا کے بعد، سفر سے واپسی کے بعد غرض بہت سے مختلف مواضع پر خدا کی حمد سکھائی گئی۔ پھر یہ مختلف اور متنوع تعریفیں جب ہر زمانہ میں بے شمار انسانوں کی زبانوں سے ہوتی ہیں وہ درحقیقت آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ان تمام تعریفوں کو بجا طور پر آپ کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اب سوچو کہ جتنی خدا کی تعریف فضاءِ عالم میں آپ کے ذریعہ سے گونجی کیا کبھی کسی اور کے ذریعہ سے گونجی ہے۔ اور اسی کے ساتھ جتنی کثرت کے ساتھ خدا کی غیر متناہی مخلوق نے آپ کی تعریفیں کیں اتنی کسی اور شخصیت کی کی ہیں۔ پس ہر اعتبار سے حمد کی جتنی خصوصیت آپ کی ذات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اتنی کسی اور ذات کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس لئے احمد و محمد نام پانے کے لئے بھی آپ ہی کی ذات منتخب ہونی چاہئے۔ اسی لئے آپ سے پہلے بھی جس نے یہ نام رکھا، آپ کی اتباع میں رکھا اور بعد میں بھی جس نے اس نام کو اختیار کیا آپ ہی کے اتباع میں کیا۔

اللهم صل وسلم وبارك عليه

شیخ اکبرؒ یہاں ایک اور عجیب نکتہ لکھ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے جب ہم کھا پی کر فارغ ہو لیتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ جب سفر ختم کر کے گھر واپس آتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اسی طرح جب دنیا کا طویل و عریض سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو خدا کی حمد کریں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ (دیکھو روح البیان ج ۱)

اس دستور کے مطابق مناسب ہے کہ جب سلسلۂ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں خدا کی حمد ہو۔ اس لئے جو نبی سب سے آخر میں آئے ان کا نام محمد رکھا گیا۔ بیشک جو ذات پاک کہ حسن و خوبی کی تمام رعنائیوں اور زیبائشوں کا مجموعہ ہو اس کے اسماء بھی اسمائی حسن و خوبی کا مجموعہ ہونے چاہئیں۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) پھر شفاعت کے بعد مخلوق آپ کی تعریف کرے گی۔ اس لئے بعد میں محمد ہوں گے۔ غرض ازل سے ابد تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ شانِ احمدی، شانِ محمدی پر مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب آپ کے نام کی بشارت سنائی تو اسم احمدی کے ساتھ سنائی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب امت محمدیہ کے کمالات کا ذکر آیا تو انھوں نے بھی یہی فرمایا اللهم اجعلني من امة احمد۔ اے اللہ تو مجھے امت احمدؐ میں بنادے۔ (اس بیان سے اس نکتہ بھی نکل آیا کہ جب آپ کا اسم مبارک محمد تھا تو پھر کتب سابقہ میں آپ کی بشارت میں اسم احمد کیوں ذکر کیا گیا)۔

یہ بات یاد رہنی چاہئے کہ حافظ ابن قیمؒ کو حافظ سہیلیؒ کے اس بیان سے سخت اختلاف ہے وہ اس پر اصرار کر رہے ہیں کہ تورات میں آپ کا اسم مبارک محمد بھی موجود ہے۔ (دیکھو زاد المعاد) شروع بیان میں یہ بحث کی گئی ہے کہ آپ سے پیشتر عرب میں یہ اسماء معہود نہ تھے اب ان تمام تفصیلات سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حکمتِ الٰہیہ نے ان دونوں ناموں کو آپ ہی کی ذات کے ساتھ کیوں مخصوص کر دیا تھا۔

اسلام میں رسول کا تصور

اسلام میں خدا کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب سے جداگانہ اور بالاتر تصور ہے۔ یہاں انسان کامل کی آخری سرحد اور لاہوت و جبروت کے ابتدائی تصور میں کوئی نقطہ مشترک نہیں نکلتا۔ ایک انسان اپنی فطری اور وہبی استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ تصور کے قابل بھی نہیں ہو سکتا اسلام میں اللہ تعالیٰ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول و اتحاد، ولادت و قرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنی سے اس کو احد و صمد کہا جاتا ہے ؎

دور بینانِ بارگاہِ الست　　　بیش ازیں پے نبردہ اند کہ ہست

رسول و اوتار و بروز — اس لئے اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ ہیکلِ انسانی میں جلوہ نما ہو رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے برہمہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق، ناممکن اور محال ہیں۔ عام حیوانات کو دیکھئے قدرت نے ان میں بھی ہر ہر نوع کی جدا جدا خصوصیات اور صورتیں بنائی ہیں اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خطِ فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع اپنے ان ہی قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے اس عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ، كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ۔	نہ سورج چاند کو پکڑ سکتا ہے اور نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے ہر چیز چکر میں پڑی گردش کھا رہی ہے۔

جب مخلوقات کے دائرہ کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرہ سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے۔ سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے فلسفۂ ارتقاء (Evolution) تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی مخلوقات کے کسی کڑی کا عالم قدس سے کوئی اتصال ثابت نہیں ہوتا اس لئے رسول کا تصور اسلام میں بلا کسی ادنیٰ شائبۂ تنقیص کے یہ ہے کہ وہ ایک انسان کامل ہوتا ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتبِ قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتا ہے۔

انسانیت رسول کا ایک کمال ہے — رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے۔ اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اور اس لئے اس کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے۔ جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی کرنا بھی نہیں جانتا۔ اور جو فطرتِ انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں کا اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے جا بجا بعثت

کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ۔ یہاں امتنان واحسان کے موقع میں منجملہ اور باتوں کے تین امور کو بالخصوص نمایاں کیا گیا ہے بعثت رسول پھر اس انعام کے لئے سرزمین عرب کا انتخاب اور سب سے بڑھ کر اس رسول کا انسان ہونا۔ حضرت خلیلؑ نے جب بنی اسماعیل میں ایک نبی کے لئے دعا فرمائی تو انھوں نے بھی اس اہم نقطہ کو فراموش نہیں کیا اور اپنی دعا میں فرمایا۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ	اے ہمارے رب ان میں رسول بھیج جو انھیں میں سے ہو

پھر جب اس دعاء مستجاب کے ظہور کا وقت آیا تو دعاء خلیل میں لفظ "منہم" کی استجابت کو مزید تاکید کے ساتھ لفظ من انفسہم سے ذکر کیا گیا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ یعنی اس رسول کو انسانوں میں تو بھیجا ہی تھا مگر ان میں بھی جس سے انھیں قریب سے قریب تر علاقہ ہو سکتا تھا ان میں بھیجا ہے انسانوں میں عرب، عربوں میں قریشی اور قریش میں ہاشمی بنایا مگر ان چند در چند خصوصیات کے باوجود پھر وہ ایک انسان ہی رہا۔ یہی وہ عقیدہ تھا جو ابتدا میں اولاد آدم کو بنیادی طور پر بتا دیا گیا تھا۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ	اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس تم ہی میں کے رسول آئیں جو
يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى	تمہارے سامنے ہماری آیات پڑھ پڑھ کر سنائیں تو جو تقوی
وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	کی راہ اختیار کرے اور نیک رہے تو ان پر نہ کوئی خوف و
يَحْزَنُوْنَ۔	ہراس اور نہ کوئی غم۔

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا میں جن باتوں کی اولاد آدمؑ کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی اُن میں ایک بعثت رسول، دوم رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی عقیدہ کے مطابق دنیا میں خدا کے بہت سے رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصب نبوت کے لئے دو انسان منتخب ہوئے تھے پھر افراد و اشخاص کی بجائے خاندانوں کا انتخاب کیا گیا اس کے بعد جب خاندانوں نے انحراف اور کفران نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس درمیان میں دنیا کی مقررہ عمر آخر ہونے لگی ادھر رسولوں کی مقررہ تعداد بھی پوری ہو گئی اس۔ آخری رسول کو بھیجکر اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور بساط عالم لپیٹنے کا اعلان کر دیا گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ	اللہ تعالیٰ نے پسند کیا آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور خاندان ابراہیم
اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ	اور خاندان عمران کو تمام جہان پر جو ایک دوسرے کی
ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ	اولاد میں۔

اس تمام سلسلہ میں جو حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے کوئی رسول ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہوتا ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ نصاریٰ کی نظروں میں کچھ مشتبہ تھا اسی کو ذریۃ بعضہا من بعض کہکر صاف کر دیا گیا ہے یعنی جب وہ بھی انسانوں ہی کی اولاد تھے تو یقیناً ان کو بھی انسان ہونا چاہئے۔

علاوہ اس کے کہ رسول اگر انسان نہ ہوں تو وہ انسانوں کی پوری اصلاح نہیں کر سکتے۔ نسل انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے۔ اس لئے خود رسول اور نوع انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسول انسانوں میں سے ایک انسان ہوتا۔

لفظ رسول کی تشریح رسول کا صحیح مقام سمجھنے کے لئے خود لفظ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں ہے

اس لفظ سے محبت وعظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہوجاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرت انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان درمیان خط فاصل ہوسکتی ہیں۔ اسی لئے خدا تعالیٰ کے سب رسولوں نے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعہ پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن کریم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے۔

(۱) محمد رسول اللہ۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے پیغمبر ہیں۔

(۲) وما محمد الا رسول۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبر ہونے کے سوا الوہیت کا شائبہ تک نہیں رکھتے۔

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لئے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔ صوفیاء نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کئے ہیں۔ وجود کا نقطۂ اول، حقیقۃ الحقائق برزخیۃ الکبریٰ۔ مگر انصاف یہ ہے کہ ان سب کلمات کے نکراؤ سے کچھ غلط فہمیاں تو پیدا ہوگئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر اتنا صاف نہ ہوسکا جتنا کہ لفظ رسول سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا اس کے لوازم سب کے ذہن نشین تھے، اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھا اس کی شخصیت و احترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش و کرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اس لئے جب کوئی رسول دنیا میں آتا تو یہی کہدیتا کہ میں احکم الحاکمین، ملک الملوک کا ایسا ہی ایک رسول ہوں جیسا کہ دنیا کے بادشاہوں کے رسول ہوا کرتے ہیں۔ بس اسی ایک لفظ سے سامعین کے دلوں میں ساری عظمتیں دوڑنے لگتیں، محبت و توقیر، اطاعت و حکمبرداری کے وہ تمام جذبات امڈنے لگتے جو ایسے رسول کے لئے امڈنا چاہئیں۔ اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان فاصل رہنی چاہئیں۔ اس لئے محبت و اطاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید بھی کفر و شرک کی گرد سے کبھی بے آب نہ ہوتا۔

رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے

درحقیقت یہ مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا کہ ایک طرف اسلام کی تانگ توحید خدا ہی کی اطاعت اور اسی کی محبت کا مطالبہ کرتی ہے اور دوسری طرف وہ اپنے سوا رسول کی محبت و اطاعت کا بھی حکم دیتی ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبت رسالت کے بعد رسول کی ہستی درمیان میں صرف ایک واسطہ ہوتی ہے۔ پھر اس کی اطاعت و محبت خدا ہی کی محبت و اطاعت ہو جاتی ہے۔ اسی لئے فرمایا

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۔ جو رسول کا کہنا مانے اس نے خدا ہی کا کہنا مانا

یعنی اصل حکمبرداری تو خدا کی چاہئے۔ ظاہری سطح میں رسول کی اطاعت گو اس کے خلاف نظر آئے مگر حقیقت میں وہ خدا ہی کی حکمبرداری ہوتی ہے بلکہ اس کی اطاعت و محبت کے بغیر، خدا کی محبت و اطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں اور اس طرح یہ اطاعت و محبت کتنی ہی پھیلتی چلی جائے مگر اس کا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

رسول اور وکیل

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوگیا کہ رسول خدا نہیں، اس کا اوتار و بروز نہیں، اور اس کا بیٹا بھی نہیں۔ اب یہ سنئے کہ وہ اس کا وکیل و مختار بھی نہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت سرانجام دینے کے لئے دو لفظ ہیں (۱) رسول (۲) وکیل۔ ان دونوں کا تصرف درحاصل دوسرے کے لئے ہوتا ہے اپنے لئے نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے۔ وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کرسکتا ہے اسی لئے خصومت و جوابدہی کا بھی اس کو حق حاصل ہوتا ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچانے

کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔

مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل و مختار بنا دے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرے بلکہ چاہے تو اس کے قوانین میں ترمیم و تنسیخ بھی کروا لے مگر ایک پیغامبر کو اس کے سوا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعہ بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے۔ اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت گو بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے۔ قرآن کریم نے بہت جگہ اس کا اعلان کیا ہے کہ جنھیں ہم بھیجیں گے وہ صرف ہمارے رسول ہوں گے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خدا خود ہی سب کا وکیل بن گیا ہے تو اب اس کا وکیل کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔ پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے متصور ہو سکتی ہے۔

(۱) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ۔	اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی سب کا وکیل و کارساز ہے۔
(۲) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا۔	آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا کی ملکیت ہے اور سب کے لئے خدا کی ذات کارساز کافی ہے۔
(۳) اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا۔	میرے سوا کسی اور کو اپنا وکیل و کارساز مت بناؤ۔
(۴) قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ۔	آپ کہدیجئے کہ میں تم پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا رسول مقرر ہوا ہوں
(۵) مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ۔	جو راہ یاب ہوا اپنے فائدے کے لئے اور جس نے گمراہی اختیار کی اپنا ہی نقصان کیا اور میں تو تم پر وکیل و مختار مقرر نہیں ہوا کہ جوابدہی میرے سر ہو۔
(۶) بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ۔	جو آپ کے پروردگار کی طرف سے اتارا جاتا ہے وہ آپ پہنچا دیجئے
(۷) اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ	آپ کا ذمہ صرف پہنچا دینا ہے۔
(۸) اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ	میں اپنے پروردگار کے پیغامات تمہارے پاس پہنچائے دیتا ہوں
(۹) قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔	آپ کہدیجئے کہ یہ میری طاقت نہیں ہے کہ میں قرآن کریم کو اپنی طرف سے بدل ڈالوں، میرے پاس تو جو حکم آئے اس کا تابعدار رہوں۔
(یونس - ۲)	

ان آیات سے ظاہر ہے کہ رسول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکام الٰہیہ پہنچا دے اور بس۔ شریعت کے ایک شوشہ اور ایک نقطہ بدلنے کا حق اس کو نہیں کسی کی ہدایت و گمراہی کا بار اس پر نہیں اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جوابدہ ہے۔ جہاں تک کارخانۂ عالم کی ذمہ داری و کارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت و وکالت خدا تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے اور رسولوں کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے انہی اور رسولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی حد تک ہے وکالت کی نہیں ہے تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ لے کہ ہدایت و ضلالت کی جوابدہی اُسے خود براہِ راست کرنی ہے جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جا سکتا۔

وکالت تو بہت دور کی بات ہے اگر کہیں ہر شخص سے خدا تعالیٰ کا باتیں کرنا خلاف مصلحت نہ ہوتا تو شاید اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان رسالت کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔ مگر جس طرح دنیا میں بادشاہ اپنی رعایا سے

بلاواسطہ کلام نہیں کیا کرتے۔ اسی طرح خدا تعالیٰ نے بھی اپنی ہر مخلوق سے براہِ راست کلام کرنا پسند نہیں فرمایا، بلکہ اس کے لئے کچھ ہستیاں منتخب کرلی ہیں جو اس کی نظروں میں اس کے لئے اہل بنائی گئی تھیں پھر ان میں بھی یہ حوصلہ نہیں ہے کہ بے حجابانہ وہ جب چاہیں اس سے باتیں کرلیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنے ہمکلامی کی صورتیں مقرر کردی ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ۔ (الشوریٰ۔ ع ۶)

کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے باتیں کرسکے مگر اشارہ سے یا پردے کے پیچھے سے یا کوئی فرشتہ بھیجے، پھر وہ خدا کے حکم سے جو اس کو منظور ہو اس کا پیغام پہنچادے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران ع ۹)

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو براہِ راست غیب کی خبر دیا کرے لیکن اس کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہے چھانٹ لیتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔

وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنی غیب کی باتیں کسی پر ظاہر نہیں کرتا مگر ہاں جس رسول کو چاہے پسند کرلیتا ہے اور انہیں جو بات بتانا چاہے بتادیتا ہے۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دستور نہیں رکھا کہ عام لوگوں کو بلاواسطہ غیب کی یقینی خبریں دیا کرے بلکہ اس کام کے لئے وہ رسولوں کا انتخاب کرتا ہے اور ان کے ذریعہ سے پھر تمام مخلوق سے ہمکلام ہوتا ہے اور یہ دستور اس لئے رکھا ہے کہ عام بشر تو درکنار رسول بھی اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ خدا تعالیٰ سے جس طرح چاہیں بالمشافہ کلام کرسکیں۔ اس لئے ان سے کلام کرنے کی بھی چند صورتیں اختیار کی گئی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ متکلم خود ذات پاک ہو مگر سامنے نہ ہو بلکہ پس پردہ ہو۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر کلام۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کرے۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ نبی خود بشریت سے ملکیت کے قریب آجائے دوم یہ کہ ملک یعنی فرشتہ بشریت کے قریب آجائے۔ ان دونوں صورتوں میں رسول سے بالواسطہ کلام ہوتا ہے۔ ان سب صورتوں میں چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات پاک رسول کے سامنے نہیں ہوتی اس لئے کلام الٰہی کی شوکت و طاقت رسول کے لئے قابلِ برداشت ہوجاتی ہے اگر کہیں آمنے سامنے آکر کلام ہو تو بشریت کی ضعیف تعمیر منہدم ہوجائے۔

رسول اور مصلح ریفارمر

جس طرح کہ رسول وکیل و مختار نہیں ہوتا، اسی طرح وہ صرف ایک مصلح و ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ رسول اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے پھر اپنی فطری صلاحیت و دلسوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے جب اس کی فہم و فراست، ہمدردی و نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح و ریفارمر کا رتبہ حاصل کرلیتا ہے مگر رسولوں کی تربیت صفت اجتبار و اصطفار کے ماتحت ہوتی ہے ان کی ہر نشست و برخاست ہر قول و فعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے اور اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو صفت عصمت حاصل ہوجاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک مناسب عمر پر وہ خود انہیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے۔ ریفارمر عصمت کا مدعی نہیں ہوتا غلطی کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے۔

رسول کی دو زندگیاں رسالت سے پہلی اور رسالت کے بعد اس قدر ممتاز ہوتی ہیں گویا بلحاظ ذمہ داری وہ دو انسان ہوتے ہیں۔ رسالت سے پہلے وہ عام انسانوں کی صف میں شامل ہوتا ہے، نہ کوئی دعویٰ کرتا ہے نہ عام انسانوں کے عقائد و اعمال سے کوئی ذمہ دارانہ سروکار رکھتا ہے اس کی دعوت میں کوئی تدریج کوئی تمہید نہیں ہوتی وہ خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ کل اُسے کیا کہنا ہے وہ بالکل خاموش خاموش نظر آتا ہے اور جونہی کہ منصبِ رسالت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس طرح بولتا ہے کہ کسی کا خوف و خطر اس کے آس پاس نہیں آتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے احوال پر نظر کیجئے یا تو وہ فرعون کے خوف سے اپنا وطن چھوڑ کر بھاگ رہے تھے یا رسالت کی دوسری ہی ساعت میں پھر اسی کی طرف واپس جاتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور وہ بھی کس کام کے لئے؟ اُس سرکش کو خدا کے عذاب سے ڈرانے کے لئے جس کے عذاب سے ڈر کر کل خود بھاگ رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے یا تو وہ عزلت نشینی تھی کہ غار حرا میں چالیس چالیس دن تک اس کی خبر بھی نہ رہتی تھی کہ دنیا کدھر جا رہی ہے یا اب کوئی بازار نہیں، کوئی مجمع نہیں، کوئی محفل نہیں جہاں دنیا کی اصلاح و خبر گیری کے لئے آپ ہیچ نہ رہے ہوں خلاصہ یہ کہ رسول کی زندگی کسب و اکتساب، تکلف و تصنع کے تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے، وہ از خود نہ رسول بنتے ہیں نہ بن سکتے ہیں اور نہ خود قوم کسی کو رسول بنا سکتی ہے بلکہ یہ دستِ قدرت کا براہِ راست انتخاب ہوتا ہے جسے چاہے اس منصب کے لئے انتخاب کر لیتا ہے۔

رسول ریاضت سے نہیں بنتے وہ پہلے سے منتخب شدہ ہوتے ہیں

رسالت ایک قسم کی سفارت ہے، ہر سفیر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے مگر ہر قابل انسان کے لئے سفیر ہو جانا ضروری نہیں۔ یہ بادشاہ کی اپنی مصلحت اور صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔ خدا کی زمین پر دنیا کے جس قدر رسول آئے آپ سب کی سیرت بالتفصیل مطالعہ کر جائیے ان کی زندگیوں کا ورق ورق الٹ جائیے مگر قرآن و حدیث سے کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کسی کو منصبِ رسالت کسی رسول کی اتباع و اطاعت کے صلہ میں ملا ہو۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی سیرت سے آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ بوقت ضرورت براہِ راست ان کو اس منصب سے نواز دیا جاتا ہے۔ بلکہ رسول کا خود مفہوم بھی یہ بتاتا ہے کہ یہ گروہ عام انسانوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان پیغامبری کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ ان کے واسطے سے لوگ شریعت پر عمل اور خدا کی عبادت کرنا سیکھیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں۔ چنانچہ جب وہ آتے ہیں تو گمراہوں میں راہنما جاہلوں میں عالم، مفسدوں میں مصلح، اور کافروں میں اول مسلم بن کر آتے ہیں۔ رسالت سے پہلے بھی ان کا دامن شرک و کفر کی تمام نجاستوں سے پاک ہوتا ہے اور جو حرکات ادیانِ سماویہ میں ناقابلِ برداشت ہیں وہ نبوت و رسالت سے پہلے بھی اُن سے دور ہی دور رہتے ہیں اور اپنی اس بے لوث اور پاک و صاف زندگی کی وجہ سے قوم میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی ریاضت و عبادت اس لئے نہیں ہوتی کہ انہیں رسول بننا ہے بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ ان کی یہ پاک و صاف زندگی قوم کی نظروں میں نمایاں کی جائے اور اس لئے نمایاں کی جائے کہ جب وہ رسالت کا دعویٰ کریں تو خود ان کی ہی زندگی ان کی تصدیق کا بڑا سامان ہو جائے۔

اگر بالفرض رسالت کسب و اکتساب کا ثمرہ ہوتی تو رسولوں کی بعثت یا فترت کا مدار عبادت کی سرگرمی یا عبادت میں سرد مہری پر ہوتا، حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی جتنی عبادت زیادہ ہوئی اسی قدر رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی اور جتنی گمراہی و ضلالت نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہو گیا۔ پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا اُس کی زیرِ قیادت عبادت کر کے ایک بھی رسول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے

ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق بھی نہ تھا یا تعلق تھا تو اور نسخ کا تعلق تھا اس لئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ رسول کسی عبادت و ریاضت سے نہیں بنتے بلکہ خود بنے بنائے آتے ہیں۔ قرآن کریم کے لفظ "یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ" میں بھی اسی کی طرف اشارہ نکلتا ہے۔ یعنی اے بنی آدم تم میں کوئی فرد عبادت کرکے خود رسول نہیں بنے گا بلکہ رسول تمہارے پاس اس طرح آئے گا جیسا کہ حکومت کی جانب سے کوئی حاکم مقرر ہوکر آیا کرتا ہے۔ ڈگریاں بڑی سے بڑی حاصل کی جاسکتی ہیں مگر حکومت کا کوئی عہدہ بلا انتخاب حکومت حاصل نہیں ہوتا ہاں لیاقت و استعداد کے بعد اس کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے کہ نظرِ حکومت اگر اسے انتخاب کرنا چاہے تو کرلے اسی طرح رسالت و نبوت کی کیفیت ہے یہ ایک منصب اور عہدہ ہے نہ کہ انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں کوئی کمال۔ ہاں اس منصب کے متعلق کچھ کمالات ہیں جو اس منصب پر موقوف ہیں۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہے لوکان بعدی نبی لکان عمر یعنی میری امت میں اگر بلحاظِ کمال دیکھا جائے تو عمرؓ میں رسالت کی صلاحیت موجود ہے مگر چونکہ منصبِ نبوۃ پر تقرر کے لئے اب کوئی جگہ باقی نہیں رہی اس لئے نبی نہیں ہیں۔ اسی طرح فرمایا۔

لوعاش ابراھیم لکان صدیقا نبیا۔

ابراہیم (فرزند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اگر جیتے تو صدیق نبی ہوتے۔

یعنی ان کا جوہرِ استعداد بھی نہایت بیش قیمت تھا انسانوں میں نبی بلکہ صدیق نبی بننے کے لائق تھے مگر یہاں ایک اور مانع بھی پیش آگیا تھا وہ یہ کہ ان کی عمر وفا نہ کر سکی۔ امت میں ان دو شخصیتوں کے متعلق تو خود زبانِ نبوت سے تصریح آگئی کہ بلحاظ لیاقت و کمال یہ دونوں منصب نبوۃ کے قابل تھے جن میں سے حضرت ابراہیمؑ کی تو عمر ہی نے وفا نہ کی حضرت عمرؓ کی عمر ہوئی تو تقرر نبوت کا زمانہ نہ رہا تھا ان کے علاوہ خدا تعالیٰ ہی کو معلوم کہ اس امت میں اور کتنے انسان ایسے گذر گئے ہوں گے جو بلحاظ نفسی کمالات انبیاء سے کتنے مشابہ ہوں گے مگر عالمِ تقدیر میں چونکہ دنیا ہی کا ختم کردینا مقرر ہوچکا تھا اس لئے کوئی اس منصب پر نوازا نہیں گیا اور دنیا کی تاریخ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے شور مچا مچا کر رسولوں کی آمد آمد پکار رہی تھی، اب یہ کہہ کر خاموش ہوگئی کہ دنیا کا آخری راہنما آچکا اب اس کے بعد کوئی رسول نہیں ہوگا۔ بہرحال تمام رسولوں کی تاریخ سے ہمیں یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی ریاضت و عبادت کے صلہ میں رسول نہیں بنتے بلکہ عین لاعلمی کی حالت میں اچانک خدا کی طرف سے منصب رسالت پر مامور ہوجاتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ ابھی حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کا کوئی ذکر فکر بھی نہیں تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر میرے بھائی میرے شریکِ کار ہوجائیں تو شاید خدماتِ نبوت کی ادائیگی میں میرے لئے سہولت رہے لیکن منصبِ نبوت چونکہ براہِ راست خدا تعالیٰ کے اصطفاء پر موقوف ہے اس لئے ان کو اسی ایک بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرنی پڑی۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَھْلِیْ ھٰرُوْنَ اَخِی اشْدُدْ بِہٖٓ اَزْرِیْ وَاَشْرِکْہُ فِیْٓ اَمْرِیْ

میرے بھائی کو میرے گھرانے سے میرا وزیر بنادے اور ان کے ذریعہ میری کمر مضبوط کر اور میرا انہیں شریک کار بنا۔

اگر نبوت اکتسابی ہوتی تو یہاں سفارش کے موقعہ پر ان کے ایسے اوصاف کا ذکر کرنا مناسب ہوتا جو نبوت کا سبب بن سکتے ہیں مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جن اسباب کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں۔

وَاَخِیْ ھٰرُوْنُ ھُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْہُ مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْٓ اِنِّیْٓ اَخَافُ

میرا بھائی مجھ سے زیادہ فصیح البیان ہے اسے میری مدد کے لئے میرے ساتھ کردے وہ میری تصدیق کرے گا

اَنْ یُّکَذِّبُوْنَ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ میری تکذیب نہ کریں۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس درخواست کو منظور کر لیا گیا اور ان کو بھی نبی بنا دیا گیا۔ سوچئے کہ فصاحت و بیان کو نبوت میں کیا دخل ہے۔ اس کے برخلاف جب کوہ طور جاتے ہوئے انہیں ایک خلیفہ کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہاں کوئی درخواست بارگاہ رب العزت میں پیش نہیں فرمائی اور براہ راست خود فرما دیا وَاخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ خلافت و نبوت میں کتنا فرق ہے۔ خلیفہ نبی خود بھی بنا سکتا ہے مگر نبی کسی کو نہیں بنا سکتا ہاں اس کے لئے دعا کر سکتا ہے۔ چونکہ حضرت علیؓ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی نسبت حاصل تھی، اس لئے گمان ہو سکتا تھا کہ جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے حق میں نبوت کی دعا کی اور قبول ہو گئی۔ اسی طرح اگر آپ بھی اُن کے لئے دعا فرمائیں تو قبول ہو جائے اس لئے حدیث ۱۵۷ میں آپ نے پڑھا کہ اس سے قبل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں یہ خیال گذرے اور آپ کے دستِ مبارک دعا کے لئے اٹھ جائیں آپ سے کہہ دیا گیا تم اپنے داماد علیؓ کے لئے جو دعا چاہو مانگ لو مگر ایک نبوت کی دعا مت کرنا کیونکہ عالم تقدیر میں یہ طے ہو چکا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جو بات یہاں طے ہو جاتی ہے وہ پلٹا نہیں کرتی۔
یہی صورت شب معراج میں پیش آئی جب تقدیر کو یہ منظور ہوا کہ اب آئندہ سلسلۂ تخفیف ختم کیا جائے اور پانچ نمازیں امت کے لئے ایک واجب العمل دستور ہو جائے تو پہلے ہی آپ سے کہہ دیا گیا مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ تاکہ بعد میں مایبدل القول کا آئین آپ کے استجابتِ دعا میں حائل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اصرار کے باوجود آپ پھر سفارش کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔
خلاصہ یہ کہ نبوت نہ پہلی امتوں میں کسب کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصبِ نبوت باقی تھا اس لئے دعا و سفارش کا موقعہ بھی تھا اب چونکہ منصبِ نبوت ہی نہیں رہا اس لئے نبوت کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی۔ ہاں اس کی بجائے خلافت باقی ہے اور وہ تا قیامت جاری رہے گی۔

پھر رسول جس طرح کہ خود بنتے نہیں اسی طرح خود بولتے بھی نہیں وہ خدا تعالیٰ کے ترجمان ہوتے ہیں جو ان کو حکم ہوتا ہے وہی بولتے ہیں اور اسی لئے ان کا ہر حکم واجب التعمیل مفترض الطاعۃ ہوتا ہے ہر امر میں ان کو حَکَم و فیصل بنانا ان کے ہر فیصلہ پر راضی ہو جانا اور اس طرح راضی ہو جانا کہ اس میں تنگ دلی بھی محسوس نہ ہو مومن کا اولین فرض ہوتا ہے۔ ریفارمر میں یہ خصوصیات نہیں ہوتیں۔ وہ اپنی قومی خدمات کے صلہ میں ریفارمر تسلیم کیا جاتا ہے اس کا حکم صرف اخلاقی حد تک واجب العمل ہوتا ہے اس کے ساتھ نزاع کا حق ہر وقت حاصل ہوتا ہے اس کو خدائی ترجمانی کا کوئی دعویٰ نہیں ہوتا۔ اس کا تعلق ہماری زندگی کے صرف ایک شعبہ کے ساتھ ہوتا ہے یعنی معاش جسمانی مبدأ و معاد سے اُسے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ رسول کا تعلق ہمارے ہر گوشۂ حیات سے ہوتا ہے۔ ریفارمر کا کوئی حکم مذہب نہیں کہلاتا۔ رسول کا ہر حکم مذہب کی بنیاد بن جاتا ہے۔ کسی قوم کا ریفارمر و مصلح بننے کے لئے اس کا ہم زبان ہونا شرط نہیں ہے۔ رسول کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس قوم کا رسول ہو اسی کا ہم زبان بھی ہو۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ رسول کا ہر علم قطعی ہوتا ہے۔ شک و تردد کا اس میں کوئی احتمال نہیں ہوتا۔ ریفارمر کی ہر ہدایت زیرِ امتحان رہ سکتی ہے اسی لئے رسول فلاح و کامیابی کا ضامن ہوتا ہے ریفارمر کامیابی کی ضمانت نہیں لے سکتا۔
رسول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ وحدتِ ملی کا ایک مستحکم مرکز ہوتا ہے اس لئے اس کی ذات

ایمان وکفر کا محور ہوتی ہے یعنی اس سے وابستگی ایمان اور اس سے علیحدگی کفر کے نام سے موسوم ہوتی ہے ہزاروں اختلافات رسول کی ذات سے وابستگی کے بعد وحدت واخوت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور بہت سی جمعیتیں رسول کے دامن سے علیحدہ ہو کر صفتِ وحدت سے خالی ہو جاتی ہیں۔ اسی لئے فرمایا۔ وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا۔ اور دوسری صورت کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل عرب کے اختلافات کا تصور کیجئے اور نقطۂ رسالت پر جمع ہونے کے بعد ان کی شانِ وحدت کو ملاحظہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ ہزاروں افراد یا تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے یا فردِ واحد کی طرح ایسے ایک جان ہو چکے تھے کہ مشرقی مسلمان کی تکلیف سے مغربی مسلمان کو وہی تکلیف محسوس ہوتی تھی جو ایک انسان میں ایک عضو کی تکلیف سے تمام اعضاء کو محسوس ہوتی ہے وہ ابھی ابھی یا تو اینٹوں کے ڈھیر کی طرح میدان میں بکھرے پڑے ہوئے تھے یا ایک ہی ساعت کے بعد ایک مستحکم تعمیر کی شکل میں منتظم و مرتب تھے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ سے مرتبط اور باعث استحکام تھی۔

عن ابی موسیٰ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضہ بعضا ثم شبک بین اصابعہ (متفق علیہ)	ابوموسیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے ایک دوسرے کو قوت پہنچاتا اور مضبوط رکھتا ہے اس کے بعد آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر اس کا نقشہ دکھایا۔ (متفق علیہ)
عن النعمان بن بشیر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المؤمنون کرجل واحد ان اشتکی عینہ اشتکی کلہ وان اشتکی رأسہ اشتکی کلہ (مسلم)	نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمام مسلمان شخص واحد کی طرح ہیں اگر اس کی آنکھ درد کرتی ہے تو تمام جسم بیمار پڑ جاتا ہے۔ اگر سر درد کرتا ہے تو تمام جسم بیمار پڑ جاتا ہے۔ (مسلم)

دنیا کی تمام وحدتیں اس حقیقی وحدت کے سامنے ہیچ ہیں۔ وحدتِ قومی، وحدتِ ملکی، وحدتِ وطنی، وحدتِ قبیلہ وحدتِ حسب ونسب، کے سوا اور جتنی وحدتیں پیدا ہو سکتی ہیں وہ سب اس کے سامنے لاشئے ہیں جب کبھی اس وحدتِ حقیقیہ کی دوسری وحدتوں سے ٹکر ہوئی تو دوسری تمام وحدتیں پاش پاش ہو کر مٹ گئیں اور صرف یہی ملت کی ایک مرکزی وحدت باقی رہ گئی۔ ریفارمر کی ذات بھی قوم کی شیرازہ بندی کا بڑا سبب ہے مگر جو وحدت ایک کامیاب سے کامیاب ریفارمر کے نام پر پیدا ہوتی ہے وہ اس وحدتِ حقیقیہ سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ یہ وحدت، نظامِ ملی اور حیوۃ بشری کے لئے بمنزلہ روح ہے اسی لئے جب یہ وحدت فنا ہونے لگتی ہے تو اس کو سرِ نو زندہ کرنے کے لئے خدا کے رسول آتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ رسالت کا دروازہ مسدود ہو چکا ہے اس لئے یہ کام خلافتِ راشدہ کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ شریعت میں خلافت اور امارت اور امامت درجہ بدرجہ اسی وحدت کے تحفظ کے لئے ہیں۔ اسی لئے جب خلافت سے یہ مقصد حاصل ہونا مفقود ہو جائے تو شریعت نے اس کا نام ملک عضوض رکھا ہے یہ اسی وحدت کی فنا کی طرف اشارہ تھا جو دراصل رسولوں کی ذات سے وابستہ ہوتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء	ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بنی اسرائیل کے سیاست کی نگہبانی انبیاء علیہم السلام

کلما ھلک نبی خلفہ نبی وانہ لا نبی بعدی وسیکون خلفاء فیکثرون الحدیث۔ (متفق علیہ)

فرمایا کرتے تھے جب ایک نبی فوت ہوجاتا اس کے قائمقام دوسرا آجاتا چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اس لئے اب عنانِ انتظام خلفا کے ہاتھ میں رہے گی اور وہ بہت ہونگے۔

خلاصہ یہ کہ رسول میں اوتار و بروز وابنیت کا کوئی تصور نہیں ہوتا اور محض ایک ریفارمر و مصلح کی حیثیت بھی نہیں ہوتی۔ نصاریٰ نے رسالت کو ابنیت کے عنوان سے سمجھنے کی کوشش کی وہ بھی غلط راہ پر نکل گئے۔ براہمہ اور جوگیوں نے اس کو اوتار کا علاقہ بنادیا وہ بھی عینیت یا حلول کے روگ میں پھنس گئے۔ نصاریٰ نے رسول کو خدا سے اتنا قریب سمجھا کہ پھر انہیں دوئی قائم رکھنا دشوار ہوگیا اور جدید روشنی میں اس کو خدا سے اتنا دور سمجھا گیا کہ اس کو صرف ایک ریفارمر کی حیثیت دی گئی۔ یہ دونوں راستے افراط و تفریط کے راستے ہیں اگر اس کی حیثیت رسول کے لفظ ہی سے قائم کی جاتی تو یہ مغالطے پیش نہ آتے اور واضح ہوجاتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اتنا بعید نہیں ہوتا جیسا کہ عام انسان اور اتنا قریب بھی نہیں ہوتا جتنا کہ اوتار و ابن۔ وہ بعید ہوکر اللہ تعالیٰ سے انتہائی قریب ہوتا ہے اور انتہا درجہ قرب کے باوجود پھر اسے وصد سے حلول و اتحاد کا کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اس کا نام قربِ ولایت نہیں یہ قربِ رسالت ہے یہ انسان کے لئے مدارجِ قرب کی وہ آخری منزل ہے جس کے بعد کوئی منزل نہیں اگر ان دونوں میں فرق سمجھ لیا جاتا تو ایک محب کی زبان سے جو کبھی اضطراب میں عاشقانہ کلمات نکل جاتے ہیں نہ نکلتے اور وہ اپنی تمام لن ترانیوں کی بجائے یہ کہکر خاموش ہوجاتا ؎

زلافِ حمد و نعت اولیٰ است برخاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن درودے می تواں گفتن

اسی لئے آسمانی مذاہب نے رسول کی اس درمیانی ہستی کے لئے جو جامع سے جامع لفظ اختیار کیا تھا وہ خود لفظِ رسول تھا اور اسی لئے اذانوں میں خطبوں میں نمازوں میں جس لفظ کا بار بار اعلان کیا جاتا ہے وہ یہی لفظِ رسول ہے۔ آج دنیا رسول کی معرفت کے لئے خود لفظِ رسول کو نا کافی سمجھتی ہے اور اپنی طفل تسلی کے لئے دوسرے عنوانات تراش تراش کر اپنے ذہن میں رسول کی حیثیت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یاد رکھو یہ کبھی نہیں ہوگا کبھی نہیں ہوگا۔ رسول کی معرفت تم کو لفظِ رسول سے زیادہ صحیح کسی اور لفظ سے حاصل نہیں ہوسکتی۔

ہمارے مضمون حجیت حدیث میں رسول کی حیثیت پر قرآن کی روشنی میں بھی کلام کیا گیا ہے مقدمہ دیکھا جائے۔

ایمان کی تعریف پر اجمالی نظر

کامل ایمان کی تعریف

شریعت میں ایمان واسلام صفتِ انقیاد واطاعت کی اس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد اوامرِ الٰہیہ اور منہیاتِ شرعیہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبرِ صادق پر وہ اعتماد حاصل ہوجائے کہ پھر دل کی تمام خوشحالی اور روح کا کامل سرور اس کی تصدیق میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبۂ وفاداری طلبِ دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ راہِ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت ہو اور ایک ادنیٰ نافرمانی وہ تلخ گھونٹ ہوجائے جو گلے سے آتارے نہ اترے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ (بقرہ)

(یہ کتاب) راہ دکھانے والی ہے (اللہ) سے ڈرنے والوں کو جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا۔

ایمان بالغیب ایمان کی سب سے بڑی صفت ہے

اس آیت میں ان ہی سرفروشوں کی اس سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے یعنی یہ وہ جماعت ہے جو محض جذبۂ انقیاد میں دیکھی اور اَن دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کرچکی ہے۔ آنکھ اگر دیکھتی اور تصدیق کرتی ہے، کان اگر سُنتے اور مان لیتے ہیں تو یہ ان کا فطری اقتضا ہونا چاہئے لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتیں کان اگر نہیں سُنتے پھر اُن آنکھوں اور کانوں کے اعتماد پر جن کی صداقت پر سارا جہان قربان اعتماد کرلیتے ہیں تو پھر بلاشبہ یہ ان کے ایثار وانقیاد کی آخری دلیل ہوگی، یہی وثوق اور اعتماد ایمان کی روح ہے۔

دلائل کی حقیقت اور اس کا درجہ

دلائل کی روشنی بھی کوئی روشنی ہے جو ایک قدم پر اگر چمکتی ہے تو دوسرے ہی قدم پر گُل ہوجاتی ہے۔ اگر نبی صاحبِ وحی ہے اور جو کہتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے کہتا ہے تو اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کرلینا ایک اقتضا طبعی ہونا چاہئے۔ کسی حقیقت کے مسلّم ہوجانے کے بعد بھی دلائل کی تلاش، روشن خیالی نہیں بلکہ ایک مختصر راہ کو اور طویل کردینا ہے۔ اسی لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد دعوتِ مناظرہ کے بجائے شروع سے عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مدار صرف دلائل پر ہو تو دلائل کبھی کبھی ہر دو طرف پیدا ہوجاتے ہیں ماسوا اس کے مطالب کی نزاکت کبھی دلائل کی رسائی سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر مذاق کا تفاوت سمجھ اور فہم کا اختلاف، اس پر وہم انسانی کی مزاحمت، یہ سب وہ موانع ہیں جو اگر نفسِ تصدیق کے لئے نہ سہی مگر کم از کم عمل کے لئے تو یقیناً سدِ راہ بن جاتے ہیں اسی لئے قرآنِ کریم نے صرف اطاعت وانقیاد ہی کی ایک راہ بتلائی ہے۔

مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَہَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَہُوْا — جو کچھ رسول تمہارے پاس لیکر آئے اس کو اختیار کرلو اور جس سے روکے اس سے رُک جاؤ۔

دلائل کا وسیع دائرہ بھی کچھ دور جاکر آخر اسی صفتِ انقیاد پر ختم ہوجاتا ہے ورنہ ایک مقصد کے حصول کے لئے مقدمات کی اتنی بے شمار کڑیاں درکار ہوں گی کہ اگر سب کاٹے کرنا ضروری ٹھہرے تو پھر تمام عمر میں ایک مقصد کا حصول بھی خواب وخیال سمجھ لینا چاہیئے۔ بہ نظرِ انصاف ایک تجربہ کار محقق کا قول خود ایسی محکم دلیل ہوتی ہے جو تنہا ہزار دلائل کا وزن اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج بھی ہم اپنے دلائل وبراہین کا سلسلہ آخر میں یورپ کے فلاسفروں کی تھیوریوں پر جاکر ختم کردیتے ہیں اور صرف ان کے اسماء کا حوالہ دیدینا دلائل کی وہ معراج تصور کرتے ہیں جس کے بعد تمام دلائل سے بے نیازی ہوجاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ تھیوریاں بے دلیل مسلّم ہونے کے قابل ہیں بلکہ اس کی تہ میں یہ علم یقین پہلے حاصل ہوتا ہے کہ یہ تھیوریاں ان فلاسفروں کے نزدیک چونکہ اپنے دلائل سے ثابت شدہ ہیں لہذا ان دلائل کا تلاش کرنا اور پھر ان کا دوہرانا محض ایک مسافۃ کا طویل کرنا ہوجاتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام اور ان کے علوم کا مرتبہ

ٹھیک اسی پر علوم انبیاء کو قیاس کرلینا چاہیئے۔ اگرچہ "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" ان کے علوم بھی اپنی جگہ ایسے دلائل سے ثابت شدہ ہوتے ہیں جہاں باطل کو کہیں سے راہ نہیں ملتی بلکہ وہ علمِ یقین کے اس مقام پر جاپہنچتے ہیں جس کے بعد ان کا لقب برہان مجسم ہوجاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (النساء) — اے لوگو! پہنچ چکی ہے تمہارے پاس ایک سند تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے تم پر واضح روشنی اتاری۔

بندہ کا کمال تفویض وتسلیم ہے

اس لئے انبیاء علیہم السلام کے علوم ان کے اعتماد پر تسلیم کرلینا کورانہ تقلید نہیں بلکہ مجسم ایک برہان اور حجتِ بینہ کی تقلید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمان کی تمام قیمت بندہ کی صرف یہ ادا ہے کہ وہ رسولِ وقت کے سامنے اپنی ساری لن ترانیاں ختم کردیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی ایک زبردست قربانی ہے، جسے وہ اپنے ضعیف وناتواں ہاتھوں سے اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ انسان کی بے صبر فطرت اپنی جیسی مخلوق کو ایسے مقام پر کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی، جہاں بے دلیل سرنگوں ہوجانا تمام انسانوں کے لئے وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہوجائے (یعنی رسول) وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور اسی کی اطاعت اپنا فرض تصور کرسکتا ہے۔ اسی لئے مشرکینِ عرب میں بھی تمام جہالتوں کے باوجود ایک جماعت خدا پرست تھی اور بزعم خود توحید کا انکار نہ کرتی تھی۔

وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ — (اور) جب کہا جائے ان سے کہ سوائے اللہ کے کوئی (اور)

يَسْتَكْبِرُوْنَ ۔ (الصٰفٰت) معبود نہیں تو غرور کرنے لگتے ہیں۔

یہاں لفظ یجحدون اسی لئے ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ اس دعوت سے انھیں انکار نہ تھا البتہ مسلمانوں کی آواز پر ان کا ہم آہنگ ہوجانا ان کے نزدیک اپنی بڑائی کے خلاف تھا۔

آدم علیہ السلام کے سجدے کا امر فرمانے کا فلسفہ

عالم کا سب سے پہلا شقی یعنی ابلیس خالق السموات والارضین کی عبادت سے کبھی منکر نہیں ہوا لیکن مشیتِ ایزدی نے اس کے دعوئے انقیاد کا جب امتحان لیا تو اپنی عبادت کا امر فرما کر نہیں لیا بلکہ ایک مشتِ خاک کے سامنے سر جھکانے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ سر جھکا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی مگر یہاں دشواری تھی تو یہ تھی کہ ایک ضعیف ہستی کے سامنے سر جھکانا جو مخلوق ہونے میں اس کی برابر کی شریک ہو، اس کی آوازِ فطرت کے برخلاف اور بظاہر ایک بے دلیل بات تھی۔ اس سے رہا نہ گیا اور

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ میں بہتر ہوں اس سے۔ (کیونکہ) مجھ کو بنایا ہے تو نے آگ

خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ سے اور اس کو بنایا مٹی سے۔

شیطان کے معارضہ کی حقیقت

کا نعرہ لگا بیٹھا دلائل کی پیروی کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ہوا، اس کا پوشیدہ کبر اور طبعی انحراف بھوٹا اور آخر وہ تسلیم و رضا کی اس منزل میں چل کرنا کام رہ گیا۔ جہاں خیر و شر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور چون و چرا کا میدان تنگ ہوجاتا ہے ؎

فراقِ وصل چہ باشد رضائے دوست طلب کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے

طبعی انحراف کا خاصہ

طبیعت کے انحراف کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تلاشِ حق کی تمام توفیق سلب کر دیتا ہے اور وہ نشہ پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد اپنی ہوائے نفس کے سامنے دلائل و براہین کی کچھ پار نہیں بستی سا اطراف و جوانب سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں اور اس بے شعوری کے عالم میں جو فیصلہ اپنے خیال میں آجاتا ہے وہ آخری فیصلہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابلیس نے صرف عنصرِ آتش کے شرف پر نظر کی یہ اس کا قصورِ نظر تھا عنصرِ خاک گو ضعیف ترین عنصر ہی مگر کیا ہو نہیں سکتا تھا کہ اس میں بھی کوئی جہتہ ایسی پیدا ہوجائے جو اسے قوی و برتر عنصر سے

فضیلت کیلئے صرف مادہ کا شرف کافی نہیں ہے

بھی افضل بنا دے، اگر ابلیس انسان کی صورت کی طرف بھی نظر کر لیتا تو اپنے مادہ کا شرف اس کی آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا۔ عنصرِ آتش ہزار اشرف سہی مگر یہاں صورت ایک حرفِ کن[۱] نے عطا کی تھی عنصرِ خاک پر

[۱] عن جابر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لما خلق اللہ ادم وذریتہ قالت الملائکۃ یا رب خلقتھم یاکلون و یشربون وینکحون ویرکبون فاجعل لھم الدنیا ولنا الاخرۃ قال اللہ تعالیٰ لا اجعل من خلقتہ بیدی ونفخت فیہ من روحی کمن قلت لہ کن فکان (شعب الایمان مشکوۃ شریف) حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور ان کی ذریۃ کو پیدا فرمایا تو فرشتوں نے عرض کیا اے پروردگار تو نے ان کو ایسا بنایا ہے کہ یہ کھاتے پیتے، نکاح کرتے اور سوار ہوتے ہیں (ہم ان باتوں سے محروم ہیں) اس لئے دنیا ان کے حصہ میں لگا دے اور آخرت ہمارے (باقی صفحہ ۴۶۸)

جو نقش و نگار نظر آئے وہ نقاشِ ازل کے خود اپنے دستِ قدرت کا بلا واسطہ کمال تھا۔

قَالَ یٰۤاِبْلِیْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِیَدَیَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِیْنَ۔ (ص)

فرمایا اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ سجدہ کرتا اس کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا یہ تو نے غرور کیا یا تو درجہ میں بڑا تھا۔

لما خلقت بیدی کی لطیف تفسیر اور شیطان کے معارضہ کا جواب

نصبِ خلافت سے پہلے ہی یہ سبق تمام نسلِ انسانی کو دیدیا گیا تھا کہ اُسے بھی اپنی اطاعت و انقیاد کا امتحان دینا ہوگا اور کامیابی صرف اس صورت میں متصور ہوگی جبکہ خدائے رب العزت کی رضا جوئی میں اس کے رسولوں کے لئے بھی بے دلیل وہی جذبۂ اطاعت پیدا ہو جائے جو خود اس کے لئے موجزن ہو سکتا ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ رسولوں کی باتوں پر بے دلیل یقین کر لینا کیوں رکنِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔

مناظرۂ ابلیس میں نسلِ انسانی کیلئے ایک عظیم موعظت

حدیث شریف میں انصار کی محبت کو علاماتِ ایمان میں اسی لئے شمار کیا ہے کہ رسول اور اس کے کنبہ و قبیلہ یا ہم وطن کی محبت ہر مسلمان میں طبعی طور پر بھی ہو سکتی ہے اور ہونی چاہیے مگر انصار کی محبت جو نہ اس کا ہم قبیلہ تھے نہ ہم وطن، اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس لئے کہ انھوں نے رسول کی ملیے الحسوق اعانت کی تھی جبکہ اس کے قبیلہ تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور بلاشبہ یہ محبت کمالِ ایمان ہی کا ثمرہ ہو سکتی ہے۔ محبوب تو نظرِ عاشق میں سرتاسر محبوب ہوتا ہے مگر اس میں کمال کیا ہے کہ اس کی ہر ہر ادا عاشق کی دلربائی کا مستقل ایک ایک افسوں ہوتا ہے، کمالِ محبت تو یہ ہے کہ اس کی رضا میں وہ فنا میسر ہو جائے کہ پھر یگانہ و بیگانہ، مکروہ و محبوب کا امتیاز جاتا رہے بلکہ تمام محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک تعاون و سازگاری کا وہی ایک محور و مرکز بن جائے۔ مال و اولاد کا تو ذکر کیا ہے اپنے نفس سے اگر محبت رہ جائے تو وہ بھی اسی کی خاطر ہو۔ ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔

انصار کی محبت علامتِ ایمان کیوں ہے۔

کمالِ محبت محبوب کی رضا میں فنا ہو جانا ہے

اس کی راہ میں تمام قربانیاں شیریں بن جائیں اور اس کے خلاف میں ساری خوشحالیاں کانٹے نظر آئیں، اس کے نام پر گردنیں اتروا دینا حیوۃ ابدی معلوم ہو اور اپنی قربان گاہ سے ایک قدم پیچھے ہٹنا موتِ ابدی نظر آئے اور یہ سب کچھ اس تصور میں ہو کہ یہ ساری جان نثاریاں گو اس قابل نہ تھی کہ محبوب کے لئے قابلِ نظر ہوں مگر ایک عاشق کی یہ حسرت ہونا چاہیئے کہ راہِ عشق میں جو قربانی وہ کر سکتا ہے کر گذرے، حضرت بلالؓ و عمارؓ کے سرفروشانہ جذبات پر سیرت نگار دور، کو حیرت ہے مگر خود ان کی زبانی اگر دریافت کیا جاتا تو ساقیِ کوثر کے ہاتھ سے ان جام پینے والوں سے شاید انھیں شکایت ہوتی جنھیں اس کے ہاتھ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جس مخلوق کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور اپنی طرف سے اس میں روح ڈالی ہے اس کو ان کے برابر نہیں کروں گا جن کو میں نے حرفِ کُن سے بنایا ہے۔

جام پی کر تکلیف و راحت کا احساس باقی تھا ؎

ازاں افیوں کہ ساقی کردہ بدمست — رفیقاں را نہ سر ماند نہ دستار

ایمان میں اسی منزل کا نام مقامِ یقین ہے دیکھو حجۃ اللہ صفحہ ۹۱ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی جب نشۂ یقین سے ممور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالمِ غیب ان کو محسوسات کی طرح یقین نصیب ہو جاتا ہے، فقر و غنا، حیوۃ و موت کے خرخشہ سے انسان بے نیاز ہو جاتا ہے اسباب کے قید و بند سے رستگاری میسر آجاتی ہے۔

ایمان مذہب کی روح اور بنیاد ہے

یہی وہ ایمان جس پر مذہب کی تمام بنیاد قائم ہے کوئی عقیدہ اپنے دامن میں خواہ کتنی ہی نزاہت اور رفعتیں کیوں نہ رکھتا ہو مگر اس نورِ ایمانی کے بغیر نظرِ شریعت میں وہ صرف ایک ظلمتکدہ اور سرتاسر تاریکی ہے۔ کوئی عمل مجاہدات و ریاضات کے خواہ کتنے ہی مراحل کیوں نہ طے کر چکا ہو مگر بدون اس روحِ ایمانی کے ایک تنِ مردہ اور میزانِ آخرت میں قطعاً بے وزن ہے۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (پس ہم ان کے لئے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے) عقائد و اعمال کا تو ذکر کیا ہے کوئی معمولی سی معمولی نیت بھی خواہ کتنی ہی صاف و ستھری کیوں نہ ہو اس سرمایۂ ایمان کے بغیر بارگاہِ بے نیاز میں کوئی اعتبار نہیں رکھتی، یہ ایمان عقائد و اعمال اور نیتوں کی وہ واحد روح ہے جس کے بعد کفر کی تو بر تو تاریکیاں چشم زدن میں کافور ہو سکتی ہیں۔ آتش کدۂ جہنم اس کے رو برو سرد ہو سکتا ہے اور گلزارِ عدن اس کا ایک طے شدہ معاوضہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی سجدہ طاعاتِ صد سالہ کے لئے مایۂ رشک اور مٹھی بھر جو کا صدقہ بے شمار تضاعیف (زیادتیاں) کا مستحق نظر آنے لگتا ہے۔ غرض سعادتِ ابدیہ اسی مبدا کی خبر ہے اور شقاوتِ ازلیہ اس سے محرومی کا نشان ہے۔ یہ سب کچھ اس سچی کتاب میں موجود ہے جو غلط گوئی کی بالکل منزہ اور مبالغہ آمیزی سے یکسر مبرا ہے۔

ایمان کی تعریف پر تفصیلی نظر

اشیاء کے وجود کی تین صورتیں

کسی چیز کے وجود کی عالم میں تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔ (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) عینی۔

وجودِ لفظی ایک ناتمام وجود ہے

ان ہر سہ اصناف میں لفظی وجود سب سے ضعیف اور کمزور وجود ہے، جو مقاصد واغراض کسی شے کے وجود میں ملحوظ ہوسکتے ہیں ان میں سے کوئی بھی اس وجود پر مرتب نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر اس وجود کو عدم کے برابر کہدیا جائے تو بیجا نہیں ہے۔ پانی کا لفظی وجود کسی تشنہ کی پیاس نہیں بجھاتا اور نہ روٹی کا صرف زبانی تذکرہ کسی بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے۔

وجودِ عینی لفظی وجود سے قوی ہے

(۲) وجودِ ذہنی گو لفظی وجود سے قوی تر ہے مگر شے کے تمام آثار و احکام مرتب ہونے کے لئے یہ بھی ناکافی ہے۔

کسی چیز کا وجودِ عینی ہی اس کا مکمل وجود ہوتا ہے

(۳) وجودِ عینی وہ وجود ہے جو خارج میں کسی کے اعتبار کے بغیر موجود ہوتا ہے اسی وجود کو درحقیقت وجود کہا جاسکتا ہے بقیہ اصناف اس کے توابع اور فروع ہیں۔ یہی مبدء آثار ہے اور اسی پر شے کے سب احکام مرتب ہوتے ہیں۔ آنکھوں کی تروتازگی قلب وجگر کی سیرابی، اشجار و ثمار کی سرسبزی یہ سب پانی کے وجودِ عینی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں، اسی لئے جب کوئی پیاسا پانی مانگتا ہے تو اس کا مقصد پانی کا ہی عینی وجود سمجھا جاتا ہے اور اس کا لفظی یا ذہنی وجود کسی کے خواب وخیال میں نہیں آتا۔

اسی طرح ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں (۱) لفظی (۲) ذہنی (۳) عینی۔

سابق تمہید کی بنا پر ایمان کا لفظی وجود بیکار محض ہونا چاہیے۔ جب کسی تشنہ کے لئے پانی کا صرف لفظی وجود کارآمد نہیں ہوتا تو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے جواب میں ایمان کا صرف لفظی وجود کیا مفید ہوسکتا ہے۔ مگر یہاں ایک سخت مشکل یہ درپیش ہے کہ عالمِ بشریت کی سرتاسر محتاجی اس کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو الفاظ وحروف کا جامہ پہنائے بغیر ادا کرسکے۔ اس کی قلبی ترجمانی کا یہی ایک ناتمام آلہ ہے اگر وہ بھی ناقابلِ اعتبار ٹھیرے تو عالمِ انسانی کا تمام کاروبار معطل اور بیکار محض ہوجائے۔ اس لئے چار و ناچار ایمان کا لفظی وجود بھی شریعت میں ایک حد تک قابلِ اعتبار سمجھا گیا ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ۔ — میں اس بات پر مامور ہوں کہ جب تک کفار لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں ان سے جنگ جاری رکھوں۔

اب اسے ایمان کی رفعت اور بلندی کہیے یا اس کی فیاضی سے تعبیر کیجیے کہ محض زبانی کلمۂ توحید پر اس نے جان بخشی کا اعلان کر دیا ہے اور کسی کے سرائر اور مکنونات صدور (دل کے راز) سے کوئی بحث نہیں کی۔ اس جگہ یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ اسلام میں تصدیق قلبی کے بغیر صرف زبانی اقرار کر لینا بھی کوئی وزن رکھتا ہے کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی کسی حالت میں قطع نظر کے قابل نہیں سمجھا گیا حتی کہ بحالتِ اکراہ جبکہ اپنی جان پر بن رہی ہو زبان سے کلمۂ کفر ادا کرنے کی صرف اسی شرط سے اجازت دی گئی ہے کہ قلب کی گہرائیاں اذعان و ایقان سے لبریز اور معمور ہیں۔

اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ۔ مگر شخص جس پر زبردستی کی گئی اور اس کا دل برقرار ہے۔

جو صورت حدیث میں مذکور ہے وہ یہ ہے کہ اگر زبان اقرار کر لیتی ہے اور دوسری کوئی دلیل جو قلبی انحراف پر دلالت کر سکے ہمارے سامنے موجود نہیں ہوتی تو اس وقت ہم اس بات کے مامور ہیں کہ اس اقرار ہی کو قلبی تصدیق کی دلیل سمجھیں۔

اسلام جو اخلاقِ عالیہ کا سب سے اول معلّم ہے کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک انسان کی زبان کو بلا وجہ جھوٹا قرار دے یا اس سے متعلق کسی اندرونی کمزوری کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے۔ دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام تک کیوں نہ پہنچ چکا ہو کبھی اپنے حریف پر وہ بھی بحالتِ جنگ اعتماد کا خیال نہیں کر سکتا، یہ اسلام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ تم اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کر لو اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے، اگر ان میں کوئی سعید روح ہو گی تو ایک دن وہ خود بخود اپنے اس صدق نما کذب پر نادم ہو گی اور دل بھی زبان کی طرح اسلام کا کلمہ پڑھ لینے پر مجبور ہو جائے گا۔

ایک مرتبہ صحابۂ کرامؓ نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ دورانِ جنگ میں ایک فریق دوسرے فریق کی گھات میں لگا ہی رہتا ہے۔ صحابہؓ نے ارادہ کیا کہ اس کی بکریاں چھین لیں، اس نے اپنا پانسا کمزور دیکھا اور وہ وقت آ گیا کہ جو اسلام مدت سے اس کے سینہ میں گھوم رہا تھا اب دل میں اتر آئے، وہ اسلام لے آیا مگر اس حال میں دشمن کا اقرارِ وفاداری انسان کی کمزور فطرت کب قبول کرتی۔ اس لئے صحابۂ کرام نے اس

۱؎ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی ہی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے اگر خدا کے رسول کے علم پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً منافقین کا گروہ کفار میں شمار ہوتا۔ اب اگر ان کو قتل کیا جاتا تو انھیں ناحق یہ بدنام کرنے کا موقعہ ہاتھ آ جاتا کہ آپ اپنے اصحاب و رفقاء کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لئے کلمۂ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام قبول کرنے کا معیار قرار دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کا دار و مدار رکھ دیا گیا (کتاب الایمان ص ۱۰۲)

اسلام کو صرف مال کے بچاؤ کا ایک ذریعہ سمجھا اور اس کی بکریاں غنیمت کا مال بنالی گئیں۔ لیکن اسلام جو اخلاق کے آخری منازل صرف زبانی سکھانے نہیں آیا تھا بلکہ طے کرانے آیا تھا اس کمزوری کو کب برداشت کرتا۔ اس واقعہ کی اہمیت محسوس کی گئی اور اتنی کی گئی کہ وحی الٰہی کو دخل دینا پڑا اور نہایت تنبیہ آمیز لہجہ میں ارشاد ہوا۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ اَلْقٰی اِلَیْکُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (نساء) — اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے "سلام علیک" کرے کہ تو مسلمان نہیں۔ تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا۔

کتب احادیث میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں، بہت ہیں، جہاں اسلام کے لفظی وجود یعنی صرف اقرار باللسان کو دنیوی احکام کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔

حضرت مقدادؓ فرماتے ہیں کہ یا رسول اللہ اگر دوران جنگ میں دشمن میرا ایک بازو کاٹ دے اور جب میرا موقعہ لگے تو وہ جان بچا کر درخت کی آڑ میں آجائے اور کلمۂ شہادت پڑھ لے تو کیا میں اس کے اس مجرمانہ اقدام کے بعد بھی اس کا یہ مبہم اسلام قبول کرلوں۔ ارشاد ہوا ضرور۔ اور اگر اس کے بعد بھی تم نے اسے قتل کردیا تو یاد رکھنا تم اب اسی طرح مباح الدم سمجھے جاؤ گے جیسا وہ اپنے اسلام لانے سے قبل مباح الدم تھا (مسلم شریف)

دیکھو! یہاں بھی انسان کی کمزور فطرت کس طرح اپنے حریف کا اسلام مبہم کررہی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کے انتقام میں یہ لفظی اسلام حائل نہ ہونے پائے مگر یہ اسلام ہے جو اپنے ہمنواؤں کے سینکڑوں بانفوس حریفوں کی ایک زبان پر نثار کررہا ہے۔ انتقام گو فطری حق ہی مگر اسلام اس نازک ماحول میں یہ ثابت کردینا چاہتا ہے کہ ایک کلمۂ حق کے احیاء میں وہ اپنے فطری اور ذاتی حق سے بھی دست بردار ہوسکتا ہے۔

احادیث میں کچھ واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دشمنوں کی جان و مال کا تکفل، ان کی عزت واحترام کا تحفظ کچھ خاص اس کلمہ کے ادا کرنے ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ صرف اقرار وفاداری کی ضرورت ہے خواہ کسی زبان سے ہو اور کسی عمل سے۔

حضرت خالدؓ مسلمانوں کا ایک دستہ لئے ہوئے مصروف جہاد ہیں، دشمن چاہتا تھا کہ اسلام قبول کرلے مگر ناواقفی اور جہالت کی وجہ سے اسلمنا (ہم نے اسلام قبول کیا) کا لفظ نہ کہہ سکا اور اس کے بجائے صبأنا صبأنا کی صدا بلند کرنے لگا (یہ لفظ عربی زبان میں بددین ہونے کے لئے مستعمل ہے) اسی کمزوریِ فطرت کی وجہ سے یہاں بھی یہ نازک اسلام قبول نہ ہوا اور آخر اسی حالت میں سب کو موت کا جام پی لینا پڑا۔ رحمۃ للعالمین کو جب اطلاع ملی تو انتہا درجہ مضطرب ہوئے اور اسی اضطراب کے عالم میں دونوں ہاتھ اس تصور میں

آسمان کی طرف اٹھ گئے کہ مبادا خدا تعالیٰ کا قہر ان معصوموں کا انتقام لینے کے لئے کھڑا ہو جائے اور میں بھی اس میں شامل سمجھا جاؤں اس لئے فرمایا اے پروردگار جو غلطی خالد سے سرزد ہوئی میں اس سے بری ہوں[1]۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ ظاہر ہو گیا کہ نفسی وجود گو ضعیف تر بلکہ مرادف عدم ہے پھر اسلام نے اس کا کیوں اعتبار کر لیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقرار سے مراد یہاں وہی اقرار ہے جسے ضمیر کی صحیح آواز کہا جاسکے ورنہ ایسا اقرار ہی نہ کہا جائے گا، بلکہ وہ انکار کی صرف ایک اقرار نما صورت ہوگی۔ اسلام کے اس لفظی وجود کو فقہاء کی اصطلاح میں اقرار باللسان کہا جاتا ہے۔

اقرار باللسان فقہاء کو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا رکھنا چاہئے، ایک جماعت رکن کی حیثیت تجویز کرتی ہے اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک نوع کی تصدیق ہی کا نام ہے فرق ہے تو یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے اور اقرار زبان کی تصدیق ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن اور دوسری شرط قرار دیدی جائے۔ ہاں اتنی بات ہے کہ تصدیق قلبی رکنِ اصلی ہے یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اقرار رکنِ زائد یعنی بعض صورتوں میں یہاں اغماض وچشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے جیسا کہ اکراہ میں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی، شیخ ابو الحسن اشعری، امام نسفی کا میلانِ خاطر اقرار کی شرطیۃ کی طرف ہے، یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوتِ اسلام سے قبل ہی احکامِ اسلام کا نافذ کر دینا تو غیر معقول ہے اور زبانی اقرار کے بغیر ہمارے پاس اسلام پر کوئی شہادت نہیں اس لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ نفاذ احکامِ اسلامیہ کے لئے اقرار باللسان کو شرط کہا جائے۔

علامہ تفتازانی فرماتے ہیں کہ اگر اس اقرار کا صرف یہ مقصد ہے تو تنہائی کا اقرار کافی نہ ہونا چاہئے بلکہ کم از کم مسلمانوں کے امیر کے سامنے ہونا چاہئے تاکہ اجراءِ احکام کا اصل مقصد حاصل ہو سکے۔ اس امر پر فریقین کا اتفاق ہے کہ مطالبہ کے بعد زبان سے اقرار کرنا بہر کیف ضروری ہے کیونکہ اب اقرار نہ کرنے کے معنی گویا انکار کرنا ہیں، یہ کفر جحود کہلاتا ہے۔

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا	اور انکار کیا اُن (آیات) کا حالانکہ اپنے دل میں اس کا
اَنْفُسُهُمْ۔ (نمل)	یقین کر چکے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کبھی دل اندر سے یقین کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے مگر زبان پھر انکار سے باز نہیں آتی، اس کا نام اصطلاح میں کفر عناد ہے۔ حضرت استاذ قدس سرہٗ فرماتے تھے کہ ہمارے فقہاء نے ایمان کی تعریف میں اسی لئے اقرار کا اضافہ کر دیا ہے کہ جو تصدیقِ قلبی زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف

[1] بخاری شریف

میں داخل نہ رہے اور یہ سمجھا ہے کہ جب زبان کے لئے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا تو اب انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوگی۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس کو دوسری طرح ادا کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب تک اقرار نہ ہو، ہمارے پاس اسی کا کیا ثبوت ہے کہ اس کے قلب میں حقیقۃً تصدیق موجود ہے، لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے بعد بھی اقرار نہیں کرتا تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اس کو تصدیقِ قلبی حاصل نہیں ہے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان ایمان کا جزء قرار دیا جائے۔[1]

ہم کہتے ہیں کہ اگر اقرار کرنا اسی مقصد کے لئے لازم قرار دیا گیا ہے جو حضرت استاذ مرحوم کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے تو پھر رکنیت اور شرطیت کا اختلاف بہت بڑھانا نہ چاہئے۔ بلکہ اب مناسب یہ ہے کہ اختلاف کی تنقیح یوں کر دی جائے کہ اقرار کرنا بالاتفاق ضروری ہے مگر ایک فریق نے اس کی اہمیت زیادہ محسوس کر کے رکنیت کا لفظ کہہ دیا ہے اور دوسری جماعت نے گو اہمیت کو تسلیم کیا ہے مگر رکنیت کا لفظ نہیں کہا، پھر اگر پہلے فریق نے رکن کہا ہے تو لفظِ زائد کہہ کر اُسے ذرا پھیکا بھی کر دیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ یہاں ایک اور مفید تحقیق فرما گئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقرار کے دو معنی آتے ہیں (۱) زبان سے تصدیق کرنا (۲) التزامِ طاعت اور عہدِ عمل و فرمانبرداری، آیتِ ذیل میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔[2]

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ	اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا
اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ	کتاب اور علم پھر تمہارے پاس کوئی رسول آئے کہ سچا بتلائے
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ	تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى	اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر
ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا (آل عمران)	میرا عہد قبول کیا، وہ بولے ہم نے اقرار کیا۔

اس آیت میں اقرار کا لفظ عہدِ عمل اور التزامِ طاعت ہی کے معنی میں مستعمل ہوا ہے کیونکہ یہاں انبیاءؑ سے کسی امر کی صرف تصدیق مطلوب نہیں بلکہ اس کا عہد لیا جا رہا ہے کہ جو رسول تمہارے پاس آئے گا تمہیں اس کی اطاعت کرنا ہوگی اس پر ایمان لانا ہوگا، اس کی نصرت کرنی پڑے گی، التزامِ طاعت کا بھی یہی مفہوم ہے اب اگر اقرار سے یہ معنی مراد لئے جائیں تو ایمان کی تعریف میں صرف اقرار کی قید کافی ہوگی، ورنہ التزامِ طاعت کے تیسرے رکن کا اور اضافہ کرنا ضروری ہوگا مزید تفصیل آئندہ آ رہی ہے۔

---

[1] کتاب الایمان ص ۸۸۔ [2] ایضاً ص ۱۶۱۔

ایمان کا وجود ذہنی تصدیقِ قلبی کو ایمان کا وجود ذہنی کہا جاتا ہے یہ تصدیق مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے (۱) کبھی دلائل و براہین کا قاہرانہ تسلط یقین کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ (۲) کبھی انسان از خود دلائل و براہین کا دروازہ جھانک کر علم یقین تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ (۳) کبھی بلا وسائل و اسباب بداھۃً یقین میسر آجاتا ہے۔ (۴) کبھی نہ دلائل کا شعور ہوتا ہے نہ اور کوئی فطری احساس صرف تقلیدی طور پر ایک اذعان پیدا ہو جاتا ہے۔ (۵) کبھی شمشیر کی جھنکار حجابِ غفلت اٹھا دیتی ہے اور صداقتِ اسلام کا عکس پڑنے لگتا ہے (۶) کبھی جان و آبرو کی حفاظت کی طمع قلب کو تصدیق کرنے کے لئے ابھار دیتی ہے۔

ان سب صورتوں میں گو اختیاری یا اضطراری طور پر تصدیق تو حاصل ہو جاتی ہے مگر ایمان کا وجود ذہنی اس وقت تک پھر بھی نہیں ہوتا جب تک کہ قلب اقرارِ وفاداری اور عہدِ فرمانبرداری نہ کرے اسی کا نام انقیادِ باطن ہے یہ علم نہیں ایک عملِ قلب ہے اور اختیاری ہے اسی لئے اس پر جزاء و سزا مرتب ہے، اسی کو عقدِ قلبی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فقہاء کی عبارات میں ضروری ہے کہ تصدیق سے اسی خاص نوع کا ارادہ کیا جائے یا اقرار سے مراد التزامِ طاعت لیا جائے ورنہ تصدیق و اقرار کے دو لفظ مل کر بھی ایمان کا پورا مفہوم شرعی ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنی کتاب الایمان میں اس جز پر بہت زور دیا ہے۔ عام طور پر یہاں اعتراضات تو سینوں میں کھٹک رہے ہیں اور بہت سے قلم جواب کے لئے جنبش کرتے نظر آتے ہیں مگر تشفی بخش جواب صرف حافظ ابن تیمیہؒ کا ہے۔

انسان ایک ضعیف مخلوق ہے مگر کبھی ایسی جسارت کر لیتا ہے کہ تصدیق اس کو حاصل ہوتی ہے مگر اقرار پھر نہیں کرتا اور کبھی اس سے بڑھ کر یہ غضب ڈھاتا ہے کہ دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار بھی کر لیتا ہے مگر اس کو اپنا عقیدہ بنانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ ۔ انسان مارا جائے کس قدر ناشکر ہے۔

ہرقل جیسے عالم کتاب کی تصدیق کا حال اس کے اور ابو سفیان کے مکالمہ سے ظاہر ہے اہل کتاب کی عام طور پر معرفت کا تذکرہ قرآن کریم نے بڑے وزنی الفاظ میں کیا ہے۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۔ اس رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو

مگر یا ایں ہمہ ان کے کفر میں کسی کو مجالِ شبہ نہیں ہے۔ ..... ابو طالب کی داستانِ جاں نثاری سے کتب سیر کے صفحات مملو نظر آتے ہیں مگر یہاں بھی جمہور محققین ان کے کفر ہی کی طرف جا رہے ہیں[1]

[1] بعض اہلِ نظر کا یہ خیال ہے کہ جو بے نظیر جاں نثاری جناب ابو طالب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ظاہر فرمائی تھی وہ یقیناً کبھی خالی جا نہیں سکتی اس لئے ان کا رجحان ان کے اسلام کی طرف ہے (باقی حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

ان سب امور سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تک تصدیق کے ساتھ التزامِ طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ ہرقل اور اس جیسے اہلِ کتاب نے تصدیق ضرور کی اور اقرار بھی کیا مگر کیا ایک لمحہ کے لئے بھی اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دینِ محمدی میں قدم رکھا؟ جناب ابوطالب نے جاں نثاری کا جو نقشہ پیش کیا بلاشبہ وہ رہتی دنیا تک تاریخِ صفحات کی زینت رہیگا۔ مگر کیا ایک مرتبہ بھی اس کلمہ کے لئے ان کی زبان متحرک ہوئی جس کے لئے دیر سے رسولِ خداؐ اصرار فرما رہے تھے۔

انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہدِ وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے ایمان کے وجود ذہنی کے لئے ضروری ہے کہ علم ایسا صفتِ نفس بن جائے کہ پھر قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے، اسی کا نام ہم نے عملِ قلب رکھا ہے۔ بعض ضعیف الاسناد روایات میں ایمان کی تعریف میں "عقد بالقلب" کا لفظ وارد ہے۔ اسی طرح عباراتِ سلف میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے، ہمارے نزدیک اس کی مراد بھی یہی عمل قلب ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیادِ قلبی اور التزامِ طاعت بھی اس کا جزءِ اہم ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا اور اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لئے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لئے آمادہ نہیں تو بھی وہ مومن نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قائل کے ان جذباتِ محبت کا ہمیں بہت احترام ہے مگر جن کے احترام کی خاطر یہ سارا احترام ہے کیا کیجئے کہ خود اُن سے اس زبردست دعویٰ کی کوئی صحیح سند نہیں ملتی۔ اعلانِ حق کی ذمہ داری اس موقعہ پر کچھ بسط کی متقاضی ہے۔ مگر محل کی نزاکت خاموشی سے گذر جانا چاہتی ہے۔ اس گویائی اور خاموشی کے مابین جو کچھ ایک مصنف کا شتیرِ قلم لکھ سکتا ہے وہ صرف اسقدر ہے کہ رب العزت کی بلند بارگاہ ہے جہاں کسی کی عداوت و جاں نثاری دونوں سے بے نیازی حاصل ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عمر فاروقؓ کی شمشیر ایک بدترین ارادہ کے لئے بے نیام ہوتی ہے مگر شانِ بے نیازی ان پر سعادت کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ ادھر جناب ابوطالب کی جاں نثاری دیر سے دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے مگر شانِ استغنا، التفات تک نہیں کرتی اور یہ کہکر دروازہ بند کر دیتی ہے کہ جف القلم بما ھو کائن۔ فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر۔

کتبِ احادیث کے مطالعہ کرنے والوں سے حیرت ہے کہ بعینہ یہ سوال جب حضرت رسالتؐ سے بہت پہلے کیا جا چکا ہے اور اس کا جواب بھی خود زبانِ فیض ترجمان سے صادر ہو چکا ہے تو پھر اس کے بعد بھی قیاس آرائی کا کیا کوئی موقعہ باقی رہ جاتا ہے!

صحیح بخاری و مسلم میں ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہؐ آپ نے اپنے چچا کو کیا نفع پہنچایا وہ آپ کے لئے ہمیشہ سرِ بکف رہا کرتے تھے؟ آپ نے جواب دیا کہ میری وجہ سے ہی ان کے عذاب میں اتنی تخفیف کر دی گئی ہے کہ صرف آگ کے دو جوتے ان کو پہنا دیئے گئے ہیں جن کی تیزی سے ان کا دماغ کھول رہا ہے اگر میں نہ ہوتا تو جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوتے۔

یہ بحث ابھی نہیں ہے کہ یہ جاں نثاری رسولِ خداؐ کے لئے تھی یا ایک عم کی اپنے ابنِ عم کے لئے۔ انصار کی محبت اس لئے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کی ایمان کی علامت ہے اور اسی حیثیت سے ان سے بغض نفاق کی نشانی ہے مگر یہ حیثیت اگر ملحوظ نہ ہو تو نہ وہ ایمان کی علامت ہے اور نہ یہ نفاق کی۔

مصمم ہو۔ گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں[1] کہ قرآن وحدیث کے جو الفاظ خود شارع علیہ السلام کے بیان اور موارد استعمالات سے کسی معنی کے لئے متعین ہو چکے ہیں بس وہی اس کے صحیح معنی ہوں گے۔ لغت میں عموم یا خصوص اس کے معنی پر کچھ اثر انداز نہ ہوگا۔ ایک متکلم جب اپنے بار بار کے استعمال سے ایک لفظ کے معنی خود متعین کر دیتا ہے تو پھر کسی کو حق نہیں رہتا کہ لغت کی استعانت یا دیگر شواہد سے اس کے کلام میں کوئی دوسرے معنی مراد لے۔ مثلاً یہی ایمان کا لفظ لے لیجئے لغت میں گو یہ لفظ تصدیق کے لئے موضوع ہے مگر شارع علیہ السلام نے اس لفظ کو جب استعمال کیا ہے تو ایک خاص نوع کی تصدیق کے لئے ہی استعمال کیا ہے اس لئے اب احادیث میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد لی جائے گی جو اس کے مکرر سہ کرر بیانات سے متعین ہو چکی ہے۔ فرض کرو ایک شخص دربارِ نبوت میں حاضر ہوتا ہے اور تصدیق کے ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ میں نہ آپ کے احکام بجا لاؤں گا نہ جن چیزوں سے آپ منع فرمائیں گے باز رہوں گا نہ فرائض خمسہ ادا کروں گا ہاں شراب پیوں گا، چوری، زنا، نکاح محارم کروں گا۔ غرض جو نا کردنی ہے وہ سب کچھ کروں گا، کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ محض لغوی تصدیق کے بعد رسولِ خدا اس کے لئے ایمان کا پروانہ تحریر فرما دیں گے، اس کی شفاعت کا وعدہ فرمالیں گے، جہنم سے نجاتِ ابدی کی بشارت سُنا دیں گے یا یہی جواب دیں گے کہ تو صرف کافر نہیں بلکہ بدترین کافر ہے۔ تیرا یہ ایمان، ایمان نہیں استہزاء ہے، یہ تصدیق نہیں بلکہ تکذیب کا بدترین مظاہرہ ہے اور اگر یہ بھی ایمان ہے تو پھر ابلیس کے ایمان میں کیا کسر تھی جس نے صرف ایک ہی سجدہ کا تو انکار کیا تھا پھر قرآن نے کیوں اس کو کافروں میں شمار کر لیا ہے۔ اِسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ۔

حضرت استاذؒ فرماتے تھے کہ ایمان کا ترجمہ جاننا یا یقین کرنا، یا تصدیق کرنا اچھا نہیں ہے۔ ان تراجم کی ایمان کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی بلکہ صحیح ترجمہ "ماننا" ہے جس سے التزامِ طاعت کا مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے۔

اتنی ہی تو بس کسر ہے تم میں   کہنا نہیں مانتے کسی کا

اردو داں حضرات کو حضرت استاد کا ایک یہ ترجمہ ہماری اس ساری تفصیل سے بے نیاز کر سکتا ہے۔

یہ ہے ایمان کا وجود ذہنی، یہی ایمان کا جزء اشرف ہے، نجات ابدی اسی پر دائر ہے اور آخرت کی ساری خوشیاں اسی کی ثمرات و برکات ہیں۔

---

[1] کتاب الایمان ص ۱۴۲ و ۱۴۳۔

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ تصدیق و معرفت حاصل ہونے کے بعد انکار و جحود کیسے ممکن ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک انسان تکمیلِ انسانیت سے پہلے انسان نہیں بنتا وہ ہمیشہ خصائلِ بہیمیہ کا محکوم بنا رہتا ہے اس کے علوم و معارف میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فطری و خلقی جذبات کو شکست دے سکے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی راحتِ ابدی صرف ایک انبیاء کی اطاعت میں منحصر ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ایمان لانا بہت سے لذائذ و مرغوبات کا ترک کر دینا اور بہت سے مکروہات میں اپنی جان کو مبتلا کر دینا ہے اس لئے قیدِ ایمان کی لذت سے یہ ناآشنا اپنے ہاتھوں سے اپنے بازوئے آزادی کترتے ہوئے کبھی اتراتا اور کبھی کتراتا ہے۔ ابلیس کے علم و تصدیق کا حال تو مشہور ہی ہے۔ فرعون کی تصدیق کا حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی سن لو۔

لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ (بنی اسرائیل) — آپ جان چکے ہیں کہ یہ چیزیں کسی نے نہیں اتاریں مگر آسمان و زمین کے مالک نے سمجھانے کے واسطے۔

معلوم ہوا کہ فرعون جیسا شقی بھی نزولِ آیات کے منشا کا صحیح علم رکھتا تھا مگر اس کے بعد بھی جو کفر اس نے کیا ہے کیا دنیا میں ضرب المثل نہیں؟ کیا اس کی وجہ بے علمی تھی؟ یا سارے جہان پر اس کا علو و برتری کا جنون۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا۔ (قصص) — فرعون ملک میں بڑائی کر رہا تھا اور وہاں کے لوگوں کو پارٹیاں بنا رکھا تھا۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (النازعات) — فرعون کی طرف جاؤ اس نے بہت سر اٹھایا ہے۔

اکثر کفار اسی طغیان کے شکار تھے اور یہی وجہ ہے کہ جو کچھ اس انھوں نے نبیِ وقت کے بالمقابل کبھی کی ہی اس میں ایک حرف بھی ایسا پیش نہیں کیا جس کو ایک صحیح الدماغ انسان ایک منٹ کے لئے نبوت میں قادح سمجھ سکتا ہو صرف اپنے حسد و بغض کا مظاہرہ کیا ہے اور بس معلوم ہوا کہ اپنی جگہ ان کی نبوتوں میں کفار کو بھی شبہ نہ تھا ورنہ کبھی ایک دلیل تو ایسی بیان کرتے جو ان کی کفر یا تردد کی کچھ تو پردہ پوشی کر لیتی۔ آیاتِ ذیل کا بغور ملاحظہ کرو اور فیصلہ کرو۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے۔

اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ۔ — کیا ہم تیری فرمانبرداری کریں حالانکہ تیری پیروی تو ذلیل لوگوں نے کی ہے

کیا اتباعِ ارذلین بھی صدقِ نبی کے منافی ہے یا کذبِ نبی کی کوئی دلیل بن سکتی ہے ہرگز نہیں۔ بات یہ تھی کہ متکبر اور مغرور انسان کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ ایک کمزور اور ذلیل انسان کو اپنے برابر یا اپنے نفس کو اس کے پہلو بہ پہلو دیکھ سکے اور یہ وہ خوب جانتا ہے کہ اسلام اس کے اس فاسد جذبہ کو ہرگز پورا نہیں کر سکتا - وہ اس فرق کو اٹھانے کے لئے آیا ہے۔ یہی تو وجہ تھی کہ مشرکینِ عرب نے بھی سرورِ کائنات کے سامنے یہ درخواست پیش کی کہ سعد بن ابی وقاص، ابنِ مسعود، خباب بن الارت، عمار بن یاسر، بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور ان جیسے

اور غرباء کو اپنی محفل سے نکال دیجئے تاکہ ہمارے آنے جانے کی جگہ ہو جائے۔ اس پر قرآن کریم نے جو جواب دیا وہ یہ تھا۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُونَ مِنَ الظَّالِمِينَ وَكَذَٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِيَقُولُوا أَهَٰؤُلَاءِ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ ؁

اور مت دور کیجئے ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام چاہتے ہیں اس کی رضا آپ پر ان کے حساب میں کچھ نہیں ہے اور نہ آپ کے حساب میں ہے ان پر کچھ ہے کہ آپ ان کو دور کرنے لگیں تو بے انصافوں میں ہو جائیں اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے تاکہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہم سب میں کیا اللہ تعالیٰ شکر کرنے والوں کو خوب جاننے والا نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا مغرورانہ جواب۔

أَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُونَ (المومنون)

کیا ہم ایمان لائیں ایسے دو آدمیوں پر جو ہم جیسے ہیں، اور ان کی قوم ہماری تابعدار ہے

أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ. وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ (شعراء)

کیا نہیں پالا ہم نے تجھ کو اپنے یہاں لڑکا سا اور رہا تو ہم میں اپنی عمر میں سے کئی برس ؏

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کی متمردانہ تقریر۔

أَصَلَاتُكَ تَأْمُرُكَ أَنْ نَتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا أَوْ أَنْ نَفْعَلَ فِي أَمْوَالِنَا مَا نَشَاءُ

کیا تجھے تیری نماز اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم ان بتوں کی عبادت ترک کریں جن کی عبادت ہمارے باپ دادے کیا کرتے تھے یا اپنے مال میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

مشرکین عرب کا ایک لغو اعتراض۔

لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (زخرف)

یہ قرآن ان دو بستیوں میں سے کسی بڑے شخص پر کیوں نہ اتارا گیا۔

ان بیانات کو پڑھ کر کیا آپ نے یہ نتیجہ نکالا کہ ان کفار کو بھی ان انبیاء کے متعلق کوئی شبہ درپیش تھا کیا ان بیانات میں ان کے صدق و کذب پر کوئی بحث ہے یا محض اپنے حسد و بغض کی ترجمانی ہے۔

مشرکین عرب کا ایک بے معنی عذر۔

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰی مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا (قصص) — اگر ہم راہ پر آجائیں تیرے ساتھ تو اچک لئے جائیں اپنے ملک کر

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰی اٰثَارِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (زخرف) — ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک راہ پر پایا اور اب ہم انہی کے مقتدی رہیں گے۔

کیا یہ ہیں وہ دلائل جو کسی رسول کی صداقت میں قادح ہو سکتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ یہ سب کچھ لکھکر فرماتے ہیں کہ جناب ابو طالب کی محرومی کا باعث ان باتوں میں سے کوئی بات نہ تھی وہ تو بدل وجان آپ کے لائے ہوئے دین کی برتری کے لئے ہمیشہ ساعی رہے مگر تقدیر یہاں دوسرے راستہ سے آئی یعنی آبائی دین کے ترک پر قریش کا طعنہ ان سے برداشت نہ ہو سکا۔ تصدیق موجود ہے معرفت تامہ حاصل ہے، قدم قدم پر جاں نثاری ہو رہی ہے یہ سب کچھ ہے مگر التزام طاعت کا ابھی ارادہ نہیں ہے۔ کیوں؟ تقدیر عصبیۃ جاہلیۃ اور قومی غیرت اور مذہبی جمود کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ اور آغوش اسلام میں آنے نہیں دیتی۔

ان سب امور کے سوا ذلیل طبع افراد کے سامنے کبھی معمولی سے نفع وضرر کا سوال بھی آجاتا ہے اس لئے مقتضائے تصدیق پورا نہیں ہوتا۔

فَتَرَی الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ یُّسَارِعُوْنَ فِیْهِمْ یَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَیُصْبِحُوْا عَلٰی مَاۤ اَسَرُّوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِیْنَ۔ (مائدہ) — آپ دیکھئے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے ان میں دوڑ کر ملتے ہیں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر زمانہ کی گردش نہ آجائے، سو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی فتح ظاہر فرمادے یا کوئی حکم اپنے پاس سے بھیجے تو اپنے دل کی (ان) پوشیدہ باتوں پر پچھتانے لگیں۔

ان تمام تفاصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ بسا اوقات تصدیق قلبی میسر آجاتی ہے مگر انسان کی طبعی غیرت یا قومی عصبیت ونخوت یا عزت ومال کی تھوڑی سی طمع اور اسی قسم کے دوسرے موانع باطنی انقیاد اور التزام طاعت کے مانع رہتے ہیں۔ نعوذ باللہ من شر الشیطان وشرکہ۔

ایمان اور ضروریات دین یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس تصدیق وانقیاد کا دائرہ صرف ذات وصفات کے مسائل یا رسالت کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ رسول کے ہر ہر قول اور ایک ایک اشارہ کو شامل ہے ارشاد باری ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (بقرہ) — اے ایمان والو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے۔

---

[1] کتاب الایمان ص ۷۷، [2] ایضاً ص ۱۰۶۔

حضرت مجاہدؒ اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت مسلمانوں کو شریعت کے ہر ہر جزو پر التزام طاعت کی دعوت دیتی ہے، خواہ وہ فرائض ہوں یا مستحبات، واجب علی الکفایہ ہوں یا علی الاعیان۔ اگر اسلام کے فرائض علی الاعیان ہیں تو اعتقادِ فرضیت کے ساتھ ہر ہر شخص پر اس کا ادا کرنا بھی فرض ہوگا اور اگر واجب علی الکفایہ ہیں تو اس کے وجوب کا اعتقاد ضروری ہوگا اور اگر مستحبات ہیں تو اس کے استحباب کا اعتقاد لازم ہوگا۔ غرضکہ جس چیز کا دینِ محمدی میں داخل ہونا بداہتہً معلوم ہو چکا ہے وہ سب ایمانیات میں داخل ہیں اور کیوں نہ ہوں کیا ایمان رسولِ خدا کی مطلقاً فرمانبرداری کا نام نہیں؟ کیا التزامِ طاعت میں بھی کوئی تفصیل ہے؟ اگر رسولؐ کا فرمان اس لئے واجب العمل ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پیغمبر ہے جو کہتا ہے وہ حق ہی کہتا ہے تو پھر انقیاد و تسلیم کا دائرہ اس کے سب اوامر و نواہی پر کیوں محیط نہ ہو، ہاں یہ ضرور ہے کہ زمانۂ رسالت میں چونکہ وسائط نہ تھے، ہر بات براہِ راست سنی جاتی اور دریافت کی جاتی تھی اور اگر وسائط تھے بھی تب بھی اس کی تحقیق بلا واسطہ ممکن تھی اس لئے التزامِ طاعت بلا استثناء لازم تھا لیکن بعد میں سند کا طویل سلسلہ حائل ہو گیا۔ جرح و تعدیل کے بے شمار مباحث نے احادیث میں ضعیف و قوی کی تقسیم پیدا کر دی اس لئے اب یہ بحث قائم ہو گئی کہ کن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اور کیا چیزیں ایمانیات میں داخل نہیں۔ جواب اب بھی وہی ہے۔ یعنی جو فرمانِ رسول ہے اس سب کا ماننا فرض ہے مگر اب اس کا ثبوت کیا ہے کہ یہ بات درحقیقت رسولِ خدا کی فرمودہ بھی ہے؟ اس لئے علماء نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جس چیز کا دینِ محمدی میں ہونا اتنا روشن ہو جائے کہ محتاجِ دلیل نہ رہے ان سب کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ اسی کو ضروریاتِ دین کہا جاتا ہے۔ مثلاً فرائضِ خمسہ، زکوٰۃ، حج، روزہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا، آپ کے بعد کوئی دوسرا نبی نہ ہونا، عذابِ قبر، قیامت، قرآنِ کریم وغیرہ، یہ سب وہ چیزیں ہیں جس کے ثبوت میں دلائل کی حاجت نہیں بلکہ کفار بھی ان چیزوں کا دین میں داخل ہونا جانتے پہچانتے ہیں اس لئے اس کا انکار اسی طرح کفر ہوگا جیسا کہ توحید یا رسالت کا۔

ایمان اور غائبات سے اس کی خصوصیت	چونکہ علماء نے ایمان کی تعریف میں عموماً تصدیق کا ہی لفظ ذکر کیا ہے اس لئے عام طور پر ایک غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ایمان گویا تصدیق کے مرادف ہے

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن و سنت میں جہاں جہاں یہ لفظ مستعمل تھا اس کی تشریح کے لئے بس تصدیق کا لفظ کافی سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ان ہر دو لفظوں میں بہت بڑا فرق ہے اگر اس کی رعایت نہ کی جائے تو ان احادیث و آیات کی اصل مراد ہی ہاتھ نہیں آسکتی۔ حافظ ابنِ تیمیہؒ کا خدا بھلا کرے جنہوں نے اس ضروری فرق کو بیان فرما کر ان بے شمار آیات و احادیث کے معانی سے حجابِ غفلت اٹھا دیا ہے، اور

ان کی صحیح مرادیں ہمارے سامنے واضح کردی ہیں. ضروری ہے کہ پورے اعتبار کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا جائے. ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لئے امانت واعتماد کے معنیٰ اس میں ہمیشہ ملحوظ رہتے ہیں. لفظِ تصدیق کے مادہ میں چونکہ یہ خصوصیت نہیں ہے اس لئے ہر خبر میں خواہ وہاں مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو تصدیق کا لفظ یکساں مستعمل ہو سکتا ہے، ایمان کے معنیٰ بھی گو تصدیق کے ہیں مگر اس کا استعمال صرف ان خبروں تک محدود رہیگا جو اپنی چشم دیدنہ ہوں بلکہ عدم موجودگی کی ہوں کیونکہ یہاں اگر تصدیق کی جائے گی تو وہ صرف مخبر کی امانت و دیانت، اس کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کی جائے گی. اسی لئے اگر ایک شخص طلوعِ آفتاب یا فوقیتِ آسمان کی خبر دیتا ہی تو اس کے جواب میں "آمنتُ" نہیں کہہ سکتے، یا دو شخص اگر ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہیں تو لغتہً ایک دوسرے کی تصدیق کے لئے "صدق احدھما صاحبہ" کہا جاتا ہے "امن لہ" نہیں کہا جاسکتا. اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں تصدیق کے لئے دوسرے پر اعتماد و وثوق کی کیا ضرورت ہے، یہ خود اپنے مشاہدہ کی خبر ہے. اس لئے یہاں ایمان کا لفظ استعمال کرنا صحیح نہیں.

اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپس آکر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں جب اپنے بھائی کے قتل کا غلط افسانہ عرض کیا تو "وما انت بمومن لنا" کہا "وما انت بمصدقٍ لنا" نہیں کہا. چونکہ یہ واقعہ بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کی عدم موجودگی میں تیار کیا گیا تھا، اس لئے اگر وہ اس کی تصدیق کر سکتے تو صرف ان کے اعتماد و وثوق کی بنا پر کر سکتے تھے لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر چونکہ ان کو اعتماد نہیں تھا اس لئے اس بے اطمینانی و بے اعتمادی کے موقعہ پر "وما انت بمومن لنا" سے زیادہ خوبصورت لفظ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا. اب اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ہمارے بیان کی تصدیق ہو تو کیونکر خود آپ تشریف فرما نہ تھے اور ہم پر آپ کو اطمینان و اعتماد نہیں، لیکن بات یہ ہے کہ ہیں ہم سچے.

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں حضرت لوط علیہ السلام کی تصدیق کو قرآنِ کریم نے اسی لفظِ ایمان سے ادا کیا ہے کیونکہ انہوں نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان کی تصدیق صرف ان کے اعتماد پر کی تھی. ارشاد باری تعالیٰ ہے "فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ" یہاں بھی "فصدّق لہ لوط" نہیں فرمایا.

غائبات اور ایمان کی اسی خصوصیت کو سورۂ بقرہ میں "یؤمنون بالغیب" کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے. یہاں غیب کا لفظ صرف بطورِ بیان واقع نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے ہے کہ ایمان کا تعلق صرف غائبات کے ساتھ ہے. مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے.

اگر یہ حقیقت پورے طور پر سمجھ لی جاتی تو اخبارِ غائبہ میں بحث و تمحیص کا ایک مرحلہ بڑی حد تک ختم ہو جاتا۔ ناواقف صاحبان ابھی تک یہ نہیں سمجھے کہ ایمان کا تعلق ہے تو کس چیز سے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ دین کے جملہ غائبات پہلے اس طرح معقول بنائے جائیں کہ پھر ان کی تصدیق کے لئے اعتمادِ رسول کا واسطہ ہی نہ رہے اور یہ نہیں جانتے کہ دلائل کی بحث سے گذر کر صرف رسول کے اعتماد پر اس کے اقوال و افعال کے تسلیم کر لینے کا نام ہی تو ایمان ہے۔ اسی تسلیم و رضا میں انسانی عقول کی آزمائش ہے۔ پختہ کار جانتا ہے کہ ایک صادق القول پر اعتماد کرنے سے بڑھ کر کوئی اور دلیل اطمینان بخش نہیں ہو سکتی مگر ایک خام کار اپنی نارسائی اور بے شعوری کے باوجود دلائل کے بغیر شفا حاصل نہیں کرتا۔

حالانکہ دلائل کا راستہ سرتاسر تردد و شبہ کا راستہ ہے، عقلِ انسانی اگر غائبات پر ایک طرف کوئی دلیل قائم کر بھی لے تو دوسری عقل اس کے خلاف پر دلائل قائم کرنے سے عاجز نہیں رہ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک عقلاء میدانِ بحث میں کبھی کسی امر پر متفق نظر نہیں آتے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف دلائل کا دروازہ کھٹکھٹاتے نظر آتے ہیں۔ آئے دن ان کی تحقیقات کی دنیا بدلتی رہتی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اسی ایک عالمِ جہالت سے دوسرے عالمِ جہالت کی طرف منتقل ہونے کا نام (ریسرچ) اور تحقیق رکھ لیا جاتا ہے کاش کہ صاحبِ وحی کی ریسرچ پر اعتماد و وثوق کر لیتے تو یہ عمرِ عزیز ساحل کی تلاش میں یوں مفت برباد نہ ہوتی حقیقت کا راستہ شریعت نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا ہے۔ اب جو کام ہمارا رہ جاتا ہے وہ اس پر چل کر منزلِ مقصود کو پہنچ جانا ہے اور بس۔

ایمان بالغیب کا راستہ بس یہی ایک راستہ ہے جس میں روح کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے ماسوا جس قدر راہیں ہیں وہ تذبذب کی راہیں ہیں، تردد کی راہیں ہیں، نہ روح کے لئے ان میں کچھ تسلی ہے نہ نفس کو کچھ تشفی۔

اِنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا	یہ ہے میرا سیدھا راستہ اس پر چلو، دوسرے اور منحرف راستوں پر
السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۔	مت چلو کہ وہ تمہیں اس بڑی شاہراہ سے جدا کر دیں گے۔

مذکورہ بالا بیان کا مقصد غور و فکر کی راہ بند کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اس کا ایک دائرہ بتلانا ہے اس کا نام عقل کا تعطل نہیں بلکہ طریقِ استعمال کی صحیح تعلیم ہے آیات آفاقی و انفسی کا دائرہ کیا کم ہے کہ اسے چھوڑ کر عالمِ غائبات پر اٹکل کے تیر چلائے جائیں جو دار العمل ہے اس میں خوب غور کرو اور جو دار الجزاء ہے اُسے احکم الحاکمین کے حوالہ کر دو۔

عالمِ غیب اور دلائل | جب تک ایمان کا مقامِ انقیاد میسر نہیں آتا۔ آپ کو حجت بازی کا موقعہ رہتا ہے۔

لیکن جب رسالت کی تصدیق دلیل یا بے دلیل حاصل ہو گئی تو اب انقیادِ باطن کا یہ نازک مقام زیادہ لن ترانیوں کا متحمل نہیں رہتا اور آپ کا صرف ایک ہی فرض رہ جاتا ہے کہ رسول کہے اور آپ خاموش سنیں، وہ حکم دے اور آپ مانیں اور کیوں نہ مانیں اگر قلب طوقِ غلامی پہن چکا ہے تو زبان کو سرتابی کا حق کیا ہے۔ بقول غالب ؎

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو   نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

رسول کی تصدیق کا بھی دعویٰ ہے پھر بات بات پر شبہات اور حجت بازی کی خلش بھی جاری ہے کیا بیک وقت یہ دو متضاد باتیں نہیں؟ کیا وثوق اور اعتماد اسی کا نام ہے کہ رسول جو کہتا ہے اس کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ دلائل و براہین سے وہ ہمارا منہ بند نہ کر دے۔

وَيَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالرَّسُوْلِ وَ	اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ کو اور رسول کو مانا اور ہم
اَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ	ان کے فرمانبردار بن گئے۔ اس کے بعد پھر ان میں کی ایک جماعت
ذٰلِكَ وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ۔ وَاِذَا	پھر جاتی ہے، اور وہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔ جب ان کو
دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا	بلایا جاتا ہے اللہ اور رسول کی طرف تاکہ ان میں فیصلہ کرے
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ	تب ہی ایک فرقہ ان میں منہ موڑ لیتا ہے اگر ان کو کچھ ملتا ہو تو اس کی
الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ۔ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ	طرف اور اس کے چلے آئیں قبول کر کے کیا ان کے دلوں میں روگ
مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ	روگ ہے یا دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ۔ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ	اور اس کا رسول بے انصافی کرے گا کچھ نہیں وہی لوگ بے انصاف
الظّٰلِمُوْنَ۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ	ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہی تھی کہ جب اللہ اور رسول
اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ	کی طرف ان میں فیصلہ کے لئے بلائے جائیں تو کہیں
اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ	ہم نے سنا اور حکم مان لیا۔ اور کامیاب یہی لوگ
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (نور)	ہیں۔

اشاعرہ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان اسی بے دلیل انقیاد و اطاعت کا نام ہے۔ (اتحاف ج ۲ ص ۲۴۰)

اب آپ یہ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ ایمان کا وجود ذہنی یا شرعی تصدیق کوئی معمولی تصور نہیں ہے جس کی حیثیت صرف ایک خواب و خیال کی سی ہو بلکہ قلبِ انسانی پر یہ وہ نقش ہے جو ایک لمحہ میں آبائی عقائد کے سب نقوش محو کر دیتا ہے۔ زمانہ جاہلیت کے مفاخر آنکھوں میں معائب

نظر آنے لگتے ہیں حتیٰ کہ طعام و شراب، وضع، قطع، رفتار و گفتار سب میں ایک عظیم تبدیلی رونما ہو جاتی ہے بلکہ سمع و بصر ذوق و شم یعنی حواسِ خمسہ کی دنیا کی دنیا منقلب ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جو نغمہ پہلے دلکش تھا جو صورت پہلے دلفریب تھی، جو کھانا لذیذ معلوم ہوتا تھا، جو خوشبو بھلی لگا کرتی تھی، اب اسی نغمہ میں وہ دلکشی، اسی صورت میں وہ دلبری، اسی کھانے میں وہ لذت، اسی خوشبو میں وہ کشش باقی نہیں رہتی مدتوں کی صحبت سے طبیعت اگر کبھی مچلتی بھی ہے تو دل اندر ہی اندر سمجھانے لگتا ہے اور آخر تصدیقِ قلبی کی مضبوط کڑیاں آئینِ اسلام سے اِدھر اُدھر جانے نہیں دیتیں۔ نفس چاہتا ہے کہ قدیم لذائذ کا پھر مزہ لوٹے مگر صفتِ انقیاد کا ذائقہ انھیں بے مزہ بنائے دیتا ہے۔ اسی لئے ہمارے فقہاء نے کفر کے بعد اسلام کو ایک حیوٰۃ نو سمجھا ہے اور کفر و اسلام پر بہت سے ایسے احکام متفرع کر دیئے ہیں جو حقیقی موت و حیات پر ہو سکتے ہیں۔ اسی لئے کفر و اسلام کی یہ معمولی تبدیلی انسان کے آخرت کی تبدیلی بن جاتی ہے اگر کسی کو تمنا ہے کہ وہ عالمِ نقمت کو عالمِ نعمت سے اور عالمِ عذاب کو عالمِ ثواب سے بدل دے تو اس کو چاہئے کہ آج عالمِ کفر کو عالمِ اسلام سے بدل لے۔ قدرت کے اس دستِ فیاض پر قربان جس نے عالمِ فانی کی اس ترمیم سے عالمِ جاودانی کی ترمیم کا وعدہ فرما لیا ہے بلکہ اس ابدی مقام کو اس عارضی ترمیم کا تابع بنا دیا ہے کیا اب بھی آپ سمجھ گئے کہ تصدیقِ قلبی کسے کہتے ہیں اور ایمان کا وجودِ ذہنی کیا ہے؟

ایمان کا وجودِ عینی ایمان کا لفظی اور ذہنی وجود آپ سن چکے یہ وجود جب اور رسوخ و پختگی اختیار کر لیتا ہے تو پھر یہی ایمان جو اس منزل تک صرف ایک معنیٰ تھا اب رفتہ رفتہ شکل و صورت اختیار کرنے لگتا ہے۔

اربابِ حقائق کے نزدیک تو معانی کا تجسد ثابت شدہ حقیقت ہے اور موجودہ تحقیقات کے مطابق بھی آج وزن جو در حقیقت مادہ کی صفت تھی حرارت کے لئے ثابت ہو چکی ہے بلکہ اس کے وزن کے لئے ایک مقیاس الحرارت بھی تیار کر لیا گیا ہے اور اب بآسانی ہر شخص اپنی حرارت کا وزن کر سکتا ہے۔ اسی طرح آواز کو مدت تک محض ایک معنیٰ تصور کیا گیا تھا جو ہوا میں آتی اور فنا ہو جاتی ہے مگر حال کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ عالم کی پیدائش سے لیکر آج تک جتنی اصوات، اس (فضا) میں نکلیں ہیں وہ سب کی سب محفوظ و موجود ہیں اور ان سے استفادہ کی سعی ہنوز جاری ہے۔ ریڈیو کی محیر العقول ایجاد کی بنیاد یہی جدید اکتشاف ہے۔ یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ تحقیقاتِ عصریہ باوجود اس تمام جد و جہد کے اب تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکیں جہاں ہمارے اربابِ حقائق کی نظریں آج سے سینکڑوں سال پیشتر پہنچ چکی تھیں۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ فتوحاتِ مکیہ میں اصوات کے صرف وجود کی تصریح نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ان کی صورتوں کے بھی قائل ہیں اور یہ بھی کسی دلیل سے نہیں

بلکہ اپنے چشم دید مشاہدہ ہے۔ دیکھئے کہ سائنس اپنی اس برق رفتاری کے باوجود کب اس مقام تک پہنچتی ہے
اسی طرح ایمان بھی ابتداءً گو تصدیقِ قلبی کا نام ہے مگر یہ تصدیق اعمالِ صالحہ کے آبیاری سے نشوونما پاکر ایک نور کی سی شکل اختیار کرلیتی ہے اور یہی نورِ ایمان کا وجودِ عینی کہلاتا ہے۔ حضرت لقمان کی وصیت میں منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا اے بیٹے جس طرح کھیتی بلا آبیاری کے سرسبز نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح ایمان بلا علم وعمل کے پختہ نہیں ہوسکتا[1]

امام ابن ابی شیبہ اور امام بیہقی اور امام ابو عبید اور امام اصبہانی نے اپنی اپنی کتابوں میں حضرت علیؓ سے روایت کیا ہے کہ پہلے ایمان ایک سفید نقطہ کی شکل پر قلب میں نمودار ہوتا ہے اور جتنا ایمان بڑھتا جاتا ہے اسی قدر یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب ایمان مکمل ہوجاتا ہے تو سارا قلب سفید ہوجاتا ہے۔ یہی حال نفاق کا ہے کہ پہلے سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بالآخر تمام قلب سیاہ ہوجاتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم ایک مومن کا قلب نکال کر دیکھو تو بالکل سفید پاؤ گے اور ایک منافق کا قلب دیکھو تو بالکل سیاہ دیکھو گے[2] لیکن معانی کے اس تجسد کے مشاہدہ کے لئے وہی تیز آنکھیں درکار ہیں جن کا ذکر اس آیت میں موجود ہے۔ فبصرك اليوم حديد۔

صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ جس وقت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا سینۂ مبارک شق کیا گیا تھا تو ایک سنہری طشت ایمان وحکمت سے لبریز لایا گیا اور اسے آپ کے صدرِ مبارک میں لوٹ دیا گیا تھا۔ عجب نہیں کہ اس سے مراد ایمان کا یہی وجودِ عینی ہو۔ انبیا کے کمالات اکتساب کا ثمرہ نہیں ہوتے بلکہ قدرت اسی طرح ان کے منازلِ کمالات خود طے کرادیتی ہے۔

یہ نورِ تصدیق جس قدر رسوخ پیدا کرتا جاتا ہے اتنا ہی خواہشاتِ نفسانیہ کے حجابات اٹھتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں اسی قدر یہ نور اور منبسط ہوتا جاتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ شدہ شدہ یہاں تک پھیل جاتا ہے کہ انسان کے تمام جوارح کا احاطہ کرلیتا ہے اور یہ مومن گویا خود ایمانِ مجسم بن جاتا ہے جسے دیکھ کر بے ساختہ خدا یاد آنے لگتا ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن غنم (بفتح غین وسکون نون) اور اسماء بنت یزید فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب سے بہتر بندے وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو خدا یاد آجائے۔[3]

اس نور کی وسعت کی بقدر اوامرِ الٰہیہ کے امتثال اور محظوراتِ شرعیہ سے اجتناب کا جذبۂ عمل پیدا

---

[1] اتحاف ج ۲ ص ۲۳۸ [2] اتحاف ج ۲ ص ۲۵۹ [3] مسند احمد و شعب الایمان۔ مشکوۃ شریف باب حفظ اللسان والغیبۃ

ہوجاتا ہے۔ اخلاقِ رذیلہ زائل ہوجاتے ہیں اور اخلاقِ فاضلہ اس کی جگہ لے لیتے ہیں اور قلب کو وہ وسعت میسر آجاتی ہے کہ سارا عالم اس کے پہلو میں مثل ایک نقطہ کے نظر آنے لگتا ہے۔ کیوں نہ ہو کہ مومن کا یہ وہ قلب ہے جو اس کے پروردگار کی تجلی گاہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ملاحظہ فرمایئے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰہُ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ — بھلا جس کا سینہ اللہ تعالیٰ نے دینِ اسلام کے لئے کھولدیا

فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّہٖ — سو وہ روشنی میں ہے اپنے رب کی طرف سے۔

پھر دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ — جس کسی کی ہدایت کا اللہ ارادہ کرتا ہے اس کا سینہ

صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ۔ — اسلام کے لئے کھول دیتا ہے۔

یہ شرحِ صدر بھی گو ایک معنی ہیں جس کا مطلب صرف اسلام کا فراخدلی سے بلا پس و پیش قبول کرلینا سمجھا جاسکتا ہے مگر اس معنی کا بھی ایک وجودِ عینی ہے وہ صرف یہ معنوی فراخی نہیں بلکہ وہ وسعت ہے جو مومنِ کامل اپنے قلب میں حسّاً بھی مشاہدہ کرتا ہے[1] اب حضرت رسالت کے حق میں شرحِ صدر کا جو مصداق ہوسکتا ہے اس کا خود اندازہ کرلو۔ قرآن امتنان کے لہجہ میں فرماتا ہے۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ — کیا ہم نے آپ کا سینہ نہیں کھولدیا۔

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ جب نورِ یقین قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں ایک فراخی اور کشادگی نمودار ہوجاتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ اس کی کچھ علامت بیان فرمایئے۔ ارشاد ہوا اس کی تین علامتیں ہیں۔

(۱) آخرت کی طرف میلان۔

(۲) دنیا سے نفرت اور یکسوئی۔

(۳) موت سے پیشتر اس کی تیاری۔ [2]

یہ ہے ایمان کا وجودِ عینی۔ یہی دعوتِ انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہے اور اسی پر نجاتِ مطلقہ (یعنی بلا عذاب) اور فلاحِ ابدی کا مدار ہے۔ اس ایمان کے بعد مومن کے کان رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کی پُرکیف صدا سننے لگتے ہیں۔ اس مومن کو اگر جلا کر خاک بھی کردیا جائے، اس کے جسم و جان کو ریزہ ریزہ کردیا جائے تو بھی اس کے ذرہ ذرہ سے اسی ایمان کی صدا بلند ہوگی۔ یہ ایمان صرف ذہنی اور عقلی نہیں رہتا بلکہ دیگر

---

[1] علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے اس شرحِ صدر کی تفصیل میں سفر السعادۃ میں مستقل ایک فصل لکھی ہے مراجعت کی جائے

[2] شعب الایمان للبیہقی۔ مشکوٰۃ شریف

محسوسات کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے اس کا نور آنکھیں دیکھتی ہیں۔

سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ   سجدہ کے اثر سے ان کے چہروں پر ان کی علامت ظاہر ہے

قلب اس کی حلاوت اور شیرینی اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسا کہ زبان مٹھائی کی۔ یہ ایمان فطرتِ انسانی کا ایک مقتضا بن جاتا ہے اور جس طرح فطری خصائل زوال پذیر نہیں ہوتے اسی طرح یہ ایمان بھی زوال کے خطرہ سے بڑی حد تک مامون رہتا ہے۔

ہرقل جو بہت بڑا عالم کتاب تھا اسی وجودِ عینی کی طرف اشارہ کرتا ہے اس نے اپنے دوران مکالمہ میں ایک سوال ابوسفیان سے یہ بھی کیا تھا کہ اس پر ایمان لا کر کیا کوئی شخص مرتد ہوتا ہے، اس پر ہزار عداوت کے باوجود جو جواب ابوسفیان کی زبان سے نکلا وہ صرف نفی محض میں تھا۔ یہ سن کر ہرقل نے جو کلمات کہے اس کی علمی گہرائی کا خوب پتہ دیتے ہیں۔

وکذٰلک الایمان اذا خالطت   یعنی ایمان ایسی ہی چیز ہے کہ جب اس کی بشاشت اور تراوٹ دلوں میں
بشاشتہ القلوب۔   رچ جاتی ہے تو پھر نکلا نہیں کرتا۔

یہ ایمان کے وجودِ عینی ہی کی طرف اشارہ ہے اسی کا نام ایمانِ کامل ہے اسی کو معرفت بھی کہا جاتا ہے علوم ابتداء میں صرف علوم رہتے ہیں مگر کچھ رسوخ کے بعد قلب میں اپنا ایک رنگ پیدا کر دیتے ہیں جس کے بعد قلب میں لطف اندوزی یا انقباض کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے اس وقت ان کا نام حال ہو جاتا ہے پھر اگر ترقی کر کے یہ لون اور رسوخ اور پختگی اختیار کر لیتا ہے تو اسی کا نام معرفت بن جاتا ہے اور اسی کو مرتبہ احسان سے تعبیر کر سکتے ہیں یہ علوم کی انتہائی معراج ہے۔ پھر اس معرفت میں بے نہایت مراتب و مدارج ہیں اور ان ہی مراتب کے لحاظ سے مومنین کا تفاضل ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات)   عزت اللہ کے یہاں اسی کو ہے جو تم میں کا زیادہ پرہیزگار ہو۔

عمل و ایمان کا توازن ایک ظاہر بیں صرف عمل پر نظر رکھتا ہے اور اسی پر افضلیت و مفضولیت کا فیصلہ کر ڈالتا ہے، مگر حقیقت شناس جانتا ہے کہ اصلی روحِ انقیاد باطن ہے اور عمل اس کا صرف ایک قالب اور ڈھانچا ہے اس لئے اس کی نظر قوتِ ایمانیہ پر ہوتی ہے اور یہی اس کا معیارِ فضیلت رہتا ہے صحیح احادیث میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خواب مذکور ہے کہ گویا کنویں پر ایک ڈول پڑا ہے۔ پہلے میں نے جب تک خدا نے چاہا اسے کھینچا میرے بعد پھر اسے ابوبکرؓ نے لیا اور ایک دو ڈول نکالے مگر کچھ ضعف کے ساتھ پھر اُن سے عمر فاروقؓ نے لیا تو اس قوت سے ڈول کھینچے کہ اونٹ والوں نے اپنے اونٹوں کے پانی پی کر بیٹھنے کی جگہ وہاں تیار کر لی۔ بعض علماء نے یہاں ضعف سے ابوبکرؓ کی مدتِ خلافت مراد لی ہے اور بلاشبہ یہ مدت بہ نسبت

خلافتِ عمرؓ کے نہایت قلیل تھی مگر کسی نے یہ بھی تسلیم کر لیا ہے کہ جو علمی شدت و شوکت عہدِ فاروقی میں نظر آتی وہ عہدِ صدیقی میں ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ شاید اسی خصوصیت کے پیشِ نظر حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کے اسلام کے بعد ہم ہمیشہ معزز رہے اور کبھی ذلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

اب اگر تسلیم کر لو کہ علمی قوت کے لحاظ سے عمر فاروق حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ تھے تو یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ قوتِ ایمانی کے اعتبار سے حضرت ابوبکر حضرت عمرؓ سے کہیں فائق تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ انتقال پر عمر فاروقؓ کی بے صبری و اضطراب اور حضرت ابوبکرؓ کا صبر و استقلال تاریخی واقعہ ہے جب قولِ علیہ جواب دیدیتے ہیں تو ایسے ہی وقت قوتِ ایمانیہ کا امتحان ہوتا ہے اگر کہیں حضرت صدیقِ اکبرؓ کی قوتِ ایمانیہ نے فاروقِ اعظمؓ کو نہ سنبھالا ہوتا تو معلوم نہیں کہ اس جاں گداز واقعہ نے ان کو کتنا اور مدہوش بنا دیا ہوتا۔ خدا ہی جانے کہ اس ہنگامۂ بے صبری میں ابوبکرؓ کی زبانی وہ چند کلمات کیا تھے جن کے بعد جلتے ہوئے سینوں کی آگ بجھ گئی۔ مدہوش عقول کو ہوش آگیا اور جو موت کا لفظ سننے پر قادر نہ تھے تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گئے، اگر ابوبکرؓ کی قوتِ ایمانیہ اس طرح قلوب کی کایا نہ پلٹ دیتی تو نہیں معلوم واقعات کہاں تک نزاکت اختیار کر لیتے۔ ایسے نازک روز میں صحابہؓ کی جماعت میں بجلی کی طرح یہ انقلاب پیدا کر دینا صدیقِ اکبرؓ کی فضیلت کی وہ بروقت دلیل تھی جس کے بعد بیعت کے لئے ہاتھ بڑھا دینا ہر مسلمان کا ایک اضطراری فرض ہو گیا تھا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ عمل و ایمان کا توازن عالم میں آشکارا ہوا تھا

صحیح احادیث میں وارد ہے کہ ساری دنیا گویا ایک دن ہے جس میں امتِ محمدیہ کا وقت صرف عصر سے غروب تک ہے اور دوسری امتوں کا فجر سے ظہر تک۔ مگر قدرت کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ مزدوری امتِ محمدیہ کو دوسری امتوں سے دوگنی ملتی ہے۔ بات وہی ہے کہ مدار قوتِ عمل پر نہیں بلکہ قوتِ ایمان پر ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ	تم سب امتوں میں اس لئے افضل ہو کہ امر بالمعروف اور
بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ	نہی عن المنکر تمہارا شیوہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے
تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ۔	کہ تم اپنے خدا پر ایمان رکھتے ہو۔

آیتِ مذکورہ نے اس بحث کا فیصلہ کر دیا کہ کچھ افراد کا نہیں بلکہ جماعات و امم میں بھی فضیلت کا قانون وہی ایک ہے اس کے بعد اگر انبیاء کی سوانح پر غور کرو تو جو مدتِ عمل خاتم النبیین کو مرحمت ہوئی وہ صرف چند سال ہیں، اور جو زمانہ حضرت نوح علیہ السلام کو ملا وہ بنصِ قرآن ہزار سال تھے پھر کون نہیں جانتا کہ فضیلت کا تاج کس کے سر ہے۔ الغرض افراد و امم و انبیاء علیہم السلام میں افضلیت کا ایک ہی قانون ہے یعنی ایمانی روح اور الٰہی معرفت بلکہ جہاں یہ روح نہیں وہاں عمل کی کوئی قیمت نہیں

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا — قیامت میں ہم کفار کے اعمال کے لئے کوئی ترازو قائم نہیں کرینگے
کیونکہ ترازو وزن کے لئے ہوتی ہے اور کافر کا عمل بے وزن ہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم ایک دوسرے خواب میں دیکھتے ہیں کہ مجھے ساری امت کے بالمقابل تولا گیا تو میرا پلا بھاری رہا پھر اس میں ابوبکرؓ کو رکھا گیا تو اسی طرح ساری امت سے وہ بھاری ہے۔ اس کے بعد پھر عمرؓ کو تولا گیا تو وہ سب سے وزنی رہے۔ یہ وزن نبی کی اسی قوت ایمانی کا تھا جس کے مقابل ساری امت ہیچ نظر آئی۔ پھر اسی مناسبت سے ابوبکر و عمر کو قیاس کرلو۔

بہرحال احادیث کا بے شمار ذخیرہ اسی طرف رہبری کرتا ہے کہ اصل قیمت انقیادِ باطن کی ہے اور پھر اسی کے بقدر عمل کا وزن اور انسان کا فضل ہے۔ [1]

ایمان اور معرفت جہم بن صفوان امام اعظمؒ کا ہمعصر صفاتِ باری تعالیٰ کا منکر تھا اور کہتا تھا کہ ایمان صرف معرفتِ قلبیہ کا نام ہے زبان سے اقرار کرنا کچھ ضروری نہیں بلکہ اس کے نزدیک اگر ایک شخص زبان سے انکار بھی کرگذرے مگر اس کو معرفتِ قلبی حاصل ہو تو مؤمن کامل رہ سکتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ تصریح فرماتے ہیں [2] کہ اس مسئلہ میں امام اعظمؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے اور یہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ اور مسائل میں بھی اس کے ساتھ آپ کے مناظرے تصانیف میں کھلے طور پر موجود ہیں [3]۔ مگر اس پر بھی بعض تنگ نظر قلم حنفیہ کے سر جہمیہ کی تہمت تھوپنے سے باز نہ آئے۔

تاریخ میں حنفیہ پر یہ پہلا ظلم نہیں بلکہ وہ اس قسم کے مظالم کے ہمیشہ تختۂ مشق بنے رہے ہیں۔ اگر ان بے محل انتسابات کے وجوہ و اسباب پر بالتفصیل روشنی ڈالی جائے تو ایک مستقل تصنیف بن سکتی ہے ہمارا مقصد اس وقت صرف یہ ہے کہ اگر تاریخ حنفیہ پر یہ جور و ستم روا رکھتی ہے تو رکھے مگر ہمارا بھی فرض ہے کہ ہم اس کی یہ ناانصافی برابر دہراتے رہیں کان اگر دلچسپی سے نہیں سن سکتے تو نہ سنیں۔

کتب کلام کی ورق گردانی کروگے تو تم کو معلوم ہوگا کہ جہمیہ کے ساتھ حنفیہ کو مرجئہ بھی کہا گیا ہے لیکن اگر ذرا تحقیق سے کام لوگے تو روشن ہوجائے گا کہ حنفیہ کا دامن اس تہمت سے بھی قطعاً پاک و صاف تھا۔ فروعی اور اجتہادی مسائل میں اگر اختلاف ہو تو ہونا چاہئے مگر غم اس کا ہے کہ دین کے وہ اصولی مسائل جن میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے اور نہ درحقیقت کوئی اختلاف تھا پھر عجلت پسند طبائع نے کیوں ان کا ایک غلط افسانہ تیار کردیا۔ خدا بھلا کرے حافظ ابن تیمیہؒ کا کہ اپنی کتاب الایمان میں وہ ایک سطر یہ لکھ گئے ہیں۔

---

[1] دیکھو کتاب الایمان ص ۱۲۷ و ۱۲۸۔ [2] ایضاً ص ۱۶۴۔ [3] دیکھو اتحاف ج ۲ ص ۲۴۲۔

ما ینبغی ان یعرف ان اکثر التنازع بین	یعنی یہ بات ضروری طور پر پیش نظر رہنی چاہئے کہ اہل سنۃ
اہل السنۃ فی ھذہ المسئلۃ ھو	والجماعت میں ایمان کے مسئلہ کے متعلق جتنے بھی اختلافات
نزاع لفظی (ص ۱۱۹ و ۸۸)	نظر آتے ہیں درحقیقت وہ صرف نزاع لفظی ہیں۔

ایک غریب عالم کی محنت اور جانفشانی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اپنی پرسکون راتوں کو دن بنا بنا کر ہزاروں صفحات کا مطالعہ کر لیتا ہے اور جب کسی نتیجہ کے لئے اس کا قلب مضطر ہونے لگتا ہے تو کسی مصنف کی ایک سطر اس کے سارے منصوبے یہ کہکر خاک میں ملا دیتی ہے ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

اب ملاحظہ فرمایئے کہ حافظ ابن تیمیہؒ ۱۱۹ صفحات میں تحقیقات کے دریا بہا دیتے ہیں اختلافات اور جانبین کے پرزور رد و قدح سے عقل متحیر رہ جاتی ہے وہ چاہتی ہے کہ کوئی راستہ تلاش کرے مگر اختلافات کے اس برق و رعد میں اسے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، اور جب آخر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اکثر حصہ صرف نزاع لفظی تھا تو تھک کر بیٹھ جاتی ہے اور اپنی اس دردسری کی فریاد کا موقعہ بھی نہیں دیکھتی۔ خوب کہا ہے، کہ علم کہاں ہے؟ کوہ کندن وکاہ برآوردن۔

اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب جنگ کچھ نہ تھی تو پھر بیکار یہ قلعے کیوں بنائے گئے۔ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ محدثین کو سارا غصہ اس پر ہے کہ جو لفظ سلف سے منقول ہوتے چلے آرہے تھے فقہاء نے ان کو کیوں ترک کیا، بالخصوص جبکہ ان کے ترک سے فرق باطل کو کچھ اعانت بھی مل گئی۔ حافظ ابن تیمیہؒ تصریح فرماتے ہیں[1] کہ جس کسی نے فقہاء کو مرجئہ میں شامل کیا ہے اس نے عقائد کے لحاظ سے نہیں کیا بلکہ صرف ان الفاظ کی وجہ سے کیا ہے جن سے مرجئہ کی موافقت کی بو آتی ہے۔

مرجئہ ایک فرقہ ہے جس کا یہ خیال تھا کہ ایمان کے لئے صرف زبانی اقرار کافی ہے اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جہمیہ نے ان سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہدیا کہ اقرار کی بھی کوئی ضرورت نہیں، صرف معرفت قلبیہ کافی ہے۔ ان فرق باطلہ کے مقابلہ میں محدثین کو ضرورت محسوس ہوئی کہ کوئی عنوان ایسا اختیار کر لیا جائے کہ وہ عنوان ہی خود ان کی تردید کا ایک اعلان بن جائے اس لئے ایمان کی تفسیر میں ہی اقرار و عمل دونوں شامل کر لئے گئے اور الایمان قول و عمل مشہور ہوگیا یعنی ایمان اقرار و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ حتی کہ شدہ شدہ جو عبارت اس مصلحت سے اختیار کی گئی تھی کچھ زمانہ کے بعد اہل سنت کے شعائر میں شمار ہونے لگی۔ اب جو شخص ایمان کی تعریف میں قول و عمل کہتا اہل سنت تھا اور جو شخص اس تعبیر کو ترک کرتا

[1] کتاب الایمان ص ۱۶۰۔

وہ صرف اس جرم میں ارجاء و جہمیت کے القاب سے متہم ہوتا۔ [1]

آج بھی اگر جماعتوں کے اختلافات پر نظر کروگے تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اس کی بناء یہی چند الفاظ تھے جن کو نااہلوں نے اصولی اختلاف بنا ڈالا ہے ع اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

ہماری بعض کتب میں امام اعظمؒ سے بھی ایمان کی تعریف میں معرفت کا لفظ منقول ہے۔ بس اتنی بات حنفیہ کی طرف جہمیت کے انتساب کے لئے بہانہ بن گئی

الایمان ھو الاقرار والمعرفۃ باللہ عزوجل والتسلیم والھیبۃ منہ وترک الاستخفاف بحقہ۔ [2]	یعنی ایمان کیا ہے؟ (۱) توحید و رسالت کا اقرار (۲) خدا تعالیٰ کی معرفت (۳) اس کے سامنے سرتاسر نیاز ہو جانا۔ (۴) اس کا خوف۔ (۵) اس کے کسی حق کو معمولی نہ سمجھنا۔

پہلے تو ہمیں امام صاحب کی طرف اس تعریف کے انتساب میں ہی کلام ہے اور اگر تسلیم کر لیا جائے تو صرف اس بات سے یہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے کہ معرفت سے امام صاحب کی وہی مراد ہے جو جہم بن صفوان کے نزدیک ہے۔ جہم کے نزدیک ایمان کے لئے نہ عمل کی ضرورت ہے نہ اقرار کی بلکہ انکار کے بعد بھی ایمان کامل رہ سکتا ہے اور یہاں اقرار کی رکنیت و شرطیت کی بحث ہو رہی ہے۔ رہ گیا انکار تو بلا اختلاف ایک بدترین کفر ہے۔ پھر جہم اور امام صاحب کے مذہب میں کیا اشتراک رہ سکتا ہے۔ بعض مصنفین نے یہاں معرفت کی تفسیر تصدیق کر دی ہے تاکہ یہ تعریف بھی مشہور کے موافق ہو جائے مگر ہمارے نزدیک اس جگہ معرفت سے وہ عام تصدیق مراد نہیں بلکہ تصدیق کا وجودِ عینی مراد ہے جسے ایمانِ کامل کہا جاتا ہے اور بلاشبہ ایمانِ کامل بلا معرفتِ تامہ حاصل نہیں ہوتا۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے ایمان میں بھی تقسیم پیدا کر دی ہے۔ [3] (۱) ایمان واجب (۲) ایمان مستحب۔ ایمان واجب ہر شخص پر فرض ہے اور اس مومن کا شمار زمرۂ ابرار اور اصحاب الیمین میں ہے۔ ایمان کی دوسری قسم مقربین و سابقین کا حصہ ہے۔ مذکورہ بالا تعریف اسی قسم ثانی کی ہے۔ جیسا کہ تعریفِ مذکور کے بقیہ الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ عبد القادر بغدادی نے جمہور ائمہ و محدثین کا مذہب نقل کر کے اس کی تصریح کی ہے کہ ان کے نزدیک بھی ایمان کے مراتب ہیں اور اعلیٰ مرتبہ یہی معرفت ہے۔

اعلی الایمان معرفۃ بالقلب اقرار باللسان وعمل بالارکان یزید بالطاعت وینقص بالمعصیۃ [4]	یعنی ایمان کا اعلیٰ مرتبہ۔ معرفت قلبیہ۔ زبان سے اقرار۔ اور اعضاء کا عمل پیرا ہونا۔ یہ ایمان طاعات سے ترقی پذیر ہوتا ہے اور معاصی سے ناقص بھی ہوتا ہے۔

[1] دیکھو کتاب الایمان ص ۱۲۳ و ۱۱۰ [2] اتحاف ج ۲ ص ۲۴۲ [3] کتاب الایمان ص ۶، ۹ [4] اتحاف ج ۲ ص ۲۵۴

اس کے سوا حافظ ابن تیمیہ نے خود محدثین سے ایمان کی تعریف میں معرفت کا لفظ نقل کیا ہے بلکہ جمہور ائمہ کے بھی الفاظ پیش کئے ہیں۔ سلہ

اب ذرا انصاف کرو کہ اگر ایمان کی تعریف میں ایک لفظِ معرفت استعمال کر لینا ہی کوئی جرم تھا تو کیا امام صاحب ہی اکیلے اس جرم کے مرتکب تھے۔ پھر ایک حنفیہ ہی کو کیوں ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

اسی طرح اگر حنفیہ نے ایمان میں عمل کو داخل نہیں کہا تو اس کے لئے بھی ان کے پاس دلائل ہیں مگر کیا اتنی سی بات سے ان کو مرجئہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے؟ حالانکہ مرجئہ کے نزدیک ایمان کے لئے معاصی کچھ مضرت رساں نہیں اور حنفیہ کے نزدیک اعمال مکملِ ایمان ہیں اور اگر صرف لفظی گرفت ہی کوئی چیز ہے تو کیا عمل کو جزءِ ایمان بنانے سے معتزلہ و خوارج کو تقویت نہیں ہوتی (معتزلہ و خوارج محدثین سے بھی ایک قدم آگے ہیں اور عمل کو ایسا جزء کہتے ہیں کہ ایک عاصی ان کے نزدیک مومن کی فہرست سے خارج ہو جاتا ہے) اب اگر ایمان میں عمل داخل نہ کرنے سے مرجئہ اور جہمیہ کو تقویت ہوتی ہے تو عمل کو جزء بنانے سے معتزلہ و خوارج کو شہ ہوتی ہے پھر محدثین کے غیظ و غضب کا نزلہ حنفیہ ہی پر کیوں گرتا ہے۔ فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون۔

اعمال کی حیثیت ایمان میں یہ بحث نہایت دلچسپ ہے کہ عمل کی ایمان میں کیا حیثیت رہنی چاہیے۔ محدثین و فقہاء کا یہاں بھی خوب نزاع ہے فریقین کے دلائل ذکر کرنے کا یہ محل نہیں، ہمارے نزدیک یہاں حقیقتِ حال امام غزالیؒ کی ایک تحقیق ہے اور بس وہی فیصلہ کن ہے اس کے بعد الفاظ خواہ وہ رہیں جو محدثین استعمال کرتے ہیں یا وہ جو فقہاء نے استعمال کئے ہیں (یعنی اعمال کو جزء کہو جو کہ محدثین کا مذہب ہے یا ایمان سے خارج قرار دو جیسا کہ فقہاء کا مسلک ہے)۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:۔

کہ باطن و ظاہر بالکل دو جداگانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ ہر دو کا باہمی ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے اگر اعتقادِ باطن، اعمالِ ظاہرہ کا مقتضی ہوتا ہے تو اعمالِ ظاہرہ اعتقادِ باطن کے ممد و معاون رہتے ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم کرنا انسانیت کا اولین فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ اقتضاء ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے لئے مجسم رحمت و دلسوزی بن جائے۔ پھر جب اس کے اعضاء و جوارح اس دلسوزی کے لئے حرکت کرنے لگتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اعتقاد میں ایک نئی روح داخل ہو رہی ہے اور جتنا جتنا اس کا یہ عمل تلطف و ترحم ترقی کرتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں شفقت و رحمت کا جوش اور پیدا ہوتا ہے۔ یا اگر ایک شخص تواضع

سلہ دیکھو کتاب الایمان ص ۱۶۰ و ۶۷، ۵۹ و ۵۸۔

کو نیک خصلت سمجھتا ہے تو اس کا مخلوق سے تواضع کا معاملہ یقیناً اس کے اس اعتقاد میں اور پختگی کا باعث بنتا ہے۔ غرض صفاتِ قلبیہ جس قدر بھی ہیں سب کا حال یہی ہے پہلے وہ اعضاءِ انسانیہ کو جنبشِ عمل کے لئے مضطر کرتی ہیں اور جب جوارح مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں تو ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کرتے رہتے ہیں۔ ایمان و اعمال کا حال بھی اسی پر قیاس کر لو۔ ایمان ایک عقیدہ ہے اور اس کا اقتضاء یہ ہے کہ جوارح توحیدِ خالص اور تصدیقِ رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دیں اور جب اعضاء اس اقتضاء کو پورا کرنا شروع کرتے ہیں تو یہ عقیدہ اور راسخ اور تر و تازہ و سرسبز ہونے لگتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں۔

لیس الایمان بالتحلی ولا بالتمنی	یعنی ایمان صرف ظاہرداری کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان
ولکنہ ما وقر بالقلب وصدقتہ الاعمال	اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال
(کتاب الایمان ص ۱۷۱)	اس کی تصدیق بھی کریں۔

اس کلام سے ان کا مقصد یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیاتِ قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ اب اگر وہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے قلبی تصدیق کی دلیل ہوگی ورنہ اس کی بدعملی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد بن جائیگی۔

محمد بن نصر مروزی نقل فرماتے ہیں کہ عبدالملک نے سعید بن جبیرؒ سے چند سوالات کئے منجملہ ان کے ایمان اور تصدیق کے متعلق بھی ایک سوال تھا انھوں نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ ایمان اللہ تعالیٰ اور ملائکہ اور رسولوں اور قیامت کی تصدیق کا نام ہے مگر تصدیق کا یہ مطلب ہے کہ قرآن کے حرف حرف پر عمل ہو اور جتنی کوتاہی رہ جائے وہ گناہ نظر آئے اس پر استغفار کرے اور آئندہ اصرار نہ ہو۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اسلام اقرار کا نام ہے اور ایمان عمل کا۔ یہ ہر دو آپس میں قرین ہیں۔ ہر شخص کا قول و عمل تولا جائے گا اگر اس کا عمل وزنی ہے تو مقبول ہوگا اور آسمان کی طرف صعود کرے گا اور اگر قول وزنی ہے تو اس کا عمل نامقبول رہے گا۔ امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ ایمان بلا اقرار صحیح نہیں ہوتا اور ایمان و اقرار بلا عمل درست نہیں ہوتے اور ان تینوں کا اعتبار بلا نیتِ حسنہ کے نہیں ہوتا۔

ان سب ائمہ کے اقوال سے ظاہر ہے کہ اعمالِ جوارح تصدیقِ قلبی کے لئے بڑی حد تک ضروری ہیں گویا اس کے لوازم ہیں۔ حضرت مجاہد روایت کرتے ہیں کہ ابوذر غفاریؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ایمان زبان سے اقرار کرنا اور اپنے عمل سے اس کی تصدیق کرنے کا نام ہے اس کے بعد آپ نے اس بیان کی شہادت میں قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ	پوری نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق و مغرب کو منہ کر لو (یعنی نماز میں)

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ ؁ بلکہ اصل مدار ایمان پر ہے۔

ایمان و عمل کے اس نازک ارتباط کو صرف ایک اہلِ سنت نے سمجھا ہے۔ مرجیہ و جہمیہ نے ان ہر دو کو ایسا علیحدہ کر دیا کہ تصدیقِ قلبی کے لئے عمل کی کوئی ضرورت نہ سمجھی اور معتزلہ و خوارج نے ان کو ایسا مدغم بنا دیا کہ عملی کوتاہی کو تصدیقِ قلبی کا ضعف قرار دیدیا۔ اسی اختلاف پر یہ بحث قائم ہو گئی کہ مرتکبِ کبیرہ کا کیا حکم ہونا چاہئے۔

تصدیقِ قلبی پر معصیت کا اثر قدرت جو فطرتِ انسانی کی سب سے بڑی رازداں ہے خوب جانتی ہے کہ یہ مجموعۂ عناصر اتنا پابندِ عہد نہیں رہ سکتا کہ عالمِ امکان کی نقاشی اس کی نظریں کبھی خیرہ نہ کر سکیں خواہشاتِ نفسانی کی بادِ صرصر اس کی شمعِ تصدیق کو کبھی حرکت نہ دے سکے، وہ کمزور ہے اور بہت کمزور ہے اس لئے معمولی خلاف ورزی پر اس کا نام وفاداروں کی فہرست سے نہیں کاٹتی اور اس حد تک اُسے معذور سمجھے جاتی ہے کہ وہ خود ہی نقضِ عہد کا اعلان کر گذرے۔ اربابِ ارجاء و اعتزال اگر تصدیق کے شرعی مفہوم اور ضعفِ انسانی کے دونوں پہلوؤں کی رعایت کر لیتے تو نہ اربابِ ارجاء کو صرف تصدیق، عمل کے بغیر کافی نظر آتی اور نہ رؤسا اعتزال صرف ایک عاصی کے لئے وہ سزا تجویز کرتے جو ایک باغی کے مناسب تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:۔

ولیس من الحکمت ان یفعل بصاحب الکبیرۃ مثل مایفعل بالکافر۔ ؎۱ یہ حکمت سے بعید ہے کہ مرتکب کبیرہ کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے جو کافر سے ہونا چاہئے۔

یہ سعادت صرف اہلِ سنت والجماعت کا حصہ تھا کہ ہر پہلو کی رعایت کی توفیق ان کو میسر آگئی اور ایمان و عمل کے پورے ارتباط کو انھوں نے ملحوظ رکھا۔ نہ اتنی سخت گیری کی کہ عمل کی کوتاہی کفر کے برابر ہو جائے اور نہ اتنا تساہل کیا کہ اتنا بڑا قصور تصدیقِ قلبی پر ذرا داغ بھی نہ لگائے اور یہ اعلان کر دیا کہ انسان کی بدعملی اس کے دامن پر فسق کا ایک بدنما دھبہ ہے۔

بِئْسَ الْاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ۔ (الحجرات) برا نام ہے گنہگاری ایمان کے بعد

حافظ ابنِ تیمیہؒ آیتِ مذکورہ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال نقل فرما کر لکھتے ہیں کہ اس آیت کی صحیح تفسیر یہ ہے کہ ایمان کے بعد پھر تمہارا فاسق ہو جانا بہت بری بات ہے۔ ؎۲ قرآن کریم جگہ جگہ مرتکبِ کبیرہ کو فاسق کہتا ہے۔

اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اگر ایک فاسق شخص تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو۔

؎۱ حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۷۹۔ ؎۲ کتاب الایمان ص ۹۸۔

وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا یعنی جو لوگ زنا کی تہمت لگاتے ہیں آئندہ ان کی شہادت قبول کی جائے

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ کیونکہ اس جرم کے بعد وہ شریعت کی نظر میں فاسق ٹھہر چکے ہیں۔

یہ وہ بدترین لقب ہے جسے قرآن نے ایمان کے بعد بہت ہی ناپسند کیا ہے۔ اس علو و برتری کے بعد یہ خفیف الحرکاتی نہایت نازیبا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے۔

سباب المسلم فسوق یعنی کسی مسلمان کو برا کہنا فسق کی بات ہے۔

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ یہ قبیح حرکت اس کو اس کا مستحق بنا دیتی ہے کہ اس کو فاسق کہدیا جائے

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن اور ایک فاسق برابر ہو جائیں۔

ان آیات و احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ معصیت کا ارتکاب مسلمان کو نہ تو کافر بنا دیتا ہے اور نہ اس کے دعویٔ انقیاد کو بے داغ رہنے دیتا ہے۔ وہ مومن ہے مگر فسق سے اس کا دامن ملوث ہو چکا ہے۔ اس مجسم طہارت و پاکیزگی کے لئے لازم ہے کہ نجاستِ فسق سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھے اور جو لقب اس کے مولیٰ نے اس کے لئے پسند نہیں فرمایا خود بھی اس سے متنفر رہے۔ بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔ [1]

اسلام و ایمان میں کیا فرق ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس مسئلہ پر بہت طویل بحث کی ہے مگر اس قدر منتشر ہے کہ اس کا خلاصہ نکالنا مشکل ہے۔ جہاں تک ہم نے ان کے کلام کا ملخص سمجھا ہے یہ ہے کہ لغت میں اسلام کے معنی اپنے نفس کو کسی کے سامنے جھکا دینا اور ذلیل بنا دینا ہیں۔ اس لحاظ سے اسلام یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ پھر اس کے سوا کسی کی عبادت کا رخ نہ کر سکے۔ یہ جھکنا اور ذلیل ہونا ایک عمل ہے۔ اس لئے اسلام دراصل ایک عمل ہی کا نام ہے۔ اور ایمان تصدیق قلبی کو کہتے ہیں۔ یہ تصدیقِ قلب کا اسی طرح ایک کلام ہے جیسا کہ اقرار زبان کا۔ یہ ضرور ہے کہ جب دل اپنی گہرائیوں سے کسی کے لئے بول اٹھے گا تو اس کے سامنے جھکنا اور ذلیل بن جانا بھی اس کا اقتضاء طبعی ہوگا مگر فرق یہ ہے کہ اسلام دراصل عمل ہی عمل ہے اور ایمان ایک علم ہے۔ عمل یہاں تابع ہے۔ اس کے بعد اب اگر احادیث پر ایک اجمالی نظر ڈالو تو تم کو معلوم ہوگا کہ یہاں بھی اس فرق کی رعایت کی گئی ہے یعنی اسلام کا تعلق ظاہر عمل اور تصدیق کا باطن سے قرار دیا گیا ہے۔

(۱) حضرت انس [2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اسلام ظاہر ہے اور ایمان دل میں ہے۔ [3] حدیثِ مذکور میں اسلام کو علانیہ اسی بنا پر فرمایا ہے کہ اعمالِ ظاہرہ کا ہر شخص مشاہدہ کر سکتا ہے۔ لیکن

---

[1] کتاب الایمان ص ۱۰۵۔ [2] ایضاً ص ۱۴۹۔ [3] مسند احمد۔

معرفت الٰہیہ اس کی محبت، اس کا خوف، یہ سب اوصافِ قلبیہ ہیں یہ باطنی چیزیں ہیں اس لئے ایمان کو علانیہ نہیں فرمایا بلکہ قلب میں کہا گیا ہے۔

(۲) حضرت ابوہریرۃؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمان تو وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے کسی مسلمان کو ایذا، نہ پہنچے اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنے جان و مال کی طرف سے خطرہ میں نہ رہیں۔

یہاں بھی اسلام کی علامت ایک ظاہری چیز قرار دی گئی ہے یعنی لوگوں کو ایذا نہ دینا اور ایمان کی علامت ایک باطنی چیز یعنی دلوں میں اس کی طرف سے خطرہ باقی نہ رہنا یہ دوسری صفت پہلی صفت سے اعلیٰ ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص ایسا مجسم پیغام امن بن جائے کہ قلوب میں اس کی طرف سے کوئی برا خطرہ تک باقی نہ رہے وہ کب کسی کو ایذا دے سکتا ہے مگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کسی کمزوری کی بناء پر یا کسی لالچ سے ایذا، دہی ترک کر دے اس لئے حدیث مذکور میں جو صفت ایمان کی بیان ہوئی ہے وہ اسلام کی صفت سے بالاتر ہے۔

(۳) عمرو بن عبسہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اسلام کسے کہتے ہیں آپ نے فرمایا لوگوں کو کھانا کھلانا اور نرم گفتگو کرنا۔ اس نے کہا کہ اچھا ایمان کیا چیز ہے فرمایا سخاوت اور صبر[1]

پہلی دو باتیں ظاہری عمل ہیں اور آخری دونوں باتیں نفسِ انسانی کی ایک صفت ہیں اس لئے ان کو اسلام سے اور ان کو ایمان سے زیادہ تعلق ہے۔ اسی طرح اکثر احادیث میں اسلام کی تفسیر میں اعمال ظاہرہ کا تذکرہ برابر چلا جاتا ہے اور ایمان کا بیشتر تعلق باطن سے معلوم ہوتا ہے۔ حدیث جبریل جو اس باب کی نہایت اہم حدیث ہے اسی فرق پر مبنی ہے اس کی تفصیل عنقریب آپ کے سامنے آنے والی ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے اسلام و ایمان کا باہمی ربط بھی حل ہو گیا یعنی کیا اسلام بلا ایمان کے یا ایمان بلا اسلام کے پایا جا سکتا ہے۔ اختلافات کی کثرت نے یہاں بھی حیرت میں مبتلا کر دیا ہے مگر ہمارے نزدیک امام سبکیؒ کی رائے بہت وزنی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اسلام گو انقیادِ ظاہری کا نام ہے مگر ایمانِ باطن اس کے لئے شرط ہے۔ اسی طرح ایمان گو انقیادِ باطن کو کہتے ہیں مگر انقیادِ ظاہری بھی

---

[1] سماحت و صبر فطرتِ انسانی کی ضد ہیں قرآن کریم کہتا ہے اَنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا یعنی ہلوع وہ ہے جسے نعمت میں سماحت نصیب نہ ہو اور مصیبت میں صبر کی توفیق میسر نہ آئے ان ہی دو خامیوں کی اصلاح کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمۃ۔ [2] اتحاف ج ۲ ص ۲۳۵۔

اس کے لئے ضروری ہے۔ اس سے ظاہر ہوگیا کہ اسلام بلا ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے شرعاً معتبر نہیں ہوتا۔ علامہ زبیدی[1] نے اس تلازم پر اشاعرہ اور حنفیہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ حدیث کے عام نظریہ میں ایمان و اسلام یا تو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں صرف خصوصیات کا کچھ فرق ہے ورنہ کم از کم متلازم ضرور ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ[2] نے یہاں قرآن کریم سے ایک لطیف استنباط فرمایا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[3] (بقرہ)	کیوں نہیں؟ جس نے تابع کر دیا اپنی ذات کو اللہ کے اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اسی کے لئے ہے اس کا ثواب اس کے رب کے پاس۔ اور نہ ان پر ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ)	بے شک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین۔ جو ایمان لایا ان میں سے اللہ اور روز قیامت پر اور نیک کام کئے تو ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس ان کا ثواب ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ پہلی آیت میں اسلام اور عمل صالح پر جو وعدہ فرمایا گیا ہے دوسری آیت میں وہی وعدہ ایمان اور عمل صالح پر مذکور ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام دونوں متلازم چیزیں ہیں۔

ابو طالب مکی نے اس مضمون پر ایک مستقل فصل قائم کی ہے اور اس کی خوب ایضاح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مثال ایسی ہے جیسی شہادتین کی۔ کہنے کو تو شہادۃ وحدانیت اور شہادۃ رسالت دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر پھر ان میں ایسا ارتباط ہے کہ بلحاظ حکم گویا ایک ہی ہیں۔ رسالت کے بغیر شہادتِ وحدانیت کارآمد نہیں ہوتی اور شہادتِ وحدانیت بلا شہادتِ رسالت کے بیکار رہتی ہے۔ ایک انسان کے لئے جس طرح قلب کی ضرورت ہے اسی طرح جسم کی ضرورت بھی ہے نہ کوئی قالب بلا قلب کے زندہ رہ سکتا ہے نہ قلب بلا قالب کے بسر کر سکتا ہے۔ خیمے کے دو حصے ہوتے ہیں ایک اوپر کا کپڑا دوسرا اندرونی چوب، نہ یہ کپڑا بلا .... چوب کے تنا رہ سکتا ہے اور نہ صرف

[1] اتحاف ج ۲ ص ۲۴۸۔ [2] کتاب الایمان ص ۱۴۰۔ [3] لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ میں جملہ اسمیہ اور وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ میں جملہ فعلیہ استعمال کرنے کا نکتہ حافظ ابن تیمیہ نے نہایت لطیف لکھا ہے دیکھو کتاب الایمان ص ۱۰۴۔

چوب بلا کپڑے کے خیمہ کہلائی جا سکتی ہے کلام کی حقیقت دو ہونٹ اور ایک زبان سے قائم ہے دونوں ہونٹ حروف جمع کر دیتے ہیں اور زبان ان کو بشکل کلام ادا کر دیتی ہے اگر ایک ہونٹ نہ رہے تو کلام کی حقیقت باطل ہو جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمالِ ظاہرہ اور اعتقادِ باطن یعنی اسلام و ایمان کا ارتباط ہے۔ صرف اعمالِ ظاہرہ بلا اعتقادِ باطن کھلا ہوا نفاق ہیں اور محض اعتقادِ باطن بدون اعمالِ ظاہرہ کے کفر کی ایک صورت ہے۔ اسلام یا ایمان کو اسی وقت معتبر کہا جا سکتا ہے جبکہ اعمالِ ظاہرہ کے ساتھ تصدیقِ باطن ہو اور تصدیقِ باطن کے ساتھ اعمالِ ظاہرہ بھی ہوں۔ قرآنِ کریم نے کفر کو ایمان و اسلام ہر دو کا مقابل قرار دیکر اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ۔ — خدا تعالیٰ بھلا اس قوم کو کیسے ہدایت دے جنھوں نے ایمان جیسی نعمت کے بعد پھر کفر اختیار کیا ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ — یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مسلمان ہو پھر رسول تم کو کفر کا حکم کرے۔

پہلی آیت میں کفر کو ایمان کے بالمقابل اور دوسری آیت میں اسلام کے بالمقابل رکھا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام و ایمان ایک دوسرے سے جدا چیزیں نہیں ہیں۔ اسلام کا ترک کرنا ایمان کا ترک کرنا ہے اور ایمان کا ترک کرنا اسلام کا ترک کر دینا ہے اور نتیجہ ہر دو کا وہی ایک کفر ہے[1]۔

غرض اعمالِ ظاہرہ بلا انقیادِ باطن صحیح نہیں ہو سکتے اور نہ انقیادِ باطن بلا اعمالِ ظاہرہ کی شہادت کے ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہر مسلم کے لئے ایمان اور ہر مومن کے لئے اسلام ضروری اور ناگزیر ہے۔

حضرت استاد قدس سرہ فرماتے تھے کہ تصدیقِ قلبی جب پھوٹ کر جوارح پر نمودار ہو جائے تو اس کا نام اسلام ہو جاتا ہے اور اسلام جب دل میں اتر جائے تو ایمان کے نام سے موسوم ہو جاتا ہے۔ ایک ہی حقیقت ہے اختلافِ مواطن سے اس کے نام مختلف ہو گئے ہیں۔ ہمارے نزدیک استاد مرحوم کا یہ بیان اسلام کامل اور ایمان کامل سے متعلق ہے اور غالباً اس کا منشا امام غزالیؒ کی وہ تحقیق ہے جس کا بیان آپ گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہمارے فقہاء کے اختلافات بھی اپنی جگہ صحیح وجوہ و اسباب پر مبنی ہیں مگر ہمیں تو یہاں وہ لکھنا تھا جو امت کے حق میں زیادہ نافع ہو تفصیل کے لئے علم کلام ہے۔

ایمان میں زیادت و نقصان کی بحث

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ایمان قلب میں مختلف راستوں سے داخل ہوتا ہے کبھی اپنی جان و مال کا تحفظ التزامِ طاعت کا داعی ہوتا ہے جیسا کہ طلقاءِ مکہ کا اسلام کبھی چند

[1] قوت القلوب ج ۲ ص ۱۲۹

دراہم مغشوشہ کی طمع التزام طاعت پر مجبور کر دیتی ہے جیسا کہ مؤلفہ قلوب کا اسلام کبھی محض قومی تقلید اور جمہور کا اتباع اس کا محرک بن جاتا ہے جیسا کہ اکثر اعراب کا اسلام ان سب صورتوں میں اگر سینہ رسولؐ کی عداوتوں سے خالی ہو چکا ہے اور نفس نے دین الٰہی میں داخل ہو جانے کی تیاری کر لی ہے تو وہ یقیناً مسلمان ہے مگر یہ ایسا اسلام ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ شبہات اس کے یقین کو متزلزل کر سکتے ہیں، ذرا ذرا سی تکلیفیں اس کو اپنے مذہب سے پھیر سکتی ہیں۔ مذہب کے لئے قربانی کا اس میں کوئی جذبہ نہیں ہوتا۔ جہاد کی دعوت اس کے لئے پیامِ موت ہوتی ہے۔ آیاتِ ربانیہ کا پیہم نزول اس کے ایمان میں کچھ افزونی نہیں بخشتا اور اسی امن و عافیت کی زندگی میں وہ دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ایک اسلام ہے اور آیتِ ذیل میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ۔	یعنی اعراب کہتے ہیں کہ ایمان ہمارے دلوں میں سرایت کر گیا ہے آپ کہہ دیجئے کہ ایسا دعویٰ ابھی مت کرو ابھی اسلام صرف تمہارے ظاہر تک ہے۔ ہاں امید ہے کہ آئندہ دلوں تک اتر جائے۔

یہ اسلام کے وجودِ لفظی کے ابتدائی حالات ہیں لیکن جب یہ ایمان اور ترقی کرتا ہے تو اس کی صورت کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ اہلِ ایمان کی صحبت اسے اپنا ہم رنگ بنا لیتی ہے کبھی آیاتِ قرآنی پر غور و تفکر ایمان کی ترو تازگی کا باعث بن جاتا ہے کبھی محض موہبتِ الٰہیہ کشاں کشاں ایمانِ حقیقی تک لے آتی ہے۔ اچانک وہ دیکھتا ہے کہ پہلے جو قلب ظلمت کدہ تھا اب نورِ ایمانی سے وادی ایمن بن گیا ہے حقائقِ ایمانیہ آناً فاناً منکشف ہوتی چلی جاتی ہیں۔ راہِ اسلام میں ہر ضرب ایک نئی تازگی بخشتی ہے طبلِ جنگ کی آواز صدائے سرود سے زیادہ سہانی اور مستانی معلوم ہوتی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت وہ کام کرتی ہے جو ابرِ رحمت کے قطرے کھیتوں میں۔ قدرت اس کو طرح طرح آزماتی ہے مگر ہر امتحان اس کے لئے ایک نیا یقین بخشتا ہے۔ عبادت میں دلچسپی کا سوال درمیان سے ہٹ جاتا ہے۔ فتح و ظفر اور شکست و انہزام سب برابر نظر آتے ہیں۔ اور اس طرح انقیادِ باطن کی ایک ایک منزل تمام طے ہو جاتی ہے۔ آپس کے تعلقات نظر سے گر جاتے ہیں اور صرف ایک تعلق رہ جاتا ہے اور وہ خدا کا تعلق ہے اب جس سے محبت ہے اسی کی خاطر ہے اور جس سے جنگ ہے اسی کے نام پر ہے ایک وہ مومن تھا اور اب یہ ایک مومن ہے اسی کا نام ایمان کی زیادتی ہے۔ اب آیاتِ ذیل کو بغور پڑھ لو۔

(۱) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ	مومن صرف وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا

وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا الخ اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔

نام آئے تو خوف زدہ ہو جائیں اور جب اس کی آیات ان پر تلاوت کی جائیں تو ان کے ایمان اور روشن ہوں۔ نمازیں نہایت خوبی کے ساتھ پڑھیں اور ہمارے بخشے ہوئے مال میں سے کچھ مصارفِ خیر میں بھی صرف کرتے رہیں۔ بس نیک مومن تو یہ ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زیادتی سے مراد صرف تصدیق ہے ہرگز نہیں بلکہ جب کبھی ایک مومن گوشِ انقیاد و اطاعت سے کلامِ پاک کو سنتا ہے تو ہر بار معانی پر غور و تفکر اس کے قلب میں جنت کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف خدا تعالیٰ کی ایک نئی محبت اس کی طاعت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اور اسی کا نام قرآنِ کریم نے ایمان کی زیادتی رکھا ہے۔

عمر بن حبیبؓ صحابی فرماتے ہیں کہ جب ہم خدا کی تسبیح و حمد میں مشغول ہوں تو یہی ایمان کی زیادتی ہے اور جب غفلت و نسیان میں مبتلا ہو جائیں تو اسی کا نام ایمان کا نقصان ہے۔ حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لئے سمجھ کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی نگرانی کرتا رہے کہ کچھ بڑھ رہا ہے یا گھٹ رہا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کا چونکہ دن رات کا یہی ایک مشغلہ تھا کہ وہ اپنے ایمان کا جائزہ لیا کرتے جب کوئی آیت اترتی تو اپنی روح میں ایک نئی ایمانی تازگی محسوس کرتے۔ ادھر کفار کا یہ مشغلہ تھا کہ وہ اس جذبہ کا تمسخر اڑاتے اور مذاق بنایا کرتے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ

جب کوئی سورت اترتی تو ان میں ایک جماعت ایسی بھی تھی جو یہ پوچھتی بھلا تم میں سے کسی کا ایمان بڑھا جی ہاں جو ایمان لا چکے ہیں ان کے ایمان میں تو ترقی ہوئی اور انھوں نے بڑی بشارت حاصل کی لیکن جن کے دلوں میں روگ تھا ان کی نجاست میں اور اضافہ ہو گیا۔

آیاتِ قرآنی کا ادب و یقین سے سننا یقیناً ایمان میں ترقی بخشتا ہے۔ یہ زیادتی کبھی جدید جدید علوم حاصل ہونے سے پیدا ہوتی ہے کبھی سکینت و فرحت کی صورت میں میسر آتی ہے، کبھی ہدایت کے نام سے موسوم ہوتی ہے پہلی آیت میں اسی کا نام استبشار ہے۔

(۲) وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ — اس روز مومنین خدا کی نصرت پر مسرور ہوں گے۔

یہاں اس زیادتی کو فرح و سرور سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۳) هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِہِمْ۔ — خدا ہی کی وہ ذات تھی جس نے مؤمنین کے دلوں پر سکینت و اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی تاکہ ان کے پہلے ایمان میں اور ترقی ہو۔

(۴) فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا۔ — اللہ تعالیٰ نے اپنا سکینہ اپنے رسول اور مومنین پر نازل فرمایا اور ایسا لشکر بھیجا جس کو تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا (یعنی فرشتے)۔

(۵) اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا۔ — جبکہ وہ دونوں غار میں پوشیدہ تھے اور خدا کا رسول اپنے رفیق کو سمجھا رہا تھا کہ غمگین ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے، تو اللہ نے اس پر اپنا سکینہ نازل فرمایا اور ایسے لشکر کے ذریعہ سے قوت پہنچائی جس کو تم نے نہیں دیکھا۔

(۶) وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ ھُدًی۔ — جو لوگ ہدایت یافتہ تھے خدا نے ان کو اور ہدایت میسر فرمائی۔

آیات بالا میں یہ سکینہ و یقین و ہدیٰ سب صفاتِ قلبیہ ہیں مصائب میں یہ یقین کر لینا کہ یہ سب مقدرات ہیں جو ضرور پیش آمدنی ہیں تقدیر پر ایمان کا ثمرہ ہے اور اسی کا نتیجہ سکینہ و اطمینان و تسلیم ہے۔

یہ ایمان جب اور عروج کرتا ہے تو اب ایک ذات وحدہ لاشریک لہ پر وہ توکل و اعتماد میسر آجاتا ہے کہ دشمن کی دھمکی اور دلیری کا باعث بن جاتی ہے۔

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔ — یہ وہ جماعت ہے جن کو کفار نے دھمکی دی کہ تمہارے لئے بڑی فوج تیار کی گئی ہے تو ذرا ڈرنا اس پر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور بولے کہ ہمیں خدا کافی ہے اور وہی ہمارا بہترین کارساز ہے۔

اس قسم کا ایک امتحان نہیں بلکہ سخت سے سخت مصائب میں مبتلا کر کے ان کا بار بار امتحان لیا جاتا ہے۔ ھُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا۔ مگر شک و تردد کا ایک کانٹا بھی ان کے دامنِ یقین پر نہیں چبھتا۔ وہ کوہِ استقامت اور یقین کی ایک چٹان بن جاتے ہیں کہ مصائب کے لشکر اگر ان سے ٹکراتے ہیں تو خود پاش پاش ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنی جگہ سے ذرا حرکت نہیں دے سکتے، جان و مال کی قربانی ان کے نزدیک ایک معمولی بات ہوتی ہے۔ ان امتحان

کے بعد اب ایک مومن اپنے دعوی میں سچا مان لیا جاتا ہے۔

(۸) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔

مومن صرف وہ لوگ ہیں جو ایک مرتبہ جب خدا و رسول پر ایمان لا چکے تو پھر شک و تردد کے پاس نہ پھٹکے بلکہ جان سے مال سے اللہ کے راستہ میں قربان ہوگئے بس یہی لوگ سچے کہے جانے کے مستحق ہیں۔

اگر بنا بر بشریت کبھی ان سے ذرا کمزوری ظاہر بھی ہو جاتی تو قرآن فوراً تنبیہ کر دیتا ہے اور تفہیم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا کہ ایمان جو صرف عشق کی راہ ہے کمزوری اور بزدلی سے طے ہونیوالی نہیں ہے ؎

این شربتِ عاشقیست خسرو
بے خونِ جگر چشید نتوان

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا مِنْکُمْ۔

تم نے کیا یہ خیال کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہوجاؤ گے اور ابھی تو اللہ نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جان و مال کی قربانی کے لئے تم میں کون کون تیار ہے۔

خدا کی راہ میں ایک بڑی قربانی یہ بھی ہے کہ اس کے سامنے باپ، بیٹا، بھائی، قبیلہ سب کو ایک طرف رکھ دیا جائے بس ساری محبتوں اور عداوتوں کا محور ایک خدا کی ذات رہ جائے۔

(۹) لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ۔

یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کو آپ خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کا برتاؤ کرتا دیکھیں خواہ وہ ان کے والد یا اولاد یا بھائی یا قبیلہ ہی کیوں نہ ہوں بس یہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں ایمان نہایت مضبوط قائم ہو چکا ہے۔

اسی لئے دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالنَّبِیِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مَا اتَّخَذُوْھُمْ اَوْلِیَآءَ وَلٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْھُمْ فٰسِقُوْنَ۔

بھلا اگر کہیں یہ لوگ اللہ، نبی، اور اس پر نازل شدہ وحی کا یقین رکھتے تو ان کو دوست بناتے مگر بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ حکم عدولی کرنے والے ہیں۔

تیسری جگہ ارشاد ہے

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ	اے پیغمبر مسلمانوں سے کہدیجئے اگر ایسا ہے کہ تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے
وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ	بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا کنبہ، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے۔
اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ	تمہاری تجارت جس کے مندا پڑجانے سے ڈرتے ہو، تمہارے
كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ	رہنے کے مکانات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں، یہ ساری چیزیں تمہیں
اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ	اللہ سے، اس کے رسول سے، اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے سے
سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ	زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ جو کچھ خدا کو کرنا ہے وہ
بِاَمْرِهٖ۔ (توبہ)	تمہارے سامنے آئے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جو ایمان کے زیادت و نقصان پر برہانِ قاطع ہیں مگر آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس کا تعلق ایمان کے وجودِ عینی سے ہے وجودِ ذہنی یعنی نفسِ تصدیق سے نہیں [۱]

اسلام و ایمان کے یہ چند مباحث ہیں ان کی روشنی میں اب آپ بسم اللہ کرکے کتاب الایمان کی احادیث پڑھنا شروع کیجئے۔ جو مباحث یہاں رہ گئے ہیں وہ تشریحی نوٹوں میں موقع بہ موقع آپ کے ملاحظہ کو گذر جائیں گے لیکن ہر بحث کو پڑھتے وقت اس کا لحاظ رکھنا چاہئے کہ ان بحثوں اور تفصیلوں کے صحیح مخاطب وہی افراد و اشخاص ہیں جو اسلام و ایمان کی روشنی خود اپنے قلب میں رکھتے ہیں۔ اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے اس کو اور روشن کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جن افراد کے قلوب میں سرے سے مذہب کے نقوش ہی نہیں یا ہیں تو مٹے ہوئے اور اُچٹے ہوئے ایسے اصحاب کو اس سلسلہ کے لئے پہلے کسی اور کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے ان کے نقطۂ نظر سے جو مباحث ضروری ہیں وہ اس کتاب میں غیر ضروری سمجھکر چھوڑ دیئے گئے ہیں کیونکہ ان کی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف احادیثِ نبویہ کی تشریح منظور ہے اور اس ضمن میں جو تفصیل طلب امور ہیں یا جو شبہات پیدا ہوسکتے ہیں اُن کی تامقدور توضیح و تفصیل کی گئی ہے۔ توحید و رسالت کے عقلی اثبات کا محل علمِ کلام ہے جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ واللہ الموفق۔

---

[۱] حافظ ابن تیمیہؒ نفسِ تصدیق میں بھی تشکیک کے قائل ہیں دیکھو کتاب الایمان ص ۹۲ و ۱۶۵ و ۱۶۶۔

كتاب الايمان والاسلام

فضل الايمان والاسلام

اٰية محبة الله عزوجل التوفيق للايمان

(۱۹۲) عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ وَاِنَّ اللهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَمَنْ لَّا يُحِبُّ وَلَا يُعْطِي الْاِيْمَانَ اِلَّا مَنْ يُحِبُّ۔ (رواه الحاكم فی المستدرك ج۱ ص۳۳ وقال الذهبی صحیح الاسناد۔)

کتاب الایمان والاسلام

ایمان اور اسلام کی فضیلت

خدا کے یہاں مقبولیت کی پہچان ایمان ہے سرمایۂ دولت نہیں

(۱۹۲) عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے جس طرح تم میں روزی کی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے اخلاق کی بھی تقسیم کردی ہے (جیسے رزق تنگ وفراخ رکھا ہے ایسے ہی اخلاق بھی کسی کے تنگ اور کسی کے وسیع رکھے ہیں) وہ دنیا تو (سب ہی کو دیتا ہے) اس کو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبت نہیں کرتا لیکن دولتِ ایمان صرف اسی کو دیتا ہے جس کو محبوب رکھتا ہے

(۱۹۲) انسان کی تمام شرافت وکمال اس کی قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ کے کمال پر موقوف ہے ان ہی کے سنور جانے کا دوسرا نام ایمان اور عملِ صالح ہے۔ کفر وایمان کی تقسیم ان ہی کے بگڑنے اور سنورنے پر دائر ہے جس کی یہ دونوں قوتیں سنور گئیں وہ سنور گیا اور جس کی بگڑ گئیں وہ بگڑ گیا۔ اسی لئے سورہ والتین اور سورۂ والعصر میں انسانی شرافت کو بڑی تاکید کے ساتھ بیان فرما کر یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے لئے اسفل السافلین اور ابدی خسارہ سے نجات کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ حریت انسان کی سب سے بڑی شرافت ہے اور عبدیت اس کے لئے بدترین داغ۔ لیکن اگر حریت کے ساتھ ایمان اور عمل صالح نہ ہو اور عبدیت کے ساتھ ایمان میسر آجائے تو حریت کی شرافت شرافت نہیں رہتی اور عبدیت کا عیب عیب نہیں رہتا۔ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ۔ ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بدرجہا افضل ہے۔ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

لا یدخل الجنۃ الا المؤمنون

(۱۹۳) عَنْ عُمَرَ قَالَ لَمَّا کَانَ یَوْمَ خَیْبَرَ قُتِلَ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَھِیْدٌ حَتّٰی مَرُّوْا عَلٰی رَجُلٍ فَقَالُوْا فُلَانٌ شَھِیْدٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَلَّا فَاِنِّیْ رَاَیْتُہٗ فِی النَّارِ فِیْ بُرْدَۃٍ اَوْ عَبَاءَۃٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْھَبْ فَنَادِ فِی النَّاسِ اَنَّہٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ۔ فَنَادَیْتُ اَلَا اِنَّہٗ لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ اِلَّا الْمُؤْمِنُوْنَ۔ (اخرجہ ابن ابی شیبۃ واحمد ومسلم والترمذی والدارمی وابن حبان)

جنّت میں صرف مومن جائیں گے

(۱۹۳) عمرؓ سے روایت ہے کہ جب خیبر کی جنگ ہوئی تو اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ صحابہ شہید ہوگئے۔ لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ فلاں فلاں شہید ہوگئے یہاں تک کہ وہ ایک اور مقتول پر گذرے تو اس کے متعلق بھی یہی کہا کہ فلاں صحابی شہید ہوگیا آپ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ میں نے اس کو ایک چادر یا عبار (چرانے کی) سزا میں دوزخ میں دیکھا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا جاؤ اور لوگوں میں یہ اعلان کردو کہ جنت میں صرف وہی لوگ جائیں گے جو "المومن" یعنی پورے پورے ایمان دار ہیں میں گیا اور میں نے یہ اعلان کردیا

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) پس اسلام میں خدا کے دوست و دشمن کی تقسیم کا مدار سرمایہ و دولت پر نہیں بلکہ ایمان و کفر پر ہے۔ دنیا کی دولت دوست و دشمن سب میں مشترک رکھی گئی ہے لیکن ایمان کی دولت صرف دوستوں کے حصہ میں لگادی گئی ہے۔

سر دِ غم عشق بو الہوس را نہ دہند — سوزِ دل پروانہ مگس را نہ دہند

عمرے باید کہ یار آید بکنار — ایں دولتِ سرمدی ہمہ کس را نہ دہند

(حاشیہ صفحۂ ھٰذا) (۱۹۳) یہ حدیث جہاں ایک طرف یہ بتاتی ہے کہ جنت صرف مومنوں کا حصہ ہے اسی کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ "المومن" کا خطاب حاصل کرنے میں ایک بے قیمت چادر اور ایک معمولی سے عبا کی چوری بھی حائل ہو سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جنت کوئی معمولی متاع نہیں مگر اللہ تعالیٰ کی نظر میں "المومن" کا خطاب بھی معمولی خطاب نہیں۔ دنیا اپنے اندازۂ خیال پر ایک شخص کو شہید کہدیتی ہے لیکن اسلام اب بھی اس کو "المومن" کا خطاب نہیں دیتا۔ کوئی شخص صرف ایک بار کلمہ طیبہ پڑھ لینے سے خواہ وہ عذاب الٰہی کی دائمی گرفت سے نجات پانے کا مستحق ہوجائے لیکن "المومن" کے معزز خطاب کا اس وقت تک مستحق نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی نظری اور عملی دونوں قوتیں کامل نہ ہوجائیں یعنی وہ اسلام کے عقائد اور اعمال کا پورے طور پر پابند نہ ہوجائے اور اس پابندی میں وہ کیفِ آزادی محسوس کرنے نہ لگ جائے اس کے بعد پہلے جنت کا مشتاق وہ تھا اور اب جنت اس کی مشتاق ہوجائے گی۔

(۱۹۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔ (رواہ مسلم)

بشارة کمال الدین لم یعط احد من الامم

(۱۹۵) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَنَّ رَجُلًا مِّنَ الْیَهُوْدِ قَالَ لَهٗ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اٰیَةٌ فِیْ کِتَابِکُمْ تَقْرَءُوْنَهَا لَوْ عَلَیْنَا مَعْشَرَ الْیَهُوْدِ نَزَلَتْ لَاتَّخَذْنَا ذٰلِکَ الْیَوْمَ عِیْدًا قَالَ اَیُّ اٰیَةٍ قَالَ (اَلْیَوْمَ

(۱۹۴) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک باہمی محبت نہ کرو گے پورے مومن نہیں ہو گے تو کیا میں تم کو وہ بات نہ بتادوں کہ جب اس کے خوگر ہو جاؤ تو باہمی محبت کرنے لگو (وہ یہ ہی کہ آپس میں ہر شخص کو سلام کیا کرو خواہ وہ تمہارا آشنا ہو یا نا آشنا۔

کمال دین کی بشارت اس امت کے سوا کسی کو نہیں دی گئی

(۱۹۵) عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی نے کہا اے امیر المومنین آپ کے قرآن میں ایک آیت ہے جسے آپ لوگ پڑھتے ہیں اگر کہیں وہ ہم یہودیوں کے لئے نازل ہوتی تو ہم اس دن عید منایا کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کونسی آیت ہے، اس نے کہا یہ آیت (آج ہم تمہارا دین کامل کر چکے

(۱۹۴) اس حدیث میں ایمان کو محبت پر اور محبت کو سلام پر معلق کیا گیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض اعمال بادی النظر میں کو معمولی نظر آتے ہیں مگر دوسرے اہم مقصد کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ سلام بظاہر ایک معمولی درجہ کا خلق ہے لیکن اس کا نتیجہ باہمی الفت و محبت ہے محبت صرف ایک جاذبیت و تاثر ہی کا نام ہے مگر اس کے باوجود وہ ایمان کا ایک مستقل سبب بن جاتی ہے۔ در اصل بات یہ ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہی کا دوسرا نام ہے۔ خدا کے محبت کی یہ راہ رسول کی محبت میں پھر رسول سے صحابہ کی محبت میں اور اسی طرح درجہ بدرجہ عامۂ مومنین کی محبت میں ہو کر گذری ہے اس لئے خدا کی محبت تک رسائی کے لئے ان محبتوں کو بھی عبور کرنا ناگزیر ہے اور اس طرح مسلمانوں کی محبت کا نتیجہ ایمان باللہ اور ایمان باللہ کا نتیجہ مومنین کی محبت ہو کر رہتا ہے۔ اسی لئے مومنین سے بغض و کینہ کی زد براہ راست آدمی کے اسلام پر پڑتی ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم میں یہ دعا تعلیم کی گئی ہے۔ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ (اور ہمارے دلوں میں اس جماعت سے کینہ نہ رکھ جو ایمان لا چکی ہے) اس کینہ کو دور کرنے کا سب سے سہل اور فطری نسخہ یہی سلام ہے اسی لئے ذرا سی شکر رنجی میں مراسم محبت میں جو چیز پہلے ختم ہوتی ہے وہ یہی سلام ہے۔ اس بیان کا اقتضاء تو یہ تھا کہ اسلام میں باہمی سلام کی حیثیت ایک رکن کی حیثیت ہوتی لیکن جن امور کو پورے ضابطہ میں لایا نہیں جا سکتا ان کی اہمیت کے باوجود شریعت ان کو رکن کا درجہ نہیں دیتی بلکہ ایمان کا ایک شعبہ قرار دیدیتی ہے۔ اسی لئے حیا بھی ایمان کا صرف ایک شعبہ قرار دی گئی ہے، یہاں بھی پورا پورا انضباط مشکل ہے۔ پس اس حقیقت سے کسی موقعہ پر بے خبر نہ رہنا چاہئے کہ جن امور کو شریعت شعبہ قرار دیتی ہے وہ ہمیشہ معمولی اور غیر اہم نہیں ہوتے کبھی کبھی ارکان کے درجہ کی چیزیں ان کے غیر منضبط ہونے یا قانون یسر کے تقاضہ

اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا) قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا ذٰلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِيْ نَزَلَتْ فِيْهِ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ۔ (رواه البخاري ومسلم والترمذي عن ابن عباسؓ)

بشارة المغفرة للمؤمن العاصي

(۱۹۶) عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَتَانِيْ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَبَشَّرَنِيْ اَنَّهُ مَنْ مَاتَ مِنْ اُمَّتِكَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ

تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے حق میں دین صرف اسلام کو پسند کرلیا۔ عمرؓ نے فرمایا ہم وہ دن بھی جانتے ہیں اور وہ جگہ بھی جانتے ہیں جہاں یہ آیت آپ پر اتری تھی جمعہ کا دن تھا اور عرفات کا میدان تھا جہاں آپ کھڑے رکنِ وقوف ادا فرمارہے تھے (یعنی اس دن ہماری دو عیدیں تھیں)۔

مومن عاصی کے حق میں مغفرت کی بشارت

(۱۹۶) ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور یہ خوشخبری لائے کہ آپ کی امت میں جو شخص اس حال پر مرجائے کہ اس نے کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک نہ ٹھہرایا ہو تو وہ جنت میں جائے گا میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنا (جیسے کبائر کا) ارتکاب کیا ہو آپ نے فرمایا

(۱۹۵) یہود و نصاریٰ اسلام کے ساتھ ہمیشہ رقابت کا تعلق رکھتے تھے اور ہر موقعہ پر اس گھات میں رہا کرتے تھے کہ اپنے دین کی برتری یا اسلام کی کمتری ثابت کردیں لیکن جب عین حج کے موسم میں آیت مذکورہ نازل ہوگئی تو ان کی حسرت کی صد باقی نہ رہی کہ ان کے پاس شریعتِ تورات جیسی بسیط شریعت موجود ہونے کے باوجود اکمالِ دین کی بشارت ان کے حصہ میں نہ آئی اور آئی تو کن کے حصہ میں جو ہمیشہ ان کے رقیب اور مدمقابل رہا کرتے تھے اس لئے جب ان سے کچھ اور بن نہ پڑا تو کہا کر ایک ہی اعتراض جڑ دیا کہ اگر یہ آیت ہمارے حق میں اترتی تو ہم اتنے خوش ہوتے کہ اس دن عید منایا کرتے ان کے علی الرغم حضرت عمرؓ نے یہ جواب دیا کہ تم کو تو ابھی یہ خبر نہیں کہ اس دن تو قدرتی طور پر ہماری دو عیدیں جمع تھیں۔ قرآن کریم کی یہ ایک ہی بشارت درحقیقت تین بشارتوں پر مشتمل ہے۔ اگر ان کی علیحدہ علیحدہ تفصیل کی جائے تو بات بہت طویل ہو جائے گی اس لئے ہم یہاں ابن عباسؓ کے صرف وہی کلمات نقل کرنے پر کفایت کرتے ہیں جو انہوں نے اس بشارت کی تشریح میں بہت مختصر مگر بہت جامع ارشاد فرمائے تھے۔

آج ہم تمہارا دین کامل کرچکے تو اب اس میں کبھی کسی زیادتی کی ضرورت نہ پڑیگی اور اپنی نعمت پوری کرچکے تو اب یہ دین کبھی ناقص نہ ہوگا اور تمہارے حق میں ہمیشہ کے لئے یہی دین پسند کرچکے تو اب کبھی اس سے ناراض نہ ہوں گے (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۷۹)

شریعتِ موسویہ اپنے زمانہ میں گو کامل ہی شریعت تھی مگر کچھ زمانہ بعد اس میں پھر زیادتی کمی کی ضرورت پیش آگئی۔ مزید برآں یہ کہ وہ اس طرح مسخ ہوگئی کہ پھر اس کی اتباع مغضوب علیہم اور ضالین کی شان بن گئی۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

قَالَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ ثُمَّ قَالَ فِی الرَّابِعَۃِ عَلٰی رَغْمِ اَنْفِ اَبِیْ ذَرٍّ (رواہ الشیخان والترمذی وعند البخاری فی باب الثیاب البیض وکان ابوذر اذا حدث بھذا قال وان رغم انف ابی ذر)

(۱۹۷) عَنْ سَالِمِ بْنِ اَبِی الْجَعْدِ عَنْ سَلَمَۃَ بْنِ نُعَیْمٍ قَالَ وَکَانَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ لَقِیَ اللّٰہَ لَا یُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ وَاِنْ زَنٰی وَاِنْ سَرَقَ۔ (رواہ احمد والطبرانی)

اگرچہ چوری وزنار کا ارتکاب کیا ہو، میں نے پھر عرض کیا اگرچہ اس نے چوری اور زنار کا ارتکاب کیا ہو۔ آپ نے پھر وہی فرمایا چوتھی مرتبہ میرے اصرار پر فرمایا ہاں اگرچہ ابوذرؓ کو کتنا ہی ناگوار گذرے۔ ابوذرؓ کی عادت تھی کہ جب وہ اس حدیث کو نقل کرتے تو آپ کے اس فقرہ کو بھی نقل کردیتے تھے۔

(۱۹۷) سالم بن ابی الجعد سلمہ بن نعیم سے روایت کرتے ہیں (یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو مرجائے کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھیرایا ہو وہ جنت میں جائیگا اگرچہ چوری اور زنار کا مرتکب ہوا ہو۔

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس آیت میں اہل اسلام کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ انقلابات کی آندھیاں یہاں بھی آئیں گی مگر ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اس دین میں زیادتی و نقصان کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔ یا یہ دین بھی ایسا منحرف ہوجائے کہ اس کی اتباع کرنا اللہ تعالیٰ کی رضا کی بجائے اس کی ناراضگی کا موجب بن جائے۔ بالفاظِ دیگر اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ دین آخری دین ہے اس لئے تحریف اور نسخ دونوں سے محفوظ رہے گا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا دین مقبول نہ ہوگا۔

(۱۹۶) آدمی بیچارے کی پرواز ہی کیا، یہ غریب رحمت کی وسعت کا اندازہ لگائے بھی تو کیا لگائے ایک کلمہ سے عمر بھر کے جرم بغاوت کی معافی کا اعلان سنتا ہے تو حیرت میں پڑجاتا ہے۔ ادھر دیکھتا ہے کہ جو زبان اس کا اعلان کررہی ہے وہ مبالغہ آمیزی کی عادی نہیں اس لئے مسرت و حیرت کے مابین وہ اس سوال کو بار بار دہرانے کے لئے مضطر ہوجاتا ہے جو حضرت ابوذرؓ کی زبانی ابھی آپ نے پڑھا۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے کانوں کے نارسائی اور قصور فہم کے جتنے موانع بھی ہوسکتے ہیں سب کو صاف کرے اور یقین کرے کہ ان کے کانوں نے سننے میں غلطی نہیں کی، عقل نے سمجھنے میں ٹھوکر نہیں کھائی اور بات درحقیقت یونہی تھی جو اس نے پہلی مرتبہ سنی۔ ابوذرؓ کے اس عالم حیرت کو ختم کرنے کے لئے بھی ایک تدبیر کارگر ہوسکتی تھی کہ ان سے ایسا محبت بھرا کلمہ سرزنش کہدیا جائے جو ان کی اس حیرت کو ختم کردے اور اپنی لذت کو اُن کے سینہ میں ہمیشہ کے لئے چھوڑ جائے۔ اسی لئے حضرت ابوذرؓ جب اس روایت کو بیان فرماتے تو ساتھ ہی . . . . اس عتاب آمیز تلطف کو بھی ذکر کردیتے خود محظوظ ہوتے اور سندِ محبت رکھنے والوں کو بھی محبت کی ان تلخیوں کی یاد دلا کر محظوظ کرتے ؎

دادو دشنامے مرا محبوب جانی یک شبے　　　عمر بگذشت وہنوزم لذتِ آں در دل است

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ زنا و سرقہ کے بعد اگر زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسلام نصیب ہوجائے یا ان گناہوں سے توبہ کرلے تو اس کے یہ گناہ معاف ہوجائیں گے اور وہ اس بشارت کا مستحق ہوجائے گا۔ (ص ۸۶۷)

(۱۹۸) عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ خَرَجْتُ لَیْلَةً مِنَ اللَّیَالِیْ فَاِذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَمْشِیْ وَحْدَهٗ
لَیْسَ مَعَهٗ اِنْسَانٌ قَالَ فَظَنَنْتُ اَنَّهٗ یَکْرَهُ اَنْ یَمْشِیَ مَعَهٗ اَحَدٌ فَجَعَلْتُ اَمْشِیْ فِیْ ظِلِّ الْقَمَرِ فَالْتَفَتَ
فَرَاٰنِیْ فَقَالَ مَنْ هٰذَا قُلْتُ اَبُوْ ذَرٍّ جَعَلَنِیَ اللّٰهُ فِدَاءَكَ قَالَ یَا اَبَا ذَرٍّ تَعَالَهْ فَمَشَیْتُ مَعَهٗ سَاعَةً فَقَالَ
اِنَّ الْمُکْثِرِیْنَ هُمُ الْمُقِلُّوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلَّا مَنْ اَعْطَاهُ اللّٰهُ خَیْرًا فَنَفَحَ فِیْهِ یَمِیْنَهٗ وَشِمَالَهٗ وَبَیْنَ یَدَیْهِ
وَوَرَاءَهٗ وَعَمِلَ فِیْهِ خَیْرًا قَالَ فَمَشَیْتُ مَعَهٗ سَاعَةً فَقَالَ لِیْ اِجْلِسْ هٰهُنَا قَالَ فَاَجْلَسَنِیْ فِیْ قَاعٍ
حَوْلَهٗ حِجَارَةٌ فَقَالَ لِیْ اِجْلِسْ هٰهُنَا حَتّٰی اَرْجِعَ اِلَیْكَ قَالَ فَانْطَلَقَ فِی الْحَرَّةِ حَتّٰی لَا اَرَاهُ فَلَبِثَ عَنِّیْ
فَاَطَالَ اللُّبْثَ (وفی باب من اجاب بلبیك وسعدیك فسمعت فتخوفت ان یکون عرض لرسول الله صلی الله علیه وسلم
فاردت ان اذهب ثم ذکرت قول رسول الله صلی الله علیه وسلم لا تبرح فمکثت قلت یا رسول الله سمعت
صوتا خشیت ان یکون عرض لك ثم) ثُمَّ اِنِّیْ سَمِعْتُهٗ وَهُوَ مُقْبِلٌ وَهُوَ یَقُوْلُ وَاِنْ سَرَقَ وَاِنْ زَنٰی قَالَ
فَلَمَّا جَاءَ لَمْ اَصْبِرْ حَتّٰی قُلْتُ یَا نَبِیَّ اللّٰهِ جَعَلَنِیَ اللّٰهُ فِدَاءَكَ مَنْ تُکَلِّمُ فِیْ جَانِبِ الْحَرَّةِ مَا سَمِعْتُ اَحَدًا
یَرْجِعُ اِلَیْكَ شَیْئًا قَالَ ذَاكَ جِبْرِیْلُ عَرَضَ لِیْ فِیْ جَانِبِ الْحَرَّةِ قَالَ بَشِّرْ اُمَّتَكَ اَنَّهٗ مَنْ مَاتَ لَا یُشْرِكُ
بِاللّٰهِ شَیْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ یَا جِبْرِیْلُ وَاِنْ سَرَقَ وَاِنْ زَنٰی قَالَ نَعَمْ قُلْتُ وَاِنْ سَرَقَ وَاِنْ زَنٰی قَالَ
نَعَمْ قُلْتُ وَاِنْ سَرَقَ وَاِنْ زَنٰی قَالَ نَعَمْ وَاِنْ شَرِبَ الْخَمْرَ۔ (رواه البخاری فی الرقاق)

(۱۹۸) ابوذرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں رات کو باہر نکلا کیا دیکھتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
تن تنہا جا رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی اور شخص نہیں ہے میں نے سمجھا کہ آپ نے اپنے ساتھ کسی کو لینا مناسب نہ سمجھا ہوگا
لہذا میں چاندنی سے ہٹ کر اندھیرے اندھیرے میں چلتا رہا آپ نے رخ پھیرا تو مجھے دیکھا فرمایا کون؟ میں بولا آپ پر قربان
میں ہوں ابوذر۔ فرمایا اے ابوذر یہاں آؤ، میں کچھ دیر آپ کے ساتھ ساتھ چلتا رہا پھر آپ نے فرمایا جو لوگ یہاں بہت مالدار
ہیں قیامت میں وہی سب سے زیادہ نادار ہوں گے مگر صرف وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا تو اس نے دائیں بائیں
آگے پیچھے چاروں طرف (فقیروں کو خوب) دیا اور خوب اچھے اچھے کام کئے۔ پھر میں تھوڑی دیر ساتھ چلا تو مجھ سے فرمایا
یہاں بیٹھ جاؤ اور مجھے ایک صاف میدان میں بٹھا دیا جس کے ارد گرد پتھریلی پتھر تھے اور فرمایا کہ جب تک میں واپس
نہ آؤں یہیں بیٹھے رہنا اس کے بعد آپ اس سنگستان کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ میری نظروں سے غائب
ہو گئے، آپ کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی (واپس آئے) تو میں نے سنا کہ آپ یہ فرماتے آ رہے تھے اگرچہ چوری کی ہو اگرچہ زنا کیا ہو
جب میرے پاس تشریف لے آئے تو مجھ سے نہ رہا گیا آخر میں نے پوچھ ہی لیا یا نبی اللہ آپ پر قربان ہوں اس سنگستان میں
آپ کس سے بات چیت کرتے آ رہے تھے میں نے تو آپ کو جواب دیتے ہوئے کسی کی آواز نہیں سنی فرمایا یہ جبریلؑ تھے۔ اس
سنگستان میں میرے پاس آئے تھے یہ کہہ رہے تھے کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شرک سے پاک وصاف مر گیا ☆

☆ وہ ضرور جنتی ہے۔ میں نے کہا اے جبرئیل اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو انھوں نے کہا جی ہاں۔ میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو۔
انھوں نے کہا جی ہاں۔ میں نے پھر کہا اگرچہ اس نے چوری اور زنا کیا ہو، انھوں نے فرمایا جی ہاں اگرچہ شراب بھی کیوں نہ پی ہو۔

الاسلام یھدم ما کان قبلہ من الذنوب

(۱۹۹) عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ قَالَ لَمَّا أَلْقَى اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي قَلْبِي الْإِسْلَامَ قَالَ أَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيُبَايِعَنِي فَبَسَطَ يَدَهُ إِلَيَّ فَقُلْتُ لَا أُبَايِعُكَ حَتَّى يُغْفَرَ لِي مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِي قَالَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا عَمْرُو أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْهِجْرَةَ تَجُبُّ مَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوبِ يَا عَمْرُو أَمَا عَلِمْتَ أَنَّ الْإِسْلَامَ يَجُبُّ مَا قَبْلَهُ مِنَ الذُّنُوبِ

(رواہ احمد وسعید بن منصور فی سننہ)

اسلام زمانۂ کفر کے سب گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے

(۱۹۹) عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈالدی تو میں آپ کے پاس حاضر ہوا تاکہ آپ مجھے بیعت فرمالیں آپ نے بیعت کے لئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھادیا میں نے کہا میں اس وقت تک آپ سے بیعت نہیں کروں گا جب تک کہ میرے سب پچھلے گناہ معاف نہ ہوں، آپ نے فرمایا اے عمرو کیا تمہیں یہ خبر نہیں کہ ہجرت پہلے سب گناہوں کو ختم کردیتی ہے اے عمرو کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام پہلے گناہوں کا تمام قصہ پاک کردیتا ہے۔

(۱۹۹) قرآن کریم نے رحمت کے اس عفو وکرم کے قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا إِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ۔ (آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر وہ (اپنی حرکتوں سے) اب بھی باز آجائیں تو ان کے پچھلے قصور سب معاف کردیئے جائیں گے) جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور سب ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا تھا اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ تمام اہل ملل کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے یہ ظاہر ہے کہ مذہب کی تلاش صرف اس لئے ہے کہ بندہ کو اپنے خالق کے قہر سے نجات حاصل ہو جائے اور فطرۃً یہی ایک گناہگار کی سب سے بڑی خواہش ہونا بھی چاہئے اس لئے اسلام اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہر ملک وملت ہر نسل ورنگ کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کے لئے ضامن ہوگا۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ مغفرت کا تعلق ذنوب اور گناہوں کے ساتھ ہے اُن حقوق کے ساتھ نہیں جو قرض، عاریت، امانت اور خرید وفروخت کے سلسلہ میں اس کے ذمہ ابھی موجود ہیں۔ اسلام ان سب حقوق کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں کرتا، بلکہ اس کی ذمہ داری اور بڑھا دیتا ہے۔ قرضخواہ کا قرض ادا کرنا ہوگا۔ صاحب عاریت کا عاریت ضرور واپس کرنا ہوگی اور امانت دار کو اس کی امانت یقیناً سپرد کرنا پڑے گی۔ آیت مذکورہ اور عمرو بن العاص کی حدیث کا تعلق زنا، سرقہ، قتل و غارت جیسے جرائم اور صرف ان حقوق العباد کے ساتھ ہے جو کفر کے زمانہ میں ناحق تلف کردیئے گئے تھے۔ اسلام کے بعد اب وہ سب محو ہو جائیں گے اور کیسے محو نہ ہوں جبکہ اسلام اس کے کفر وشرک کی اصل تاریکی ہی محو کرچکا ہے۔ کفر ایک موت ہے اور اسلام اس کے بعد ایک حیاتِ نو۔

(باقی حاشیہ برصفحہ آئندہ)

(۲۰۰) عَنْ اِبْنِ شُمَاسَةَ الْمَهْرِيِّ قَالَ حَضَرْنَا عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ وَهُوَ فِي سِيَاقَةِ الْمَوْتِ يَبْكِي طَوِيْلًا حَوَّلَ وَجْهَهُ اِلَى الْجِدَارِ فَجَعَلَ ابْنُهُ يَقُوْلُ يَا اَبَتَاهُ اَمَا بَشَّرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هٰكَذَا اَمَا بَشَّرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِكَذَا قَالَ فَاَقْبَلَ بِوَجْهِهِ اِلَى الْجِدَارِ وَقَالَ اِنَّ اَفْضَلَ مَا نُعِدُّ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ اِنِّيْ قَدْ كُنْتُ عَلٰى اَطْبَاقٍ ثَلَاثٍ لَقَدْ رَاَيْتُنِيْ وَمَا اَحَدٌ اَشَدَّ بُغْضًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنِّيْ وَلَا اَحَبَّ اِلَيَّ اَنْ اَكُوْنَ قَدِ اسْتَمْكَنْتُ مِنْهُ فَقَتَلْتُهُ فَلَوْ مُتُّ عَلٰى تِلْكَ الْحَالِ لَكُنْتُ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَلَمَّا جَعَلَ اللّٰهُ الْاِسْلَامَ فِيْ قَلْبِيْ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ اُبْسُطْ يَمِيْنَكَ فَلَاُبَايِعْكَ فَبَسَطَ يَمِيْنَهُ

(۲۰۰) ابنِ شماسہ مہری سے روایت ہے کہ ہم عمرو بن العاص کے پاس ان کے دمِ واپسیں کے وقت حاضر تھے وہ زار و قطار رو رہے تھے اور دیوار کی طرف اپنا رخ کئے ہوئے تھے، ان کے صاحبزادہ ان کو سمجھانے لگے۔ اے والدِ ماجد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو تو بڑی بڑی بشارتیں دی ہیں یہ سن کر انھوں نے دیوار کی طرف سے اپنا رخ بدلا اور فرمایا بھی سب سے افضل چیز جو ہم نے آخرت کے لئے تیار کی ہے وہ توحید و رسالت کی شہادت ہے میری زندگی کے تین دور گذرے ہیں ایک دور تو وہ تھا جبکہ آپ سے بغض رکھنے والا مجھ سے زیادہ کوئی اور شخص نہ تھا اور جبکہ میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح آپ پر میرا قابو چل جائے تو میں آپ کو مار ڈالوں یہ تو میری زندگی کا سب سے بدترین دور تھا۔ اگر (خدا نہ خواستہ) میں اسی حال پر مرجاتا تو یقیناً دوزخی ہوتا اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈالی تو میں آپ کے پاس آیا اور میں نے کہا لائیے ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں آپ نے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ آپ نے فرمایا اے عمرو یہ کیا۔ میں نے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) لیکن جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار پڑسکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہوسکتے ہیں اس لئے اس کو ایسے اعمال کی ضرورت پھر باقی رہتی ہے جو اس کے اس جدید زندگی کے فروگذاشتوں کا کفارہ بن جائیں۔ حدیث مذکور نے اس کے لئے یہاں دو عمل بتائے ہیں ہجرت اور حج۔ یہ دونوں اعمال اگر اپنے پورے شرائط کے ساتھ ادا کئے جائیں تو یہ حقوق اللہ کے لئے کفارہ بن جاتے ہیں اور خاص حج کے متعلق یہ بھی امید ہے کہ وہ حقوق العباد کا کفارہ بھی بن جائے اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ صاحبِ حقوق کو اپنے خزانۂ غیب سے ان کے حقوق کا عوض دیکر ان سے دست برداری دلا دے اور اُسے معاف کردے۔ مشہور ہجرت تو ختم ہو چکی، حج روز ادا نہیں ہوتا اس لئے ایک کمزور انسان کو جو سر تاپا قصور ہی قصور ہے قدم قدم پر ایسے اعمال کی ضرورت ہے جو اس کی کوتاہیوں کا کفارہ بنتے رہیں اس لئے اسلام میں اور بھی بہت سے اعمال ہیں جو اس کی اس درمیانی فروگذاشتوں کا کفارہ بنتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ سب اعمال کفارہ کے باب میں فروعی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہجرت اسلامی زندگی کا ایک تاریخی عمل ہے اور حج جملہ ادیان میں اہمیت رکھتا چلا آیا ہے اس لئے ان دونوں کی حیثیت اصل کی ہے اور ان سب کے لئے اسلام کی حیثیت اصل الاصل کی۔

قَالَ فَقَبَضْتُ يَدِي قَالَ مَالَكَ يَا عَمْرُو قَالَ قُلْتُ أَرَدْتُ أَنْ أَشْتَرِطَ قَالَ تَشْتَرِطُ بِمَاذَا قُلْتُ أَنْ يُغْفَرَ لِي قَالَ أَمَا عَلِمْتَ يَا عَمْرُو أَنَّ الْإِسْلَامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَأَنَّ الْهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهَا وَأَنَّ الْحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ وَمَا كَانَ أَحَدٌ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَا أَجَلَّ فِي عَيْنِي مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أُطِيقُ أَنْ أَمْلَأَ عَيْنَيَّ مِنْهُ إِجْلَالًا لَهُ وَلَوْ سُئِلْتُ أَنْ أَصِفَهُ مَا أَطَقْتُ لِأَنِّي لَمْ أَكُنْ أَمْلَأُ عَيْنَيَّ مِنْهُ وَلَوْ مُتُّ عَلَى تِلْكَ الْحَالِ لَرَجَوْتُ أَنْ أَكُونَ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ وَلِينَا أَشْيَاءَ مَا أَدْرِي مَا حَالِي فِيهَا فَإِذَا أَنَا مُتُّ فَلَا تَصْحَبْنِي نَائِحَةٌ وَلَا نَارٌ فَإِذَا دَفَنْتُمُونِي فَشُنُّوا عَلَيَّ التُّرَابَ شَنًّا ثُمَّ أَقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْرَ مَا تُنْحَرُ جَزُورٌ وَيُقْسَمُ لَحْمُهَا حَتَّى أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ وَأَنْظُرَ مَاذَا أُرَاجِعُ بِهِ رُسُلَ رَبِّي۔ (رواہ مسلم)

(۲۰۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ نَاسًا مِنْ أَهْلِ الشِّرْكِ قَتَلُوا فَأَكْثَرُوا وَزَنَوْا فَأَكْثَرُوا ثُمَّ أَتَوْا مُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالُوا إِنَّ الَّذِي تَقُولُ وَتَدْعُو لَحَسَنٌ وَلَوْ تُخْبِرُنَا أَنَّ لِمَا عَمِلْنَا كَفَّارَةً فَنَزَلَ (وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ

عرض کیا میں کچھ شرط لگانا چاہتا ہوں۔ فرمایا کیا شرط لگانا چاہتے ہو میں نے کہا یہ کہ میرے سب گناہوں کی مغفرت ہو جائے۔ آپ نے فرمایا اے عمرو کیا تمہیں خبر نہیں کہ اسلام تو کفر کی زندگی کے گناہوں کا تمام قصہ ہی پاک کر دیتا ہے اور ہجرت بھی پہلے تمام گناہ ساقط کر دیتی ہے اور حج بھی پہلے سب گناہ ختم کر دیتا ہے۔ یہ دور وہ تھا جبکہ آپ سے زیادہ پیارا آپ سے زیادہ بزرگ و برتر میری نظروں میں کوئی اور باقی نہ رہا تھا۔ آپ کی عظمت کی وجہ سے میری یہ تاب نہ تھی کہ کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھ سکتا اگر مجھ سے آپ کی صورت پوچھی جائے تو میں کچھ نہیں بتا سکتا کیونکہ میں نے کبھی پوری طرح آپ کو دیکھا ہی نہیں۔ کاش اگر میں اس حال پر مر جاتا تو امید ہے کہ جنتی ہوتا۔ اس کے بعد ہم کچھ چیزوں کے متولی بنے اور نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا حال ان میں کیا رہا (یہ میرا دورِ زندگی تھا) اچھا دیکھو جب میری وفات ہو جائے تو میرے ساتھ کوئی نوحہ کرنے والی عورت نہ جانے پائے اور نہ زمانۂ جاہلیت کی طرح آگ میرے جنازہ کے ساتھ ہو اور جب مجھے دفن کر چکو تو میری قبر میں اچھی طرح مٹی ڈالنا اور (جب فارغ ہو جاؤ) تو میری قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرنا جتنی دیر کہ اونٹ نحر کر کے اس کا گوشت تقسیم ہو سکتا ہے تاکہ تمہاری وجہ سے میرا دل لگا رہے اور میں یہ معلوم کر لوں کہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے فرشتوں کے سوالات کے جوابات کیا دیتا ہوں۔

(۲۰۱) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کچھ مشرکوں نے خوب قتل اور خوب زنا کیا پھر آپ کے پاس حاضر ہوئے اور بولے جو باتیں آپ فرماتے ہیں اور جن کی دعوت دیتے ہیں تو وہ سب ٹھیک۔ کاش آپ ہمیں اس کا بھی اطمینان

وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا) وَنَزَلَ (يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ)۔

(۲۰۲) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَيْخٌ كَبِيْرٌ يَدَّعِمُ عَلٰى عَصًا لَهٗ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ لِيْ غَدَرَاتٍ وَفَجَرَاتٍ فَهَلْ يُغْفَرُ لِيْ قَالَ اَلَسْتَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ قَالَ بَلٰى وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ قَدْ غُفِرَ لَكَ غَدَرَاتُكَ وَفَجَرَاتُكَ۔ (رواہ احمد والطبرانی وسندہ جید)

(۲۰۳) عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِذَا اَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسُنَ اِسْلَامُهٗ يُكَفِّرُ اللّٰهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا وَكَانَ بَعْدَ ذٰلِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِائَةِ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةُ بِمِثْلِهَا اِلَّا اَنْ يَّتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا (رواہ البخاری فی الایمان)

دلادیتے کہ جو بدکاریاں ہم پہلے کر چکے ہیں اُن کے بخشش کی بھی کوئی صورت ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی (جو لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا نہیں مانتے اور جس کا خون اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس کو قتل نہیں کرتے مگر ضابطہ میں اور زنا نہیں کرتے اور جو یہ باتیں کریں وہ بڑے گناہ میں جا پڑے) اور یہ آیت بھی اتری (اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)۔

(۲۰۲) عمرو بن عبسہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک بوڑھا اپنی لکڑی کا سہارا لئے ہوئے آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی یا رسول اللہ میں اپنے کفر کے زمانہ میں بہت سی خیانتیں اور قسم قسم کی بیہودگیاں کر چکا ہوں کیا (اسلام کے بعد) وہ سب معاف کردی جائیں گی آپ نے فرمایا کیا تو یہ گواہی نہیں دیتا کہ خدا کوئی نہیں مگر ایک اللہ۔ اس نے کہا کیوں نہیں میں تو یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں آپ نے فرمایا تو جا تیری سب خیانتیں اور بیہودگیاں معاف ہو گئیں

(۲۰۳) ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب آدمی مسلمان ہو جاتا ہے اور اس کا اسلام خوبصورت اسلام بن جاتا ہے تو جتنی برائیاں وہ پہلے کر گذرا تھا اللہ تعالیٰ سب معاف کر دیتا ہے اور اس کے بعد حساب یہ رہتا ہے کہ ایک نیکی کے عوض میں دس نیکیوں سے سات سو گنا تک نیکیاں مل سکتی ہیں اور برائی کے بدلہ میں صرف ایک برائی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے۔ (تو اب برائی کے بدلہ ایک برائی بھی نہیں لکھی جاتی)۔

(۲۰۲) ہر عاصی فطرۃً اس کا متلاشی ہوتا ہے کہ اس کے گناہوں کی بخشش ہو جائے۔ اگر تبدیلِ مذہب کے بعد بھی گناہوں کا بوجھ سر سے ہلکا نہیں ہوتا۔ تو پھر تبدیلِ مذہب کا فائدہ؟ (باقی حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

الاعمال بغیر الایمان اجساد لا ارواح لها

(۴۰۳) عَنْ فَضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ يَقُوْلُ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ الشُّهَدَاءُ اَرْبَعَةٌ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْاِيْمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ اَعْيُنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ هٰكَذَا وَرَفَعَ رَأْسَهٗ حَتّٰى سَقَطَتْ قَلَنْسُوَتُهٗ فَمَا اَدْرِيْ اَقَلَنْسُوَةَ عُمَرَ اَرَادَ اَمْ قَلَنْسُوَةَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

ایمان کے بغیر اعمال صرف خوشنما قالب ہیں جن میں روح نہیں

(۴۰۳) فضالہ بن عبید روایت فرماتے ہیں کہ میں نے عمر بن الخطابؓ سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ شہید چار قسم کے ہیں ایک وہ کھرے ایمان والا جو دشمن کے مقابل ہوا اور اس بہادری سے لڑا کہ ثبات قدمی کی جو شان اللہ تعالیٰ نے مومنین کی بیان فرمائی تھی وہ اس نے اپنے عمل سے سچی کر دکھائی (اور نہایت دلیری سے لڑتا رہا) یہاں تک کہ شہید ہوگیا یہ تو وہ مومن ہے جس کے مرتبے اتنے بلند ہوں گے کہ قیامت کے دن لوگ اس کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر اس طرح دیکھیں گے

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس لئے اسلام یہ اطمینان دلاتا ہے کہ گنہگاروں کو مایوسی کا موقع نہیں ہے اگر دوسرے مذاہب یہ گارنٹی نہیں کرتے تو اسلام خوشی سے اس گارنٹی کے لئے تیار ہے ۔ ؎

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی میرے جرم ہائے سیاہ کو تیرے عفو بندہ نواز میں

(۴۰۳) حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں۔ ظاہر و باطن سے اسلام قبول کرلیا جائے اور ہر عمل کے وقت یہ تصور قائم رکھنے کی کوشش رہے کہ قادر مطلق کی نظر اس کو برابر دیکھ رہی ہے وہ اس سے دور نہیں بہت قریب ہے اور اتنا قریب ہے کہ رگ جان بھی اتنی قریب نہیں۔ جو نقل و حرکت وہ کرتا ہے اس کو خوب جانتا ہے۔ اس طرح اسلام قبول کرنے کا خاصہ یہ ہے کہ جو بدکاریاں وہ کفر کی زندگی میں کر چکا ہے وہ یک قلم معاف ہو جاتی ہیں اور اس کو ایک ایسی نئی اور پاک زندگی میسر آجاتی ہے جیسا آج وہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ شیخ محی الدین نووی فرماتے ہیں کہ اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ دل سے اسلام لائے محض نمائشی اسلام نہ ہو کہ یہ نفاق ہے۔ پس جو دل سے مسلمان ہوگیا اس کے زمانۂ کفر کے سب گناہ معاف ہوگئے اور جس کے دل میں نفاق رہا وہ اس بشارت کا مستحق نہیں۔

(حاشیہ صفحہ ھذا) (۴۰۴) اس تقسیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مجاہد کبھی تو بہادر ہونے کے ساتھ متقی بھی ہوتا ہے کبھی صرف متقی ہوتا ہے بہادر نہیں ہوتا اس کے برخلاف کبھی ایک شخص بہادر تو ہوتا ہے مگر متقی نہیں ہوتا۔ پھر یہ غیر متقی یا تو معمولی طور پر گنہگار رہتا ہے اور کبھی کھلا ہوا فاسق ہوتا ہے۔ طیبی فرماتے ہیں، اس تقسیم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اعمال کی تمام قیمت ایمان ہی کے بعد ہے اسی لئے چوتھا شخص اگرچہ بہادر تھا اور دوسرا اگرچہ بزدل مگر ایمان ہی کے ضعف و قوت کے تفاوت سے یہ بہادر چوتھے نمبر میں اور وہ بزدل دوسرے نمبر میں پہنچ گیا ہاں اگر خوش قسمتی سے ایمان کے ساتھ بہادری بھی جمع ہوجائے تو اس کے کیا کہنے۔

وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ جَيِّدُ الْإِيمَانِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَكَأَنَّمَا ضُرِبَ جِلْدُهُ بِشَوْكِ طَلْحٍ مِنَ الْجُبْنِ أَتَاهُ سَهْمٌ غَرْبٌ فَقَتَلَهُ فَهُوَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّانِيَةِ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ خَلَطَ عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَاكَ فِي الدَّرَجَةِ الثَّالِثَةِ وَرَجُلٌ مُؤْمِنٌ أَسْرَفَ عَلٰى نَفْسِهِ لَقِيَ الْعَدُوَّ فَصَدَقَ اللّٰهَ حَتّٰى قُتِلَ فَذَاكَ فِي الدَّرَجَةِ الرَّابِعَةِ۔ (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن غریب)

(۲۰۵) عَنْ أَبِي إِسْحَاقَ قَالَ سَمِعْتُ الْبَرَاءَ يَقُولُ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ بِالْحَدِيدِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ أُقَاتِلُ أَوْ أُسْلِمُ قَالَ أَسْلِمْ ثُمَّ قَاتِلْ فَأَسْلَمَ ثُمَّ قَاتَلَ فَقُتِلَ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمِلَ قَلِيلًا وَأُجِرَ كَثِيرًا (بخاری)

یہ کہہ کرانھوں نے اپنا سر اٹھایا یہاں تک کہ ان کی ٹوپی سر سے گر گئی۔ راوی کہتا ہے یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے استاد کی مراد کس کی ٹوپی تھی حضرت عمرؓ کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے بعد فرمایا دوسرا وہ شخص ہے جس کا ایمان تو کھرا تھا لیکن وہ (بہادر نہ تھا) جب دشمن کے آمنے سامنے ہوا تو مارے بزدلی کے اس کا حال یہ ہو گیا کہ گویا اس کے جسم میں طلح درخت کے کانٹے چبھو دیئے گئے۔ پھر کسی نامعلوم سمت سے ایک تیر آ کر اس کے لگا اور اس کو ختم کر دیا۔ یہ دوسرے درجہ کا شہید ہے۔ تیسرا معمولی درجہ کا مومن ہے جس نے پہلے عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کئے تھے جب دشمن سے لڑا تو ایسی جانبازی سے لڑا کہ اللہ تعالیٰ نے مومن کی جو شان بیان فرمائی تھی اس کو سچا کر دکھایا یہاں تک کہ شہید ہو گیا یہ تیسرے نمبر کا شہید ہے۔ چوتھا وہ شخص ہے جس نے گناہ کرنے کی حد باقی نہ رکھی تھی (مگر بہادر تھا) جب لڑا تو اپنے عمل سے اللہ تعالیٰ کو سچا ثابت کر دیا اور خوب بہادری سے لڑا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ یہ چوتھے نمبر کا شہید ہے۔

(۲۰۵) ابو اسحاق سے مروی ہے کہ میں نے براء کو یہ کہتے سنا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص (زرہ پہنے) سرتا پا لوہے میں ڈھکا ہوا آیا اس نے کہا یا رسول اللہ میں پہلے جہاد میں شریک ہو جاؤں یا پہلے اسلام لے آؤں پھر جہاد کروں آپ نے فرمایا پہلے اسلام قبول کر اس کے بعد جہاد کرنا۔ چنانچہ وہ پہلے مسلمان ہوا اس کے بعد جہاد کیا اور شہید ہو گیا آپ نے فرمایا اس نے کام تو کم کیا مگر ثواب بہت پائے گا۔

(۲۰۵) یعنی زمانہ کفر کا بڑا عمل بھی بے وزن ہے اور ایمان کا تھوڑا سا عمل بھی بہت بھاری ہے۔ جاں نثاری کی تمام قیمت اس وقت ہے جبکہ وفاداری کا طوق گلے میں پڑا ہو ورنہ صرف ایک غدار کی موت ہے جس صورت سے بھی آجائے، خس کم جہاں پاک۔ اسی لئے آپ نے اس شخص کو پہلے اسلام لانے کا مشورہ دیا۔ اس خوش نصیب کے گذشتہ گناہ تو اسلام سے معاف ہو گئے تھے پھر اس معصومی کی حالت میں جو پہلا عمل اس نے کیا وہ شہادت تھا اس لئے اس کے عمل کی مدت گو بہت قلیل رہی مگر ثواب کی بہت بڑی بازی جیت لے گیا۔ امام بخاریؒ نے اس حدیث سے ایک اور لطیفہ استنباط کیا ہے یعنی جہاد کرنے سے پہلے کوئی اچھا عمل کرنا مطلوب ہے تاکہ عمل خیر کی برکت ثبات قدمی میں معین ہو۔

مثل الذی یقرأ القران ولا یومن کالریحانۃ ریحہا طیب وطعمہا مر

(۲۰۶) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ الْمُؤْمِنُ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَیَعْمَلُ بِہٖ کَالْاُتْرُجَّۃِ طَعْمُہَا طَیِّبٌ وَرِیْحُہَا طَیِّبٌ وَالْمُؤْمِنُ الَّذِیْ لَا یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ وَیَعْمَلُ بِہٖ کَالتَّمْرَۃِ طَعْمُہَا طَیِّبٌ وَلَا رِیْحَ لَہَا وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ کَالرَّیْحَانَۃِ رِیْحُہَا طَیِّبٌ وَطَعْمُہَا مُرٌّ وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ لَا یَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ کَالْحَنْظَلَۃِ طَعْمُہَا مُرٌّ اَوْ خَبِیْثٌ وَرِیْحُہَا مُرٌّ (بخاری)

بشارۃ التضعیف بعشر امثالہا لمن اسلم

(۲۰۷) حَدَّثَنَا اَبُوْ ہُرَیْرَۃَ عَنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی اِذَا تَحَدَّثَ عَبْدِیْ بِاَنْ یَعْمَلَ حَسَنَۃً فَاَنَا

اس کی مثال جو ایمان نہیں رکھتا اور قرآن پڑھتا ہے نازبو کی طرح ہے جس کی خوشبو اچھی مگر ذائقہ تلخ ہوتا ہے

(۲۰۶) ابو موسیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جو مومن قرآن پڑھتا اور اس پر عمل بھی کرتا ہے وہ رنگترے کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی اچھا اور خوشبو بھی اچھی اور جو قرآن نہیں پڑھتا مگر اس کے احکام پر عمل کرتا ہے وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ تو اچھا مگر خوشبو کچھ نہیں اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال ریحان (نازبو) کی سی ہے جس کی خوشبو تو بہت اچھی مگر ذائقہ تلخ اور جو قرآن بھی نہیں پڑھتا اس کی مثال درخت حنظل کی سی ہے جس کا ذائقہ بھی تلخ اور بو بھی ناگوار۔ (بخاری شریف)

جو اسلام لے آئے اس کے لئے ایک نیکی پر دس نیکیوں کی بشارت

(۲۰۷) ابو ہریرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث قدسی میں روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے میرا بندہ جب اپنے دل میں کوئی نیک کام کرنے کا خیال کرتا ہے تو صرف اس خیال پر میں

---

(۲۰۶) یعنی جس طرح پھل کی صرف خوشبو سے اس کے ذائقہ کا حال معلوم نہیں ہوتا اسی طرح صرف قرآن پڑھنے سے کسی کے ایمان کا حال نہیں کھلتا اور جس طرح کہ پھل کی اصل خوبی اس کا خوش ذائقہ ہوتا ہے صرف اس کی خوشبو نہیں وہ ایک سامانِ تفریح ہے اسی طرح انسان کی اصل خوبی ایمان ہے صرف تلاوتِ قرآن نہیں یہ مومن کے ایمان کی زینت ہے نہ کہ منافق کے نفاق کی مگر مشک جس کے پاس ہوگا خوشبو بھی دے گا اسی طرح قرآن جو تلاوت کرے گا اس کی خوشبو ضرور مہکے گی مگر صرف اتنی بات پر دھوکا نہ کھانا چاہئے عمل کی اصل روح ایمان ہے۔

(۲۰۷) اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عزم معصیت کے بعد اس پر عمل نہ کرنے پر نیکی صرف اس صورت میں لکھی جاتی ہے

أَكْتُبُهَا لَهُ حَسَنَةً مَا لَمْ يَعْمَلْ فَإِذَا عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا وَإِذَا تَحَدَّثَ بِأَنْ يَعْمَلَ سَيِّئَةً
فَأَنَا أَغْفِرُهَا لَهُ مَا لَمْ يَعْمَلْهَا فَإِذَا عَمِلَهَا فَأَنَا أَكْتُبُهَا لَهُ بِمِثْلِهَا وَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

ایک نیکی لکھ دیتا ہوں، یہ تو اُس وقت تک ہے جب تک وہ اُسے کرتا نہیں اور اگر یہ نیکی کر لیتا ہے تو اب اس کا دس گنہ لکھتا ہوں اور جب دل میں کسی بُرائی کا خیال کرتا ہے تو اُسے معاف کر دیتا ہوں اگر کر لیتا ہے تو اُسے صرف ایک بُرائی لکھتا ہوں۔ آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ فرشتے عرض کرتے ہیں اے پروردگار یہ تیرا بندہ

جبکہ اس معصیت کا نہ کرنا خدا کے خوف پر مبنی ہو، اگر نا سازگاریٔ حالات کی وجہ سے یہ معصیت وجود میں نہ آسکی یا کسی سہو و نسیان کی بنا پر ذہن سے نکل گئی تو اس قسم کی صورتوں میں صرف ترکِ معصیت سے وہ نیکی کا حقدار نہیں ہوتا۔ صحیح مسلم میں اسراء کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا ملنے کا ضابطہ ان خصوصی انعامات میں داخل ہے جو معراج کی پُر اسرار شب میں آپ پر کئے گئے تھے۔ بہر حال جس امت کو قلیل مدت میں تمام امتوں پر فائق بنانا منظور تھا اس کی صورت یہی ہو سکتی تھی کہ اس کے قلیل عمل کے لئے تضعیف کا ضابطہ وضع کر دیا جائے تاکہ اس جدید قانون کے ماتحت اس کے تھوڑے عمل بھی دوسری امتوں کے طویل مدتوں کے عمل سے بڑھ جائیں۔ اور اس پیرایہ سے عمل کی بازی جس امت کو جتانی منظور تھی وہ جیت بھی جائے اور قانونِ عدل و فضل دونوں کا اقتضاء بھی پورا ہو جائے۔ اس حدیث میں کسی نیک یا بدکام کے عملی جامہ پہنانے یا ارادہ کرنے کی چار صورتیں مذکور ہیں۔

(۱) نیکی کا ارادہ کر کے اس پر عمل بھی کر لینا۔ (۲) نیکی کا صرف ارادہ کرنا اور اس پر عمل نہ کرنا۔ عمل و ارادہ کے اعتبار سے بدی کی بھی یہی دو صورتیں ہیں۔ اس طرح یہ چار صورتیں بن جاتی ہیں۔ پہلی صورت میں ایک نیکی دس گنہ، سات سو گنہ اور کبھی مراتب اخلاص کے اعتبار سے شمار کی حد بندی سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں صرف ارادہ پر پوری ایک نیکی لکھدی جاتی ہے لیکن بدی کا حکم یہ نہیں ہے۔ یہاں عمل کی صورت میں صرف ایک بدی لکھی جاتی ہے اور ارادہ کے بعد نہ کرنے پر بدی کے بجائے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

صحیح مسلم میں اسی روایت میں ابنِ عباسؓ سے حدیث النفس کی بجائے هَمّ کا لفظ مروی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف خطرہ کا درجہ مراد نہیں بلکہ ارادہ کا وہ مرتبہ مراد ہے جس کے بعد عمل کے لئے دل میں فکر پیدا ہو جائے اسی کا نام هَمّ ہے۔

خریم بن فاتک کے الفاظ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عزم مراد ہے صرف وسوسہ و خیال مراد نہیں۔

من همّ بحسنة فلم يعملها فعلم الله منه انه قد اشعر قلبه وحرص عليها كتبت له حسنة	"جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ اس کا برابر احساس کر رہا ہے اور اس کو عمل میں لانے کے لئے حریص ہے پھر ان مراحل کے بعد بھی اگر اس کو نہ کیا تو بے شک اب . . . . . . اس کے لئے ایک نیکی لکھدی جائے گی۔"

صرف حسنہ کے ارادہ پر ایک نیکی لکھے جانے میں تو کوئی تفصیل نہیں ہے لیکن سیئہ کے ارادہ کر لینے کے بعد نہ کرنے پر ایک حسنہ ملنے پر قدرے تفصیل کی حاجت ہے۔

عزم علی المعصیۃ کی وہ صورت جس سے مقصود شریعت کا استخفاف و استہزاء ہو یہاں زیرِ بحث ہی نہیں یہ تو کھلا ہوا کفر ہے۔
اسی طرح وہ صورت بھی زیرِ بحث نہیں ہے جہاں ایک شخص صرف اپنی خواہشِ نفس کی بنا پر کسی معصیت کا عزم کر لیتا ہے لیکن اس کے

قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ رَبِّ ذَاكَ عَبْدُكَ يُرِيْدُ اَنْ يَّعْمَلَ سَيِّئَةً وَهُوَ اَبْصَرُ بِهٖ فَقَالَ ارْقُبُوْهُ فَاِنْ عَمِلَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ بِمِثْلِهَا وَاِنْ تَرَكَهَا فَاكْتُبُوْهَا لَهٗ حَسَنَةً اِنَّمَا تَرَكَهَا مِنْ جَرَّائِيْ ۔ (رواہ مسلم والبخاری نحوہ)

برائی کرنے کا قصد کر رہا ہے (حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ان سے زیادہ ہوتا ہے) ارشاد ہوتا ہے ابھی اسے دیکھتے رہو اگر کرلے تو اس کی صرف ایک برائی لکھ لو اور اگر چھوڑ دے تو اب اس کے حق میں اسے بھی ایک نیکی لکھ لو، کہ اس نے میرے ہی خوف سے اس برائی کو چھوڑا ہے۔ (متفق علیہ)

بعد خدا کے خوف سے وہ اس معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ یہاں بھی بلاشبہ اس کے خوف وخشیت کی وجہ سے ایک حسنہ کا ثواب ملنا چاہیے جیسا کہ صورتِ مذکورہ میں اگر ترکِ معصیت کا داعیہ مخلوق کا خوف یا محض ریاکاری ہو تو اس سے مواخذہ ہونا چاہیے۔ غور طلب صورت صرف یہ ہے کہ ایک شخص عزم کر لینے کے بعد خود بخود اپنے ارادہ میں سست پڑ جاتا ہے اور اس لئے عمل کرنے کی اسے نوبت ہی نہیں آتی۔ کیا اس کا صرف یہ عزم بھی معصیت شمار ہوگا یا جبکہ عمل کی حد تک پہنچا ہی نہیں تو معاف ہو جائے گا۔ فقہاء و متکلمین و محدثین کا مختار تو یہ ہے کہ چونکہ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا اس لئے اس سے مواخذہ ہوگا گو یہ مواخذہ خود اس معصیت کے مواخذہ سے ہلکا رہے۔

ابن المبارکؒ نے سفیان ثوریؒ سے دریافت کیا کیا آدمی کے ارادہ پر بھی مواخذہ ہوتا ہے فرمایا ہاں جب پختہ ہو جائے امام شافعیؒ اور ابن حامد اس طرف ہیں کہ صرف عزم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے جب تک کہ اس کو منہ سے نہ نکالے یا اس پر عمل نہ کرے۔ یہ تمام تفصیل اُن معاصی کے ارادہ میں ہے جن کا تعلق جوارح کے ساتھ ہو مثلاً چوری، زنا، شراب خواری وغیرہ۔ رہ گئے وہ اعمال جن کو اعمالِ قلبیہ کہا جاتا ہے جیسے کفر، حسد، جذبۂ ایذا رسانی وغیرہ جہاں عملِ جوارح کا سوال ہی نہیں تو یہاں بلا تردد صرف عزم بلکہ ہم پر بھی مواخذہ ہوگا۔

فقہاء و متکلمین اور امام شافعیؒ کے درمیان زیرِ اختلاف شق اب بھی تشنہ ہے۔ ہمارے نزدیک حافظ ابن رجب کی تفصیل یہاں بہت دلپذیر ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی معصیت کا پہلی ہی مرتبہ ارادہ کرتا ہے یعنی ابھی اس نافرمانی کی اپنی عمر بھر میں اسے نوبت ہی نہیں آئی تھی تو پہلی مرتبہ عزم پر اس سے مواخذہ نہ ہوگا لیکن اگر وہ اس معصیت کا ذائقہ کبھی پہلے چکھ چکا ہے اور اب پھر اس کا عزم کر رہا ہے تو اس کے اس عزم پر بھی مواخذہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اب اسے صرف عزم نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اصرار کی تعریف میں آجاتا ہے یہ قابلِ اغماض نہیں جیسا کہ وہ شخص جو عزم کے بعد اپنی جانب سے تو اس عمل کے تمام مقدمات پورے کر چکا ہو پھر کچھ آسمانی اسباب ایسے رونما ہو جائیں جو اس کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہو جائیں وہ بھی اس قدرتی معذوری کی بنا پر معذور نہیں کہا جا سکتا اب وہ بھی قابلِ درگذر نہیں ہے۔ اسی لئے جب آپ نے قاتل و مقتول کے متعلق جہنم کی وعید بیان فرمائی تو سامعین نے پوچھا کہ بیچارا مقتول دوزخ میں کیوں گیا۔ آپ نے فرمایا کہ انه كان حريصا على قتل صاحبه۔ وہ بھی تو اپنے بھائی کے قتل کرنے کی فکر میں لگ رہا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی سبب سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاتل و مقتول گناہ میں دونوں برابر ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ قاتل کا جرم شدید ہے اس کو سزا بھی شدید ملے گی بلکہ مقصد یہ ہے کہ جو پورے عزم کے بعد عمل کے لئے قدم بھی اٹھا چکا ہے اگرچہ کسی سبب سے کامیاب نہ ہو سکا لیکن وہ اپنی اس غیر اختیاری ناکامی سے اپنے اس اختیاری عزم اور اس کو پورا کرنے کی اختیاری سعی کے جرم سے

بشارة التضاعيف لمن حسن اسلامه

(۲۰۸) عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَحْسَنَ اَحَدُكُمْ بِاِسْلَامِهِ فَكُلُّ حَسَنَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِمِاَئَةِ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَعْمَلُهَا تُكْتَبُ لَهٗ بِمِثْلِهَا وَفِي رِوَايَةٍ اِلَّا اَنْ يَتَجَاوَزَ اللّٰهُ عَنْهَا۔ (رواه الشيخان)

جو اپنے اسلام میں خوبی پیدا کرے اس کے لئے ایک نیکی پر سات سو گنا نیکیوں کی بشارت

(۲۰۸) ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا جب تم میں کوئی سچا اور پکا مسلمان بن جاتا ہے تو پھر جو نیکی کرتا ہے وہ اس کے نامۂ اعمال میں دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہیں اور جو برائی کرتا ہے وہ صرف اتنی ہی لکھی جاتی ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ احتمال یہ بھی رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے درگذر فرمائے (تو اب ایک بھی نہیں لکھی جاتی) (بخاری و مسلم)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) بری نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عزم کے بعد عمل کے لئے سعی کرنا قابلِ مواخذہ ہو سکتا ہے اسی طرح کسی معصیت کے ارتکاب کے بعد اس کا پھر ارادہ کرنا بھی قابلِ مواخذہ ہونا چاہئے کیونکہ اب یہ محض عزم باقی نہیں رہا بلکہ عمل کی ابتدائی کڑی سمجھا جائے گا اگرچہ وہ کتنی ہی بعید ہو صرف عزم پر مواخذہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے مگر یہ واضح رہنا چاہئے کہ عمل کی تمام روح انسان کی قوتِ ارادی ہے۔ اگر انسان کی اس قوت کو پورے طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے اور اس کے عزم پر کسی قسم کا کنٹرول قائم نہ رکھا جائے تو اس کے بعد معاصی و فواحش سے اس کو روکنا بہت مشکل بلکہ بے نتیجہ ہوگا لہٰذا اگر آپ صرف عزم پر مواخذہ کی شکل پر غور کر رہے ہیں تو اس شکل پر بھی ذرا غور کیجئے کہ اگر یہ اعلان کر دیا جائے کہ کسی بد تر سے بد تر گناہ جیسے قتل، چوری، زنا، شراب خواری کا پورا پورا عزم کرنے کے بعد بھی انسان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوتا تو کیا بالفاظِ دیگر یہ ان افعال کے اجازت دینے کے مرادف نہ ہوگا۔ ارادہ کا یہ درجہ عمل سے بہت ہی قریب ہے۔ کیا اس مرتبہ سے اغماض اور دوسرے بالکل متصل نقطہ پر مواخذہ کرنا انسانی صنعت کے مناسب ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) (۲۰۸) حسنات کی اس تضعیف کی ابتدا اس وقت ہوتی ہے جب ایمان و اسلام سے گذر کر صفتِ احسان میں قدم رکھا جائے۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اُس کا دس گنا ملنا تو اس امت کے حق میں عام ضابطہ ہے لیکن خدا کی رحمت اپنا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لئے کھلا رکھتی ہے جیسے جیسے صفتِ احسان کامل ہوتی جائے گی یعنی عبادت میں جتنا خلوص اور اللہ تعالیٰ کی رؤیت کا جتنا تصور غالب ہوتا جائے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح بعض وقت خود عمل کی برتری و فضیلت اور کبھی ضرورت کا بروقت احساس کرنا بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے۔ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ حسب ذیل آیت تو عام مسلمانوں کے بارے میں ہے۔

مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا — جو ایک نیکی کرے گا اس کو اس کا دس گنا ملے گا۔

پھر مہاجرین کے لئے کیا ضابطہ ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ اس سے اور زیادہ ثواب اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

اذا احسن اسلامہ یکتب لہ فی الاسلام کل حسنۃ عملھا فی الشرک

(۲۰۹) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ الْخُدْرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ الْکَافِرَ اِذَا اَحْسَنَ اِسْلَامَہٗ یُکْتَبُ لَہٗ فِی الْاِسْلَامِ کُلُّ حَسَنَۃٍ عَمِلَھَا فِی الشِّرْکِ (ذکر الدار قطنی تلک الزیادۃ فی حدیث ابی سعید کما حکاہ النووی فی شرح مسلم)

اچھے اسلام کے بعد زمانۂ کفر کی نیکیاں بھی نامۂ اعمال میں لکھدی جاتی ہیں

(۲۰۹) ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب آدمی کے اسلام میں خوبصورتی پیدا ہوجاتی ہے تو اس کی تمام وہ نیکیاں جو اس نے شرک کے زمانہ میں کی تھیں اسلام کے بعد سب لکھدی جاتی ہیں (دار قطنی)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُضَاعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے اور بڑا ثواب دیتا ہے"۔ ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھدیتا ہے جیسا کہ آیت بالا میں ہے کہ وہ اپنے پاس سے بڑا ثواب اور بھی دیتا ہے۔ تو اب سوچو کہ اس ثواب کا اندازہ کون کرسکتا ہے (جامع العلوم والحکم ص ۲۵۵) بہرحال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سو گنہ پر جاکر بھی ختم نہیں ہوتا اس سے بھی کہیں اوپر پہنچتا ہے بیشک جس کی رحمت غیر متناہی ہو اس کے انعامات کی انتہا بھی نہ ہونا چاہئے لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ علی الحساب داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان رکھا گیا ہے۔ اسلام و ایمان اور احسان کے ہر سہ ارتقائی مراتب کی تفصیل چند عنوانات کے بعد عنقریب آپ کے سامنے آنے والی ہے۔

(۲۰۹) اس حدیث میں ایک بڑی اہم بحث یہ ہے کہ کیا زمانۂ شرک و کفر کی نیکیاں بھی معتبر ہوسکتی ہیں۔ حافظ ابن حجرہ کا رجحان بظاہر نفی کی طرف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کفر انسان کی اتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کے بعد اس کا کوئی نیک کام بھی نیک نہیں رہتا اور ابن منیر سے حدیث کی یہ توجیہ نقل کرتے ہیں کہ بحالتِ کفر کافر کے حسنات کا معتبر نہ ہونا اس کو مستلزم نہیں ہے کہ اسلام کے بعد بھی ان کو لکھا نہ جائے۔ اگر خدا تعالیٰ انسانی عجز و مرض کے زمانہ میں اس کی صحت و قدرت کے زمانہ کے اعمال کا ثواب دے سکتا ہے تو اسلام کے بعد زمانۂ کفر کی نیکیوں کا ثواب کیوں نہیں دے سکتا مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسلام لائے بغیر بھی کافر کی حسنات قابلِ ثواب شمار ہوں یہ اسلام ہی کی برکت ہے کہ وہ اس کے ضائع شدہ اعمال کو بھی بیش قیمت بنادیتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلام جہاں ایک طرف اس کے خرمنِ معاصی کو خاک کردیتا ہے دوسری طرف اس کی خاک شدہ نیکیوں میں پھر سر نو جان بھی ڈالدیتا ہے۔ (فتح الباری ج ۱ ص ۲۸)

شیخ محی الدین نووی کا رجحان اس طرف ہے کہ زمانۂ کفر کے اچھے کام بلکہ عبادتیں بھی معتبر ہوسکتی ہیں۔ وہ یہاں حدیث کی بجائے فقہاء کے قول کی تاویل کی طرف جارہے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن فقہاء نے یہ کہا ہے کہ کافر کی کوئی عبادت صحیح نہیں ہوتی اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان پر صحت کا حکم نہیں لگایا جائیگا رہ گیا ثواب کا معاملہ تو فقہاء نے اس کی نفی نہیں کی، یہ تو خدا کی دین کی بات ہے وہ چاہے تو عمل کے بغیر بھی نامۂ اعمال میں نیکیاں درج کردے تو اگر کافر کی کرائی عبادت پر ثواب بخشدے تو اس سے کیا بعید ہے۔ ۴۴

۴۴ (نووی مصری ج ۱ ص ۱۴۲) یہاں ابن بطال شارح بخاری ابراہیم حربی اور قرطبی جیسے متقدمین علماء و محدثین بھی امام نووی کے ہمنوا ہیں۔ اس مسئلہ کی تحقیق ہم آیندہ ذکر کریں گے۔ اتنی بات یہاں بھی سن لیجئے کہ جو مسئلہ زیر بحث ہے وہ کافر کی نیکیوں پر ثواب ملنے نہ ملنے سے متعلق ہے اسلام لانے کے بعد کا نہیں ہے۔

من اساء فی اسلامه یؤاخذ بما عمل فی الجاهلیة

(۲۱۰) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ قَالَ اُنَاسٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَنُؤَاخَذُ بِمَا عَمِلْنَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ قَالَ اَمَّا مَنْ اَحْسَنَ مِنْكُمْ فِي الْاِسْلَامِ فَلَا يُؤَاخَذُ بِهَا وَمَنْ اَسَاءَ اُخِذَ بِعَمَلِهِ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَالْاِسْلَامِ - (رواه الشيخان)

جس نے اپنے اسلام کو بدنما بنا دیا اس سے دورِ جاہلیت کے اعمال پر بھی مواخذہ ہوگا

(۲۱۰) عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ کیا ہم سے اُن افعال کی بھی بازپرس ہوگی جو ہم نے اپنے کفر کے زمانہ میں کئے ہیں آپ نے ارشاد فرمایا جس نے اسلام میں اچھے کام کئے اُس سے تو کچھ بازپرس نہ ہوگی لیکن جس نے اپنے اسلام میں بدنمائی پیدا کی اور برے کام کئے اس سے کفر واسلام دونوں زمانوں کے افعال کی بازپرس کی جائے گی۔ (متفق علیہ)

(۲۱۰) حضرت ابن مسعودؓ کی یہ حدیث بظاہر عمرو بن العاص کی گذشتہ حدیث کے مخالف معلوم ہوتی ہے اس سے ثابت ہو رہا تھا کہ اسلام کسی تفصیل کے بغیر دورِ جاہلیت کی بداعمالیوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور اس حدیث سے کچھ تفصیل بھی ثابت رہی ہے۔ شیخ محی الدین نووی وغیرہ کے مختار پر تو جواب ظاہر ہے، ان کے نزدیک اسلام کی خوبی یہ ہے کہ دل سے اسلام قبول کرے اور اس کی بدنمائی یہ ہے کہ محض زبان پر کلمۂ اسلام ہو، دل ایمان ویقین سے یکسر خالی ہو، درحقیقت یہ اسلام ہی نہیں اس بنا پر اس حدیث کا خلاصہ یہ ہوگا کہ مذکورہ بالا بشارت اُس اسلام پر ہے جس میں نفاق نہ ہو، منافقانہ اسلام سے صرف جان ومال کی عصمت تو حاصل ہو جاتی ہے مگر گناہوں کی مغفرت نہیں ہوتی بلکہ ان کا بوجھ اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حضرت استاد قدس سرہ فرماتے تھے کہ اسلام جو اس کا مدعی ہے کہ وہ دنیا میں تہذیبِ اخلاق کے لئے برائیاں مٹانے اور بھلائیاں پھیلانے کے لئے آیا ہے وہ روزِ اول ہی سے اپنے حلقہ بگوشوں سے یہ تقاضہ کرنے لگتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے اس کے دعوے کا ثبوت پیش کریں جو لوگ اس کے اس تقاضہ کو پورا کرتے ہیں ان کا اسلام سچا اور خوبصورت اسلام شمار ہوتا ہے۔ بس اسلام کی خوبی یہ ہے کہ جب اسلام لائے تو دنیا کے سامنے علاً اعلیٰ سے اعلیٰ تہذیب کا نمونہ پیش کرے، اپنے دل میں دورِ کفر کی بدکرداریوں اور بداخلاقیوں کی برائی محسوس کرے ان پر شرمندہ بھی ہو اور آئندہ اس کا عزم کرلے کہ اب اسلام کی حلقہ بگوشی کے بعد ان کا اعادہ پھر کبھی نہیں کرے گا، یہ ہے وہ مسلمان جو اپنے تمام گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسا اپنی ماں کے پیٹ سے آج پیدا ہوا ہے لیکن ایک وہ ہے جو مسلمان تو ہو جاتا ہے مگر لاابالی طور پر مسلمان ہوتا ہے اور اب بھی شترِ بے مہار کی طرح آزاد ہی پھرتا ہے اس کی بداخلاقی بدستور قائم ہے۔ طبیعت کی درشتی، نفس کی خست، مزاج میں خود غرضی وطمع کا وہی حال باقی ہے، غرضکہ اس کی عملی زندگی میں کوئی نمایاں انقلاب پیدا نہیں ہوتا، یہ بھی ایک مسلمان ہے لیکن اس کا اسلام خوبصورت اسلام نہیں، اس میں معاصی کی بدنمائی بدستور موجود ہے اس نے اسلام کی صداقت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، وہ اس عظیم الشان بشارت کا حقدار نہیں۔ جو کل تک خدا کی نافرمانی سے شرمندہ نہیں تھا اور آج بھی اس پر نادم نہیں ہوا۔ (باقی بر صفحۂ آئندہ)

من حسن اسلام المرء ترکه مالا یعنیه

(۲۱۱) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ

آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیکار اور لایعنی باتوں سے کنارہ کش ہو جائے

(۲۱۱) حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے آدمی کے اسلام

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) اس کی نافرمانیوں کا بہی کھاتہ کیونکر پاک و صاف ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ تفصیل نہایت منصفانہ اور معقول ہے۔ ملا علی قاری نے فقہ اکبر کی شرح میں اس کو شارح عقیدہ طحاوی سے توبہ کی بحث میں نقل کیا ہے۔ وہ محققین کا قول نقل کرتے ہیں کہ اگر اسلام کے ساتھ گذشتہ گناہوں پر توبہ بھی کی جائے تو ایسا اسلام تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور اگر ان معاصی سے توبہ نہ کرے اور اسلام کے بعد اسی طرح گناہ کرتا رہے تو اس سے تمام گناہوں کا مواخذہ ہوگا۔ (دیکھو شرح فقہ اکبر ص ۱۲۱)

(۲۱۱) امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا آپ کو یہ رتبۂ عالی کیسے ملا۔ آپ نے فرمایا تین باتوں سے (۱) راست گوئی۔ (۲) ادائے امانت (۳) اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی کی عادت سے۔ (موطا)

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ بیکار باتوں سے مراد مباحات کا غیر ضروری سلسلہ ہے۔

یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ مستحبات اور محرمات کے درمیان شریعت نے ایک درجہ مباحات کا بھی رکھا ہے اُسے خدا کے محرمات کی سرحد کہنا چاہئے۔ یہاں پہنچ کر محرمات کی ظاہری دلفریبی کا نظارہ ہونے لگتا ہے اس لئے آپ مباحات کو اپنی نظر میں ہلکا نہ سمجھیں، عمل کے مسافر کے لئے یہ منزل بہت نازک منزل ہے جو اس منزل پر جا پہنچا اس کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ اس کا دوسرا قدم اب محرمات ہی میں جائے گا۔ ان کی مشروعیت کا مقصد یہ ہے کہ آپ مباحات کو خدا کی طاعات و عبادات کے لئے ذریعہ و وسیلہ بنائیں۔ اس کے احکام کی بجا آوری میں اُن سے کام لیں۔ اب یہ مباحات بھی آپ کے لئے مستحبات کا حکم اختیار کر لیں گے لیکن اگر خدانہ کردہ آپ نے ان کو خدا کی معصیت کا ذریعہ بنا لیا تو اب یہ مباح نہیں رہے ممنوعات و محظورات کی فہرست میں شمار ہوں گے۔ اگر آپ نے یہ نکتہ سمجھ لیا ہے تو اُن تمام احادیث کی مرادیں آپ پر روشن ہو جائیں گی جن میں مباحات پر بھی ثواب اور عقاب کا ذکر آجاتا ہے۔ مثلاً کھانا کھانا، پانی پینا، شب میں سو رہنا حتی کہ باہمی خوش طبعی کرنا بہت سے بہت مباح ہی کا درجہ رکھتے ہیں لیکن اگر یہ تمام کام آپ اس لئے کرتے ہیں کہ ان مباحات سے آپ کو خدا کی عبادت میں تقویت حاصل ہو۔ آپ کھائیں گے نہیں تو خدا کے فرائض بھی ادا نہیں کر سکیں گے۔ رات کو آرام نہیں کریں گے تو صبح کی نماز میں شریک بھی نہیں ہو سکیں گے، اگر اپنے بھائی سے خوش طبعی کریں گے تو باہمی محبت و الفت پیدا ہوگی۔ اس کا دل خوش ہوگا آپ کا کچھ بگڑے گا نہیں۔ تو اب یہی سب مباحات موجب اجر بن جائیں گے۔ اسی طرح انگور کا عرق نکالنا مباح ہی ہے کچھ حرام نہیں لیکن اگر یہ فعل آپ نے اس لئے کیا ہے کہ اس کی شراب تیار کریں گے تو اب یہی فعل حرام کہلائے گا اسی لئے حدیث میں "عاصر" یعنی انگور کا عرق نکالنے والے پر لعنت آئی ہے۔ مباحات صرف اسی وقت تک مباحات ہیں جب تک ان میں نہ وہ نیت ہو نہ یہ، اگر آپ اسی عالم غفلت میں مباحات میں قدم رکھتے ہیں تو رکھ لیجئے مگر حدیث یہ کہتی ہے کہ یہی فعل عبث ہے اور آپ کے حسن اسلامی پر ایک بدنما داغ ہے۔ شادی کی بہت سی رسمیں اباحت کا درجہ رکھتی ہیں اگر اعتدال کے ساتھ ادا کی جائیں اور شریعت کے حدود سے باہر نہ ہوں اور

مَالَا يَعْنِيْهِ (رواہ الترمذی وغیرہ وحسنہ الحافظ ابن رجب الحنبلیؒ فی جامع العلوم والحکم)

کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بیکار باتوں کا مشغلہ چھوڑ دے۔

خوشی میں خوشی منانا مقصود ہے تو اُن پر ثواب مل سکتا ہے لیکن ایسے انسان بہت کم ہیں جو مسرت اور غم میں اعتدال کی حالت قائم رکھ سکیں اس لئے وہ خدا کی اس وسعت سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور مباحات کو محرمات بنا کر چھوڑتے ہیں اس پر طرہ یہ کہ وہ اسی خیال میں سرشار رہتے ہیں کہ ہم نے مباحات کے حدود سے قدم باہر نہیں نکالا حالانکہ ان کو یہ خبر نہیں ہے کہ حدود شرعیہ سے ذرا تجاوز کرنے سے وہی مباحات محرمات کا حکم اختیار کر لیتے ہیں (دیکھو کتاب الایمان ص ۱۹ و ۳۰ و حجۃ اللہ ج ۲ ص ۱۰۱)

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ عنایت لغت میں کسی چیز کے خاص طور پر اہتمام کرنے کا نام ہے اس بنا پر حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی شان یہ ہونا چاہیے کہ جو قول و فعل بھی اسلام کی نظر میں قابلِ اعتنا اور لائقِ اہتمام نہ ہو اُس سے یکلخت کنارہ کش ہو جائے۔ پس جب تک ایک مسلمان محرمات و مشتبہات تو درکنار بے حاجت مباحات میں بھی قدم رکھنا ترک نہیں کرتا، اسلام کی صفتِ احسان سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر کسی خوش نصیب کو یہ مقام نصیب ہو جائے، خدا کا تصور اس پر اس درجہ غالب آ جائے کہ ہر حال میں اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ذاتِ پاک گویا حاضر و ناظر ہو تو پھر بیکار باتوں کی طرف اس کا قدم خود بخود نہیں اٹھ سکتا اور اگر غفلت یا سہو و نسیان کی بنا پر کبھی اس سے کوئی لغزش واقع بھی ہوگی تو اس کو ایسی ہی ندامت و شرمساری لاحق ہوگی جیسی کہ حقیقتہً خدا کے حضور میں یہ غلطی کر کے ہوتی اسی کو حدیث میں استحیاء من اللہ کہا گیا ہے یہ استحیاء اسی صفتِ احسان کا نتیجہ ہے (جامع العلوم والحکم ص ۸۰ و ۸۴)

اس حدیث کی اہمیت کے پیشِ نظر مالا یعنی کے لفظ کی کچھ اور توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ حافظ ابنِ رجبؒ فرماتے ہیں کہ لفظی وسعت کے لحاظ سے تو "لایعنی" کا لفظ اقوال و افعال سب کو شامل ہے لیکن محاورہ و استعمال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کا زیادہ تر اطلاق لغو باتوں پر ہوتا ہے اسی کی طرف حسب ذیل آیت و احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔	کوئی بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر ایک نگراں اس کے پاس لکھنے کو تیار رہتا ہے۔"
لَا خَيْرَ فِي كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوْفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔	ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بہتری اور خیر کا نام نہیں مگر ہاں جو خیرات یا کسی اور نیک کام یا لوگوں میں میل ملاپ کی صلاح دے۔

(۱) آدمی کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیکار باتیں نہ کرے۔ (مسند امام احمد)

(۲) جو آدمی اپنے عمل اور باتوں کا موازنہ کرتا رہے گا وہ خود بخود صرف حاجت کی بات کرنے کا عادی بن جائیگا۔ (ابن حبان)

(۳) اسی حقیقت کے مخفی رہنے کی وجہ سے حضرت معاذؓ نے یہ سوال فرمایا تھا یا رسول اللہ جو باتیں ہم کرتے ہیں کیا ان پر بھی ہم سے گرفت کی جائے گی آپ نے فرمایا کیوں نہیں۔ زیادہ تر تو لوگ اسی جا و بیجا زبان چلانے کی بدولت ہی دوزخ میں منہ کے بل گرائے جائیں گے۔

(۴) حضرت ام حبیبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ ابنِ آدم کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اس کے نقصان ہی نقصان کی ہوتی ہے نفع کی نہیں ہوتی بجز اِن صورتوں کے بھلی بات کا حکم دینا، بری بات سے روکنا اور اللہ کی یاد کرنا۔ (ترمذی) باقی حاشیہ صفحہ ۵۲۵

بشارة التجاوز عن حديث النفس والخطاء والنسيان

(۲۱۲) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللهَ تَجَاوَزَ لِأُمَّتِي مَا حَدَّثَتْ بِهِ أَنْفُسَهَا مَا لَمْ يَتَكَلَّمُوا أَوْ يَعْمَلُوا بِهِ (رواہ مسلم)

دل کے خطرات اور بشری بھول چوک پر درگذر کی بشارت

(۲۱۲) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے خاص میری امت کے حق میں وہ وساوس جو صرف ان کے دلوں میں گذریں معاف کردیئے ہیں جب تک کہ وہ اپنی زبان سے ان کو ادا نہ کریں یا عملی جامہ نہ پہنائیں۔ (مسلم)

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) (۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایک صحابی کا انتقال ہوگیا تو کسی نے کہا تجھے جنت کی بشارت ہو آپ نے فرمایا تمہیں کیا خبر ہے شاید کبھی اس نے بیکار بات منہ سے نکالی ہو یا اپنی حاجت سے زیادہ چیز پر بخل کیا ہو۔ (ترمذی)

(۶) ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ میں اپنی قوم کا سردار ہوں جو کہتا ہوں میری مانتے ہیں اُن سے کیا کہوں آپ نے فرمایا کہ ہر کس وناکس کو سلام کیا کریں اور غیر ضروری باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ (ابن ابی الدنیا)

(۷) ایک صحابی کی بیماری میں (عیادت کے لئے) کچھ لوگ گئے دیکھا تو وہ بہت ہشاش بشاش تھے. سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا دو عمل میرے پاس ایسے ہیں کہ اُن سے زیادہ بخشش کی امید مجھے کسی عمل پر نہیں ہے. ایک تو یہ کہ میں غیر ضروری باتیں نہ کرتا تھا۔ دوم یہ کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے میرا سینہ صاف اور ٹھنڈا رہا کرتا تھا۔ (ابن ابی الدنیا)

(۸) حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ کسی آدمی سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کرنے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اس کو بیکار باتوں کے مشغلہ میں الجھا دے۔

(۹) سہل تستریؒ فرماتے ہیں جو بے ضرورت باتیں کرے گا وہ راست گوئی سے محروم ہوجائے گا۔

(۱۰) معروف کرخیؒ فرماتے ہیں آدمی کی بیکار باتوں کا مشغلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رسوا کرنے کی ایک علامت ہے۔

اس قسم کی احادیث اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کا زیادہ تر تعلق اقوال ہی کے ساتھ ہے. خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان بیکار و بے حاجت قول وفعل چھوڑنے اور ضرورت کے مطابق بات اور اسی کے موافق کام کرنے کا عادی بن جائے تو اُسے بشارت ہو کہ اب اس نے صفتِ احسان میں قدم رکھدیا ہے اور اب اس کی ایک نیکی صرف دس یا سات سو نیکیوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اس کے لئے رحمت کا وہ وسیع دروازہ کھل گیا ہے جس کی کوئی حد ونہایت نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نازک حسن بیکار باتوں کی ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا پھر آپ یہ کیا سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی غفلت اور من مانی آزادی کے بعد بھی اس کا بال بیکا نہیں ہوتا۔

(۲۱۲) جو وساوس کہ اپنے اختیار کے بغیر پیدا ہوں اور بلا توقف دل سے نکل جائیں یا کچھ ٹھیریں مگر اس کو عملی جامہ پہنانے کی دل میں کوئی فکر نہ ہو یا کچھ فکر تو پیدا ہو مگر کسی ایک جانب میلان خاطر نہ ہو، (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(٢١٣) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قِيْلَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَيُّ الْاَدْيَانِ اَحَبُّ

(٢١٣) ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا سب دینوں میں اللہ تعالیٰ

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) یہ سب اقسام اس امت کے حق میں معاف کردیئے گئے ہیں۔ ہاں اگر کسی جانب رجحان پیدا ہوگیا ہو تو اگر یہ رجحان خیر اور نیک عمل کی طرف ہے تو اس پر اجر ہے اور اگر برائی کی جانب ہے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے اور اگر یہ خیال پختہ ہوکر عزم کی صورت اختیار کرگیا ہے تو پھر نیکی میں اجر یقینی ہے اور بدی کی صورت میں مواخذہ کا امکان ہے۔ حدیث مذکور میں جس مرتبہ کی معافی کا اعلان کیا گیا ہے وہ حدیث النفس ہے عزم نہیں۔ عزم کی تفصیل ابھی آپ ملاحظہ کرچکے ہیں۔

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں وساوس و خطرات کی وہی قسم مراد ہے جو کسی قول یا عمل کے ابتدائی مراحل میں پیش آتی ہے۔ عقائدِ فاسدہ یا اخلاقِ رذیلہ جن کا تعلق صرف قلب سے ہے جوارح سے نہیں وہ یہاں مراد نہیں ہیں بس اگر خدا کی وحدانیت یا رسول کی رسالت میں وساوس داخل ہوکر تردد کی حد تک پہنچ گئے ہیں تو قابلِ مواخذہ ہیں عقائد کے باب میں عزم ہی عزم درکار ہے۔ اسی طرح حسد، کینہ، کبر، فریب، مسلمان پر ناحق بدگمانی، یہ سب کے سب اعمالِ قلبیہ ہیں۔ حدیث مذکور سے ان کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس حدیث میں صرف اُن وساوس کا ذکر ہے جو زنا و سرقہ جیسے افعال یا غیبت وغیرہ جیسے اقوال سے پہلے انسان کے دل میں گذرتے ہیں۔ پس اگر غیبت، زنا و سرقہ وغیرہ کرنے کی نوبت نہیں آتی اور یہ خیالات صرف دل میں گذر کر رہ جاتے ہیں تو شانِ رحمت ان کی معافی کا اعلان کرتی ہے۔

حاشیہ صفحۂ ہذا (٢١٣) حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ "الحنیفیۃ" وہ دین ہے جو ملتِ ابراہیمی کی طرح شعائر اللہ کے استحکام اور شعائرِ شرک کے استیصال اور رسوم فاسدہ و عقائدِ باطلہ کے ابطال پر مبنی ہو اور "السمحۃ" وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور ناقابلِ برداشت مجاہدات نہ ہوں اور اس میں ایسی رخصتیں بھی موجود ہوں جو بوقتِ ضرورت بشری ضعف کو سنبھالیں اور "البیضاء" کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی علتیں اور حکمتیں ایسی واضح اور صاف ہوں کہ ہر ذی فہم کی سمجھ میں بآسانی آسکیں (دیکھو حجۃ اللہ ص ١٢١ و ١٢٢) حنیف در اصل وہ ہے جو ہر باطل سے بیزار ہوکر ایک مولیٰ حقیقی کا رُخ کرچکا ہو۔ حضرت خلیلؑ کی زندگی طفولیت سے لیکر آخر تک اس خصوصیت کا مرقع تھی اس لئے انبیاء علیہم السلام میں یہ لقب ان ہی کا مشہور ہوگیا ہے ورنہ انبیاء علیہم السلام کا سب گروہ معناً تو اس اصطلاح میں شامل ہے۔ غرض ملتِ ابراہیمی ملتِ حنیفیہ کہلاتی ہے۔ دینِ محمدی چونکہ جملہ ادیان کی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور ملتِ ابراہیمی کی بڑی خصوصیت یعنی یسر و سہولت تو اس کا سب سے نمایاں عنصر ہے اس لئے اور ملتوں کی نسبت ملتِ محمدیہ اس کے قریب تر ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تو اپنی تفسیر میں چالیس احکام شمار کرکے ایسے تحریر فرمائے ہیں جو ان ہر دو ملتوں میں تقریباً مشترک ہیں گویا دینِ محمدی کی زمین ملتِ ابراہیمی ہے اس لئے اس لقب پانے کی سب سے زیادہ مستحق یہی ملت ہے۔ ناظرین کے سامنے ان احکام کی مختصر فہرست پیش کرنا خالی از بصیرت نہ ہوگا۔

(١) دشمنانِ خدا سے جہاد کرنا۔
(٢) بت شکنی۔
(٣) غیر اللہ کی منت نہ ماننا۔
(٤) اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح نہ کرنا۔
(٥) رزق، شفا اور موت کو صرف مسبب الاسباب کے قبضۂ قدرت میں تصور کرنا۔
(٦) اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا۔
(٧) کہانت باطل سمجھنا۔
(٨) بدفالی کا قائل نہ ہونا۔
(٩) کسی ساعت کو منحوس نہ سمجھنا۔
(١٠) کواکب پرستی کا انکار کرنا۔
(١١) نجومیوں سے مستقبل کے واقعات دریافت نہ کرنا۔

إِلَى اللهِ قَالَ الْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر والاوسط والبزار والبخاری فی الادب المفرد وفی الصحیح تعلیقا۔

(۲۱۴) عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ إِنَّ اللهَ وَضَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَأَ وَ

کونسا دین پیارا ہے فرمایا ابراہیم علیہ السلام کا جو نہایت سہل اور آسان تھا۔ (مسند احمد، بزار، ادب المفرد، طبرانی)

(۲۱۴) ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کی

---

(۱۲) آداب قربانی۔
(۱۳) خصالِ فطرت۔
(۱۴) جملہ افعالِ حج۔
(۱۵) کعبہ کا قبلہ ہونا۔
(۱۶) مصیبت پر صبر کرنا۔
(۱۷) نوحہ وغیرہ نہ کرنا۔
(۱۸) تصویر کی حفاظت اور مصوری سے اجتناب کرنا۔
(۱۹) ترکِ نکاح، ترکِ لذائذ، ترکِ لباس ونفائس اور گوشہ نشینی جیسے افعال اختیار نہ کرنا۔
(۲۰) عبادت میں اتنی افراط سے اجتناب کرنا جس سے حقوق العباد تلف ہوں۔
(۲۱) کسبِ معاش۔
(۲۲) بلاضرورت سوال نہ کرنا۔
(۲۳) لباس صاف ستھرا رکھنا۔
(۲۴) لہو ولعب سے احتراز کرنا۔
(۲۵) والد کو اولاد اور اولاد کو والد کے جرم میں گرفتار نہ کرنا۔
(۲۶) حرمتِ زنا وغیرہ۔
(۲۷) سترِ عورت۔
(۲۸) ختنہ کرنا۔
(۲۹) عقیقہ کرنا۔
(۳۰) آدابِ ضیافت۔
(۳۱) پوشش ولباس کے احکام۔
(۳۲) عبادت کے وقت اچھی ہیئت کا خیال رکھنا۔
(۳۳) اشہرِ حرام کا احترام کرنا۔
(۳۴) محرماتِ نکاح۔
(۳۵) نکاح میں شاہدوں کا ہونا۔
(۳۶) زکوٰۃ۔
(۳۷) چاشت کی چار رکعتیں۔
(۳۸) تحریمہ میں رفع یدین کرنا۔
(۳۹) رکوع کا سجدہ پر مقدم ہونا۔
(۴۰) نماز کی ہر نقل وحرکت میں تکبیر کہنا۔

(فتح العزیز ص ۴۹۶ و ۴۹۷)

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے احکام ہیں جو دونوں ملتوں میں مشترک ہیں یہاں سب کا استقصار کا ارادہ نہیں کیا گیا۔

(۲۱۴) خطاء ونسیان کی دو کمزوریاں انسان کے خمیر میں داخل ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہے۔ نسی آدم فنسیت ذریتہ خطاء آدم فخطاءت ذریتہ۔ حضرت آدم علیہ السلام بھولے تو بھولنے کی سرشت ان کی اولاد میں بھی نمایاں ہوگئی، وہ چوکے تو اس قصور کا اثر ان میں بھی ظاہر ہو کر رہا اس لئے رحمت بھی ان پر مواخذہ نہیں کرتی اور ان کے عفو کا اعلان کرتی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں بندہ کے ارادہ واختیار کو دخل نہیں ہوتا اور جبر واکراہ کی حالت میں گو شعور، ارادہ اور اختیار موجود ہوتا ہے مگر جبر کی وجہ سے معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی ان تینوں حالتوں کا ذکر کیا ہے خطاء ونسیان کا حسب ذیل آیت میں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا۔ اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس پر مواخذہ نہ فرما۔

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

النِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوا عَلَيْهِ۔ رواه ابن ماجة والبيهقى وابن حبان فى صحيحه والدارقطنى وقد خرجه الحاكم وقال صحيح على شرطهما قال الحافظ ابن رجب ولكن له علة وقد انكره الامام احمد جداً وقد خرجه النسائى ولم يذكر الاكراه والحديث فخرج من رواية ابى قتادة فى الصحيحين والسنن والمسانيد بدونها وحسنه الحافظ ابن رجب دراجع جامع العلوم والحكم ص ۲۷۱)

بھول، چوک اور وہ تمام باتیں معاف کردی ہیں جو ان سے بہ جبر کرائی جائیں۔

خطاء ونسیان گو انسان کے ایک فطری ضعف کا اثر ہے لیکن پھر ان میں کچھ نہ کچھ اس کے تساہل اور لاپرواہی کا دخل ضرور ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسیان اسی جگہ پیش آتا ہے جہاں آدمی کو زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح خطاء بھی ضرور کسی نہ کسی بے احتیاطی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پس دعاء کے ان الفاظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ بندہ کی شانِ عبدیت کے یہ نامناسب ہے کہ وہ اپنے تساہل کو کوئی جرم ہی تصور نہ کرے۔ اس تصور سے اس میں تساہل اور بے احتیاطی کی سرشت اور پختہ ہوگی۔ اس کو یہ احساس کرنا چاہئے کہ معصیت گو نسیان وخطاء کی بنا پر سرزد ہو اور گو شانِ رحمت اسے عفو بھی کردے مگر ہے قابلِ گرفت ومواخذہ۔ اس لئے پہلے اسے اپنے اس تساہل اور لاپرواہی کے جرم کا اعتراف کرلینا چاہئے پھر بارگاہِ رحمت کی طرف ہاتھ اٹھا کر اس کے عفو کے لئے دعا کرنا چاہئے۔ لفظ اِنْ جو شرط کے لئے آتا ہے یہاں اسی لئے استعمال کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہماری سعی وکوشش تو یہی تھی اور یہی آئندہ بھی رہے گی کہ ہم سے بھول چوک کبھی تیری معصیت نہ ہو۔ لیکن اگر ضعفِ بشری کی بنا پر ہو جائے تو پھر تو اپنی شانِ ربوبیت کے صدقہ میں اس پر مواخذہ نہ کرنا۔

اکراہ کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ (النحل)	جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے مگر اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو (اُس سے مواخذہ نہیں)

بندہ کی شانِ عبدیت تو یہ ہے کہ ان تینوں صورتوں میں اس کی نظر اپنی کوتاہی کی طرف لگی رہے اور رب العزت کی شانِ رحمت یہ ہے کہ وہ ان مجرموں سے عفو ودرگذر کا اعلان کرتی رہے۔

وہ بازی خطا کی جتاتے ہیں
میں اُن کے بھروسہ پہ ہارا کروں

اس بیان سے ظاہر ہوگیا کہ اس حدیث کا تعلق صرف اس بے نیاز کے حق سے ہے جس کا معصیت سے کچھ بگڑتا نہیں اور عفو سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔ بندوں کے حقوق کے ساتھ نہیں جو بہت بخیل اور کمزور ہیں اس لئے اگر ان صورتوں میں ان کے حقوق تلف ہونگے تو اُن کا تاوان ادا کرنا ہوگا۔ ہاں ان کے تساہل کا جو گناہ تھا وہ معاف ہو جائے گا۔

بشارۃ کون الدین یسرا کلہ

(۲۱۵) عَنْ اِبْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلدِّیْنُ یُسْرٌ۔ اخرجہ احمد والبخاری فی الادب المفرد وفی الصحیح فی ترجمۃ الباب وعند احمد خَیْرُ دِیْنِکُمْ اَیْسَرُہٗ۔ قال الحافظ اسنادہ حسن

(۲۱۶) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ وَلَنْ یُّشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلَّا غَلَبَہٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاسْتَعِیْنُوْا بِالْغَدْوَۃِ وَالرَّوْحَۃِ وَشَیْءٍ مِّنَ الدُّلْجَۃِ۔ (رواہ البخاری فی الایمان)

(۲۱۷) عَنْ عَائِشَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ ھٰذَا الدِّیْنَ مَتِیْنٌ فَاَوْغِلُوْا فِیْہِ

دین محمدی کے سرتاسر سہل اور آسان ہونے کی بشارت

(۲۱۵) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ دین بہت آسان ہے اور مسند احمد کی ایک روایت میں ہے تمہارے سب دینوں میں بہتر وہ ہے جو سب میں آسان ہو۔

(۲۱۶) ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے دین بہت آسان ہے جو شخص دین میں سختی کرے گا وہ اس پر غالب آجائے گا لہذا سیدے رہو اور زیادہ بلند پروازیاں مت کرو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمہیں ایسا آسان دین ملا ہے) صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کرکے (دین پر مداومت کے ساتھ عمل کرنے کی) قوت حاصل کرو۔

(۲۱۷) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ دین نہایت موزوں

(۲۱۶) حافظ ابن حجرؒ نے اسی کے ہم معنی ایک اور روایت محجن بن ادرعؓ سے نقل کی ہے "انکم لن تنالوا ھذا الامر بالمغالبۃ وخیر دینکم الیسرۃ۔ (تم دین کو زور آزمائی کرکے ہرگز نہیں پاسکتے تمہارا سب سے بہتر دین وہ ہے جو آسان ہو) ابن منیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں عبادت میں جدوجہد کرنے کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اُس افراط کی ممانعت ہے جس کا نتیجہ فرائض وواجبات کا ترک بن جائے۔ عزیمت پر عمل کرنا بیشک افضل ہے مگر خدا کی رخصتوں کو دائمی طور پر ترک کر دینا بھی کچھ کی بات نہیں جو شخص تیمم کے موقعہ پر ہمیشہ وضو کرنا ضروری تصور کرے گا اُسے آخر ایک دن جھک مار کر خدا کی رخصتوں کے دامن میں پناہ لینا پڑے گی۔ بعض صحابہؓ نے زمانۂ شباب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجویز کردہ رخصتوں پر عمل نہ کیا آخر ضعف کے زمانہ میں انھیں پچھتانا پڑا اور یہ حسرت ہوئی کہ کاش انھوں نے آپ کی رخصت کو قبول کر لیا ہوتا۔

(۲۱۷) یہ نرمی اور سہولت ملتِ ابراہیمیہ کی بنیاد اور اساس ہے اور اس کی اسی بنیاد پر شریعت محمدیہ کی تعمیر اٹھائی گئی ہے۔ اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو ہمیں تمام شریعت پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہوگی۔ اور اس اجمال میں پھر اتنی تفصیل پیدا ہو جائے گی جس کی ہمارے ان مختصر نوٹوں میں جگہ نہیں ہے اس لئے ہم یہاں صرف وہ اصول تیسیر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں

بِرِفْقٍ وَلَا تُبَغِّضُوْا اِلٰی اَنْفُسِکُمْ عِبَادَۃَ اللّٰہِ فَاِنَّ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَہْرًا اَبْقٰی (قال العراقی فی تخریج الاحیاء رواہ احمد من حدیث انس والبیہقی من حدیث جابر)

اور مضبوط ہے اس کو نرمی کے ساتھ حاصل کرنے کی کوشش کرو (اور زیادہ سختیاں اٹھا اٹھا کر) خدا کی عبادت سے اپنے دل میں نفرت نہ پیدا کرو کیونکہ زیادہ تیز رو مسافر اپنی سواری ہلاک کردیتا ہے اور منزلِ مقصود طے کرنے سے بھی رہ جاتا ہے (یہی مثال عبادت میں حد سے زیادہ جد و جہد کرنے والے کی ہے)۔

جو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے تحریر فرمائے ہیں ان کی روشنی میں آپ تمام شریعت کا جائزہ لیکر بآسانی یہ فیصلہ کرسکیں گے کہ اس شریعت میں دوسرے ادیان کی نسبت سے کتنی سہولت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ یسر و سہولت کے لئے حسب ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے۔

(۱) کسی عبادت کے لئے ایسی چیز کو رکن و شرط کی حیثیت نہ دی جائے جس کی ادائیگی میں دشواری ہو۔ شریعتِ محمدیہ میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اسی لئے لازم قرار نہیں دیا گیا۔ لولا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواک عند کل صلوٰۃ کا مفہوم یہی ہے۔ یعنی اگر اپنی امت کے مشقت میں مبتلا ہوجانے کا مجھے خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ انھیں مسواک کرنیکا حکم دیدیتا

(۲) اگر کسی دشوار چیز کا حکم دیا جائے تو اس میں تدریج کا خیال رکھا جائے تاکہ اس دشواری میں پھر ایک سہولت پیدا ہوجائے شراب کی حرمت کا مسئلہ بالخصوص عرب کے لئے جتنی دشواری کا موجب ہوسکتا تھا ظاہر ہے لیکن اسی اصل کے پیشِ نظر اس کی صاف و صریح حرمت پہلے ہی نازل نہیں کی گئی بلکہ رفتہ رفتہ اس کی مذمت اور برائیاں اس انداز سے بیان کی گئیں کہ ان سے آئندہ صریح حرمت کے لئے قلب میں جگہ پیدا ہوتی چلی گئی۔ آخر کار تیسری بار صاف ممانعت نازل ہوگئی، اس طرح وہ حکم جو پہلے ناقابلِ عمل تھا اب خوشی خوشی قابلِ عمل بن گیا۔

(۳) طبعی میلان اور طبعی تنفر کا لحاظ بھی رکھا جائے اسی بناء پر اسلام میں غلام، نابینا، مجہول النسب شخص کی امامت کو پسند نہیں کیا گیا کہ بہت سے حالات میں ان کی امامت تنفر کا موجب بن سکتی ہے اسی طرح امام یا کسی مقتدیٰ و بزرگ کی موجودگی میں ان کی امامت کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے اسی لئے ان کی موجودگی میں دوسرے کی امامت ناپسندیدہ قرار دی گئی۔

(۴) انسان کی فطرت میں مسرت و غم کے موقعہ پر کچھ رسوم منانا بھی داخل ہے جن کی ادائیگی وہ اپنی زندگی کا ایک ثبوت سمجھتا ہے اس کے اس اقتضاء کی بھی رعایت کی جائے۔ عیدین اور جمعہ کی مشروعیت اسی اقتضاء کے پورا کرنے کے لئے ہے۔

(۵) اس دین کا ایک حصہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس کی طرف رغبت کرنے میں طبیعت کے ساتھ عقل بھی شریک ہو تاکہ طبیعت و عقل ہر دو کی اجتماعی رغبت سے دین میں سہولت در سہولت پیدا ہوجائے۔ مسجد کی صفائی، جمعہ و عیدین کا غسل، خوش الحان موذن و امام وغیرہ کا حکم اسی نظریہ کے ماتحت ہے۔

(۶) عوام کے جذبات کی تا امکان رعایت کی جائے۔ خانہ کعبہ میں آمد و رفت کے لئے دو دروازہ قائم کرنے کا ارادہ آپ نے اسی لئے فسخ فرمادیا تھا کہ اس میں قریش کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا مبادا وہ یہ خیال کرگذریں کہ آپ نے ان کے بزرگوں کی یادگار کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور ان کی قدیم بنا کو توڑ کر نئی تعمیر کرڈالی۔ یہاں اسی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کردیا گیا مگر اس کے حدود کہاں تک ہوں گے یہ بہت طویل الذیل مسئلہ ہے۔

(۷) ارکان و شرائط کی تحدید و تعیین کی جائے مگر نہ اتنی کہ بجائے سہولت کے اور مصیبت بن جائے ایک حد تک ان کو

متعین بھی کر دیا جائے اور اس کے بعد ان کی عقلوں کے سپرد کر دیا جائے مثلاً قراءۃ فاتحہ نماز کے لئے ضروری قرار دی گئی ہے مگر مخارج حروف کی ادائیگی اور طرز قراءت کو معروف طریقہ پر چھوڑ دیا گیا ہے نماز کے لئے استقبال قبلہ ضرور شرط کیا گیا ہے مگر تعیین سمت قبلہ کے لئے براہین ہندسیہ، طول و عرض بلدہ کا علم شرط نہیں کیا گیا۔ رمضان کے روزوں کے لئے ماہ رمضان شرط کیا گیا ہے مگر یہاں بھی زائچہ و جنتری کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ صرف چاند کے طلوع پر مدار رکھدیا گیا ہے اور ابر و غبار کی صورت میں تیس دن پورے کر لینا کافی سمجھ لیا گیا ہے۔

(۸) جو شخص دوسروں کے حقوق تلف کردے اس کے حقوق بھی تلف کر دیئے جائیں۔ اسی قاعدہ کے ماتحت قاتل کو وراثت سے محروم کیا گیا ہے۔

(۹) علم کی اہمیت، وعظ و نصیحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اتنا اہتمام کیا جائے کہ قانونِ الٰہی پر عمل کرنے کی تازہ روح پیدا ہو جائے۔

(۱۰) اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعائیں کرنا چاہیئے کہ وہ اس قوم کو مہذب اور کامل بنادے اور سکینہ و اطمینان ان کے قلوب میں نازل فرمائے۔ اسلام میں کتاب الاذکار اور کتاب الدعوات اسی مقصد کے پیش نظر ہے۔

اگر مذاہب عالم کو ان دس اصول پر پرکھا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان اصول کی جتنی رعایت مذہب اسلام نے کی ہے اتنی اور ادیان نے نہیں کی اسی لئے مجموعی لحاظ سے جتنی سہولت اسلام میں ملتی ہے اور ادیان میں نہیں ملتی لیکن یہ بحث کہ سہولت کا مفہوم اور اس کا معیار کیا ہے دوسری طویل بحث ہے علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر عمدہ کلام کیا ہے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ

جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا خواہشمند ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا

سوال یہ ہے ایسا کیوں ہوگا؟ جواب معلوم کرنے سے پیشتر عالم کے تمام مذاہب پر ایک نظر ڈال جائے بہت سے مذاہب تو وہ ہیں جو الٰہی قانون ہونے کا اپنے پاس کوئی ثبوت نہیں رکھتے ان کے لئے تو معتبر مذہبوں کی صف میں کوئی جگہ ہی نہیں ہے اور اس لئے ان کے ساتھ دینِ حق کے تقابل و توازن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ وہ مذاہب جو اپنے آسمانی دین ہونے کا ثبوت رکھتے ہیں ان کو اس سوال کا حق ہے اور ان ہی کے غور و فکر کے لئے یہ اعلان کیا گیا ہے۔ اپنے اپنے زمانے میں تمام مذاہب حق اور کامل ہی تھے لیکن ان کی صداقت اور کمال کی حیثیت ٹھیک وہی تھی جو اپنے اپنے دور میں سلسلۂ ارتقار کی ہر کڑی کی ہوا کرتی ہے کوئی کڑی اپنے دور کے لحاظ سے ناقص شمار نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر بعد والی کڑی پہلی کڑی کے لحاظ سے کامل تر ہوتی ہے اگر ایسا نہ ہو تو ارتقار کا مفہوم ہی بے معنی ہو کر رہ جائے اس لئے اگر کوئی پہلی کڑی بعد والی کڑی کی جگہ رکھ دی جائے تو اس ارتقائی دور کے لحاظ سے اس کو ناقص کہنا بھی غلط نہ ہوگا۔

پھر اگر ذرا اور غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں ناقص و کامل کا سوال کرنا ہی بے محل ہے۔ کیونکہ تقابل و توازن کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہوں ایک ہی حقیقت کے مختلف مراتب و مدارج میں نقص و کمال کا سوال ہی بے حقیقت ہے جیسا کہ ایک شخص کے مختلف ادوارِ طفولیت و شباب میں۔ جب ایک چیز اپنے غیر ضروری اجزاء کو چھوڑتی اور اس سے کامل تر اجزاء اختیار کرتی چلی جاتی ہے تو اسی کو ارتقار کہا جاتا ہے اس لحاظ سے ہر پہلی کڑی دوسری کیلئے بنیاد

ہوتی ہے اور ہر دوسری کڑی پہلی کڑی کی نسبت سے کامل ہوتی ہے۔ اس کمال کے باوجود اس کی حقیقت پہلی کڑی کی حقیقت سے مختلف نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا اس کی حقیقت میں پلٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جو صداقت حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے شروع ہوئی اس کی حقیقت کبھی نہیں بدلی اس کے ضروری اجزا ہر دور اور ہر زمانہ میں محفوظ ہی رہے پھر کچھ دور آئے جن میں دینِ حق کی شریعتوں کی گرفت قدرے سخت ہو گئی لیکن وہ بار تقائی کی طبعی رفتار کے پیش نظر تھوڑے سے وقفے کے بعد گرفت کی وہ سختی ڈھیلی کر دی گئی اور اوامر و نواہی کے بوجھ ہلکے کر دیئے گئے اور جو پھندے کس دیئے گئے تھے اُن کو کاٹ دیا گیا۔ یہاں تک کہ سچائی کی ایسی آسان راہ دکھا دی گئی جس میں نہ تو عمل کے لئے کوئی سختی تھی نہ عقل کے لئے کوئی بوجھ۔ اسی کا نام اسلام ہے اور اب یہ پیغام محمدی کا لقب مخصوص ہو گیا ہے ارتقار کے ان ہی منازل کی جانب ذیل کی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی آج کے دن ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا۔ الخ

یعنی یہ کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی دین ارتقار کی منزلیں طے کرتے کرتے آج اپنے اوجِ کمال تک پہنچ گیا ہے۔ لفظ کمال میں دین کی اسی ارتقائی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن کریم کی سب سے بڑی خصوصیت "مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ" کا حاصل بھی یہی ہے لہٰذا "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ" کا عقیدہ بھی اس لئے سکھایا گیا یعنی یہ سب ایک ہی صداقت کی کڑیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہیں اور اپنے اپنے دور میں سب ہی کامل تھیں، صورتیں بیشک مختلف رہیں مگر حقیقت ایک ہی تھی اس لئے یہاں تسلیم و انکار کی تفریق برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ایک کا ماننے والا اس کا مکلف ہے کہ وہ دوسرے کو بھی مانے اسی طرح ایک کا انکار کرنے والا اس جرم کا مرتکب ہے کہ اس نے دوسرے کا بھی انکار کر دیا ہے "لا تخیروا بین الانبیاء" کا مفہوم بھی یہی ہے یعنی انبیار علیہم السلام میں افضل و مفضول ہونے کے باوجود تخییر کی بحث اس لئے ناموزوں ہے کہ یہ سب ایک ہی پیغام اور ایک ہی صداقت کے حامل تھے" لوکان موسیٰ حیا لما وسعہ الا اتباعی" میں بھی یہی اشارہ ہے کہ دورِ کمال میں غیر کامل دور کی کسی کڑی کو لا کر رکھنے کے کوئی معنی نہیں وہ اپنے دور میں ہزار کامل سہی مگر اس دور میں ہرگز قابلِ عمل نہیں ہو سکتی، طلوعِ آفتاب کے بعد بجلی کے قمقموں سے روشنی حاصل کرنا دانائی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے ارشاد ہوا کہ آج اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی بقید حیات ہوتے تو ان کے لئے بھی خدا کا یہی مذہب (اسلام) جو اب اپنی مکمل اور آخری صورت میں جلوہ گر ہو چکا ہے قابلِ اتباع ہوتا۔ پس اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کی تمام عظمتوں کے باوجود سوائے دینِ کامل کے اتباع کے کوئی راہ نہیں تو اب دنیا میں کس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسری راہ پر عمل پیرا ہونے کا مجاز ہو۔ اب نہ دو ہزار پہلے کا انسان موجودہ ترقی یافتہ انسان کے ساتھ ساتھ چل سکتا ہے اور نہ ہزاروں سال پہلا آئین موجودہ ضروریات کا حل کر سکتا ہے۔ فوز و فلاح، نجات اور کامیابی کی اب صرف یہی ایک راہ ہے اور اگر اس فطری ارتقار کے بعد بھی کوئی شخص قدرت کی بخشائش سے فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا اور اور ان ہی راہوں پر چلنا چاہتا ہے جن کے صحیح نقوش اب مٹ چکے ہیں تو اس کو اختیار ہے لیکن اسے معلوم ہو جانا چاہئے کہ اب اس کا یہ اتباع اسلام اور اس کی صداقتوں کا اتباع نہیں ہوگا بلکہ خواہشات کا اتباع ہوگا جسے فلاح و نجاح کی راہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

اسلام کیا ہے؟ خدا کی رضامندی کی ایک زبردست دستاویز، اعتقادیات و عملیات کا مکمل نقشہ، انسانی زندگی کے تمام سبھوں کے لئے غیر فانی دستور العمل، زمانۂ کفر کی ہر گمراہی کے عفو کا ضامن، اور آئندہ اس کے ہر ضعف و نسیان پر تسامح کرنے کا روادار، اپنے حلقہ بگوشوں کی معمولی جدوجہد کا بڑا قدردان اور انتہائی شکر گذار۔ غور فرمایئے اس کے بعد آپ چاہتے کیا ہیں کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی زمین پر آپ کی عقل کا بنایا ہوا آپ کی پسند کے موافق قانون نافذ ہو تو کیا آپ کے نزدیک ایک انسانی دماغ تمام عالم کی مختلف ضروریات کا احاطہ کر بھی سکتا ہے یا پورے طور پر ان کا ادراک بھی کر سکتا ہے اور اگر اس

ناممکن مرحلہ سے گذر بھی جائے تو کیا ان کی ضروریات کے احساس کے بعد ان کے لئے مناسب آئین وضع بھی کر سکتا ہے اور
اگر یہ شکل بھی آسان ہو جائے تو اس کی کیا ذمہ داری ہے کہ تمام عالم اس پر متفق بھی ہو سکتا ہے اور اگر فرد واحد کے ساتھ اس
آئین سازی میں کچھ اور افراد بھی شامل کر لئے جائیں تو یقیناً وہ بھی انسانوں کی غیر محدود کثرت کے مقابلہ میں ایک ہی فرد کا حکم رکھیں گے
تو اگر درحقیقت ان سب مشکلات کا حل مشکل ہی ہے تو مذہب سازی کی دردسری اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ اسی
مذہب کو کیوں قبول نہیں کر لیتے جسے قدرت کے رمز شناس ہاتھ نے تمام مزاجوں اور ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنایا ہے۔ جس میں گذشتہ
مذاہب کے محاسن چن چن کر اٹھا لئے گئے ہیں پھر اس مجموعہ میں اور بہت سے محاسن شامل کر کے اس کو بہت مکمل اور انتہائی دلپذیر
صورت میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے دنیا اس پر عمل کر کے زمین کی مالک اور آخرت کی وارث بن چکی جنھوں نے اس کو چھوڑا
انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اب اگر اس کے بعد بھی آپ کے تلاشِ مذہب کی تشنگی نہیں بجھتی تو یقین کیجئے کہ آئندہ تا قیامت
بجھے گی بھی نہیں۔ فبأی حدیث بعدہ یومنون۔

اس مرحلہ پر آپ کے دل میں یہ شبہ گذر سکتا ہے کہ جس طرح دیگر مذاہب کے ارتقاء کے بعد اسلام وجود میں آیا اسی طرح
تیرہ سو سال گذرنے کے بعد اب کوئی اور نیا دین آنا چاہئے۔ لیکن اکمالِ دین کی بشارت کے ساتھ اگر دنیا کے خاتمہ کا اعلان
بھی نہ کر دیا جاتا تو عالم پر ایک غیر معلوم مدت گذرنے کے بعد حرکتِ ارتقائی شاید کوئی اور قانون منصۂ شہود پر لے آتی یا اس آخری
قانون کو بھی کچھ مدت کے لئے ابھی اور مؤخر کر دیا جاتا مگر محفلِ عالم کی برخاستگی کے نوٹس نے یہ امید منقطع کر دی ہے اور یہ یقین کرنے پر
مجبور کر دیا ہے کہ اب آخری قانون یہی ہے اور اس کے بعد کسی دوسرے قانون کا انتظار عبث ہے۔

دنیا انصاف کے ساتھ غور کرے گی تو آسمانی ادیان میں آج روئے زمین پر اسے اسلام کے سوا کوئی دین قابلِ قبول
نظر نہیں آئے گا۔ اسلام کا پہلا اعلان یہ ہے کہ ادیانِ سماویہ کی بنیاد فرقہ بندی اور تعصب پر نہیں ہے، ہر دین پہلے دین کا
مصدق اور آئندہ کا مبشر بن کر آیا ہے۔ یہاں تک کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہ بنام حق دنیا میں آیا تو اس نے
خدا کے سب نبیوں کی عظمت سرِ نو زندہ کر دی۔ سب رسولوں کا احترام کرنا فرض و لازم قرار دیدیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے
منکر کو اسی طرح کافر ٹھیرایا جیسا خدا کے سب سے بڑے رسول محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر کو۔ پہلے نبیوں کے سر جو
تہمتیں لگا دی گئی تھیں تحقیق و تنقید کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا۔ خدا کی مقدس کتابوں میں خفیہ سازشوں کا انکشاف کیا
اور اس طرح ان کی عظمتِ رفتہ کو پھر قائم کیا اس نے پہلے رسولوں سے کٹ کر اور پہلے دینوں کو جھوٹا کہہ کر کسی نئے دین کی
دعوت نہیں دی بلکہ اسی حقیقت کی طرف بلایا جس کی ان کے پیغمبر انھیں وصیت کر گئے تھے۔ تورات یہ نہیں کہتی کہ انجیل کو
مت مانو اور انجیل یہ نہیں بتاتی کہ تورات غلط ہے اسی طرح قرآن یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تورات و انجیل خدا کی نازل کی ہوئی
کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے ماننے والوں پر یہ بھی حق لازم قرار دیتا ہے کہ تم ان کتابوں کو بھی خدا ہی کی کتابیں تصور کرو
رسول عربیؐ یہ نہیں فرماتے کہ میرے سوا کسی پر ایمان نہ لاؤ بلکہ سب سے پہلے وہ خدا کے مقدس رسولوں کی عظمت کا سکہ
دلوں میں قائم کرتے ہیں۔ اگر کسی مسلمان کی زبان سے جذباتِ محبت میں کوئی کلمہ ایسا نکل بھی جاتا ہے جس میں خدا کے دوسرے
رسولوں کے ساتھ رقابت کی بو بھی پائی جاتی ہو تو آپ نہایت سختی کے ساتھ اسی حد پر اسے روک دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنے
متعلق عاجزی و انکساری سے ایسے بھرے ہوئے کلمات ارشاد فرما دیتے ہیں جن کے بعد جذباتِ رقابت یک لخت سرد ہو کر
رہ جاتے ہیں۔

حقیقت بھی یہ ہے کہ جو دین اپنے عالمگیر ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے اسے ایسی ہی تعلیمات کا مجموعہ بن کر آنا چاہئے
جن میں تمام عالم کے لئے یکساں جاذبیت موجود ہو وہ زمانۂ ماضی میں کسی صداقت پر عمل کرنے والوں کی تغلیط نہ کرتا ہو اور آج جب اپنی طرف

دعوت دے تو یہ کہہ کر دعوت دے کہ تم میری دعوت کی اپنی کتاب سے تصدیق کر لو خدا چاہتا ہے کہ اب بکھرے ہوئے ادیان و ملل کو ایک دین اور ملت بنا دیا جائے۔ دنیا کی ابتدا میں ایک ہی دین تھا اس کے خاتمہ پر پھر ایک ہی دین، ایک ہی ملت رہ جائے صراطِ مستقیم میں عقلی طور پر بھی تعدد کی گنجائش نہیں اس لئے فرقے اور پارٹیاں جو کچھ بنائیں پیروانِ مذہب نے بنائیں، باہمی رقابت اور عصبیت کے جراثیم جو کچھ پھیلائے انھوں نے ہی پھیلائے۔ فروعی اختلاف کو دین کی اساس سمجھ لیا اور اساسی مسائل کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر یہود و نصاریٰ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اسلام اُن سے ایسی کسی ایک بات کا بھی مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی کتابوں کے خلاف ہو وہ مطالبہ کرتا ہے تو یہ کہ تم نے صحیح طور پر عیسیٰ علیہ السلام کا مقام نہیں پہچانا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو ٹھیک نہیں سمجھا۔ تورات و انجیل کی صحیح تعلیمات تم نے حاصل نہیں کیں، تم ایک فرضی عیسیٰ (علیہ السلام) ایک موہوم موسیٰ (علیہ السلام) ایک خود تراشیدہ تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہو اس لئے تم کو حقیقت کا سراغ نہیں ملتا۔ بس تم اتنا ہی کر لو کہ اپنے نبیوں کو صحیح طور پر پہچان لو اور ان کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل پیرا ہو جاؤ تو جو رسول تمہارے سامنے آیا ہے وہی تمہیں اپنا رسول نظر آنے لگے گا۔ خدا کی کتاب جو تمہارے لئے بھیجی جا رہی ہے وہی اپنی کتاب معلوم ہونے لگے گی۔ وہی شعلۂ طور، وہی ید بیضا، وہی دم عیسیٰ دیکھنا ہو تو اب یہاں آکر دیکھو۔ تورات کے وہی پُر شوکت احکام، انجیل کی وہی سادہ اور رقت انگیز تعلیمات، زبور کی حمد و ثنا کے وہی ترانے، پھر سننے ہوں تو یہاں آکر سنو، یہ اس لئے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے تمام برگزیدہ انبیاء علیہم السلام کی شانوں کا مجموعہ بن کر آگئے ہیں۔

حُسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

قرآن کریم خدا کی تمام متفرق صداقتوں کو اپنے دامن میں جمع کئے ہوئے نازل ہوا ہے، کیا وہی صداقت، وہی سچائی اگر تورات میں ہو، انجیل میں ہو تو قابلِ تسلیم ہو، اور اگر وہی قرآن میں ہو تو قابلِ انکار ہو سکتی ہے کیا وہی رسول اگر اس کی بشارت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام دیں تو قابلِ انتظار ہو اور جب وہی تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے تو لائقِ انکار ہو سکتا ہے۔ پھر صرف ان چند مسائل کی بنا پر جو تمہارے ہی لئے تخفیف، تمہارے ہی لئے سہولت کا موجب تھے یہ عداوت یہ ضد کیوں ہے ایسی عالمگیر تعلیم، جذبات سے اتنی خالی، فرقہ پرستی اور تعصب سے اتنی دور، گزشتہ اور موجودہ ادیانِ سماویہ کا اتنا احترام سکھانے والی، پھر ضروریاتِ زمانہ کے لئے اتنی مناسب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایک ایک شوشے کے ساتھ اتنی محفوظ۔ اگر دینِ اسلام کے سوا کسی اور دین میں موجود ہو تو بیشک اس کو اسلام کے مقابلہ میں آنے کا حق ہو سکتا ہے لیکن ان تمام صفات کے ساتھ موصوف تو کیا اگر کسی ایک صفت میں بھی اس کے ہم پلہ نہیں ہے تو یقیناً آج بھی اس کی پیروی نامنظور اور کل بھی خسارہ و نقصان کا موجب ہونا چاہئے۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منه وھو فی الاٰخرة من الخاسرین۔

(نوٹ) یہ یاد رہنا چاہئے کہ مولف کے نزدیک یہاں ارتقاء سے ڈارون کا وہ تمام فلسفہ مراد نہیں ہے جو انھوں نے سلسلۂ تخلیقِ انسانی میں بیان کیا ہے بلکہ کسی جنس کے انواع میں وہ حسی ارتقاء مراد ہے جو ڈارون سے پہلے بھی مسلم تھا اور ان کے بعد بھی مسلم ہے۔ اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر بحث کرنا یہاں ہمارا موضوع نہیں ہے۔

(۲۱۸) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَشْهَدُوْا اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوةَ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ۔ (رواه الخمسة)

(۲۱۸) ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میں اس بات پر مامور ہوں کہ اس وقت تک برابر جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اس کے پیغمبر ہیں، نمازیں اچھی طرح پڑھیں اور زکوۃ ادا کریں جب ان احکام کو مان لیں تو اب مجھ سے اپنی جان اور مال کو بچا لیں گے ہاں بجز اس صورت کے جو اسلامی ضابطہ کے ماتحت ہو اس کے بعد ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے (وہ جانے کہ ان کا اسلام محض نمائشی تھا یا دل سے)۔

(۲۱۸) یعنی جب مشرکین کے ساتھ... کسی...... سبب سے جنگ چھڑ جائے تو اب اس کے ختم کرنے کی قطعی صورت صرف ایک ہے کہ وہ خدا کی توحید اور تمام پیغمبروں کی تصدیق کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کر لیں۔ نماز اور زکوۃ ادا کرنے کا اقرار کریں اسی کا نام اسلام ہے۔ اسلام کے سوا کسی بھی مذہب کی تبدیلی سے جنگ ختم نہیں کی جا سکتی بلکہ اگر اسلام کے کسی ایک رکن کے انکار پر بھی اصرار باقی ہے جب بھی اسلام کی تلوار برابر چمکتی رہے گی۔ ہاں دائرہ اسلام میں آجانے کے بعد یہ تحقیق بھی نہیں کی جائے گی۔ کہ یہ اسلام حقیقی تھا یا محض نمائشی اور وقتی۔ اس آئین کے ماتحت جب یہ منظر کا نقشہ دیکھا جاتا ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ ٹھیک اس وقت جبکہ جنگ نہایت گرما گرمی سے ہو رہی تھی اگر دشمن نے صبانا صبانا (ہم اپنے دین سے نکل گئے) کے نامانوس الفاظ کے ساتھ بھی اپنے اسلام کا اظہار کر دیا ہے اور خالد بن ولید جیسے جرنیل نے اپنی تلوار نیام میں نہیں کی تو اس کی خبر پہنچنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط تأثر سے فوراً آسمان کی طرف یہ کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا دیئے ہیں" پروردگار! یہ جو کچھ کیا خالد نے کیا میں اس سے بری ہوں"۔ یا اگر کسی مشرک نے کسی مسلمان کا بازو کاٹ ڈالا ہے اور جب دوست بردہ مسلمان کا قابو چلا دیکھا تو فوراً کلمۂ اسلام پڑھ کر پناہ لینے کا ارادہ کیا ہے تو اس وقت بھی آپ نے اس مسلمان کی کوئی حجت نہیں سنی اور یہی حکم دیا کہ وہ اس کے بازو تک پہنچی ہوئی تلوار کھینچ لے۔

اس حدیث میں قتل کی بجائے قتال کا لفظ چاہتا ہے کہ یہاں اس جنگ کا تذکرہ ہے جس کی ذمہ داری تنہا مسلمانوں کی نہیں ہے بلکہ اس میں مشرکین کا بھی بڑا ہاتھ ہے اس لئے اس کو اسلام پر جبر و اکراہ کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ورنہ عبارت یوں ہونا چاہیے تھی "امرت ان اقتل الناس" مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں مشرکین کو قتل کرتا رہوں، تاوقتیکہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور یہی وجہ ہے کہ عہد نبوت میں ایک واقعہ بھی ایسا ثابت نہیں ہوتا جہاں محض اسلام پر مجبور کرنے کے لئے آپ نے کسی پر چڑھائی کی ہو۔ اگر اسلام جبر و اکراہ اور زبردستی کے تبدیل عقیدے کو جائز قرار دیتا تو دائرۂ اسلام میں آجانے والوں کے لئے اتنا اغماض کیوں کرتا کہ امام یہ تحقیق بھی نہ کرے کہ ان کا یہ اسلام کہیں نمائشی تو نہیں ہے بلکہ حکم یہ ہوتا کہ جب تک ان کے اسلام کی طرف سے مکمل اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے۔

صلح اور جزیہ بھی اگرچہ جنگ ختم کرنے کا سبب بنتے ہیں مگر یہ دونوں صورتیں طرفین کی رضامندی پر موقوف ہیں۔ فریق محارب صلح کی درخواست کرے گا یا جزیہ دینا قبول کرے گا تو اس کی درخواست قبول کی جا سکتی ہے لیکن جنگ ختم کرنے کا

(۲۱۹) عَنْ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ أُعْطِيتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي
نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ

(۲۱۹) جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے پانچ باتیں مجھے خاص طور پر عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پیشتر کسی نبی کو نہیں دی گئیں، ایک ماہ کی مسافت سے دشمن پر رعب و خوف ڈال کر میری مدد کی گئی ہے، تمام روئے زمین میرے لئے مسجد اور (پانی نہ ہونے کی حالت میں پاک کرنے کا آلہ بنادی

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) وہ حتمی اور یقینی سبب جو صرف دشمن کے ہاتھ میں ہے اسلام ہے۔ اس مرحلے پر قبولِ اسلام کے لئے جبر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے برعکس یہاں اس سبب کا بیان ہے جس کو اختیار کرکے مشرکین مسلمانوں کو جنگ ختم کرنے کے لئے مجبور کرسکتے ہیں۔
صحیح مسلم کے ایک طریقہ میں اتنا اور ہے کہ آپ نے حدیث مذکور بیان فرماکر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ۔ آپ انہیں سمجھائے جائیے کیونکہ آپ کا کام سمجھانا ہی ہے آپ اُن پر داروغہ مقرر نہیں کئے گئے ہیں۔
اب غور کیجئے اگر حدیث کے پہلے حصہ میں جبر و اکراہ کا کوئی ہلکا سا مفہوم بھی موجود ہوتا تو پھر اس کے ساتھ اس آیت کو تلاوت کرنے کا کیا مطلب ہے، یہ کھلا ہوا اختلاف ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو دلوں میں ڈالدینا رسول کا منصب ہی نہیں یہ کام خدائے قدوس کا ہے اس کا کام صرف وعظ و تذکیر کے ذریعہ اسلام کی خوبیاں بیان کردینا ہے، تلوار کے ذریعہ سے کسی چیز کی خوبی نہ تو دلوں میں بٹھائی جاسکتی ہے اور نہ اس کا منصبِ نبوت سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے۔ جبر و اکراہ کے مضمون کے ساتھ صحیح مسلم کے اس ٹکڑے کا کوئی جوڑ نہیں ملتا۔ جبر کے ہوتے ہوئے آپ مصیطر تو ہوسکتے ہیں مُذکر نہیں ہوسکتے اس لئے یہ بدیہی ہے کہ یہاں قبول اسلام پر مجبور کرنے کے لئے جنگ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ مشرکین کی جو جنگ اسلام کے ساتھ جاری تھی اس کے ختم کردینے کی یہ ایک قطعی شکل بیان کی گئی ہے اور شکل بھی ایسی جو ان کی مرضی پر موقوف ہو۔ جنگ انھوں نے شروع کی اس لئے اب ختم بھی انھیں ہی کو کرنی ہوگی۔
(۲۱۹) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات کا ان پانچ ہی میں انحصار نہیں ہے ان کے علاوہ بھی آپ کی بہت سی خصوصیات ہیں جن کو شیخ جلال الدین سیوطی نے خصائص الکبریٰ میں جمع کیا ہے اس سلسلہ میں سب سے بڑی خصوصیت آپ کی بعثتِ عامہ ہے۔ یعنی یہ کہ آپ کائناتِ ارضی کی تمام آبادیوں کے لئے نبی و رسول بناکر بھیجے گئے ہیں۔ اسی بعثتِ عامہ کا یہ قدرتی تقاضا ہے کہ اب روئے زمین پر شریعتِ محمدی کے علاوہ کسی شریعت کی پیروی کرنا نجات کے لئے کافی نہیں۔ حتیٰ کہ دینِ کامل کے اس دور میں اگر موسیٰ علیہ السلام جیسے الوالعزم پیغمبر بھی تشریف لائیں تو اُن کے لئے بھی اسی دین کی پیروی کرنا ناگزیر ہے کیونکہ اب یہی دین اور یہی شریعت ہے جس میں تمام آسمانی صداقتوں کی روح اپنے تمام کمالات کے ساتھ سمودی گئی ہے حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے متعلق بھی عام ہونے کا شبہ کیا گیا ہے مگر وہ اس لئے صحیح نہیں کہ اول تو اُن کے زمانہ تک معمورۂ عالم شاید اتنی وسعت کے ساتھ آباد بھی نہ ہوا ہوگا گمان غالب یہ ہے کہ اس نو آباد کرۂ زمین پر صرف اُن ہی کی قوم ہوگی اس لئے عمومِ بعثت کا مفہوم قدرۃً اُن ہی میں منحصر ہونا چاہئے اور اگر اس سے آگے بھی عموم تسلیم کرلیا جائے تو بہت سے بہت اس کا اطلاق صرف حضرت نوح علیہ السلام کے زمانۂ حیات تک ہوسکتا ہے۔ شیخ تقی الدینؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ توحید اور اصولِ دین کے لحاظ سے اگرچہ تمام انبیاء کی بعثت عام تھی، مشترکہ صداقتوں کی دعوت ہر نبی جسے چاہے دیسکتا تھا لیکن منہاجوں اور شریعتوں کی

الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِأَحَدٍ قَبْلِي وَأُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً (رواہ الخمسۃ الا ابا داؤد)

گئی ہے تو میری امت میں جس کو جہاں نماز کا وقت آجائے وہیں پڑھ لے۔ میرے لئے مالِ غنیمت حلال کر دیا گیا ہے، مجھ سے پیشتر کسی کے لئے حلال نہیں کیا گیا۔ شفاعتِ کبریٰ کا حق صرف مجھے بخشا گیا ہے۔ مجھ سے پہلے جو نبی تھے وہ خاص اپنی ہی قوم کے لئے ہوتے تھے میں تا قیامت تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

دعوت اپنی اپنی قوم کے ساتھ مخصوص تھی مگر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس میں نہ تو قوموں کی تخصیص ہے، نہ شریعت میں کسی قوم کی، نہ زمان و مکان کی بلکہ حیات و وفات کی قید بھی نہیں۔ یہاں تک کہ جن وانس کی بھی کوئی تخصیص نہیں اور اگر غیر مکلف یا جمادات بھی انوارِ نبوت سے غیر شعوری طور پر مستفیض ہو سکتے ہوں تو وہ بھی بلا شبہ اس کے احاطہ میں داخل ہیں۔ غرض یہ عموم و اطلاق یا خالق کی خالقیت و ربوبیت کے لئے ہے اور یا پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے لئے۔ وہ رب العالمین ہے تو یہ رحمۃ للعالمین۔ اللّٰھم صل وسلم وبارك علیہ کما تحب وترضی ؎

یارب تو کریمی و رسولِ تو کریم   صد شکر کہ ہستیم میانِ دو کریم

(۲) ساز و سامان کے ساتھ دشمن کا مرعوب ہونا عام بات ہے لیکن بے سروسامانی میں اُس کا لرزہ براندام ہو جانا آپ کی خصوصیات میں ہے۔ ایک ماہ کی مسافت کی تخصیص صرف اس بنا پر ہے کہ اس وقت آپ کی عداوت کا دائرہ زیادہ تر اسی مسافت کے اندر محدود تھا۔ (دیکھو عمدۃ القاری)

(۳) پہلی امتوں پر نماز کے لئے گرجا و کنیسہ کی پابندی تھی اس امت کے لئے وقت کی پابندی زیادہ ضروری ہے مسجد کے بغیر بھی نماز ادا ہو سکتی ہے اس لئے مسجد کی تلاش میں وقت نہ جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء اسلام میں مساجد کی تعمیر سے قبل مرابض غنم یعنی بکریوں کے بندھنے کی جگہ بھی نماز ادا کر لی گئی ہے۔ مسئلہ کی فقہی حیثیت اپنے محل پر ذکر کی جائے گی۔

(۴) اس امت سے پیشتر بھی مالِ غنیمت خدا کی ملک سمجھا جاتا تھا اور اب بھی اسی کی ملک سمجھا جاتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے آگ آسمان سے آکر اُسے جلا دیتی تھی اور یہی بنی اسرائیل جیسی حریص قوم کے لئے مناسب بھی تھا۔ اب اس ناتوان و نادار امت کے مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس مال کو خدا کی مقرر کردہ تقسیم کے مطابق پھیلا دیا جائے۔ یہاں نادان تو ہر لوٹ کے مال کو مالِ غنیمت کہہ دیتا ہے اور دانا دشمن اُسے لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ سمجھتا ہے اصل بات نہ یہ ہے نہ وہ۔ تفصیل کتاب الجہاد میں آئیگی۔

(۵) محشر میں جب شانِ کبریائی کسی سے خطاب نہ کرے گی تو اس عقدہ کشائی کے لئے اہلِ محشر کسی شفیع کی تلاش کریں گے رب العزت نے اس کام کے لئے اپنے قہر و غضب کے سب سے بڑے مظاہرے کے دن اپنی سب سے بڑی رحمت کو منتخب کیا ہے تا کہ جب بھن غیظ و غضب کے عالم میں رحمۃ للعالمین سامنے آجائیں تو "سبقت رحمتی غضبی" کے قاعدہ کے مطابق اقتضاءِ رحمت غضب کے اقتضاء پر غالب آجائے اور بے یار و مددگار مخلوق سے حساب و کتاب شروع ہو جائے اسی کا نام شفاعتِ کبریٰ ہے اور یہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے اس کے بعد بہت سی اور سفارشیں ہوں گی انہیں شفاعتِ صغریٰ کہتے ہیں۔ اس میں شفاعتِ اکبر کے بہت سے امتیوں کا بھی حصہ ہے۔

من آمن من اھل الکتاب یوتی لہ الاجر مرتین

(۲۲۰) حَدَّثَنِیْ اَبُوْ بُرْدَۃَ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمَنَ بِنَبِيِّهٖ وَاٰمَنَ بِمُحَمَّدٍ وَالْعَبْدُ الْمَمْلُوْكُ اِذَا اَدّٰی حَقَّ اللّٰهِ وَحَقَّ مَوَالِیْهِ وَرَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ يَطَاُهَا فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَاْدِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا فَلَهٗ اَجْرَانِ ثُمَّ قَالَ عَامِرٌ اَعْطَيْنَاكَهَا بِغَيْرِ شَيْءٍ وَقَدْ كَانَ يُرْكَبُ فِيْمَا دُوْنَهَا اِلَی الْمَدِيْنَةِ. (رواہ البخاری وغیرہ)

اہل کتاب میں جو شخص ایمان لائیگا اس کو دو اجر ملیں گے

(۲۲۰) ابو بردہؓ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخصوں کو دو اجر ملیں گے ایک وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لائے۔ دوسرا وہ غلام جو خدا کا حق ادا کرے اور اپنے آقاؤں کا بھی۔ تیسرا وہ شخص جس کی باندی تھی وہ اس سے صحبت کرتا تھا پہلے اس کو خوب سلیقہ شعار بنایا خوب تعلیم دی پھر آزاد کیا اور اس سے نکاح کر لیا اس کو بھی دو اجر ملیں گے عامر (راوی حدیث اپنے شاگرد سے کہتا ہے) ہم نے تو ایسی بیش بہا حدیث تمہیں کسی رنج و تعب کے بغیر سنادی پہلے اس سے معمولی حدیث کے لئے مدینہ تک سفر کیا جاتا تھا۔ (متفق علیہ)

(۲۲۰) ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لئے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا فطرۃً شاق گذرتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ ادیان سماویہ میں کوئی رقابت نہیں یہ پارٹیاں نہیں ہیں اس لئے ان مذاہب کے پیروؤں کو بھی یہی جذبہ رکھنا چاہئے یہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے اس لئے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گذرنا چاہئے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں چلا گیا۔ بلکہ اگر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے تو دو اجر کا مستحق ہوگا ہاں یقینی ہے کہ اگر آپ پر ایمان نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی حبط ہو جائے گا۔ کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جا سکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر شمار ہوگا۔ اس بشارت میں در اصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لے آئیں اور کیوں ایمان نہ لائیں جبکہ ان سب نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت کا جزء ہے۔ پس آپ پر ایمان لانا اُن سب پر ایمان لانا اور آپ کا انکار اُن سب کا انکار ہے اس لئے اگر وہ خدا کے دین یا خدا کے رسولوں کے متعلق فرقہ پرستی کی اسپرٹ رکھیں گے تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام اس کو برداشت نہیں کرے گا اور اُلٹا ان کا حاصل کردہ اجر بھی برباد ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب انبیاء علیہم السلام پر ضروری۔ لیکن منہاج اطاعت صرف اسلام میں منحصر ہے۔

المبايعة على الاسلام هو الحلف على الوفاء بذمة الله

(۲۲۱) عن عبادة بن الصامت (وكان شهد بدرا وهو احد النقباء ليلة العقبة) ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال وحوله عصابة من اصحابه بايعوني على ان لا تشركوا بالله شيئا ولا تسرقوا ولا تزنوا ولا تقتلوا اولادكم ولا تأتوا ببهتان تفترونه بين ايديكم وارجلكم ولا تعصوا في معروف فمن وفى منكم فاجره على الله ومن اصاب من ذلك شيئا فعوقب في الدنيا فهو كفارة له ومن اصاب من ذلك شيئا ثم ستره الله فهو الى الله ان شاء عفا عنه وان شاء عاقبه فبايعناه على ذلك۔ (رواه البخاري)

اسلام پر بیعت کرنا خدا کی اسٹیٹ میں حلفِ وفاداری کے ہم معنیٰ ہے

(۲۲۱) عبادۃ بن صامت سے روایت ہے (بدر میں شریک تھے اور لیلۃ العقبہ میں بیعت کرنے والوں میں شامل تھے) کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد صحابہ کی ایک مختصر جماعت بیٹھی ہوئی تھی آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو۔ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگے، چوری نہیں کروگے، زنا نہیں کروگے، اپنے بچوں کو قتل نہیں کروگے، دیدہ و دانستہ کسی پر افترا پرداری نہیں کروگے اور اُن احکام میں جو شریعت کے مطابق ہوں میری نافرمانی نہیں کروگے، جو شخص تم میں اس عہد کو پورا کرے گا اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے اور جو (حسب الاتفاق) ان باتوں میں سے کسی میں مبتلا ہو جائے گا پھر دنیا میں اس کی سزا مل جائے گی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہو جائے گی اور اگر اس کو (سزا نہ ملی اور) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کی پردہ پوشی فرمائی تو اب یہ اس کی مرضی پر منحصر ہوگا اگر چاہے تو آخرت میں بھی درگذر فرمائے اور اگر چاہے تو اسے عذاب دے۔ ہم نے ان سب شرطوں پر آپ سے بیعت کرلی۔ (بخاری شریف)

(۲۲۱) یہ ایک عام دستور ہے کہ ہر اسٹیٹ کی ابتدا اس کے ساتھ حلفِ وفاداری اٹھانے سے ہوتی ہے کیونکہ جب تک کسی اسٹیٹ اور کسی نظامِ حکومت کے ساتھ پوری وفاداری کا عہد نہ کیا جائے اس نظام کا چلنا ہی ممکن نہیں۔ اس عہد کو کرنے کے بعد نہ صرف یہی کہ اس نظامِ حکومت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے بلکہ سر مو اس کی مخالفت کرنے کی گنجایش باقی نہیں رہتی اور اس کے ساتھ عملاً پوری ہمدردی کرنا بھی فرائض میں شمار ہوتا ہے اسی طرح اسلامی نظامِ حکومت بھی اپنے ہمنواؤں سے سب سے اول اپنے ساتھ حلفِ وفاداری اٹھانے کا مطالبہ کرتا ہے اس کی صورت بیان کلمۂ توحید اور رسالت کی شہادت مقرر کی گئی ہے اسی کا نام ایمان و اسلام ہے اور اسی عہد کو اور زیادہ مضبوط و مستحکم کرنے کے لئے بیعت لی جاتی ہے۔ پس ایمان اگرچہ بظاہر صرف رسالت اور توحید کے اقرار کا نام ہے مگر درحقیقت وہ پوری اسلامی اسٹیٹ کے ساتھ وفاداری کا ایک موکد اور مضبوط اقرار ہے اس لئے صرف ایمان

كيف يبايع الامام الناس

(۲۲۲) عَنْ قَيْسٍ سَمِعْتُ جَرِيْرًا يَقُوْلُ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى شَهَادَةِ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالسَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ (بخاری)

(۲۲۳) عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَاَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَاَنْ نَقُوْمَ اَوْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ حَيْثُ مَا كُنَّا

امام کو لوگوں سے کن باتوں پر بیعت لینا چاہئے

(۲۲۲) قیس روایت کرتے ہیں کہ میں نے جریر سے خود سُنا ہے وہ فرماتے تھے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لا الٰہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شہادت، اور نماز پڑھنے، اور زکوٰۃ ادا کرنے (امام) کی بات سننے اور اس کے احکام ماننے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنے پر بیعت کی تھی۔ (بخاری شریف)

(۲۲۳) عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے حکم سننے اور ماننے پر بیعت کی تھی، خوشی اور ناخوشی دونوں حالوں میں اور اس پر کہ خلافت کے معاملہ میں ہم کسی حقدار شخص سے کوئی جھگڑا نہیں کریں گے، حق کو قائم رکھیں گے (راوی کو یہاں شک ہے کہ یا یہ لفظ تھے کہ حق کہتے رہیں گے) جہاں

لانے سے اسلام کے تمام احکام کا تسلیم کرنا بلکہ اس کی شرح کا خود ایک پرزہ بن جانا ضروری ہو جاتا ہے۔ رسول خدا کی احتیاط کی یہ حد ہے کہ جب کسی کو بیعت فرماتے تو الفاظ بیعت میں یہ قید لگا دیتے کہ آپ کی اطاعت کی حدود بھی صرف معروف کے اندر اندر محدود رہیں گی حالانکہ آپ کے متعلق معروف کے سوا منکر کے حکم دینے کا خطرہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اصل مقصود یہ بتانا تھا کہ جب خدا کی نافرمانی کی سرحد آجائے تو اب خدا کی مخلوق میں کسی بڑے سے بڑے کی اطاعت بھی نہیں کی جائے گی بلکہ اب اس کی اطاعت اسلامی اسٹیٹ کے ساتھ غداری تصور کی جائے گی۔

یہاں بیعت کے مذکورہ بالا الفاظ میں قتلِ اولاد وغیرہ کا ذکر بھی آگیا ہے یہ صرف اس زمانہ کے ماحول کی رعایت تھی اب امام کے لئے اپنے زمانہ کے تقاضوں کی رعایت کر لینا مناسب ہے اور اس قسم کے جرائم پر بیعت لینا مناسب ہے جو اس کے زمانہ میں زیادہ پھیل چکے ہوں۔

(۲۲۳) اسلام میں مرکزی طاقت امیر و خلیفہ کو سمجھا گیا ہے۔ طاقت کو محفوظ رکھنے اور اس کی وحدت کو انتشار سے بچانے کے لئے مسلمانوں پر پہلا فرض یہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ امیر کا حکم خوشی اور ناخوشی کی بحث سے علیحدہ ہو کر ہر حال مانیں بشرطیکہ اس میں خدا کی نافرمانی کا کوئی پہلو نہ ہو اور دوسرا یہ کہ جب اس منصب کی کوئی اہل ہستی سامنے آجائے تو اس کی راہ میں ہرگز آڑے نہ آئیں۔ تیسرا فرض جو اس مرکزی وحدت کا سب سے بڑا مقصد ہے وہ دنیا میں حق کا قیام ہے اس لئے اس کو بھی بیعت کا

لَا نَخَافُ فِي اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔ (بخاری)

(۲۲۴) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ قَالَ کُنَّا اِذَا بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ یَقُوْلُ لَنَا فِیْمَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (بخاری)

لا یبایع رجلا للدنیا

(۲۲۵) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَلَاثَۃٌ لَا یُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَلَا یُزَکِّیْھِمْ وَلَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ رَجُلٌ عَلٰی فَضْلِ مَاءٍ بِالطَّرِیْقِ یَمْنَعُ مِنْہُ ابْنَ السَّبِیْلِ

بھی ہم ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا خوف نہ کھائیں گے۔ (بخاری)

(۲۲۴) عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے احکام سننے اور ماننے پر بیعت کرتے تو آپ ہم سے کہتے کہ (یہ قید لگالو کہ) جتنی تم میں طاقت ہوگی۔

دنیا کے لئے کسی سے بیعت کرنا نہیں چاہئے

(۲۲۵) ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخص ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت میں بات بھی نہ کرے گا، نہ انھیں گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ ایک وہ شخص جو لبِ راہ اپنی حاجت سے زائد پانی رکھتا ہے اور مسافروں کو اس میں سے استعمال کرنے نہیں دیتا

ایک اہم ترین عنصر قرار دیا گیا ہے۔ اس تیسرے جزء سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ اس بیعت کے پہلے جملوں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مرکزی طاقت کے خلاف کسی نفسانیت یا نافہمی کی بنا پر ہنگامہ آرائی نہ کی جائے اسی لئے جہاں ایک طرف اس خاموشی کی تعلیم دی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اس صاف گوئی کا عہد بھی لیا گیا ہے جس میں امیر، غریب، مالک و آقا اور بادشاہ و رعایا کا کوئی فرق نہیں ہے۔ عہدِ سلف کی تاریخ آج بھی مسلمانوں کی اس صاف گوئی کی شاہد ہے۔ اگر عمرؓ جیسے منصف اور بارعب امیر پر بھی کوئی ادنیٰ شبہ ہوگیا ہے تو برسرِ منبر اُن کو ٹوک دینے میں ذرا تامل نہیں کیا گیا۔

(۲۲۵) اسلامی بیعت کا تعلق چونکہ امیرِ وقت اور مرکز سے وابستہ ہے اس لئے یہاں انسانی نیت میں بہت سی کمزوریاں داخل ہوسکتی ہیں اس کی سب سے بڑی کمزوری دنیا طلبی ہے اس لئے یہاں اس پر متنبہ کردیا گیا ہے کہ اتنے اہم عمل کا مقصد اتنا ادنیٰ نہ بنانا چاہئے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اس کے مذہبی نظام سے جدا نہیں بلکہ اُن ہی تمام ہدایتوں کے نیچے ہے جس کے تحت مذہبی نظام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی سیاست میں بھی ہمیشہ وہی اسپرٹ کارفرما رہی ہے جو مذہب میں ہوا کرتی ہے۔ اور اسی بنا پر کسی کو یہ دھوکا لگ گیا ہے کہ آسمانی مذاہب بھی در پردہ انسانوں کی سیاست کا ایک صرف ایک نقاب تھے۔

وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا لَا يُبَايِعُ إِلَّا لِلدُّنْيَا فَإِنْ أَعْطَاهُ مَا يُرِيدُ وَفَى لَهُ وَإِلَّا لَمْ يَفِ لَهُ وَرَجُلٌ يُبَايِعُ رَجُلًا بِسِلْعَةٍ بَعْدَ الْعَصْرِ فَحَلَفَ بِاللّٰهِ لَقَدْ أُعْطِيَ بِهَا كَذَا وَكَذَا فَصَدَّقَهُ وَلَمْ يُعْطَ بِهَا (رواه البخاری)

بيعة النساء

(۲۲۶) عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبَايِعُ النِّسَاءَ بِالْكَلَامِ بِهٰذِهِ الْآيَةِ لَا تُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا قَالَتْ وَمَا مَسَّتْ يَدُ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدَ امْرَأَةٍ إِلَّا امْرَأَةً يَمْلِكُهَا (بخاری)

بيعة الصغير

(۲۲۷) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ هِشَامٍ وَكَانَ قَدْ أَدْرَكَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَذَهَبَتْ بِهِ أُمُّهُ زَيْنَبُ بِنْتُ حُمَيْدٍ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَتْ يَا رَسُولَ اللّٰهِ بَايِعْهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هُوَ صَغِيرٌ فَمَسَحَ رَأْسَهُ وَدَعَا لَهُ۔ (رواہ البخاری)

دوسرے وہ شخص ہے جو امامِ وقت سے صرف دنیا کے لئے بیعت کرتا ہے اگر اس نے اس کے خیال کے مطابق کچھ دیدیا تب تو اس نے اس کے ساتھ وفا کی ورنہ نہ کی۔ تیسرے وہ شخص جس نے عصر کے بعد کسی کے ہاتھ مال بیچا اور (جھوٹی) قسم کھائی کہ اس چیز کی اس کو اتنی قیمت دی جاتی تھی حالانکہ اس کو وہ قیمت نہیں دی جاتی تھی اس بیچارہ نے اس کی بات کو سچ سمجھا (اور اس قیمت کو لے لیا) (بخاری شریف)

عورتوں کی بیعت

(۲۲۶) عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو یہ آیت پڑھ کر صرف زبانی بیعت فرمایا کرتے تھے "کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ گی" خدا کی قسم کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک سوائے آپ کی مملوکہ عورتوں کے کسی اجنبی عورت کو نہیں لگا۔ (بخاری شریف)

بچے کی بیعت

(۲۲۷) عبداللہ بن ہشام سے روایت ہے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ پایا تھا اور ان کی والدہ زینب ان کو آپ کی خدمت میں لے گئی تھیں) اور آپ سے عرض کیا تھا یا رسول اللہ اس لڑکے کو بیعت فرمالیجئے آپ نے فرمایا یہ بچہ ہے اور آپ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ان کے لئے دعا فرمائی (بخاری شریف)

---

(۲۲۶) معلوم نہیں۔ کہ جب دنیا کی اس سب سے مقدس ہستی نے بھی عورتوں کو بیعت کرنے کے وقت ہاتھ نہیں لگایا تو پھر کسی اور شخص کو یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں (باقی حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

بیعة الرقیق

(۲۲۸) عَنْ جَابِرٍ قَالَ جَاءَ عَبْدٌ فَبَايَعَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْهِجْرَةِ وَلَا يَشْعُرُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ عَبْدٌ فَجَاءَ سَيِّدُهُ يُرِيدُهُ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِعْنِيهِ فَاشْتَرَاهُ بِعَبْدَيْنِ أَسْوَدَيْنِ ثُمَّ لَمْ يُبَايِعْ أَحَدًا بَعْدُ حَتَّى يَسْأَلَهُ أَعَبْدٌ هُوَ۔
رواه الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

غلام کی بیعت

(۲۲۸) جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ کی خدمت میں ایک غلام آیا اور آپ سے ہجرت پر بیعت کی، آپ کو یہ خبر نہ تھی کہ یہ غلام ہے اس کے بعد اس کا مالک اس کو لینے کے لئے آیا آپ نے کہا اس کو میرے ہاتھ فروخت کردو اور سیاہ رنگ کے دو غلام دے کر اس کو خرید لیا اور آئندہ کبھی کسی کو اس وقت تک بیعت نہ کیا جب تک کہ یہ تحقیق نہ کرلی کہ کہیں وہ غلام تو نہیں ہے۔ (ترمذی)

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ) اچھی اور بری نیت کا سوال نہیں ہے بلکہ بیعت کے وقت عورت کو ہاتھ لگانا خواہ کسی نیت سے ہو آئینِ بیعت ہی نہیں رکھا گیا۔ درحقیقت شریعت کی یہ بڑی پُرحکمت نظر ہے کہ جن مقامات پر انسان کوئی ادنیٰ خیانت بھی کرسکتا تھا اس نے مدار کار صرف ظاہر عمل پر رکھدیا ہے اور نیت سے کوئی بحث نہیں کی۔

(۲۲۷) بیعت کا مقصد شریعت پر عمل کرنے کا عہد لینا ہے جس پر ابھی خود اللہ تعالیٰ نے عمل کرنے کا بوجھ نہیں ڈالا اس پر عمل کا بوجھ آپ کیسے ڈال سکتے تھے ہاں رحمۃ للعالمین نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ اس کو دعاء برکت دیئے بغیر یونہی رخصت کردیا جائے۔ رسولِ خدا کی یہ دونوں شانیں حکمت وشفقت سے لبریز نظر آتی ہیں۔

(۲۲۸) یہاں ایک مشکل تو یہ درپیش تھی کہ اس غلام کو تحقیق سے قبل بیعت کرلینا یہ تقاضہ کررہا تھا کہ اس کو فوراً اس کے مالک کے حوالہ کردیا جاتا۔ دوسری مشکل اپنی بیعت کے احساسِ ذمہ داری کی تھی۔ جس کو بیعت کرکے ایک مرتبہ اپنی پناہ میں لے لیا گیا تھا اس کو دشمن کے حوالہ کردینا خوشی سے کیونکر گوارا کرلیا جائے۔ اس لئے آپ نے ان دونوں پہلوؤں کو نبھایا اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ نبھایا۔ مالک کو یوں خوش کردیا کہ ایک غلام کے بدلہ دو غلام دیدیئے اور غلام کے بیعت کی یوں لاج رکھ لی کہ اس کی حمایت میں جائز طور پر جو قدم بھی اٹھایا جاسکتا تھا اٹھا دیا۔ لیکن آئندہ کے لئے اپنا یہ دستور العمل ٹھیرا لیا کہ جب کسی کے متعلق ذرا شبہ پڑتا تو بیعت کرنے سے پہلے یہ تحقیق فرمالیتے کہ کہیں وہ کسی کا غلام تو نہیں۔ اس قسم کے روزمرہ کے واقعات سے یہ اندازہ کرلینا چاہیئے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عام معاملات میں بھی جبرواکراہ سے کتنی دور رہتے تھے اور حقوق کی ادائیگی کے بارے میں اپنے اور پرائے، مسلمان اور کافر کا کوئی امتیاز نہ کرتے تھے۔

بيعة الاعراب

(۲۲۹) عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ اَعْرَابِيًّا بَايَعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْاِسْلَامِ فَاَصَابَهٗ وَعْكٌ فَقَالَ اَقِلْنِيْ بَيْعَتِيْ فَاَبٰى ثُمَّ جَاءَهٗ فَاَبٰى ثُمَّ جَاءَهٗ فَاَبٰى فَخَرَجَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْمَدِيْنَةُ كَالْكِيْرِ تَنْفِيْ خَبَثَهَا وَتُنْصِعُ طَيِّبَهَا۔ (رواہ البخاری)

بادیہ نشینوں کی بیعت

(۲۲۹) جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک گنوار آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام پر بیعت کی، اتفاق یہ کہ اس کو بخار ہو گیا، اس نے کہا آپ میری بیعت واپس فرما دیجئے آپ نے انکار کیا وہ پھر آپ کے پاس آیا آپ نے پھر انکار کیا وہ پھر آیا آپ نے پھر انکار کیا آخر وہ مدینہ سے نکل گیا۔ آپ نے فرمایا مدینہ مثل ایک بھٹی کے ہے اپنے میل کچیل کو دفع کر دیتا ہے اور عمدہ کو اور خالص کر دیتا ہے۔ (بخاری شریف)

(۲۲۹) ایک گنوار وہ بھی عرب کا باشندہ جس کی فطرت میں بدفالی و نیک فالی کا عقیدہ رچا ہوا تھا بیعت اسلام کے بعد اتفاقاً بیمار پڑتا ہے تو العیاذ باللہ اس کو اپنے اسلام کی نحوست تصور کر لیتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اس کا علاج اب اس بیعت کو فسخ کروا لینے کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے کم علم اور نافہم کو آپ سمجھاتے بھی تو کیا سمجھاتے اور اسلام کی بیعت واپس کرنے کا اقرار بھی کرتے تو کیسے۔ یہ بیعت کوئی خرید و فروخت کی معمولی بیعت تو نہ تھی کہ جب چاہی کر لی اور جب چاہی فسخ کر ڈالی، یہ تو متاعِ حیوۃ گنوانے یا ٹھکانے لگانے کا سودا تھا۔ خدا سے محبت، اس کے احکام کی بجا آوری پر عہد لینے اور عہد کرنے کی اہم بیعت تھی۔ اگر یہ احمق اس کو واپس کرتا ہے تو کر دے لیکن داعیِ اسلام سے فسخ بیعت پر دستخط کر دینے کی تمنا کیوں کرتا ہے۔
آپ کی دعوت و ارشاد کا یہ پہلو بھی عجب پُر حکمت ہے کہ اس قسم کے احمقوں سے نہ تو ان کے ناسزا کلمات کی کبھی آپ تحقیق فرماتے اور نہ اُن پر کچھ مواخذہ ہی کرتے بلکہ کوئی ایسا حقیقت اور نصیحت سے بھرا ہوا کلمہ ارشاد فرما دیتے جو اس کی نصیحت آموزی اور دوسروں کی عبرت پذیری کے لئے کافی ہو جاتا۔ یہاں بھی آپ صرف یہ فرما کر خاموش ہو گئے کہ مدینہ چھوڑ کر باہر چلا جانا اور اس کے سرد و گرم کی برداشت نہ کرنا اچھی علامت نہیں۔ یہاں کی تنگی و ترشی پر جو صبر کر گیا وہ گناہوں کی آلائشوں سے پاک و صاف ہو گیا اور جو اُن پر صبر نہ کر سکا اور گھبرا کر باہر نکل گیا وہ جیسا نجاست آلودہ داخل ہوا تھا ویسا ہی نجاست آلودہ چلا گیا۔ سوچو اور انصاف کرو کہ پورے اقتدار کے باوجود نہ تو اس کے اس طرزِ عمل پر آپ کوئی ادنیٰ سرزنش فرماتے ہیں اور نہ اس کو اسلامی بیعت قائم رکھنے پر مجبور ہی کرتے ہیں اور نہ اس تحقیق میں پڑنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں کہ اس فقرہ سے اس کا اصل مقصد کیا تھا، کیا اتنی آزادی کے بعد بھی اسلام میں جبر و اکراہ کا کوئی تخیل لایا جا سکتا ہے۔
یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدح و ذم کے اُن مقامات پر بھی جہاں انسان کا قلم اور زبان دونوں بے قابو ہو جاتے ہیں انبیاء علیہم السلام کا قدم ذرا نہیں ڈگمگاتا۔ وہ یہاں بھی اتنے اعتدال کے ساتھ چلتے ہیں کہ ان کے اور کمالات کو چھوڑ کر اگر اسی ایک کمال پر غور کیا جائے تو ان کی حقانیت اور نبوت کے ثبوت کے لئے یہی ایک بات کافی ہے۔ کیا ممکن ہے کہ

الذین وفدوا علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم من العرب للسوال عن الاسلام والایمان

(۱) وفادۃ ضمام بن ثعلبہ

(۲۳۰) عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ لَنَا قَدْ نُهِيْنَا اَنْ نَسْأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ شَيْءٍ فَكَانَ يُعْجِبُنَا اَنْ يَجِيْءَ الرَّجُلُ مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلُ فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ الْبَادِيَةِ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ اَتَانَا رَسُوْلُكَ فَزَعَمَ لَنَا اَنَّكَ تَزْعُمُ اَنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَكَ قَالَ صَدَقَ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ الْاَرْضَ قَالَ اللّٰهُ قَالَ فَمَنْ نَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ

اُن وفود کا ذکر جو اسلام و ایمان کی تحقیق کیلئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے

(۱) ضمام بن ثعلبہ کی آمد

(۲۳۰) انس بن مالکؓ روایت فرماتے ہیں کہ ہمیں (قرآن میں) اس بات سے روکا گیا تھا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بے ضرورت سوال کیا کریں اس لئے (ہم خود نہ پوچھتے اور) یہ پسند کیا کرتے تھے کہ کہیں کوئی جنگل کا رہنے والا سمجھدار آدمی آنکلے اور وہ آپ سے پوچھے اور ہم سنیں، اتفاقاً ایک گنوار شخص آیا اور بولا اے محمدؐ آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا تھا اُس نے ہم سے کہا کہ آپ کو اس بات کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا۔ پھر اس نے پوچھا آسمان کس نے بنایا ہے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ اس نے کہا زمین کو، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ اس نے کہا اچھا تو ان پہاڑوں کو کس نے قائم کیا اور ان میں قسم قسم

بڑے سے بڑے اشتعال آمیز اور زیادہ سے زیادہ مسرت بخش حالات میں بھی ان کے منہ سے ایک لفظ بھی ایسا نکل جائے جس میں مبالغہ آمیزی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی پیدا ہو سکے اس وقت بھی ان کی زبان سے وہی الفاظ نکلتے ہیں جو حقیقت کی ترجمانی کے لئے سب سے قریب تر ہو سکتے ہیں۔ پہلے ایک واقعہ آپ پڑھ چکے ہیں جس میں ایک شخص اسلام لاتا ہے اور اس کے بعد فوراً شہید ہو جاتا ہے ایسے پاک و صاف انسان اور ایسے جانباز کی مدح سرائی کے لئے اگر کوئی شاعر مزاج زبان کھولتا تو نہ معلوم آسمان و زمین کے کتنے قلابے ملا دیتا، یا اس گنوار جیسے بدبخت اور گستاخ کے ہجو کرنے پر آتا تو خدا جانے کیا کیہ کہتا مگر رسولِ خدا کی زبان سے اُس شہید کے حق میں جو کلماتِ مدحیہ نکلے وہ صرف یہ تھے "عمل قلیل واجر کثیر" اس نے عمل گو تھوڑا کیا تھا مگر ثواب بہت پایا۔ اور اس گستاخ کے حق میں جو کلمات ارشاد ہوئے وہ بھی صرف یہ ہیں جو اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ان دونوں مقامات پر لسانِ نبوت کے کانٹے پر تلے ہوئے کلمات دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ استقامت و تمکین سے لبریز کلمات ایسے منضد کے موتی ہیں جس میں ہواؤں کے طوفان خیز تموج سے بھی کوئی ادنیٰ جنبش نہیں ہوتی۔ ہم اس حقیقت کو جا بجا واضح کریں گے اور آپ ہر جگہ اس کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کیجئے گا کہ روزمرہ کی گفتگو دن رات کے ان معمولی واقعات میں جن کو انسان کوئی اہمیت نہیں دیتا انبیاء علیہم السلام کا انداز بیان کیا رہتا ہے اس کے بعد آپ مجبور ہو جائیں گے کہ ان نفوسِ قدسیہ کی صداقت و امانت، علو ہمت و فکر اور ان کی بنی نوعِ انسانی کے ساتھ یکساں ہمدردی پر پورا یقین کرلیں۔

وَجَعَلَ فِيهَا مَا جَعَلَ قَالَ اللهُ قَالَ فَبِالَّذِي خَلَقَ السَّمَآءَ وَخَلَقَ الْأَرْضَ وَنَصَبَ هٰذِهِ الْجِبَالَ آللهُ أَرْسَلَكَ قَالَ نَعَمْ. قَالَ فَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِي يَوْمِنَا وَلَيْلَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا زَكَاةً فِي أَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرِ رَمَضَانَ فِي سَنَتِنَا قَالَ نَعَمْ صَدَقَ قَالَ فَبِالَّذِي أَرْسَلَكَ آللهُ أَمَرَكَ بِهٰذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حَجَّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَدَقَ قَالَ ثُمَّ وَلّٰى فَقَالَ وَالَّذِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ نَبِيًّا لَا أَزِيدُ عَلَيْهِنَّ شَيْئًا وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُنَّ شَيْئًا فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَئِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ۔ (رواہ احمد والشیخان وابوداؤد)

کی چیزیں کس نے بنائیں، آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ (یہ سن کر) وہ بولا اسی کی قسم ہے جس نے آسمان زمین بنایا اور ان پہاڑوں کو قائم کیا سچ بتایئے کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسول بنایا ہے آپ نے فرمایا ہاں پھر اس نے کہا آپ کے قاصد نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ شب و روز میں ہمارے ذمہ پانچ نمازیں فرض ہیں آپ نے فرمایا سچ کہا (یہ سن کر) وہ کہنے لگا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے سچ بتایئے کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے آپ نے فرمایا ہاں پھر اس نے کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے مالوں میں زکوٰۃ بھی واجب ہے، آپ نے فرمایا سچ کہا۔ پھر اس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے ٹھیک بتایئے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے آپ نے فرمایا ہاں۔ پھر اس نے کہا آپ کے قاصد نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ذمہ ایک سال میں ماہ رمضان کے روزے ہیں آپ نے فرمایا ہاں اُس نے سچ کہا پھر اُس نے کہا اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنایا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے آپ نے فرمایا ہاں پھر اُس نے کہا آپ کے قاصد کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم میں جس کے پاس سواری اور توشہ سفر مہیا ہو اس پر بیت اللہ کا حج کرنا بھی فرض ہے آپ نے فرمایا اُس نے سچ کہا، راوی کہتا ہے کہ یہ سوالات کر کے اس شخص نے پشت پھیری اور کہا تو اس ذات کی قسم ہے جس نے آپ کو سچا نبی بنایا ہے میں ان باتوں پر کچھ کم و بیش نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر یہ سچ کہتا ہے تو یقیناً جنت میں جائے گا (احمد، بخاری شریف و مسلم شریف، ابو داؤد)

(۲۳۰) مورخین کو ضمام بن ثعلبہ کی آمد کے سال میں اختلاف ہے۔ ابن اسحٰق اور ابو عبیدہ وغیرہ کی رائے ہے کہ یہ ۹ھ میں آئے ہیں۔ واقدی ۵ھ میں فرماتے ہیں مگر محققین نے اس کو تسلیم نہیں کیا۔ دوسرا اختلاف ان کے اسلام کے بارے میں ہے امام بخاریؒ وغیرہ کا میلانِ خاطر اس طرف ہے کہ جس وقت آپ کا قاصد پہنچا تھا یہ اسی وقت مسلمان ہو چکے تھے اور اب ان کا

وعنہ فی روایۃ اخری بنحو ھذا وزاد قَالَ الرَّجُلُ اٰمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِہٖ وَاَنَا رَسُوْلُ مَنْ وَّرَائِیْ مِنْ قَوْمِیْ قَالَ وَاَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَۃَ اَخُوْ بَنِیْ سَعْدِ بْنِ بَکْرٍ۔

(۲۳۱) عَنْ طَلْحَۃَ بْنِ عُبَیْدِ اللّٰہِ قَالَ جَاءَ اَعْرَابِیٌّ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِیْ یَوْمٍ وَّلَیْلَۃٍ قَالَ ھَلْ عَلَیَّ غَیْرُھُنَّ قَالَ

حضرت انسؓ سے یہی مضمون ایک اور طریقہ سے بھی مروی ہے اس میں یوں ہے۔ اس شخص نے کہا جو دین آپ لائے ہیں میں اس کو قبول کر چکا ہوں اور میں اپنی قوم کا قاصد ہوں جو میرے پیچھے ہے۔ میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے اور میں بنو سعد بن بکر کا بھائی ہوں۔

(۲۳۱) طلحہ بن عبید اللہ فرماتے ہیں کہ ایک گنوار آدمی آپ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا یا رسول اللہ اسلام کی تفصیل بتائیے۔ آپ نے فرمایا شب و روز میں پانچ نمازیں، اس نے عرض کیا اس کے سوا میرے ذمہ کچھ اور نمازیں

مقصد صرف اس کی تصدیق کرنا تھا۔ قرطبی کا رجحان اس طرف ہے کہ یہ یہاں آکر مسلمان ہوئے ہیں۔ ہماری رائے ناقص میں ان کے دل میں صداقتِ اسلام کا سکہ تو پہلے ہی قائم ہو چکا تھا لیکن باضابطہ مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہی ہوئے ہیں "اٰمنت بما جئت" یہ کا ترجمہ ہم نے امام بخاریؒ کی رائے کے مطابق کیا ہے۔ ہماری گذارش کے مطابق یہ الفاظ اپنے ظاہر پر ہی رہیں گے۔

حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے روایتِ مذکورہ میں "شرائع الاسلام کلہا" کے الفاظ بھی پیش کیے ہیں یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز روزے کے سوا کل احکامِ اسلام ان کے سامنے بیان کر دیئے تھے اس پر مسند امام احمد سے ان کا یہ جواب نقل کیا ہے۔ وساؤدی ھذہ الفرائض واجتنب ما نھیتنی عنہ لا ازید ولا انقص۔ (میں ان تمام فرائض کو ضرور ادا کروں گا اور جن جن باتوں سے آپ نے روکا ہے اُن سے احتراز رکھوں گا اور اس پر زیادتی کمی کچھ نہیں کروں گا) —— ان الفاظ کے بعد کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ ضمام نے پورے دین پر عمل کرنے کا عہد کیا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ابو ہریرہؓ کی روایت میں اتنی بات اور نقل کی ہے فاما ھذہ الھناۃ فواللہ ان کنا لنتنزہ عنھا فی الجاھلیۃ یعنی الفواحش۔ (یعنی رہ گئیں یہ بیحیائی کی حرکتیں تو ان سے تو ہم کفر کے زمانہ میں بھی بچا کرتے تھے) کس قدر تعجب خیز ہے کہ ضمام کی اس سلامتِ فطرت اور ان کے اس تفصیلی جواب کے بعد بھی صرف لا ازید (میں اور اعمال نہیں کروں گا) کے ایک لفظ سے یہ خیال قائم کر لیا جائے کہ انھوں نے ان چند احکام کے سوا بقیہ احکام نہ کرنے کا قصد کر لیا تھا اول تو یہ ایک نو مسلم شخص تھے ان کے نزدیک کل دین اتنا ہی تھا جتنا اس وقت ان کے سامنے آگیا تھا۔ جس حصہ کا اب تک انھیں علم ہی نہ تھا۔ اس کے کرنے نہ کرنے کا وہ کیسے قصد کر سکتے تھے دوم ہمارے نزدیک جو الفاظ انھوں نے یہاں استعمال کیے تھے وہ امتثالِ امر کے لئے زیادہ سے زیادہ تاکید کے الفاظ تھے۔ بے کم و کاست پورا کرنا اردو میں بھی ایک عام محاورہ ہے جو کسی کام کو پورا پورا ادا کرنے کے موقعہ پر مستعمل ہے۔ پس یہاں ان کے اس لفظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انھوں نے ان چند احکام کے سوا اور احکام پر عمل نہ کرنے کا عہد کیا تھا۔ الفاظ پر بے جا جمود ہے پھر اس کے جواب کے درپے ہونا اور بے جا دردسری ہے۔

(۲۳۱) اس روایت میں "لا ازید" کے بجائے "لا اتطوع" کا لفظ شارحین کے لئے ایک اور مشکل کا موجب بن گیا ہے اس لفظ سے ان کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ اس اعرابی نے شاید عباداتِ نافلہ نہ کرنے کا عہد بھی کیا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ صرف لفظی

وَسَأَلَهُ عَنِ الْقَوْمِ قَالَ صِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ قَالَ لَا قَالَ وَذَكَرَ الزَّكَاةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا قَالَ وَاللّٰهِ لَا أَزِيدُ عَلَيْهِنَّ وَلَا أَنْقُصُ مِنْهُنَّ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ۔ رواہ احمد والشیخان وابوداؤد وغیرھم. وفی کتاب الحیل من البخاری الا ان تطوع وفیہ بعد ذکر الصلوۃ والزکوۃ فاخبرہ بشرائع الاسلام قال والذی اکرمک لا اتطوع شیئا ولا انقص مما فرض اللہ علی شیئا۔

(۲) وفادۃ معاویہ بن حیدۃ

(۲۳۲) عَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ قَالَ أَتَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَاللّٰهِ مَا أَتَيْتُكَ حَتّٰى حَلَفْتُ أَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ أُولَاءِ أَنْ لَا آتِيَكَ وَلَا آتِيَ دِيْنَكَ

بھی ہیں آپ نے فرمایا کچھ نہیں۔ راوی کہتا ہے پھر اس نے روزہ کے متعلق دریافت کیا آپ نے فرمایا رمضان کے روزہ۔ اس نے کہا ان کے سوا میرے ذمہ کچھ اور روزہ بھی ہیں، فرمایا کچھ نہیں۔ راوی کہتا ہے اس نے زکوۃ کا بھی ذکر اور دریافت کیا کہ میرے ذمہ زکوۃ کے سوا بھی کچھ اور دینا ضروری ہے فرمایا کچھ نہیں۔ اس نے کہا خدا کی قسم ہے کہ میں ان باتوں پر کچھ کم و بیشی نہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر اس نے سچ کہا ہے تو کامیاب ہوگیا (مسند احمد شیخین وغیرہم) امام بخاریؒ نے کتاب الحیل میں آپ کے جواب میں اتنا اور روایت فرمایا ہے کہ تجھ پر اور کچھ فرض نہیں مگر ہاں اگر تو اپنی طرف سے خود کرنا چاہے۔ نماز اور زکوۃ کے بعد راوی یہ بھی نقل کرتا ہے کہ آپ نے اس کو اسلام کے اور احکام بھی سکھلائے اور آخر میں یہ بھی ہے کہ خدا کی قسم جس نے آپ کو بزرگ بنایا ہے نہ تو میں اپنی طرف سے کچھ اور اضافہ کروں گا اور نہ ان باتوں میں جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض کی ہیں کوئی کمی کروں گا۔

(۲) معاویہ بن حیدۃ کی آمد

(۲۳۲) بہز بن حکیم اپنے دادا معاویہ بن حیدۃ سے روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم میں آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا مگر جبکہ ان انگلیوں کی گنتی سے زیادہ مرتبہ یہ قسم کھا چکا تھا کہ نہ تو میں آپ کے پاس آکر پھٹکوں گا اور نہ آپ کا دین اختیار کروں گا

تفنن ہے اور "لا انقص" کے تقابل کی وجہ سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی اصل مراد اس لفظ سے بھی وہی "لا ازید" کا مفہوم تھا لہذا محض لفظی تفنن سے نئے نئے نتائج پیدا نہ کئے جائیں اور اگر تسلیم ہی کر لیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب بھی ایک نومسلم پر صرف اس کی تعبیر کی وجہ سے مواخذہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۲۳۲) بہز بن حکیم کی اس روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے چند ایسے احکام کا بھی ذکر فرمایا ہے جن کا

وَجَمَعَ بَهْزٌ بَيْنَ كَفَّيْهِ (وفی روایۃ حَتّٰی حَلَفْتُ عَدَدَ اَصَابِعِيْ هٰذِهٖ اَنْ لَا اٰتِيَكَ وَلَا اٰتِيَ دِيْنَكَ) وَاِنِّيْ قَدْ جِئْتُ اِمْرَءً لَا اَعْقِلُ شَيْئًا اِلَّا مَا عَلَّمَنِيَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ وَرَسُوْلُهٗ وَاِنِّيْ اَسْأَلُكَ بِوَجْهِ اللّٰهِ بِمَ بَعَثَكَ رَبُّنَا اِلَيْنَا قَالَ بِالْاِسْلَامِ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا اٰيَةُ الْاِسْلَامِ (وفی روایۃ ما الاسلام)

بہز نے اپنی دونوں مٹھیاں جمع کرکے (دس کے عدد کی طرف اشارہ کیا اور ایک روایت میں لفظ اولا، کی بجائے "اصابعی ھذہ" (ان انگلیوں کے) کا لفظ ہے۔ اور میں آپ کی خدمت میں ایک ایسا شخص آیا ہوں جو قطعاً بے علم اور یکسر ناسمجھ ہے بس وہی جانتا ہے جو خدا اور خدا کا رسول اس کو بتادے۔ میں خدا کا واسطہ دیکر آپ سے پوچھتا ہوں کہ ہمارے پروردگار نے آپ کو ہمارے پاس کیا کیا احکام دے کر بھیجا ہے آپ نے فرمایا (سب سے پہلے) اسلام کا حکم دیا ہے۔ اس نے عرض کیا اسلام کی نشانی کیا ہے (ایک روایت میں ہے اسلام کیا چیز ہے) آپ نے

عام روایات میں ذکر نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام پر عمل کرنا اسلام کے مفہوم میں داخل ہے۔ اکثر احادیث میں آپ نے صرف ارکانِ اسلام پر کفایت کی ہے اور حسب موقعہ ومحل کہیں کہیں اسلام کے کچھ اور اہم احکام بھی بیان فرمادیئے ہیں۔ اس حدیث میں اسلام کی جو تشریح کی گئی ہے وہ خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے الفاظ سے ملتی جلتی ہے انھوں نے بھی خدا کی پوری پوری حکمبرداری کے بعد "وما انا من المشرکین" فرمایا تھا اور یہاں بھی "تخلیت" کا لفظ آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جس شدت کے ساتھ شریعت پر عمل کا عہد کرنا ضروری ہے اسی شدت کے ساتھ کفر وشرک سے دور رہنے کا عہد بھی ضروری ہے۔ شریعت کے فرائض وواجبات میں سستی کرنا فسق ہے اور خلاف شریعت میں شدت اختیار نہ کرنا مداہنت ہے ایمان یہ ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کو معبود سمجھے اور ساتھ ہی معبودانِ باطل کے متعلق یہ یقین بھی کرے کہ ان میں معبودیت کی ایک شمہ برابر بھی اہلیت نہیں وہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہر وقت مقہور وذلیل ہیں چنانچہ ضمام جب آپ کی خدمت سے رخصت ہوکر اپنی قوم کے پاس پہنچے تو سب سے پہلے جو الفاظ ان کے منہ سے نکلے وہ یہ تھے "بئست اللات والعزی" لات وعزی دونوں ذلیل وخوار ہیں دیکھو شرح مواہب ؎

از یکے گو وز ہمہ یکسوئے باش — یک دل ویک قبلہ ویک روئے باش

پس اگر حریم معبودیۃ میں ایک اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے سوا کسی غیر کے لئے کوئی ادنیٰ گنجائش باقی ہے تو یہ ایمان نہیں ہے ایمان واسلام یہ ہے کہ باطن میں ایک اللہ کے سوا کسی غیر کی معبودیت اور قانونِ شریعت کے سوا کسی اور قانون پر راضی ہونے کی گنجایش باقی نہ رہے۔ رضینا باللہ ربا وبالاسلام دینا کا مفہوم یہی ہے۔ با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تک قلب میں کفر کی طرف میلان باقی ہے اسلام مسلمان کے ظاہر وباطن کے ساتھ کفر کا کوئی تسمہ لگا رکھنا نہیں چاہتا۔ اسلام اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ "وما انا من المشرکین" کا نعرہ نہ لگا دیا جائے۔ الوہیت کے مقام میں ایک اللہ کے سوا بقیہ تمام معبودوں کو ذلیل سمجھنا دوسروں کی تذلیل نہیں بلکہ مقام الوہیت کی تعظیم ہے قانونِ شریعت کے سوا باطل قوانین کو دستور العمل بننے کے ناقابل سمجھنا۔ دوسرے قوانین کی توہین نہیں بلکہ شریعت کا ایک حق ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام آپ کو دوسرے معبودوں کی تذلیل یا دوسرے مذاہب کی توہین کرنے کی دعوت دیتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ

قال ان تقول اسلمت وجهي وتخليت وتقيم الصلوة وتؤتي الزكاة وكل مسلم على مسلم محرم
اخوان نصيران لا يقبل الله عز وجل من مشرك يشرك بعد ما اسلم عملا او يفارق المشركين
الى المسلمين مالي امسك بحجزكم عن النار الا ان ربي داعي وانه سائلي هل بلغت عبادي وانا
قائل له رب قد بلغتهم الا فليبلغ الشاهد منكم الغائب۔ ثم انكم مدعوون ومفدمة
افواهكم بالفدام وان اول ما يبين (وفي رواية يترجم) قال وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم
بيده على فخذه (وفي رواية ثم ان اول ما يبين عن احدكم لفخذه وكفه) قال قلت يا رسول الله
هذا ديننا قال هذا دينكم واينما تحسن يكفك۔ رواه احمد والحاكم وقال صحيح الاسناد
واقره الذهبي۔ واخرجه النسائي مختصرا۔

فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو یہ اقرار کرے کہ میں اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر چکا اور شرک وکفر سب چھوڑ چکا، نماز پڑھے،
زکوٰۃ دے، ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے قابلِ احترام ہے، مسلمان باہم دو بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کا
مددگار رہنا چاہیئے جو مشرک اسلام لانے کے بعد پھر شرک کرے اس کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا جب تک کہ وہ ان کو چھوڑ کر
پھر مسلمانوں کے گروہ میں شامل نہ ہو جائے۔ یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمہاری کمر پکڑ پکڑ کر تمہیں دوزخ کی آگ سے بچا رہا
ہوں (اور تم ایک نہیں مانتے) سن لو میرا پروردگار (قیامت کے دن) مجھے بلائے گا اور مجھ سے یقیناً یہ سوال کریگا
کہ آپ نے میرے بندوں کو تبلیغ کر دی؟ میں عرض کروں گا پروردگار! کر دی۔ سن لو تم میں جو لوگ یہاں موجود ہیں
وہ میرا پیغام ان کو بھی پہنچا دیں جو یہاں موجود نہیں پھر تم کو بھی بلایا جائے گا اور تمہارے منہ پر کپڑا لگا دیا جائے گا۔
(تاکہ غلط بات نہ بول سکو) پھر سب سے پہلے انسان کا جو حصہ بیان کرنا شروع کرے گا (اور ایک روایت میں ترجمانی
کا لفظ ہے) راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اپنی ران کی طرف اشارہ کر کے بتایا (کہ وہ حصہ یہ
ہوگا) دوسری روایت میں ہے کہ سب سے پہلے تمہاری طرف سے جسم کا جو حصہ بولے گا وہ تمہاری ران اور تمہارے ہاتھ
ہوں گے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ بس ہمارا دین یہ ہے آپ نے فرمایا ہاں یہ تو تمہارا دین ہے پھر بھلائی جہاں بھی کرو گے کافی ہوگی

کسی سچائی کی سچائی ہونے پر آپ کو پورا پورا یقین اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ باطل کے باطل ہونے کا بھی آپ کو
پورا پورا یقین ہو جائے اگر آپ کے قلب میں باطل پر بھی صداقت کا شبہ پڑ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ حق و باطل
کو ابھی تک ٹھیک طور پر پہچانتے ہی نہیں۔ اسلام عقیدہ کے باب میں کوئی لچک نہیں رکھتا۔ ہاں جب دنیا کے ساتھ معاملات
کا نمبر آتا ہے تو وہ اس میں بڑی سے بڑی رواداری کی بھی تعلیم دیتا ہے اور یہی وجادلهم بالتي هي احسن کا مفہوم ہے
منہ پر کپڑا لگانا حقیقۃً نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے۔ اليوم نختم على افواههم وتكلمنا
ايديهم الاية۔ آج ہم ان کے منہ پر مہر کر دیں گے اور ہم سے ان کے ہاتھ اور پیر تمام واقعات جو انہوں نے کئے
تھے وہ خود بتائیں گے۔

(۳) وفادۃ ابی رزین العقیلی

(۲۳۳) عَنْ اَبِی رَزِیْنِ الْعُقَیْلِیِّ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاَنْ یَّکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْکَ مِمَّا سِوَاھُمَا وَاَنْ تُحْرَقَ بِالنَّارِ اَحَبَّ اِلَیْکَ مِنْ اَنْ تُشْرِکَ بِاللّٰہِ وَاَنْ تُحِبَّ غَیْرَ ذِیْ نَسَبٍ لَا تُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ فَاِذَا کُنْتَ کَذٰلِکَ فَقَدْ دَخَلَ حُبُّ الْاِیْمَانِ فِیْ قَلْبِکَ کَمَا دَخَلَ حُبُّ الْمَاءِ لِلظَّمْاٰنِ فِی الْیَوْمِ الْقَائِظِ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ کَیْفَ لِیْ بِاَنْ اَعْلَمَ اَنِّیْ مُؤْمِنٌ قَالَ مَا مِنْ اُمَّتِیْ اَوْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَبْدٌ یَعْمَلُ حَسَنَۃً فَیَعْلَمُ اَنَّھَا حَسَنَۃٌ وَاَنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ جَازِیْہِ بِھَا خَیْرًا وَلَا یَعْمَلُ سَیِّئَۃً فَیَعْلَمُ اَنَّھَا سَیِّئَۃٌ وَاسْتَغْفَرَ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ مِنْھَا وَیَعْلَمُ اَنَّہٗ لَا یَغْفِرُ اِلَّا ھُوَ اِلَّا وَھُوَ مُؤْمِنٌ

(انفرد بہ احمد وفی اسنادہ سلیمان بن موسیٰ وثقہ قوم وضعفہ آخرون)

(۳) ابو رزین عقیلی کی آمد

(۲۳۳) ابو رزین عقیلی روایت کرتے ہیں کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی یا رسول اللہ ایمان کی حقیقت کیا ہے، آپ نے فرمایا اس بات کی گواہی دے کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے بندہ اور اس کے رسول ہیں، اللہ اور اس کا رسول تجھ کو تمام ماسوی سے زیادہ محبوب ہو جائیں اور آگ میں جل کر خاک ہو جانا اللہ تعالیٰ کے شریک ٹھیرانے سے زیادہ پسند ہو جائے اور جن شخصوں سے رشتہ و نسب کا کوئی تعلق بھی نہ ہو ان سے اللہ ہی کے نام پر محبت ہو جائے۔ جب یہ علامات پائی جائیں تو (سمجھ لینا کہ) اب تمہارے دل میں ایمان کی محبت ایسی سماگئی ہے جیسے سخت گرمی میں پیاسے کے دل میں پانی کی محبت۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں یہ بات کیسے سمجھوں کہ اب میں مومن کامل ہوگیا۔ آپ نے فرمایا میری امت میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے یا یہ فرمایا کہ اس امت میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہے (راوی کا شک ہے) کہ جب نیکی کرے تو اس کو محسوس ہو کہ یہ نیکی ہے اور اس پر یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور بدلہ دے گا اور جب کوئی برائی کرے تو اسے محسوس ہو کہ یہ برائی ہے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے اور یہ یقین رکھے کہ بخشنے والا بجز اس کے کوئی نہیں تو یقیناً وہ شخص کامل مومن ہے۔ (احمد)

(۲۳۳) حدیث مذکور میں پیاسے اور پانی کی تشبیہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان کا باطن جب ایمان کے رنگ سے رنگین ہو جاتا ہے تو اب اس کی محبت صرف عقلی نہیں رہتی بلکہ تقاضا طبیعت بن جاتی ہے۔ نفس کو جو راحت و

(۴) وفادة عبد القيس

(۲۳۴) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ وَفْدَ عَبْدِ الْقَيْسِ لَمَّا قَدِمُوا الْمَدِينَةَ عَلَى رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مِمَّنِ الْوَفْدُ أَوْ قَالَ الْقَوْمُ قَالُوا رَبِيعَةُ قَالَ مَرْحَبًا بِالْوَفْدِ أَوْ قَالَ الْقَوْمِ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا نَدَامَى

(۴) وفد عبد القیس کی آمد

(۲۳۴) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب وفد عبد القیس آپ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا تو آپ نے پوچھا یہ وفد کس قبیلہ کا ہے یا قوم کا لفظ فرمایا (راوی کا شک ہے) انھوں نے جواب دیا قبیلہ ربیعہ کا۔ آپ نے فرمایا خوش آمدید تم لوگ خوشی سے مسلمان ہو کر آئے ہو) اس لئے نہ دنیا میں رسوائی کی نوبت آئی نہ آخرت میں شرمندہ ہو گے

سرور اپنی طبعی مرغوبات میں اور جو کراہت و نفرت طبعی مکروہات میں محسوس ہوا کرتی ہے وہی راحت و سرور ایک مومن کامل کو شریعت کی اتباع میں اور وہی نفرت و کراہت اس کی مخالفت میں محسوس ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ احکام شریعت کی محبت اور اس کے خلاف سے نفرت اختیاری نہیں رہتی۔ اسی کی طرف آیتِ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ۔ (یعنی خدا کا یہ بڑا انعام ہے کہ اس نے ایمان کی محبت تمہارے دلوں میں ڈال دی ہے اور اس کو تمہارے دلوں کی زینت بنا دیا ہے اور کفر فسق اور نافرمانی کی نفرت بٹھا دی ہے)

حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ مومن کے لئے صرف کفر سے نفرت کرنا کافی نہیں بلکہ فسق اور خدا کی نافرمانی سے نفرت کرنا بھی ضروری ہے گناہ کی چند قسمیں ہیں جن میں کفر تو سب سے بڑا گناہ ہے۔ دوسری قسم فسق ہے یہ کفر سے ہلکا ہے۔ معصیۃ درمیانی چیز ہے۔ نہ ہمیشہ فسق ہوتی ہے نہ کفر۔ زیادہ ترقی کر جائے تو کفر تک جا سکتی ہے اور اس سے کچھ کم رہے تو فسق بھی ہو سکتی ہے۔ اسی لئے معصیت میں کبیرہ و صغیرہ کی تفصیل ہے۔ پس ایمان کی اتنی محبت کہ وہ قلوب کی زینت بن جائے اور کفر کی اتنی نفرت کہ وہ اپنے تمام انواع و اقسام کے ساتھ قابل نفرت ہو جائے اس کی علامت ہے کہ اب ایمان انسانی فطرت و مزاج کا جزء بن گیا ہے۔ آیت بالا میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ نعمت کسبی نہیں۔ خدا کی دین کی بات ہے جسے چاہے دیدے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے محدثین کے مذاق پر یہ بھی تحریر کیا ہے کہ آیت میں کفر فسق اور معصیت کی تفصیل کرنا اور ایمان میں فرائض و مستحبات وغیرہ کی تفصیل اختیار نہ کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ ایمان در اصل ان تمام کے مجموعہ ہی کا نام ہے صرف تصدیقِ قلبی کا نام نہیں۔ پس ایمان کی محبت کے معنی تمام شریعت کی محبت ہیں۔ محدثین اعمال کو ایمان سے جدا کرنا نہیں چاہتے اور عملی دنیا کے لئے یہی نظریہ مفید بھی ہے۔ حقیقت ایمانیہ کا تجزیہ اور تحلیل کر کے اس کے اجزاء کی حیثیات اور مراتب میں بحث کرنا فقہ کے لحاظ سے گو اہم سہی لیکن عمل کے دائرہ میں یقیناً مفید نہیں ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے کتاب الایمان ص ۱۷)

(۲۳۴) یہ وفد آپ کی خدمت میں دو مرتبہ حاضر ہوا ہے ایک مرتبہ فتح مکہ سے پہلے ۵ھ میں یا اس سے بھی قبل اس مرتبہ یہ کل تیرہ یا چودہ آدمی تھے جن کے نام فتح الباری میں مذکور ہیں پھر دوسری مرتبہ ۹ھ یا ۱۰ھ میں اس وقت یہ چالیس اشخاص مل کر آئے تھے۔ یہ لوگ بحرین کے باشندہ تھے۔ اسلام میں مسجدِ نبوی کے بعد سب سے پہلا جمعہ ان ہی کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ اول جمعۃ جمعت بعد جمعۃ فی مسجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مسجد

قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّا نَاْتِيْكَ مِنْ شُقَّةٍ بَعِيْدَةٍ وَبَيْنَنَا وَبَيْنَكَ هٰذَا الْحَيُّ مِنْ كُفَّارِ مُضَرَ وَلَسْنَا نَسْتَطِيْعُ اَنْ نَاْتِيَكَ اِلَّا فِيْ شَهْرٍ حَرَامٍ فَاَخْبِرْنَا بِاَمْرٍ نَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ وَنُخْبِرُ بِهِ مَنْ وَرَائَنَا وَسَاَلُوْا عَنِ الْاَشْرِبَةِ فَاَمَرَهُمْ بِاَرْبَعٍ وَنَهَاهُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَمَرَهُمْ بِالْاِيْمَانِ بِاللّٰهِ قَالَ اَتَدْرُوْنَ مَا الْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ قَالُوْا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ وَاَنْ تُعْطُوا الْخُمُسَ مِنَ الْمَغْنَمِ وَنَهَاهُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالنَّقِيْرِ وَالْمُزَفَّتِ قَالَ وَرُبَمَا قَالَ الْمُقَيَّرِ قَالَ احْفَظُوْهُنَّ وَاَخْبِرُوْهُنَّ مَنْ وَّرَائَكُمْ (رواہ احمد والشیخان وغیرہم)

انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم بڑی دور دراز مسافت طے کرکے آرہے ہیں، ہمارے اور آپ کے درمیان کفارِ مضر کا یہ مشہور جنگجو قبیلہ پڑتا ہے اس لئے ہم آپ کی خدمت میں صرف اُن مہینوں میں حاضر ہوسکتے ہیں جن میں کفار کے نزدیک جنگ کرنا حرام ہے اس لئے ہیں تو آپ کوئی ایسی مختصر بات بتادیجئے جس پر عمل کرکے ہم جنت میں چلے جائیں اور جو لوگ ہم سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کو بھی اس کی اطلاع کردیں اور اسی کے ساتھ انھوں نے اُن برتنوں کی بابت بھی پوچھا جن میں نبیذ بنائی جاتی تھی (کون سے استعمال میں لائے جاسکتے ہیں اور کون سے نہیں لائے جاسکتے) آپ نے ان کو چار باتوں کا حکم دیا اور چار باتوں سے روکا (۱) صرف اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا، یہ کہہ کر فرمایا جانتے بھی ہو اللہ پر ایمان لانا کس طرح ہوتا ہے انھوں نے عرض کیا اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ہی زیادہ واقف ہیں فرمایا اس بات کی گواہی دینا کہ قابلِ عبادت کوئی نہیں مگر ایک اللہ تعالیٰ کی ذات اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر ہیں، باقاعدہ نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، ماہِ رمضان کے روزے رکھنا اور مالِ غنیمت میں پانچواں حصہ بھی دیا کرو، اور چار برتنوں کے استعمال سے منع کیا، دباسے، حنتم سے، نقیرے اور مزفت سے (ابن عباسؓ مزفت کے بجائے کبھی مقیر کہا کرتے تھے) اور فرمایا کہ ان باتوں کو یاد کرلو اور جو تم سے اس طرف مسلمان رہتے ہیں ان کو بھی ان باتوں کی خبر کردو۔

عبد القیس بجواثی من البحرین۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے بعد سب سے پہلا جمعہ بحرین کے مقام جواثی میں عبد القیس کی مسجد میں قائم ہوا ہے۔

زرقانی نے شرح مواہب میں بیہقی سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے پاس ابھی ایک قافلہ آنے والا ہے جو اہلِ مشرق میں سب سے بہتر ہے حضرت عمرؓ ان کے دیکھنے کے لئے کھڑے ہوئے تو انھیں ۱۳ آدمیوں کا ایک قافلہ آتا ہوا نظر پڑا انھوں نے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت سنائی پھر اُن کے ساتھ ساتھ آپ کی خدمت میں آئے جب ان لوگوں نے دور سے آپ کو دیکھا تو بے تاب ہوگئے اور فرطِ اشتیاق سے اپنا سامان اسی طرح چھوڑ کر دیوانہ وار آپ کی خدمت میں دوڑ پڑے حاضر ہوکر آپ کا دستِ مبارک چومنے لگے۔ شیخ عبد القیس جو ان کے سردار تھے اگرچہ نو عمر تھے سب سے پیچھے رہ گئے تھے انھوں نے پہلے تو سب کے اونٹ باندھے پھر اپنا بکس کھول کر سفر کے کپڑے اتارے اور دوسرا سفید لباس پہنا پھر باطمینان آپ کی

(۵) وفادة ابن المنفتق

(۲۳۵) عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْيَشْكُرِيِّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ انْطَلَقْتُ إِلَى الْكُوفَةِ لِأَجْلِبَ بِغَالًا قَالَ فَأَتَيْتُ السُّوقَ وَلَمْ تَقُمْ قَالَ قُلْتُ لِصَاحِبٍ لِي لَوْ دَخَلْنَا الْمَسْجِدَ وَمَوْضِعُهُ يَوْمَئِذٍ فِي

(۵) ابن المنفتق کی آمد

(۲۳۵) مغیرہ بن عبداللہ یشکری اپنے والد عبداللہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں خچر خریدنے کے لئے کوفہ گیا بازار پہنچا تو اس وقت تک بازار ٹھیک نہ لگا تھا میں نے اپنے رفیق سے کہا اتنی دیر) مسجد ہی میں چلیں اس وقت اس کی جگہ

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ) خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔ آدمی بدشکل تھے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھائی تو انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ آدمی کی قیمت صرف اس کے ڈھانچے سے نہیں ہوتی اس کی قیمت صرف اس کے دو چھوٹے سے چھوٹے اعضا سے ہوتی ہے زبان اور دل۔ آپ نے فرمایا تم میں دو خصلتیں ہیں جن کو اللہ و رسول پسند کرتے ہیں دانائی اور بردباری انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا میں نے اپنے کسب سے حاصل کی ہیں فرمایا پیدائشی۔

ان کی روایت میں عام طور پر حج کا ذکر نہیں ہے صرف بیہقی نے سننِ کبریٰ کی کتاب الصیام میں "وتحجوا البیت الحرام" کا لفظ روایت کیا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے اس کو شاذ قرار دیا ہے مسند امام احمد میں بھی ایک طریقے میں حج کا ذکر موجود ہے۔

یہ بات آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اسلام کامل اور ایمان کامل بلحاظ مصداق جدا جدا دو چیزیں نہیں ان میں جو کچھ فرق ہے وہ صرف بلحاظ مفہوم ہے۔ وفدِ مذکور آپ کی خدمت میں ایمان و اسلام کا فرق دریافت کرنے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ صرف ایسا نظامِ عمل معلوم کرنے کے لئے آیا تھا جس پر وہ کاربند ہو کر نجات پا جائے اس لئے آپ نے ان کے سامنے ان کے سوال کے مطابق ایک مختصر نظام العمل بیان فرما دیا تھا لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام (جن کی حدیث آئندہ آرہی ہے) اسلام و ایمان اور احسان کی جدا جدا حقیقتیں دریافت کرنے کے لئے آئے تھے ان کے سامنے کوئی مختصر اور مجمل نقشۂ عمل بتانا ان کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا تھا اس لئے ان سے ہر ایک کی حقیقت جدا جدا بیان فرمانا چاہئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان دو حدیثوں میں آپ نے دو منصبوں کے فرائض انجام دیئے ہیں یہاں ایک واعظ و مذکر کے اور حضرت جبرئیلؑ کی حدیث میں ایک مدرس و معلم کے ایک مذکر و واعظ کا فرض علمی چھان بین نہیں وہ صرف عمل کی ترغیب دیتا ہے اور معلم کا فرض علمی مشکلات کو واضح اور صاف کرنا ہے۔ ان دو منصبوں کے لحاظ کو طریقۂ تعبیر بدلنا بھی ضروری ہے اس لئے یہ شبہ نہ کرنا چاہئے کہ ایمان کی جو تشریح یہاں کی گئی ہے جبرئیل علیہ السلام کی حدیث میں وہی تشریح اسلام کی کیسے قرار دیدی گئی۔ بات یہ ہے کہ ایمان و اسلام کا پورا پورا مفہوم تو بلاشبہ حدیث جبرئیل ہی میں ادا کیا گیا ہے لیکن عملی دائرہ میں چونکہ ایمان و اسلام جدا چیزیں نہ تھیں اس لئے ضمام کی حدیث میں ان کی حقیقتوں پر جدا جدا روشنی ڈالنا غیر ضروری سمجھا گیا ہے۔

(۲۳۵) امام بخاریؒ نے باب فضل صلۃ الرحم میں اس روایت کو بیان کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

أَصْحَابِ التَّمْرِ فَإِذَا فِيهِ رَجُلٌ مِنْ قَيْسٍ يُقَالُ لَهُ ابْنُ الْمُنْتَفِقِ وَهُوَ يَقُولُ وُصِفَ لِي رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ فَطَلَبْتُهُ بِمِنًى فَقِيلَ لِي هُوَ بِعَرَفَاتٍ فَانْتَهَيْتُ إِلَيْهِ فَزَاحَمْتُ عَلَيْهِ فَقِيلَ لِي إِلَيْكَ عَنْ طَرِيقِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ دَعُوا الرَّجُلَ أَرِبَ مَا لَهُ قَالَ فَزَاحَمْتُ عَلَيْهِ حَتَّى خَلَصْتُ إِلَيْهِ قَالَ فَأَخَذْتُ بِخِطَامِ رَاحِلَةِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَوْ قَالَ زِمَامِهَا هَكَذَا حَدَّثَ مُحَمَّدُ بْنُ جُحَادَةَ قَالَ قُلْتُ ثِنْتَانِ أَسْأَلُكَ عَنْهُمَا مَا يُنَجِّينِي مِنَ النَّارِ وَمَا يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ قَالَ فَنَظَرَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ نَكَسَ رَأْسَهُ ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيَّ بِوَجْهِهِ قَالَ لَئِنْ كُنْتَ أَوْجَزْتَ فِي الْمَسْأَلَةِ لَقَدْ أَعْظَمْتَ وَأَطْوَلْتَ فَاعْقِلْ عَنِّي إِذًا اعْبُدِ اللَّهَ لَا تُشْرِكْ بِهِ شَيْئًا وَأَقِمِ الصَّلَاةَ الْمَكْتُوبَةَ وَأَدِّ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَصُمْ رَمَضَانَ

کھجور والوں کے محلہ میں تھی کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں قبیلۂ قیس کا ایک شخص بیٹھا ہوا تھا جس کو ابن المنتفق کہتے تھے، وہ یہ کہہ رہا تھا کہ ایک شخص نے مجھ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک بیان کیا میں نے آپ کو منیٰ میں تلاش کیا تو کسی نے کہا آپ میدانِ عرفات میں ہیں میں آپ کے پاس پہنچا تو (بھیڑ بہت تھی اس لئے) زبردستی گھسنے لگا، مجھ سے کسی نے کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ سے ایک طرف ہٹ جا آپ نے فرمایا اس آدمی کو آنے دو ضرورت مند ہے (دیکھو) اُسے کیا ضرورت ہے، وہ فرماتے ہیں میں گھس گھسا کر آپ کی خدمت میں جا ہی پہنچا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سانڈنی کی مہار پکڑلی ایک راوی نے خطام کے بجائے زمام کا لفظ کہا ہے۔ محمد بن جحادہ نے (مغیرہ کا شاگرد) ہم سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ میں نے عرض کیا دو باتیں ہیں جنہیں میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں، آتشِ دوزخ سے مجھے کیا عمل نجات دیسکتا ہے اور جنت کے لئے کیا عمل درکار ہے۔ آپ نے پہلے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا پھر سر مبارک نیچے جھکا لیا اس کے بعد میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا اگرچہ تو نے سوال تو بہت مختصر کیا مگر بات بڑی لمبی دریافت کی ہے اچھا تو اب اس کو مجھ سے خوب سمجھ لے صرف خدا تعالیٰ کی عبادت کر اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کر فرض نماز اچھی طرح پڑھا کر فرض زکوٰۃ

فقال القوم ما لہ ما لہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارب ما لہ۔ یعنی جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ شخص بھیڑ میں زبردستی گھسا آرہا ہے تو کہا ارے اسے کیا ہوگیا ہے، آپ نے فرمایا ہوکیا گیا ہے کوئی ضرورت مند شخص ہے۔ جو ترجمہ یہاں ہم نے کیا ہے وہ صحیح بخاری کی اسی روایت کی مدد سے کیا ہے۔ شارحین کو اس لفظ کے ترجمہ میں اختلاف ہے۔ بخاری کی روایت میں محشی نے کانہ کان علی راحلتہ کی شرح ہمارے نزدیک صحیح نہیں کی جو احتمالات انھوں نے لکھے ہیں وہ سب یہاں چسپاں نہیں ہوتے صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ کی روایت کے آخر میں وہی لفظ مذکور ہیں جو ضمام نے کہے تھے" والذی نفسی بیدہ لا ازید علی ھذا شیئا ابدا ولا انقص منہ" یعنی میں آپ کے ارشاد پر کوئی کمی بیشی نہیں کروں گا۔ ہمارے نزدیک امتثالِ امر کے لئے

وَمَا تُحِبُّ اَنْ يَفْعَلَهُ بِكَ النَّاسُ فَافْعَلْ بِهِمْ وَمَا تَكْرَهُ اَنْ يَاْتِيَ اِلَيْكَ النَّاسُ فَذَرِ النَّاسَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ خَلِّ سَبِيْلَ الرَّاحِلَةِ۔

وَعَنْهُ مِنْ طَرِيْقٍ اٰخَرَ بِنَحْوِهٖ وَفِيْهِ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ دُلَّنِيْ عَلٰى عَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ وَيُنَجِّيْنِيْ مِنَ النَّارِ قَالَ بَخٍ بَخٍ لَئِنْ كُنْتَ قَصَّرْتَ فِي الْخُطْبَةِ لَقَدْ اَبْلَغْتَ فِي الْمَسْئَلَةِ اِتَّقِ اللّٰهَ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤَدِّي الزَّكٰوةَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ خَلِّ عَنْ طَرِيْقِ الرِّكَابِ (رواہ احمد وفی البخاری وتصل الرحم ولیس فیہ ذکر الحج والاسلام)

(۶) وفد الازد

(۲۳۶) عَنْ سُوَيْدِ الْاَزْدِيِّ قَالَ وَفَدْتُ سَابِعَ سَبْعَةٍ مِنْ قَوْمِيْ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا دَخَلْنَا عَلَيْهِ وَكَلَّمْنَاهُ اَعْجَبَهٗ مَا رَاٰى مِنْ سَمْتِنَا وَزِيِّنَا فَقَالَ مَا اَنْتُمْ قُلْنَا مُؤْمِنُوْنَ فَتَبَسَّمَ

دیا کر، رمضان کے روزے رکھا کر۔ اور جو بات تو چاہتا ہے کہ لوگ تیرے ساتھ کریں وہی تو اُن کے ساتھ کیا کر، اور جو بات تو نہیں چاہتا کہ لوگ تیرے ساتھ کریں دوسروں کو بھی اُس سے معاف رکھا کر اس کے بعد آپ نے فرمایا اچھا اب سانڈنی کا راستہ چھوڑ۔

اس روایت کے دوسرے طریقہ میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے لیکن اس کے لفظ یہ ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسا عمل بتا دیجئے جو جنت میں پہنچا دے اور دوزخ کی آگ سے بچا دے، آپ نے فرمایا بہت خوب بہت خوب تم نے درخواست تو مختصر کی مگر سوال بہت گہرا کیا ہے اللہ سے ڈر اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کر، باقاعدہ نماز پڑھا کر، زکوٰۃ دیا کر، حج کر، رمضان کے روزہ رکھا کر، اس کے بعد فرمایا اچھا اب میری سواری کے سامنے سے ہٹ جا۔

(۶) سوید ازدی کی آمد

(۲۳۶) سوید ازدی روایت فرماتے ہیں کہ ہماری قوم کے سات آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن میں ساتواں شخص میں تھا جب ہم آپ کی خدمت میں آئے اور آپ سے گفتگو کی تو جو طرز و انداز آپ نے ہمارا دیکھا آپ کو بہت پسند آیا آپ نے فرمایا تم کون لوگ ہو ہم نے عرض کیا مسلمان آپ مسکرائے اور فرمایا ہر بات

اس سے زیادہ ادب کے الفاظ اور نہیں ہو سکتے اس لئے جو صحیح الفطرت شخص بھی آپ کی خدمت میں آیا ہے اس نے ان ہی الفاظ کو دہرایا۔ الفاظ کی روح نظر انداز کر کے محض ان کی سطح سے سوال و جواب پیدا کرنا نامناسب ہے۔

(۲۳۶) چونکہ یہ لوگ عام اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور نظر آرہے تھے اس لئے آپ نے اُن کو اسلام کے ایک بلند مقام کی

عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَقَالَ اِنَّ لِکُلِّ قَوْلٍ حَقِیْقَةً فَمَا حَقِیْقَةُ قَوْلِکُمْ وَاِیْمَانِکُمْ قُلْنَا خَمْسَ عَشَرَةَ خَصْلَةً خَمْسٌ مِّنْهَا اَمَرَتْنَا رُسُلُكَ اَنْ نُّؤْمِنَ بِهَا وَخَمْسٌ اَمَرَتْنَا اَنْ نَّعْمَلَ بِهَا وَخَمْسٌ تَخَلَّقْنَا بِهَا فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَنَحْنُ عَلَیْهَا اِلَّا اَنْ تَکْرَهَ مِنْهَا شَیْئًا فَقَالَ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا الْخَمْسُ الَّتِیْ اَمَرَتْکُمْ بِهَا رُسُلِیْ قُلْنَا اَمَرَتْنَا اَنْ نُّؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ قَالَ وَمَا الْخَمْسُ الَّتِیْ اَمَرَتْکُمْ اَنْ تَعْمَلُوْا بِهَا قُلْنَا اَمَرَتْنَا اَنْ نَّقُوْلَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَنُقِیْمَ الصَّلٰوةَ وَنُؤْتِیَ الزَّکٰوةَ وَنَصُوْمَ رَمَضَانَ وَنَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْنَا اِلَیْهِ سَبِیْلًا قَالَ وَمَا الْخَمْسُ الَّتِیْ تَخَلَّقْتُمْ بِهَا فِی الْجَاهِلِیَّةِ قُلْنَا الشُّکْرُ عِنْدَ الرَّخَاءِ وَالصَّبْرُ عِنْدَ الْبَلَاءِ

کی ایک حقیقت ہوا کرتی ہے بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے ہم نے عرض کیا پندرہ چیزیں ہیں جن میں پانچ تو ایسی ہیں جن کے متعلق آپ کے قاصدوں نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم ان پر یقین رکھیں اور پانچ ایسی ہیں جن کے متعلق کہا ہے کہ ہم اُن پر عمل کیا کریں اور پانچ وہ ہیں جن کی عادت ہمیں زمانۂ جاہلیت سے پڑی ہوئی ہے اور اب تک ہم اُن پر قائم ہیں ہاں اگر آپ اُنھیں پسند نہ کریں تو البتہ ہم اُنھیں چھوڑ سکتے ہیں آپ نے فرمایا بتاؤ وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن پر میرے قاصدوں نے تم کو یقین رکھنے کے لئے کہا ہے، ہم نے عرض کیا یہ ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اُس کے فرشتے، اس کی کتابیں اس کے سب رسولوں کو مانیں اور مرنے کے بعد جی اٹھنے کا یقین کریں فرمایا وہ پانچ باتیں کیا ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے کہا ہے ہم نے عرض کیا یہ کہ ہم اقرار کریں کہ ایک اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں، نماز باضابطہ پڑھیں، زکوٰۃ دیں، رمضان کے روزے رکھیں اور اگر زادراہ موجود ہو تو بیت اللہ کا حج بھی کریں فرمایا اچھا اب وہ پانچ باتیں بتاؤ جن کی کفر کے زمانہ سے تمہیں عادت ہے ہم نے عرض کیا فراخی میں شکر کرنا، مصیبت میں

تعلیم دی یعنی توکل کی۔ جن پانچ چیزوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے ان کا زیادہ تعلق اسی صفتِ توکل کے ساتھ ہے توکل ترکِ اسباب کا نام نہیں بلکہ اسباب پر ترکِ اعتماد کا نام ہے۔ ترکِ اسباب آسان ہے اور اسباب کر کے ان پر ترکِ اعتماد مشکل ہے۔ بقدرِ ضرورت غذا کی تلاش رہائش کا انتظام توکل کے منافی نہیں البتہ حاجت سے زیادہ غذا، ضرورت سے زیادہ تعمیر یہ توکل کے منافی ہے اسی لئے یہاں آپ نے بقدرِ حاجت غذا، یا مکان کی ممانعت نہیں کی۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ دینِ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اس لئے اس میں ہر ذوق اور ہر مزاج کے مناسب تعلیمات رکھی گئی ہیں اگر کوئی ورع و تقویٰ کی باریکیوں سے گزرتے ہوئے گھبراتا ہے تو اس کے لئے رخصتوں کے صاف اور کھلے ہوئے راستے موجود ہیں اور اگر کوئی بلند فطرت رخصتوں کی بجائے اُن دشوار گذار وادیوں میں گزرنے کی تلاش رکھتا ہے جن سے گذرنے کی تمنا ہر عاشق مزاج کو ہوا کرتی ہے تو ایسی قربان گاہوں کی بھی یہاں کمی نہیں ہے، ان دونوں کے درمیان اعتدال کا راستہ ہے جن میں نہ وہ سہولتیں ہیں نہ یہ دشواریاں، یہاں اپنی حاجت سے زیادہ جمع کرنے اور ضرورت سے زیادہ مکان تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل جاتی ہے مگر پھر اُن کے لئے کچھ حقوق بھی رکھے گئے ہیں جن کے ادا نہ کرنے میں مواخذہ کا کھٹکا لگا رہتا ہے

اب یہ آپ کے پسند کی بات ہے چاہے تو وہ زندگی گذاریئے جو بے کھٹکے ہو اور چاہے وہ بسر کیجئے جس میں خطرات ہیں۔

وَالرِّضَا بِمُرِّ الْقَضَاءِ وَالصِّدْقُ فِي مَوَاطِنِ اللِّقَاءِ وَتَرْكُ الشَّمَاتَةِ بِالْأَعْدَاءِ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حُلَمَاءُ عُلَمَاءُ كَادُوْا مِنْ فِقْهِهِمْ اَنْ يَكُوْنُوْا اَنْبِيَاءَ ثُمَّ قَالَ وَاَنَا اَزِيْدُكُمْ خَمْسًا فَتَتِمُّ لَكُمْ عِشْرُوْنَ خَصْلَةً اِنْ كُنْتُمْ كَمَا تَقُوْلُوْنَ فَلَا تَجْمَعُوْا مَالَا تَاكُلُوْنَ وَلَا تَبْنُوْا مَالَا تَسْكُنُوْنَ وَلَا تَنَافَسُوْا فِي شَيْءٍ اَنْتُمْ عَنْهُ غَدًا تَزُوْلُوْنَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ وَعَلَيْهِ تُعْرَضُوْنَ وَارْغَبُوْا فِيْمَا تَقْدَمُوْنَ وَفِيْهِ تَخْلُدُوْنَ فَانْصَرَفُوْا وَقَدْ حَفِظُوْا مِنْ وَصِيَّتِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَعَمِلُوْا بِهَا (رواہ ابونعیم فی کتاب معرفۃ الصحابۃ کما فی شرح المواھب)

وفادۃ رجال من العرب لم یسموا

(۲۳۷) عَنْ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ قَالَ قَالَ رَجُلٌ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِسْلَامُ قَالَ اَنْ يُسْلِمَ قَلْبُكَ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَاَنْ يَسْلَمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِكَ وَيَدِكَ قَالَ فَاَيُّ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ قَالَ الْاِيْمَانُ

صبر کرنا، مقدرات جب سامنے آجائیں تو اُن پر خوش رہنا، جنگ میں ثابت قدمی اور دشمنوں کی مصیبت پر ہنسی نہ اڑانا آپ نے فرمایا تم تو سب کے سب بڑے حکیم اور عالم نکلے قریب تھا کہ اپنے اس علم و فہم کی بدولت نبی بن جاتے (اگر نبوت جاری ہوتی) اچھا تو اب پانچ باتیں میں تمہیں بتاتا ہوں تاکہ کل مجموعہ بیس باتیں ہو جائیں۔ اگر بات اسی طرح سے ہے جیسا تم کہتے ہو تو حاجت سے زیادہ کھانا جمع نہ کرو اور ضرورت سے زیادہ مکانات نہ بناؤ، اور جس چیز کو چھوڑ کر کل تمہیں چلا جانا ہے اس میں ایک دوسرے کی حرص نہ کرو، اور ایک اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو جس کی طرف پھر لوٹ کر تمہیں جانا ہے اور جس کے سامنے حساب دینے کے لئے پیش ہونا ہے اور اُس گھر کی فکر رکھنا جس میں تمہیں آئندہ جانا اور ہمیشہ رہنا ہے آپ کی یہ وصیت سن کر وہ اپنے وطن کو واپس ہوگئے اور ان پر عمل کیا۔

ان وفود کی آمد جن کا نام روایات میں مذکور نہیں

(۲۳۷) عمرو بن عبسہ روایت فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ اسلام کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ تیرا قلب اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک جائے اور تیری زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانی سے تمام مسلمان محفوظ رہیں پھر اُس نے پوچھا اچھا اسلام کا سب سے بہتر جزء کیا ہے آپ نے فرمایا ایمان! (ایک روایت میں

---

(۲۳۷) عمل کونسا بہتر ہے؟ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب نہیں ہو سکتا۔ فی نفسہ اُس عمل کے وزن، مخاطب کے حالات اور زمانوں کے مختلف تقاضوں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مختلف ہوتا جائے گا اسی لئے حدیثوں میں بھی اس سوال کے جوابات مختلف ہیں

(وفی روایۃ قال خُلُقٌ حَسَنٌ) قَالَ وَمَا الْاِیْمَانُ قَالَ تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ (وفی روایۃ قَالَ وَمَا الْاِیْمَانُ قَالَ الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَۃُ) قَالَ فَاَیُّ الْاِیْمَانِ اَفْضَلُ قَالَ الْھِجْرَۃُ قَالَ فَمَا الْھِجْرَۃُ قَالَ تَھْجُرُ السُّوْءَ قَالَ فَاَیُّ الْھِجْرَۃِ اَفْضَلُ قَالَ الْجِھَادُ قَالَ اَنْ تُقَاتِلَ الْکُفَّارَ اِذَا لَقِیْتَھُمْ قَالَ فَاَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ قَالَ مَنْ عُقِرَ جَوَادُہٗ وَاُھْرِیْقَ دَمُہٗ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثُمَّ عَمَلَانِ ھُمَا اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اِلَّا مَنْ عَمِلَ بِمِثْلِھِمَا حَجَّۃٌ مَبْرُوْرَۃٌ اَوْ عُمْرَۃٌ (رواہ احمد والطبرانی ورجالہ موثوقون)

(۲۳۸) عَنْ رِبْعِیِّ بْنِ حِرَاشٍ عَنْ رَجُلٍ مِنْ بَنِیْ عَامِرٍ اَنَّہٗ اِسْتَاْذَنَ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَاَلِجُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِخَادِمِہٖ اُخْرُجِیْ اِلٰی

فرمایا اچھے اخلاق) اس نے پوچھا ایمان کیا چیز ہے آپ نے فرمایا یہ کہ تو اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتے، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو دل سے ماننے اور مرنے کے بعد پھر جینے پر یقین رکھے (ایک روایت میں ہے اس نے پوچھا ایمان کیا چیز ہے آپ نے فرمایا صبر اور سخاوت) اس نے عرض کیا اچھا ایمان میں بہتر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہجرت، اُس نے عرض کیا ہجرت سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا یہ کہ تو برائیاں چھوڑ دے، اس نے عرض کیا اچھا تو ہجرت سب سے بہتر کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا جہاد کرنا اور کافروں سے لڑائی کے وقت خوب لڑنا، اس نے عرض کیا اچھا تو جہاد کونسا بہتر ہے آپ نے فرمایا اس شخص کا جہاد جس کا گھوڑا زخمی ہو جائے اور اس کا خون بھی بہا دیا جائے آپ نے فرمایا اس کے بعد دو کام اور ہیں جو سب سے عمدہ ہیں مگر ہاں وہ شخص جو یہی کام کرے ایک حج جس میں جنایت نہ ہو دوم عمرہ کرنا۔

(۲۳۸) ربعی بن حراش بنی عامر قبیلہ کے کسی آدمی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے آپ کی خدمت میں حاضری کے لئے اجازت طلب کی (مگر جو لفظ اس کے لئے اسلام نے مقرر فرمائے تھے

دیئے گئے ہیں — اس حدیث میں افضل ہجرت کی تفسیر جہاد کی گئی ہے۔ چونکہ جہاد میں بھی وطن، اہل و عیال کو ترک کرنا پڑتا ہے اس لئے اصل مفہوم کے لحاظ سے اس تفسیر میں کوئی حرج نہیں اگرچہ اب اصطلاحی لحاظ سے ہجرت کا لفظ مسلمانوں کی ایک مشہور قربانی کے لئے مخصوص ہو گیا ہے اس تعبیر کا حسن ہم انشاء اللہ تعالیٰ کسی مناسب مقام پر آئندہ ذکر کریں گے۔

(۲۳۸) اسلام ایک مکمل آئین ہے اس نے معمولی اور غیر معمولی تمام ضروریات کے لئے قانون مقرر کئے ہیں۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں اجازت کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اجازت نامہ (Visiting Card) بھیجا جائے اسلام نے اجازت کو ضروری اور کارڈ کو غیر ضروری سمجھا ہے اور اس کے لئے مختصر جملے کے ساتھ مناسب کلمات مقرر کر دیئے ہیں آپ کے زمانہ میں ان آداب کی عملی طور پر بھی کافی نگرانی رکھی جاتی تھی جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہے اب اگر اس زمانہ میں کوئی شخص اجازت کے بغیر داخل ہو جاتا ہے تو یہ قصور اس کا ہے نہ کہ ادب اسلامی کا۔

فَاِنَّہٗ لَا یُحْسِنُ الْاِسْتِیْذَانَ فَقُوْلِیْ لَہٗ فَلْیَقُلْ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَاَدْخُلُ فَقَالَ فَسَمِعْتُہٗ یَقُوْلُ ذَالِکَ فَقُلْتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ اَاَدْخُلُ قَالَ فَاَذِنَ لِیْ اَوْ قَالَ فَدَخَلْتُ فَقُلْتُ بِمَ اَتَیْتَنَا بِہٖ قَالَ لَمْ اٰتِکُمْ اِلَّا بِخَیْرٍ اَتَیْتُکُمْ بِاَنْ تَعْبُدُوا اللّٰہَ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ قَالَ شعبۃ واحسبہ قال وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنْ تَدَعُوا اللَّاتَ وَالْعُزّٰی وَاَنْ تُصَلُّوْا بِاللَّیْلِ وَالنَّہَارِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ وَاَنْ تَصُوْمُوْا مِنَ السَّنَۃِ شَہْرًا وَاَنْ تَحُجُّوا الْبَیْتَ وَاَنْ تَاْخُذُوْا مِنْ مَالِ اَغْنِیَاۗئِکُمْ فَتَرُدُّوْہَا عَلٰی فُقَرَاۗئِکُمْ قَالَ فَقَالَ ہَلْ بَقِیَ مِنَ الْعِلْمِ شَیْءٌ لَا تَعْلَمُہٗ قَالَ قَدْ عَلَّمَنِیَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ خَیْرًا وَاِنَّ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَا یَعْلَمُہٗ اِلَّا اللّٰہُ (اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ) (قال الہیثمی اخرجہ ابو داؤد طرفا منہ وقد رواہ احمد ورجالہ کلہم ثقات ائمہ)

وہ استعمال نہ کرے اور کہا) کیا میں اندر گھس آؤں، آپ نے اپنی ایک باندی سے کہا اس شخص کو اجازت حاصل کرنے کا سلیقہ نہیں آتا، جا اور اُسے بتا کہ پہلے اُسے السلام علیکم کہنا چاہیے اس کے بعد یوں کہنا چاہیے کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں۔ وہ شخص کہتا ہے کہ آپ کی یہ بات میں نے بھی سن لی تو اسی کے مطابق میں نے عرض کیا السلام علیکم، کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ اُن کو اجازت مل گئی، یا یہ کہ میں اندر چلا آیا (راوی کو شک ہے) اور پوچھا آپ ہمارے پاس کیا دین لیکر آئے ہیں آپ نے فرمایا جو لایا ہوں سب بہتری بہتر ہے، یہ لیکر آیا ہوں کہ ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، جس کا کوئی شریک نہیں شعبہ (راوی حدیث) کہتا ہے کہ مجھے خیال ہے کہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کا لفظ آپ نے فرمایا تھا اور یہ کہ لات و عزیٰ تو بالکل ترک کر دو اور رات دن میں پانچ نمازیں ادا کرو، سال بھر میں ایک مہینہ کے روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو اور اپنے مالداروں سے روپیہ لیکر اپنے غریبوں پر تقسیم کرو اُس نے پوچھا اچھا کوئی علم ایسا باقی ہے جو آپ نہ جانتے ہوں آپ نے فرمایا ابھی تو بہت سی عمدہ عمدہ باتیں باقی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے مجھے بتائی ہیں ہاں علم کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جسے سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا (اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی) اِنَّ اللّٰہَ الخ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے وہی بارش بھیجتا ہے وہی جانتا ہے کہ مادر اکے رحم میں کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا کہ کل اُسے کیا کرنا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ وہ کس ملک اور کس بستی میں مرے گا اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا اخبردار ہے۔

(۲۳۹) عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا بَرَزْنَا مِنَ الْمَدِيْنَةِ اِذَا رَاكِبٌ يُوْضِعُ نَحْوَنَا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَاَنَّ هٰذَا الرَّاكِبَ اِيَّاكُمْ يُرِيْدُ قَالَ فَانْتَهَى الرَّجُلُ اِلَيْنَا فَسَلَّمَ فَرَدَدْنَا عَلَيْهِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَيْنَ اَقْبَلْتَ قَالَ مِنْ اَهْلِيْ وَوَلَدِيْ وَعَشِيْرَتِيْ قَالَ فَاَيْنَ تُرِيْدُ قَالَ اُرِيْدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَقَدْ اَصَبْتَهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ عَلِّمْنِيْ مَا الْاِيْمَانُ قَالَ تَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِي الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَيْتَ قَالَ قَدْ اَقْرَرْتُ قَالَ ثُمَّ اِنَّ بَعِيْرَهُ دَخَلَتْ يَدُهُ فِيْ شَبَكَةِ جُرْذَانٍ فَهَوٰى بَعِيْرُهُ وَهَوٰى الرَّجُلُ فَوَقَعَ عَلٰى هَامَتِهِ فَمَاتَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَيَّ بِالرَّجُلِ فَقَالَ فَوَثَبَ اِلَيْهِ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ وَحُذَيْفَةُ فَاَقْعَدَاهُ فَقَالَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قُبِضَ الرَّجُلُ قَالَ فَاَعْرَضَ عَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ لَهُمَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَمَا رَاَيْتُمَا اِعْرَاضِيْ عَنِ الرَّجُلِ فَاِنِّيْ رَاَيْتُ مَلَكَيْنِ يَدُسَّانِ فِيْ فِيْهِ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ فَعَلِمْتُ اَنَّهُ

(۲۳۹) جریر بن عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے جب مدینہ سے باہر نکل لئے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سوار ہماری طرف اپنی سواری بھگاتا ہوا آرہا ہے آپ نے فرمایا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہارے ہی پاس آرہا ہے اتنے میں وہ آہی پہنچا اور سلام کیا ہم نے اس کے سلام کا جواب دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا کدھر سے آرہے ہو، اس نے عرض کیا بیوی، بچوں اور اپنے خاندان کے پاس سے، آپ نے پوچھا کدھر کا قصد ہے اس نے عرض کیا اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کا، آپ نے فرمایا تو ٹھیک مقصد پر پہنچ گئے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے سکھائیے ایمان کیا چیز ہے آپ نے فرمایا اس بات کی گواہی دو کہ معبود کوئی نہیں مگر ایک اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں نماز اچھی طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، رمضان کے روزے رکھو، بیت اللہ کا حج کرو، اس نے عرض کیا میں نے ان سب باتوں کا اقرار کیا۔ راوی کہتا ہے اس کے بعد اس کے اونٹ کا پیر کسی جنگلی چوہے کے سوراخ میں جا پڑا وہ اونٹ گرا اور کھوپری کے بل یہ خود بھی جا گرا اور مرگیا۔ آپ نے فرمایا اس شخص کو ذرا بلا کر لانا فوراً عمار بن یاسرؓ اور حذیفہؓ اس کو بلانے کے لئے لپکے اس کو بٹھایا (تو وہ مرچکا تھا) انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ اس کا تو انتقال ہوگیا۔ راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کی بجائے کسی اور سمت دیکھنے لگے پھر آپ نے فرمایا تم نے دیکھا کہ میں اس شخص کی بجائے دوسری طرف متوجہ ہوگیا تھا میں نے دیکھا تھا کہ

مَاتَ جَائِعًا ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھٰذَا وَاللّٰہِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالَ اللّٰہُ فِیْھِمْ (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْا اِیْمَانَھُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِکَ لَھُمُ الْاَمْنُ وَھُمْ مُّھْتَدُوْنَ) ثُمَّ قَالَ دُوْنَکُمْ اَخَاکُمْ قَالَ فَاحْتَمَلْنَاہُ اِلَی الْمَاءِ فَغَسَّلْنَاہُ وَحَنَّطْنَاہُ وَکَفَّنَّاہُ وَحَمَلْنَاہُ اِلَی الْقَبْرِ قَالَ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَتّٰی جَلَسَ عَلٰی شَفِیْرِ الْقَبْرِ قَالَ فَقَالَ اَلْحِدُوْا وَلَا تَشُقُّوْا فَاِنَّ اللَّحْدَ لَنَا وَالشَّقَّ لِغَیْرِنَا۔

(وَعَنْہُ اَیْضًا مِنْ طَرِیْقٍ ثَانٍ) قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَبَیْنَا نَحْنُ نَسِیْرُ اِذْ رُفِعَ لَنَا شَخْصٌ فَذَکَرَ نَحْوَہٗ اِلَّا اَنَّہٗ قَالَ وَقَعَتْ یَدُ بَکْرِہٖ فِیْ بَعْضِ تِلْکَ الَّتِیْ تَحْفِرُ الْجُرَذَانُ وَقَالَ فِیْہِ ھٰذَا مِمَّنْ عَمِلَ قَلِیْلًا وَاُجِرَ کَثِیْرًا۔

دو فرشتے اس کے منہ میں جنت کے میوے ڈال رہے ہیں، یہ دیکھ کر میں سمجھا کہ ضرور یہ شخص بھوکا مرا ہوگا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا خدا کی قسم یہ اُن لوگوں میں ہے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے (جو لوگ ایمان لا چکے پھر انھوں نے اپنے ایمان میں معصیت کا ذرا بھی داغ لگنے نہیں دیا یہی لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور یہی ہدایت یافتہ ہیں پھر فرمایا اپنے بھائی کی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو، ہم اُسے اُٹھا کر پانی کے پاس لائے، غسل دیا، خوشبو لگائی، کفن پہنایا، اور قبر میں دفن کے لئے اٹھا کر لے چلے، راوی کہتا ہے آپ تشریف لائے اور قبر کے ایک کنارہ پر بیٹھ گئے اور فرمایا بغلی بنانا صندوق نہ بنانا کیونکہ ہمارے لئے بغلی ہی مناسب ہے صندوق دوسروں کے لئے ہے۔

(اسی روایت کے دوسرے طریقے میں ہے) ہم کسی سفر کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے ابھی جا رہے تھے کہ دفعۃً ایک شخص نظر آیا اس کے بعد وہی مضمون مذکور ہے اس طریقے میں یہ لفظ ہیں کہ اس کے اونٹ کا ہاتھ ان سوراخوں میں سے کسی سوراخ میں جا پڑا جو جنگلی چوہے کھود لیا کرتے ہیں اور یہ مضمون اور ہے کہ یہ اُن لوگوں میں ہے جنھوں نے عمل تو تھوڑا کیا لیکن ثواب بہت پایا۔

---

(۲۳۹) عالم فانی سے گذرنے کے بعد ہی عالم آخرت کی نعمتوں سے کچھ نہ کچھ تمتع حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ یہی حال عذاب کا بھی ہے پورے طور پر ثواب و عذاب قیامت کے بعد ہوگا۔ شہداء کے لئے رزق ملنا شریعت میں ثابت ہے۔ یہ شخص بھی کتنا خوش قسمت تھا کہ تعلیمات اسلامی حاصل کرنے کے بعد اس کو خدا کی نافرمانی کی مہلت ہی نہ مل سکی۔ ادھر اسلام لایا اُدھر شہادت کی موت مر گیا۔ فرشتوں نے فوراً اکرام مومن کے فرائض انجام دیئے اور اس کے لئے اس عالم کے مناسب نعمتوں کا دروازہ کشادہ ہو گیا۔ رسولِ خدا نے یہ ماجرا دیکھ کر بے ساختہ فرمایا کہ اس خوش نصیب نے عمل تو بہت تھوڑا کیا تھا مگر ثواب کتنا عظیم الشان پایا۔

(وعنہ ایضا من طریق ثالث) اَنَّ رَجُلاً جَاءَ فَدَخَلَ فِی الْاِسْلَامِ فَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یُعَلِّمُہُ الْاِسْلَامَ وَھُوَ فِیْ مَسِیْرِہٖ فَدَخَلَ خُفُّ بَعِیْرِہٖ فِیْ جُحْرِ یَرْبُوْعٍ فَوَقَصَہُ بَعِیْرُہٗ فَمَاتَ فَاَتٰی عَلَیْہِ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَمِلَ قَلِیْلاً وَاُجِرَ کَثِیْراً قَالَہَا حَمَّادٌ ثَلَاثًا اللَّحْدُ لَنَا وَالشَّقُّ لِغَیْرِنَا۔ (رواہ الطبرانی وابن ابی حاتم فی تفسیرہ والحکیم الترمذی مثلہ والخطیب وحدیث الباب فی اسنادہ زاذان ابی عمر الکندی قال ابن معین ثقۃ وقال الحافظ فی التقریب صدوق یرسل وفیہ شیعیۃ وقال یحیی بن معین النسائی والدارقطنی ضعیف وقال الحافظ ضعفوہ لکثرۃ تدلیسہ۔

حقیقۃ الایمان والاسلام والاحسان

(۲۴۰) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا یُرٰی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُہٗ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ اِلٰی رُکْبَتَیْہِ وَوَضَعَ کَفَّیْہِ عَلٰی فَخِذَیْہِ وَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ

(تیسرے طریقے میں ہے) کہ ایک شخص آیا اور مسلمان ہو گیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر ہی میں اس کو اسلام کی تعلیم دیتے جاتے تھے اس کے اونٹ کا ایک پیر کسی جنگلی چوہے کے سوراخ میں جا پڑا وہ اونٹ گرا اور یہ بھی گرا گردن ٹوٹ گئی اور مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اس شخص نے عمل تو تھوڑا ہی کیا مگر ثواب بہت پایا۔ حماد نے تین بار فرمایا۔ بغلی قبر ہمارے لئے ہے اور صندوق دوسروں کے لئے ہے۔

ایمان، اسلام اور احسان کی حقیقت

(۲۴۰) حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے دفعۃً ایک شخص آیا اس کے کپڑے نہایت سفید، بال نہایت سیاہ تھے، نہ اس پر کوئی سفر کی علامت تھی، (کہ ہم اُسے مسافر کہتے) نہ ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا تھا (کہ شہری سمجھتے) یہاں تک کہ وہ آکے اس قدر پاس آ بیٹھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیئے اور اپنے دونوں ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانوئے مبارک پر رکھ دیئے اور بولا۔ اے محمد مجھے بتائیے اسلام کیا چیز ہے؟ آپ نے

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا
رَسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ
اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْأَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ
قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَ
شَرِّهٖ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ
فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ

ارشاد فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اس بات کا اقرار کرے کہ سوائے ایک خدا کے اور کوئی معبود نہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے پیغمبر ہیں. نماز پورے طور پر ادا کرے، زکوۃ دے. رمضان شریف کے روزے رکھے اور اگر طاقت ہو تو خدا کے گھر کا حج بھی کرے وہ بولا کہ تو نے ٹھیک کہا. راوی کہتا ہے ہمیں اس پر تعجب ہوا کہ (پہلے تو) آپ سے دریافت کرتا ہے پھر (خود ہی) آپ کی تصدیق بھی کر دیتا ہے (گویا واقفکار ہے) پھر بولا اچھا اب ایمان کے متعلق بتایئے! آپ نے فرمایا خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اس کے رسولوں اور قیامت کو دل سے مانو اور اس بات پر یقین کرو کہ برا بھلا جو کچھ ہے وہ سب نوشتۂ تقدیر کے موافق ہے اس نے کہا تو نے صحیح کہا اب یہ بتلایئے احسان کیا چیز ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا اللہ کی اس توجہ سے عبادت کرنا گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ تم اگر اُس کو حقیقۃً نہیں دیکھتے مگر وہ تو تمہیں حقیقۃً دیکھتا ہے (پھر اتنی ہی خشوع سے عبادت کرنا چاہیے جتنا کہ اس علم صحیح کا اقتضاء ہے) اس کے بعد اس نے قیامت کے متعلق سوال کیا (کب آئے گی؟) آپ نے فرمایا جس سے دریافت کرتے ہو

(۲۴۰) [۱] ابن حبان نے شعر کی بجائے لحیۃ کا لفظ روایت کیا ہے یعنی اُس کی ڈاڑھی کے بال سیاہ تھے ـ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۳۲۹) کپڑوں کی صفائی اور بالوں کی سیاہی میں اس طرف اشارہ تھا کہ طالب علم کے لئے اپنا ظاہری لباس صاف رکھنا اور نوعمری میں طلب علم کے لئے نکلنا مناسب ہے.

[۲] نسائی شریف میں اس کی تصریح ہے کہ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زانوئے مبارک ہی مراد ہیں

[۳] بخاری شریف کتاب التفسیر میں "یا محمد" کی بجائے "یا رسول اللہ" کا لفظ آیا ہے. شیخ بدرالدین نے ایک روایت میں السلام علیک کا لفظ بھی نقل کیا ہے. چونکہ اس آمد میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کا مقصد از اول تا آخر اخفاءِ حال تھا اس لئے ایسے متناقض حالات میں ان کی تشریف آوری ہوئی کہ یہ راز کھلنے ہی نہ پایا کہ یہ شخص کوئی گنوار آدمی تھا یا متمدن ' . . . . باہر سے آیا تھا، یا اندرونِ شہر سے، معلم بن کر آیا تھا، یا متعلم، حتٰی کہ حافظ عینی ؒ نے ایک روایت میں خود سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ لفظ نقل کئے ہیں کہ بخدا بجز اس مرتبہ کے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے ہوں اور میں نے انہیں نہ پہچانا ہو، اس لئے اگر ان کی زبان سے یا رسول اللہ کی بجائے یا محمد کا لفظ ہی نکلا تو بھی کوئی اعتراض کا موقعہ نہیں ہے

مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِهَا قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَۃُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَی الْحُفَاۃَ الْعُرَاۃَ الْعَالَۃَ رِعَاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِیًّا ثُمَّ قَالَ لِیْ یَا عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهٗ جِبْرِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ۔ رَوَاہُ الْخَمْسَۃُ وَزِیْدَ فِیْ رِوَایَۃٍ فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ (اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ) الْاٰیَۃَ ثُمَّ اَدْبَرَ فَقَالَ رُدُّوْهُ فَلَمْ یَرَوْا شَیْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِیْلُ جَآءَ یُعَلِّمُ النَّاسَ دِیْنَهُمْ۔

اس کا تو وہ خود بھی سائل سے زیادہ عالم نہیں ہے[1] اُس نے پوچھا اس کی کچھ علامات ہی بتلا؟ آپ نے فرمایا کہ (۱) باندی اپنی آقا جنے[2]، اور برہنہ پا، ننگے، محتاج، بکریوں کے چرانے والے، عمارتوں میں اکڑتے نظر آنے لگیں۔ راوی کہتا ہے اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔ میں نے کچھ عرصہ[3] توقف کیا اس کے بعد آپ نے (مجھ سے) ارشاد فرمایا اے عمرؓ جانتے ہو یہ سائل کون تھا؟ میں نے عرض کیا خدا اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ جبریلؑ تھے تمہارا دین (اس پیرایہ سے) تمہیں سکھانے آئے تھے۔

اس حدیث کو پانچ کتابوں میں روایت کیا ہے اور ایک روایت میں اتنی بات اور ہے (کہ قیامت کا علم ان[4] پانچ باتوں میں داخل ہو جنہیں سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ الخ یعنی قیامت کا علم صرف خدا کو ہے۔ آخر آیت تک۔ جب وہ شخص پشت پھیر کر چلا گیا تو آپ نے حکم دیا جاؤ اسے واپس بلاؤ، وہ گئے تو انھیں کوئی نظر نہ آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا یہ جبریلؑ تھے لوگوں کو دین سکھانے تشریف لائے تھے)۔

بقیہ صفحہ گذشتہ

اس وقت ان کے مناسب حال یہی تھا کہ اپنے نفس کو ایسے ہی متردد حالات کے ماتحت رہنے دیں کہ مخاطب ان کے متعلق کوئی رائے قائم ہی نہ کر سکے۔ بہر حال اس روایت سے یہ اور فائدہ معلوم ہو گیا کہ کسی محفل میں آنے کا ادب یہ ہے کہ پہلے سلام کرنا چاہئے۔

[2] یہ ترجمہ شیخ محی الدین نووی کے مختار پر کیا گیا ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ۔ انسانی فطرت حضور اور غیبت کا بڑا فرق کرتی ہے۔ ایک غلام اپنے آقا کی خدمت جب اس کے سامنے انجام دیتا ہے تو خشوع و خضوع اور حسن ادب کے جتنے مراتب ہو سکتے ہیں سب ہی صرف کر ڈالتا ہے لیکن جب اس کے سامنے سے ذرا علیحدہ ہو جاتا ہے تو اس کی یہ تمام مستعدی طبعی طور پر سرتاسر قصور اور کوتاہی بن جاتی ہے۔ غیبت اور حضور کا یہ فرق درحقیقت ایک قسم کا نفاق ہے . . . .

. . . . . . شریعت چاہتی ہے کہ اس عیب سے اسے پاک کر کے اخلاص حقیقی کے بلند مقام تک پہنچا دے اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ بندہ پر یہ حق ہے کہ وہ ہر حال میں ایسی ہی عبادت کا عادی ہو جائے جیسا کہ حالت حضور میں ہوتا لیکن یہ ظاہر ہے کہ جدوجہد کی جتنی طاقتیں ہیں ان کا مصروف عمل ہو جانا اس تصور پر موقوف نہیں ہے کہ ہم اسے دیکھتے ہیں بلکہ حالت حضوری

(۲۴۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَجْلِسًا لَهٗ فَجَاءَ جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَجَلَسَ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى رُكْبَتَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ حَدِّثْنِيْ بِالْاِسْلَامِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْاِسْلَامُ اَنْ تُسْلِمَ وَجْهَكَ لِلّٰهِ وَتَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ قَالَ اِذَا فَعَلْتُ ذٰلِكَ فَاَنَا مُسْلِمٌ قَالَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ

(۲۴۱) حضرت ابن عباس روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک مجلس میں تشریف فرما تھے کہ بے وہم وگمان جبرئیل علیہ السلام آگئے اور اپنے دونوں ہاتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زانو مبارک پر رکھ کر سامنے بیٹھ گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے اسلام کی حقیقت بیان کیجئے آپ نے فرمایا اسلام یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ کا ہمہ تن تابعدار ہوجائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے، اور یہ گواہی دے کہ معبود کوئی نہیں مگر صرف وہی ایک اللہ جس کا کوئی شریک نہیں اور محمدؐ اس کے بندہ اور رسول ہیں، اس نے عرض کیا اچھا جب میں یہ گواہی دیدوں گا تو کیا میں مسلمان

(بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ)
میں بھی تحسینِ عمل اور حسنِ ادب کا باعث یہی تصور ہوتا ہے کہ وہ ہمیں دیکھتا ہے اس لئے اگر ہم اس تصور سے عبادت نہیں کرسکتے کہ گویا ہم اُسے دیکھ رہے ہیں تو یہ علم تو بہرکیف ہمیں حاصل ہے کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ خشوع وخضوع کا سبب اصلی جب یہ ضمیر الود یہ علم ہروقت حاصل ہے پھر حضور وغیبت کا فرق کیوں ہو۔ الم یعلم بان اللہ یریٰ

حاشیہ صفحہ ۵۶۵ ۱؎ انسان کو اگر اپنی ہی موت کا ٹھیک وقت معلوم ہوجائے تو اس کا کارخانہ حیات درہم وبرہم ہوجائے۔ اگر کہیں تمام دنیا کے فنا کا صحیح وقت اس کو بتا دیا جائے تو نظام عالم کیونکر قائم رہے اس لئے مصلحت یہ ٹھیری کہ یہ وقت بصیغۂ راز ہی رکھا جائے۔

۲؎ ہمارے نزدیک یہاں علامہ طیبی کی شرح سب سے زیادہ دلچسپ ولطیف ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں جملے انقلابِ حالات سے کنایہ ہیں یعنی جب اتنا انقلاب رونما ہوجائے کہ اپنی اولاد اپنی آقا اور حاکم بن جائے شرفا کی جگہ ذلیل لے لیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اب تمام عالم پر ایک عظیم انقلاب کا وقت نزدیک آگیا ہے۔

۳؎ نسائی، ابوداؤد، ترمذی، میں اس عرصہ کی مدت تین شب بیان کی گئی ہے۔

۴؎ حافظ بدرالدین عینیؒ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہاں سائل نے ان پانچ ہی چیزوں کے متعلق دریافت کیا تھا اس لئے آیت میں ان پانچ ہی کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے سوا اور اشیاء کا علم مخلوق کو حاصل ہوجاتا ہے۔ ہمارے نزدیک انسانی حیوۃ کے یہ پانچ گوشے وہ ہیں جس کے متعلق اس کا ضمیر ہمیشہ اس سے سوال کرسکتا ہے ممکن ہے کہ ان پانچ کی تخصیص کا یہی ایک سبب ہو۔ حافظ ابن حجرؒ نے چودھویں جلد کے آخر میں اس پر اچھی بحث نقل کی ہے۔

یہ "حدیث جبرئیل" کے عنوان سے مشہور ہے۔ اس میں ایک سوال اسلام وایمان کے متعلق بھی ہے۔ جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا تعلق زیادہ تر ظاہر سے ہے اور ایمان کا باطن سے اس بنا پر ایمان کا رتبہ اسلام سے بڑھا ہوا ہوگا اور کوئی اسلام بغیر ایمان کے قابلِ اعتبار نہیں ہوگا۔

فَقَدْ اَسْلَمْتَ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِیْ مَا الْاِیْمَانُ قَالَ الْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتَابِ وَالنَّبِیّٖنَ وَتُؤْمِنَ بِالْمَوْتِ وَبِالْحَیَاۃِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَتُؤْمِنَ بِالْجَنَّۃِ وَالنَّارِ وَالْحِسَابِ وَالْمِیْزَانِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ کُلِّہٖ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ ۔ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَقَدْ اٰمَنْتُ قَالَ اِذَا فَعَلْتَ ذٰلِکَ فَقَدْ اٰمَنْتَ ۔ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْاِحْسَانُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنَّکَ اِنْ لَمْ تَرَہٗ

ہوجاؤں گا؟ آپ نے فرمایا بیشک جب تو یہ عہد کرلے گا تو یقیناً مسلمان ہوجائے گا۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اچھا اب ایمان کی حقیقت بتلایئے؟ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ، قیامت، فرشتے، اللہ تعالیٰ کی کتابیں اور اس کے سب نبیوں کو مانے، اور موت پھر موت کے بعد جی اٹھنے، جنت اور دوزخ، حساب وکتاب اور اعمال کی ترازو کا یقین کرے اور اس کا یقین کرے کہ ہر بری بھلی بات تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اس نے کہا جب میں ان سب باتوں کو مان لوں گا تو کیا میں مومن بن جاؤں گا آپ نے فرمایا جب تو یہ باتیں مان لیگا تو مومن بن جائے گا اس نے عرض کیا یا رسول اللہ اب یہ فرمایئے کہ احسان کسے کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا اس طرح خوگر ہوجائے گویا تو اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ تو اگر اسے

(۱۴۲) (الف) چونکہ اس واقعہ کے آخر میں معلوم ہوگیا تھا کہ یہ سائل حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اس لئے یہاں راوی نے روایت کے شروع ہی میں ان کا نام ذکر کردیا ہے ورنہ اکثر روایات سے یہ ثابت ہے کہ سائل کی پوری تشخیص اس کی آمد کے وقت کوئی شخص نہ کرسکا تھا حتیٰ کہ خود خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم بھی۔ اس کے سوا بعض الفاظ میں یہاں راویوں کا کچھ اور اختلاف بھی ہے جو صرف نقلی اختلاف کہا جاسکتا ہے اصل واقعہ پر اس کا کوئی اثر نہیں۔ اس روایت میں اسلام کی تعریف میں یہ بات بتلائی گئی ہے کہ اسلام صرف انقیاد ظاہری کا نام نہیں۔ بلکہ اپنے آپ کو خالق کے پورے طور پر سپرد کردینے کا نام ہے ایسی سپردگی جس کے بعد اپنی جان ومال پر اختیار باقی نہ رہے یہ وہی اسلام ہے جس کا مطالبہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے کیا گیا تھا اور جس کے جواب میں انھوں نے فرمایا تھا "اسلمت للہ رب العالمین" میں اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے سپرد کرچکا اور اس کے سامنے سر تسلیم جھکا چکا۔ ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لاشریک لہ، میری نماز، میرے افعال حج حتیٰ کہ میرا مرنا اور جینا سب اللہ رب العالمین کے لئے ہیں جس کا کوئی شریک نہیں۔ ایمان کی تعریف میں بھی یہاں میزان اور حساب کا ذکر پہلی روایت سے زیادہ ہے ایسے اسلام اور ایسے ایمان والا شخص کامل مسلمان اور کامل مومن کہلاتا ہے۔ جو شخص صرف شہادتین ادا کرتا ہے اگرچہ وہ بھی ایک مسلمان ہے لیکن ابھی اسے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنا باقی ہے۔

(ب) نااہلوں میں سرداری اور مالداری علامات قیامت میں اس لئے شمار کی گئی ہے کہ قیامت عالم پر سب سے بڑے انقلاب کا نام ہے اور نظام عالم کی بربادی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ اس کی زمام اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جائے جو اس کے اہل نہ ہوں یہ ظاہر ہے کہ دنی ہمت، پست فطرت، درشت خصلت اور جاہل لوگوں کے دلوں میں سوائے ایک جذبۂ جلب مال کے کوئی دوسرا جذبہ نہیں ہوتا وہ ہر موقعہ پر اپنے ہی اغراض کو مقدم رکھتے ہیں دنیا ودین کے نظام میں

فَاِنَّہٗ یَرَاکَ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَحَدِّثْنِیْ مَتَی السَّاعَۃُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سُبْحَانَ اللّٰہِ فِیْ خَمْسٍ مِنَ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا ھُوَ اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ وَ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ) وَلٰکِنْ اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُکَ بِمَعَالِمَ لَھَا دُوْنَ ذٰلِکَ قَالَ اَجَلْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَحَدِّثْنِیْ. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَا رَاَیْتَ الْاَمَۃَ وَلَدَتْ

نہیں دیکھتا تو وہ تو تجھے یقیناً دیکھتا ہے اس نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے یہ بتائیے قیامت کب آئے گی آپ نے فرمایا سبحان اللہ اس کا علم تو غیب کی اُن پانچ باتوں میں داخل ہے جن کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا (قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، بارش کو وہی بھیجتا ہے، رحمِ مادر میں کیا ہے اس کا علم اسی کو ہے اور کل کیا کرنا ہے اسے بھی کوئی نہیں جانتا۔ اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ اُس کا انتقال کہاں ہوگا بلاشبہ اللہ ہی ہر چیز کا جاننے والا اور ہر بات سے باخبر ہے) ہاں اگر تو چاہے تو اس سے پہلے جو اس کی علامتیں ہیں وہ بتا سکتا ہوں اُس نے عرض کیا یا رسول اللہ اچھا تو وہی بتائیے آپ نے فرمایا جب تو دیکھے

صرف کرنے کے لئے ان کے ہاتھ کبھی نہیں کھلتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے حقوق تلف ہونے لگتے ہیں قلوب میں اُن کی نفرت و عداوت پیدا ہونے لگتی ہے۔ تعلیمِ دین کا نظم قائم نہ ہونے کے باعث دین سے عام جہالت روز بروز ترقی کرتی جاتی ہے اور عالم پر خدا کی معرفت کے لحاظ سے ایک عام تاریکی چھا جاتی ہے۔ ادھر علم و فکر کے فقدان کی وجہ سے انھیں اس کا کوئی احساس بھی نہیں ہوتا اس لئے دین و دنیا ہر دو کا نظام تباہ و برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب اس طرح عالم کی بربادی سامنے آجائے تو یقین کر لینا چاہیے کہ اب خود عالم کی بربادی جس کا دوسرا نام قیامت ہے بہت نزدیک آگئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عالمِ اسباب میں ہر چیز اسباب کے ساتھ وابستہ ہے حتیٰ کہ قیامت بھی اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک اس کے اسباب نہ آجائیں۔

(ح) حافظ فضل اللہ تورپشتی فرماتے ہیں کہ یہ مکالمہ حجۃ الوداع سے ذرا قبل واقع ہوا ہے جبکہ انقطاعِ وحی اور اکمالِ دین کا زمانہ قریب آچکا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ احتمال یہ بھی ہے کہ حجۃ الوداع کے بعد واقع ہوا ہو، ان حضرات کی نظر حافظ ابن مندہ کی ایک روایت پر ہے جس کے لفظ یہ ہیں کہ "ان رجلاً فی اٰخر عمر النبی صلی اللہ علیہ وسلم جاء الخ" (عمدۃ القاری صفحہ ۲۹۱) یعنی ایک شخص آپ کی آخری عمر میں حاضر ہوا "آخری عمر میں" دونوں احتمال ہو سکتے ہیں۔ بہرحال اس لفظ سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ آمد آپ کے آخری زمانہ میں ہوئی تھی۔ چونکہ وحی ہمیشہ کے لئے بند ہو جانے والی تھی اس لئے عرب کی امی قوم کے لئے ضرورت تھی کہ جو دین تئیس سال میں تدریجاً اترتا رہا ہے آخر میں اُس کی ایک مختصر مگر مکمل فہرست اُن کو دیدی جائے۔ اس کام کے لئے قدرت نے سب سے زیادہ سلیقہ شعار فرشتہ منتخب کیا اور جو اصولی سوالات تھے وہ اس کی زبان سے پیش کرا دیئے اور بارگاہِ رسالت کی اُس کا جو آخری جواب ہو سکتا تھا وہ بھی دلوا دیا گیا اور اس طور پر صحابہ کرام نے اپنی خاموشی میں دین کی ایک تسلی بخش فہرست پھر سن لی۔ اس حدیث نے دین کے تین درجے بتائے ہیں۔ ادنیٰ۔ اوسط۔ اعلیٰ۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ شہادتین کے ساتھ

رَبَّتَهَا اَوْ رَبَّهَا وَرَأَيْتَ اَصْحَابَ الشَّاءِ تَطَاوَلُوْا بِالْبُنْيَانِ وَرَأَيْتَ الْحُفَاةَ الْجِيَاعَ الْعَالَةَ كَانُوْا رُؤُسَ النَّاسِ فَذٰلِكَ مِنْ مَعَالِمِ السَّاعَةِ وَاَشْرَاطِهَا قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَصْحَابُ

باندیوں کی اولاد مالکوں کی طرح ان کی حکمراں بن گئی ہے، بھیڑ بکری چرانے والے یہ فخر کرنے لگیں کہ اونچی اور شاندار کوٹھی کس کی ہے۔ برہنہ پا، بھوکے، اور محتاج، لوگوں کے افسر بن جائیں تو بس یہی قیامت کی نشانیاں اور اس کے نزدیک آنے کی علامات ہیں اس نے عرض کیا یا رسول اللہ چرواہوں، پیادہ پا، فاقہ مست

صرف ظاہری اعضاء وجوارح ارکانِ خمسہ سے مزین ہو جائیں اگرچہ حقایق ایمانیہ سے قلب ہنوز منور نہ ہو۔ اس ناتمام انقیاد کا نتیجہ یہ ضرور ہونا چاہیے کہ حجابِ غفلت میں کبھی کبھی معصیت بھی سرزد ہو جائے اسی کو قرآن کریم نے اپنے حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ قلت الاعراب اٰمنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔ اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ فرما دیجئے کہ یہ دعویٰ ابھی مت کرو ابھی تو صرف ظاہری انقیاد حاصل ہوا ہے ہاں اس کی توقع ہے کہ آئندہ دین تمہارے دلوں میں اتر جائے۔ پھر تمہارا باطن بھی ظاہر کی طرح پیکر تسلیم بن جائے گا۔ اسی کا نام ایمان ہے اور یہی دین کی اوسط منزل ہے۔ یہاں پہنچ کر واجبات کا تحفظ اور محرمات سے اجتناب ضروری ہو جاتا ہے اب اگر قسمت نے کسی صاحبِ نصیب کی دستگیری فرمائی اور اس سے بھی آگے عروج میسر آگیا تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ قلب میں حاضر و غائب کا فرق نہ رہے اور دنیا میں عین حجابِ غیب میں عبادت کا وہ سلیقہ ہاتھ آجائے جو عالمِ بے حجابی میں ہوتا۔ ان ہر سہ منازل کی طرف قرآن نے آیتِ ذیل میں اشارہ فرمایا ہے۔ ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخیرات باذن اللّٰه ذلك هو الفضل الکبیر۔ پھر ہم نے اپنی کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چھانٹ لیا تھا اس میں کوئی تو اپنی جان پر ظلم کرتا رہا اور کوئی میانہ چلتا رہا اور خدا کے حکم سے کوئی ہر نیکی میں آگے آگے رہا یہی اللہ کا بڑا فضل ہے۔ اس کے بعد گو کہ انبیاء کی سی عصمت تو حاصل نہیں ہوتی مگر اُن کی وراثت میں اس کا کوئی نمونہ ضرور میسر آجاتا ہے۔ اس تیسرے درجہ کا نام احسان ہے (دیکھو کتاب الایمان ص ۲۴۴)

(د) قیامت کا وعدہ آفرینشِ عالم کی ابتداء سے ہوتا چلا آیا ہے مگر وہ آنے کا نام نہیں لیتی۔ انسان کی بے صبر طبیعت اتنا انتظار نہیں کر سکتی، اس لئے وہ اندر ہی اندر اس سوال کے لئے مضطرب رہا کرتی ہے " ویقولون متیٰ هو " وہ کہتے ہیں کہ آخر وہ کب آئے گی۔ قل عسیٰ ان یکون قریبًا۔ آپ فرما دیجئے کہ اب آئی۔ قیامت کو جب آنا ہے وہ اپنے وقت پر آجائیگی اس بارے میں طبیعت کا انتظار یا سوال وجواب کا بے معنی سلسلہ قائم کرنا عملی زندگی کے لئے مضر ہے۔ اس لئے آئندہ اس دروازہ کو یہ بتا کر بند کر دیا گیا ہے کہ دین کا علم رسول سے ہی حاصل ہو سکتا ہے مگر جب وہی اپنی آخری حیٰوۃ بھر اس مسئلہ کو طے کرنا نہیں چاہتا تو اس کے بعد دوسرا کون ہوگا جو اُسے طے کر سکے۔ صاحب موافقات فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیامت کا علم دین کے اُن مسائل میں سے نہیں ہے جن کا جاننا ضروری ہو۔

(ہ) یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ دنیا جس کو غیب دانی کے نام سے موسوم کرتی ہے عرب میں پہلے یہ ایک مستقل فن تھا اور اس کا نام کہانت تھا، ابنِ خلدون نے اپنے مقدمہ میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ حضرت استاد قدس سرہ فرماتے تھے کہ قرآن کریم کے محاورہ میں علم وہ ہے جو واقعہ سے مستفاد ہو اور جو اپنی جانب سے تیار کیا جائے اس کو ظن کہا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ اتباعِ ظن کی جا بجا مذمت کی گئی ہے۔ مالهم به من علم الا اتباع الظن۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل وصلب میں اختلاف کرنے والوں کو واقعہ کا کچھ علم نہیں ہے صرف اپنی جانب سے اٹکل لگاتے ہیں ان یتبعون الا الظن وان هم الا یخرصون

الشَّاءِ وَالْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ قَالَ الْعَرَبُ (رواہ احمد وقال الحافظ اسنادہ حسن ورواہ البزار بنحوہ)

(۲۴۲) عَنْ يَحْيَى بْنِ يَعْمَرَ فِيمَا حَدَّثَهُ ابْنُ عُمَرَ قَالَ بَيْنَمَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَاءَ رَجُلٌ فَذَكَرَ مِنْ هَيْئَتِهِ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُدْنُهْ فَدَنَا فَقَالَ اُدْنُهْ فَدَنَا حَتّٰى كَادَ رُكْبَتَاهُ تَمَسَّانِ رُكْبَتَيْهِ فَقَالَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ اَخْبِرْنِي مَا الْاِيْمَانُ اَوْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنُ بِالْقَدَرِ قَالَ سُفْيَانُ اُرَاهُ قَالَ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ فَمَا الْاِسْلَامُ قَالَ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكٰوةِ وَحَجُّ الْبَيْتِ وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ وَغُسْلُ مِنَ الْجَنَابَةِ كُلُّ ذٰلِكَ قَالَ صَدَقْتَ

اور محتاجوں سے آپ کی مراد کون لوگ ہیں۔ آپ نے فرمایا یہی عرب کے عوام۔

(۲۴۲) یحیٰ بن یعمر نے ابن عمرؓ کی حدیث میں یہ مضمون اس طرح روایت کیا ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک شخص آیا، راوی نے پھر اس کی صورت کا مفصل ذکر کیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس سے فرمایا ذرا قریب آجاؤ وہ قریب آگیا۔ آپ نے فرمایا اور قریب آجاؤ وہ اور قریب آگیا یہاں تک کہ اس کے زانو آپ کے زانو سے آلگے، اس نے عرض کیا یا رسول اللہ فرمائیے ایمان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور قیامت کو مانو اور تقدیر پر یقین رکھو۔ سفیان کہتے ہیں کہ میرے خیال میں شاید آپ نے تقدیر کے ساتھ بری بھلی کا لفظ بھی ارشاد فرمایا تھا اس نے عرض کیا اچھا تو اسلام کے متعلق فرمائیے آپ نے فرمایا نماز اپنے شرائط و آداب کے ساتھ پڑھنا، زکوٰۃ دینا، بیت اللہ کا حج کرنا، اور ماہِ رمضان شریف کے روزے رکھنا اور جنابت سے

یہ لوگ صرف ظن کے تبع ہیں اور تخمینے لگاتے ہیں۔ مدعیٔ غیب کو واقعہ کا علم نہیں ہوتا۔ دھواں اٹھتا ہے معلوم ہوجاتا ہے کہ آگ لگی ہے۔ ہوا چلتی ہے مٹی کی خوشبو سے پتہ لگتا ہے کہ بارش ہوگئی ہے۔ مان سون اٹھتا ہے معلوم ہوجاتا ہے کہ برسات قریب ہے۔ ہوا کا تموج بتا دیتا ہے کہ سمندر میں طوفان کس سمت سے آنے والا ہے یہ سب استدلالات ہیں جن سے درجہ بدرجہ گو یقین حاصل ہوجاتا ہے مگر واقعہ کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کو بلا واسطہ واقعہ کا علم ہے اور اتنا قطعی ہے کہ اس کا تخلف محال ہے۔ یہاں تک کہ اشیاء اپنے وجود میں اس کے تابع ہیں وہ اشیاء کا تابع نہیں ہے۔ مخلوق کے دائرہ میں کمال یہ ہے کہ اس کا علم واقع کے مطابق ہوجائے اور علم الٰہی کا کمال یہ ہے کہ خود اشیاء اپنے باب وجود میں علم الٰہی کے تابع رہیں۔ ہاں کبھی خزانۂ غیب سے خواص کو کوئی حصہ بخشدیا جاتا ہے تو وہ اس کے تعلق و خصوصیت کی ایک برہان بن جاتا ہے مگر علم بھی اتنا ہی ملتا ہے جتنا کہ ایک ضعیف انسان کا ظرف متحمل ہوسکتا ہے۔ مخلوق کسی ایک چیز کے علم میں بھی خالق کی ہمسری نہیں کرسکتی۔ قدیم کا علم حادث میں کب سما سکتا ہے، ذرہ میں آفتاب چمکتا ہے مگر نہ ذرہ آفتاب بنتا ہے نہ آفتاب ذرہ بن سکتا ہے وللّٰہ المثل الاعلیٰ۔ غرض خالق کی نوعیتِ علم ہی مخلوق کے علم کی نوعیت سے جداگانہ ہے ایک کو دوسرے پر قیاس ہی نہیں کیا جاسکتا ہمسری تو کجا۔

صَدَقْتَ قَالَ الْقَوْمُ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا أَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا كَأَنَّهُ يُعَلِّمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَخْبِرْنِي عَنِ الْإِحْسَانِ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِلَّا تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ كُلُّ ذٰلِكَ نَقُوْلُ مَا رَأَيْنَا رَجُلًا أَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا فَيَقُوْلُ صَدَقْتَ صَدَقْتَ قَالَ أَخْبِرْنِي عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ بِهَا مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَقَالَ صَدَقْتَ قَالَ ذٰلِكَ مِرَارًا مَا رَأَيْنَا رَجُلًا أَشَدَّ تَوْقِيرًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ هٰذَا ثُمَّ وَلّٰى قَالَ سُفْيَانُ فَبَلَغَنِي أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْتَمِسُوْهُ فَلَمْ يَجِدُوْهُ قَالَ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ جَاءَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ مَا أَتَانِي فِي صُوْرَةٍ إِلَّا عَرَفْتُهُ غَيْرَ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ - وفی روایة ابن حبان زیادات

غسل کرنا۔ ہر بات پر وہ بجا اور درست کہتا جاتا تھا۔ حاضرین نے کہا اس سے بڑھ کر آپ کی توقیر و تعظیم کرنے والا شخص ہم نے کوئی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہ پہلے سے آپ کو جانتا تھا۔ پھر اس نے کہا یا رسول اللہ احسان کے متعلق ارشاد ہو آپ نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، اگر تم اُسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں بلاشبہ دیکھتا ہی ہے۔ ہر مرتبہ ہم یہی کہتے کہ اس جیسا آپ کی تعظیم اور توقیر کرنے والا شخص ہم نے کوئی نہیں دیکھا، بات بات پر بجا و درست ہی کہہ رہا ہے اس کے بعد اس نے عرض کیا اچھا اب قیامت کے متعلق فرمائیے کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا اس بارے میں تو سائل اور جس سے پوچھا جا رہا ہے دونوں کا علم برابر ہے (نہ اُسے معلوم نہ اسے معلوم) راوی کہتا ہے اس پر پھر اس نے وہی بجا و درست کہا۔ بار بار وہ یہی کہتا رہا۔ ہم نے کہا اس جیسا شخص ہم نے آپ کی توقیر کرنے والا نہیں دیکھا پھر وہ پشت پھیر کر چلا گیا۔ سفیان کہتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اس شخص کو تلاش کرو لوگ تلاش کرنے کے لئے گئے مگر وہ نہ ملا، آپ نے فرمایا یہ جبرئیل تھے اس لئے سے تمہارا دین تمہیں سکھانے آئے تھے اس سے قبل وہ جس صورت میں بھی میرے پاس آئے میں نے انہیں ہمیشہ پہچان لیا ہے لیکن اس صورت میں میں اُن کو پہچان نہیں سکا۔ ابن حبان نے بھی اس واقعہ کو روایت کیا ہے

(۲۴۲) یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سوالات کی ترتیب میں یہاں کچھ اختلاف ہے بعض روایات میں ایمان کا سوال مقدم ہے اور بعض میں اسلام کا لیکن سائل کے اصل سوال اور آپ کے اصل جواب میں کہیں کوئی فرق نہیں ہے سب کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کا تعلق اعمالِ جوارح سے ہے اور ایمان کا اعتقادیات سے۔ اکثر روایات میں اعمالِ جوارح کی تفصیل شہادتین اور ارکانِ خمسہ ذکر کی گئی ہے۔ عمرہ، غسلِ جنابت اور وضو کی تکمیل صرف ابن حبان کی روایت میں مذکور ہے لیکن چونکہ عمرہ حج کے تابع ہے اور غسلِ جنابت اور اسباغِ وضو نماز کے اس لئے یہ اختلاف کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایمان کی تشریح میں جن امورِ خمسہ کا

منہا فی الاسلام قال وتحج وتعتمر وتغتسل من الجنابۃ وان تتم الوضوء الی اخرہ خذوا عنہ والذی نفسی بیدہ ما اشتبہ علی منذ اتانی قبل مرتی ھذہ وما عرفتہ حتی ولّی (جامع العلوم والحکم ص ۱۶)

(وعنہ من طریق ثان) جاءَ جِبْرَئِیْلُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ مَا الْاِسْلَامُ فَقَالَ تَعْبُدُ اللّٰہَ لَا تُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِی الزَّکٰوۃَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ وَتَحُجُّ الْبَیْتَ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُسْلِمٌ قَالَ نَعَمْ صَدَقْتَ قَالَ فَمَا الْاِحْسَانُ قَالَ تَخْشَی اللّٰہَ تَعَالٰی کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّا تَکُ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُحْسِنٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ صَدَقْتَ قَالَ فَمَا الْاِیْمَانُ قَالَ تُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْبَعْثِ مِنْ بَعْدِ الْمَوْتِ وَالْجَنَّۃِ وَالنَّارِ وَالْقَدَرِ کُلِّہٖ قَالَ فَاِذَا فَعَلْتُ ذٰلِکَ فَاَنَا مُؤْمِنٌ قَالَ نَعَمْ قَالَ صَدَقْتَ (زاد فی روایۃ وکان جبرئیل یاتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی صورۃ دحیۃ

اس میں کچھ زیادتیاں اور بھی ہیں مثلاً اس میں اسلام کی تشریح میں حج، عمرہ، غسل جنابت اور پورے طور پر وضو کرنے کا ذکر بھی ہے اور آخر میں ہے مجھ سے اپنا دین سیکھ لو۔ اس کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کہ میرے پاس یہ تشریف لاتے ہیں کبھی مجھ پر مشتبہ نہیں ہوئے بجز اس مرتبہ کے کہ میں ان کو شناخت نہیں کر سکا یہاں تک کہ وہ پشت پھیر کر چلے گئے" ابن عمرؓ کی روایت کے دوسرے طریقہ میں اس روایت کا مضمون یوں ہے جبرئیلؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا اے محمدؐ اسلام کی حقیقت کیا ہے، آپ نے فرمایا اللہ کی عبادت کر اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیرا، نماز ادا کر، زکوٰۃ دے، رمضان شریف کے روزے رکھ، بیت اللہ کا حج کر۔ اس نے عرض کیا یا رسولؐ! جب یہ باتیں میں کرلوں تو کیا میں مسلمان ہوجاؤں گا؟ آپ نے فرمایا ضرور، اس نے کہا آپ نے درست فرمایا۔ پھر پوچھا احسان کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈر تا رہ گویا اسے تو آنکھوں سے دیکھتا ہے اگر تو اسے آنکھوں سے نہیں دیکھتا تو وہ تو یقیناً تجھے دیکھتا ہے۔ اس نے کہا اگر میں یہ صفت حاصل کرلوں تو کیا میں محسن ہوجاؤنگا آپ نے فرمایا بیشک۔ اس نے کہا آپ نے بجا فرمایا۔ پھر بولا کہ ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ۔ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے تمام رسولوں کو اور موت کے بعد جی اٹھنے کو، جنت و دوزخ اور ہر قسم کی تقدیر کو دل سے مان لے۔ اس نے کہا جب میں یہ تمام باتیں مان لوں تو کیا میں مومن ہوجاؤنگا آپ نے فرمایا یقیناً۔ اس نے کہا ٹھیک فرمایا (ایک روایت میں یہ اور ہے

احادیث میں ذکر ہے قرآن کریم نے بھی کئی جگہ ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۱) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ

وعنه من طريق ثالث أنّ جبريل قال للنبي صلى الله عليه وسلم ما الإيمان قال أن تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وبالقدر خيره وشره فقال له جبريل عليه السلام صدقت قال فتعجبنا منه يسأله ويصدقه قال فقال النبي صلى الله عليه وسلم ذاك جبريل أتاكم يعلمكم معالم دينكم۔ وعنه عن طريق رابع قال أخبرني عمر بن الخطابؓ

کہ عام طور پر جبریل علیہ السلام آپ کی خدمت میں دحیہ کلبی کی صورت میں آیا کرتے تھے)۔

ابن عمرؓ کی روایت کے تیسرے طریقے میں یہ مضمون اس طرح ہے جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ایمان کسے کہتے ہیں آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور تمام رسولوں کو اور آخرت کے دن اور ہر بری بھلی چیز کو نوشتۂ تقدیر مان لو، جبریل علیہ السلام نے کہا آپ نے ٹھیک فرمایا۔ راوی کہتا ہے کہ ہم نے اس پر تعجب کیا کہ یہ شخص خود ہی پوچھتا ہے اور پھر خود ہی اس کی تصدیق بھی کرتا جاتا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ جبریل علیہ السلام تھے، تمہارے پاس تمہارے دین کے اصول سکھانے آئے تھے ـــ روایت مذکورہ کے چوتھے طریقے میں ہے۔ ابن عمرؓ کہتے

ہمارے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کتاب کو مان لیا جو ان پر ان کے پروردگار کی طرف سے نازل کی گئی اور (پیغمبر کے ساتھ) دوسرے مسلمانوں نے بھی۔ یہ سب کے سب اللہ اور اس کے فرشتے اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔

(۲) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ۔ بلکہ اصل بھلائی اور نیکی یہ ہے کہ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے۔

چونکہ رسولوں پر ایمان یہ ہے کہ ان کی بیان کردہ سب باتوں کو تسلیم کیا جائے اس لئے اللہ تعالیٰ کی تمام صفات، قیامت اور جنت و دوزخ کی تمام تفصیلات، جیسے صراط و میزان وغیرہ سب کا تسلیم کرنا ایمان بالرسول میں داخل ہے یہاں ایک بات غور طلب یہ ہے کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان کے مفہوم میں فرق ہے اور وفد عبد القیس کی حدیث میں آپ نے اسلام کی ٹھیک وہی تفسیر بیان فرمائی ہے جو یہاں ایمان کی مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور ایمان میں کوئی فرق نہیں۔ علماء نے اس کے مختلف جواب دیئے ہیں حضرت استاذ قدس سرہ فرماتے تھے کہ ایمان و اسلام مصداق کے لحاظ سے ایک ہی چیز ہیں یعنی اسلام کامل اور ایمانِ کامل جدا نہیں ہوتے اس لئے ایمان و اسلام کے اجزا ایک دوسرے کی تعریف میں . . . ذکر کئے جا سکتے ہیں۔

حدیث جبرئیل میں سائل کے سوالات کی نوعیت پھر بار بار اس کی تصدیق کرنے سے یہ اندازہ کرنا بہت ہی قرین قیاس تھا کہ یہ مخاطب کوئی ذی علم اور ذی فہم شخص ہے اس لئے اس کے سامنے ہر ایک کی جداگانہ ماہیت اور علیحدہ علیحدہ حقیقت بیان کرنا اور ان باریک علمی گوشوں پر بھی متنبہ کر دینا جن سے ایمان و اسلام کی حقیقتیں ممتاز ہوتی ہیں نہایت مناسب تھا، وفد عبد القیس میں آپ کے مخاطب چند نو مسلم تھے ان کے سامنے علمی تحقیقات بیان کرنا غیر ضروری تھا۔ نیز وہ صرف ایک ایسا نظام عمل دریافت کرنے آئے تھے جو ان کی نجات کے لئے کافی ہو جائے اس لئے ان کے سامنے آپ نے ایسا ہی نظام عمل

اَنَّھُمْ بَیْنَا ھُمْ جُلُوْسٌ اَوْ قُعُوْدٌ عِنْدَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَاءَ رَجُلٌ یَمْشِیْ حَسَنَ الْوَجْہِ حَسَنَ الشَّعْرِ عَلَیْہِ ثِیَابٌ بِیْضٌ فَنَظَرَ الْقَوْمُ بَعْضُھُمْ اِلٰی بَعْضٍ مَا نَعْرِفُ ھٰذَا اَوْ مَا ھٰذَا بِصَاحِبِ سَفَرٍ ثُمَّ قَالَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اٰتِیْکَ؟ قَالَ نَعَمْ فَجَاءَ فَوَضَعَ رُکْبَتَیْہِ عِنْدَ رُکْبَتَیْہِ وَیَدَیْہِ عَلٰی فَخِذَیْہِ (وساق الحدیث بنحو ما تقدم وفیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال بعد ان ذھب السائل) عَلَیَّ بِالرَّجُلِ فَطَلَبُوْہُ فَلَمْ یَرَوْا شَیْئًا فَمَکَثَ یَوْمَیْنِ اَوْ ثَلٰثَۃً ثُمَّ قَالَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ عَنْ کَذَا وَکَذَا قَالَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ قَالَ ذَاکَ جِبْرِیْلُ جَاءَکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ۔

ہیں مجھ سے حضرت عمرؓ نے بیان فرمایا کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھے کہ ایک شخص نہایت حسین، خوبصورت بالوں والا، سفید لباس پہنے ہوئے آپ کے پاس ٹہلتا ہوا آیا، لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا (اور کہا) ہم اس شخص کو پہچانتے تو نہیں یا یہ کہا کہ یہ شخص مسافر تو معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ بولا یا رسول اللہ میں حاضر ہو سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا شوق سے وہ آیا اور اپنے دونوں زانو آپ کے زانو کے برابر اور اپنے ہاتھ آپکے رانوں پر رکھدیئے (اس کے بعد پھر حضرت عمرؓ کی روایت کا وہی مضمون بیان کیا اس میں یہ اور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے چلے جانے کے بعد فرمایا اس کو میرے پاس لاؤ، لوگوں نے اُسے ڈھونڈھا تو انھیں کوئی نظر نہ آیا۔ دو تین دن کے بعد آپ نے فرمایا اے ابن الخطابؓ جانتے ہو یہ سوالات کرنے والا شخص کون تھا۔ انھوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی واقف ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل تھے تمہارا دین سکھانے کے لئے تمہارے پاس آئے تھے

رکھدینا مناسب سمجھا۔ یہاں اسلام وایمان کا فرق بیان کرنا بالکل غیر ضروری تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ تعبیری فرق صرف مخاطبین کے حالات کی رعایت سے کیا گیا ہے مسئلہ کا فرق نہیں ہے۔

ابن عمرؓ کی روایت کے دوسرے طریقہ کے آخری الفاظ سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ حضرت جبرئیل ؑ کو شناخت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس مرتبہ وہ اپنی عام عادت کے مطابق دحیہ کلبی کی شکل میں تشریف نہ لائے تھے تعجب ہے کہ نسائی شریف میں اس کے بالکل برعکس یہاں راوی یہ بیان کرتا ہے "انہ جبریل نزل فی صورۃ دحیۃ الکلبی" (یہ جبرئیل تھے دحیہ کلبی کی صورت میں آئے تھے۔) حافظ ابن حجرؒ نے اس کو راوی کا وہم قرار دیا ہے اور بجا قرار دیا ہے۔

چوتھے طریقہ میں یہ تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ سے آپ کا سائل کی تشخیص کے متعلق سوال کرنا اس واقعہ کے دو تین دن بعد ہوا ہے۔ ابوداؤد، نسائی اور ترمذی میں راوی نے بلا تردد تین دن کا لفظ کہا ہے۔ لہذا اس کے خلاف جو روایت بھی ہو اس کی تاویل کی جائے گی۔

(۲۴۳) عَنْ اَبِیْ عَامِرٍ الْاَشْعَرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِنَحْوِهٖ وَفِیْهِ ثُمَّ وَلّٰی (ای السائل) فَلَمَّا لَمْ نَرَ طَرِیْقَهٗ بَعْدُ قَالَ (ای النبی صلی اللہ علیہ وسلم) سُبْحَانَ اللّٰهِ ثَلَاثًا هٰذَا جِبْرِیْلُ جَاءَ لِیُعَلِّمَ النَّاسَ دِیْنَهُمْ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَا جَاءَنِیْ قَطُّ اِلَّا وَاَنَا اَعْرِفُهٗ اِلَّا اَنْ تَکُوْنَ هٰذِهِ الْمَرَّةَ۔ (انفرد بہ الامام احمد وحسنہ الحافظ)

(۲۴۴) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بِنَحْوِهٖ وَفِیْهِ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

(۲۴۳) ابو عامر اشجعی نے بھی جبرئیل علیہ السلام کی آمد کا واقعہ اسی طرح نقل کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔ پھر وہ شخص چلا گیا جب ہمیں اس کا کہیں پتہ نہ چلا تو آپ نے تین بار سبحان اللہ سبحان اللہ فرما کر کہا یہ جبرئیل تھے اس لئے آئے تھے کہ لوگوں کو اس پیرایہ سے دین کی تعلیم دیں۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس مرتبہ کے سوا کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ وہ میرے پاس آئے ہوں اور میں نے انھیں پہچان نہ لیا ہو۔

(۲۴۴) یہ مضمون ابوہریرہؓ سے بھی اسی کے قریب مروی ہے (صرف اتنا فرق ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کی آمد کا سبب اس میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا مجھ سے جو دریافت کرنا ہے وہ دریافت

(۲۴۳) حافظ ابن رجبؒ نے یہاں صحابی کی کنیت میں اختلاف نقل کیا ہے کہ ابن عامر ہے یا ابو عمر یا ابو مالک اور ان کی روایت کے الفاظ میں یہ بھی نقل کیا ہے "کہ ہمیں بات کرنے والا وہاں کوئی شخص نظر نہ آتا تھا ہم صرف آپ کا جواب سُن رہے تھے" مسند احمد کے یہ الفاظ اس باب کی تمام صحیح روایات کے خلاف ہیں، راوی عام طور پر سائل کو بچشم خود دیکھنا بیان کرتے ہیں اس لئے اگر کسی ایک روایت میں اس کے خلاف مذکور ہے تو یقیناً یہ بھی راوی کا وہم ہی سمجھا جائے گا۔ صحیحین کی روایات سے ثابت ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کو ایک نوجوان شخص کی صورت میں سب نے دیکھا تھا۔ ان روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عالم روحانیت موجود ہے، اُس کو اپنی شکل بدلنے پر قدرت دی گئی ہے، وہ انسانی شکل اختیار کر سکتا ہے اور اپنی شکل پر واپس بھی ہو سکتا ہے۔ نقل و حرکت اور سمع و بصر وغیرہ کی تمام صفات اس میں موجود ہیں۔ فرشتوں کی بحث میں اس پر مزید کلام کیا جائے گا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جن لوگوں کے مزاج میں تحقیق و تنقیح کی قوت نہیں ہوتی جب وہ کہیں راویوں کا اختلاف دیکھتے ہیں تو اس کی تنقیح کرنے کی بجائے اصل واقعہ ہی کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ایسی ہی بات ہے جیسے کسی واعظ و مقرر کی تقریر سننے والے اگر آپ کے سامنے اس کی تقریر میں کچھ اختلاف نقل کریں تو آپ سرے سے اس کی تقریر ہی کا انکار کر بیٹھیں۔ پس اگر اس جگہ ناقلین کے اختلاف کی وجہ سے اس تقریر سے انکار کرنا غلط ہے تو پھر راویوں کے اختلاف سے جبرئیل کی آمد کے اصل واقعہ ہی سے انکار کرنا کیونکر صحیح کہا جا سکتا ہے اس کا حاصل تو یہ ہے کہ جب تک ایک واقعہ کے نقل پر اس کے تمام ناقل کسی ادنیٰ اختلاف کے بغیر متفق نہ ہو جائیں اس واقعہ کا وجود ہی قابل تسلیم نہ ہو۔

(۲۴۴) اس روایت سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں جبرئیل علیہ السلام کو سائل بن کر تشریف لانے کی ضرورت کیا تھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قرآن میں سوال کرنے کی ممانعت کا منشا تحقیق سے روکنا نہیں تھا بلکہ بیکار سوالات یا ایسے سوالات سے روکنا مدنظر تھا۔ جن سے دین میں تشدد پیدا ہو جانے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔ حدیث جبرئیل میں سب سے بڑی

سَلُوْنِیْ فَهَابُوْهُ اَنْ یَّسْاَلُوْهُ وَفِیْهِ فَاِذَا کَانَتِ الْعُرَاۃُ الْحُفَاۃُ الْجُفَاۃُ وَفِیْهِ وَاِذَا تَطَاوَلَ رُعَاۃُ الْبُهْمِ فِی الْبُنْیَانِ وَفِیْهِ بَعْدَ ذِکْرِ الْاٰیَةِ زِیَادَۃٌ ثُمَّ اَدْبَرَ

کرلو، صحابہ (قرآن میں سوال کی ممانعت کی وجہ سے) سوال کرتے ہوئے ڈرے، اس پر جبرئیل علیہ السلام آئے اور انھوں نے یہ سوالات خود شروع کئے اور علاماتِ قیامت میں ابن عباسؓ کی روایت کے الفاظ کی بجائے یہاں یہ لفظ ہیں جب برہنہ جسم، پیادہ پا، گنوار، درشت خصلت (لوگ قوم کے سردار ہوجائیں) اور ’’ورایت اصحاب الشاء‘‘ کی بجائے یہ لفظ ہیں اور جب جاہل، بھیڑوں کے چرواہے عمارتوں پر فخر کرنے لگیں اور آیت ’’ان اللہ عندہ علم الساعۃ‘‘ کے بعد اتنا اور ہے اس کے بعد وہ شخص پشت پھیر کر چلا گیا

بحث احسان کی ہے۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر احسان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہیں تقویٰ کے ساتھ کہیں ایمان اور کہیں عمل صالح کے ساتھ۔

(۱) بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ (بقرہ) بلکہ واقعی بات تو یہ ہے کہ جس نے خدا کے آگے سر تسلیم خم کردیا اور وہ نیکوکار بھی ہے تو اس کے لئے اس کا اجر اس کے پروردگار کے یہاں موجود ہے۔

(۲) وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْهَهٗ اِلَی اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (لقمان) اور جو خدا کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرے اور وہ نیکوکار بھی ہو (تو بس اس نے مضبوط رسی تھام لی۔

(۳) لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ (مائدہ) جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے تو جو کچھ ممانعت سے پہلے کھاپی چکے اس میں ان پر کسی طرح کا گناہ نہیں جبکہ انھوں نے حرام چیزوں سے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کئے پھر حرام چیزوں سے پرہیز کیا اور ایمان لائے پھر حرام چیزوں سے پرہیز کیا اور اچھا پرہیز کیا جیسا کرنے کا حق ہے اور اللہ خلوص دل سے نیک کام کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۴) لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ (یونس) جن لوگوں نے دنیا میں بھلائی کی ان کے لئے آخرت میں بھی ویسی ہی بھلائی ہے اور کچھ بڑھ کر بھی۔

صحیح مسلم میں زیادہ کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے روئے انور کا دیدار کی گئی ہے۔ صفتِ احسان کے لئے یہ جزا نہایت ہی موزوں ہے۔ جب احسان یہ ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اس تصور کے ساتھ ادا کی جائے گویا اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے تو آخرت میں اس کے مناسب یہی جزاء ہوسکتی ہے کہ اس کو دیدار الٰہی سے حقیقۃً مشرف فرمایا جائے اس کے بالمقابل کافروں کا حال یہ ہے کہ دنیا میں بھی ان کے اور ان کے پروردگار کے درمیان غفلت کے حجابات پڑے ہوئے ہیں اس لئے ان حجابہائے غفلت کی جزاء آخرت میں بھی دیدار الٰہی سے محرومی ہونا چاہئے اسی لئے فرمایا۔ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ۔

حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ احسان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ تم سے اتنا قریب ہے گویا تمہارے سامنے ہے اور تم اُسے دیکھ رہے ہو اگر یہ تصور دشوار ہو تو پھر اُس کے پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اس ایمان کا تصور جاؤ کہ وہ تمہاری تمام حرکات وسکنات دیکھتا ہے۔ یہ ایمان تو ہر شخص کو حاصل ہے جب اس حقیقت پر بار بار غور کروگے

الرَّجُلُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رُدُّوْا عَلَيَّ الرَّجُلَ فَاَخَذُوْا لِيَرُدُّوْهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا فَقَالَ هٰذَا جِبْرِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ

آپ نے فرمایا اس شخص کو میرے پاس واپس لاؤ، لوگ چلے کہ اُسے واپس لائیں مگر انھیں کوئی نظر نہ آیا آپ نے فرمایا یہ جبرئیل علیہ السلام تھے۔ اس لئے آئے تھے کہ لوگوں کو اس پیرایہ سے ان کا

تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کی قرب و معیت کا تصور تم پر اتنا غالب آجائے گا کہ پھر وہ ہر وقت گویا تمہیں سامنے نظر آئے گا۔ اس بنا پر حدیث میں ایک ہی حال مذکور ہے اور دوسرا جملہ پہلے حال کی تحصیل کا صرف ایک ذریعہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو دو جداگانہ حال قرار دیئے جائیں اور مطلب یہ ہو کہ اگر تمہیں پہلا حال میسر نہ آسکے تو دوسرے حال ہی پر کفایت کرلو اور کم از کم اس تصور سے تو خالی نہ رہو کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے خشوع و خضوع عبادت کی روح ہے اور اس کے لئے یہ تصور بھی کافی ہے۔ بعض عارفین نے ان دو مقاموں کو مقام اخلاص اور مقام مشاہدہ سے تعبیر کیا ہے۔ پہلا مقام مقام مشاہدہ ہے اور دوسرا مقام اخلاص۔ اگر یہ تصور میسر آجائے کہ خدا تعالیٰ تمہیں ہمہ وقت دیکھتا ہے۔ تمہاری ہر ہر حرکت پر اس کی نظر پڑ رہی ہے تو اس حالت میں غیر اللہ کی طرف التفات یا عبادت میں غیر اللہ کی شرکت کا خائبہ بھی آنا نا ممکن ہوگا۔ اس کا نام مقام اخلاص ہے لیکن اگر کسی بلند فطرت کا قلب نور عرفان و یقین سے اتنا لبریز ہوچکا ہے کہ حجاب اغیار اٹھا کر غیب الغیب کو دیکھنے لگا ہے تو یہ مقام مشاہدہ ہے اور در اصل احسان اسی یقین کا نام ہے یہ مشاہدہ اسی یقین کا ایک اثر ہوتا ہے جو کمال استحضار اور انتہائی رسوخ کے بعد یہ شکل اختیار کرلیتا ہے ورنہ ؎

عنقا شکار کس نشود دام باز چین   کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اس صفت احسان کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔

(۱) وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (بقرہ) ہمارے بندے جب ہمارے بارے میں دریافت کریں تو ان کو سمجھا دو کہ ہم ان کے بہت قریب ہیں۔

(۲) مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا (مجادلہ) جب تین آدمیوں کا مشورہ ہوتا ہے تو ضرور اُن کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور پانچ کا مشورہ ہوتا ہے تو اُن کا چھٹا وہ ہوتا ہے اور اس سے کم ہوں یا زیادہ اور کہیں بھی ہوں وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔

(۳) وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ (یونس) اور اے پیغمبر تم کسی حال میں ہو اور قرآن کی کوئی سی آیت بھی لوگوں کو پڑھ کر سناتے ہو اور (اے لوگو) کوئی سا عمل بھی تم کرتے ہو ہم (ہمہ وقت) جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو تو تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔

(۴) وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (ق) اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

(۵) يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ (نساء) لوگوں سے شرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے۔ حالانکہ جب راتوں کو (بیٹھ بیٹھ کر) ان باتوں کے مشورے کرتے ہیں جن سے خدا راضی نہیں تو خدا اُن کے ساتھ (موجود) ہوتا ہے۔

(۶) وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ   اور تم کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔

دِینَهُمْ۔ وفی طریق اَرَادَ اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْأَلُوْا۔ (رواہ احمد والشیخان وغیرہما)

دین سکھلائیں۔ دوسرے طریقے میں یہ لفظ ہیں کہ چونکہ تم نے سوال نہ کیا اس لئے جبرئیل علیہ السلام نے (خود یہ سوالات کئے) تاکہ تم اپنا دین سیکھ لو۔

ان تمام آیات میں حق تعالیٰ کی یہ قرب و معیت اُسی صفتِ احسان کا اثر ہے جس کو حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں بتایا گیا ہے۔ احادیث ذیل میں بھی اسی کے اثرات ہیں۔

انّ احدکم اذا قام یصلی فانما یناجی ربہ او ربہ بینہ وبین القبلۃ وقولہ ان اللہ قبل وجہہ اذا صلی۔ وقولہ ان اللہ ینصب وجہہ لوجہ عبدہ فی صلاتہ مالم یلتفت وقولہ للذین رفعوا اصواتھم بالذکر انکم لا تدعون اصم ولا غائبا انکم تدعون سمیعا قریبا۔ وفی روایۃ وھو اقرب الی احدکم من عنق راحلتہ وفی روایۃ وھو اقرب الیکم من حبل الورید وقولہ یقول اللہ عزوجل انا مع عبدی اذا ذکرنی وقولہ یقول اللہ عزوجل انا مع ظن عبدی بی وانا معہ حیث یذکرنی۔

(۱) جب تم میں کوئی شخص نماز ادا کرنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس وقت وہ اپنے پروردگار سے سرگوشی کرتا ہے یا آپ نے یہ فرمایا کہ اس کا پروردگار گویا اس کے اور اس کے قبلہ کے درمیان جلوہ گر ہوتا ہے۔ (۲) جب مصلی نماز پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پاک اس کے منہ کی جانب جلوہ گر ہوتی ہے۔ (۳) جب تک بندہ نماز میں اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا اللہ تعالیٰ اس کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ (۴) کچھ لوگوں نے ایک سفر میں چیخ چیخ کر ذکر اللہ شروع کیا۔ آپ نے فرمایا اتنا چلاؤ مت تم کسی بہرے یا غیر حاضر ذات کو یاد نہیں کررہے ہو، تم ایسی ذات کو یاد کررہے ہو جو سننے والی ہے اور تمہارے بہت ہی قریب ہے اور ایک روایت میں یہ ہے کہ تمہارے اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے (۵) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس وقت اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ (۶) حق تعالیٰ کا ارشاد ہے میں اپنے بندہ کے اعتقاد کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

قرب و معیت کی یہ تمام داستانیں بندہ کے اسی یقین و حضور کے کرشمے ہیں جس کے پیدا کرنے کا وہ بہرحال مامور ہے صوفیاء محققین نے اس قرب و معیت کو اپنے فن اور اپنے ذوق کے انداز میں دوسری طرح پیش کیا ہے مگر درحقیقت وہ سب کیفیات و وجدانیات ہیں جو الفاظ کی محدود تعبیرات میں مقید ہوکر فضول دماغی الجھاؤ کا باعث بن گئی ہیں۔

حافظ ابن رجب حنبلیؒ کی یہ تعبیر بہت صاف ہے اور علماء و صوفیاء دونوں کے مذاق کے قریب ہے۔ شریعت کا اصل مقصد توحید و رسالت کا صرف علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ان علوم کو حالات اور حالات سے مقامات کی حد تک پہنچانا ہے علوم جب تک حالات و وجدانیات کی شکل اختیار نہیں کرتے اس وقت تک طبیعت میں نہ تو جذبۂ عمل پیدا ہوسکتا ہے اور نہ عمل میں کوئی ذوق نصیب ہوسکتا ہے۔ انسانی دماغ ان کو صرف ایک علمی تحقیق کی نظر سے دیکھا کرتا ہے اور یہ باور نہیں کرسکتا کہ یہ تمام علوم درحقیقت عالمِ غائبات کے وہ عظیم الشان حقائق ہیں جو خارج میں عالمِ مشاہدہ سے زیادہ مستحکم طور پر موجود ہیں۔ اسے حق تعالیٰ کی ذات و صفات کے مسائل، تقدیر و برزخ، جنت اور دوزخ کے تمام غیبی حقائق صرف خیالی نظر آتے رہتے ہیں لیکن منازلِ یقین طے کرتے کرتے جب وہ منزلِ احسان تک پہنچ جاتا ہے تو پھر جن کو پہلے وہ

اوہام سمجھا کرتا تھا اب وہی حقائقِ ثابتہ نظر آنے لگتے ہیں اور جنھیں حقائق سمجھا کرتا تھا وہ اوہام سے زیادہ ناپائیدار اور بے حقیقت ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان کے باطن میں جب یہ انقلاب رونما ہوجاتا ہے تو شریعت اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک سائنس کا ماہر مسلسل تجربات کرتے کرتے جب کسی ایک نقطہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی اس تحقیق پر وہ یقین میسر آجاتا ہے جو اپنی آنکھوں کے مشاہدات سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتا ہے۔ ہر انسان مشاہدہ میں انسان ہے اور دوسرے انسان ہی سے پیدا ہوا ہے۔ تاریخ نے کبھی شہادت نہیں دی کہ کوئی انسان کسی جانور سے پیدا ہوا تھا لیکن جب محض دماغی فلسفہ نے اس کو ہڈیوں کے جوڑ و بند ملانے پر مجبور کردیا تو اس نے اپنے تمام مشاہدات اور دنیا کی تمام موجودہ تاریخ کی صرف دلائل و براہین اور محض اپنے تجربات کی بنا پر تکذیب کردی اور بڑی خوشی سے یہ کہنے لگا کہ انسان حیوان ہی کی ایک ارتقائی شکل ہے یہ کوئی علمی تحقیق نہیں بلکہ جب دماغ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ کسی ایک جانب مشغول ہوجاتا ہے تو اس کو حقائق کے قلب کرنے میں ایک ملکہ حاصل ہوجاتا ہے اور وہ اوہام کو حقائق اور حقایق کو اوہام کا رنگ دینے لگتا ہے۔ اس کے یقین کی یہ ساری دنیا صرف اس کے دماغ کی تراشیدہ ہوتی ہے۔ آج بھی اوہام کے پرستار پھیلے ہوئے امراض کو جنات کا خلل قرار دیتے ہیں۔ قدیم ہندو ذہنیت سے متاثر بعض جاہل مسلمان بھی چیچک کو دیوی کا تصرف خیال کرتے ہیں اور اس زمانہ میں گھر کے اندر گوشت پکانا چیچک بگڑنے کا سببِ حقیقی تصور کرتے ہیں۔ اس کے برعکس روحانیات کے منکر روحانی تصرفات کے لئے بھی انجکشن تجویز کراتے پھرتے ہیں۔ اس پر تماشہ یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے دائرۂ یقین کے موافق معالجہ کرتا ہے اور اس پر آثار مرتب ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے۔ یہ سب حقائق نہیں بلکہ اپنے ہی یقین کے اثرات ہیں جو بصورتِ حقائق نظر آنے لگتے ہیں اس کا مقصد دلائل و براہین کو یکسر معطل کرنا اور دنیا کے اس سارے نظام کو جو ان دلائل پر ہی قائم ہے درہم و برہم کردینا بھی نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہاں صفتِ احسان کا دخل ہے وہ دنیا دلائل و براہین کی دنیا نہیں ہے وہ عالم مشاہدہ کا عالم ہے اس لئے وہاں تحصیل یقین کا راستہ صرف مشاہدہ ہے جس کی پہلی کڑی عمل ہے۔ عمل سے عقائد راسخ ہوتے ہیں اور جب عقائد راسخ ہوجاتے ہیں تو اسی پر صفتِ احسان کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اسی راستے سے انسان کے عنصرِ مادیۃ کو عروج میسر آتا ہے۔ حقیقی ارتقاء یہی ہے۔ انسان جب تک مادیت میں ڈوبا ہوا ہے وہ صفتِ احسان سے آشنا نہیں ہوسکتا اور جونہی اس کے عنصرِ مادیت کو عروج میسر آیا اسی وقت سے اس کی ماہیت کا دوسرا پاک عنصر یعنی روحانیت چمکنے لگتا ہے اور صفتِ احسان کی ابتدا ہونے لگتی ہے اور جتنا اس کا یہ عنصر شریعت کے تطہیر و تزکیہ کے اثرات سے عنصرِ مادیۃ کو مسخر کرتا جاتا ہے اتنا ہی یہ عنصر بھی عنصرِ روحانیت کے ہمرنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے ظاہر و باطن، مادیت و روحانیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس انقلاب کے بعد اب اس کے لئے فرشتے، جنت اور دوزخ پر یقین کرنا اسی طرح بدیہی ہوجاتا ہے جیسا اپنی آنکھوں کے مشاہدات پر انبیاء علیہم السلام کے اکثر غیبی علوم کا تعلق اسی صفتِ احسان سے ہے۔ جو شخص صفتِ احسان سے جتنا بے بہرہ ہے اتنا ہی وہ ان علوم سے بھی بے بہرہ ہے یہ اس کی خوش فہمی ہے کہ وہ اس کا انکار اپنے روشن خیالی کا ثمرہ تصور کرتا ہے۔ حقیقت یہ نہیں بلکہ دراصل اس کا یہ تردد یا تمرد اس صفتِ احسان سے دوری اور محرومی کا ثمرہ ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ دینِ اسلام کے منکر ہیں ان کا عنصرِ روحانیۃ رفتہ رفتہ ان کی مادیۃ کے ہمرنگ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک وقت وہ آجاتا ہے جبکہ ان کی روحانیت قطعاً مردہ ہوجاتی ہے اور اب ان کے لئے صرف عالمِ مادیت میں ڈوبنے اور ڈوب کر مرجانے ہی کی ایک صورت باقی رہ جاتی ہے اور ان کے لئے صفتِ احسان تک رسائی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ شاید اسی کو قرآن کے الفاظ میں طبع اور قلبی مہر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ جبریل علیہ السلام کی اس صورت میں تمام علوم اسلامیہ کا خلاصہ موجود ہے فقہاء کا موضوع عبادات و معاملات ہیں، یہ تمام مسائل مفہوم اسلام میں درج ہیں اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لانا، جنت، دوزخ، تقدیر، اور قیامت پر یقین رکھنا متکلمین کا موضوع ہے، یہ تمام مباحث لفظ ایمان میں داخل ہیں۔ توکل، رضا، صبر اور بقیہ مقامات عشرہ وغیرہ عرفاء کا موضوع ہے یہ سب مقامات احسان کے ابواب ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ یہ حدیث کتنی عظیم الشان ہے۔

ارکان الاسلام ودعائمہ العظام

(۲۴۵) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃِ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکٰوۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِیُّ وَمُسْلِمٌ وَالتِّرْمِذِیُّ وَالنَّسَائِیُّ۔

ارکانِ اسلام

(۲۴۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اسلام کا قصر پانچ ستونوں پر (قائم کیا گیا) ہے۔ شہادتین۔ یعنی اس بات کا دل سے اقرار کرنا کہ سوائے ایک اللہ تعالیٰ کے کوئی اور معبود نہیں ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ اس کے رسول ہیں پورے آداب وحقوق کی رعایت کرکے نماز ادا کرنا۔ زکوٰۃ دینا۔ حج کرنا۔ رمضان شریف کے روزے رکھنا۔ اس حدیث کو بخاری ومسلم وترمذی ونسائی نے روایت کیا ہے۔

(۲۴۵ الف) مصنفہ عبدالرزاق میں یہاں خمس دعائم کا لفظ صراحۃً مذکور ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۲۱)

(ب) حدیثِ مذکور کا مطلب سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ تعلیم اور قرآن کریم کا اسلوبِ بیان ہر دو فطری ہوتے ہیں یہاں روزمرہ کے معمولی مشاہدات سے آخرت کے بڑے بڑے علوم باتوں ہی باتوں میں حل کردیتے جاتے ہیں۔ اب ذرا غور کرو کہ ایک اُمّی قوم کو اسلام اور اعمال کا ربط، پھر اعمال میں باہمی مراتب کا تفاوت سمجھانا ہے۔ مسئلہ کس قدر مشکل ہے اور اس کے لئے تعبیر کتنی سادہ۔ ارشاد ہوتا ہے کہ جس طرح اپنے ماحول میں تم روزمرہ اپنا مکان دیکھتے ہو اس میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں اور یہ مجموعہ مل کر ہی تمہارا مکان کہلاتا ہے پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ضرور ہوتی ہے جس پر یہ مکان قائم ہوتا ہے۔ پھر عجیب بات ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان مکان تو آنکھوں سے نظر بھی آتا ہے مگر وہ بنیاد جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہوتی ہے کہیں نظر نہیں آتی وہ زمین کے نیچے ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کو سمجھ لو وہ بھی ایک مجموعہ کا نام ہے اس کے بھی اجزاء ہیں . . . .

. . . . اس کی بھی ایک بنیاد ہے۔ پھر اس کے اجزاء میں ایسا ہی تفاوت ہے جیسا کہ تمہارے مکان کے اجزاء میں، ہر جزء مکان کے لئے یکساں ضروری نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ مکان کی بقاء کے لئے جس قدر ستونوں کی حاجت ہے اتنی طاق، روشندان اور نقش ونگار کی نہیں اسی طرح یہاں ارکانِ خمسہ، اسلام کے بنیادی اصول ہیں جن کے بغیر اسلام کا کارخانہ قائم نہیں رہ سکتا پھر ان ارکان میں بھی باہمی فرق ہے۔ آئندہ حدیث میں ابھی آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ ان ارکانِ خمسہ کے ساتھ ساتھ تصدیقِ قلبی بھی اہم ترین جزء ہے اُسے مکان کی بنیاد کی مثال سمجھئے جس طرح وہ زمین میں مدفون ہوتی ہے اسی طرح یہ دل میں پوشیدہ رہتی ہے۔ . . . . ارکان خمسہ کی یہ محکم تعمیر اسی پوشیدہ تصدیق پر قائم رہ سکتی ہے۔ ایک موٹی سی مثال سے کتنی بڑی حقیقت ذہن نشین کردی اور لطف یہ کہ سامعین کو خبر تک نہ ہوئی کہ مشکل کیا تھی اور کیونکر حل ہوگئی۔ دورِ نبوت گذرا اور جب علومِ رسمیہ کی نوبت پہنچی تو اسی صاف بات کو جب

(بقیہ برصفحہ آئندہ)

(٢٤٦) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا اَتَی ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مَا حَمَلَكَ عَلٰى اَنْ
تَحُجَّ عَامًا وَتَعْتَمِرَ عَامًا وَتَتْرُكَ الْجِهَادَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ عَلِمْتَ مَا رَغَّبَ اللّٰهُ فِيْهِ قَالَ
يَا ابْنَ اَخِىْ بُنِىَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ اِيْمَانٍ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالصَّلٰوةِ الْخَمْسِ وَصِيَامِ رَمَضَانَ
وَاَدَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ قَالَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَلَا تَسْمَعُ مَا ذَكَرَ اللّٰهُ فِىْ كِتَابِهٖ
وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ـ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى
لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ قَالَ فَعَلْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ الْاِسْلَامُ

(۲۴۶) نافع سے یوں روایت ہے کہ ایک شخص ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا اے ابو عبد الرحمٰن (ان کی
کنیت ہے) کیا وجہ کہ آپ حج اور عمرہ تو ہر سال کرتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرتے حالانکہ آپ جانتے ہیں
کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی کیسی ترغیب دلائی ہے۔ ابن عمرؓ نے جواب دیا اے بھائی اسلام تو پانچ چیزوں کا نام
ہے (۱) اللہ کی توحید اور رسول کی تصدیق (۲) پنج وقتہ نماز (۳) رمضان کے روزے (۴) زکوٰۃ (۵)
بیت اللہ کا حج (اور آج کل جو لڑائی ہے اس میں شریک ہونا کچھ اسلام کا جزء نہیں جو نہ کرنے سے کچھ نقصان ہو)
اس نے کہا اے ابو عبد الرحمٰن کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہیں مانتے وان طائفتان الخ یعنی اگر مسلمانوں کے
دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو (آخر آیت تک) دوسری جگہ ارشاد ہے کفار سے جنگ کرو یہاں تک
کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ ابن عمرؓ نے کہا ہم نے حضرت کے زمانہ میں جب اسلام کم تھا ایسا ہی کیا (جو شخص فتنہ

ضوابط کے شکنجوں میں کھینچا گیا تو اسی ایک لاینحل معمہ بن کر رہ گئی کہ اعمال ایمان کے اجزاء ہیں یا صرف اس کی تکمیل کا
سامان اسی پر یہ بحث قائم ہو گئی کہ ایمان اب بسیط رہا یا مرکب پھر اعمال کی ضرورت اگر رہی تو کس درجہ ان جماعت
نے یہاں تک طول پکڑا کہ مستقل مذاہب بن گئے اور ہزاروں اوراق صرف ہو جانے کے بعد بھی روشنی پھر اس سے
زیادہ پیدا نہ ہو سکی جو اس مثال میں موجود ہے۔

(۲۴۶) حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ ایک خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے عبادت کے لئے سرنگوں
ہو جانا۔ اب اگر دین اسلام کا تجزیہ کرو تو اس میں چند قسم کے احکام پاؤ گے۔ (۱) وہ احکام جو سب پر یکساں واجب ہیں۔ (۲)
وہ احکام جو خاص خاص افراد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم پر ایک بڑا حصہ صرف فرض علی الکفایہ ہے۔ ہر شخص پر واجب نہیں جیسا
کہ جہاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر، امارت، حاکم، قاضی، مفتی، شہادۃ وغیرہ ان سب کا تعلق خاص مصالح اور عارضی
اسباب سے وابستہ ہے۔ فرض کر لو اگر یہ مصالح ہماری نقل و حرکت کے بغیر حاصل ہو جائیں تو یہ احکام واجب نہیں رہتے۔ اسی طرح
حدود وغیرہ کے ابواب ہیں ان کا تعلق بھی چند جرائم کے ساتھ ہے۔ اگر اس کا انسداد ہو جائے تو ان ابواب کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ دین کا
دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسا کہ قرض کی ادائگی، غصب و عاریت، ودیعت و امانت وغیرہ یہ تمام
ابواب انسانوں کے حقوق کے تحفظ اور مظلوم کی دادرسی کے لئے ہیں اگر صاحب حق معاف کر دے تو یہ ابواب بھی معطل ہوتے

قَلِيلًا فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِي دِينِهِ إِمَّا قَتَلُوهُ وَإِمَّا يُعَذِّبُوهُ حَتَّى كَثُرَ الْإِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ الحديث (رواه البخاري في التفسير (ص ٦٤٨)

(۲۴۷) عَنْ أَبِي سُوَيْدٍ الْعَبْدِيِّ قَالَ أَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ فَجَلَسْنَا بِبَابِهِ لِيُؤْذَنَ لَنَا قَالَ فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ قَالَ فَقُمْتُ إِلَى جُحْرٍ فِي الْبَابِ فَجَعَلْتُ أَطَّلِعُ فِيهِ فَفَطِنَ بِي فَلَمَّا أُذِنَ لَنَا جَلَسْنَا فَقَالَ أَيُّكُمْ اطَّلَعَ آنِفًا فِي دَارِي قَالَ قُلْتُ أَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ فَنَظَرْتُ فَلَمْ أَتَعَمَّدْ ذَالِكَ قَالَ ثُمَّ سَأَلُوهُ عَنْ أَشْيَاءَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ

اٹھاتا اس کو مار دیا جاتا یا تکلیف دی جاتی) یہاں تک کہ اسلام بکثرت پھیل گیا اور کوئی فتنہ باقی نہ رہا۔

(۲۴۷) ابو سوید عبدی بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دروازے پر بیٹھ گئے تاکہ اجازت ہو جائے (تو اندر داخل ہوں) اجازت میں کچھ دیر ہوئی تو میں دروازے میں ایک سوراخ کے اندر سے جھانکنے لگا وہ میری اس حرکت کو تاڑ گئے جب ہمیں اجازت مل گئی اور ہم بیٹھ گئے تو انھوں نے فرمایا ابھی ابھی میرے گھر میں تم میں کس نے جھانکا تھا میں نے عرض کیا کہ اجازت ملنے میں دیر ہوگئی تھی اس لئے میں نے جھانکا تھا (تاکہ تاخیر کا سبب معلوم ہو) جھانکنا مقصود نہ تھا اس کے بعد پھر اُن سے بعض اور باتیں دریافت کیں انھوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت پر نماز پڑھنے،

ہیں، صلۂ رحمی، حقوقِ زوجیت، حقوقِ اولاد، پڑوسی، شریک، فقیر وغیرہ ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص افراد سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں اسی طرح شریعت کے بقیہ ابواب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال جایئے اور غور کر کیجئے کہ اب وہ کون سے احکام ہیں جو ہر ہر فرد پر واجب ہیں اور کسی وقتی مصلحت پر بھی مبنی نہیں۔ اور انسان کے انقیادِ ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت بھی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ یہی مبانی خمسہ ہیں۔ اسی لئے حدیثِ مذکور میں صرف ان پانچ ہی کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

اس حدیث میں ابن عمرؓ کو جس جنگ کی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے وہ عبد اللہ بن زبیرؓ کی خلافت پر جنگ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا جواب یہاں کتنا عبرت آموز اور کتنا قیمتی ہے کہ کفار سے جنگ فتنہ فرو کرنے کے لئے ہوتی ہے اور مسلمانوں سے جنگ فتنہ پیدا کرنے کے لئے۔ تم جس آیت کو میری تردید کے لئے پڑھ رہے ہو درحقیقت وہی میری تائید کے لئے ہے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابن عمرؓ کا اس حدیث سنانے سے مقصد یہ نہیں تھا کہ جہاد فرضِ عین نہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ا ص ۱۴۳) بلکہ وہ اُسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جس کو حافظ ابن تیمیہؒ نے مذکورہ بالا بیان میں مفصل طور پر ذکر کیا ہے۔

(۲۴۷) اسلام میں کسی غیر شخص کے گھر میں جھانکنے کی ممانعت کی گئی تھی اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے

وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصِيَامِ رَمَضَانَ قُلْتُ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مَا تَقُولُ فِي الْجِهَادِ قَالَ مَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (ومن طريق اخر) قَالَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ وَالْجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ الْجِهَادُ حَسَنٌ هٰكَذَا حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلم الاولى اخرجها احمد وعبدالرزاق والثانية الشيخان والنسائی والترمذی والطبرانی۔

(۲۴۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍؓ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ بِالنَّاسِ قِبَلَ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَلَمَّا أَنْ أَصْبَحَ صَلّٰى بِالنَّاسِ صَلٰوةَ الصُّبْحِ ثُمَّ إِنَّ النَّاسَ رَكِبُوْا فَلَمَّا أَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ نَعَسَ النَّاسُ فِيْ أَثَرِ الدُّلْجَةِ وَلَزِمَ مُعَاذٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْلُوْ أَثَرَهٗ وَالنَّاسُ تَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ عَلٰى جَوَادِ الطَّرِيْقِ تَأْكُلُ وَتَسِيْرُ فَبَيْنَمَا مُعَاذٌ عَلٰى أَثَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ

زکوٰۃ دینے، بیت اللہ کا حج، اور رمضان کے روزے رکھنے پر، ہم نے عرض کیا اے ابو عبدالرحمٰن اور جہاد کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں، فرمایا جو کوئی جہاد کرے گا وہ اپنے ہی نفع کے لئے کرے گا۔ دوسرے طریقے میں ہے ایک شخص نے ان سے پوچھا اور جہاد فی سبیل اللہ کیسا ہے فرمایا اچھا ہے (مگر) ہم سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بیان کیا تھا۔ (احمد۔ عبدالرزاق)

(۲۴۸) معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غزوۂ تبوک کے لئے لے کر نکلے۔ جب صبح ہوگئی تو آپ نے ان کو صبح کی نماز پڑھائی۔ لوگ نماز پڑھ کر پھر سوار ہوگئے جب آفتاب نکلا تو سب لوگ شب کی بیداری کی وجہ سے اونگھ رہے تھے۔ ایک معاذ تھے جو برابر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگے چلے آرہے تھے بقیہ لوگوں کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور بڑی شاہراہوں پر انھیں لے کر تتر بتر ہوگئیں تھیں۔ اسی دوران میں کہ معاذ کی اونٹنی نبی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے کبھی چرتی اور کبھی چلتی جارہی

ان کے بیٹھتے کے ساتھ ہی پہلے اس خلاف شرع حرکت پر ان کو ٹوکا، آخر انھیں معذرت کرنی پڑی۔ اس سے زیادہ پیچھے پڑنا طریق دعوت و حکمت کے خلاف تھا اس لئے یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ ان کا یہ عذر بھی شرعی طور پر کافی نہیں تھا۔ اس پر ابن عمرؓ نے کیسے سکوت کرلیا۔ الفاظ بالا سے یہ اور صاف ہوگیا کہ ابن عمرؓ کا منشا صرف اتنا تھا کہ ان کے زمانہ کا جہاد ارکان خمسہ کے ہم پلہ نہیں ہے۔ ایسے فتنوں کے موقعوں پر اس سے زیادہ صفائی سے بات کہنا بھی فتنہ کا موجب تھا اس لئے ابن عمرؓ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے، مانا کہ جہاد بہت اچھا عمل ہے مگر جو حدیث میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے وہ اتنی ہی ہے اس میں جہاد کا ذکر نہیں ہے اس لئے تم مجھے اس جہاد کی شرکت پر مجبور نہیں کرسکتے اور میں اس سے علیحدہ رہ کر معذور رہ سکتا ہوں۔

(۲۴۸) اس حدیث میں کلمۂ شہادت کے لئے "رأس" اور نماز کے لئے "قوام" اور جہاد کے لئے "ذروہ" کا لفظ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَاقَتُهُ تَأْكُلُ مَرَّةً وَتَسِيْرُ أُخْرَى، عَثَرَتْ نَاقَةُ مُعَاذٍ فَكَبَحَهَا بِالزِّمَامِ
فَهَبَّتْ حَتّٰى نَفَرَتْ مِنْهَا نَاقَةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
كَشَفَ عَنْهُ قِنَاعَهُ، فَالْتَفَتَ فَإِذَا لَيْسَ مِنَ الْجَيْشِ رَجُلٌ أَدْنٰى إِلَيْهِ مِنْ مُعَاذٍ فَنَادَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ قَالَ اُدْنُ دُوْنَكَ فَدَنَا مِنْهُ حَتّٰى لَصِقَتْ
رَاحِلَتُهُمَا إِحْدَاهُمَا بِالْأُخْرٰى فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كُنْتُ أَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا
لَمَكَانِهِمْ مِنَ الْبُعْدِ فَقَالَ مُعَاذٌ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ نَعَسَ النَّاسُ فَتَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ تَرْتَعُ وَتَسِيْرُ
فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا كُنْتُ نَاعِسًا فَلَمَّا رَأٰى مُعَاذٌ بُشْرٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ وَخَلْوَتَهُ لَهُ قَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ائْذَنْ لِيْ أَسْأَلُكَ عَنْ كَلِمَةٍ قَدْ
أَمْرَضَتْنِيْ وَأَسْقَمَتْنِيْ وَأَحْزَنَتْنِيْ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ سَلْنِيْ عَمَّ شِئْتَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ حَدِّثْنِيْ

تھی دفعۃً ٹھوکر کھائی۔ معاذؓ نے اس کو لگام کھینچ کر سنبھالا تو وہ اور تیز ہوگئی یہاں تک کہ اس کی
وجہ سے آپ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ آپ نے اپنا نقاب اٹھایا دیکھا تو لشکر بھر میں معاذ سے زیادہ کوئی اور شخص
آپ کے قریب نہ تھا آپ نے ان کو آواز دی اے معاذ، انھوں نے جواب دیا یا نبی اللہ میں حاضر ہوں فرمایا اور
قریب آجاؤ، وہ قریب آگئے اور اتنے قریب آگئے کہ دونوں کی سواریاں ایک دوسرے سے بالکل مل گئیں آپ نے
فرمایا میرا یہ خیال نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اتنی دور ہوں گے۔ معاذ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ لوگ کچھ اونگھ رہے
تھے (اس لئے) ان کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور اِدھر اُدھر انھیں لے کر متفرق ہوگئیں، آپ نے
فرمایا میں بھی اونگھ رہا تھا معاذؓ نے جب دیکھا کہ آپ اُن سے خوش ہیں اور موقعہ بھی تنہائی کا ہے تو عرض کیا
یا رسول اللہ اجازت دیجئے تو ایک بات پوچھوں جس نے مجھے بیمار ڈال دیا ہے اور غمزدہ بنا رکھا ہے، آپ
نے فرمایا اچھا جو چاہتے ہو پوچھو، عرض کیا یا رسول کوئی ایسا کام بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لیجائے

استعمال کیا گیا ہے۔ ترمذی کی روایت میں یہاں کچھ اور اعمال کا بھی ذکر ہے۔ ان الفاظ سے بڑھ کر ان عبادتوں کی حقیقتوں
کی ترجمانی کے لئے دوسرے الفاظ میسر نہیں آسکتے۔ الفاظِ بالا میں توحید و رسالت کو سر کہا گیا ہے، شہادتین کی حقیقت
سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور لفظ نہیں ہوسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا سر کٹ جائے تو اس
کی روح نکل جاتی ہے اور وہ صرف ڈھانچا ہی ڈھانچا رہ جاتا ہے اسی طرح کلمہ شہادت کو سمجھنا چاہئے اگر یہ نہ ہو تو بڑے سے
بڑا عمل بھی صرف ایک ڈھانچا ہے جس میں کوئی روح نہیں۔ نماز کو قوام اس لئے کہا گیا ہے کہ نماز دیکھنے میں گو ایک ہی
عبادت ہے مگر جملہ عبادات کی روح اس میں موجود ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا مفہوم بھی ہے اور صوم کا صبر بھی۔ نفس اور حج کی
طرح حرم مقصود کے گرد طواف بھی۔ جس نے اس عبادت کو چھوڑا اس نے گویا سب عبادتوں کو چھوڑ دیا۔ قرآن کہتا ہے

بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ لَا أَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ غَيْرِهَا قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِيمٍ لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِيمٍ ثَلَاثًا وَإِنَّهُ لَيَسِيرٌ عَلَى مَنْ أَرَادَ اللّٰهُ بِهِ الْخَيْرَ فَلَمْ يُحَدِّثْهُ بِشَيْءٍ إِلَّا قَالَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ يَعْنِي أَعَادَهُ عَلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حِرْصًا لِكَيْمَا يُتْقِنَهُ عَنْهُ فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُقِيمُ الصَّلٰوةَ وَتَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهُ لَا تُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا حَتّٰى تَمُوتَ وَأَنْتَ عَلَى ذٰلِكَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ أَعِدْ لِي فَأَعَادَهَا لَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مُعَاذُ بِرَأْسِ هٰذَا الْأَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ فَقَالَ بِأَبِي وَأُمِّي أَنْتَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِي فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ رَأْسَ هٰذَا الْأَمْرِ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَإِنَّ قِوَامَ هٰذَا الْأَمْرِ إِقَامُ الصَّلٰوةِ وَإِيتَاءُ الزَّكٰوةِ وَإِنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَإِنَّمَا أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ

اس کے سوا میں آپ سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا، آپ نے فرمایا بہت خوب بہت خوب تم نے بڑی بات پوچھی تین بار فرمایا ہاں جس کے لئے خدا بھلائی کا ارادہ کرے اس کیلئے کچھ اتنی دشوار بھی نہیں۔ کوئی بات آپ نے ان سے نہیں فرمائی جو تین بار نہ دہرائی ہو، اس شوق میں کہ وہ آپ کی بات خوب پختہ یاد کرلیں، آپ نے فرمایا اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھو، نماز پڑھا کرو۔ اللہ کی عبادت کیا کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ یہاں تک کہ اسی حال پر تمہاری موت آجائے انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ پھر ارشاد فرمائیے، آپ نے ان کی خاطر تین بار فرمایا اس کے بعد آپ نے فرمایا اگر چاہو تو اس دین کے اونچے عملوں میں جو چوٹی کا عمل ہے اور جو اس کی جڑ ہے وہ تمہیں بتادوں انھوں نے عرض کیا میرے ماں، باپ آپ پر قربان بتائیے آپ نے فرمایا سب میں جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ تو اس کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں جو تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور رسول ہیں اور جس عمل سے دین کی بندش مضبوط رہتی ہے وہ نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے اور اس کے اونچے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے مجھے

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر "نماز بےحیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے" لو اسی لئے دوسری جگہ یہ اعلان فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات "پھر ان کے بعد ان کے جانشین نااہل پیدا ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے" یہاں اضاعۃ صلوٰۃ کو اتباعِ شہوات کا پیش خیمہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے عمر فاروق ؓ نے اپنی قلمرو میں یہ حکم لکھ بھیجا تھا کہ نمازوں کی نگرانی رکھو جو شخص نمازوں کو ضائع کرے گا، اس کے بقیہ دین کا بھی خدا حافظ ہے۔ جہاد کو ذروۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ اونٹ میں کوہان پھر کوہان میں چوٹی سب سے نمایاں اور اونچی چیز ہوتی ہے اسی طرح اسلام میں وہ سب سے اونچا عمل جو خود بھی سب سے زیادہ نمایاں اور اسلام کا جھنڈا بھی سب سے زیادہ نمایاں کرنے [illegible]

حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَیَشْهَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ مَا شَحُبَ وَجْهٌ وَلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰی فِیْهِ دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ الْمَفْرُوْضَةِ كَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا ثَقُلَ مِیْزَانُ عَبْدٍ كَدَابَّةٍ تُنْفَقُ لَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ یُحْمَلُ عَلَیْهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ (رواہ احمد والبزار والنسائی وابن ماجۃ والترمذی وقال حدیث حسن صحیح وحدیث الباب اسناد جید وشهر بن حوشب وثقه ابن معین والامام احمد وغیرهما۔

الارتباط بین ارکان الاسلام

(۲۴۹) عَنْ زِیَادِ بْنِ نُعَیْمٍ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ اس وقت تک برابر جاری رکھوں جب تک کہ لوگ نماز نہ پڑھیں زکوۃ نہ دیں اور اس بات کی شہادت نہ دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں جب یہ باتیں کرلیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا مگر ہاں جو ضابطہ میں ہو اور اس کے بعد اُن کا حساب خدا کے سپرد ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا۔ کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجات جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مرگیا یا وہ جو اس نے راہِ خدا میں کسی کو دے ڈالا۔

ارکانِ اسلام کا باہمی ربط

(۲۴۹) زیاد بن نعیم سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، چار

---

(۲۴۹) ابن عمرؓ کی حدیث مذکور سے یہ تو سب ہی نے سمجھا کہ ارکانِ خمسہ اور مجموعہ دین کا وہ رشتہ ہے جو ایک قصر اور اس کے ستونوں کا ہوتا ہے اگر ارکانِ اسلام نہ ہوں تو دین کا قصر بھی گر جائے مگر خود ان ارکان کے درمیان رشتہ کیا ہے، ادھر کسی کا ذہن نہ گیا۔ اس نکتہ کی طرف حافظ ابن رجب کی نظر پہنچی ہے وہ اس حدیث کی شرح

اَرْبَعٌ فَرَضَهُنَّ اللّٰهُ فِي الْاِسْلَامِ فَمَنْ جَاءَ بِثَلَاثٍ لَمْ يُغْنِيْنَ عَنْهُ شَيْئًا حَتّٰى يَأْتِيَ بِهِنَّ

چار چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور بیت اللہ کا

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ارکانِ اسلام میں باہم بھی گہرا ربط ہے اگر ان میں ایک ڈھ ہو تو بقیہ میں بھی ضعف نمایاں ہونے لگتا ہے کیونکہ یہ ارکان جس طرح پورے قصر کو سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی سہارا دیتے ہیں اگر سب موجود ہوں تو پورے قصر کا وزن اپنے درمیان تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اس کا وزن صرف بقیہ ارکان پر آپڑتا ہے اور لازمی طور پر اس قصر کے لئے اور خود ان ستونوں کے لئے بھی خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے یہ تو ارکانِ ظاہری کا حال ہے۔ ارکانِ دین کا ربط اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان میں ایسا معنوی ربط ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ جزء بنا ہوا ہے ایک کی ادائگی سے دوسرے کی توفیق میسر ہوتی ہے اور ایک کے ترک کرنے سے دوسرے سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے صاحبِ نبوت کی اس پُر اسرار تشبیہ میں ارکانِ خمسہ کا باہمی رشتہ بھی داخل سمجھنا چاہئے اور اب اس تشبیہ کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ایک قصر کے لئے ستون ضروری ہے اسی طرح اسلام کے لئے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا ادا کرنا ضروری ہے اور جس طرح کسی محل کے بعض ستون گر جانے سے اس کے اور ستونوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اسی طرح کسی رکنِ اسلامی کے ترک سے اس کے بقیہ ارکان کو بھی نقصان ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قصر کے قائم رہنے کے لئے جتنے ستون درکار ہیں ان سب ہی کا ہونا ضروری ہے اگر ان میں ایک بھی نہ ہو تو بقیہ کا وجود چنداں مفید نہیں ہوتا۔ اب رہ گئی یہ بات کہ کس تعمیر کے لئے کتنے ستون ہونے چاہئیں پھر ان ستونوں میں اہمیت اور غیر اہمیت کا تناسب کیا ہونا چاہئے ان میں کس کو کس کی احتیاج زیادہ ہے۔ ان مراحل کو وہی انجنیر خوب سمجھ سکتا ہے جس نے یہ نقشۂ تعمیر تیار کیا ہے ہر ایک کے ادراک کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد جب آپ قرآن وحدیث پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ اکثر آیات میں ایک ہی جگہ ملے گا۔ احادیث میں چار وایان کا تذکرہ ساتھ نظر آئے گا۔ اسی ربط کے پیشِ نظر حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں" من لم یزك فلا صلوٰة له" (جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں۔) ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے شراب پی اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ دوسری حدیث میں ہے جو غلام اپنے آقاؤں سے بھاگ جائے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی احادیث بالا سے شراب نوشی اور اپنے مالک سے بیوفائی کا نماز سے بڑا گہرا ربط ثابت ہوتا ہے۔ اس ربط کا پورا پورا ادراک تو خدا تعالیٰ ہی کو ہے جس نے دین کا یہ قصر تیار کیا ہے اور وہی دراصل اس کے اصولِ تعمیری کا رازداں ہے۔ تاہم حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اور انسانی دماغ کے رسائی کی حد تک اسے خوب ہی سمجھا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عبادات درحقیقت عبدیت اور بندگی کی ایک عملی ٹریننگ ہے۔ عبدیت درحقیقت وہ صحیح رشتہ ہے جو بندہ اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے اور اس کے حقوق بتلانے آئے۔ باپ بیٹے، دوست دوست، ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ امتی اور رسول کا رشتہ بھی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان رشتوں میں تعدد کی گنجائش بھی ہے لیکن عبدیت اور معبودیت کا وہ تعلق ہے جو نہ باہمی مخلوق میں ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اثنینیۃ کی گنجائش ہے وہ صرف مخلوق اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے۔ اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک طرزِ ادا سے ہم کو

جَمِيعًا الصَّلٰوۃُ وَالزَّکٰوۃُ وَصِیَامُ رَمَضَانَ وَحَجُّ الْبَیْتِ رواہ احمد الحدیث مرسل رواہ الطبرانی فی الکبیر عن عمارۃ بن حزم وفی اسنادہ ابن لھیعۃ ایضا وقد ضعفوہ۔

ج۔ جو شخص ان میں تین ادا کرے وہ اس کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ سب نہ کرے۔ (مسند احمد)

رنگین بنانا بھی ہے اگر اس رشتہ کا تجزیہ کرو تو جو اس کے بڑے عنصر نظر آئیں گے وہ صرف دو ہیں اطاعت و محبت۔ ہر غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے سامنے ہمہ تن اطاعت ہو مگر وہ اطاعت نہیں جو ذوقِ محبت سے خالی ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ سے محبت کرے۔ مگر وہ محبت نہیں جس میں سرمو خلاف کی گنجائش باقی ہو، یہ دونوں فرائض بڑی حد تک بندوں کے ساتھ بھی مشترک ہیں۔ شریعت چاہتی ہے کہ ان مشترک فرائض کے درمیان ایک ایسا خطِ فاصل کھینچ دے جس کے بعد دونوں کی حدود میں کوئی اشتراک باقی نہ رہے اسی کا نام عبادت ہے۔ دشواری یہ ہے کہ انسان خطرۂ داغِ عبدیت برداشت نہیں کرتا اس لئے اس کے سامنے ایک ایسا آئین رکھا گیا ہے جسے وہ سمجھے پھر اس پر عمل پیرا ہو کر اس منزل تک پہنچ جائے۔ جہاں یہ داغِ عبدیت تاجِ خلافت کا سب سے آبدار موتی نظر آنے لگتا ہے اس لئے اُسے صرف سمجھایا نہیں گیا بلکہ عملی طور پر بھی ایسی ٹریننگ دی گئی جس کے اثر سے تدریجاً اس کی فطرت اطاعت و محبت کی خوگر ہوتی چلی جائے۔ سب سے پہلے مولیٰ حقیقی نے اپنے ایسے ایسے خوبصورت نام بتائے جن میں حسن و خوبی کا جلوہ بھی ہے اور حکومت و سلطنت کا دبدبہ بھی ساد رہیں حکم دیا کہ ہم ان ناموں سے اُسے پکارا کریں۔ اس کا نتیجہ نفسیاتی طور پر یہ ہونا چاہئے کہ اس کے حسن و جمال کا بے کیف و بے مثال نقش ہمارے دل پر جما چلا جائے اسی کے ساتھ اس کی بے پناہ قدرت و طاقت کا تسلط بھی قلب پر چھاتا چلا جائے اور ان اسماء کے لحاظ سے عبادات میں یہ تقسیم کردی کہ کچھ عبادتیں تو وہ رکھیں جو اس کی حکومت کا سکہ دل پر قائم کریں اور کچھ وہ جو اس کا جذبۂ محبت بھڑکائیں۔ اب اگر تم ذرا غور کرو گے تو اسلام کی عبادت میں نماز اور زکوٰۃ تمہیں پہلی قسم میں نظر آئیں گی اور روزہ و حج دوسری قسم میں۔ نماز و زکوٰۃ میں تمام تر بارگاہِ سلطنت و حکومت کا ظہور ہے اور روزہ و حج میں سرتاسر محبوبیت و جمال کا جلوہ۔ نماز کیا ہے حاضری کے ایک عام نوٹس کے بعد لباس و جسم کی صفائی، اس کے بعد کورٹ کی حاضری کے لئے تیاری، وکیل کا انتخاب، پھر کورٹ میں پہنچکر دست بستہ باادب قیام، دائیں بائیں دیکھنے، بات چیت کرنے، کھانے پینے، حتیٰ کہ بلاوجہ کھانسنے اور نظریں اٹھانے تک کی ممانعت، آخر میں بذریعہ وکیل درخواست پیش کرنا پھر باادب سلام کرکے رخصت ہو جانا۔ زکوٰۃ پر غور کیجئے تو اس میں بھی غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالہ کر دینا" سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے آئیں تو ان کو راضی کرکے واپس کرنا، اور جو وہ لینا چاہیں بے چون و چرا ان کے سپرد کر دینا

اب سوچو کہ اگر پانچ وقت اس طرح حاضری اور اتنی عاجزانہ جبہ سائی کی تا بعمر ٹریننگ حاصل کی جائے پھر سال بھر میں اپنا کمایا ہوا مال ایسی خاموشی اور بیچارگی سے سپرد کیا جائے تو کیا اس ذات کے ملکوت و جبروت کا نقش دل پر قائم نہیں ہوگا۔ جس کے پرشوکت اسماء پکارتے پکارتے اور یہ عاجزانہ عبادتیں کرتے کرتے عمر بسر ہوگئی ہے دوسری طرف اگر غور کرو تو محبت کا پہلا اثر کم خفتن، کم گفتن، کم خوردن ہی ہوتا ہے اس لئے اگر پہلے ہی قدم میں یہاں کوئی عاشق نہیں ہے تو یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس جمیلِ مطلق کی محبت کی عاشقانہ ادائیں ہی اختیار کرے، کھانا، پینا ترک کرے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی نیند خراب کرے اور ایک جگہ جمع ہو کر اس کلام کی ایک معقول مقدار سنا کرے جسے سن کر مردہ روحیں بھی تڑپنے لگتی ہیں۔ اگر

ایک ماہ کی اس ٹریننگ سے اس کے رنگ ڈھنگ طور و طریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہو گیا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ جب کھانے پینے، سونے، جاگنے اور دنیا کے دوسرے لذائذ میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانا چاہئے۔ یہاں زیب و زینت، ترک و احتشام درکار نہیں بلکہ سرتاسر ذل و افتقار، ہمہ تن عجز و انکسار، شکستہ حال و اشکبار، برہنہ پا و جاں نثار، غرضکہ سراپا دیوانہ وار بن کر چلنا مقصود ہے، یہی احرام کا خلاصہ ہے۔ پھر لق و دق میدانوں کی صحرا نوردی اور لطائف حقیقت کے سامنے چیخ و پکار یہی تلبیہ اور میدان عرفات کا قیام ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے گھر کے سامنے حاضری ہوتی ہے جس کا مکین کوئی نہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے حسن و جمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور دلہائے عشاق کو پاش پاش کئے دیتی ہیں۔ ایسے دل کش نظارہ کے موقعہ پر بے ساختہ وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو مجنوں نے دیار لیلیٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا اسی کا نام طواف ہے۔ شاید صوم و حج کے اسی ربط کی وجہ سے ماہ رمضان کے بعد ہی حج کے ایام شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر جذبۂ محبت اس سے بھی آگے ترقی کر جائے تو آخری منزل جہاد ہے ... یہ عشق و محبت کی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر محب صادق اور مدعی کاذب نکھر جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں جہاد کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے، اس میدان سے جو بھاگا وہ اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ پھر خدا و رسول کی محبت کا دم بھر سکے۔ اور جس نے ذرا کوئی کمزوری دکھائی اس پھر بیوفائی کا دھبہ لگے بغیر نہیں رہتا۔ اس میدان کا مصرف وہ ہے جو اپنی موت کو اپنی زیست پر ترجیح دیتا نظر آئے۔ دشمن کی تلوار کی چمک اس کو اتنی محبوب ہو جائے کہ سو جان سے اُسے گلے لگانے کی آرزو ہو اور وہ بڑے جذبہ کے ساتھ یہ کہتا ہوا خدا کی راہ میں قربان ہو جائے ؎

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد   من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

یہ وہ عاشق صادق ہے کہ جب اس طرح پروانہ وار اپنی جان دیدیتا ہے تو قرآن کو اسے ..... مردہ کہنے پر غیرت آتی ہے وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگرچہ تمہیں اس کی زندگی اور اس زندگی کے مقام بلند کا شعور نہیں۔

مولانا مرحوم کے اس نقشہ کے مطابق نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ ربط واضح ہو جاتا ہے۔ اگر یہ چاروں عبادتیں اس تصور سے ادا ہوتی رہیں تو ممکن نہیں کہ اطاعت و محبت کی دونوں شانیں جو ایک عبد کے لئے مطلوب ہیں پیدا نہ ہو جائیں، ہمارے فقہاء نے بھی بڑی حد تک اس کو سمجھا ہے اور شاید اسی لئے قضا نمازوں کی ترتیب ساقط ہونے کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ پوری پانچ نمازیں قضا ہو جائیں بظاہر ایک دن کی پانچ نمازوں میں کوئی ایسا ربط پنہاں ہے کہ یہ پانچ گویا ایک ہی نماز ہے اور اسی لئے اگر کسی شخص کی چار نمازیں فوت ہو جائیں تو اُسے ان کو بالترتیب قضا کرنا چاہئے شافعیہ نے حالت سفر میں دو دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کی اجازت دی ہے مگر یہ اجازت نہیں دی کہ پانچ میں سے جن دو کو چاہے جمع کرلے بلکہ صرف ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ جمع کرنا تجویز کیا ہے۔ شاید یہ بھی ان نمازوں کے کسی معنوی تناسب پر مبنی ہے۔ قاضی ابو الولید الباجی جملۂ حدیث " وانتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ " کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سلف ظہر کے بعد عصر اور مغرب کے بعد عشاء کا انتظار کیا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی ربط پر مبنی تھا۔ روزے کے باب میں جنون کے پورے ماہ یا اس کے کسی ایک حصہ میں ہونے کی بحث بھی شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پورے ایک ماہ کے روزوں کو بظاہر کوئی معنوی ربط حاصل ہے۔ ماہ رمضان کی تین عشروں پر تقسیم بھی ہر عشرہ کے کسی معنوی ربط کا پتہ دیتی ہے اور آخر عشرہ کی اکائیوں میں بھی شاید کوئی

اوثق عری الایمان

(۲۵۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَدْرُوْنَ اَیُّ عُرَی الْاِیْمَانِ اَوْثَقُ قُلْنَا الصَّلٰوۃُ قَالَ الصَّلٰوۃُ حَسَنَۃٌ وَلَیْسَتْ بِذَاکَ قُلْنَا الصِّیَامُ فَقَالَ مِثْلَ ذَالِکَ حَتّٰی ذَکَرْنَا الْجِہَادَ فَقَالَ مِثْلَ ذَلِکَ ثُمَّ قَالَ اَوْثَقُ عُرَی الْاِیْمَانِ الْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْمُعَادَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ اخرجہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس و الطیالسی عن البراء۔

اسلام میں سب سے مضبوط عمل

(۲۵۰) براء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو ایمان میں سب سے مضبوط عمل کون سا ہے؟ ہم نے عرض کیا نماز۔ فرمایا بیشک نماز کا تو کیا کہنا ہے لیکن اس کا دائرہ دوسرا ہے ہم نے عرض کیا تو پھر روزے، آپ نے اس پر بھی۔ یہی فرمایا یہاں تک کہ ہم نے جہاد کا نام لیا تو اس پر بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اس کے بعد کہا سب سے مضبوط عمل یہ ہے کہ خدا ہی کے لئے دوستی اور خدا ہی کے لئے دشمنی، اسی کے نام پر محبت اور اسی کے نام پر بغض رکھنا۔ (طبرانی مسند ابوداود طیالسی)

ایسی خصوصیت پنہاں ہے کہ لیلۃ القدر اُن ہی میں رکھی گئی ہے۔ بہرحال جب حوادثِ عالم کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی کسی اندرونی نظام کے ماتحت رونما ہوتی ہیں تو پھر احکامِ شریعت کو اتنا بے ربط کیوں سمجھا جائے اس موضوع پر غور کرنے کے لئے طبعی دلچسپی کی ضرورت ہے۔ فرصت نکالئے اور ان موتیوں کے حاصل کرنے کے لئے حدیث و قرآن کے سمندر میں غوطہ لگائیے گوہرِ مقصود مل جائے گا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر صرف تمسخر اور استہزاء کرنا علم کا راستہ نہیں۔

(۲۵۰) حدیث و قرآن میں فرائض و ارکان کو زیرِ بحث لایا ہی نہیں گیا۔ اُن کی اہمیت تو اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہاں وہ اعمال جو کسی سبب سے ارکان قرار نہیں دیئے گئے۔ لیکن بہ حقیقت رکنیت کا مقام رکھتے ہیں ان کو اس لئے ابھارا جاتا ہے کہ عام نظریں ان کا شمار ارکانِ اسلام میں نہ دیکھ کر کہیں ان اعمال کو نظر انداز نہ کر دیں ہمارے خیال میں یہ اعمال اکثر وہ ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ہے۔ بعض اجتماعی عمل اتنے اہم ہوتے ہیں کہ بہت سے انفرادی فرضوں کی ادائیگی اُن اعمال پر موقوف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا اپنا مقام دیکھا جائے تو اگرچہ اسکی حیثیت فرض و رکن کی نہیں ہوتی لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کا مرتبہ ہو تا ہی جو قالب کیلئے قلب کا اور جسم کیلئے روح کا۔ از انجملہ خدا کے لئے محبت و عداوت کا عمل ہے۔ احادیث میں اسلام کے اس شعبہ کو کمالِ ایمانی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ فضیلتِ اسلام کی حدیثوں میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جنت میں جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باہمی محبت پیدا نہ ہو جائے۔ اس

محبت سے مراد یہی پُرخلوص محبت ہے۔ مسلمانوں کا تنہا یہ عمل ان کے تمام دین کے ارکان کی ادائیگی میں جتنا ممد و معاون ہو سکتا ہے ظاہر ہے نماز سے لیکر جہاد تک معاملات سے مسائلِ امامت و سیاست تک کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہی وہ مرد و تقی ہے جو بہت سے اجتماعی امراض کا علاج اور بہت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب بھی ہے۔ حدیثوں میں مختصر مختصر ایسے اعمال بتا دیئے گئے ہیں جو امتِ امیہ کو اجتماعی اور انفرادی زندگی کی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جب یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں تو بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین ادا کرنے کی فرصت میسر آجاتی ہے۔ لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ ایسا پرپیچ بن جاتا ہے کہ انسان عبادتِ خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے مشغلہ میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اللّٰھم صلِ علیٰ سیّدنا و مولانا محمدٍ و علیٰ اٰلِ سیّدنا و مولانا محمدٍ واصحابِ سیّدنا و مولانا محمدٍ و بارک وسلم

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے

البقرة : ۱۴۳

علماءِ دیوبند (رحمہم اللہ تعالیٰ)

کا

دینی رُخ اور مسلکی مزاج

آخری تصنیف

حکیم الاسلام حضرۃ مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہ

(مہتمم دار العلوم دیوبند)

اِدارۂ اِسلامیات

۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

(۲۴۶) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ رَجُلًا اَتَى ابْنَ عُمَرَ فَقَالَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مَا حَمَلَكَ عَلٰى اَنْ تَحُجَّ عَامًا وَتَعْتَمِرَ عَامًا وَتَتْرُكَ الْجِهَادَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ عَلِمْتَ مَا رَغَّبَ اللّٰهُ فِيْهِ قَالَ يَا ابْنَ اَخِيْ بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ اِيْمَانٍ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالصَّلٰوةِ الْخَمْسِ وَصِيَامِ رَمَضَانَ وَاَدَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ قَالَ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَلَا تَسْمَعُ مَا ذَكَرَ اللّٰهُ فِيْ كِتَابِهٖ وَاِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا - اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ قَالَ فَعَلْنَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ الْاِسْلَامُ

(۲۴۶) نافع سے یوں روایت ہے کہ ایک شخص ابن عمرؓ کے پاس آیا اور کہا اے ابوعبدالرحمٰن (ان کی کنیت ہے) کیا وجہ کہ آپ حج اور عمرہ تو ہر سال کرتے ہیں اور جہاد فی سبیل اللہ نہیں کرتے حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی کیسی ترغیب دلائی ہے۔ ابن عمرؓ نے جواب دیا اے بھائی اسلام تو پانچ چیزوں کا نام ہے (۱) اللہ کی توحید اور رسول کی تصدیق (۲) پنج وقتہ نماز (۳) رمضان کے روزے (۴) زکوٰۃ (۵) بیت اللہ کا حج (اور آج کل جو لڑائی ہے اس میں شریک ہونا کچھ اسلام کا جزء نہیں جو نہ کرنے سے کچھ نقصان ہو) اس نے کہا اے ابوعبدالرحمٰن کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہیں مانتے وان طائفتان الخ یعنی اگر مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو (آخر آیت تک) دوسری جگہ ارشاد ہے کفار سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ ابن عمرؓ نے کہا ہم نے حضرت کے زمانہ میں جب اسلام کم تھا ایسا ہی کیا (جو شخص فتنہ

ضوابط کے شکنجوں میں کھینچا گیا تو اب یہی ایک لاینحل معمہ بن کر رہ گئی کہ اعمال ایمان کے اجزاء ہیں یا صرف اس کی تکمیل کا سامان اسی پر یہ بحث قائم ہو گئی کہ ایمان اب بسیط رہا یا مرکب پھر اعمال کی ضرورت اگر رہی تو کس درجہ ان مباحث نے یہاں تک طول پکڑا کہ مستقل مذاہب بن گئے اور ہزاروں اوراق صرف ہو جانے کے بعد بھی روشنی پھر اس سے زیادہ پیدا نہ ہو سکی جو اس مثال میں موجود ہے۔

(۲۴۶) حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ ایک خدائے وحدہ لاشریک کے سامنے عبادت کے لئے سرنگوں ہو جانا۔ اب اگر دین اسلام کا تجزیہ کرو تو اس میں چند قسم کے احکام پاؤ گے۔ (۱) وہ احکام جو سب پر یکساں واجب ہیں۔ (۲) وہ احکام جو خاص خاص افراد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم میں ایک بڑا حصہ صرف فرض علی الکفایہ ہے۔ ہر شخص پر واجب نہیں جیسا کہ جہاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر، امارت، حاکم، قاضی، مفتی، شہادۃ وغیرہ ان سب کا تعلق خاص مصالح اور عارضی اسباب سے وابستہ ہے۔ فرض کرو اگر یہ مصالح ہماری نقل و حرکت کے بغیر حاصل ہو جائیں تو یہ احکام واجب نہیں رہتے۔ اسی طرح حدود وغیرہ کے ابواب ہیں ان کا تعلق بھی چند جرائم کے ساتھ ہے۔ اگر اس کا انسداد ہو جائے تو ان ابواب کی حاجت بھی نہیں رہتی۔ دین کا دوسرا حصہ وہ ہے جس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جیسا کہ قرض کی ادائگی، غصب و عاریت، ودیعت و امانت وغیرہ یہ تمام ابواب انسانوں کے حقوق کے تحفظ اور مظلوم کی دادرسی کے لئے ہیں اگر صاحب حق معاف کردے تو یہ ابواب بھی معطل ہو جاتے

قَلِيلاً فَكَانَ الرَّجُلُ يُفْتَنُ فِي دِينِهِ إِمَّا قَتَلُوهُ وَإِمَّا يُعَذِّبُوهُ حَتَّى كَثُرَ الْإِسْلَامُ فَلَمْ تَكُنْ فِتْنَةٌ الحديث (رواه البخاری فی التفسیر (ص ۶۴۸)

(۲۴۷) عَنْ أَبِي سُوَيْدٍ الْعَبْدِيِّ قَالَ أَتَيْنَا ابْنَ عُمَرَ فَجَلَسْنَا بِبَابِهِ لِيُؤْذَنَ لَنَا قَالَ فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ قَالَ فَقُمْتُ إِلَى جُحْرٍ فِي الْبَابِ فَجَعَلْتُ أَطَّلِعُ فِيهِ فَفَطِنَ بِي فَلَمَّا أَذِنَ لَنَا جَلَسْنَا فَقَالَ أَيُّكُمُ اطَّلَعَ آنِفًا فِي دَارِي قَالَ قُلْتُ أَبْطَأَ عَلَيْنَا الْإِذْنُ فَنَظَرْتُ فَلَمْ أَتَعَمَّدْ ذَالِكَ قَالَ ثُمَّ سَأَلُوهُ عَنْ أَشْيَاءَ فَقَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللّٰهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ

اٹھاتا اس کو مار دیا جاتا یا تکلیف دی جاتی) یہاں تک کہ اسلام بکثرت پھیل گیا اور کوئی فتنہ باقی نہ رہا۔

(۲۴۷) ابو سوید عبدی بیان کرتے ہیں کہ ہم ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دروازے پر بیٹھ گئے تاکہ اجازت ہو جائے (تو اندر داخل ہوں) اجازت میں کچھ دیر ہوئی تو میں دروازے میں ایک سوراخ کے اندر سے جھانکنے لگا وہ میری اس حرکت کو تاڑ گئے جب ہمیں اجازت مل گئی اور ہم بیٹھ گئے تو انھوں نے فرمایا ابھی ابھی میرے گھر میں تم میں کس نے جھانکا تھا میں نے عرض کیا کہ اجازت ملنے میں دیر ہو گئی تھی اس لئے میں نے جھانکا تھا (تاکہ تاخیر کا سبب معلوم ہو) جھانکنا مقصود نہ تھا اس کے بعد پھر اُن سے بعض اور باتیں دریافت کیں انھوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت پر، نماز پڑھنے،

ہیں، صلۂ رحمی، حقوقِ زوجیت، حقوقِ اولاد، پڑوسی، شریک، فقیر وغیرہ ان احکام کا تعلق بھی سب کے ساتھ نہیں بلکہ خاص خاص افراد سے ہے وہ بھی خاص خاص اوقات میں اسی طرح شریعت کے بقیہ ابواب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال جائیے اور غور کر کیجئے کہ اب وہ کون سے احکام ہیں جو ہر ہر فرد پر واجب ہیں اور کسی وقتی مصلحت پر بھی مبنی نہیں۔ اور انسان کے انقیادِ ظاہری و باطنی کا ایک مکمل ثبوت بھی ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ یہی مبانیٔ خمسہ ہیں۔ اسی لئے حدیثِ مذکور میں صرف ان پانچ ہی کو اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

اس حدیث میں ابن عمرؓ کو جس جنگ کی شرکت کی دعوت دی جا رہی ہے وہ عبداللہ بن زبیرؓ کی خلافت پر جنگ کا واقعہ ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کا جواب یہاں کتنا عبرت آموز اور کتنا قیمتی ہے کہ کفار سے جنگ فتنہ فرو کرنے کے لئے ہوتی ہے اور مسلمانوں سے جنگ فتنہ پیدا کرنے کے لئے۔ تم جس آیت کو میری تردید کے لئے پڑھ رہے ہو در حقیقت وہی میری تائید کے لئے ہے اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابن عمرؓ کا اس حدیث سنانے سے مقصد یہ نہیں تھا کہ جہاد فرضِ عین نہیں جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے (دیکھو عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۴۳) بلکہ وہ اُسی حقیقت کی طرف اشارہ فرما رہے تھے جس کو حافظ ابن تیمیہؒ نے مذکورہ بالا بیان میں مفصل طور پر ذکر کیا ہے۔

(۲۴۷) اسلام میں کسی غیر شخص کے گھر میں جھانکنے کی ممانعت کی گئی تھی اس لئے حضرت ابن عمرؓ نے

وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ وَصِيَامِ رَمَضَانَ قُلْتُ يَا اَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ مَا تَقُوْلُ فِي الْجِهَادِ قَالَ مَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ (ومن طريق اخر) قَالَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ وَالْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ الْجِهَادُ حَسَنٌ هٰكَذَا حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلم الاولى اخرجها احمد وعبدالرزاق والثانية الشيخان والنسائی والترمذی والطبرانی۔

(۲۴۸) عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَرَجَ بِالنَّاسِ قِبَلَ غَزْوَةِ تَبُوْكَ فَلَمَّا اَنْ اَصْبَحَ صَلّٰى بِالنَّاسِ صَلٰوةَ الصُّبْحِ ثُمَّ اِنَّ النَّاسَ رَكِبُوْا فَلَمَّا اَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ نَعَسَ النَّاسُ فِيْ اَثَرِ الدُّلْجَةِ وَلَزِمَ مُعَاذٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتْلُوْ اَثَرَهٗ وَالنَّاسُ تَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ عَلٰى جَوَادِّ الطَّرِيْقِ تَاْكُلُ وَتَسِيْرُ فَبَيْنَمَا مُعَاذٌ عَلٰى اَثَرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ

زکوٰۃ دینے، بیت اللہ کا حج، اور رمضان کے روزے رکھنے پر، ہم نے عرض کیا اے ابو عبد الرحمٰن اور جہاد کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں، فرمایا جو کوئی جہاد کرے گا وہ اپنے ہی نفع کے لئے کرے گا۔ دوسرے طریقے میں ہے ایک شخص نے ان سے پوچھا اور جہاد فی سبیل اللہ کیسا ہے فرمایا اچھا ہے (مگر) ہم سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح بیان کیا تھا۔ (احمد۔ عبد الرزاق)

(۲۴۸) معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو غزوۂ تبوک کے لئے لے کر نکلے۔ جب صبح ہوگئی تو آپ نے ان کو صبح کی نماز پڑھائی۔ لوگ نماز پڑھ کر پھر سوار ہوگئے جب آفتاب نکلا تو سب لوگ شب کی بیداری کی وجہ سے اونگھ رہے تھے۔ ایک معاذ تھے جو برابر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے لگے چلے آرہے تھے بقیہ لوگوں کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور بڑی شاہراہوں پر انھیں لے کر تتر بتر ہوگئیں تھیں۔ اسی دوران میں کہ معاذ کی اونٹنی بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے کبھی چرتی اور کبھی چلتی جارہی

ان کے بیٹھتے کے ساتھ ہی پہلے اس خلافِ شرع حرکت پر ان کو ٹوکا، آخر انھیں معذرت کرنی پڑی۔ اس سے زیادہ پیچھے پڑنا طریقِ دعوت و حکمت کے خلاف تھا اس لئے یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ ان کا یہ عذر بھی شرعی طور پر کافی نہیں تھا۔ اس پر ابن عمرؓ نے کیسے سکوت کرلیا۔ الفاظِ بالا سے یہ اور صاف ہوگیا کہ ابن عمرؓ کا منشا صرف اتنا تھا کہ ان کے زمانہ کا جہاد ارکانِ خمسہ کے ہم پلہ نہیں ہے۔ ایسے فتنوں کے موقعوں پر اس سے زیادہ صفائی سے بات کہنا بھی فتنہ کا موجب تھا اس لئے ابن عمرؓ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوگئے، مانا کہ جہاد بہت اچھا عمل ہے مگر جو حدیث میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے وہ اتنی ہی ہے اس میں جہاد کا ذکر نہیں ہے اس لئے تم مجھے اس جہاد کی شرکت پر مجبور نہیں کر سکتے اور میں اس سے علیحدہ رہ کر معذور رہ سکتا ہوں۔

(۲۴۸) اس حدیث میں کلمۂ شہادت کے لئے "رأس" اور نماز کے لئے "قوام" اور جہاد کے لئے "ذروہ" کا لفظ

صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنَاقَتَهُ تَاكُلُ مَرَّةً وَتَسِيرُ أُخْرَى عَثَرَتْ نَاقَةُ مُعَاذٍ فَكَبَحَهَا بِالزِّمَامِ فَهَبَّتْ حَتَّى نَفَرَتْ مِنْهَا نَاقَةُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ إِنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَشَفَ عَنْهُ قِنَاعَهُ فَالْتَفَتَ فَإِذَا لَيْسَ مِنَ الْجَيْشِ رَجُلٌ أَدْنَى إِلَيْهِ مِنْ مُعَاذٍ فَنَادَاهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا مُعَاذُ قَالَ لَبَّيْكَ يَا نَبِيَّ اللهِ قَالَ اُدْنُ دُونَكَ فَدَنَا مِنْهُ حَتَّى لَصِقَتْ رَاحِلَتُهُمَا إِحْدَاهُمَا بِالْأُخْرَى فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا كُنْتُ أَحْسِبُ النَّاسَ مِنَّا كَمَكَانِهِمْ مِنَ الْبُعْدِ فَقَالَ مُعَاذٌ يَا نَبِيَّ اللهِ نَعَسَ النَّاسُ فَتَفَرَّقَتْ بِهِمْ رِكَابُهُمْ تَرْتَعُ وَتَسِيرُ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَنَا كُنْتُ نَاعِسًا فَلَمَّا رَأَى مُعَاذٌ بُشْرَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَيْهِ وَخَلْوَتَهُ لَهُ قَالَ يَا رَسُولَ اللهِ ائْذَنْ لِي أَسْأَلْكَ عَنْ كَلِمَةٍ قَدْ أَمْرَضَتْنِي وَأَسْقَمَتْنِي وَأَحْزَنَتْنِي فَقَالَ نَبِيُّ اللهِ سَلْنِي عَمَّ شِئْتَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللهِ حَدِّثْنِي

تھی دفعۃً ٹھوکر کھائی، معاذؓ نے اس کو لگام کھینچ کر سنبھالا تو وہ اور تیز ہوگئی یہاں تک کہ اس کی وجہ سے آپ کی اونٹنی بھی بدک گئی۔ آپ نے اپنا نقاب اٹھایا دیکھا تو لشکر بھر میں معاذ سے زیادہ کوئی اور شخص آپ کے قریب نہ تھا آپ نے ان کو آواز دی اے معاذؓ، انھوں نے جواب دیا یا نبی اللہ میں حاضر ہوں فرمایا اور قریب آجاؤ، وہ قریب آگئے اور اتنے قریب آگئے کہ دونوں کی سواریاں ایک دوسرے سے بالکل مل گئیں آپ نے فرمایا میرا یہ خیال نہیں تھا کہ لوگ مجھ سے اتنی دور ہوں گے۔ معاذؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ لوگ کچھ اونگھ رہے تھے (اس لئے) ان کی سواریاں چرتی رہیں اور چلتی رہیں اور اِدھر اُدھر اُنھیں لے کر متفرق ہوگئیں، آپ نے فرمایا میں بھی اونگھ رہا تھا، معاذؓ نے جب دیکھا کہ آپ اُن سے خوش ہیں اور موقعہ بھی تنہائی کا ہے تو عرض کیا یا رسول اللہ اجازت دیجئے تو ایک بات پوچھوں جس نے مجھے بیمار ڈال دیا ہے اور غمزدہ بنا رکھا ہے، آپ نے فرمایا اچھا جو چاہتے ہو پوچھو، عرض کیا یا رسول کوئی ایسا کام بتا دیجئے جو مجھے جنت میں لیجائے

استعمال کیا گیا ہے۔ ترمذی کی روایت میں یہاں کچھ اور اعمال کا بھی ذکر ہے۔ ان الفاظ سے بڑھ کر ان عبادتوں کی حقیقتوں کی ترجمانی کے لئے دوسرے الفاظ میسر نہیں آسکتے۔ الفاظ بالا میں توحید و رسالت کو سر کہا گیا ہے، شہادتین کی حقیقت سمجھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور لفظ نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان کا سر کٹ جائے تو اس کی روح نکل جاتی ہے اور وہ صرف ڈھانچا ہی ڈھانچا رہ جاتا ہے؛ اسی طرح کلمۂ شہادت کو سمجھنا چاہئے اگر یہ نہ ہو تو بڑے سے بڑا عمل بھی صرف ایک ڈھانچا ہے جس میں کوئی روح نہیں۔ نماز کو قوام اس لئے کہا گیا ہے کہ نماز دیکھنے میں گو ایک ہی عبادت ہے مگر جملہ عبادات کی روح اس میں موجود ہے۔ اس میں زکوٰۃ کا مفہوم بھی ہے اور صوم کا صبر بھی۔ نفس اور حج کی طرح حریم مقصود کے گرد طواف بھی۔ جس نے اس عبادت کو چھوڑا اس نے گویا سب عبادتوں کو چھوڑ دیا۔ قرآن کہتا ہے

بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِي الْجَنَّةَ لَا اَسْأَلُكَ عَنْ شَيْءٍ غَيْرِهَا قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَخٍ بَخٍ
لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِيْمٍ لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِيْمٍ ثَلَاثًا وَاِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهِ الْخَيْرَ فَلَمْ
يُحَدِّثْهُ بِشَيْءٍ اِلَّا قَالَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ يَعْنِيْ اَعَادَهُ عَلَيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ حِرْصًا لِكَيْمَا يُتْقِنَهُ عَنْهُ
فَقَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتَعْبُدُ اللّٰهَ
وَحْدَهٗ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا حَتّٰى تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰى ذَالِكَ فَقَالَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اَعِدْ لِيْ فَاَعَادَهَا
لَهٗ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُكَ يَا مُعَاذُ
بِرَاْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَذِرْوَةِ السَّنَامِ فَقَالَ بِاَبِيْ وَاُمِّيْ اَنْتَ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ فَحَدِّثْنِيْ فَقَالَ
نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ رَاْسَ هٰذَا الْاَمْرِ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ
لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ قِوَامَ هٰذَا الْاَمْرِ اِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ
الزَّكٰوةِ وَاَنَّ ذِرْوَةَ السَّنَامِ مِنْهَا الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ

اس کے سوا میں آپ سے اور کچھ نہیں پوچھوں گا، آپ نے فرمایا بہت خوب بہت خوب تم نے بڑی بات پوچھی
تین بار فرمایا ہاں جس کے لئے خدا بھلائی کا ارادہ کرے اس کیلئے کچھ اتنی دشوار بھی نہیں. کوئی بات آپ نے ان سے
نہیں فرمائی جو تین بار نہ دہرائی ہو، اس شوق میں کہ وہ آپ کی بات خوب پختہ یاد کرلیں، آپ نے فرمایا
اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھو، نماز پڑھا کرو۔ اللہ کی عبادت کیا کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ،
یہاں تک کہ اسی حال پر تمہاری موت آجائے! انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ پھر ارشاد فرمایئے، آپ نے ان
کی خاطر تین بار فرمایا اس کے بعد آپ نے فرمایا اگر چاہو تو اس دین کے اونچے عملوں میں جو چوٹی کا عمل ہے اور
جو اس کی جڑ ہے وہ تمہیں بتا دوں انھوں نے عرض کیا میرے ماں' باپ آپ پر قربان بتایئے آپ نے فرمایا
سب میں جڑ کا عمل تو یہ ہے کہ تو اس کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں جو تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک
نہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندہ اور رسول ہیں۔ اور جس عمل سے دین کی بندش مضبوط رہتی ہے وہ
نماز پڑھنا اور زکوۃ دینا ہے اور اس کے اونچے اونچے عملوں میں سب سے چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے مجھے

ان الصلوۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر۔ "نماز بیحیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے" اور اسی لئے دوسری جگہ اعلان ہے
فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوۃ واتبعوا الشھوات: پھر ان کے بعد ان کے جانشین نااہل پیدا
ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ یہاں اضاعۃ صلوۃ کو اتباعِ شہوات کا پیش خیمہ
قرار دیا گیا ہے۔ اسی لئے عمر فاروق رضؓ نے اپنی قلمرو میں یہ حکم لکھ بھیجا تھا کہ نمازوں کی نگرانی رکھو جو شخص نمازوں کو ضائع کرے گا،
اس کے بقیہ دین کا بھی خدا حافظ ہے۔ جہاد کو ذروۃ اس لئے کہا گیا ہے کہ اونٹ میں کوہان پھر کوہان میں چوٹی سب سے
نمایاں اور اونچی چیز ہوتی ہے اسی طرح اسلام میں وہ سب سے اونچا عمل جو خود بھی سب سے زیادہ نمایاں اور اسلام کو بھی سب سے زیادہ نمایاں کرنے

حَتّٰی یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَیَشْھَدُوْا اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَعَصَمُوْا دِمَاءَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَحِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ مَا شَحَبَ وَجْہٌ وَّلَا اغْبَرَّتْ قَدَمٌ فِیْ عَمَلٍ تُبْتَغٰی فِیْہِ دَرَجَاتُ الْجَنَّۃِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ الْمَفْرُوْضَۃِ کَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا ثَقُلَ مِیْزَانَ عَبْدٍ کَدَابَّۃٍ تُنْفَقُ لَہٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ یُحْمَلُ عَلَیْھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (رواہ احمد والبزار والنسائی وابن ماجۃ والترمذی وقال حدیث حسن صحیح وحدیث الباب اسنادہ جید وشھر بن حوشب وثقہ ابن معین والامام احمد وغیرھما۔

الارتباط بین ارکان الاسلام

(۲۴۹) عَنْ زِیَادِ بْنِ نُعَیْمٍ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ اس وقت تک برابر جاری رکھوں جب تک کہ لوگ نماز نہ پڑھیں زکوۃ نہ دیں اور اس بات کی شہادت نہ دیں کہ معبود کوئی نہیں مگر اللہ جو تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں جب یہ باتیں کرلیں تو وہ خود بھی بچ گئے اور اپنی جان و مال کو بھی بچا لیا مگر ہاں جو ضابطہ میں ہو اور اس کے بعد اُن کا حساب خدا کے سپرد ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے کوئی چہرہ (عمل کرتے کرتے) متغیر نہیں ہوا اور کوئی قدم (سفر کرتے کرتے) غبار آلود نہیں ہوا۔ کسی ایسے عمل میں جس کا مقصد درجات جنت ہوں فرض نماز کے بعد جہاد فی سبیل اللہ کے برابر اور نہ بندہ کے میزانِ عمل میں کوئی نیکی اتنی وزن دار ثابت ہوئی جتنا کہ اس کا وہ جانور جو جہاد فی سبیل اللہ میں مر گیا یا وہ جو اس نے راہِ خدا میں کسی کو دے ڈالا۔

ارکانِ اسلام کا باہمی ربط

(۲۴۹) زیاد بن نعیم سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، چار

---

(۲۴۹) ابن عمرؓ کی حدیثِ مذکورہ سے یہ تو سب ہی نے سمجھا کہ ارکانِ خمسہ اور مجموعہ دین کا وہ رشتہ ہے جو ایک قصر اور اس کے ستونوں کا ہوتا ہے اگر ارکانِ اسلام نہ ہوں تو دین کا قصر بھی گر جائے مگر خود ان ارکان کے درمیان رشتہ کیا ہے، اِدھر کسی کا ذہن نہ گیا۔ اس نکتہ کی طرف حافظ ابن رجب کی نظر پہنچی ہے وہ اس حدیث کی شرح

اَرْبَعٌ فَرَضَهُنَّ اللّٰهُ فِی الْاِسْلَامِ فَمَنْ جَاءَ بِثَلَاثٍ لَمْ یُغْنِیْنَ عَنْهُ شَیْئًا حَتّٰی یَاْتِیَ بِهِنَّ

چار چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض قرار دیا ہے۔ نماز، زکوٰۃ، روزے اور بیت اللہ کا

کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ارکانِ اسلام میں باہم بھی گہرا ربط ہے اگر ان میں ایک نہ ہو تو بقیہ میں بھی ضعف نمایاں ہونے لگتا ہے کیونکہ یہ ارکان جس طرح پورے قصر کو سنبھالے ہوئے ہوتے ہیں اسی طرح ایک دوسرے کو بھی سہارا دیتے ہیں اگر سب موجود ہوں تو پورے قصر کا وزن اپنے درمیان تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اس کا وزن صرف بقیہ ارکان پر آپڑتا ہے اور لازمی طور پر اس قصر کے لئے اور خود ان ستونوں کے لئے بھی خطرہ پیدا ہونے لگتا ہے یہ تو ارکانِ ظاہری کا حال ہے۔ ارکانِ دین کا ربط اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ان میں ایسا معنوی ربط ہے کہ ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ جزء بنا ہوا ہے ایک کی ادائگی سے دوسرے کی توفیق میسر ہوتی ہے اور ایک کے ترک کرنے سے دوسرے سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے صاحبِ نبوت کی اس پُر اسرار تشبیہ میں ارکانِ خمسہ کا باہمی رشتہ بھی داخل سمجھنا چاہئے اور اب اس تشبیہ کا خلاصہ یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح ایک قصر کے لئے ستون ضروری ہے اسی طرح اسلام کے لئے نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا ادا کرنا ضروری ہے اور جس طرح کسی محل کے بعض ستون گرجانے سے اس کے اور ستونوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے اسی طرح کسی رکنِ اسلامی کے ترک سے اس کے بقیہ ارکان کو بھی نقصان ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قصر کے قائم رہنے کے لئے جتنے ستون درکار ہیں ان سب ہی کا ہونا ضروری ہے اگر ان میں ایک بھی نہ ہو تو بقیہ کا وجود چنداں مفید نہیں ہوتا۔ اب رہ گئی یہ بات کہ کس تعمیر کے لئے کتنے ستون ہونے چاہئیں پھر ان ستونوں میں اہمیت اور غیر اہمیت کا تناسب کیا ہونا چاہئے ان میں کس کو کس کی احتیاج زیادہ ہے۔ ان مراحل کو وہی انجینیر خوب سمجھ سکتا ہے جس نے یہ نقشۂ تعمیر تیار کیا ہے ہر ایک کے ادراک کی بات نہیں ہے۔ اس کے بعد جب آپ قرآن و حدیث پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ اکثر آیات میں ایک ہی جگہ ملے گا۔ احادیث میں چار و ایمان کا تذکرہ ساتھ نظر آئے گا۔ اسی ربط کے پیشِ نظر حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں" من لم یزك فلا صلوٰۃ لہ" (جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز بھی قبول نہیں۔) ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ جس نے شراب پی اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوتیں۔ دوسری حدیث میں ہے جو غلام اپنے آقاؤں سے بھاگ جائے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی احادیثِ بالا سے شراب نوشی اور اپنے مالک سے بیوفائی کا نماز سے بڑا گہرا ربط ثابت ہوتا ہے۔ اس ربط کا پورا پورا ادراک تو خدا تعالیٰ ہی کو ہے جس نے دین کا یہ قصر تیار کیا ہے اور وہی دراصل اس کے اصولِ تعمیری کا رازداں ہے۔ تاہم حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اور انسانی دماغ کے رسائی کی حد تک اسے خوب ہی سمجھا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عبادات درحقیقت عبدیت اور بندگی کی ایک عملی ٹریننگ ہے۔ عبدیت درحقیقت وہ صحیح رشتہ ہے جو بندہ اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہے جتنے آسمانی دین آئے وہ اسی رشتہ کو سمجھانے اور اس کے حقوق بتلانے آئے۔ باپ بیٹے، دوست دوست، ہمسایہ ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ امتی اور رسول کا رشتہ بھی ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان رشتوں میں تعدد کی گنجائش بھی ہے لیکن عبدیت اور معبودیت کا وہ تعلق ہے جو نہ باہمی مخلوق میں ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اثنینیۃ کی گنجائش ہے وہ صرف مخلوق اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے۔ اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک طرز ادا سے ہم کو

جَمِيعاً الصَّلوٰةُ وَالزَّكوٰةُ وَصِيَامُ رَمَضَانَ وَحَجُّ الْبَيْتِ رواہ احمد الحدیث مرسل رواہ الطبرانی فی الکبیر عن عمارۃ بن حزم وفی اسنادہ ابن لھیعۃ ایضا وقد ضعفوہ۔

ج۔ جو شخص ان میں تین ادا کرے وہ اس کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتیں تاوقتیکہ سب نہ کرے۔ (مسند احمد)

رنگین بنانا بھی ہے اگر اس رشتہ کا تجزیہ کرو تو جو اس کے بڑے عنصر نظر آئیں گے وہ صرف دو ہیں اطاعت و محبت۔ ہر غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے سامنے ہمہ تن اطاعت ہو مگر وہ اطاعت نہیں جو ذوق محبت سے خالی ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ سے محبت کرے۔ مگر وہ محبت نہیں جس میں سرمو خلاف کی گنجائش باقی ہو، یہ دونوں فرائض بڑی حد تک بندوں کے ساتھ بھی مشترک ہیں، شریعت چاہتی ہے کہ ان مشترک فرائض کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دے جس کے بعد دونوں کی حدود میں کوئی اشتراک باقی نہ رہے اسی کا نام عبادت ہے۔ دشواری یہ ہے کہ انسان خطرۂ داغ عبدیت برداشت نہیں کرتا اس لئے اس کے سامنے ایک ایسا آئین رکھا گیا ہے جسے وہ سمجھے پھر اس پر عمل پیرا ہو کر اس منزل تک پہنچ جائے۔ جہاں یہ داغ عبدیت تاج خلافت کا سب سے آبدار موتی نظر آنے لگتا ہے اس لئے اُسے صرف سمجھایا نہیں گیا بلکہ عملی طور پر بھی ایسی ٹریننگ دی گئی جس کے اثر سے تدریجاً اس کی فطرت اطاعت و محبت کی خوگر ہوتی چلی جائے۔ سب سے پہلے مولیٰ حقیقی نے اپنے ایسے ایسے خوبصورت نام بتائے جن میں حسن و خوبی کا جلوہ بھی ہے اور حکومت و سلطنت کا دبدبہ بھی ساد ہیں حکم دیا کہ ہم ان ناموں سے اُسے پکارا کریں۔ اس کا نتیجہ نفسیاتی طور پر یہ ہونا چاہئے کہ اس کے حسن و جمال کا بے کیف و بے مثال نقش ہمارے دل پر چھا جائے اسی کے ساتھ اس کی بے پناہ قدرت و طاقت کا تسلط بھی قلب پر چھاتا چلا جائے اور ان اسماء کے لحاظ سے عبادات میں یہ تقسیم کر دی کہ کچھ عبادتیں تو وہ رکھیں جو اس کی حکومت کا سکہ دل پر قائم کریں اور کچھ وہ جو اس کا جذبۂ محبت بھڑکائیں۔ اب اگر تم ذرا غور کرو گے تو اسلام کی عبادت میں نماز اور زکوٰۃ تمہیں پہلی قسم میں نظر آئیں گی اور روزہ و حج دوسری قسم میں۔ نماز و زکوٰۃ میں تمام تر بارگاہ سلطنت و حکومت کا ظہور ہے اور روزہ و حج میں سرتاسر محبوبیت و جمال کا جلوہ۔ نماز کیا ہے حاضری کے ایک عام نوٹس کے بعد لباس و جسم کی صفائی، اس کے بعد کورٹ کی حاضری کے لئے تیاری، وکیل کا انتخاب، پھر کورٹ میں پہنچ کر دست بستہ باادب قیام، دائیں بائیں دیکھنے، بات چیت کرنے، کھانے پینے، حتیٰ کہ بلاوجہ کھانسنے اور نظریں اٹھانے تک کی ممانعت، آخر میں بذریعہ وکیل درخواست پیش کرنا پھر باادب سلام کر کے رخصت ہو جانا۔ زکوٰۃ پر غور کیجئے تو اس میں بھی غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالہ کر دینا" سرکاری ٹیکس وصول کرنے والے آئیں تو ان کو راضی کر کے واپس کرنا، اور جو وہ لینا چاہیں بے چون و چرا ان کے سپرد کر دینا

اب سوچو کہ اگر پانچ وقت اس طرح حاضری اور اتنی عاجزانہ جبہ سائی کی تا بعمر ٹریننگ حاصل کی جائے پھر سال بھر میں اپنا کمایا ہوا مال ایسی خاموشی اور بیچارگی سے سپرد کیا جائے تو کیا اس ذات کے ملکوت و جبروت کا نقش دل پر قائم نہیں ہوگا۔ جس کے پرشوکت اسماء پکارتے پکارتے اور یہ عاجزانہ عبادتیں کرتے کرتے عمر بسر ہوگئی ہے دوسری طرف اگر غور کرو تو محبت کا پہلا اثر کم خفتن، کم گفتن، کم خوردن ہی ہوتا ہے اس لئے اگر پہلے ہی قدم میں یہاں کوئی عاشق نہیں ہے تو یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اس جمیل مطلق کی محبت کی عاشقانہ ادائیں ہی اختیار کرے، کھانا، پینا ترک کرے، راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی نیند خراب کرے اور ایک جگہ جمع ہو کر اس کلام کی ایک معقول مقدار سنا کرے جسے سن کر مردہ روحیں بھی تڑپنے لگتی ہیں۔ اگر

ایک ماہ کی اس ٹریننگ سے اس کے رنگ ڈھنگ، طور وطریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہو گیا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہیئے اور وہ یہ ہے کہ جب کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور دنیا کے دوسرے لذائذ میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانا چاہیئے۔ یہاں زیب وزینت، تزک واحتشام درکار نہیں بلکہ سرتاسر ذل وافتقار، ہمہ تن عجز وانکسار، شکستہ حال واشکبار، برہنہ پا وجاں نثار، غرضکہ سراپا دیوانہ وار بن کر چلنا مقصود ہے، یہی احرام کا خلاصہ ہے۔ پھر لق ودق میدانوں کی صحرا نوردی اور سلطانِ حقیقت کے سامنے چیخ و پکار یہی تلبیہ اور میدانِ عرفات کا قیام ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے گھر کے سامنے حاضری ہوتی ہے جس کا مکین کوئی نہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے حسن وجمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور دلہائے عشاق کو پاش پاش کئے دیتی ہیں۔ ایسے دل کش نظارہ کے موقعہ پر بے ساختہ وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو مجنوں نے دیارِ لیلیٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا اسی کا نام طواف ہے۔ شاید صوم وحج کے اسی ربط کی وجہ سے ماہِ رمضان کے بعد ہی حج کے ایام شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر جذبۂ محبت اس سے بھی آگے ترقی کر جائے تو آخری منزل جہاد ہے۔ یہ حسن ومحبت کی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر محبِ صادق اور مدعیِ کاذب نکھر جاتے ہیں۔

قرآن کریم میں جہاد کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے، اس میدان سے جو بھاگا وہ اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ پھر خدا ورسول کی محبت کا دم بھر سکے۔ اور جس نے ذرا کوئی کمزوری دکھائی اس پر بیوفائی کا دھبہ لگے بغیر نہیں رہتا۔ اس میدان کا موصوف وہ ہے جو اپنی موت کو اپنی زیست پر ترجیح دیتا نظر آئے۔ دشمن کی تلوار کی چمک اس کو اتنی محبوب ہو جائے کہ سو جان سے اُسے گلے لگانے کی آرزو ہو اور وہ بڑے جذبہ کے ساتھ یہ کہتا ہوا خدا کی راہ میں قربان ہو جائے ؎

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد   من از سرِ نو جلوہ دہم دار ورسن را

یہ وہ عاشقِ صادق ہے کہ جب اس طرح پروانہ وار اپنی جان دیدیتا ہے تو قرآن کو اسے ..... مردہ کہنے پر غیرت آتی ہے، وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگرچہ تمہیں اس کی زندگی اور اس زندگی کے مقامِ بلند کا شعور نہیں۔

مولانا مرحوم کے اس نقشہ کے مطابق نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ ربط واضح ہو جاتا ہے۔ اگر یہ چاروں عبادتیں اس تصور سے ادا ہوتی رہیں تو ممکن نہیں کہ اطاعت ومحبت کی دونوں شانیں جو ایک عبد کے لئے مطلوب ہیں پیدا نہ ہو جائیں۔ ہمارے فقہاء نے بھی بڑی حد تک اس کو سمجھا ہے اور شاید اسی لئے قضاء نمازوں کی ترتیب ساقط ہونے کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ پوری پانچ نمازیں قضا ہو جائیں۔ بظاہر ایک دن کی پانچ نمازوں میں کوئی ایسا ربط پنہاں ہے کہ یہ پانچ گویا ایک ہی نماز ہے اور اسی لئے اگر کسی شخص کی چار نمازیں فوت ہو جائیں تو اُسے ان کو بالترتیب قضاء کرنا چاہیئے شافعیہ نے حالتِ سفر میں دو دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھنے کی اجازت دی ہے مگر یہ اجازت نہیں دی کہ پانچ میں سے جن دو کو چاہے جمع کر لے بلکہ صرف ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ جمع کرنا تجویز کیا ہے۔ شاید یہ بھی ان نمازوں کے کسی معنوی تناسب پر مبنی ہے۔ قاضی ابو الولید الباجی جملۂ حدیث "وانتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ" کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سلف ظہر کے بعد عصر اور مغرب کے بعد عشاء کا انتظار کیا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی ربط پر مبنی تھا۔ روزے کے باب میں جنون کے پورے ماہ یا اس کے کسی ایک حصہ میں ہونے کی بحث بھی شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پورے ایک ماہ کے روزوں کو بظاہر کوئی معنوی ربط حاصل ہے۔ ماہِ رمضان کی تین عشروں پر تقسیم بھی ہر عشرہ کے کسی معنوی ربط کا پتہ دیتی ہے اور آخر عشرہ کی اکائیوں میں بھی شاید کوئی

اوثق عری الایمان

(۲۵۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَدْرُوْنَ اَیُّ عُرَی الْاِیْمَانِ اَوْثَقُ قُلْنَا الصَّلٰوۃُ قَالَ الصَّلٰوۃُ حَسَنَۃٌ وَلَیْسَتْ بِذَاکَ قُلْنَا الصِّیَامُ فَقَالَ مِثْلَ ذَالِکَ حَتّٰی ذَکَرْنَا الْجِہَادَ فَقَالَ مِثْلَ ذَالِکَ ثُمَّ قَالَ اَوْثَقُ عُرَی الْاِیْمَانِ الْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْمُعَادَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ اخرجہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس و الطیالسی عن البراء۔

اسلام میں سب سے مضبوط عمل

(۲۵۰) براء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو ایمان میں سب سے مضبوط عمل کون سا ہے؟ ہم نے عرض کیا نماز۔ فرمایا بیشک نماز کا تو کیا کہنا ہے لیکن اس کا دائرہ دوسرا ہے ہم نے عرض کیا تو پھر روزے، آپ نے اس پر بھی یہی فرمایا یہاں تک کہ ہم نے جہاد کا نام لیا تو اس پر بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اس کے بعد کہا سب سے مضبوط عمل یہ ہے کہ خدا ہی کے لئے دوستی اور خدا ہی کے لئے دشمنی، اسی کے نام پر محبت اور اسی کے نام پر بغض رکھنا۔ (طبرانی مسند ابوداؤد طیالسی)

ایسی خصوصیت پنہاں ہے کہ لیلۃ القدر اُن ہی میں رکھی گئی ہے۔ بہرحال جب حوادثِ عالم کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی کسی اندرونی نظام کے ماتحت رونما ہوتی ہیں تو پھر احکامِ شریعت کو اتنا بے ربط کیوں سمجھا جائے اس موضوع پر غور کرنے کے لئے طبعی دلچسپی کی ضرورت ہے۔ فرصت نکالئے اور ان موتیوں کے حاصل کرنے کے لئے حدیث و قرآن کے سمندر میں غوطہ لگائیے گوہرِ مقصود مل جائے گا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر صرف تمسخر اور استہزاء کرنا علم کا راستہ نہیں۔

(۲۵۰) حدیث و قرآن میں فرائض و ارکان کو زیرِ بحث لایا ہی نہیں گیا۔ اُن کی اہمیت تو اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہاں وہ اعمال جو کسی سبب سے ارکان قرار نہیں دیئے گئے۔ لیکن بہ حقیقت رکنیت کا مقام رکھتے ہیں ان کو اس لئے ابھارا جاتا ہے کہ عام نظریں ان کا شمار ارکانِ اسلام میں نہ دیکھ کر کہیں ان اعمال کو نظر انداز نہ کر دیں ہمارے خیال میں یہ اعمال اکثر وہ ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ہے۔ بعض اجتماعی عمل اتنے اہم ہوتے ہیں کہ بہت سے انفرادی فرضوں کی ادائیگی اُن اعمال پر موقوف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا اپنا مقام دیکھا جائے تو اگرچہ اسکی حیثیت فرض و رکن کی نہیں ہوتی لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کا مرتبہ وہ ہو جاتا ہے جو قالب کیلئے قلب کا اور جسم کیلئے روح کا۔ ازانجملہ خدا کے لئے محبت و عداوت کا عمل ہے۔ احادیث میں اسلام کے اس شعبہ کو کمالِ ایمانی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ فضیلتِ اسلام کی حدیثوں میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جنت میں جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باہمی محبت پیدا نہ ہو جائے۔ اس

محبت سے مراد یہی پُرخلوص محبت ہے۔ مسلمانوں کا تنہا یہ عمل ان کے تمام دین کے ارکان کی ادائیگی میں جتنا ممد و معاون ہو سکتا ہے ظاہر ہے نماز سے لیکر جہاد تک معاملات سے مسائلِ امامت و سیاست تک کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہی وہ مرد وتقی ہے جو بہت سی اجتماعی امراض کا علاج اور بہت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب بھی ہے۔ حدیثوں میں مختصر مختصر ایسے اعمال بتادیئے گئے ہیں جو امتِ امیہ کو اجتماعی اور انفرادی زندگی کی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جب یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں تو بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین ادا کرنے کی فرصت میسر آجاتی ہے۔ لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ ایسا پر پیچ بن جاتا ہے کہ انسان عبادتِ خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے مشغلہ میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اللّٰھم صلِ علیٰ سیّدنا و مولانا محمدٍ و علیٰ اٰلِ سیّدنا و مولانا محمدٍ
و اصحابِ سیّدنا و مولانا محمدٍ و بارِک و سلم

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے

البقرۃ : ۱۴۳

علماءِ دیوبند (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج

آخری تصنیف

حکیم الاسلام حضرۃ مولانا قاری محمد طیب نور اللہ مرقدہٗ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

ادارہ اسلامیات

۱۹۰ - انارکلی ○ لاہور

ایک ماہ کی اِس ٹریننگ سے اس کے رنگ ڈھنگ، طور وطریق میں کچھ عاشقانہ انداز پیدا ہوگیا ہے تو اب اس کو دوسرا قدم اٹھانا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ جب کھانے، پینے، سونے، جاگنے اور دنیا کے دوسرے لذائذ میں اس کے لئے کوئی لذت نہیں رہی تو اس کو اب کوئے یار کی ہوا کھانا چاہیے۔ یہاں زیب وزینت، تزک واحتشام درکار نہیں بلکہ سرتاسر ذل وافتقار، ہمہ تن عجز وانکسار، شکستہ حال واشکبار، برہنہ پا وجاں نثار، غرضکہ سرتاپا دیوانہ وار بن کر چلنا مقصود ہے، یہی احرام کا خلاصہ ہے۔ پھر لق ودق میدانوں کی صحرانوردی اور لیلائے حقیقت کے سامنے چیخ وپکار یہی تلبیہ اور میدانِ عرفات کا قیام ہے۔ اس کے بعد ایک ایسے گھر کے سامنے حاضری ہوتی ہے جس کا مکین کوئی نہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے حسن وجمال کی کرنیں اس کے ہر ہر پتھر سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی ہیں اور دلہائے عشاق کو پاش پاش کئے دیتی ہیں۔ ایسے دل کش نظارہ کے موقعہ پر بے ساختہ وہی فرض ادا کرنا پڑتا ہے جو مجنوں نے دیارِ لیلیٰ کو دیکھ کر ادا کیا تھا اسی کا نام طواف ہے۔ شاید صوم وحج کے اِسی ربط کی وجہ سے ماہِ رمضان کے بعد ہی حج کے ایام شروع ہوجاتے ہیں۔ اگر جذبۂ محبت اس سے بھی آگے ترقی کرجائے تو آخری منزل جہاد ہے ۔ حسن ومحبت کی وہ آخری منزل ہے جہاں پہنچ کر محبِ صادق اور مدعیِ کاذب نکھر جاتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں جہاد کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے، اس میدان سے جو بھاگا وہ اس لائق نہیں سمجھا جاتا کہ پھر خدا ورسول کی محبت کا دم بھر سکے۔ اور جس نے ذرا کوئی کمزوری دکھائی اس پھر بیوفائی کا دھبہ لگے بغیر نہیں رہتا۔ اِس میدان کا مردِ صرف وہ ہے جو اپنی موت کو اپنی زیست پر ترجیح دیتا نظر آئے۔ دشمن کی تلوار کی چمک اس کو اتنی محبوب ہوجائے کہ سو جان سے اُسے گلے لگانے کی آرزو ہو اور وہ بڑے جذبہ کے ساتھ یہ کہتا ہوا خدا کی راہ میں قربان ہوجائے ؎

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　　　من از سرِ نو جلوہ دہم دار ورسن را

یہ وہ عاشقِ صادق ہے کہ جب اس طرح پروانہ وار اپنی جان دیدیتا ہے تو قرآن کو اسے ..... مردہ کہنے پر غیرت آتی ہے، وہ اعلان کرتا ہے کہ وہ زندہ ہے اگرچہ تمہیں اس کی زندگی اور اس زندگی کے مقامِ بلند کا شعور نہیں۔

مولانا مرحوم کے اس نقشہ کے مطابق نماز اور زکوٰۃ، روزہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ ربط واضح ہوجاتا ہے۔ اگر یہ چاروں عبادتیں اس تصور سے ادا ہوتی رہیں تو ممکن نہیں کہ اطاعت ومحبت کی دونوں شانیں جو ایک عبد کے لئے مطلوب ہیں پیدا نہ ہوجائیں، ہمارے فقہاء نے بھی بڑی حد تک اس کو سمجھا ہے اور شاید اسی لئے قضاء نمازوں کی ترتیب ساقط ہونے کے لئے یہ شرط رکھی ہے کہ پوری پانچ نمازیں قضا ہوجائیں بظاہر ایک دن کی پانچ نمازوں میں کوئی ایسا ربط پنہاں ہے کہ یہ پانچ گویا ایک ہی نماز ہے اور اسی لئے اگر کسی شخص کی چار نمازیں فوت ہوجائیں تو اُسے ان کو بالترتیب قضاء کرنا چاہیے شافعیہ نے حالتِ سفر میں دو دو نمازوں کو جمع کرکے پڑھنے کی اجازت دی ہے مگر یہ اجازت نہیں دی کہ پانچ میں سے جن دو کو چاہے جمع کرلے بلکہ صرف ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ جمع کرنا تجویز کیا ہے۔ شاید یہ بھی ان نمازوں کے کسی معنوی تناسب پر مبنی ہے۔ قاضی ابو الولید الباجی جملۂ حدیث "وانتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ" کی شرح میں لکھتے ہیں کہ سلف ظہر کے بعد عصر اور مغرب کے بعد عشاء کا انتظار کیا کرتے تھے وہ بھی شاید اسی ربط پر مبنی تھا۔ روزے کے باب میں جنون کے پورے ماہ یا اس کے کسی ایک حصہ میں ہونے کی بحث بھی شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ پورے ایک ماہ کے روزوں کو بظاہر کوئی معنوی ربط حاصل ہے۔ ماہِ رمضان کی تین عشروں پر تقسیم بھی ہر عشرہ کے کسی معنوی ربط کا پتہ دیتی ہے اور آخر عشرہ کی اکائیوں میں بھی شاید کوئی

اوثق عری الایمان

(۲۵۰) عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ تَدْرُوْنَ اَیُّ عُرَی الْاِیْمَانِ اَوْثَقُ قُلْنَا الصَّلٰوۃُ قَالَ الصَّلٰوۃُ حَسَنَۃٌ وَلَیْسَتْ بِذَاکَ قُلْنَا الصِّیَامُ فَقَالَ مِثْلَ ذَالِکَ حَتّٰی ذَکَرْنَا الْجِہَادَ فَقَالَ مِثْلَ ذٰلِکَ ثُمَّ قَالَ اَوْثَقُ عُرَی الْاِیْمَانِ الْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْمُعَادَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ اخرجہ الطبرانی فی الکبیر عن ابن عباس و الطیالسی عن البراء۔

اسلام میں سب سے مضبوط عمل

(۲۵۰) براء روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جانتے ہو ایمان میں سب سے مضبوط عمل کون سا ہے؟ ہم نے عرض کیا نماز۔ فرمایا بیشک نماز کا تو کیا کہنا ہے لیکن اس کا دائرہ دوسرا ہے ہم نے عرض کیا تو پھر روزے، آپ نے اس پر بھی۔ یہی فرمایا یہاں تک کہ ہم نے جہاد کا نام لیا تو اس پر بھی آپ نے وہی ارشاد فرمایا اس کے بعد کہا سب سے مضبوط عمل یہ ہے کہ خدا ہی کے لئے دوستی اور خدا ہی کے لئے دشمنی، اسی کے نام پر محبت اور اسی کے نام پر بغض رکھنا۔ (طبرانی مسند ابوداؤد طیالسی)

ایسی خصوصیت پنہاں ہے کہ لیلۃ القدر اُن ہی میں رکھی گئی ہے۔ بہرحال جب حوادثِ عالم کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی کسی اندرونی نظام کے ماتحت رونما ہوتی ہیں تو پھر احکامِ شریعت کو اتنا بے ربط کیوں سمجھا جاتا ہے اس موضوع پر غور کرنے کے لئے طبعی دلچسپی کی ضرورت ہے۔ فرصت نکالئے اور ان موتیوں کے حاصل کرنے کے لئے حدیث و قرآن کے سمندر میں غوطہ لگائیے گوہرِ مقصود مل جائے گا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو کر صرف تمسخر اور استہزا کرنا علم کا راستہ نہیں۔

(۲۵۰) حدیث و قرآن میں فرائض و ارکان کو زیر بحث لایا ہی نہیں گیا۔ اُن کی اہمیت تو اسلام کا بنیادی مسئلہ ہے۔ ہاں وہ اعمال جو کسی سبب سے ارکان قرار نہیں دیئے گئے۔ لیکن بہ حقیقت رکنیت کا مقام رکھتے ہیں ان کو اس لئے ابھارا جاتا ہے کہ عام نظریں ان کا شمار ارکانِ اسلام میں نہ دیکھ کر کہیں ان اعمال کو نظر انداز کر دیں ہمارے خیال میں یہ اعمال اکثر وہ ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ساتھ ہے۔ بعض اجتماعی عمل اتنے اہم ہوتے ہیں کہ بہت سے انفرادی فرضوں کی ادائیگی اُن اعمال پر موقوف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کا اپنا مقام دیکھا جائے تو اگرچہ اسکی حیثیت فرض و رکن کی نہیں ہوتی لیکن جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ارکانِ اسلام کے لئے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان کا مرتبہ وہ ہو جاتا ہے جو قالب کیلئے قلب کا اور جسم کیلئے روح کا۔ ازانجملہ خدا کے لئے محبت و عداوت کا عمل ہے۔ احادیث میں اسلام کے اس شعبہ کو کمالِ ایمانی کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ فضیلتِ اسلام کی حدیثوں میں آپ ملاحظہ کر چکے ہیں کہ جنت میں جانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک باہمی محبت پیدا نہ ہو جائے۔ اس

محبت سے مراد یہی پُرخلوص محبت ہے۔ مسلمانوں کا تنہا یہ عمل ان کے تمام دین کے ارکان کی ادائیگی میں جتنا ممد و معاون ہو سکتا ہے ظاہر ہے نماز سے لیکر جہاد تک معاملات سے مسائلِ امامت و سیاست تک کون سا شعبہ ایسا ہے جس میں حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کی ضرورت نہ ہو بلکہ اسلام کی ایک عظیم الشان عبادت یعنی جہاد تو درحقیقت اسی کے مجموعہ کا نام ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہی وہ عروۃ الوثقی ہے جو بہت سے اجتماعی امراض کا علاج اور بہت سے امراض سے تحفظ کا واحد سبب بھی ہے۔ حدیثوں میں مختصر مختصر ایسے اعمال بتا دیئے گئے ہیں جو امتِ امیہ کو اجتماعی اور انفرادی زندگی کی پیچیدگیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اور جب یہ پیچیدگیاں پیدا نہیں ہوتیں تو بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ عبادت رب العالمین ادا کرنے کی فرصت میسر آجاتی ہے۔ لیکن جب ان اعمال کو ترک کر دیا جاتا ہے تو زندگی کا ہر شعبہ ایسا پرپیچ بن جاتا ہے کہ انسان عبادتِ خداوندی کی بجائے صرف ان کے سلجھانے کے مشغلہ میں ہی پھنس کر رہ جاتا ہے۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اللّٰھم صلِ علیٰ سیّدنا ومولانا محمدٍ وعلیٰ اٰلِ سیّدنا ومولانا محمدٍ
واصحابِ سیّدنا ومولانا محمدٍ وبارک وسلم

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا

اور ہم نے تم کو ایک ایسی جماعت بنا دیا ہے جو نہایت اعتدال پر ہے

البقرۃ : ۱۴۳

علماءِ دیوبند (رحمہم اللہ تعالیٰ) کا دینی رُخ اور مسلکی مزاج

آخری تصنیف

حکیم الاسلام حضرۃ مولانا قاری محمد طیب نوّر اللہ مرقدہٗ

(مہتمم دار العلوم دیوبند)

اِدارۂ اسلامیات

۱۹۰۔ انارکلی ○ لاہور